

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ الَّذِي أَنبَأَنَا بَشِيرًا وَنَذِيرًا
وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

دین الحق

بِجَوَابِ جَاءَ الْحَقُّ

حصہ دوم

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ



ناشر

ملنے کیلئے

مکتبہ عزیزہ
لاہور



نعمانی کتب خانہ

حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

Ph:042-7321865

دین الحق

بجواب

جاء الحق

تالیف

ابوصہیب محمد داؤد ارشد

جلد دوم

ناشر

مکتبہ عزیزیہ

لاہور

ملنے کا پتہ

فصلی کتب خانہ

حق سٹریٹ اردو بازار لاہور۔

042 7321865 (فون)

(پاکستان)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب

دین الحق بجواب جاء الحق

از قلم

ابوصہب محمد داؤد ارشد

تاریخ اشاعت



تعداد

دسمبر ۲۰۰۱

1100

ناشر

مطبوعہ

مونروے پرنٹرز لاہور

مکتبہ عزیز یہ لاہور

ملنے کا پتہ



نمان کتب خانہ

NOMANI KUTAB KHANA

HAG STREET URDU BAZAR

LAHORE. 2 PAKISTAN

TEL: 042- 7321865

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فہرست مضامین دین الحق

نمبر شمار	تفصیل مضامین	صفحہ نمبر
۱	خطبہ رحمت للعالمین	۶۴
۲	عرض مؤلف	۶۴
۳	علماء و محققین کے تبصرے	۲۳ تا ۲۴
	باب بدعات اسلام کی نظر میں	
۴	بعثت انبیاء کا مقصد	۶۸
۵	شریعت کے رابہ پر چلنا ہی ہدایت ہے	۶۹
۶	کامیابی فقط اتباع رسول ﷺ میں ہے	۷۲
۷	نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر عمل کرنا گمراہی ہے	۷۴
۸	صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نظر میں بدعت -	۷۵
۹	بدعی اعمال اللہ کے ہاں مردود ہیں -	۷۸
۱۰	بدعتی کی توبہ قبول نہیں جب تک بدعت کو نہ چھوڑے -	۷۹
۱۱	بدعت جاری کرنے والے پر اللہ کی اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے	۸۰
۱۲	بدعتی کی فرض و نفلی عبادات قبول نہ ہوگی	۸۰
۱۳	بدعت کا لغوی معنی	۸۱
۱۴	بدعت کا شرعی معنی	۸۳
۱۵	کیا بدعت میں دین کی قید ہے	۸۴
۱۶	اکابرین اہل حدیث کا موقف	۸۵
۱۷	علماء بریلویہ کا موقف	۸۵
۱۸	علماء سلف سے بدعت شرعی کی تعریف	۸۶
۱۹	بدعت کے شرعی معنی پر مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	۸۹
۲۰	مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض اور اس کا جواب	۹۰
۲۱	کیا علم حدیث بدعت ہے	۹۳
۲۲	مفتی صاحب کا اکابر اہل حدیث کو چیلنج	۹۵
۲۳	شرک کی تعریف	۹۶

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۹۸	عبادت کی تعریف	۲۴
۱۰۱	دین کی تعریف	۲۵
۱۰۲	خلفاء راشدین کا عمل بھی سنت میں داخل ہے	۲۶
۱۰۳	مفتی صاحب کا پہلا اعتراض	۲۷
۱۰۵	مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض	۲۸
۱۰۶	مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض	۲۹
۱۱۰	مفتی صاحب کا سوال	۳۰
۱۱۱	کیا اشیاء میں اصل اباحت ہے	۳۱
۱۱۳	مفتی صاحب کی اباحت پر پہلی دلیل کا جواب	۳۲
۱۱۴	دوسری دلیل کا جواب	۳۳
۱۱۵	تیسری دلیل کا جواب	۳۴
۱۰۵	مفتی صاحب کی بڑ	۳۵
۱۱۶	بدعات کے دلائل اور ان کا علمی و تحقیقی جائزہ	۳۶
۱۱۶	مفتی صاحب کی پہلی دلیل کا جواب	۳۷
۱۲۳	مفتی صاحب کا ایک مغالطہ	۳۸
۱۲۵	مفتی صاحب کی دوسری دلیل کا جواب	۳۹
۱۲۷	مفتی صاحب کی تیسری دلیل کا جواب	۴۰
۱۳۰	مفتی صاحب کی چوتھی دلیل کا جواب	۴۱
۱۳۲	مفتی صاحب کی پانچویں دلیل کا جواب	۴۲
۱۳۴	مفتی جی کا سنت کو بدعت کہنا	۴۳
۱۳۶	باب فردا فردا بدعات پر تنقید	
۱۳۷	محفل میلاد کی شرعی حیثیت	۴۴
۱۴۲	محبت رسول اللہ ﷺ کا معیار	۴۵
۱۴۳	محبت رسول اللہ ﷺ کی آڑ میں لیڈروں کی سیاسی چالیں	۴۶
۱۵۵	مفتی صاحب کی پہلی دلیل کا جواب	۴۷
۱۴۸	اسلام میں تحدیثِ نعمت کا	۴۸

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
		۴۹
۱۵۴	مفتی صاحب کی تیسری دلیل کا جواب	۵۰
۱۵۸	مفتی صاحب کی چوتھی دلیل کا جواب	۵۱
۱۶۱	مفتی صاحب کی پانچویں دلیل کا جواب	۵۲
۱۶۴	مفتی صاحب کی چھٹی دلیل کا جواب	۵۳
۱۶۵	مفتی صاحب کی ساتویں دلیل کا جواب	۵۴
۱۶۸	باب مجلس میلاد میں کھڑے ہونے کی شرعی حیثیت	
۱۶۹	پہلی بات پر تبصرہ	۵۵
۱۷۰	دوسری بات کا جواب	۵۶
۱۷۱	آنحضرت ﷺ اپنے لئے قیام کو ناپسند کرتے تھے	۵۷
۱۷۲	مفتی صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۵۸
۱۷۴	مفتی صاحب کی پہلی دلیل کا جواب	۵۹
۱۷۵	مفتی صاحب کی دوسری دلیل کا جواب	۶۰
۱۷۶	تنبیہ	۶۱
۱۷۶	مفتی صاحب کی تیسری دلیل کا جواب	۶۲
۱۷۸	مفتی صاحب کی چوتھی دلیل کا جواب	۶۳
۱۷۸	مفتی صاحب کی پانچویں دلیل کا جواب	۶۴
۱۸۰	مفتی صاحب کی چھٹی دلیل کا جواب	۶۵
۱۸۳	مفتی صاحب کی ساتویں دلیل کا جواب	۶۶
۱۸۴	مفتی صاحب کی آٹھویں دلیل کا جواب	۶۷
۱۸۵	کیا کھڑے ہو کر کھانا مکروہ ہے	۶۸
۱۸۵	خلاصہ کلام	۶۹
۱۸۶	تعظیم رسول اللہ ﷺ کا مفہوم	۷۰
۱۸۷	باب مسئلہ ایصال ثواب	
۱۸۷	کن چیزوں کا میت کو ثواب پہنچنا ہے	۷۱
۱۸۹	اولاد میں والدین کی سعی شامل ہے	۷۲

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۱۹۰	ایصال ثواب کا شروع طریقہ	۷۳
۱۹۰	دعا	۷۴
۱۹۱	صدقہ جاریہ	۷۵
۱۹۳	نیابت	۷۶
۱۹۴	نیابت کا مشروع طریقہ	۷۷
۱۹۵	روزہ میں نیابت کی دلیل	۷۸
۱۹۵	نیابت اور اھد اُ کا فرق	۷۹
۱۹۶	شبہات اور ان کا ازالہ	۸۰
۱۹۸	فرقہ بریلویہ کے لئے لمحہ فکریہ اور ان کے اکابرین کو کھلا چیلنج	۸۱
۱۹۹	قراۃ قرآن	۸۲
۲۰۰	قل دسواں چالیسوں کی بعث	۸۳
۲۰۲	مرنے والے کے وارثوں سے مسنون سلوک	۸۴
۲۰۴	فقہائے احناف کی صراحت	۸۵
۲۱۱	مفتی صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۸۶
۲۱۳	مفتی صاحب کی پہلی دلیل اور اس کا جواب	۸۷
۲۱۶	دوسری دلیل کا جواب	۸۸
۲۱۷	مفتی صاحب کی تیسری دلیل کا جواب	۸۹
۲۲۰	چوتھی دلیل کا جواب	۹۰
۲۲۳	شریعت میں مکاشفہ کی حیثیت	۹۱
۲۲۴	مفتی صاحب کی پانچویں دلیل کا جواب	۹۲
۲۲۵	کیا کھانے کے بعد کی مسنون دعا سے ختم ثابت ہوتا ہے	۹۳
۲۲۶	مفتی صاحب کی چھٹی دلیل کا جواب	۹۴
۷۷۷	کیا معجزہ احکام میں معتبر ہے	۹۵
۲۲۸	مفتی صاحب کی ساتویں دلیل کا جواب	۹۶
۲۲۸	کیا قربانی کی دعا سے ختم ثابت ہوتا ہے	۹۷
۲۳۲	عقلی دلیل کا رد	۹۸

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۲۳۳	مفتی صاحب کا ایک سوال	۹۹
۲۳۳	کیا قرآن مبتدیین کے لئے رحمت ہے	۱۰۰
۲۳۷	باب نماز جنازہ کے بعد اجتماعی دعا	
۲۳۹	مفتی صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۱۰۱
۲۳۹	کیا کلام الہی کے علاوہ ہر کتاب کا ہر کلمہ قطعی حق ہوتا ہے	۱۰۲
۲۳۸	بعد نماز جنازہ دعا کا فقہاء احناف سے رد	۱۰۳
۲۴۴	عبارات فقہاء پر مفتی صاحب کا پہلا اعتراض اور اس کا جواب	۱۰۴
۲۴۵	دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	۱۰۵
۲۴۵	تیسرا اعتراض اور اس کا جواب	۱۰۶
۲۴۶	مفتی صاحب کے دلائل کا تجزیہ	۱۰۷
۲۴۶	پہلی دلیل کا جواب	۱۰۸
۲۵۰	دوسری دلیل کا جواب	۱۰۹
۲۵۱	تیسری دلیل کا جواب	۱۱۰
۲۵۳	چوتھی دلیل کا جواب	۱۱۱
۲۵۶	پانچویں دلیل کا جواب	۱۱۲
۲۵۷	چھٹی دلیل کا جواب	۱۱۳
۲۵۸	ساتویں دلیل کا جواب	۱۱۴
۲۵۹	آٹھویں دلیل کا جواب	۱۱۵
۲۶۲	نویں دلیل کا جواب	۱۱۶
۲۶۴	دفن کے بعد قبر پر قرآن قرآن کا مسئلہ	۱۱۷
۲۶۴	نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم	۱۱۸
۲۶۸	باب قبروں پر مزارات کی تعمیر	
۲۶۸	مزارات رسول اللہ ﷺ کی نظر میں	۱۱۹
۲۶۹	پہلی حدیث	۱۲۰
۲۷۰	قبر اور مقبرہ کا معنی و مفہوم	۱۲۱
۲۷۲	کیا یہ حکم خاص ہے	۱۲۲

نمبر شمار	تفصیل مضامین	صفحہ نمبر
۱۲۳	کیا مزار تعمیر کرنے کی ممانعت سجاوٹ کی وجہ سے ہے	۲۶۳
۱۲۴	قبر پر عمارت تعمیر کرنے کا مفہوم	۲۶۴
۱۲۵	کیا وثن اور عمارت ہم معنی ہے	۲۶۶
۱۲۶	کیا مزار تعمیر نہ کرنے کا حکم تقوہ کی وجہ سے ہے	۲۸۱
۱۲۷	کیا زائر بن کی آسائش کے لئے مزار بنانا جائز ہے	۲۸۲
۱۲۸	کیا صحابہ کرام نے خاص خاص قبروں پر قبے بنائے تھے	۲۸۶
۱۲۹	تنبیہ ثانیہ	۲۸۸
۱۳۰	مزارات کے رد میں دوسری حدیث	۲۸۸
۱۳۱	تسویہ قبور اور بخش قبور کا فرق	۲۹۰
۱۳۲	کیا یہ حکم کفار کی قبروں کے متعلق تھا؟	۲۹۳
۱۳۳	کیا قبروں کو گرانا جائز ہے	۲۹۵
۱۳۴	تیسری حدیث	۲۹۶
۱۳۵	فائدہ جلیلہ	۲۹۶
۱۳۶	چوتھی حدیث	۲۹۹
۱۳۷	پانچویں حدیث	۲۹۹
۱۳۸	اتباع رسول اللہ ﷺ کا تقاضہ	۲۹۹
۱۳۹	مزارات اور امام ابوحنیفہ	۳۰۰
۱۴۰	اکابر احناف کی صراحت	۳۰۱
۱۴۱	مکروہ کا مفہوم آئمہ احناف کے نزدیک	۳۰۲
۱۴۲	توہمات بریلویہ	۳۰۶
۱۴۳	قبور پر مزارات کے تعمیر کے دلائل کی حقیقت	۳۱۰
۱۴۴	مفتی صاحب کی پہلی دلیل	۳۱۰
۱۴۵	کیا حضرت عثمانؓ کی قبر کو پختہ کیا گیا تھا؟	۳۱۱
۱۴۶	مفتی صاحب کی دوسری دلیل	۳۱۳
۱۴۷	کیا اہل کتاب کا عمل دین میں حجت ہے	۳۱۳
۱۴۸	مفتی صاحب کی تیسری دلیل	۳۱۵

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۳۱۶	کیا آنحضرت ﷺ کا روضہ صحابہ نے تعمیر کیا تھا	۱۴۹
۳۱۹	مفتی صاحب کی چوتھی دلیل	۱۵۰
۳۱۹	کیا صحابہ کے دور میں قبروں پر قبے بنائے گئے؟	۱۵۱
۳۳۱	مفتی صاحب کا اصل موضوع سے فرار	۱۵۲
۳۳۴	کیا تکمیل شریعت کے بعد کوئی حکم منسوخ ہو سکتا ہے	۱۵۳
۳۳۶	باب قبروں پر پھول ڈالنا چادریں چڑھانا	
	اور چراغاں کرنے کا بیان	
۳۳۶	کیا یہ اسلام کی تعلیم ہے یا زمانہ جاہلیت کی	۱۵۴
۳۳۰	فائدہ جلیلہ	۱۵۵
۳۳۲	مفتی صاحب کا حقائق سے انکار	۱۵۶
۳۳۲	کیا اعتبار خصوص سبب کا ہوتا ہے	۱۵۷
۳۳۴	کیا خوش لباسی اور تمام اکل حلال اسراف ہے	۱۵۸
۳۳۶	کیا رات کو دفن کے وقت لائٹ کا انتظام کیا جاسکتا ہے	۱۵۹
۳۳۹	کیا مرور زمانہ سے حکم شرعی بدل جاتا ہے	۱۶۰
۳۴۰	عمال حکومت اور سیاست فاروقی	۱۶۱
	تنبیہ	۱۶۲
۳۴۲	کیا مساجد کو پختہ کرنے کی اجازت ہے	۱۶۳
۳۴۵	کیا مساجد میں عورت کا نماز پڑھنا جائز ہے:	۱۶۴
۳۴۶	کیا مؤلفۃ القلوب کا حکم منسوخ ہے	۱۶۵
۳۴۸	مزارات پر غلاف پڑھانا اور چراغاں کرنے کے	
	دلائل اور ان کی حقیقت	
۳۴۸	مفتی صاحب کی پہلی دلیل	۱۶۶
۳۴۹	کیا قبریں شعائر اللہ میں داخل ہیں	۱۶۷
۳۵۲	مفتی صاحب کی دوسری دلیل	۱۶۸
۳۵۲	عذاب قبر میں تخفیف کا سبب رسول اللہ ﷺ کی شفاعت تھی یا نبی کی تسبیح	۱۶۹
۳۵۵	مفتی صاحب کی تیسری دلیل	۱۷۰

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۳۵۵	کیا اسلام میں قبر کی عظمت کا پرچار جائز ہے	۱۷۱
۳۵۸	باب میت دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا	
۳۵۸	ذفن کرنے کے بعد منمنون عمل	۱۷۲
۳۵۹	فقہائے احناف کی صراحت	۱۷۳
۳۶۱	علمائے بریلویہ کا اعراف حق	۱۷۴
۳۶۳	مفتی صاحب کا پہلا اعتراض اور اس کا جواب	۱۷۵
۳۶۳	جس کی اصل ثابت ہو اس پر لاحقہ و اضافہ کرنا جائز ہے	۱۷۶
۳۶۷	علمائے بریلویہ کا اعتراف حق	۱۷۷
۳۶۹	مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	۱۷۸
۳۷۱	مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض اور اس کا جواب	۱۷۹
۳۷۳	مفتی صاحب کا چوتھا اعتراض اور اس کا جواب	۱۸۰
۳۷۴	عرفہ کے روز باہر نکل کر عبادت وغیرہ کرنی	۱۸۱
۳۷۷	باب قبر پر اذان دینے کے دلائل کا تجزیہ	
۳۷۷	مفتی صاحب کی پہلی دلیل	۱۸۲
۳۷۷	میت کو تلقین کب کی جائے	۱۸۳
۳۸۰	اکابرین احناف سے حدیث کا معنی	۱۸۴
۳۸۲	محدثین کرام سے حدیث کا معنی	۱۸۵
۳۸۴	برصغیر کے علماء اہل حدیث کا معنی	۱۸۶
۳۸۵	بریلوی کتب فکر کے علماء سے معنی	۱۸۷
۳۸۶	مفتی صاحب کی ایک نئی دریافت	۱۸۸
۳۸۷	مفتی صاحب کی دوسری دلیل	۱۸۹
۳۸۷	کیا تحری کی اذان سے قبر کی اذان ثابت ہوتی ہے	۱۹۰
۳۸۸	مفتی صاحب کی تیسری دلیل	۱۹۱
۳۸۸	کیا شیطان کو بہگانے کے لئے اذان دی جاسکتی ہے	۱۹۲
۳۹۶	مفتی صاحب کی چوتھی دلیل	۱۹۳
۳۹۷	کیا قبر میں میت پر وشت آتی ہے	۱۹۴



صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۳۹۹	کیا آدم علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی ذات کے وسیلہ سے دعا کی تھی	۱۹۵
۴۰۱	مفتی صاحب کی پانچویں دلیل	۱۹۶
۴۰۱	کیا مردے کے غم کو دور کرنے کے لئے اذان کہی جاسکتی ہے	۱۹۷
۴۰۴	مفتی صاحب کی چھٹی دلیل	۱۹۸
۴۰۴	کیا اذان دینے سے قبر کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے	۱۹۹
۴۰۸	نماز کے بعد مصافحہ و معائنہ کرنا	۲۰۰
۴۱۳	تنبیہ	۲۰۱
۴۱۴	باب اولیاء کرام کا عہد منانا	
۴۱۴		
۴۱۵	عرس کا پس منظر اور وجہ تسمیہ	۲۰۲
۴۱۶	اولیاء کرام کا تہوار منانا	۲۰۳
۴۱۸	مفتی صاحب کا معنی حدیث سے انکار	۲۰۴
۴۲۰	مفتی صاحب کی سوچ کی غلط کروش	۲۰۵
۴۲۵	مفتی صاحب کا اصل بحث سے فرار	۲۰۶
۴۲۶	عرس اور فقہاء احناف	۲۰۷
۴۲۶	عرس کے دلائل اور ان کا تجزیہ	۲۰۸
۴۲۷	مفتی صاحب کی پہلی دلیل	۲۰۹
۴۲۹	مومن کے آرام قبر سے عرس کا اثبات	۲۱۰
۴۳۰	ملفوظ	۲۱۱
۴۳۱	مفتی صاحب کی دوسری دلیل	۲۱۲
۴۳۳	کیا رسول اللہ ﷺ شہدا احد کی قبروں پر ہر سال جایا کرتے تھے	۲۱۳
۴۳۴	مفتی صاحب کی تیسری دلیل	۲۱۴
۴۳۶	کیا جب کیفیت بدل جائے تو حکم شرعی میں تبدیلی آ جاتی ہے	۲۱۵
۴۳۶	مفتی صاحب کی چوتھی دلیل	۲۱۶
۴۳۷	کیا عرس میں حج جیسے فوائد ہے	۲۱۷
۴۳۸	کیا قبر پر قرآن پڑھنا جائز ہے	۲۱۸
		۲۱۹

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۵۲۶	چوتھی دلیل کا جواب	۲۶۵
۵۳۸	پانچویں دلیل کا جواب	۲۶۶
۵۳۹	مفتی صاحب کا اصل موضوع سے فرار	۲۶۷
۵۴۰	امام احمد بن حنبل پر افترا	۲۶۸
۵۴۲	آیت قرآن سے غلط استدلال	۲۶۹
۵۴۵	غلط بحث کی ایک اور مثال	۲۷۰
۵۴۷	آب زم زم سے استدلال	۲۷۱
۵۴۸	مقام ابراہیم کو مصطفیٰ بنانے سے استدلال	۲۷۲
۵۵۰	اللہ تعالیٰ کی قسم سے استدلال	۲۷۳
۵۵۱	حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال	۲۷۴
۵۵۴	باب عبد النبی اور عبد الرسول نام	
۵۵۹	رکھنے کی بحث	
۵۶۲	مفتی صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۲۷۵
۵۶۳	کیا فرماتے ہیں علماء بریلوکیہ	۲۷۶
۵۶۴	مفتی صاحب کے دلائل کا تجزیہ	۲۷۷
۵۶۵	پہلی دلیل کا جواب	۲۷۸
۵۶۶	دوسری دلیل کا جواب	۲۷۹
۵۶۸	تیسری دلیل کا جواب	۲۸۰
۵۷۲	باب جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے	
۵۷۵	کلمہ وغیرہ کا ذکر کرنا	
۵۷۶	مفتی صاحب کا اعتراض	۲۸۱
۵۸۰	ایک نئی دریافت	۲۸۲
۵۸۰	مفتی صاحب کے	۲۸۳
۵۸۰	دلائل کا جواب	۲۸۴
۵۸۰	پہلی دلیل کا جواب	۲۸۵
۵۸۲	مفتی صاحب کی دوسری دلیل کا جواب	۲۸۶



صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۵۰۰	ملفوظ	۲۴۳
۵۰۰	دیگر روایات	۲۴۴
۵۰۲	کیا کفن کی خوشبو سے کفنی والی ثابت ہوتی ہے	۲۴۵
۵۰۳	مفتی صاحب کی ساتویں دلیل کا جواب	۲۴۶
۵۰۶	کفنی کے ثبوت پر عقلی دلائل اور ان کا رد	۲۴۷
۵۰۶	پہلی عقلی دلیل کا جواب	۲۴۸
۵۰۶	دوسری عقلی دلیل کا جواب	۲۴۹
۵۰۷	تیسری عقلی دلیل کا جواب	۲۵۰
۵۱۰	باب نماز کے بعد بلند آواز سے	
	درود شریف پڑھنے کا ثبوت	
۵۱۰	کیا بلند آواز سے ذکر کرنا جائز ہے	۲۵۱
۵۱۳	سری اور جہری ذکر کی دلیل	۲۵۲
۵۱۵	العودانی المقصود	۲۵۳
۵۱۶	نماز کے بعد منہ و طائف	۲۵۴
۵۱۷	کیا اہل حدیث درود کے منکر ہیں	۲۵۵
۵۱۹	مفتی صاحب کے دلائل میں سقم کی صراحت	۲۵۶
۵۲۰	الفاظ حدیث میں اضافہ	۲۵۷
۵۲۰	معنی حدیث کی غلط تاویل	۲۵۸
۵۲۱	مفتی صاحب کی علل الحدیث سے کم آگاہی	۲۵۹
۵۲۲	معنی حدیث میں تحریف	۲۶۰
۵۲۳	باب انسان کے ہاتھ پاؤں چومنے کی شرعی حیثیت	
۵۲۷	مفتی صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۲۶۱
۵۲۹	بزرگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے کے دلائل کا تجزیہ	۲۶۲
۵۲۹	مفتی صاحب کی پہلی دلیل کا جواب	۲۶۳
۵۳۲	دوسری دلیل کا جواب	۲۶۴
۵۳۳	تیسری دلیل کا جواب	۲۶۵



صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۴۴۳	باب بحث سفر عرس	
۴۴۵	کیا لاتشد الرجال کی ممانعت صرف مساجد کے ساتھ خاص ہے	۲۲۰
۴۴۸	کیا حاجی و غازی کے علاوہ کوئی اور دریائی سفر کر سکتا ہے	۲۲۱
۴۵۰	اسوہ فاروقی اور اجماع صحابہ کرامؓ	۲۲۲
۴۵۰	مفتی صاحب کا ڈھکوسلہ	۲۲۳
۴۵۱	کیا تمام صحابہ ہی بیعت رضوان والے درخت کو بھول گئے تھے؟	۲۲۴
۴۵۳	سفر عرس کے دلائل	۲۲۵
۴۵۴	کیا عام سفروں سے عرس کا سفر ثابت ہوتا ہے	۲۲۶
۴۵۷	مفتی صاحب کا امام شافعی پر انفرادی	۲۲۷
۴۶۰	کیا زیارت قبور سے عرس کا سفر ثابت ہوتا ہے	۲۲۸
۴۶۳	تنبیہ	۲۲۹
۴۶۵	باب قوالی کی بحث	
۴۶۵	اسلام میں عبادت کا طریقہ	۲۳۰
۴۶۷	موسیقی رسول اللہ ﷺ کی نظر میں	۲۳۱
۴۶۹	فقہاء احناف کی صراحت	۲۳۲
۴۷۰	فتاویٰ رضویہ	۲۳۳
۴۷۶	قوالی کے دلائل اور ان کی حقیقت	۲۳۴
۴۸۰	خلاصہ کلام	۲۳۵
۴۸۱	علامہ شامی کی ادھوری عبارت	۲۳۶
۴۸۲	باب کفنی والفی تحریر کرنے کی بحث	
۴۸۹	کفنی والفی لکھنے کے دلائل اور ان کا تجزیہ	۲۳۷
۴۸۹	کیا تو سل سے تبرک اور تبرک سے کفنی والفی ثابت ہوتی ہے	۲۳۸
۴۹۳	کیا حضرت زینبؓ کے کفن میں کفنی رکھی گئی تھی	۲۳۹
۴۹۵	کیا منافقین کے لیڈر کے کفن میں کفنی رکھی گئی تھی	۲۴۰
۴۹۷	کیا زندگی میں کفن تیار کرنے سے کفنی ثابت ہوتی ہے	۲۴۱
۴۹۸	کیا رسول اللہ ﷺ والدہ علیؑ کے ساتھ قبر میں لیٹے تھے	۲۴۲

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۵۸۴	تیسری دلیل کا جواب	۲۸۷
۵۸۵	چوتھی دلیل کا جواب	۲۸۸
۵۸۶	پانچویں دلیل کا جواب	۲۸۹
۵۸۸	چھٹی دلیل کا جواب	۲۹۰
۵۹۰	ساتویں دلیل کا جواب	۲۹۱
۵۹۲	خلاصہ کلام	۲۹۲
۵۹۳	باب حلیہ اسقاط کی بحث	
۵۹۳	حیلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں	۲۹۳
۵۹۴	جن لوگوں نے حیلہ کیا تھا ان کا انجام	۲۹۴
۵۹۶	مفتی صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۲۹۵
۶۰۰	حیلہ اللہ تعالیٰ کی شریعت سے مذاق	۲۹۶
۶۰۱	مفتی صاحب کا پہلا اعتراض اور اس کا جواب	۲۹۷
۶۰۳	دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	۲۹۸
۶۰۵	تیسرا اعتراض اور اس کا جواب	۲۹۹
۶۰۸	صدقہ گناہوں کو مناتا ہے	۳۰۰
۶۰۹	حیلہ نبی ﷺ کی نظر میں	۳۰۱
۶۱۴	اسقاط کے دلائل کا تجزیہ	۳۰۲
۶۱۶	اسقاط کے طریقہ پر تبصرہ	۳۰۳
۶۱۹	حیلہ اسقاط کی پہلی دلیل کا جواب	۳۰۴
۶۲۰	ایک بریلوی عالم کا اعتراف حق	۳۰۵
۶۲۲	مفتی صاحب کی دوسری دلیل کا جواب	۳۰۶
۶۲۳	مفتی صاحب کے استدلال کی خامیاں	۳۰۷
۶۲۶	مفتی صاحب کی تیسری دلیل کا جواب	۳۰۸
۶۲۸	مفتی صاحب کی چوتھی دلیل کا جواب	۳۰۹
۶۲۸	نہاڑ اور روزے کا حیلہ	۳۱۰
۶۳۳	تنبیہ	۳۱۱

۶۳۳	خلاصہ کلام	۳۱۲
۶۳۴	استقاط کا ثبوت	۳۱۳
۶۳۶	باب اذان میں انگوٹھے چومنے کی بحث	
۶۳۸	انگوٹھے چومنے کا ثبوت	۳۱۴
۶۴۱	عیسائیوں کے گھر سے	۳۱۵
۶۴۳	ایک من گھڑت	۳۱۶
۶۴۴	علماء بریلویہ کا اعتراف	۳۱۷
۶۴۶	ایک مجلس کی تین طلاقیں	
۶۴۶	فصل اول	۳۱۸
۶۴۶	پہلی آیت	۳۱۹
۶۴۷	مفتی کا پہلا اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۰
۶۵۰	دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۱
۶۵۱	تیسرا اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۲
۶۵۳	دوسری آیت	۳۲۳
۶۵۷	پہلی حدیث	۳۲۴
۶۵۸	مفتی صاحب کا پہلا اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۵
۶۶۰	دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۶
۶۶۲	تیسرا اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۷
۶۶۶	دوسری حدیث	۳۲۸
۶۶۷	تیسری حدیث	۳۲۹
۶۶۸	ایک مجلس کی طلاق ثلاثہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ	۳۳۰
۶۷۰	تابعین کرام کے فتاویٰ	۳۳۱
۶۷۱	فتویٰ امام عکرمہ	۳۳۲
۶۷۲	امام طاووس کا فتویٰ	۳۳۳
۶۷۲	امام عطاء کا فتویٰ	۳۳۴
۶۷۲	امام عطاء بن یسار کا فتویٰ	۳۳۵

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۶۷۳	امام جابر بن زید کا فتویٰ	۳۳۶
۶۷۳	امام عمر بن دینار کا فتویٰ	۳۳۷
۶۷۴	دیگر تابعین عظام کے فتاویٰ	۳۳۸
۶۷۴	دعویٰ اجماع حقیقت کے آئینہ میں	۳۳۹
۶۷۵	ہمارے دور کے علماء عرب و عجم	۳۴۰
۶۷۶	علماء پاک و ہند	۳۴۱
۶۷۷	مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کا فتویٰ	۳۴۲
۶۷۸	ایک اور فتویٰ	۳۴۳
۶۷۹	پیر کرم شاہ صاحب بریلوی کا فتویٰ	۳۴۴
۶۷۹	مفتی صاحب کی پہلی	۳۴۵
	دلیل کا جواب	۳۴۶
۶۸۳	دوسری دلیل کا جواب	۳۴۷
۶۸۵	تیسری دلیل کا جواب	۳۴۸
۶۸۷	چوتھی دلیل کا جواب	۳۴۹
۶۸۹	حضرت علیؑ سے ایک مزید ثبوت کا جواب	۳۵۰
۶۹۱	پانچویں دلیل کا جواب	۳۵۱
۶۹۳	چھٹی دلیل کا جواب	۳۵۲
۶۹۴	ساتویں دلیل کا جواب	۳۵۳
۶۹۶	آٹھویں دلیل کا جواب	۳۵۴
۶۹۸	ملفوظہ	۳۵۵
۷۰۰	امام ابن ماجہ اور حدیث البت	۳۵۶
۷۰۱	نویں دلیل کا جواب	۳۵۷
۷۰۲	دسویں دلیل کا جواب	۳۵۸
	فقہ حنفی کے خلاف	۳۵۹
۷۰۵	خلفاء راشدین کی نافذ کردہ قوانین کی امثلہ	۳۶۰
۷۰۵	حج تمتع کی مثال	۳۶۱

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۷۰۶	سفر حج میں قصر نماز کی مثال	۳۶۲
۷۰۷	بیک وقت ہزار طلاقیں دینے کی مثال	۳۶۳
۷۰۷	مفقود الخیر شوہر کی مثال مروجہ نکاح حلالہ کی مثال	۳۶۴
۷۰۸	حالت احرام میں نکاح کی مثال	۳۶۵
۷۰۹	نکاح بلا ولی کی مثال	۳۶۶
۷۱۰	ہمت رضاعت کی مثال	۳۶۷
۷۱۰	طلاق غلام کی مثال	۳۶۸
۷۱۱	عدت خلع کی مثال	۳۶۹
۷۱۲	زبردستی طلاق کی مثال	۳۷۰
۷۱۲	بدست آدمی کی طلاق کی مثال	۳۷۱
۷۱۲	نکاح سے پہلے طلاق کی مثال	۳۷۲
۷۱۳	ہدم طلاق کی مثال	۳۷۳
۷۱۴	ایلاء کی مثال	۳۷۴
۷۱۵	حد چوری کی مثال	۳۷۵
۷۱۶	سزائے لوطی کی مثال	۳۷۶
۷۱۶	بثانی پر کھیتی کی مثال	۳۷۷
۷۱۷	مسئلہ وقف کی مثال	۳۷۸
۷۱۸	گوہ کی گوشت کی مثال	۳۷۹
۷۲۰	کیا جمہور کی مخالفت گمراہی ہے	۳۸۰
۷۲۰	حنفیہ کے خلاف جمہور علماء کے مسائل کے نشان دہی	۳۸۱
۷۲۱	جانور کو ادھار لینا	۳۸۲
۷۲۱	جانور کو کمی و بیشی سے فروخت کرنا	۳۸۳
۷۲۲	مال کی تیسری حصہ سے زیادہ وصیت کرنا	۳۸۴
۷۲۳	آقا لونڈی پر حد قائم کر سکتا	۳۸۵
۷۲۴	گھر میں اعتکاف	۳۸۶
۷۲۵	اشعار بدن	۳۸۷

صفحہ نمبر	تفصیل مضامین	نمبر شمار
۷۲۷	کافر حرمین شریفین میں جا سکتا ہے	۳۸۸
۷۲۸	خون مسلم کی بے قدری	۳۸۹
۷۲۹	ایک گواہی اور قسم سے فیصلہ	۳۹۰
۷۳۱	کیا کہتے کے جوٹھے برتن کو تین بار دھونا ہی کافی ہے؟	۳۹۱
۷۳۲	نکاح کے بغیر بیوی	۳۹۲
۷۳۴	بیع اختیار کا مسئلہ	۳۹۳
۷۳۵	سنت فجر کے بعد گفتگو	۳۹۴
۷۳۶	نماز استقواء کی مشروعیت سے انکار	۳۹۵
۷۴۰	اگر نماز میں ایک رکعت زیادہ ادا کر لی جائے	۳۹۶
۷۴۲	مردہ پھل کی حکم	۳۹۷
۷۴۳	کتے کو فروخت کرنا	۳۹۸
۷۴۴	عیدین کے دن روزہ رکھنا	۳۹۹
۷۴۶	کیا فرماتے ہیں علماء بریلویہ	۴۰۰
۷۴۷	برائیسوں کی جڑ نجد یا عراق	
۷۴۸	تعداد نجوم؟	۴۰۱
۷۴۸	قرن الشیطان کو ناسخد ہے	۴۰۲
۷۵۰	مزید وضاحت	۴۰۳
۷۵۲	تاریخ کی شہادت	۴۰۴
۷۵۵	عراق حدیث نبوی کی روشنی میں	۴۰۵
۷۵۷	بصورت تسلیم	۴۰۶
۷۶۰	محمد بن عبدالوہاب تاریخ کے آئینہ میں	۴۰۷
۷۶۲	تعلیم القرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ	
۷۶۲	تصویر کا پہلا رخ	۴۰۸
۷۶۵	تصویر کا دوسرا رخ	۴۰۹
۷۶۸	راہ اعتدال	۴۱۰
۷۶۸	ان احادیث کا صحیح محل	۴۱۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ابتدائیہ

مولانا ابوالانس محمد یحییٰ گوندلوی

مترجم و شارح صحیح سنن ترمذی و صحیح ابن ماجہ

نصیرہ دہلوی علی رسول اللہ (ﷺ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل کے لیے حضرت محمد ﷺ کا انتخاب فرمایا اور انہیں تمام انسانوں کے لیے معلم اور رسول بنا کر مبعوث کیا جنہوں نے کتاب و سنت کی تعلیم سے پرانندہ دلوں کا تزکیہ کیا اور ان میں کتاب و سنت کا نور بھردیا:

(يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ) (الجمعه ۲)

یہ تعلیم ایسی اکمل اور اتم ہے کہ اس کا کوئی ایسا پہلو باقی نہیں جو تشنہ تکمیل ہو بلکہ ضروریات دین کو علی وجہ الکمال بیان کر دیا جس میں کسی قسم کی کمی کا تصور ممکن نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا

(المائدہ ۳)

”میں نے آج (حجۃ الوداع) کے دن تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا ہے اور میں تمہارے لیے دین اسلام پر راضی ہو گیا ہوں۔“ اسی دین کی پیروی میں دنیا و آخرت کی فلاح اور کامیابی ہے اور یہی دین صراط مستقیم ہے ماسوا گمراہی اور ضلالت ہے۔

(وان هذا صراطی مستقیم فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبیلہ

ذالکم وضحکم بہ لعلکم تتقون) (الانعام ۱۵۳)

”بمشابہہ یہی میرا سیدھا اور درست راہ ہے تم اسی راہ کی پیروی کرو کیونکہ وہ تم کو اللہ کے رستہ سے جدا اور الگ کر دیں گے تم کو اللہ نے وصیت کی ہے تاکہ تم

پر ہیز گار بن جاؤ“

اس رستہ سے انحراف و عدول اور اعراض کرنے والے کو اس کے برباد ہونے کے ساتھ سخت سزا کی وعید سنائی ہے

(وما اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا واتقوا الله ان الله شديد العقاب) (الحشر ۷)

”رسول تم کو جو دے اسے پکڑ لو اور جس سے منع کرے اس سے باز آ جاؤ اور اللہ سے ڈرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے“ اس حد تک تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ دین اسلام حضرت رسول اکرم ﷺ کی وفات سے قبل مکمل ہو چکا ہے اب اس میں کوئی ایسی گنجائش باقی نہیں ہے کہ جس سے یہ دین کسی زبانی یا کی کا متحمل ہو کیونکہ معلم کائنات ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دین کی مکمل تعلیم سے آراستہ کر دیا حضرت سلمان فارسیؓ سے چند مشرکوں نے

(قد علمکم نبیکم کل شیئی حتی الخراۃ فقال اجل) (مسند احمد ص مسلم ص ۱۳۰ ج ۱)

”کیا تمہارے نبی نے تمہیں سب کچھ سکھا دیا ہے حتیٰ کہ طہارت بھی تو انہوں نے فرمایا جی ہاں خود حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرما دیا کہ“

(ما ترک شیئاً مما امرکم اللہ بہ الا وقد امرتکم بہ ولا شیئاً مما نہاکم اللہ عنہ الا وقد نہیتکم عنہ)

”اللہ نے جس کا بھی تمہیں حکم دیا ہے میں نے اس میں کوئی چیز نہیں چھوڑی مگر تمہیں اس کا حکم دے دیا ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس سے تم کو منع کیا ہے مگر میں نے تم کو اس سے منع کر دیا ہے“ معلوم ہوا کہ جو چیز دین میں حضرت رسول اکرم ﷺ کی تعلیم کے علاوہ داخل کی جائے وہ دین نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ ہدایت کہلا سکتی ہے ۔

بریت کا اظہار

یہی وجہ ہے کہ حضرت رسول اکرم نے دین میں اہواء و خواہشات اور بدعات کے داخل کرنے والوں سے بریت کا اظہار کیا ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں حضرت رسول اللہ ﷺ نے آیت

(ان الذین فرقوا دینہم وکانو شیعیاً)

تلاوت کی اور فرمایا

(ہم اہل الہواء واصحاب البدع واصحاب الضلالة یا عائشہ ان لكل ذنب توبة ما خلا اصحاب الہواء والبدع ليس لهم توبة وانا برى منهم وهم منى البراء (الاعتصام ص ۶۰ ج ۱)

”جنہوں نے دین میں تفرقہ ڈالا یہ عید گروہ تھے یہ وہ گروہ ہیں جو خواہش پرست بدعتی اور گمراہی والے ہیں اے عائشہ ہر گناہ کی توبہ ہے مگر خواہش پرستوں اور اہل بدعت کی توبہ قبول نہیں میں ان سے بری ہوں اور یہ مجھ سے بری ہیں“
(اہل الہواء واصحاب البدعة)

نتیجہ! دونوں ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو دین کی رعایت ایسے نہیں رکھتے جیسا کہ اس کا حق ہے بلکہ اپنی خواہشات اور بدعات کو دین میں شامل کر لیتے ہیں یہی لوگ ہیں جنہیں بدعتی کہا جاتا ہے

بدعت کی تعریف

اہل لغت کے نزدیک بدعت کی تعریف یہ ہے :

بدع یبدع بدعاً انشاء علی غیر مثال سابق. (المعجم الوسیط ص ۴۳ ج ۱)
اختراع لا علی مثال. (مختار الصحاح ص ۵۶)

بدعت کا مادہ ہے بدع لغت میں اس کا معنی ہے بلا کسی سابقہ مثال کے کسی چیز کو ایجاد کرنا:

(ا بتدع فلان بدعة یعنی ابتداء طريقة لم يسبق اليها). (الارشاد الی صحیح

(الاعتقاد ص ۲۹۲)

بدعت کا لفظ اس وقت بولتے ہیں جب کسی نے ایسے طریقہ کی ابتداء کی ہو جس طرف کسی اور نے پہل اور سبقت نہ کی ہو۔

اصطلاحی تعریف

۱۔ اکرام نے بدعت کی شرعی اور اصطلاحی تعریف یوں کی ہے اہم شاطبی فرماتے ہیں :

(طريقة في الدين مختصرة تضاعى الشرعية بقصد بالسلوك عليها المبالغ في التبع لله سبحانه تعالى)۔ (الاعتصام ص ۳۷ ج ۱)

دین کے اندر ایسا ایجاد کیا ہوا طریقہ جو شریعت کے ساتھ مشابہت رکھتا ہو اور اس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت میں مبالغے کا قصد اور ارادہ کیا جائے علامہ حواہی نے بدعت کی تعریف اس طرح کی ہے

(البدعة هي الحدث في الدين بعد الاكمال وما استحدث بعد النبي ﷺ من الاهواء والاعمال) (السنن والمنتبغات ص ۱۱)

دین کے کامل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابواء و اعمال ایجاد کئے جانے کا نام بدعت ہے علامہ محمد ابی بکر الرزوی فرماتے ہیں :

(البدعة حدث في الدين بعد الاكمال)۔ (مختار الصحاح ص ۵۶)

دین کے مکمل ہونے کے بعد جو چیز دین میں نئی پیدا کی جائے وہ بدعت ہے مذکورہ تعریفات سے واضح ہوا کہ شرع میں اس فعل اور عمل کو بدعت کہتے ہیں جو دین تکمیل اور رسول اللہ ﷺ کے بعد ایجاد ہوا ہو جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ جس امر کی کتاب و سنت سے دلیل نہیں وہ بدعت ہے علامہ شاطبی فرماتے

كل ما لا يدل عليه دليل فهو بدعة۔ (الاعتصام ص ۳۶۰ ج ۱)

جس فعل پر کوئی دلیل و دلالت نہ کرے وہ بدعت ہے بدعت کی مذکورہ تعریف کوئی اختراعی اور وضعی تعریف نہیں بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ سے منقول بدعت کے بارہ

میں صریح اور صحیح نص کے الفاظ کا مفہوم ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

(من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهورد). (بخاری ص ۲۷۰ مسلم

ص ۷۷ ج ۲-)

”جو ہمارے اس امر میں نیا کام جاری کرے جو اس سے نہ ہو وہ مردود ہے اور

فرمایا:

(من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فهورد). (مسلم ص)

(جو ایسا عمل کرے جس پر ہمارا امر نہ ہو پس وہ مردود ہے) لفظ امرنا نے واضح

کردیا کہ بدعت کا تعلق امور دین سے ہے دنیاوی عادی ایجادات سے نہیں

اہل بدعت کی غلط توضیح

اہل بدعت بدعت کے تعین میں مختلف گروہوں میں تقسیم ہیں ایک گروہ کے

نزدیک بدعت صرف امور اعتقادیہ میں ہے جیسا کہ خارجیوں اور قدریوں کی بدعت ہے

دوسرا گروہ کہتا ہے بدعت اور امور دونوں میں ایک جیسی ہے یہ پہلا گروہ دراصل

اعتقاد کا نام لے کر احکام میں ہر قسم کی من مرضی کرنا چاہتا ہے دوسرا گروہ دنیاوی

اور عادی امور کو بدعت میں شامل کر کے عقلاً ہر قسم کی بدعت کے جواز کی راہ

ہموار کرنا چاہتا ہے مگر راقم کہتا ہے ان دونوں گروہوں کا عندیہ اور نظریہ نقل اور عقلاً غلط

اور باطل ہے شرعاً اس لیے غلط ہے کہ جن احادیث میں بدعات کی وعید آئی ہے

اس میں عقیدہ اور عمل کی کوئی تفریق نہیں عقلاً اس لیے یہ تعریف باطل ہے کہ عمل

کی بنیاد عقیدہ ہوتا ہے کوئی عمل عقیدہ سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے گروہ کا نظریہ

اس بنا پر غلط ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فی امرنا کہہ کر دنیاوی اور عادی

امور کو بدعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اور عقلاً اس لئے غلط ہے کہ دنیاوی اور عادی

امور میں حسب حال اور حسب زمانہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے مگر دین کا معاملہ تو قیقی ہے

جس میں اللہ اور رسول کے علاوہ کسی ایک کو کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا اختیار اور حق

نہیں ہے ہمارے دور کے مبتدعہ حضرات اس دوسری قسم پر بڑا زور دیتے ہیں وہ ریل جہاز

ڈاک ریڈیو اور لاؤڈ سپیکر کو بھی بدعت قرار دیتے ہیں بالآخر نتیجہ یہ نکالتے ہیں ان کا استعمال بدعت ہے اور انہیں ہر جماعت کے لوگ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ (جاء الحق ص ۲۲۲ ج ۱)

مذکورہ سائنسی ایجادات کافی امر نازدائیں داخل کرنا محض فریب ہے اس لئے کہ دنیاوی معاملات کو انسانوں کے تجربہ فہم و فراست پر چھوڑا گیا ہے، جیسا کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا

(انتم اعلم بأمور دنیاکم) (مسلم ص ۲۴۶ ج ۲)

تم اپنے معاملات کو بخوبی سمجھتے ہو۔

اور فرمایا:

(انما انا بشر امرتکم بشیء من دینکم فخذوا به واذ امرتکم بشیء من رائی

فانما انا بشر) (مسلم ص ۲۶۴ ج ۲)

”میں بشر ہوں کوئی حکم تمہیں کسی دین کے بارہ میں کروں تو اس کو پکڑ لو لیکن جب میں تمہیں اپنی رائے سے حکم دوں تو میں بشر ہوں اور فرمایا:

(اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذوا به فانی لن اکذب علی اللہ عزوجل).

(مسلم ص ۲۶۴ ج ۲).

جب میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے بیان کروں تو اس پر عمل کرو، میں اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتا۔

دنیاوی ایجادات کی بنیاد تجربات ہیں جو ہر دور میں جاری رہتے ہیں، اور ہر آنے والا زمانہ ان میں نئی کشش اور جدت پیدا کر دیتا ہے۔ مگر دین کا معاملہ ایسا نہیں کیونکہ اس کی بنیاد تجربہ پر نہیں بلکہ الہام اور وحی پر ہے جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی منقطع ہو چکی ہے مگر دنیاوی امور جب شریعت سے متصادم نہ ہوں میں اصل اباحت ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں:

(اذا نظرنا الی البدع المتعلقة بامور الدنیا لم تساو البدع المتعلقة بامور

الاحکام الفرعیة ولعل البدع المتعلقة بامور الدنیا لا تکره اصلا بل کثیر منها

يجزم فيه بعدم الكراهة) (احکام الاحکام ص ۵۱ ج ۱)

دُنیاوی ایجادات کو دیکھتے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ دین احکام کے مساوی اور برابر نہیں، ممکن ہے کہ دینی امور کے متعلقہ ایجادات اصلاً ناپسند ہوں بلکہ بہت سی ایجادات تو ایسی ہیں جن کے ناپسند ہونے کا ہم پختہ فیصلہ دیتے ہیں۔ ہاں البتہ ایسی دُنیاوی ایجادات جن کا دین میں نقصان نفع سے زیادہ ہو تو ان سے اجتناب ضروری ہے۔ تاکہ دین کے نقصان کا اندیشہ پیدا نہ ہو۔

شریعت نے منع نہیں کیا

بدعات کے باب میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ معلوم ہونا چاہیے دلیل وجود اور اثبات کی ہوتی ہے۔ نبی اور منع کی دلیل کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کوئی فعل پہلے ہو رہا ہو اور بعد میں شریعت نے منع کیا ہو جیسا کہ نکاح متعہ اور دیگر منع کردہ امور ہیں جو جاہلیت میں ہو رہے تھے مگر شریعت غرا سے عدم مطابقت اور موافقت کی وجہ سے ان سے منع کر دیا گیا۔

مگر ایسا فعل جو زمانہ نزول وحی کے وقت موجود ہی نہیں تھا بلکہ وہ شریعت کی تکمیل اور صاحب وحی کے بعد وجود میں آیا تو اس کے قبل از وجود منع کرنے اور روکنے کے لیے دلیل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اس کے وجود کا زمانہ خود اس کے ناجائز ہونے کی دلیل ہے علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

(کل ما لا يدل عليه دليل فهو بدعة). (الاعتصام ص ۳۶۰ ج ۱).

”ہر وہ امر جس پر دلیل دلالت نہ کرے وہ بدعت ہے“ یہی وجہ ہے کہ وہ عبادت نہیں جس کا وجود صحابہ کے زمانہ مسعود میں نہیں تھا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں:

قل عبادة لم يتبعدها اصحاب رسول الله ﷺ فلا تعبدوها فان الاول لم للاخر مقالا. (الاعتصام ص ۱۳۲ ج ۲).

ہر عبادت جو صحابہ نے نہیں کی تم بھی اسے نہ کرو کیونکہ پہلے صحابہ نے پچھلوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

بدعت کی شناخت یہی ہے کہ اس کا وجود کتاب و سنت سے معلوم نہ ہو اور صحابہ کرام نے بھی اس پر عمل نہ کیا ہو۔ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

اما اهل السنة والجماعة فيقولون في كل فعل وقول لم يثبت عن الاصحاب

هو بدعة لانه لو كان خيرا لسبقون اليه انهم لم يتركوا خصلة من خصال الخير الا وقد بادروا اليها. (ابن كثير ص ۱۵۶ ج ۴).

اہل سنت والجماعت کے نزدیک ہر وہ قول اور فعل بدعت ہے جس کا ثبوت صحابہ سے نہیں، اس لیے اگر بعد والے قول اور فعل میں کوئی اچھائی ہوتی تو صحابہ اس کی طرف سب سے پہلے سبقت لے جاتے اور اس کے کرنے پر پہل کرتے اس لیے کہ انہوں نے کوئی بھی بھلائی کی خصلت نہیں چھوڑی مگر اس کے کرنے میں انہوں نے بڑی تیزی اور عجلت دکھائی ہے

معلوم ہوا کہ اہل بدعت کا یہ کہنا کہ اس کے منع کی دلیل پیش کرو، محض ایک مغالطہ اور دھوکہ ہے۔

درجات بدعت

بلاشبہ دین میں ہر قسم کی بدعت گمراہی ہے جو باعث آگ ہے مگر بدعات گمراہی میں شدید ہونے کے لحاظ سے مختلف درجوں میں ہیں۔ علامہ حوامدی نے تمام بدعات کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے:

۱- البدعة المكفرة: مصیبتوں، تکلیفوں کے وقت اور حاجات کی براری کیلئے اللہ تعالیٰ کے علاوہ یا اللہ کے ساتھ انبیاء اور صالحین کو بطور استغاثہ کے پکارنا یہ ایسی بدعت ہے جس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں سے فریب کیا گیا ہے یہ ایسی بدعت ہے جس کے جال اور چنگل میں علماء اور جہلا دونوں گرفتار ہیں بہت کم ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس بدعت سے محفوظ رکھا ہے درحقیقت یہ نداء ہی تو عین شرک ہے۔

۲- بدعت محرمة: مردوں سے وسیلہ طلب کرنا، قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، ان پر چراغاں کرنا، نذر و نیاز اور ذبح کرنا، قبر کا طواف کرنا اور بوسہ دینا، علامہ حامد الفقی فرماتے ہیں:-

یہ دوسری قسم بھی حکم کے اعتبار سے پہلی قسم کی طرح ہے قبر پر نذر و نیاز، اس کا طواف کرنا اور چھونا یہ اللہ کے علاوہ مردوں کی عبادت ہے یہ بھی جشن میلاد کی طرح شرکیہ عبادت ہے۔

۳- بدعت مکروه: جیسا کہ نماز جمعہ کے بعد احتیاطی ظہر پڑھنا، اجرت پر تلاوت کرنا، مسیحہ،

عقائد اور ختم جو میت کے لیے کیا جاتا ہے۔ شب برأت اور میلاد النبی کی رات عبادت کرنا۔ اذان کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ و سلام پڑھنا۔ قضاء عمری کی نماز جو رمضان المبارک کے آخر میں پڑھی جاتی ہے وغیرہ۔

۴۔ بدعت تنزیہہ: نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا، قبروں پر پردے لگانا سال کے آغاز اور اختتام اور عاشوراء کے روز خصوصی دعائیں کرنا۔

بہت سے محققین علماء کا مذہب ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حرام ہے ان کا استدلال حدیث کے عموم کے صیغوں سے ہے کہ:

(فان كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة وكل ضلالة في النار.) (السنن والمبتدعات ص ۱۲ ملخصاً)

ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ہے۔

بدعت کی مذمت

اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کر دی ہے لہذا جو چیز تکمیل دین کے وقت دین میں شامل نہیں وہ دین ہے نہ حق بلکہ خالص گمراہی ہے۔

(فماذا بعد الحق الا الضلل.) (یونس ۳۲)

”حق کے بعد گمراہی ہے“ جو ہدایت کی ضد ہے ایسا شخص ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا جو کتاب و سنت کے بغیر ہدایت طلب کرتا ہے۔

(ومن اضل ممن اتبع هوئہ بغیر ہدی من اللہ.) (القصاص ۵۰)

”ایسے شخص کے گمراہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ منزل من اللہ دین پر اپنی خواہش کو مقدم رکھتا ہے۔

افراء یت من اتخذ الہۃ ہوئہ.) (الحاشیہ ۲۳)

”کیا تو نے اس کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو الہ بنا لیا۔“ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

آیت: ﴿یوم تبيض وجوه وتسود﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تبيض وجوه اهل السنة والجماعة وتسود وجوه اهل البدعة والفرقة. (تفسیر

ابن کثیر (ص ۳۰۷ ج ۱)۔

اہل سنت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہل بدعت کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے آیت: ﴿ان الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعا﴾ (الانعام ۱۵۹) پڑھی تو فرمایا:

هم اصحاب الاهواء واصحاب البدع واصحاب الضلالة من هذه الامة.
(الاعتصام ص ۵۶ ج ۱)۔

یہ اس اُمت کے خواہش پرست، بدعتی اور گمراہ لوگ ہیں۔

حدیث نبویؐ اور بدعت:

اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے اپنی امت کو بدعات سے ڈرایا بلکہ سختی سے منع فرمایا اور واضح کیا کہ کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔ (نسائی) ”کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔“

یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے دین سے جو سلوک کیا اسی خطرہ کے پیش نظر آپؐ نے اُمتِ محمدیہ کو یہود و نصاریٰ کی اتباع اور پیروی سے منع فرمایا کہ مبادا کہیں یہ اُمت بھی بدعت کی خرافات میں نہ کھو جائے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے ادیان میں جو خرابی پیدا کی وہ ان کی من مرضی کی آراء کا مسلط کرنا اور دین میں بدعات کا رائج کرنا تھا چنانچہ آپؐ نے واضح کر دیا کہ:

”من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو رد“۔ (مسلم)۔

ہر وہ عمل جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے۔

”من احدث في امرنا هذا ما ليس منه فهو رد“۔ (بخاری)۔

جو ایسا امر ایجاد کرتا ہے جو دین میں سے نہیں وہ مردود ہے۔

موقف صحابہ کرامؓ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدُمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ

وَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (الحجرات)۔

اے ایماندارو تم اللہ اور رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا

جاننے والا ہے۔

صحابہ کرام اللہ کے حکم کے مطابق اللہ اور رسول سے ایک قدم بھی آگے نہ جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک دین میں بدعت نہایت مبغوض اور ناپسند امر تھا حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ولم ار من اصحاب رسول اللہ ﷺ رجلا ابغض الیہ حدثن فی الاسلام منہ۔
اصحاب رسول میں سے میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس کے نزدیک اسلام میں بدعت سے زیادہ کوئی ناپسندیدہ امر ہو۔ (السنن والمبتدعات ص ۴)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

(اتبع ولا تبندع)۔ (دارمی ص ۵۰ ج ۱)۔ ”تو اتباع کر بدعت پر عمل نہ کر“۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

علیکم بالعلم وایاکم والتبدع۔ (دارمی ص ۵۰ ج ۱)۔

تم علم کو لازم پکڑو اور بدعت سے بچو اور فرمایا:

اتبعوا ولا تبندعوا قتد کیفتم۔ (دارمی ص ۶۱ ج ۱)۔

تم پیروی کرو اور بدعتی نہ بنو تم کفایت کئے جا چکے ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو کسی نے کہا کہ فلاں آدمی آپ کو سلام کہتا ہے تو انہوں نے فرمایا:

”مجھے خبر پہنچی ہے کہ وہ بدعتی ہو گیا ہے اگر وہ بدعتی ہو گیا ہے تو اس پر سلام نہ کہنا“ (دارمی

ص ۱۹، مسلم)

ان آثار سے واضح ہو گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ بدعت کو نظر تحسین سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ وہ اہل

بدعت سے علیک سلیک کو بھی درست نہیں جانتے تھے۔

بدعت حسنہ اور بدعت سیدہ

بدعت کی مذمت میں جو صحیح احادیث منقول اور ماثور ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی بدعت

کو حسنہ اور سیدہ کی طرف تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنے عموم کے اعتبار سے دین میں جو بھی بدعت

ایجاد کی جائے گی خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی۔ اصول میں ہو یا فروغ میں۔ عقائد میں ہو یا عبادات

میں تمام کی تمام ضلالت اور گمراہی میں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

فایاکم وما ابتدع ضلالة. (السنن والمبتدعات ص ۴).

تم بدعت سے بچو بلاشبہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

مگر اس کے باوجود بدعتی حضرات بدعت کو حسنہ اور سیدہ کی طرف تقسیم کرتے ہیں دراصل ان کی مذکورہ تقسیم از خود بدعت ہے کتاب و سنت میں بدعت حسنہ کے دلائل کا کوئی وجود نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے بھی کوئی اس تقسیم سے واقف نہیں تھا کیونکہ بدعت کو تو مذکورہ تقسیم عہد صحابہ کے بہت بعد معرض وجود میں آئی ہے بلکہ اس کی اصل شناخت تو عز بن عبد السلام نے کی ہے۔

اگر بدعت کی مذکورہ تقسیم کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کوئی بدعت ایسی نہیں ہوگی جس کو تمام سیدہ کہتے ہوں بلکہ بعض اسے ضرور حسنہ کہیں گے کیونکہ بدعت کو اچھی سمجھ کر ہی اس پر عمل ہوتا ہے گمراہی سمجھ کر کون عمل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ بدعتی سرغننے اپنے پیشواؤں کی بدعات پر حسنہ کا لیبل لگا کر ان کو گمراہ کرتے ہیں پھر اسی پر ہی اکتفاء نہیں بلکہ بدعت کو حسنہ کا لبادہ پہنا کر اس پر عمل کرنے والوں کو ثواب کی نوید سنائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ایک صاحب لکھتے ہیں:

بدعت حسنہ کا برا ہونا تو کیا بلکہ اس پر رسول اللہ ﷺ نے وعدہ ثواب کا دیا ہے۔ (انوار الساطعہ ص ۹۳)۔

نیز ایسی بدعت، بدعت نہیں رہتی بلکہ سنت بن جاتی ہے جیسا کہ فرماتے ہیں بدعت حسنہ کا لفظ وہی کہے گا جو قائل تقسیم بدعت ہوگا جو تقسیم کا قائل نہ ہوگا وہ بدعت حسنہ کو سنت کہے گا۔ (ایضاً ص ۹۵)

پھر اہل بدعت کے نزدیک بدعت کے رائج کا کوئی بھی زمانہ متعین نہیں، بلکہ جس دور میں بھی بدعت رائج ہوگی وہ سنت کا درجہ حاصل کرے گی۔ جیسا کہ مولوی عبدالمسیح لکھتے ہیں:

بلکہ ایجاد اس کا جائز ہے قیامت تک کسی زمانہ میں ایجاد ہو اور کوئی ایجاد کرے۔

اس پر موصوف نے تمام مفتیان کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

پس جان لیجئے کہ ان سب مفتیان دین کے نزدیک تا قیامت بدعت حسنہ جائز ہے کچھ قرون ثلاثہ منحصر نہیں ہے۔ (انوار الساطعہ ص ۹۴ و ۹۵)۔

موصوف کے خیالات کے مطابق ہر کسی کو بدعت حسنہ کے نام پر شریعت سازی کا حق حاصل ہے اور اس کا ایسے حسن کو استعمال کرنا مذموم نہیں بلکہ باعث ثواب ہے۔

ہم کہتے ہیں اس نظریہ سے تو شریعت بیضاء کا کوئی مقام ہی باقی نہیں رہ جاتا بلکہ شریعت کی بنیادیں ہی کھوکھلی ہو جاتی ہیں اب دین کے نام پر ہر ہتھو خیرے کو نیا دین بنانے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے جب ایسا ہی کردار یہود و نصاریٰ کے احبار اور رہبان نے ادا کیا تو اصل دین ناپید ہو گیا اور اس کی جگہ ان کی بدعات نے لے لی اور یہی کردار امت محمدیہ کے بدعتی حضرات نے ادا کیا اور بڑی جسارت اور جرأت سے اپنی ایجاد کردہ بدعات کو شریعت کا درجہ دے دیا۔ بلاشبہ یہود و نصاریٰ کی اتباع میں اہل بدعت نے کوئی کمی نہیں کی۔

بدعت حسنہ کے دلائل کا تجزیہ

ہاں البتہ اہل بدعت نے اپنی بدعات کے تحفظ کی خاطر قرآن و حدیث کا نام استعمال کیا اور قرآن و حدیث سے اپنی بدعات کے حق میں دلائل تلاش کرنا شروع کر دیے۔ اور بڑی جستجو کے بعد اپنے زعم میں چند دلائل جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مگر وہ دلائل کیا ان کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔

آئیے ملاحظہ کرتے ہیں:

(۱) من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها لا ينقص من اجورهم شيئاً
ومن سن سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها لا ينقص من اوزارهم شيئاً.
(مسلم)

بدعتی حضرات کا اس حدیث سے یہ استدلال ہے کہ جیسے اچھا طریقہ رائج کرنے سے اجر اور ثواب ملتا ہے تو اسی طرح غلط طریقہ رائج کرنے سے گناہ حاصل ہوتا ہے اہل بدعت کے نزدیک یہ دلیل ان کے موقف میں سب سے اہم ہے مگر یہ دلیل ان کے موقف سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں رکھتی اس لیے کہ اس حدیث میں سنت کا ذکر ہے بدعت کا ذکر نہیں بدعت سنت کی ضد ہے۔

رسول اللہ ﷺ خطبہ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے:

خير الهدى هدى محمد وشر الامور محدثاتها. (مسلم)

بہترین رستہ محمد ﷺ کا ہے اور بدترین امور بدعت کے ہیں۔

معلوم ہوا کہ سنت خیر ہے اور بدعت شر ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خیر و شر دونوں آپس میں ضد ہیں۔ بدعت سنت کی ضد ہونے کو خود اہل بدعت نے بھی تسلیم کیا ہے طائفہ بریلویہ کے مقتدا مولوی عبدالسمیع فرماتے ہیں:

سنت کی ضد بدعت ہے۔ (انوار ساطعہ ص ۶۹)

اسی طرح علامہ شاطبی ناقل ہیں کہ بدعت سنت کی ضد ہے۔ (الاعتصام ص ۹۱ ج ۱)۔

لہذا اس حدیث سے بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ غلط ہے کیونکہ یہ دونوں آپس میں ضد ہونے کی وجہ سے دونوں نہ ہم معنی ہو سکتی ہیں اور نہ ایک جگہ اکٹھی ہو سکتی ہیں۔

ثانیا: مذکورہ الفاظ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے مگر اہل بدعت پوری حدیث ذکر نہیں کرتے وہ آخر ایسا کیوں کریں کیا اپنے استدلال کو خود ہی غلط ٹھہرا لیں۔ دراصل یہ حدیث صدقہ و خیرات کے بارہ میں ہے کہ مضر قبیلہ کے چند لوگ حضرت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے بدن تھے چہرے بھوک کی وجہ سے مرجھائے ہوئے تھے فاقہ واضح نظر آ رہا تھا جسے دیکھ کر آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا آپ کبھی گھر میں داخل ہوتے اور کبھی باہر آتے اسی بے چینی میں نماز کا وقت ہو گیا نماز پڑھ لینے کے بعد آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور صدقہ کی ترغیب دی۔ کسی نے دینار کا صدقہ کیا کسی نے درہم کا۔ کسی نے صدقہ میں کپڑے دیئے اور کسی نے گندم اور کسی نے کھجوروں کا صدقہ کیا جس سے آپ کا چہرہ انور خوشی سے چمک اٹھا تو اس موقع پر آپ نے مذکورہ حدیث بیان فرمائی:-

اب دیکھئے کیا صدقہ دینا بدعت ہے۔ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ قرآن و حدیث میں صدقہ کرنے کی فضیلت میں اگنت اور لا ابعاد نصوص وارد ہوئی ہیں کیا نصوص کثیرہ کا نام بدعت حسنہ ہے؟ برز نہیں بلکہ سنت کا معنی بدعت کرنا جہالت یا تحریف معنوی ہے۔

(۲) ما راہ المسلمون حسنا فهو عند الله حس. (جاء الحق ص ۳۰۱)۔

جس کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک اچھا ہے۔

بدعتی حضرات مذکورہ روایت کو بھی اپنے مدعا میں پیش کرتے ہیں مگر اس حدیث کا بھی بدعت

حنہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اولاً: اسے حدیث رسول باور کرانا مفتی احمد یار خان گجراتی کی علم حدیث سے ناواقفی کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ الفاظ رسول اکرم ﷺ کے نہیں ہیں بلکہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ جب تمام صحابہ کرام نے حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت خلافت کی تو اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا تھا کہ یہ بیعت اللہ کے ہاں بھی درست ہے۔ (مستدرک ص ۸ ج ۳)۔

کیا خلافت کی بیعت بدعت ہے جبکہ قرآن و حدیث کے بے شمار دلائل خلافت کے درست ہونے اور بعض واضح احادیث بالخصوص حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت پر شاہد عادل ہیں۔

ثانیاً: المسلمون میں لام تعریف استغراقی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام کو تمام مسلمان اچھا کہیں وہ اچھا ہے ہمارے خیال میں کوئی ایسی بدعت نہیں جس کے حنہ ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوا ہو۔ لہذا یہ اثر تو بدعت کے عدم جواز پر دلالت کرتا ہے۔

ثالثاً: اس قول کے قائل حضرت عبداللہ بن مسعود دین میں ہر قسم کی بدعت کو ناجائز سمجھتے تھے جیسا کہ فرماتے ہیں:

اتبعوا ولا تبتدعوا۔ (دارمی)

تم اتباع کرو اور بدعتی نہ بنو۔

نیز انہوں نے ایک جماعت کو تسبیح، تحمید اور تکبیر کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

لقد جنتم بدعة وظلما۔ (دارمی)۔

تم بدعت اور ظلم لائے ہو۔ لہذا حضرت ابن مسعود کے اس قول سے بدعت حنہ کا وجود کشید کرنا حضرت ابن مسعود کی مراد کے بالکل خلاف ہے۔

(۳) من ابتدع بدعة ضلالة لا يرضاء الله ورسوله كان عليه من الاثم۔ (رواہ الترمذی)

انوار الساطعة ص ۶۹)۔

اس روایت سے بھی اہل بدعت نے بدعت حنہ کا استدلال کیا ہے کہ ناپسندیدہ بدعت قابلِ جرم ہے اور جو ناپسندیدہ نہ ہو وہ درست ہے۔

راقم کہتا ہے یہ استدلال بھی دو وجہوں سے غیر معقول ہے۔

اولاً: تو کوئی بدعت اللہ اور رسول کو پسند نہیں ہے جیسا کہ فرمایا: ”کل بدعة ضلالة“ ہر بدعت گمراہی ہے۔

ثانیاً: بدعتی کو کیسے معلوم ہوگا کہ میری یہ بدعت اللہ اور رسول کو پسند ہے اگر وہ اپنے گمان سے اس بدعت پر اللہ اور رسول کی رضا صادر کرے گا تو یہ اللہ اور رسول پر افتراء ہوگا کیونکہ اسے اللہ اور رسول کی رضا کا تو علم نہیں ہے۔ جب تک وہ خود اپنی رضا کا اظہار نہ کریں تو وحی کے منقطع ہو جانے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس کا علم ہونا ممکن ہی نہیں۔

ثالثاً: یہ روایت ہی غیر معتبر ناقابل اعتماد اور حجت کے لائق نہیں ہے اس لئے کہ اس کی سند اتنی گری ہوئی ہے کہ جس سے اس روایت کے من گھڑت ہونے کا شائبہ پڑتا ہے کیونکہ اس سند کے بعض راوی ایسے ہیں جن پر محدثین نے سنگین قسم کی جرح کی ہے۔

(۱) کثیر بن بعد اللہ راوی امام شافعی اور ابوداؤد فرماتے ہیں: جھوٹ کا رکن ہے۔ دارقطنی فرماتے ہیں: متروک ہے۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں: اس کے پاس عن ابیہ عن جدہ کا نسخہ من گھڑت ہے اور مذکورہ روایت بھی عن ابیہ عن جدہ ہے۔ (میزان الاعتدال ص ۴۰۷ ج ۲)۔

معلوم ہوا کہ یہ روایت من گھڑت نسخہ والی ہے جو خود من گھڑت ہے۔

(۲) دوسرا راوی مردان بن معاویہ مدلس ہے۔ (تقریب ص ۲۳۲)۔

لہذا جب یہ روایت ہی قابل اعتماد نہیں تو اس سے استدلال پکڑنا بھی درست نہیں ہے بالخصوص جبکہ یہ روایت پہلے ذکر شدہ صحیح احادیث کے معارض اور مخالف بھی ہے۔

(۴) حضرت عمرؓ نے نماز تراویح کی باجماعت ادائیگی کو دیکھ کر فرمایا تھا: ”نعت البدعة“۔

لہذا معلوم ہوا کہ بدعت اچھی بھی ہوتی ہے۔

راقم کہتا ہے یہ استدلال تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے وہ ایسے کہ نماز تراویح کی جماعت خود رسول اللہ ﷺ نے تین دن تک کرائی تھی پھر اس کے فرض ہونے کے اندیشہ سے جماعت کو ترک کر دیا تھا کیا ہم سنت رسول کو بدعت کہہ سکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نماز تراویح کی احیاء پر بدعت کا لفظ محض اس کے دوبارہ احیاء پر بولا تھا کہ جس کا م کا ایک عرصہ ترک رہنے کے بعد ہم نے اہتمام کیا ہے وہ اچھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک

یہاں بدعت کا لفظ شرعی اصطلاح کے لیے نہیں تھا بلکہ لغوی معنی میں تھا۔
اگر اہل بدعت اس کو لغوی معنی میں نہ بھی مانے تو پھر بھی ان کو حضرت عمرؓ کا مذکورہ فرمان فائدہ مند نہیں ہے وہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:۔

علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المهديين. (ترمذی).
کہ تم پر میری سنت اور خلفاء راشدین جو ہدایت یافتہ ہیں کی سنت لازم ہے۔
حضرت عمرؓ کے خلیفہ راشد ہونے کا کسی مسلمان کو انکار نہیں ہے اور پھر رسول اللہ ﷺ نے
حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا نام لے کر فرما دیا تھا۔

اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر وعمر. (ترمذی)
”تم میرے بعد ابوبکر و عمر کی اقتدا کرنا“

از روئے شریعت جب ان دونوں کی اقتداء پر نص موجود ہے تو ان کا امر و فعل بدعت کیسے ہو
سکتا ہے بدعت تو وہ ہے جس پر شرعی دلیل موجود نہ ہو جب تراویح کی امامت اور حضرت عمرؓ کی
اقتداء پر رسول اللہ کا فعل اور امر موجود ہے۔

(۵) قرآن کی کتابت وغیرہ

اہل بدعت اپنے مطلب میں قرآن کریم کی کتابت کو بھی دلیل بناتے ہیں کہ یہ بھی رسول اللہ
ﷺ کے بعد ہوئی ہے لہذا بدعت ہے۔

راقم کہتا ہے یہ دلیل بھی ان کے حق میں مفید نہیں ہے وہ اس لیے کہ قرآن کریم کی کتابت خود
رسول اللہؐ نے کروائی تھی اور اس کے لیے نہایت ثقہ کاتبوں کی ایک جماعت موجود تھی۔ مگر یہ کتابت
منتشر تھی جسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دوبارہ لکھوا کر یکجا کر دیا تھا جس کی تفصیل حدیث کی تمام معتبر
کتابوں میں موجود ہے۔

ثانیاً: قرآن کی کتابت اور تدوین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں سے ہوئی جن کی سنت کی
پیروی اور ان کی اقتداء کا حکم خود رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا جیسا کہ نمبر ۳ میں گزر چکا ہے لہذا یہ کام
بھی بدعت کے زمرہ میں نہیں آتا۔

قرآن پر اعراب

بعض حضرات کا خیال ہے کہ قرآن پر اعراب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے لگائے گئے تو اس اعتبار سے یہ کام بھی بدعت نہیں کیونکہ یہ کام بھی خلیفہ راشد کے ہاتھوں ہوا ہے مگر اکثر کی رائے ہے کہ

قرآن کریم پر اعراب حجاج بن یوسف نے لگوائے تھے لہذا یہ بھی بدعت ہے۔

راقم کہتا ہے کہ حجاج کے دور میں بہت سے صحابہ کرام بقیہ حیات تھے اگر یہ کام بدعت ہوتا تو صحابہ کرام ضرور اعتراض کرتے مگر کسی ایک نے اس پر اعتراض نہیں کیا گویا کہ یہ اجماع ہے۔ یہ تھا اہل اصول کے بقول اجماع خود حجت شرعیہ ہے۔

ثالثاً: اعراب کو بدعت قرار دینا محض جہالت ہے کیا رسول اللہ ﷺ قرآن کریم کو بغیر اعراب کے پڑھتے تھے؟ ایسا قطعاً نہیں کیونکہ اعراب کے بغیر تو کوئی عبارت پڑھی نہیں جاسکتی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی قرأت اور بعض آیات کے اعراب کی وضاحت احادیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ حجاج نے تو صرف یہ کیا تھا جس طرح رسول اللہ ﷺ قرآن کو پڑھتے اسے ضبط کر دیا۔ یہ جو لوگ اصول قرأت سے واقف نہیں وہ بھی قرآن کریم کی تلاوت میں دقت محسوس نہ کریں کیا رسول اللہ ﷺ کی قرأت کو مدونہ صورت دے دینا بدعت ہے پھر جب کہ کسی ایک نے اس فعل پر نکیر بھی نہ کی ہو۔

یہ وہ دلائل تھے جو بدعتی حضرات اپنے موقف میں پیش کرتے ہیں مگر آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ ان دلائل میں کوئی ایک دلیل بھی ان کے موقف پر پوری نہیں اترتی لہذا بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ کی طرف اضافی تقسیم ہے بذات خود بدعت ہے۔

دین الحق کا دوسرا حصہ قارئین کرام کی پیش خدمت ہے یہ جاء الحق کے اس حصے کا جواب ہے جو بدعات سے بھرا ہوا ہے اس کے مولف مفتی احمد یار خان نے دل بھر کر بدعات کی ترجمانی کی ہے اور اپنے طائفہ میں اس کا حق ادا کر دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدعات کی ایجادات کے علاوہ کوئی اور مشغلہ ہی نہیں کیونکہ اہل بدعت کی نظر میں بہت سے خیر کے امور شریعت نے نامکمل چھوڑے ہیں جن کی تکمیل کا حق ان حضرات کو حاصل ہے وہ جب چاہیں اپنی طرف سے کوئی بدعت جاری کر کے اس کو خالص دین میں داخل کر لیں آخر انہوں

نے اپنی مذمومہ شریعت کو مکمل کرنا ہے انا للہ وانا الیہ رجعون

اللہ تعالیٰ مولانا محمد داؤد ارشد حفظہ اللہ کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر سے نوازے کہ انہوں نے دین الحق لکھ کر اس طائفہ کی معروف بدعات کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اور کتاب وسنت کے دلائل اور سلف صالحین صحابہ کرام و تابعین عظام کے عمل سے ان بدعات کا پوسٹ مارٹم کر دیا ہے اور دین مصطفیٰ کی حتی المقدور حفاظت کا فریضہ سرانجام دیا ہے دین الحق ایک نہایت مضبوط علمی کاوش ہے جس میں مولف نے چونکہ چنانچہ سے کام لینے کی بجائے اپنی تحقیق کی بنیاد کتاب وسنت کے نصوص واضح پر رکھی ہے اور طائفہ بریلویہ کے بدعات کے جوہر میں ایک ایک حیلے کے کئی کئی جوابات تحریر کئے ہیں جس سے مولف کی وسعت علمی اور سنت سے محبت اور شفقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

موصوف نے بدعات کے رد میں کوئی چلک اور نرمی پیدا نہیں کی بلکہ بیباک اور بے لاگ تبصرہ کیا ہے اور سنت کے دفاع اور دین خالص کے تحفظ میں اپنی غیرت ایمانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دین الحق کی دوسری جلد کے مطالعہ سے قارئین کرام محسوس کریں گے کہ مفتی احمد یار خاں کی پارٹی بدعات کے جواز میں کن حدود کو پھلانگ چکے ہیں اور مولانا محمد داؤد ارشد نے ان کی بدعات کے سامنے کتاب وسنت کے نصوص کا کتنا مضبوط بند باندھ دیا ہے بلاشبہ ان کی یہ کاوش بدعات کے رد اور کتاب وسنت کے دفاع میں سنگ میل ثابت ہوگی۔ فجزاہ اللہ عناد عن سائر المسلمین اللہ کریم سے دعا ہے کہ موصوف کی اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے اور اس کو حق و باطل کے مابین حد فاصل بنادے آمین الہ العالمین۔

کتبہ

ابوانس محمد یحییٰ گوندلوی

مدیر جامعہ تعلیم القرآن والحديث ساہووالہ سیالکوٹ

۲۹ / اپریل ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ عصر استاذ العلماء حضرت حافظ ثناء اللہ الزاہدی حفظہ اللہ تعالیٰ جامعہ اسلامیہ صادق آباد، کاتبصرہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسول الله وعلى آله وأصحابه

أجمعين. اما بعد:

اسلامی معاشرہ شروع سے ہی دو طرح کے طبقات (حزب اللہ اور حزب الشیطان) پر منقسم رہا ہے کتاب و سنت کے داعی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سرگرم عمل ہیں اور شرک و بدعت کی داعی جماعتیں بھی شرک و بدعت کی ترویج میں کوشاں ہیں اسی سلسلہ کی کاوشوں میں سے ایک کاوش کتاب (جاء الحق) بھی ہے جو کہ مفتی احمد یار مجبڑی کی تالیف کردہ ہے اس میں بریلوی فرقہ کی رسوم و بدعت کو اسلامی بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کئی سالوں سے یہ کتاب مطبوعہ حالت میں لوگوں کے ہاں زیر مطالعہ ہے ضرورت تھی کہ اس کتاب کے مسائل بدعت و شرک کی عوام الناس کے سامنے حقیقت واضح کی جائے تاکہ لوگ اصل اسلامی عقائد و عبادات سے واقف بھی ہوں اور عمل پیرا ہو کر اسلامی خوشنودی اور محبت اور جنت جیسی گراں قدر نعمتوں سے مشرف ہوں اللہ تعالیٰ نے اس خدمت عظیم کی توفیق ہمارے فاضل دوست مولانا داود ارشد صاحب کو عطا فرمائی جنہوں نے دین حق کے نام سے موسوم کتاب میں مفتی صاحب کی بدعت کو سنت بنا کر پیش کرنے کی ساری کاوشوں کو عیاں کیا اور کتاب و سنت رسول ﷺ سے تمام بدعات اور شریکات کا انتہائی سلجھے ہوئے علمی انداز سے رد کیا ہے اللہ تعالیٰ انکی اس خدمت کو قبول و منظور فرمائے اور آخرت میں ذریعہ نجات بنائے آمین۔

عوام الناس سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس کا ضرور مطالعہ کریں اور اپنے عقائد و عبادات کو کتاب و سنت کے مطابق ادا کرنے کی کوشش کریں کہ یہی ذریعہ نجات ہے۔

اللهم تقبل حسناتنا واعف عنا سيئاتنا ووفقنا الى الذي نحبه وترضاه (آمین)۔

کعبہ العباد المقیم الی اللہ

حافظ ثناء اللہ الزاہدی

۱۴۲۱/۸/۱۴ھ

صادق آباد

حافظ عبدالغفار روپڑی حفظ اللہ، مدیر تنظیم اہل حدیث کا تبصرہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد:

بریلوی مکتبہ فکر کے حکیم الامت مفتی اعظم احمد یار گجراتی جو کہ قرآنی آیات کی تحریف میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے آیت فویل للذین یکتبون الکتاب بایدہم ثم یقولون ہذا من عند اللہ لیشر و ابہ ثمنا قليلا، کا مصداق ہے نے بریلوی شریعت پر ایک ضخیم کتاب جاء الحق و زهق الباطل نامی تحریر کی جو کہ امت بریلویہ کے نزدیک انتہائی اہمیت کی حامل ہے یہی وجہ ہے کہ امت بریلویہ کے واعظین و خطباء و مفتیان عظام کا مبلغ علم اور معیار تحقیق یہی کتاب ہے جس میں شکم پرور مسائل قل دسواں چالیسواں کے علاوہ دیگر بدعات پر طبع آزمائی کی گئی اور خرافات ہفوات کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب و سنت کے واضح نصوص کی تحریف کر کے شریعت مطہرہ کے صاف و شفاف پانی میں بدعات و رسومات کے گڑ کا پانی ملانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اس لئے وہ ہر دور میں اپنے دین کی حفاظت اور دفاع کیلئے اپنے مقرب بندوں میں سے بعض کو مقرر کر دیتا ہے جو اپنی ذمہ داری سے لمحہ بھر بھی غافل نہیں ہوتے۔

لہذا مالک کائنات نے جس طرح میدان بدر میں باطل کو شکست و ریخت سے دوچار کرنے کیلئے معوذ اور معاذ کو منتخب کیا اسی طرح بدعات و خرافات کے قلمی قلعہ جاء الحق کو مسار کرنے کیلئے کائنات نے ہمارے فاضل دوست مولانا محمد داود ارشد کو منتخب کیا جنہوں نے دین حق کی تلوار سے باطل کے ایک قلعے کو زمین بوس کر کے بعد میں بدعات کے مورچوں پر دین حق فی تقید جاء الحق میں دلائل و براہین کی ایسی بمباری کی ہے جس میں جاء الحق و زهق الباطل کا حقیقی نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے فاضل دوست نے ان تھک محنت و کوشش کر کے مختلف کتب میں بکھرے ہوئے جواہر پاروں کو جمع کر کے دین حنیف کا دفاع کیا ہے اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائے اور دین حق کے اسی دوسرے حصے کو عوام و خواص میں پہلے حصے کی طرح مقبول عام کرے اور مؤلف کیلئے توشہ آخرت بنائے (آمین)

عبدالغفار روپڑی

وکیل صحابہ پاسبان مسلک علمائے دیوبند حضرت مولانا عبدالرؤف فاروقی کا تبصرہ

بسم اللہ تعالیٰ

شرک اور بدعات کی علم اور دلائل کے ساتھ تردید توحید و سنت کے ساتھ اعتقادی اور عملی محبت کی دلیل ہے اور اس سلسلے کا آغاز خود اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے کیا، صحابہ رضوان علیہم اجمعین نے اس سلسلہ میں انتہائی حمیت دین کا ثبوت دیا اور اپنے یہاں شرک و بدعات کے مراسم کو کسی صورت برداشت نہیں کیا، ائمہ و علماء نے ہر دور میں اس سلسلے کا تحفظ کیا اور اسے آگے بڑھایا یہاں تک کہ ہر طرح کی تکالیف و آلام کو برداشت کر کے بھی اس سلسلے کو قائم رکھا۔ دعوت و دعوت کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

برصغیر میں علاقائی و قبائلی رسومات کو جن میں ایک بہت بڑا حصہ ہندو و مجوس کے مذہبی و اعتقادی شعائر سے متعلق تھا، مذہب کا درجہ دے کر انہیں باقاعدہ بدعات کی شکل دینے کی ”خدمت“ بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والے مذہبی رہنماؤں نے سرانجام دی۔ یہ یہود و نصاریٰ کی خدمت تھی اور اس سے مشرکانہ مذاہب اور اسلام دشمن تحریکوں کا کام بہت آسان ہو گیا، یہ دراصل اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوششوں کا حصہ تھا اور بریلوی مسلک کے کچھ لوگ شعوری طور پر اس سازش کا حصہ بنے تو کچھ لوگ اس سلسلے میں استعمال ہو گئے۔

جناب احمد رضا خان بریلوی جہاں تکلیف مسلمانوں کے سلسلہ میں سرخیل بلکہ موجد ہیں وہاں بدعات کو رواج دینے اور اعتقادی و عملی شرک کی راہیں کھولنے اور ان کے لئے قرآن و حدیث میں تحریف کے درجے کی تاویلات کر کے عظیم قومی و مسلکی جرم کے مرتکب ہوئے ہیں اور پھر تعصب و عناد نے ان کے اتباع کو اپنی زندگیاں اور زندگی کی تمام تر توانیاں اسی ہدم اسلام کے لیے محنت میں صرف کرنے کی راہ پر لگا دیا۔

اللہ تعالیٰ بھلا کرے اُن علماء کرام کا جنہوں نے بدعات کی تردید میں وقت کا فرض ادا کیا اور تاریخ دعوت و غربیت میں اپنا کردار بڑی ہی خوش اسلوبی سے ادا کیا ان کی ساعی جمیلہ اور علمی خدمات نے جہاں اسلام کا حقیقی چہرہ مسلمانوں کے سامنے روشن رکھا ہے وہاں دلائل کی قوت سے مبتدعین کے تعاقب میں ہر میدان میں مبتدعین کو رسوا کیا ہے، توحید و سنت کی حفاظت کے لیے علم و دلائل کے اعتبار سے کام کرنے، اسلام کے روشن چہرے کو نکھارنے اور مبتدعین کو دلائل و علم کے میدان میں راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کرنے والوں کی جب فہرست یا تاریخ برتر ہوگی تو یقیناً ان میں حضرت مولانا محمد داؤد ارشد صاحب کا نام ایک محقق، غیرت مند عالم دین اور توحید و سنت کے ایک رضا کار کے طور پر درج کیا جائے گا۔

مولانا محمد داؤد ارشد نے بدعات کو قرآن و حدیث میں علمی خیانت اور معنوی تحریف کر کے سہارا

دینے والے ایک دینی مجرم مفتی احمد یار گجراتی کا جس انداز سے تعاقب کیا ہے اور اس کی کتاب ”جاء الحق“ کا استدلال کی جس قوت سے ابطال کیا ہے اس پر وہ پوری سنی قوم کی طرف سے ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں۔

میں نے اُن کی تقریبات و صفحات پر مشتمل کتاب ”دین الحق فی تنقید جاء الحق“ کے بعض اہم حصوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ ایک خاموش مجاہد اسلام کی عظیم کوشش ہے اور اس کا انداز انتہائی منفرد اور جاندار ہے، مولانا محمد داؤد ارشد نے قرآن، حدیث، نقایس فقہی کتب اور چودہ سو سالہ دینی و علمی کام سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی کتاب کو ناقابلِ تنحییر بنایا ہے۔

میں دل کی گہرائیوں سے ان کی اس خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے علماء اور عامۃ المسلمین میں اس کی قبولیت کے لیے دعا گو ہوں۔ ساتھ ہی ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ”بریلویت“ مستقل ایک مکتبہ فکر کا نام ہے اس کے مقاصد۔ نصب العین، سوچ کا انداز، استدلال کا طریق کار کام، اور علمی فکری اور عملی اعتبار سے اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال سے متصادم ایک اپنا جداگانہ طرز فکر ہے۔ اس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں محض مقاصد کے حصول کی خاطر برصغیر کے اکثریتی فقہی مسلک کا لبادہ اوڑھ کر اور اس نام کو استعمال کر کے اس نے اپنے مقاصد

حاصل کرنے اور اپنے معتقدات کو عامۃ المسلمین میں رواج دینے کا پر فریب انداز اختیار کیا۔ لہذا بریلویت کو حقیقت سے جدا کر کے حقیقت کو اس کے بنیادی علمی سرچشموں اور بریلویت کو اس کے طرز استدلال سے اگر جاننے کی کوشش کی جائے تو دونوں کے درمیان موجود زمین و آسمان کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

آخر میں پھر میں حضرت مولانا محمد داؤد ارشد کی اس علمی خدمت پر اُن کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اتباع سنت سے نوازیں اور بدعات سے نہ صرف اجتناب بلکہ ان کی تردید کے لیے محنت کرنے کی توفیق سے نوازے۔

عبدالروف فاروقی۔

۶ محرم ۱۴۲۱ھ

فاروقی صاحب کا تبصرہ اور کتاب سے اتفاق صرف اور صرف بدعات اور اس کے متعلقہ مضامین سے ہے طلاقِ ثلاثہ اور اس ضمن میں دیگر مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند ہیں

محمد داؤد ارشد

۳۰ رمضان ۱۴۲۱ھ

۲۷ دسمبر ۲۰۰۰ھ

۱۲- پوہ ۲۰۵۷



مقدمہ دین الحق

از رشحات قلم:

الشیخ حافظ عبدالرشید اظہر حفظہ اللہ تعالیٰ

اسلام آباد

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

بنی نوع انسان میں اختلاف و تفاوت ایک مسلمہ حقیقت اور امر واقع ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں میں جاری و ساری سنت۔ جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں یہ اختلاف خلقت، خلق اور عقل و فکر اور نظر و استدلال ہر طرح کا ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا، اسکی بنیاد پر دنیا میں فساد برپا کرنے سے پرہیز کرنا، اس نوعیت کا فساد کہیں رونما ہو جائے تو سلیقے کے ساتھ اسے ختم کرنے کی کوشش کرنا یا ادب و احترام کے ساتھ اس سے بچ نکلنا اسلامی آداب و اخلاق کا حصہ اور رضا بالقضاء کا تقاضا ہے۔ رنگ و نسل، تہذیب و ثقافت، علاقہ و زبان اور شعوب و قبائل کے اختلاف کی وجہ سے چشم فلک نے انسانوں میں احقناہ قتل و غارت گری اور ہلاکت و بربادی کے ایسے بدترین مناظر دیکھے کہ الامان والحفیظ۔

شہ زوری و کم زوری کے اختلاف کی وجہ سے انسانوں نے اپنے جیسے ذی شعور و مجبور انسانوں پر جو تسم ڈھائے اس کے تصور سے ہی رو گئے کھڑے ہوتے ہیں اور اس کی حکایت و روایت انسانی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ مالی تفاوت کی وجہ سے آجر و آجیر اور غنی و فقیر کے مابین حسد و بغض اور نفرت کی جڑیں بڑی لمبی اور گہری ہیں۔ باوجودیکہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں مگر قضاء و قدر پر عدم اعتماد اور توفیق الہی سے محرومی انہیں باہم قریب نہیں ہونے دیتی اور انہیں پروردگار کی تقسیم و تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنے دیتی۔

مقام رسالت

وحی و رسالت اور نبوت کا سلسلہ بندوں پر اللہ رب العزت کی بڑی مہربانی اور کرم نوازی ہے جس کے ذریعے اس نے حقوق و فرائض کا تعین فرما دیا اور حدود و قیود واضح کر دیں۔ انسانیت کو ظلم و ظلمت سے نکال کر عدل و انصاف اور نور و ہدایت سے سرفراز فرما دیا۔ بندوں کو انکے اختیاری افعال و اعمال کے انجام خیر و شر سے آگاہ فرما کر انہیں روشن راہ دکھادی تاکہ وہ ظاہری لذت یا مشقت کو نظر انداز کر کے انجام کار کو مد نظر رکھیں۔ کہ یہی عین سعادت و بصیرت ہے۔

قد افلح من ترکى و ذکر اسم ربہ فصلی بل تؤثرن الحیة الدنیا والآخرۃ
خیر و ابقی (۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ / الأعلى)

بے شک اس نے فلاح پائی جو پاک ہوا اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا مگر تم دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔
ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت و انزلنا معهم الکتاب و المیزان ليقوم الناس
بالقسط الاية ۲۵ الحديد).

ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں دیکر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (قواعد عدل) تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اور فرمایا: اللہ الذی انزل الکتاب بالحق و المیزان الخ (۱۷ الشوری).

اللہ ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی اور ترازوئے عدل و انصاف۔
اور فرمایا۔

ان هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم و یشیر المؤمنین الذین یعملون
الصالحات ان لهم اجرا کبیرا (۹ . بنی اسرائیل).

بے شک یہ قرآن وہ رستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

اور فرمایا فاصبر إن العاقبة للمتقين . (۴۹ ہود)

یہ ارشاد و توجیہ اور راہ حق کی نشاندہی اللہ کا اپنے بندوں پر فضل خاص اور اتمام نعمت ہے۔ اور علیم و حکیم ذات کی طرف سے ظلم و جہول انسان کی دہگیری ۔

یرید الله أن يخفف عنكم و خلق الانسان ضعيفا (۲۸ . النساء)

دنیا میں انسانوں کے مابین اس عظیم الشان نظام عدل و انصاف کے قیام ، اختلافی امور میں فیصلہ کرنے اور سلیقہ سکھانے اور حقوق و فرائض کے تعین کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایسی نادرہ روزگار اور ذی وقار شخصیات کا انتخاب فرمایا جو ہر قسم کے عیوب سے مبرا ، انگشت نمائی سے بالاتر طمع و لالچ اور ذاتی مفادات سے پاک امانت و دیانت اور تبلیغ رسالت میں اپنی مثال آپ تھیں ان کا وجود مبارک سراپا ہدایت انکی سیرتیں منارہ نور ، انکی تعلیم اور پیغام نور علی نور تھا۔

فرمایا :

الر ☆ کتاب انزلناه الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور باذن ربهم

الی صراط العزیز الحمید (۱ . ابراہیم)

یہ ایک کتاب ہے اس کو ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ ان کے پروردگار کے حکم سے (یعنی) غائب اور قابل تعریف ذات کے رستے کی طرف۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا أن أخرج قومک من الظلمات الی النور و ذکرهم

بایام الله ان فی ذلک لآیات لكل صبار شکور (۵ . ابراہیم)۔

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ اور ان کو اللہ کے دن یاد دلاؤ اس میں ان لوگوں کیلئے جو صابر و شاکر ہیں۔ (قدرت الہی کی) نشانیاں ہیں۔

وحی کا انکار بد نصیبی ہے

مگر اس رحمت و عنایت الہی کے باوجود حیوانیت اور بہیمیت سے مغلوب اور بدنصیب انسان بھی

وسرکشی کا شکار ہوا دنیا کی محبت میں اندھا ہو کر اپنے لئے ہدایت کی بجائے ہلاکت کا سامان کر بیٹھا۔
 وویل للکافرین من عذاب شدید ☆ الذین یستحبون الحیوة الدنیا علی الآخرة
 و یصدون عن سبیل اللہ و یبغونها عوجا ☆ اولئک فی ضلل بعید (ابراہیم ۲-۳)
 اور کافروں کیلئے سخت عذاب کی ہلاکت ہے جو آخرت کی نسبت دنیا کو پسند کرتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کے رستے سے روکتے اور اس میں کجی چاہتے ہیں یہ لوگ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔

حق و ہدایت کی راہ سے ہٹے ہوئے انسان نے خلق، خلقی اور طبعی اختلاف کے ساتھ فکری و نظری اور حق و باطل کے اختلاف کا بھی اضافہ کر لیا۔

حق واضح ہے۔ صراط مستقیم روشن ہے، دین میں کوئی کمی ہے نہ اس کی دعوت و تبلیغ میں کوئی کوتاہی بلکہ اس میں دلوں میں راہ پانے کی کھل صلاحیت ہے مگر بدنصیب لوگوں کے دلوں پر مہریں کانوں میں ڈاٹ اور آنکھوں پر پردے ہیں اور وہ ازلی شقاوت کا شکار ہیں۔

حتم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم و علی أبصارہم غشاوة (البقرة: ۷)
 فرمایا: ولو شاء ربی لجعل الناس امة واحدة ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک
 ولذلك خلقہم و تمت کلمة ربک لأملن جہنم من الجنة و الناس أجمعین (ہود: ۱۱۸-۱۱۹)

اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا، لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔ مگر جن پر تمہارا پروردگار رحم کرے اور اسی لئے تو اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور تمہارے پروردگار کا قول پورا ہو گیا کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

نیز فرمایا: فہدی اللہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنه و اللہ یرہدی من یشاء الی صراط مستقیم (۲۱۳ البقرة)

پس اللہ نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس حق کی راہ دکھا دی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔

نیز فرمایا: ولو شاء اللہ ما اقتتل الذین من بعدہم من بعدما جاء تہم البینت ولكن اختلفوا فمنہم من آمن و منهم من کفر. ولو شاء اللہ ما اقتتلوا ولكن اللہ یفعل ما یرید

(۲۵۳ / البقرة)

اور اگر اللہ چاہتا تو ان سے پچھلے لوگ اپنے پاس کھلی نشانیاں آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہی رہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ باہم جنگ و قتال نہ کرتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

نیز فرمایا: وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يَدْخُلُ مِنْ يَشَاءَ فِي رَحْمَتِهِ (الآية-۸ الشوری)

اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو ایک ہی جماعت کر دیتا لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔ اور فرمایا: وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بِنِهَايَةِ الْآيَةِ ۝ ۱۲۰ / (الشوری)

و عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایم اللہ ترکتکم علی البیضاء لیلھا و نھا رہا سواء۔ (ابن ماجہ)۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم میں تم لوگوں کو روشن شریعت پر چھوڑ کر جا رہا ہوں جہاں (روشنی کی وجہ سے) دن رات برابر ہیں۔
بد نصیب گروہوں اور گمراہ قوموں کے اس بے جا اختلاف و شقاق بے دلیل بحث و جدال اور بے مقصد عناد و فساد کے قرآن حکیم نے متعدد اسباب ذکر کئے ہیں۔

انکار نبوت و رسالت کے اسباب

۱۔ منصب نبوت و رسالت کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کے انتخاب و اختیار اور منشاء و مشیت پر اعتراض حالانکہ وہ قادر و مطلق ہے جسے چاہے اپنے فضل خاص اور رحمت سے نوازے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلوق کے مختلف افراد کو متعدد امور میں اختصاصات سے نوازا ہے۔
مثلاً صحت و توانائی، جسمانی ذیل و ذل، فکر و فہم، مال و دولت اور حکومت و سلطنت وغیرہ کے بارے میں قسام ازل کے فیصلے قبول ہیں تو اگر اپنے کچھ بندوں کو اس نے نبوت و رسالت اور وحی کیلئے منتخب فرمایا اور ان کے ذریعے اپنی مخلوق کی فلاح و صلاح کا کام لے لیا اور لوگوں پر حجت قائم کر دی تو یہ بھی اس کا حق ہے کہ وہ حکیم و علیم، متفکر کل اور فعال لما یرید ہے۔

نظام کائنات، انسانوں کے باہم تفاوت اور سنیہ اللہ پر ذرا غور کرنے سے یہ حقیقت سہولت سمجھ آ جاتی ہے کہ انبیاء و رسل کا انتخاب و اختیار اس ذات وحدہ لا شریک لہ کا ہی حق ہے۔ اس نے جسے چاہا اس اعزاز و اکرام سے نوازا دیا اور انکی پاکیزہ زندگیوں اس حسن انتخاب کی بہترین دلیل ہیں علیہم صلوات اللہ وسلامہ۔

فرمایا: اللہ یصطفیٰ من الملائکۃ رسلا و من الناس ان اللہ سمیع بصیر (۷۵ الحج)
اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کر لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

نیز فرمایا: رسلا مبشرین و منذرین لئلا یكون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل
وكان اللہ عزیزا حکیمًا (۱۶۵ النساء)

رسولوں کو (اللہ نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ پر الزام کا موقع نہ رہے۔ اور اللہ غالب و حکمت والا ہے۔

نیز فرمایا: و ربک یخلق ما یشاء و یختار ما کان لہم الخیرۃ الآیۃ (۶۸/ القصص)
اور تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) برگزیدہ کر لیتا ہے انکو اس کا اختیار نہیں، و قالوا لو لا نزل هذا القرآن علی رجل من القرینین عظیم ☆ اہم یقسمون
رحمۃ ربک ☆ (الآیۃ ۳۱، ۳۲ / الزخرف)

اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟

کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟

۲۔ کچھ لوگ ضد و عناد اور حسد کا شکار ہو گئے، انہیں اپنا جاہ و جلال اور منصب و اقتدار خطرے میں محسوس ہونے لگا ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نے انبیاء و رسل اور ان پر آنے والی وحی و رسالت کو تسلیم کر کے انکی تصدیق کر دی تو لوگ ہمیں چھوڑ کر انکو اپنا لیں گے، وہ بیوقوف اپنے ہوا پرستی، حسد و بغض اور عناد کو چھپا بھی نہ سکے بلکہ اپنی زبانوں سے اپنے خلاف حجت قائم کر کے حماقت کا اظہار کر دیا۔

و اذا جاء تہم آیۃ قالوا لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللہ ، اللہ اعلم

حيث يجعل رسالته (۱۲۳ / الانعام).

اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ جس طرح رسالت اللہ کے رسولوں کو ملی ہے جب تک اسی طرح کی رسالت ہم کو نہ ملے ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ اس بات کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ کہ رسالت کسے عنایت فرمائے۔

اور جب حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰات والتسلیمات وحی ورسالت سے سرفراز ہو کر فرعون کے پاس گئے اس کا جواب بھی کچھ اسی نوعیت کے تکبر و خود پسندی اور بے جا اعتراض اور ہٹ دھرمی پر مبنی تھا۔

و نادى فرعون فى قومہ قال يا قوم اليس لى ملك مصر و هذه الانهار تجري من تحتى افلا تبصرون ☆ أم انا خير من هذا الذى هو مهين ولا يكاد يبين ☆ فلو لا القى عليه أسورة من ذهب أو جاء معه الملائكة مقترنين ☆ (الزخرف / ۵۱ - ۵۳)

اور فرعون نے اپنی قوم کو پکار کر کہا اے قوم کیا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے (مخلو کے) نیچے بہہ رہی ہیں (میری نہیں ہیں) کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ بے شک میں اس شخص سے جو کچھ عزت نہیں رکھتا اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا بہتر ہوں۔ تو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہ اتارے گئے۔ یا (یہ ہوتا کہ) فرشتے جمع ہو کر اس کے ساتھ اترتے۔

ایسے ہی خاتم النبیین سیدنا و سید الاولین والآخرین جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے نبوت و رسالت کی خلعت فاخرہ زیب تن کی جو وجود اطہر کیلئے اس قدر موزوں اور مناسب تھی کہ انگشت نمائی کی کوئی گنجائش نہ تھی اور لوگوں کو دین حق کی دعوت دی دلائل و براہین اور معجزات سے اپنے دعویٰ نبوت و رسالت کو ثابت کر دیا مخالفین کے پاس کہنے کو جب کچھ بھی نہ رہا تو صفا دید قریش اور کفار مکہ نے بھی وہ ہی پرانی بات کی کہ نبوت و رسالت جیسے عظیم منصب کے لئے آخر اللہ نے اس یتیم کا انتخاب کیوں کیا نہ مکہ و طائف کے کسی عظیم شخص پر یہ عنایت کیوں نہ ہوئی۔

و قالوا لو لا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم . أهم يقسمون رحمت ربك نحن قسمنا بينهم معيشتهم فى الحياة الدنيا و رفعنا بعضهم فوق بعض درجات ليتخذ بعضهم بعضا سخريا و رحمت ربك خير مما يجمعون (۳۱-۳۲ الزخرف)

اور کہنے لگے یہ قرآن ان دونوں بستیوں (مکہ و طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔ کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت بانٹتے ہیں ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں بانٹ دیا ہے۔ اور ایک دوسرے پر درجے بلند کئے۔ تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔ اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تیرے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے۔

انکار رسالت کا تیسرا سبب - بشریت انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام

انبیاء و رسل اور ان کی اقوام و ملل کے مابین سب سے زیادہ متنازع فیہ مسئلہ انبیاء کی بشریت تھا انہیں اپنی وحی رسالت کی طرف حاجت و ضرورت کا بھی اعتراف تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اختیار و انتخاب پر بھی ان کا ایمان تھا مگر انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی کہ یہ مقام و مرتبہ اولادِ آدم میں سے کسی ان جیسے بشر کو بھی حاصل ہو سکتا ہے انکا خیال تھا یہ مقام ملائکہ کے شایانِ شان ہے۔ انکا خیال تھا کہ بشریت مقام رسالت کے منافی ہے کہ انسان کی روح جس قدر بھی شفاف ہو۔ اس کی قوت فہم و ادراک جس قدر بلند و بالا ہو جائے اور نفس انسانی جتنے بھی مقامات سلوک سر کر لے، کبھی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ فیوض و برکات الہیہ کے نزول کا مرکز اور وحی و رسالت کا اہل بن سکے ان کی نظر میں انسانیت بہر حال اس سے احقر ہے کہ اسے مقام نبوت پر فائز کیا جاسکتا ہے۔

فقال الملائۃ الذین کفروا من قومہ ما نراک الا بشرا مثلاً ومانراک **اتبعک** الا الذین

ہم آراؤنا بادی الرأی ومانری لکم علینا من فضل بل نظنکم کاذبین (ہود : ۲۷)

تو ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ ہم تم کو اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی ان ہی لوگوں نے کی ہے جو ہم میں ادنیٰ درجے کے ہیں اور وہ بھی رائے ظاہری سے اور ہم تم میں اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

کذبت ثمود بالنذر فقالوا أبشرا منا واحدا نتبعه انا اذا لفی ضلل و سعراً ألقى الذکر علیہ من بیننا بل هو کذاب أشراً (سورة القمر آیت ۲۳، ۲۴، ۲۵)

ثمود نے بھی ہدایت کرنے والوں کو جھٹلایا اور کہا کہ بھلا ایک آدمی جو ہم ہی میں سے ہے، ہم انکی پیروی کریں یوں ہو تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں پڑ گئے۔ کیا ہم سب میں سے اسی پر وحی نازل

ہوئی ہے (نہیں) بلکہ یہ جھوٹا خود پسند ہے۔

و ما قدروا الله حق قدره اذ قالوا ما انزل الله على بشر من شيء قل من انزل الكتاب
الذى جاء به موسى نورا و هدى تجعلونه قراطيس ^{للناس} تبدونها و تخفون كثيرا (الایات -
الانعام ۹۱)

اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر جیسی جانتی چاہئے تھی نہ جانی جب انہوں نے کہا کہ اللہ نے
انسان پر کچھ بھی نازل نہیں کیا، کہو! کہ جو کتاب موسیٰ لیکر آئے تھے۔ اسے کس نے نازل کیا تھا جو
لوگوں کے لئے نور و ہدایت تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق کر رکھا تھا اس کے کچھ حصے کو تم
ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو۔

و اضرب لهم مثلا اصحاب القرية اذ جاءها المرسلون اذ ارسلنا اليهم اثنين
فكذبوهما فعززننا بثالث فقالوا انا اليكم مرسلون ☆ قالوا ما انتم الا بشر مثلنا و ما
انزل الرحمن من شيء ان انتم الا تكذبون ☆ (سورہ یسن الآیات ۱۳-۱۵)

اور ان سے گاؤں والوں کا قصہ بیان کرو جب ان کے پاس رسول آئے۔ جب ہم نے ان کی
طرف دو کو بھیجا تو انہوں نے انکو جھٹلایا۔ پھر ہم نے (انکو) تیسرے سے تقویت دی۔ تو انہوں نے
کہا ہم تمہاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں۔ تو وہ بولے کہ تم تو ہماری طرح کے عام آدمی ہی ہو اور
رحمن نے کچھ نازل نہیں کیا تم تو محض جھوٹ بولتے ہو۔

قالوا ان انتم الا بشر مثلنا تريدون ان تصدونا عما كان يعبد آباءنا فأتونا
بسلطان مبين ☆ قالت لهم رسلهم ان نحن الا بشر مثلكم ولكن الله يمن على من
يشاء من عباده الآية (ابراہیم ۱۰ و ۱۱)۔

وہ بولے تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو تمہارا یہ منشاء ہے کہ جن چیزوں کو ہمارے بڑے پوجتے
رہے ہیں ان سے ہم کو روک دو تو ہمیں کوئی واضح دلیل دو۔ رسولوں نے ان سے کہا ہاں ہم تمہارے
ہی جیسے بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرما دیتا ہے۔

ما يأتیہم من ذكر من ربهم محدث الا استمعوه و هم يلعبون لاهية قلوبہم
واسروا النجوى الذين ظلموا هل هذا الا بشر مثلکم أفتأتون السحر و انتم

تبصرون (سورة الانبياء ۲-۳)۔

ان کے پاس کوئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ظالم لوگ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں کہ یہ تو تمہارے ہی جیسا بشر ہے تو تم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جادو میں کیوں آتے ہو۔

وما منع الناس أن يؤمنوا إذ جاءهم الهدى إلا أن قالوا أبعث الله بشرا رسولا (الاسراء ۹۳)

اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی چیز مانع نہ ہوئی کہ کہنے لگے کہ کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟

انکار رسالت کا انجام

گویا اہل جہل و ضلال اور عناد و فساد اصحاب کفر و شرک اور نفاق و شقاق کا اللہ کے فرستادہ چیدہ برگزیدہ رسولوں کے ساتھ سب سے بڑا معرکہ ان کی بشریت کے بارے میں ہی پیا ہوا۔

انبیاء و رسل کے ساتھ اختلاف ان کی نبوت و رسالت پر حرف گری اور طعنہ زنی کا نتیجہ بہر حال مشیت الہی میں مداخلت اللہ تعالیٰ کے انتخاب و اختیار پر عدم اعتماد اور اس کے نازل کردہ دین حق سے روگردانی ہے۔ حق و صداقت اور وحی و رسالت کے انکار کا نتیجہ کفر و شرک اور بدعت کے ہوا کیا ہو سکتا ہے۔ گویا یہاں سے اللہ اور اس کے رسولوں کی گستاخی کا دروازہ کھلتا ہے۔

دنیا میں فتنے نازل ہوئے اور فساد برپا ہوتا ہے۔ وحی و رسالت کو نظر انداز کر کے اور انبیاء و رسل کی اطاعت سے روگردانی کر کے حق تک رسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرمایا۔

فما بعد الحق إلا الضلال۔

نیز فرمایا: فليحذر الذين يخالفون عن امره أن تصيبهم فتنهم أو يصيبهم عذاب اليم)

(۲۳ النور)

تو جو لوگ ان کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انکو ڈرنا چاہئے کہ کہیں ان پر کوئی آفت نہ پڑ جائے یا تکلیف دینے والا عذاب نازل نہ ہو جائے۔

تخلیق کائنات اور بالخصوص جن و انس کا مقصد تو منشاء و مراد الہی کے مطابق اس کے حضور سجدہ

ریز ہونا اور آداب بندگی بجالانا ہے جس کا علم وحی و رسالت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ انبیاء و رسل کے ساتھ اختلاف کر کے منشاء مراد الہی کیسے معلوم کیا جاسکتا ہے؟

جن نفوس قدسیہ کے قلوب مطہرہ پر وحی کا نزول ہوا ان سے کٹ کر اور ان پر کسی بہانے سے عدم اعتماد کا اظہار کر کے رضاء الہی کا حصول ممکن نہیں۔ انبیاء و رسل کی پیروی دین حق اور صراط مستقیم ہے۔

جن لوگوں نے اس سے صرف نظر کیا وہ شریعت سازی جیسے بدترین جرم میں مبتلا ہوئے اپنے خود ساختہ دین کو حق قرار دے کر غضب الہی اور ہلاکت کا شکار ہوئے۔ فرمایا:

فویل للذین یکتبون الکتب بأیدیہم ثم یقولون هذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنًا
قلیلًا فویل لہم مما کتبت أیدیہم وویل لہم مما یکسبون (البقرة ۷۹)۔

تو ان لوگوں کیلئے ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آئی ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کریں ان کے لئے ہلاکت ہے اس لئے کہ وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں ان کیلئے ہلاکت ہے اس لئے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

شرائع سماویہ کے کلی یا جزوی انکار، ان کے لانے والے قابل قدر و قابل صد احترام انبیاء و رسل جو دنیا میں معیار حق و صداقت ہیں پر کسی قسم کی حرف گیری کا لازمی نتیجہ متوازی شریعت سازی اور بدعت کی ایجاد ہوتا ہے۔ جو کتاب و سنت کے مطابق شرک کے بعد سب سے بدتر فکری و عملی گمراہی ہے۔ اس سے دین میں تحریف و تغیر کے دروازے کھلتے ہیں اور مسلمانوں میں جھگڑے اور اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ بدعت کے حاملین دین کے فرائض و واجبات، ذکر و عبادت کے مشروع و منسنون اور مستند طریقے چھوڑ کر اپنے خود ساختہ طریقوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اصل اسلام کے ساتھ لوگوں کا تعلق سطحی سا رہے جاتا ہے۔ اور خود ساختہ بدعات معاشرے میں رواج پا جاتی ہیں۔ اسی لئے شریعت اسلامیہ میں ہر قسم کی بدعت کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اللہ اور اس کے رسول نے اس کی پر زور مذمت فرمائی اور حرام قرار دیا۔ فرمایا:

و من یبدل نعمۃ اللہ من بعد ما جاءہ تہ فان اللہ شدید العقاب (البقرة ۲۱۱)
اور رسالت مآب علیہ الصلاۃ والسلام کے یہ الفاظ تو تمام آئمہ و خطباء کی زبان پر جاری رہتے

شر الامور محدثاتها و كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة في النار (مسلم و نسائی)

بدترین چیز نو ایجاد امور ہیں اور دین میں ہر نو پید چیز بدعت ہے، ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔

در اصل بدعت دین میں تحریف ہے جو سراسر حرام ہے۔

بدعت ان مسائل میں سے ہے جس کے بارے میں سلف امت میں قرون ثلاثہ تک اور آئمہ مجتہدین میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ یہ حرام اور دجل ہے۔ نیز سلف صالحین اس کی تقسیم حسنہ و سیئہ کا کوئی سراغ نہیں ملتا البتہ شیطان اور اسکی ذریت کی سعی و جہد مسلسل سے متاخرین میں اس کے حمایتی علماء پیدا ہو گئے اور اس کی پشت پناہی ہونے لگی اس کی حمایت میں تالیفات منظر عام پر آنے لگیں۔ بالآخر مسلمان بالعموم دو گروہوں میں بٹ گئے ایک گروہ اہل سنت و حدیث کا ہے۔ اور دوسرا اہل بدعت کا۔

منکرین رسالت کی تگ و ناز کا میدان بدعت ہے

دوسرے گروہ یعنی اہل بدعت کی اسلام پر عمل کی بجائے تمام تر توجہ نئے اور متوازی دین کی ایجاد پر مرکوز ہو گئی۔ انہوں نے اپنی اس سعی نامشکور سے اسلام اور وحی کے سرچشمہ مصطفیٰ کو مکدر کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا، اللہ کے بندوں کو صراط مستقیم اور دین حق سے ہٹا کر اپنی خود ساختہ شریعت پر چلانے کیلئے وہ تمام جابلانہ، مشرکانہ اور فسطائی حربے استعمال کیئے جو مشرکین مکہ نے رسالت مآب فداہ ابی و امی کے خلاف استعمال کئے تھے۔ تکمیل دین کے چودہ صدیاں بعد اسرائیلی من گھڑت شریعت کے دلائل کو بنیاد بنا کر اہل بدعت کے ایک کم سواد مصنف اور شریعت سناز اہل قلم نے تحریری اعتراف کیا کہ قبوری شریعت پر مبنی حق ان تک اب پہنچا ہے۔ اور کوشش یہ کی اسلام کے نظام عقائد و عبادات کے بالمقابل ایک نیا نظام بدعت متعارف کرا دیا جائے، علم و فضل، دیانت و امانت اور حیاء اور خوف خدا، سنجیدگی و متانت جیسی وہابی عادات سے مکمل احتیاط برت کر دجل و تحریف اور فریب کاری سے کھل کر کام لیا صدق رسول اللہ حیث قال - اذا لم تستحی

ربنا لا ترغ قلوبنا بعد اذ هديتنا و هب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب (آل

عمران: ۸)

”اے پروردگار جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے۔ تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کبھی نہ پیدا کر دیجیو اور ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما تو تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔“

مفتی احمد یار خان کی مذکورہ کتاب ”جاء الحق“ اہل بدعت‘ حاملین قبوری شریعت رضا خانی ٹولے میں ان کے مزاج کے مطابق ہونے کی وجہ سے کافی مشہور و مقبول ہے۔ اس میں مؤلف نے بدعت حسنہ کے جواز اور اس کی تائید پر مستزاد شرک کی ترویج و اشاعت کیلئے بڑی محنت کی ہے۔ انبیاء اور بزرگوں کو حاضر و ناظر‘ عالم الغیب‘ سمیع الدعاء حاجت روا‘ مشکل کشا اور فریاد رس ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مصائب و مشکلات میں انہیں مدد کیلئے پکارنے‘ ان کی قبروں پر حاضری‘ دعا و فریاد و سجود و طواف‘ نذر و نیاز‘ عرس و فاتحہ اور ذبح و قربانی جیسے مراسم عبودیت ادا کرنے کو متن اسلامی ثابت کرنے کی بھی سعی لا حاصل کی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو شرک و بدعت آخری اور بدترین مقام پر لاکھڑا کرنے کی اس کتاب میں سب سے زیادہ اور بدترین کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے بعد شرک و بدعت کی تائید و جواز میں جو کتاب میں منظر پر آئی اس کے مصنف نے جاء الحق سے ہی استفادہ کیا اور مفتی صاحب کا نامہ اعمال ہی سیاہ کیا ہے۔ علماء بدعت کی بعد کی تمام کتابوں میں آپ کو تھوڑی بہت جزوی تبدیلی اور حک و اضافہ کے ساتھ اسی کتاب کے دلائل نظر آئیں گے۔

مؤلف دین الحق نے گویا بدعت حسنہ کی تائید میں جملہ دلائل کا علمی و تنقیدی جائزہ لیکر اس قبیل کی تمام کتابوں کی قلعی کھول دی ہے۔ اور مسلک حق کی کما حقہ وضاحت کر دی ہے۔ اور اب اہل فکر و دانش کے پاس اتباع کتاب و سنت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

و من يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى و نصله جهنم و ساءت مصيرا (النساء ۱۱۵)

اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا اور مؤمنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے پر چلے گا تو جہد وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر کو ہی چلنے دیں گے اور پھر جہنم میں داخل کریں گے۔ اور برا ٹھکانہ ہے۔

اہل حق کا موقف اور طرز عمل

اس بے ہنگم تشریح اور بے سرو پا عقائد سازی جس کے پیچھے حقیقتہً خاتم النبیین رسول رب العالمین النبی الامین فداہ ابی و اُمی و روحی ﷺ کی گستاخی کا فرما ہے نے امت مسلمہ کو ٹکڑیوں میں بانٹ دیا ہے امام الانبیاء کے فرمان صداقت برہان کے مطابق صرف طائفہ منصورہ اور جماعت حقہ ہی منج نبوی و منہاج صحابہ پر قائم رہ سکی باقی تمام گروہوں نے یہودی و نصاریٰ کے شریعت سازی کے کلبو کو اپنایا اور مغضوب علیہم اور الضالین کے مصداق ٹھہرے۔ کچھ جانتے ہیں مگر نہیں مانتے اور کچھ بد نصیب جاننے کی بجائے لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون کی جاہلانہ پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔

صراط مستقیم پر گامزن انبیاء و صدیقین شہداء و صالحین کے پیروکاروں کا اپنا الگ طرز عمل ہے۔ وہ صدیاں بیتنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے اتباع رسول اور سبیل المؤمنین سے سرمو تجاوز کرنے اور پرکاشہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔

”اهدنا الصراط المستقیم“

پر مشتمل سورۃ الفاتحہ کی قرأت و تلاوت پر اصرار و تکرار کی برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ہاں منعم علیہم کے رفیقہ طیبہ و مبارکہ میں شامل فرمائے۔

طائفہ منصورہ جماعت اہل حدیث کا موقف بالکل واضح ہے۔ کہ ہمارے جملہ عقائد و اعمال کی توازن عملی کے ساتھ اسانید موجود ہیں عصر نبوی و عہد صحابہ سے آج تک عقائد و اعمال کے حاملین و حاملین کے حسب و نسب اور احوال و تراجم بھی معروف ہیں۔

اور جن اسفار مقدسہ اور کتب مبارکہ میں یہ دین حق مرتب و مدون ہے۔ اس کی اسانید بھی متواتر اور محفوظ ہیں اس حد تک واضح اور بین موقف اور روشن مسلک کے بعد اہل حق پر طعن و ملامت بد عقیدہ کی پھبتیاں کیا جواز رکھتی ہیں بالخصوص ایسے لوگوں کی طرف سے جن کا دین بے نام و نسب ہے اور کتب رطب و یابس پر مبنی بے اصل و بے سند ان کے بارے میں ہم کچھ کہہ کر اپنی زبان اور کچھ لکھ کر اپنا قلم آلودہ نہیں کرنا چاہتے کہ ہمارے مولد کا یہی حکم ہے اور ہمارے اسلاف کرام کی بھی سنت ہے۔

فرمایا: خذ العفو و امر بالعرف و اعرض عن الجاہلین (الاعراف ۱۹۹) عفو اختیار

کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جابلوں سے کنارہ کر لو۔
اس چیرہ دستی اور ہوس پرستی کے دور میں

و اذا مروا باللغو مروا کراما (الفرقان ۷۲) اور جب انکو بیہودہ (لوگوں) کے پاس سے
گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز میں گذر جاتے ہیں

اہل حق نے ہمیشہ اس چیرہ دستی اور ہوس پرستی کے دور میں صبر و سکوت سے کام لیا اور دعوت
وعزیمت پر کار بند رہے۔

مگر اہل زلیغ و ضلال اور دعاۃ شروفساد کی روز فروزں دسیسہ کاریوں اور حق اور اہل حق پر بے
جاحلوں نے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا ہے ہماری نئی نسل میں ایک ایسا گروہ میدان میں نکل آیا ہے
جو دفاع کی بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا قائل ہے۔

و للناس فیما یعشفون و مذاہب

مگر حیرت ہوتی ہے کہ متانت و سنجیدگی کا سرشتہ انہوں نے بھی ہاتھ سے جھوٹے نہیں دیا
آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب دین الحق جس پر بہترین شاہد عدل ہے۔ مخالف کی چیر
دستیوں اور جور و جفا کے باوجود اس کی خیر خواہی دعاۃ الحق کا ہمیشہ سے طرۃ امتیاز رہا ہے کہ فرمان
نبوی (الدین النصیۃ) کا یہی تقاضا ہے۔

انگریز نوازی

برصغیر ہندوستان میں انگریزی استعمار کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہاں کے مسلمان تھے۔ ان
کی حریت پسندی کسی وقت بھی پردہ سی حکومت کیلئے مسئلہ بن سکتی تھی ان کو معلوم تھا کہ بت پرست
معاشرے میں ان کے تبلیغی دین کو کوئی خطرہ نہیں تھا مگر اہل توحید انہیں کبھی برداشت نہیں کر پائیں
گے۔ اس لئے ان کے ظلم و ستم کا نشانہ زیادہ تر مسلمان بالخصوص ازادی کے متوالے اور توحید و جہاد
کے علمبردار ہی تھے۔

انگریزی حکومت کی تخم ریزی سے جو گروہ یہاں پیدا ہوئے انہوں نے دین کا حلیہ بگاڑنے

تحریف و تاویل اور دجل سے اسے اپنے آقاؤں کیلئے قابل قبول بنانے اور مسلمانوں کو باہم لڑانے میں کوئی کسر اٹھانیں رکھی انگریز مخالف اہل حق پر ظلم ڈھانے ان کو بدنام کرنے بلکہ انہیں ختم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

دور غلامی میں جہاں آپکو حکومتی ایوانوں میں مراعات یافتہ جاگیرداروں کی استقبالیہ قطاریں نظر آئیں گی وہاں درباریوں، نذاریوں اور حضور یوں قبوریوں کی جبہ و دستار سمیت بدست جماعتیں بھی ملیں گی، اہل حق کے خلاف طوفان بدتمیزی اسی گروہ اشرا پچانے کیا تھا ان کے آقاء ولی نعمت نے ان کو بہ خدمت تفویض کی تھی اس خدمت کے صلے میں۔

انہیں جائیدادیں اور جاگیریں ملیں۔ وہ جیلانی و گیلانی بخاری و چشتی اور سہروردی سجادہ نشین بنے اور سب ہی سرکار کی خوشنودی سے شریف قرار پائے کسی کو مجددیت کا منصب بلند ملا۔ اور کسی کے سر میں سودائے نبوت کا ذبہ تا قیامت رویا کر دیا گیا۔ کہ مسلمانوں کو باہم لڑانے اور دین میں تحریف و دجل کا اس سے کم کیا صلہ ہو سکتا تھا

وقال الشيطان لما قضی الامر ان الله وعدكم وعد الحق ووعدتكم فباخلفتكم وما كان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلو مونی ولوموا انفسکم ما انا بمصرخکم وما انتم بمصرخی انی کفرت بما اشركتمون من قبل ان الظالمین لهم عذاب الیم (ابراہیم ۲۲)

”حساب و کتاب کا فیصلہ ہونے کے بعد شیطان کہے گا۔ جو وعدہ اللہ نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا اور جو وعدہ میں نے کیا تھا وہ جھوٹا تھا، اور میرا تم پر کسی طرح کا زور نہیں تھا ہاں میں نے تم کو بلایا تم نے میرا کہنا مان لیا۔ سو تم مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو ہی ملامت کرو نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ تم پہلے مجھے شریک بناتے تھے بے شک جو ظالم ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

غلبہ حق

مذکورۃ الصدر گروہ کی تکفیر تشریح کا سلسلہ بڑا طویل ہے اور یہ ان کا محبوب مشغلہ ہے، مشغلہ ان کا ہے تکفیر مسلم ہند، کافر ہے جس کو ہوا ان سے ذرہ بھی اختلاف، مفتی احمد یار خان گجراتی کی

کتاب (جاء الحق) بھی سلسلہ دہلی و تحریف اور تکفیر کی ایک کڑی ہے گمراہوں کی ہلاکت و ضلالت اپنی جگہ مگر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب یا اس قبیل کی دوسری کتابیں مثلاً تجانب اہل السنہ وغیرہ پڑھ کر کوئی ایک شخص بھی راہ حق سے نہ بھٹکا ہو گا کہ حق یہی ہے جب اس کی شناخت پاکیزہ دلون میں داخل ہوتی ہے تو پھر نکلی نہیں ان سے ان کے مؤلفین کا نامہ اعمال ضرور سیاہ ہوا ہو گا مگر کسی مخلص مسلمان کا دل کبھی ایسی واہیات سے سیاہ نہیں ہو سکتا یہ صرف خوش فہمی اور تفاعل ہی نہیں بلکہ حقیقت واقعہ ہے کل جو اہل حدیث کو مسجدوں میں داخل نہ ہونے دیتے تھے داخل ہو جائیں تو مسجد دھوتے تھے ان کی مسجد نہ بننے دیتے تھے بن جائے تو ڈھا دیتے تھے۔ سنت نبوی کے مطابق نماز پڑھنے کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کے فتوے دیتے تھے۔

ان کی مسجدوں کو ”کفار کی مسجد مثل گھر کے ہے“ قرار دیتے تھے (ملاحظہ ہو ملفوظات ج ۱ ص ۹۳) وہابی سے مصافحہ کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، فتوے جاری کرتے تھے۔ کل تک خادم الفقراء اور سجادہ نشیناں سر عالیہ ملکہ برطانیہ کی مدد سے ہمارا وجود ختم کرنے کے درپے تھے آج چند برسوں کے بعد انہیں اپنا وجود برقرار رکھنے کا مسئلہ درپیش ہے۔

فاما الزبد فیذهب جفاء و اما ما یبفع الناس فیمکث فی الارض (الرعد: ۱۷)
سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔

”جاء الحق“ کی حقیقت واقعہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حق میں ان کے قلم سے رقم کروائی اور پھر اسے حقیقت کا روپ دیا۔ والحمد للہ علی ذلک۔

آج کوئی شہر کوئی بستی کوئی محلہ بفضل اللہ ایسا نہیں جہاں توحید کے علمبرداروں کی مسجد یا مدرسہ نہ ہو، حق پھیل رہا ہے۔ باطل سمٹ رہا ہے وہ دن دور نہیں ہے جب توحید کے شرارے شرک کے خنس و خاشاک کو بھسم کر دیں گے ہماری نسل نو نے ہر میدان میں قبر پرستوں کو چاروں شانے چت لٹا دیا ہے اب اللہ کی توفیق سے حق پھیل رہا ہے۔ اور اہل حق سوئے منزل گامزن ہیں اور اہل باطل اپنی بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور ہیں اس جنگ میں شکست ان کا مقدر ہے۔

نصیحت

کاش وہ نوشتہ دیوار پڑھیں اور یقین کر لیں کہ ان کے روحانی ہستیاں انگریز برصغیر سے جا چکے ہیں تو حید خالص کا سراج منیر افق مشرق سے کب کا طلوع ہو چکا اس کی کرنیں شعائیں بن چکی ہیں حشر و نشر قریب ہے اتباع کتاب و سنت کے بغیر شفاعت نبوی نصیب نہ ہوگی اور شفاعت کے بغیر نجات نہ ہوگی۔

فرمایا:

الم یأْن للذین آمنوا ان تخشع قلوبهم لذكر الله و ما نزل من الحق ولا یكونوا
کالذین اوتوا الکتب من قبل فطال علیهم الامد فقست قلوبهم و کثیر
منهم فاسقون (الحدید ۱۶)

کیا ابھی تک مومنوں کیلئے اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کی یاد کرتے وقت اور جو حق نازل ہوا ہے اس کے سنتے وقت ان کے دل نرم ہو جائیں۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے پہلے کتابیں دی گئیں۔ پھر ان پر مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

نیز فرمایا:

فلیحذر الذین یخالفون عن امره أن تصیبهم فتنه او یصیبهم عذاب الیم (النور ۶۳)

تو جو لوگ ان کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہئے کہ ان پر کہیں کوئی آفت نہ پڑ جائے یا تکلیف دینے والا عذاب نازل نہ ہو جائے۔

و ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله ولو أنهم اذ ظلموا انفسهم جاؤک
فاستغفروا الله و استغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحیما (النساء ۶۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا صرف اس لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے اور یہ جب اپنے اوپر ظلم کر بیٹھے تھے اگر تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول ﷺ بھی ان کے لئے بخشش مانگتے تو اللہ کو معاف کرنے والا اور مہربان پاتے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول زرین ان کے لئے کتنی بڑی نصیحت ہے فرمایا:

فان تراجع الحق خیر من التمادی فی الباطل
یعنی حق کی طرف رجوع کرنا باطل پر اڑے رہنے سے بہتر ہے، اس لئے صرف اپنے باطل پر
حق کا لیل لگانے کی بجائے منزل من اللہ حق کی طرف رجوع کریں۔ اسی میں بھلا ہے۔

مؤلف کتاب

مؤلف کتاب برادر عزیز مولانا محمد داؤد ارشد کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل رشد و ہدایت سے حظ
وافر عطا فرمایا ہے نقد و جرح کے رموز و اسرار سے بخوبی واقف ہیں دشمنان دین کی خبر لینا خوب
جانتے ہیں دین حق اور اہل حق کی خیر خواہی ان کے دل میں ہمیشہ موجزن رہتی ہے۔ فتنوں اور فتنہ
برداروں پر کڑی نظر رکھتے ہیں جوں ہی کوئی فتنہ سرا اٹھاتا ہے فوراً سرکوبی کر دیتے ہیں۔

جزاه اللہ عنہا و عن المسلمین خیرا۔

اس منجھے ہوئے ثقہ عالم دین مخلص نوجوان اور سلیقہ شعار مؤلف کی یہ تصنیف لطیف اور
سعی مشکور اہل ایمان اور اصحاب توحید کا سرمایہ گراں مایہ اور یشف صدور قوم مؤمنین کا مصداق
ہے۔

اللہ تعالیٰ اسے عامۃ الناس کی ہدایت کا سبب بنائے اور مؤلف موصوف کیلئے ذخیرہ آخرت۔

یوم لا ینفع مال و لا بنون الا من اتى اللہ بقلب سلیم

اور ہم سب کو اپنی مرضیات بجالانے کی توفیق نصیب فرمائے

و صلی اللہ علی نبینا محمد و علی آلہ و صحبہ وسلم تسلیما کثیرا

حافظ عبد الرشید اظہر بن عبد العزیز

یکم ستمبر ۲۰۰۱ء - اسلام آباد

خطبہ حرمت للعالمین

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادي له و اشهد ان محمداً عبده و رسوله اما بعد فان خير الحديث كتاب الله و خير الهدى هدى محمد و شر الا مور محدثاتها و كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة في النار.

عرض مؤلف

لیجے جناب، دین الحق فی تنقید جاء الحق، (ای الباطل) کا دوسرا حصہ بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے،

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، جس نے دوسرے حصے کی تکمیل و اشاعت کی توفیق بخشی اور توقع سے زیادہ اس کو شہرت اور قبولیت عطاء فرمائی۔

اس حصہ میں رد بدعات اور ان کے جواز پر مفتی صاحب کے جوڑ توڑ کا علمی محاسبہ اور طلاق ثلاثہ وغیرہ پر مکمل و مدلل بحث ہے۔

اللہ کی توفیق سے اس جلد میں خاکسار نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی ضعیف و کمزور روایت کو درج نہ کیا جائے، اگر کسی جگہ ضعیف روایت کو نقل کیا ہے تو اس کے ضعف کو واضح کیا ہے، یا کم از کم ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی مقام پر بھی بنیادی استدلال ضعیف روایت سے نہیں کیا، واللہ الحمد۔

کتاب کی تیاری میں اصل کتاب اللہ اور سنت خیر الانام ﷺ کو بنایا ہے، آثار صحابہ کرام اور اقوال تابعین عظام اور فقہاء و محدثین کی عبارات کو ان کی تائید میں نقل کرتے ہوئے آخر میں مفتی صاحب کی ہر دلیل کو مکمل نقل کر کے اس کا پورا پورا محاسبہ کیا ہے، علمی و تحقیقی جواب دیتے ہوئے ان کی تاویل بلکہ تحریف کو فقہاء احناف کی عبارات اور آئمہ لغت کی شہادت سے رد کرتے ہوئے صحیح و درست بات کی نشان دہی کی ہے،

گو اس سے کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے، مگر عوام الناس کی تفہیم کے لیے یہی مفید تھا، کیونکہ ہمارے مخاطب علماء دین نہیں بلکہ مبتدعین کے تربیت یافتہ بلکہ سند یافتہ جہلا ہیں، کتاب کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ فصل اول میں بدعت کا رد کرتے ہوئے قرآن و سنت کی روشنی سے ثابت کیا جاتا ہے کہ اس مقام پر مسنون عمل فلاں کام ہے اور یہ بدعت اس عمل مسنون کو محو کرنے والی ہے، دوسری فصل میں مفتی صاحب کا جواب تحریر کیا جاتا ہے، اور ان کے ایچ پیج کا رد ہوتا ہے،

فرداً فرداً بدعات کی تردید سے پہلے بدعت کے رد میں ایک مفصل مقالہ بھی تحریر کیا ہے، جس میں بدعت کی حقیقت اسلام میں اس کا صحیح محل اور آخر میں بدعات کے جواز پر مفتی صاحب کے دلائل کی حقیقت کا بیان ہے،

بدعات کے علاوہ اس حصہ میں طلاق ثلاثہ کے مسئلہ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مفتی صاحب نے اس کو بدعات کے آخر میں درج کیا ہے،

مفتی صاحب کے دلائل کا رد کرتے ہوئے ان کے کسی حوالے پر اعتماد کرتے ہوئے، جواب تحریر نہیں کیا، کیونکہ مفتی صاحب کی راویانہ ثقات کا مسئلہ انتہائی حد تک مایوس کن ہے، وہ قرآن و حدیث کے مفہوم کو بگاڑنے اور اپنی طرف سے حک و اضافہ کرتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں کرتے، تحریف میں وہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے،

بہر حال اہل علم جانتے ہیں کہ تصنیف کے میدان میں تخریج کا مرحلہ نہایت گھٹن اور دشوار ہوتا ہے، مگر یہاں تو معاملہ ہی فروتر ترین تھا، مفتی صاحب نقل در نقل پر اعتماد کرتے ہوئے کوئی آیت یا حدیث یا کسی محدث و فقہی کی عبارت کو نقل کر کے آخر میں کتاب کا حوالہ دے دیتے ہیں، ابواب و صفحات کا التزام وہ سرے سے غیر ضروری سمجھتے ہیں،

علاوہ ازیں خاکسار کے پاس وسائل بھی نہایت محدود ہیں، کتب اسلامی کا نہایت مختصر ذخیرہ ہونے کے باوجود یہ کتاب دیہات میں بیٹھ کر کیسے تکمیل کے مراحل طے کر کے مرتب ہوگئی؟ یقیناً جاننے کے لیے ایک ایک حوالے کے لیے متعدد لائبریریوں کے چکر لگانے پڑے، ان حالات میں، الممد العالیہ، (منگل سادہاں) کی لائبریری خاکسار کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی، پھر وہاں کے

منتظم حضرات کا تعاون بھی اپنے اندر جو خلوص و محبت کی مٹھاس رکھتا تھا اس کا تذکرہ نہ کرنا انتہائی ناپسای ہوگی، بفضل الہی اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ مفتی صاحب کی کسی بات کو ادھورا نقل کیا جائے نہ ان کی بات کے مفہوم کو بگاڑا جائے، بلکہ ان کے اصل منشاء و مقصود کو سامنے رکھ کر، جواب تحریر کیا جائے، اس بات میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے، اس بات کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ کتاب میں تکرار نہ ہو مگر پھر بھی بعض مقامات پر بامر مجبوری ایسا ہو گیا ہے،

حسب وعدہ اس جلد میں قدامت اہل حدیث اور رد تقلید کا مضمون درج نہیں ہو سکا، اس کی وجہ کتاب کی ضخامت ہے، کوشش کے باوجود بعض مقام پر مضمون طویل ہو گیا، اس کی وجہ عوام الناس کی تفہیم اور مفتی صاحب کے تمام دلائل کا مکمل محاسبہ ہے، تقریباً آٹھ صد صفحات کا یہ مضمون، جاء الباطل کے تقریباً اڑھائی صد صفحات کا مکمل و مفصل جواب ہے،

اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی اور زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ حسب وعدہ دین الحق، چار جلدوں میں شائع ہوگی، فریق مخالف نے اگر کسی غلطی کی نشاندہی کی تو اسے خندہ پیشانی سے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا جائے گا، باقی رہے جذباتی حضرات جو دلائل کی بجائے گالیوں سے اتمام حجت کرتے ہیں تو انہیں مخاطب کرنے کا سرے سے ارادہ ہی نہیں،

کوشش کے باوجود اس حصہ میں لہجہ میں ترشی اور سختی آگئی ہے، اس کی وجہ مفتی صاحب کی تاویلات و تحریفات ہیں، حضرت استاذی المکرم کی خواہش کے احترام میں بعض مقامات پر خط نسخہ بھیج دیا ہے، اللہ قبول فرمائے۔

ہمارے فاضل بھائی، مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ، اور حضرت شیخ نے پورے مسودہ کو پڑھا ہے اور مفید مشوروں سے نوازہ، مولانا عبدالرحمن عابد فاضل مدینہ یونیورسٹی نے بھی تقریباً اسی فیصد مسودہ پر نظر ثانی کی، یہ تمام بزرگ شکریہ کے مستحق ہیں، اللہ ان کے عمل حسنہ کو قبول فرمائے، آمین یا الہ العالمین۔

ہمارے بھائی شفقت علی خاں صاحب (آف ڈنگہ متصل نارنگ) اور محمد زبیر صاحب (آف

صادق آباد) قابل ذکر ہیں جنہوں نے نہایت محنت اور اخلاص سے پروف ریڈنگ کی خدمات سر انجام دیکر راقم کی عملی معاونت فرمائی

فجذاہم اللہ احسن الجذاء

اے میرے پیارے اللہ تعالیٰ جو دلوں کی چھپی ہوئی بات کو جانتا ہے تیرے علم میں ہے کہ راقم نے یہ کتاب خالص تیری رضا و خوشنودی اور تیرے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کی محبت کے جذبہ میں تحریر کی ہے، اے اللہ اسے قبول فرما اور میرے لیے اسے توشہ آخرت اور کفارہ سیات بنا اور اس عمل حسنہ کے وسیلہ سے تیری جناب میں ملتی ہوں کہ میری اولاد کو عالم باعمل بنا اپنے نبی کی سنت کا وفادار بنا، اسے ظاہر و باطنی خوبیوں سے نواز دے، وہ جب تک زندہ رہیں تیری توحید پر قائم رہیں۔ اس دار فانی سے دار البقا کی طرف جائیں تو حالت ایمان میں جائیں۔

اے میرے پیارے اللہ انہیں اپنے دین کے خادموں میں منتخب فرما، اے اللہ تو مالک کل ہے جو چاہے کر سکتا ہے، تو علیٰ کل شئی قدیر ہے تیرے خزانوں میں کس چیز کی کمی ہے، تو اپنی رحمت سے جس سے چاہے دین کی خدمت لے لے، اے اللہ جسے تو بلند کرے اسے کون گرا سکتا ہے، جسے تو اپنی رحمت کے لیے منتخب کر لے اسے تیرے پیار سے کون دور کر سکتا ہے۔

اے اللہ قادیانیت دین اسلام میں ایک بدترین فتنہ ہے میری اولاد کو توفیق دینا کہ وہ اس میں گراں قدر خدمات بجالا سکیں، آمین یا الہ العلمین۔

اے اللہ میرے والدین اور اساتذہ کرام کو معاف فرما ان میں جو فوت ہو چکے ہیں ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور جو بقیہ حیات ہیں ان کی زندگی اور عمل حسنہ میں برکت ڈال دے اور جہاں جہاں علم و فضل کی مسندیں سجائے بیٹھے ہیں، ان میں برکات کا ملہ نازل فرما اور ان کی مساعی جلیلہ کو درجہ قبولیت سے نواز دے۔

آمین یا الہ العلمین

آپ کی دعاؤں کا محتاج فقیر بارگاہ محمدی ابوصہیب محمد داؤد ارشد
خطیب جامع مسجد محمدی اہل حدیث کوٹلی ورکاں، نزد نارنگ منڈی، شیخوپورہ

۲۷، رمضان ۱۴۲۰ھ

۷ جنوری دوہزار ۲۰۰۰ء

باب

بدعات اسلام کی نظر میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعثت انبیاء کا مقصد

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد !

ہدایت انسان کی ایجاد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے انسان خواہ کتنا بھی عقل مند ہو جائے تب بھی اس کی عقل ناقص ہی رہتی ہے، ہم کسی بھی شخص کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی عقل حرف آخر ہے اور عقل ودانائی اس پر ختم ہو گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کئی ایسی حقیقتیں ہیں جو ہمارے سامنے آچکی ہیں اور ان کی ایک بچہ بھی غوطی خبر رکھتا ہے جبکہ یہی چیزیں ماضی قریب میں انسان کا دماغ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اس ترقی کی معراج میں بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خداداد عقل انسانی یہیں کہیں ختم ہو گئی ہے، عین ممکن ہے کہ آنے والی نسلیں آج کے انسان کی عقل و شعور کا مذاق اڑائیں انہیں حقائق کی بنا پر مذہب کا تعلق انسان کی سوچ و پچار اور عقل و خرد پر نہیں رکھا گیا، بلکہ بنی آدم کی فلاح و بہبود کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیاء کرام کا مقدس سلسلہ جاری کیا، جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت غلد سے نکالا گیا تو ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ :-

﴿ فَإِنَّمَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَن تَبَعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَحْزَنُونَ ﴾ (البقرة/ ۳۸)

ترجمہ۔ پس اگر میری طرف سے تم کو ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کے تابع ہوں گے سو ان کو کچھ خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غم کریں گے (ثانی)

اس آیت کریم میں اللہ تعالیٰ نے وحی و نبی کی ضرورت بتادی کہ فطرت انسانی کی کمزوری کا علاج صرف رب العزت کے ہاتھ میں ہے
ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا :-

﴿يَا بَنِي آدَمَ إِنَّمَا يَتُوبُ عَلَيْكُمْ رُسُلُكُمْ يَقَصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنْ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (الأعراف/ ۳۵)

ترجمہ۔ اے آدم کے بیٹو اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے میرے رسول آویں جو تم کو میرے احکام سناویں تو جو ایمان لاویں گے اور صلاحیت اختیار کریں گے ان پر کوئی خوف نہ ہوگا نہ وہ غمزدہ ہوں گے، (ثانی)

اس آیت میں اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ بنی آدم کی اصلاح انبیاء کرام کی تعلیم کی پیروی میں ہے اور اس تعلیم سے اعراض و مخالفت موجب خسران ہے، اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص دین میں بدعت ایجاد کرتا ہے تو وہ عملاً انبیاء کرام کی تعلیم کو ناقص و ادھورا مانتا ہے اور وہ اپنے قول و عمل سے یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ انبیاء کرام کی تعلیم سے زائد ہدایت بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں اپنی طرف سے عبادات اور ان کی کیفیت ایجاد کرنا بدعت ہے حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:-

”لَا تَخْصُوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِي وَلَا تَخْصُوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ مِنْ بَيْنِ الْأَيَّامِ إِلَّا أَنْ يَكُونَ فِي صَوْمٍ يَصُومُهُ أَحَدُكُمْ“۔

جمعہ کی راتوں کو نوافل کے لیے خاص نہ کرو اور جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے روزہ کے لئے مخصوص نہ کرو مگر یہ کہ کوئی شخص اگر روزے رکھتا ہے اور جمعہ کا دن درمیان میں آجائے تو الگ بات ہے۔ (مسلم ص ۳۶۱ ج ۱)۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے کہہ رکھا ہے۔

”لَا يَتَقَدَّمُ أَحَدُكُمْ رَمَضَانَ بِصَوْمٍ يَوْمٍ أَوْ يَوْمَيْنِ إِلَّا أَنْ يَكُونَ رَجُلٌ كَانَ يَصُومُ صَوْمَهُ فَلْيَصُمْ ذَلِكَ الْيَوْمَ“۔

تم میں سے کوئی رمضان سے پہلے ایک یا دو دن کا روزہ نہ رکھے مگر یہ کہ اگر کوئی شخص روزے پہلے رکھ رہا تھا تو وہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔

بخاری ص ۲۵۶ ج ۱، و مسلم ص ۳۴۸ ج ۱، و ابوداؤد ص ۳۳۹ ج ۱، و ترمذی مع تحفة
ص ۳۲ ج ۲، و نسائی ص ۲۴۸ ج ۱، و ابن ماجہ ص ۱۲۰، و مسند احمد ص ۲۳۴ ج ۲، و الدارمی
ص ۸ ج ۲، السنن الکبریٰ ص ۲۰۷ ج ۴، و الدار قطنی ص ۱۶۰ ج ۲، و اللفظ
للبخاری۔

اب دیکھئے کہ روزہ جیسی عظیم نیکی جس کے متعلق محبوب رب العلمین حضرت محمد ﷺ
نے وعدہ دے رکھا ہے کہ، روزے دار کے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں (بخاری ۲۵۵ و
مسلم ۲۵۹ ج ۱) لیکن اس کے باوجود کسی شخص کو اس بات کا حق رسول اللہ ﷺ نہیں دے رہے
کہ وہ از خود اپنی طرف سے اس کی کیفیت ایجاد کر کے روزے رکھ لے، اسی طرح جب حضرت
عبداللہ بن مسعودؓ کو اس بات کا علم ہوا کہ مسجد نبوی میں ایک ایسی محفل ذکر ہو رہی ہے جس
میں ایک شخص کتا ہے، سو بار (۱۰۰) اللہ اکبر پڑھو تو حاضرین کنکریوں پر سو دفعہ اللہ اکبر کہتے
ہیں، پھر وہ کتا ہے سو (۱۰۰) دفعہ کلمہ طیبہ کا ورد کرو تو وہ سو (۱۰۰) بار تہلیل پڑھتے ہیں، پھر وہ
کتا ہے سو (۱۰۰) دفعہ سبحان اللہ کہو تو وہ سنگریزوں پر سو بار تسبیح پڑھتے ہیں حضرت عبداللہ بن
مسعودؓ نے ان سے سوال کیا تم ان پر کیا پڑھتے ہو؟ وہ کہنے لگے ہم تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھ
رہے ہیں، تو آپؐ نے ان سے کہا

”فعدوا سیئاتکم فانا ضامن ان لایضیع من حسناتکم شیء و یحکم یا امة
محمد ﷺ ما اسرع هلكتکم هؤلاء صحابة نیکم متوافرون و هذه ثیابه لم تبل،
و آیتہ لم تکسر..... او مفتحو باب ضلالة؟“

تم ان کنکریوں پر اپنے گناہ شمار کرو، میں اس بات کا ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں سے
کچھ بھی ضائع نہ ہوگا۔

اے امت محمد ﷺ تم پر افسوس ہے کہ کتنی جلدی تم ہلاکت میں پڑ گئے ہو جبکہ ابھی
محمد ﷺ کو دیکھنے والے تم میں بہت زیادہ موجود ہیں علاوہ ازیں ابھی تو جناب رسول اکرم ﷺ
کے کپڑے پرانے نہیں ہوئے اور آپ علیہ السلام کے برتن نہیں ٹوٹے اور تمہاری یہ حالت

ہے کہ تم بدعت و گمراہی کا دروازہ کھولتے ہو، سنن لداری ص ۷۹ ج ۱، باب فی کراہیۃ اخذ الراۃ، رقم الحدیث (۲۰۴)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فرمان سے ثابت ہوا کہ اپنی طرف سے از خود کوئی نیکی ایجاد کرنا گمراہی و بدعت ہے، اب اگر کوئی سر پھرایہ کتنا پھرے کہ لو جی سبحان اللہ، کلمہ طیبہ اور تکبیر کا ورد بھی بدعت ہے، تو دین پھر کس چیز کا نام ہے؟ ہم ان سے بس یہی گزارش کریں گے کہ بھائی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مطلب یہی تھا کہ گو ان اذکار کی بہت کچھ فضیلت ہے اور محبوب ترین ذکر ہے لیکن اس کا یہ خاص طریقہ جناب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے صحابہ کرام سے مروی نہیں بلکہ یہ خود ایجاد بندہ ہیں لہذا بدعت و گمراہی ہے اور یہی فقہ حنفی میں لکھا ہے،

چنانچہ علامہ ابن نجیم حنفیؒ کنز الدقائق کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

”لَا نَذْكُرُ اللَّهَ تَعَالَى إِذَا قَصَدَ بِهِ التَّخْصِصَ بِوَقْتٍ دُونَ وَقْتٍ أَوْ شَيْءٍ دُونَ

شَيْءٍ لَمْ يَكُنْ مَشْرُوعًا حَيْثُ لَمْ يَرِدِ الشَّرْعُ بِهِ لِأَنَّهُ خِلَافُ الْمَشْرُوعِ“۔

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کسی خاص وقت میں مخصوص کر لیا اور دوسرے وقت میں وہ نہ ہو یا کسی چیز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر مخصوص کر لیا اور دوسری چیز کے ساتھ وہ نہ کیا، تو وہ مشروع نہ ہوگا اس لیے کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں آئی لہذا وہ خلاف شرع ہوگا۔
(البحر الرائق ص ۱۵۹ ج ۲)

شریعت کے راستہ پر چلنا ہی ہدایت ہے

اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں :-

(۱) فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى * وَمَنْ

أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

أَعْمَى ﴿طہ/۱۲۳-۱۲۴﴾

ترجمہ۔ پھر اگر تم کو میری طرف سے ہدایت پہنچے پس جو کوئی میری ہدایت کا پیروکار ہوگا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ بد نصیب اور جو کوئی میری نصیحت سے منہ پھیرے گا پس اس کی تمام زندگی بد نصیبی کی ہوگی اور قیامت کے روز اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے، (ثانی)

(۲) ﴿وَنُزِّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا

خَسَارًا﴾ (بنی اسرائیل/۸۲)

ترجمہ۔ اور ہم قرآن کو ایمان داروں کے شفاء اور رحمت کرتے ہیں اور ظالم اس سے سراسر نقصان ہی اٹھاتے ہیں (ثانی)

(۳) ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا * فَأَمَّا

الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ

مُسْتَقِيمًا﴾ (النساء/۱۷۴-۱۷۵)

ترجمہ۔ لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک راہنما (حضرت محمد ﷺ) تمہارے پاس آچکا اور ہم نے کھلا نور تمہاری طرف اتارا ہے پس جو لوگ اللہ کو مانیں گے اور اسی سے مضبوط تعلق کریں گے تو اللہ ان کو اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کرے گا اور ان کو اپنی طرف سیدھے راستے پر پہنچا دے گا (ثانی)۔

(۴) ﴿قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ * يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ

السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِمْ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ

مُسْتَقِيمٍ﴾ (المائدة/۱۵-۱۶)

ترجمہ۔ تمہارے پاس اللہ کا نور اور روشن کتاب آئی جو لوگ خدا کی رضا مندی کے طالب ہیں اس کتاب کے ذریعے خدا ان کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور ان کو راہ راست دکھاتا ہے (ثانی)

(۵) ﴿قُلْ هُوَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَاۗءٌ﴾ (حم السجدة/۴۴)۔

ترجمہ۔ تو کہہ یہ (قرآن) ماننے والوں کے لئے ہدایت اور شفا ہے (ثانی)

ان آیات بینات سے یہ بات واضح ہوئی کہ بنی آدم کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف لانے والا قرآن اور صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ہیں۔

کامیابی فقط اتباع رسول ﷺ میں ہے

(۱) ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمْ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (۳۱) قُلْ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ ﴿اَلْ

عمران/۳۱-۳۲)۔

ترجمہ۔ تو کہہ دے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرے پیچھے چلو خدا تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا خدا بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے تو کہہ دے کہ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرو پھر اگر وہ منہ پھیریں تو کافر خدا کو نہیں بھاتے (ثانی)۔

اس آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی نجات اپنے تجویز کردہ راستوں میں نہیں، بلکہ اتباع رسول ﷺ میں ہے۔

(۲) ﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۵۱) وَمَنْ یُطِيعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یَخْشَ اللّٰهَ وَیَتَّقِهٖ

فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿ (النور/۵۱-۵۲)

ترجمہ۔ چکے ایمانداروں کو جب اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان میں فیصلہ کرے تو ان کا جواب بس یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور تابع ہیں یہی لوگ کامیاب ہیں جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کریں گے اور خدا سے ڈرتے رہیں گے اور سچیں گے بس وہی لوگ کامیاب ہوں گے (ثانی)

﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴾ (الأحزاب/۷۱)

ترجمہ۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کرے گا وہ ضرور مراد پائے گا (ثانی)

خلاصہ ان آیات بیات کا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی فقط اتباع رسول میں ہے ، آیت اول میں یہ وعدہ دیا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت و شفقت حاصل کرنی ہے تو میرے نبی کی پیروی کرو کہ میری رحمت کے حصول کا فقط یہی راستہ ہے

نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر عمل کرنا گمراہی ہے

ارشاد رب العلمین ہے

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ (الحجرات/۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھا کرو اور اللہ ہی سے ڈرتے رہو اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے (۱-۳۹) (ثانی)

اس آیت کا یہی مفہوم ہے کہ شرعی امور میں اللہ تعالیٰ اور رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اجازت کے بغیر کوئی کام از خود نہ کیا کرو ورنہ تم طاعی بدعتی بن جاؤ گے کیوں؟ اس لئے کہ ایمان کا پہلا اور بنیادی تقاضا یہ ہے، کہ جو شخص اللہ کو رب اور رسول اللہ ﷺ کو اپنا

ہادی مانتا ہو، وہ اپنے اس عقیدے کی سچائی میں اپنی رائے اور خیال کو اللہ و رسول ﷺ کے فیصلے پر مقدم نہ رکھے، چنانچہ فاضل بریلی کے ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں مولوی نعیم الدین مراد آبادی لکھتا ہے،

اصلاً تم سے تقدیم واقع نہ ہو نہ قول میں نہ فعل میں کہ تقدم کرنا رسول ﷺ کے ادب و احترام کے خلاف ہے (ص ۷۴۵ حاشیہ ۲) خود حضرت مفتی صاحب نے لکھا ہے، کسی چیز میں بھی حضور سے آگے بڑھنا منع ہے کیونکہ یہاں لَا تُقَدِّمُوا مطلق ہے، (نور العرفان ص ۸۲۲) ان عبارات سے واضح ہے کہ نبی ﷺ سے بڑھ کر یعنی مزید کسی فعل کا کرنا ادب رسول ﷺ کے خلاف ہے، تو معلوم ہوا کہ دین میں جتنی یار لوگوں نے بدعتیں ایجاد کر رکھی ہیں وہ تمام کی تمام اس آیت کی زد میں آتی ہیں اور ان کے کرنے والے بقول مولوی نعیم الدین مراد آبادی رسول اللہ ﷺ کے گستاخ اور بے ادب ہیں اور ان کا وہ فعل احترام نبوی علیہ التحیۃ والسلام کے منافی ہے،

اللہ رب العلمین نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔

(۲) ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدة/۳)۔

ترجمہ۔ آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کی ہے اور میں نے اسلام کو تمہارا مذہب پسند کیا ہے (ثانی)

تکمیل دین سے تکمیل ہدایت مراد ہے اور، اَتَمَمْتُ، کسی چیز کا تمام اس درجہ تک پہنچ جانا ہوتا ہے جب وہ خارج میں کسی کی محتاج نہ ہو اور جو چیز اپنے سے خارج کی محتاج ہو وہ ناقص کہلاتی ہے،

جیسا کہ امام راغبؒ نے صراحت کی ہے :-

تمام الشئ انتہاؤہ الی حد لایحتاج الی شیء خارج عنه والناقص ما یحتاج

الی الشیء خارج عنه. (المفردات فی غریب القرآن ص ۷۵).

قارئین جب آپ نے مذکورہ دلیل فرقانی کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب آئیے مبتدعین کی اختراعات کی طرف کہ یہ حضرات ان بدعات کو دین کا ایک حصہ و جز تصور کرتے ہیں اور ان کے بغیر مسلمانوں کے ایمان کو ادھورا و ناقص قوی و عملی طور پر یقین کرتے ہیں اور منکرین پر نجدیت و وہابیت کا فتویٰ لگاتے ہیں اور اپنے امتیازی مسائل گردانتے ہیں بلکہ اہل سنت کی علامت بتاتے ہیں،

تو آپ ہی بتائیے کہ ان کا یہ قول و عمل مذکورہ آیت قرآنی کی رو سے مردود نہیں تو اور کیا ہے؟ کیونکہ قرآن نے تو صاف بتا دیا ہے کہ میری ہدایت اپنی ذات میں اس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے کہ خارج میں کسی ہدایت کی محتاج نہیں، اور یہ حضرات اس کے بالکل برعکس بدعات کو بھی ہدایت تصور کرتے ہیں

(۳) ﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ﴾ (الشوریٰ/۲۱)
ترجمہ۔ کیا ان لوگوں کے شریک ہیں جنہوں نے ان کے دین میں ایسے کاموں کی اجازت دے رکھی ہے جن کی بابت خدا نے حکم نہیں بھیجا (الشوریٰ ۲۲-۲۱)

وہ لوگ جنہوں نے اپنی طرف سے دین ایجاد کیا یا دین میں ایسی بدعات ایجاد کیں جن کا اللہ رب العزت نے حکم نہیں دیا تھا، اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنی قبیح اور بری تھیں اور ان کے موجد و فاعل اس قدر بد باطن اور منحوس تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے آگے فرماتے ہیں۔

وَلَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿الشوریٰ/۲۱﴾
اگر فیصلہ کا حکم نہ ہوا ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ کیا جاتا اور ظالموں کو سخت دکھ کا عذاب ہوگا (۲۱-۲۲)

(۴) وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ السِّنُّكُمْ الْكُذْبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِّتَقْرَؤُا عَلَى اللَّهِ الْكُذْبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذْبَ لَا يَفْلَحُونَ ﴿النحل/۱۱۶﴾

ترجمہ۔ اور اپنی زبانوں کے جھوٹے بیان سے نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ کے بہتان باندھنے لگو جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا کرتے ہیں ہرگز بامراد نہ ہوں گے (۱۶-۱۱۶)

اس دلیل فرقانی سے معلوم ہوا کہ اپنی نفسی خواہش سے کسی چیز کو حرام کہنا اللہ رب العزت پر جھوٹا بہتان باندھنا ہے اور اسی طرح کسی چیز کو حلال قرار دینا بھی اللہ تبارک و تعالیٰ پر افتراء ہے

الفرض یہ آیت قرآنی بدعات کے رد میں برہان واضح ہے امام ابن کثیر اپنی تفسیر قرآن عظیم میں اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

ویدخل فی هذا کل من ابتدع بدعة لیس له فیها مستند شرعی او حلل شیئا مما حرم الله او حرم شیئا مما اباح الله بمجرد رأیه و تشہیه، (ص ۵۹۰ ج ۲)

اور اس میں وہ تمام اشخاص داخل ہیں جنہوں نے دین میں کوئی ایسی بدعت نکالی جس میں ان کے پاس کوئی دلیل شرعی نہیں یا جنہوں نے فقط اپنی رائے اور چاہت سے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال یا اللہ تعالیٰ کی مباح کردہ چیز کو حرام قرار دے دیا ہو، (۲-۵۹۰)

صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نظر میں بدعت

(۱) بدعتی کی حمایت کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

لعن الله من لعن والديه و لعن الله من ذبح لغير الله و لعن الله من اوى محدثا و

لعن الله من غیر منار الارض،

اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اس شخص پر جو اپنے والدین پر لعنت کرے جو غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرے جو بدعتی کو پناہ دے اور جو زمین کی حدیں تبدیل کرے۔ (صحیح مسلم ص ۱۶۰ ج ۲، و مسند امام احمد ص ۱۱۸ ج ۱ ارقم ۹۵ و نسائی ص ۲۰۰ ج ۲، و ابویعلیٰ ص ۲۹۸ ج ۱)۔

(۲) بدعی اعمال اللہ کے ہاں مردود ہیں

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

من احدث فی امرنا هذا ماليس منه فهورد،

جس کسی نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی جو دین میں نہیں ہے تو وہ کام اللہ کے ہاں مردود ہے۔

(بخاری ص ۱۷۱ ج ۱، و مسلم ص ۷۷ ج ۲، و ابوداؤد ص ۷۹ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۳، و مسند امام احمد ص ۷۳، ۷۴ ج ۶،

(۳) بدعتی کی توبہ قبول نہیں جب تک بدعت کونہ

چھوڑے

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں :-

قال رسول الله ﷺ ان الله حجب التوبة عن صاحب كل بدعة.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے۔

(طبرانی اوسط ص ۱۱۳ ج ۵، رقم الحدیث ۴۲۱۴ و مجمع الزوائد ص ۱۹۲ ج ۱۰)۔

علامہ منذری نے اسکی سند کو حسن کہا ہے، الترغیب ص ۸۶ ج ۱، اور ہیثمی نے اس کے راویوں کو ثقہ کہا ہے،

بدعت جاری کرنے والے پر اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں نبی ﷺ نے فرمایا :-

المدينة حرم من كذا الى كذا لا يقطع شجرها ولا يحدث فيها حدث من

احد حدث فيها حدثا فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين.

مدینہ طیبہ حرم ہے فلاں مقام سے لیکر فلاں جگہ تک نہ تو اس کا درخت کاٹا جائے اور نہ ہی اس میں کوئی بدعت ایجاد کی جائے، جو اس میں کوئی بدعت رائج کرے اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔

(صحیح بخاری ص ۲۵۱ ج ۲ و مسلم ص ۴۴۱ ج ۱)۔

(۵) بدعتی کی فرضی و نفلی عبادات قبول نہ ہوں گی

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :-

المدينة حرم من غير الى كذا فمن حدث فيها حدثا فعليه لعنة الله والملائكة،،

والناس اجمعين لا يقبل الله منه صرفا ولا عدلا. (الحديث).

مدینہ طیبہ مقام غیر سے لیکر وہاں (تور تک، کمافی روایۃ الاخریٰ مسلم ۴۴۲/۱) حرم ہے۔ سو جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو، اس کی فرضی عبادات اور نہ ہی نفلی عبادات قیامت کے روز اللہ تعالیٰ قبول کرے گا، صحیح بخاری ص ۱۰۸۴ ج ۲، و مسلم ص ۴۴۲ ج ۱۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا :-

المدينة حرم فمن احدث فيها حدثا او آوى محدثا فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين لا يقبل منه يوم القيامة عدل ولا صرف.

مدینہ منورہ حرم ہے، پس جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو یہاں پناہ دی، اس پر اللہ تعالیٰ کی، ملائکہ کی، تمام لوگوں کی لعنت ہو، اس کی قیامت کے روز کوئی فرضی و نفلی عبادت قبول نہ ہوگی، صحیح مسلم ص ۴۴۲ ج ۱،

فائدہ جلیلہ

حکومت سعودیہ نے جو مبتدعین کے لڑیچر اور ان کے اکابرین پر پابندی لگا رکھی ہے ان کے اس عمل کی دلیل یہ حدیث طیبہ ہے

بدعت کا لغوی معنی

(۱) علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں :-

والبدعة. الحدث وما ابتدع من الدين بعد الاكمال،

یعنی بدعت ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو تکمیل دین کے بعد نکالی گئی ہو (لسان العرب ص ۶۸ ج ۸)

(۲) علامہ زمخشری التوفی سن ۵۳۸ھ جو کہ بلاشبہ لغت عرب میں امام اور حجت ہیں فرماتے ہیں، ابدع الشی وابتدع، اخترع۔

یعنی بدعت ایک نئی من گھڑت چیز کو کہتے ہیں، اساس البلاغة ص ۱۷

(۳) امام راغب فرماتے ہیں :-

والبدعة فى المذهب ايراد قول لم يستن قائلها وفا عليها فيه بصاحب الشريعة واما ثلها المتقدمه واصولها المتقنة.

بدعت کا مذہب میں اطلاق ایسے قول پر ہوتا ہے جس کا قائل اور فاعل صاحب شریعت

کے نقش قدم پر نہ چلا ہو اور شریعت کی سابق مثالوں اور اس کے اصول پر وہ گامزن نہ ہو، المفردات فی غریب القرآن ص ۳۹۔

(۴) علامہ وحید الزمان حیدر آبادی فرماتے ہیں :-

ایک نئی چیز نکالنا یا پیدا کرنا جس کی کوئی مثال پہلے نہ ہو، لغات الحدیث جلد اول ص ۲۸

ب

ان محکم اور ٹھوس حوالا جات کتب لغویہ سے ثابت ہو کہ لغت میں بدعت کا اطلاق ایسے قول و فعل پر ہوتا ہے جس کی ایجاد بلا کسی ساہبہ مثال کے ہو، انہیں معنوں میں قرآن حکیم میں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے

بديع السموات والارض

نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا (البقرہ ۷۱) ترجمہ احمد رضا خان بریلوی

اب ظاہر ہے کہ یہاں قرآن نے بدیع کا لفظ بغیر کسی مثال سابق کی ایجاد پر بولا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو حکم فرمایا کہ

قل ما كنت بدعاً من الرسل ،

تم فرماؤ میں کوئی انوکھا رسول نہیں، (الاحقاف ۹) ایضاً

اس آیت کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبانی یہی بات کھلائی ہے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں، یعنی میں کوئی پہلا رسول تو نہیں جس کی ساہبہ زمانہ میں مثال نہ ملتی ہو بلکہ رسالت کا سلسلہ تو ابتدا آدم سے ہی چلا آرہا ہے، خود حضرت مفتی صاحب یہاں تک ہمارے ساتھ متفق ہیں لکھتے ہیں کہ، مرقاة شرح مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة میسر ہے۔

قال النووي البدعة كل شئى على غير مثال سبق،

بدعت وہ کام ہے جو بغیر گزری مثال کے کیا جائے، جاء الباطل ص ۲۲۴ ج ۱،

(نوٹ) امام نووی کی اس عبارت کے لیے دیکھئے شرح مسلم ص ۲۸۵ ج ۱،

(جاء الباطل- میں یہ لفظ عبل ہے جو غلط ہے) (ی)

بدعت کا شرعی معنی

شریعت میں بدعت ایسے قول و فعل کو کہتے ہیں جو دین میں اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے اختراع کیا گیا ہو

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اما بعد فان خير الحديث كتاب الله وخير الهدي هدي محمد ﷺ وشر الا

مور محدثاتها و كل بدعة ضلالة (الحديث)

اما بعد! بہترین کلام اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور بدترین وہ کام ہیں جو نئے نئے گھڑے جائیں (اور ہر نیا کام بدعت ہے) اور ہر بدعت گمراہی ہے (صحیح مسلم ص ۲۸۵ ج ۱، وابن ماجہ ص ۶ واللفظ لہ،

اس حدیث کے ایک اور طریق میں اس کی صاف وضاحت ہے کہ

ان اصدق الحديث كتاب الله واحسن الهدي هدي محمد و شر الامور

محدثاتها و كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة في النار، الحديث،

بلاشبہ سب سے سچی بات اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور سب سے بہترین ہدایت حضرت محمد ﷺ کی ہے اور بدترین کام وہ ہیں جو نئے نئے ایجاد کیے جائیں اور ہر نیا ایجاد شدہ کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں (لے جانے والی) ہے، سنن نسائی ص ۱۸۸ ج ۱۔

اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے بدعت اور ہدایت کا تقابل کر کے بات کو واضح کر دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے خلاف جو بھی ایجاد کیا جائے گا وہ بدعت ہے، اس سے یہ بات بھی کھل گئی کہ ہر بدعت بُری نہیں تاکہ جدید سائنسی ایجادات کو اس میں شامل کر لیا جائے، جیسا کہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے، حدیث میں کل محدث

بدعت (مشکوٰۃ باب الاعتصام) ہر نیا کام بدعت ہے، اس میں دینی یا دنیاوی کی قید نہیں، جاء الباطل ص ۲۲۳

کیا بدعت شرعی میں دین کی قید ہے؟

اولا حضرت مفتی صاحب نے جو بھی رقم فرمایا ہے یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، پھر اس پر جو حدیث نقل کی ہے اس کے الفاظ بھی صحیح درج نہیں کئے جبکہ درست الفاظ، محدثہ (ہیں ثانیان کی درج کردہ حدیث وہی ہے جو ہم پہلے حوالہ عرض کر چکے ہیں ان کا حق تھا، پوری حدیث عوام کے سامنے لاتے تاکہ وہ خود فیصلہ کر لیتے کہ ہدایت رسول ﷺ کے بالمقابل یہ لفظ بولا گیا ہے، اب ظاہر ہے کہ ہدایت رسول ﷺ فقط دینی امور میں ہے، دنیاوی امور میں تو انہوں نے خود کہا ہے کہ،

انتم اعلم بامر دنیا کم، صحیح مسلم ص ۲۶۴ ج ۲،

تم اپنی دنیا کے امور کو زیادہ جانتے ہو،

ثالث، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث میں دین کی قید موجود ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا

من احدث فی امرنا هذا ماليس منه فهورد،

جس کسی نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردود ہوگی، بخاری ص ۱۷۱ ج ۱، و

مسلم ص ۷۷ ج ۲، و ابو داؤد ص ۲۷۹ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۳، و مسند احمد ص ۷۳ و ص ۱۴۰ ج ۲

، حافظ ابن حجر اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، من اخترع فی الدین

(یعنی جو دین میں اختراع کی جائے) فتح الباری ص ۲۳۰ ج ۵

فی امرنا هذا، کا معنی ملا علی قاریؒ نے، اکی فی دین الاسلام، کیا ہے، مرقاۃ ص ۲۲۵ ج ۱،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی نے، دردین ما، کیا ہے، اشعة الملتعات ص ۱۳۴ ج ۱، یعنی دین

اسلام میں، یہی معنی اس حدیث کا بریلوی مکتب فکر کے معروف شیخ الحدیث مولوی غلام رسول

سعیدی صاحب نے، شرح صحیح مسلم ص ۱۵۵ ج ۵، میں کیا ہے بلکہ خود مفتی صاحب نے یہی معنی کیا ہے، مرات المناجیح ص ۱۴۵ ج ۱،

ان خفی تراجم سے ثابت ہو گیا کہ دین کی قید ہماری اختراع نہیں بلکہ نبی رحمت رسول مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بیان کردہ ہے اور اس سے انکار محض مبتدعین علماء بریلویہ کی ضد ہے، اور بس!

اکابرین علماء اہل حدیث

اس حدیث سے اکابرین علمائے اہل حدیث نے بھی یہی سمجھا ہے کہ، فی امرنا هذا، سے مراد امر دین ہے چنانچہ حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے شاگرد خاص اور شارح سنن ابی داؤد حضرت مولانا محمد شمس الحق محدث عظیم کبادی فرماتے ہیں، فی امرنا هذا، ای فی دین الاسلام، عون المعبود ص ۳۲۹ ج ۴،

یعنی، فی امرنا هذا، سے دین اسلام مراد ہے مولانا عبید اللہ رحمائیؒ نے بھی یہی لکھا ہے، مرعاة المفاتیح ص ۲۳۶ ج ۱،

حضرت مولانا حافظ عبداللہ محدث روپڑی فرماتے ہیں

من احدث ففی امرنا هذا مالیس منه فہورد،

جو دین میں نیا کام جاری کرے وہ مردود ہے (فتاویٰ اہل حدیث ص ۶۵۵ ج ۲)

علماء بریلویہ

مولوی غلام رسول سعیدی کا حوالہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اسی طرح فریق ثانی کے ایک نامور مولوی عبدالسمیع رامپوری لکھتے ہیں،

یہ صحیحین کی حدیث ہے یعنی جس نے نکالی ہمارے اس دین میں وہ بات جو دین کی قسم سے نہیں یعنی کتاب اور سنت کے مخالف ہے وہ بات اس کی رد ہے،

(انوار ساطعہ مع براہین قاطعہ ص ۴۴، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی سن ۱۹۸۷ء)

مفتی صاحب کے مجدد ملت اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خاں صاحب تمباکو کی حلت و

حرمت پر بحث کرتے ہوئے اسے خلال و مباح قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں، رہا اس کا بدعت ہونا یہ کچھ باعث ضرر نہیں کہ یہ بدعت کھانے پینے میں ہے نہ امور دین میں، تو اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار کام ہے،

رسالہ حقۃ المرجان للمہم حکم الدخان ص ۳، مندرجہ فتاویٰ رضویہ ص ۴۱ ج ۱۱، و احکام شریعت حصہ سوم مسئلہ نمبر ۷۳، ص ۲۶۰،

مولوی محمد صدیق حنفی بریلوی لکھتا ہے کہ
(بدعت) دین میں جو نیا کام بغرض ثواب جاری کیا جائے،
بدعت کی حقیقت صفحہ ۴۱

بریلویت کا مشہور واعظ مولوی منور حسین عثمانی رضوی لکھتا ہے

بدعت کا اصطلاحی معنی ہے امور دینیہ میں جو کام ثواب کے لیے ایجاد کیا جائے، رد شرک و بدعت ص ۳۲، فریق ثانی کے جید علماء سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ شرعی بدعت فقط وہی ہے جو دین میں نکالی جائے اور بقول مولوی احمد رضا خاں گو حقہ بدعت ہے مگر دنیاوی امور میں ہونے کی وجہ سے اسے ناجائز نہیں کہہ سکتے کہ اس کی بدعت دین میں داخل نہیں، لہذا اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار کام ہے۔

علماء سلف سے بدعت شرعی کی تعریف

حضرت مفتی صاحب نے ایک یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ علماء سلف محدثین فقہاء عظام سے بدعت شرعی کے معنی میں دین کی قید مروی نہیں! حالانکہ یہ مفتی صاحب کا خالص مغالطہ اور سو فی صد غلط بیانی ہے، اس بدایونی جھوٹ کے متعلق ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، لیکن مبتدعین کی مزید تسلی کے لئے ہم اس مقام پر چند اور عبارات اکابر بھی نقل کرتے ہیں تاکہ مفتی صاحب کی مکاری و عیاری سے پورا پورا پردہ اٹھ سکے علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ

البدعة كل ما قيل او فعل مما ليس له اصل فيما نسب اليه ﷺ وهو الدين كل ما لم يات في القرآن ولا عن رسول الله ﷺ (یعنی بدعت اسے کہتے

ہیں جس کی اصل رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو اور دین میں قرآن و سنت سے اس پر کوئی دلیل نہ ہو،

الاحکام فی اصول الاحکام ص ۷ ج ۱،

اما ابن رجب فرماتے ہیں کہ

والمراد بالبدعة ما احدث مما لا اصل له فی الشريعة يدل عليه فاما ما كان له اصل مین الشرع يدل عليه فليس ببدعة شرعا وان كان بدعة لغة،

یعنی بدعت سے مراد نوا ایجاد چیز جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو جو اس پر دلالت کرے، بہر حال جس کی شریعت میں کوئی اصل ہو جو اس پر دلالت کرے وہ شرعی بدعت نہیں اگرچہ وہ لغت کے اعتبار سے بدعت ہو،

جامع العلوم والحکم ص ۷ ج ۲

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ

والبدعة على قسمين، تارة تكون بدعة شرعية كقوله، فان كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و تارة تكون بدعة لغوية، كقول امير المؤمنين عمر بن الخطاب رضى الله عنه عن جمعه اياهم على صلاة التراويح واستمرارهم، نعمت البدعة هذه،

اور بدعت کی دو قسمیں ہیں (۱) بدعت شرعی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، (۲) بدعت لغوی، جیسا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تراویح اکٹھے پڑھنے کے متعلق فرمایا کہ یہ کیا ہے اچھی بدعت ہے، تفسیر ابن کثیر ص ۱۶۱ ج ۱ طبع بیروت ۱۳۸۸ھ علامہ شاطبی فرماتے ہیں کہ

طريقة في الدين مخترعة تصا هي الشريعة يقصد بالسلوك عليها المبالغة في التعبد لله سبحانه،

یعنی دین کے اندر ایسا نوا ایجاد طریقہ جو شریعت اسلامیہ کے مشابہ ہو اور اس پر عمل

کرنے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ کرنا مقصود ہو، للاعتصام ص ۷۳ ج ۱
علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں کہ

والبدعة الحدث وما ابتدع من الدين بعد الاكمال.

بدعت نئی چیز کو کہتے ہیں جو دین میں اس کی تکمیل کے بعد نکالی گئی ہو (لسان العرب
ص ۶۸ ج ۸،

امام ابن الاثیر اپنی معروف کتاب، النہایہ، میں فرماتے ہیں

كل محدثة بدعة انما يريد ماخالف اصول الشريعة ولم يوافق السنة،

كل محدثة بدعة (کی حدیث) کا معنی یہ ہے کہ جو چیز اصول شریعت کے خلاف ہو اور سنت
مصطفیٰ ﷺ کے موافق نہ ہو، کذا فی لسان العرب ص ۸۶ ج ۸۔

علامہ مرتضیٰ الزبیدی حنفی (التوفی سن ۱۲۰۵ھ) نے تاج العروس شرح قاموس ص ۷۱ ج ۲
ج ۵، میں انہیں الفاظ سے بدعت شرعی کا معنی کیا ہے

آخر میں ہم علامہ وحید الزماں مرحوم حیدر آبادی کی ایک عبارت بھی ذکر کر دیتے ہیں،
کیونکہ مبتدعین اکثر ان کی ادھوری عبارت ذکر کر کے فتح حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے
ہیں چنانچہ آپ بدعت کی تحقیق اور تنقیح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں
اور قول محقق یہ ہے کہ بدعت لغوی کی دو قسمیں ہیں حسنہ اور سیئہ لیکن بدعت شرعی
ہمیشہ سیئہ ہوتی ہے جیسے حدیث میں ہے،

كل بدعة ضلالة (لغات الحديث جلد اول کتاب ب، ص ۳۰ مادہ بدع،
قارئین آپ نے ان محکم اور ٹھوس حوالہ جات کو جب بغور پڑھ لیا ہے تو پھر آپ اس نتیجہ
پر بھی یقیناً پہنچ چکے ہوں گے کہ تمام مکاتب فکر کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جو چیز دین
میں نئی نکالی گئی ہو اگرچہ وہ عقیدہ یا عمل یا حال ہو تو وہ بدعت ہے۔

بدعت کے شرعی معنی پر مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض

فرماتے ہیں اگر مان بھی لیا جائے کہ بدعت میں دینی کام کی قید ہے تو دینی کام اسی کو کہتے ہیں جس پر ثواب ملے مستحبات، نوافل واجبات فرائض سب دینی کام ہیں کہ اس کو آدمی ثواب کے لیے کرتا ہے اور دنیا کا کوئی کام نیت خیر سے کیا جائے اس پر ثواب ملتا ہے (یہ ہے مفتی صاحب کے اعتراض کا خلاصہ خیر سے اس پر انہوں نے بزرگ خود دلائل بھی دیئے ہیں) جاء الباطل ص ۲۲۳،

الجواب

اولاً اسلام دو چیزوں کا نام ہے، عقائد اور اعمال، پھر اعمال میں دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق حقوق اللہ سے ہے تو دوسرے کا حقوق العباد سے، مفتی صاحب نے خیر سے جن کاموں کو دنیاوی قرار دیا ہے کہ مسلمان سے خندہ پیشانی سے ملنا صدقہ کا ثواب رکھتا ہے، اپنے بچوں کو پالنا نیت خیر سے ہو تو ثواب ہے لہذا مسلمان کا ہر دنیاوی کام دینی ہے اب بتاؤ کہ نیت خیر سے پلاؤ کھانا بدعت ہے یا نہیں، جاء، الباطل ص ۲۲۳۔

حالانکہ یہ خالص شرعی اور دینی کام ہیں ہم حکیم الامت کے مکتب فکر کے علماء سے پوچھتے ہیں کہ، حقوق العباد، دین اسلام میں داخل ہیں کہ نہیں؟ اگر جواب مثبت میں ہے، تو بتائیے پھر مسلمان سے ناراض رہنا بال بچوں کی پرورش نہ کرنا بے دینی ہے کہ نہیں؟ اگر ہے یقیناً ہے، تو پھر بتائیے جس شخص کا یہ عقیدہ و نظریہ ہو کہ حقوق العباد کا غضب کرنا جائز ہے؟ یہ قول و عمل بدعت میں شامل ہے کہ نہیں؟ اگر مفتی صاحب کی پیروی میں اسے بدعت میں شامل نہیں کرتے تو ذرا قرآن کی ان آیات بینات کا مفہوم تو بیان کر دیجئے گا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً

عَلَىٰ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (الانعام ۱۴۰)

ترجمہ۔ بے شک تباہ ہوئے وہ جو اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں احمقانہ جمالت سے اور حرام

ٹھہراتے ہیں وہ جو اللہ نے انہیں روزی، دی اللہ پر جھوٹ باندھنے کو بے شک وہ پہلے اور راہ نہ پائی (احمد رضا خاں)

ثانیاً علماء بریلویہ بتائیں انہوں نے کتب اصول میں کہیں مباح کی بھی تعریف پڑھی ہے، لایثاب علیہ ولا یعاقب، توضیح ص ۲۶۔ طبع نول کشور

یعنی نہ تو اس کے کرنے پر ثواب ہوتا ہے نہ عذاب، مزید دیکھئے، خلاصۃ الافکار ص ۱۵۹ و فتاویٰ شامی ص ۱۲۳ و ص ۶۵۳ ج ۱ و اصول السرخسی ص ۱۱۲ ج ۱، وغیرہ، خود حضرت مفتی صاحب نے جاء الباطل، ص ۱۹ ج ۱، میں ایک عبارت ذکر کی ہے جس میں تصریح ہے کہ مباح میں ثواب متعلق نہیں ہوتا، اس سے بڑھ کر ہم فریق ثانی کی اور کیا تسلی کر سکتے ہیں

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

فرماتے ہیں دینی کام کی قید لگانا آپ کے لیے کوئی مفید نہیں کیونکہ دیوبند کا مدرسہ وہاں کا نصاب دورہ حدیث تنخواہ لیکر مدرسین کا پڑھانا، امتحان اور تعطیلات کا ہونا آج قرآن پاک میں اعراب لگانا قرآن و مخاری چھاپنا مصیبت کے وقت ختم مخاری کرنا جیسا کہ پندرہ روپیہ لیکر کرایا جاتا ہے بلکہ سارا فن حدیث بلکہ خود احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بلکہ خود قرآن کو کاغذ پر جمع کرنا۔ اس میں رکوع بنانا اس کے تیس سپارے کرنا وغیرہ سب ہی دینی کام ہیں اور بدعت ہیں کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ان میں سے کوئی کام نہ ہوا تھا، جاء الباطل ص ۲۲۴ ج ۱

الجواب

یہ عبارت بریلویت کے حکیم الامت کے مغالطہ کا منہ بولتا ثبوت ہے، تفصیل حسب ذیل

ہے

اولاً مفتی صاحب کا دینی مدارس کو بدعت میں شامل کرنا صرف وہم ہے کیونکہ حضور ﷺ کی زندگی مبارکہ میں مسجد نبوی کے لمحہ ایک صفہ ہوا یا گیا تھا جہاں لوگ دینی تعلیم پاتے

تھے، معلوم نہیں مفتی صاحب تاریخ سے اتنے بے خبر کیوں ہیں؟ خود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے،

خیر کم من تعلم القرآن و علمہ.

تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن پڑھتا اور پڑھاتا ہے

(بخاری ص ۵۲ ج ۲، مشکوٰۃ ص ۱۸۳)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بیعت عقبہ کے بعد اسی غرض سے مدینہ بھیجا گیا تھا کہ لوگوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیں، مسند امام احمد ص ۲۹۱ ج ۲، و بخاری مع فتح الباری ص ۵۶۸ ج ۸،

نظام حکومت قائم ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جو امراء و عمال مقرر فرمائے ان کا سب سے مقدم فرض کتاب و سنت کی تعلیم دینا قرار پایا، چنانچہ، استیعاب، تذکرہ معانی بن جبل رضی اللہ عنہ، میں ہے

بعثہ رسول اللہ ﷺ قاضیا الی الجندین بالیمن یعلم الناس القرآن و شرایع

الاسلام، (الاستیعاب بر حاشیہ الاصابہ ص ۳۵۶ ج ۳)

آپ نے ان کو یمن کے ایک حصہ کا قاضی مقرر فرما کر بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو قرآن مجید اور احکام اسلام کی تعلیم دیں،

چنانچہ انہوں نے وہاں جا کر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں لوگوں کو تعلیم الاسلام اور تفقہ فی القرآن پر توجہ دلائی اور فرمایا جب قرآن پڑھ چکنا تو مجھ سے پوچھ لینا کہ جتنی کون ہے؟ اور جنہی کون ہے؟

جب وہ لوگ قرآن کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے آپ سے یہی سوال کیا، سنن دارمی ص ۸۳ ج ۱، اس کے بعد اگرچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں تعلیم قرآن کے متعلق کوئی خاص یا جدید انتظام نہیں کیا گیا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی دور خلافت میں نہایت وسیع پیمانہ پر تعلیم قرآن کا سلسلہ شروع کیا تمام مفتوحہ علاقوں میں

تعلیم قرآن کے لیے مکاتب قائم کئے اور بعض علاقوں میں قرآن مجید کی جبری تعلیم کا انتظام کیا، چنانچہ ایک شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا، خاص اس کام پر مامور کیا کہ بدوؤں کے قبائل میں دورہ کر کے ہر شخص کا امتحان لے اور جسکو قرآن مجید یاد نہ ہو اس کو سزا دے (اصلہ تذکرہ اوس بن خالد)

اگر ان دلائل سے بھی کسی طالب حق کی تسلی نہیں ہوئی تو ایسے متلاشی حق کے لیے مزید عرض ہے کہ جب نبی ﷺ کی زندگی مبارکہ کے آخری دور میں وفود کا سلسلہ شروع ہوا، تو جو مہاجر آتے انہیں مدینہ کے انصار قرآن و سنت پڑھاتے، چنانچہ وفد عبدالقیس جب واپس گیا تو انہوں نے اعتراف کیا،

ان الانصار يعلمونا کتاب ربنا و سنة نبينا،

یعنی انصار ہم کو ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت سکھاتے تھے۔

مسند احمد ص ۴۳۲ ج ۳ رقم ۱۵۱۳۱

ثانیاً انہیں دلائل سے معلم مقرر کرنا بھی ثابت ہو گیا اور معلم کو اجرت دینا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے، اگر علماء بریلی کو شکم پڑھنا سے فرصت ہو تو کبھی کبھار سیرت نبی کریم ﷺ کو بھی پڑھ لیا کریں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ جنگ بدر کے قیدیوں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے سے فدیہ لیا گیا جس کی مقدار ایک ہزار سے لیکر چار ہزار درہم تھی اہل مکہ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے جبکہ اہل مدینہ لکھنے پڑھنے سے واقف نہ تھے اس لئے یہ طے کیا گیا کہ جس کے پاس فدیہ نہ ہو وہ مدینے کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے جب یہ بچے اچھی طرح سیکھ جائیں تو یہی اس کا فدیہ ہوگا،

الرحیق المختوم ص ۷۸، و ضیاء النبی ص ۳۹۵ ج ۳، مؤلفہ پیر کرم شاہ بریلوی،

ثالثاً، قرآن پاک کے اعراب کو بدعت میں شامل کرنا انتہا درجہ کا سفہ پن ہے کیونکہ ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ عربی زبان کی ایک سطر بھی بغیر اعراب کے نہیں پڑھی جاسکتی اور ہماری طرف سے پوری دنیا کے مبتدعین بریلویہ کے علماء کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ بغیر اعراب کے عربی کا صرف ایک جملہ پڑھ کر دکھادیں کہ جملہ پڑھا جائے اور اس پر اعراب نہ پڑھے جائیں،

جب آپ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب سنئے کہ نبی ﷺ قرآن کو پڑھا کرتے تھے
(سورۃ التیمۃ آیت ۱۸)

بلکہ صحابہ کرام نے تو نبی ﷺ کی قرأت کو اس قدر محفوظ رکھا تھا کہ آنحضرت ﷺ مالک
یوم الدین، یا، ملک یوم الدین، پڑھا کرتے تھے، دیکھئے ان کثیر ص ۲۴،
رابعاً، قرآن و بخاری کو دین مصطفیٰ کی اشاعت اور اسلام کی حفاظت و برتری اور کفار
کو دعوت اسلام اور مسلمانوں کو دین سے روشناس کرانے کی غرض سے شائع کیا جاتا ہے اور
تحریری طور پر کفار کو دعوت اسلام دینا سنت مصطفیٰ ﷺ ہے اگر اعتبار نہ ہو تو سیرت مصطفیٰ
ﷺ میں بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط کا مطالعہ ضرور کریں، علاوہ ازیں قرآن و حدیث کو
حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی مبارکہ میں تحریری طور پر لکھا جاتا تھا، پھر ہمارے نزدیک قرآن و
حدیث زبانی ہوں یا کسی کاتب نے لکھے ہوں یا کسی پر لیس میں چھپے ہوں، وہ قرآن ہونے میں برابر
ہیں، یہ نہیں جو زبانی پڑھ رہا ہے یا خطی ہے وہ قرآن ہی نہیں، نعوذ باللہ من ہذا، تو پھر اعتراض
کیسا،

خامسا، ظاہر ہے کہ قرآن عربی مبین میں ہے اور اس کی عملی تفسیر نبی کریم ﷺ کا اسوہ
حسنہ بھی عربی میں ہی معرض وجود میں آیا تھا، اہل عرب اور صحابہ کرام کی چونکہ مادری زبان ہی
عربی تھی، وہ تو اپنی زبان پر عبور رکھتے تھے، جبکہ ایک عجمی قرآن و حدیث میں اس وقت تک
رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ عربی زبان میں شدید حاصل نہ کر لے،
سادسا، قرآن کی جمع و ترتیب اور رکوعات کو بدعات میں شمار کرنا غلط محض ہے جمع قرآن
کے سلسلہ میں دین الحق، ص ۵۵۳ حصہ اول، میں ہم نے صراحت کردی ہے اسے وہاں ہی
دیکھئے البتہ جمع حدیث کے متعلق راقم کچھ عرض کر دیتا ہے

کیا علم حدیث بدعت ہے

حضرت مفتی صاحب کافن حدیث کو بدعات میں شمار کرنا ان کی کم آگئی کی واضح برہان ہے
کیونکہ عرف عام میں حدیث تو نبی رحمت رسول مکرم ﷺ کے مقدس فرمان، فعل اور تقریر

کو کہا جاتا ہے خود مفتی صاحب لکھتے ہیں، اصطلاح میں صرف حضور کے فرمان اور کام کو حدیث کہا جاتا ہے، (مرآۃ المناجیح ص ۱۴۴ ج ۱)

اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ آپ علیہ السلام کے اقوال و افعال حجت شرعیہ ہیں اور آپ کی پیروی اسلام ہے (جس کے دلائل آگے آرہے ہیں)

جب آپ نے انہیں ہی بدعات میں شامل کر لیا تو بقیات آپ کے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے حضرت مفتی جی! نبی کریم ﷺ کی حدیث اگر بدعات میں شامل ہیں تو انہیں دین سے خارج کر کے ہمیں کتے کی حرمت تو ثابت کر کے دکھا دیجئے کیونکہ قرآن میں اس کے حرام ہونے کی وضاحت نہیں ہے! اگر علماء بریلویہ کہہ دیں کہ نہیں نہیں ان کی تحریر کا مقصد فقط اس قدر ہے کہ حدیث کی جمع و ترتیب اور حافظے سے تحریر میں انتقال بدعت ہے، کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں نہ تھی، تو جو بلا عرض ہے کہ حدیث کو ضبط تحریر میں لانے کی ابتدا تو حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی مبارکہ میں شروع ہو چکی تھیں چنانچہ ملاحظہ ہو۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے ۸ھ، میں فتح مکہ کے موقع پر انسانی حقوق اور مکہ کی عزت و حرمت کے بارے میں مسائل کو بیان فرمایا تو ایک یمنی آدمی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے یہ احکام لکھوا دیجئے تو آپ علیہ السلام نے حکم فرمایا کہ، اکتبوا لای شہ، میری حدیث ابو شاہ کو لکھ دو، بخاری کتاب العلم

(۲) رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ جہینہ کو ایک حدیث لکھوا کر بھجوائی کہ مردہ سے نفع حاصل نہ کرو (ابوداؤد ص ۲۱۳ ج ۲، و ترمذی مع تحفہ ص ۴۵ ج ۳، و سنن نسائی ص ۱۸۳ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۲۶۶)

(۳) رسول اللہ ﷺ نے ملک یمن کے شہر جرش کے لوگوں کو کھجور اور منقہ کو ایک ساتھ بھگونے سے منع فرمایا تھا کہ اس میں نشہ کا اندیشہ تھا، مسلم شریف ص ۱۶۴ ج ۱،

(۴) نبی ﷺ نے ہر قبیلہ والوں کو دیت کے مسائل کی تفصیلات لکھوائیں اور یہ بھی لکھوایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ امر جائز نہیں کہ بلا اجازت اصل مالک کے کسی غیر کے آزاد کردہ غلام کا والی بن جائے، (صحیح مسلم ص ۴۹۵ ج ۱۔)

(۵) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے ایک صحیفہ لکھا اور اس صحیفہ کے مسائل یہ ہیں (۱) تحدید حرم (۲) ایجاد بدعت پر لعنت (۳) بدعتی کی تکریم اور اس کو جگہ دینے پر لعنت (۴) ذمہ اور عہد کے وفانہ کرنے پر لعنت (۵) کسی دوسرے کے آزاد کردہ غلام کو اپنا مولا بنانے پر لعنت (۶) اونٹوں کے متعلق مسائل (۷) مسائل جراحات اور دیت (۸) زمین کی حد فاصل اور امتیازی نشانات کے مٹانے اور چوری کرنے پر لعنت (۹) ذبح لغیر اللہ کی حرمت (۱۰) احکام ذمیاں وغیرہ بھی مرقوم ہیں، (بخاری ص ۱۴۵ ج ۱، و مسلم ص ۳۹۵ ج ۱- وغیرہ)،

اسی طرح حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خود بھی احکام قضا کی حدیثیں جمع کی تھیں جو کتاب قضایا کے نام سے موسوم تھی، (مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۰)،

(۶) نبی کریم ﷺ نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ تمام حدیثیں قلم بند کروادی تھیں جن کا تعلق مسائل زکوٰۃ سے تھا اس کا نام کتاب الصدقہ تھا، لیکن اس کو ابھی حکام کے پاس روانہ نہ کر پائے تھے کہ آپ علیہ السلام کا انتقال ہو گیا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے دور خلافت میں اسے نافذ کیا اور اس کے مطابق زکوٰۃ کے وصول کرنے کا انتظام رکھا، سنن ابوداؤد مع عون ص ۸ ج ۱،

(۷) نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری دور میں احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ اہل یمن کے پاس حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی معرفت روانہ کیا تھا، سنن نسائی ص ۲۲۷ ج ۲، رقم الحدیث ۳۸۵۷

ان چند مثالوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اپنے فرمودات و ہدایات کو لکھنے کا حکم و ارشاد فرمایا اور قلم بند کروایا بھی تھا ہم ان ہی چیزوں کو حدیث کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، انتہی کلام الرحمانی، صیانة الحدیث ص ۳۹،

مفتی صاحب کا اکابر اہل حدیث کو چیلنج

فرماتے ہیں ہم نے مولوی ثناء اللہ امرتسری کو اپنے مناظرہ میں کہا تھا کہ آپ حضرات چار

چیزوں کی صحیح تعریف کر دیں جس پر کوئی اعتراض نہ ہو جامع مانع ہو، تو جس قدر چاہیں ہم سے انعام لیں، بدعت، شرک، دین، عبادت، اور اب بھی اپنے رب کے بھروسہ پر کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دیوبندی کوئی غیر مقلد اور کوئی شرک و بدعت کی رٹ لگانے والا ان چاروں چیزوں کی تعریف ایسی نہیں کر سکتا جس سے اس کا مذہب بچ جائے، جاء الباطل ص ۲۲۲،

الجواب

اولاً مفتی صاحب نے یہ چیلنج جس انداز سے کیا ہے وہ ان کی لاعلمی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ایسی تعریف ہو جس پر کوئی اعتراض نہ ہو، اے جی اعتراض تو ہر چیز پر ممکن ہے، لوگوں نے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام علیہم السلام تک معاف نہیں کیا، قرآن کے رد میں لکھی گئی کتب، ستارش پرکاش، ترک اسلام، تنویر الاذہان فی فصاحت القرآن، وغیرہ سے غالباً علماء بریلوی بھی واقف ہوں گے جن کا جواب کسی بریلی کے نام نہاد مفسر قرآن اور مجدد مائتہ حاضرہ وغیرہ اور گجرات کے بقلم خود حکیم الامت نے نہیں دیا بلکہ ان کا جواب تحریر کرنے والے سچے محبت قرآن اور شرک و بدعت سے نفرت دلانے والے اور یکے متبع سنت تھے جن پر آپ اور آپ کے مجدد ملت اور اس کی ذریت خبیثہ کفر کے فتوے لگا رہی تھی، یہ تمام حقائق تاریخ کی امانت ہیں،

ثانیاً، بدعت کی جامع مانع تعریف ہم نے کر دی ہے جس کا جواب انشاء اللہ کسی رضوی علامہ فہامہ سے ممکن نہیں

شرک کی تعریف

ثالثاً، شرک کی تعریف بھی سن لیجئے، شرک کا لغوی معنی ہے، خلط الملکین، مفردات القرآن ص ۲۵۹، یعنی حصہ دار، قرآن میں ارشاد ہوتا ہے

(۱) ولم یکن له شریک فی الملک، (بنی اسرائیل ۱۱۱)

اور نہ ملک میں اس کا کوئی شریک ہے، (ثانی)
 اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ
 اللہ رب العزت اپنی ذات اور تمام صفات میں، منفرد، واحد اور اکیلا ہے اس کی ذات اور ہستی میں
 کوئی ایک شریک نہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

(۲) وَلَا اِشْرَکَ بِرَبِّیْ اَحَدًا، (الکھف ۳۸)

اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا، (ثانی)

(۳) وَلَیْقُوْلَ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اِشْرَکْ بِرَبِّیْ اَحَدًا، (الکھف ۴۲)

اور کتنا تھا ہائے میری کم ختی میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتا (ثانی)

(۴) وَلَا یَشْرَکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ اَحَدًا، (الکھف ۱۱۰)

ترجمہ۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بناوے (ثانی)

(۵) یَهْدِیْ اِلَی الرِّشْدِ فَاَمَّا نَا بِهٖ وَلَنْ نَّشْرَکَ بِرَبِّنَا اَحَدًا (الجن ۲)

ترجمہ۔ ہم آئندہ کو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے، (ثانی)

(۶) اِنَّ الْمَسْجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تُدْعَوْنَ مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (الجن ۱۸)

ترجمہ۔ اور تمام مسجدیں اللہ کیلئے ہیں پس ان میں اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو، (ثانی)

(۷) قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَا اِشْرَکَ بِهٖ اَحَدًا (الجن ۲۰)

ترجمہ۔ تو کہہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں

کرتا، (ثانی)

(۸) قُلْ اِنِّیْ لَنْ یَّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ وَلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَئِدًا (الجن ۲۲)

ترجمہ۔ تو کہہ دے بذات خود مجھے بھی اللہ کے سوا کوئی پناہ نہیں دے گا اور اس کے سوا

میں کہیں پناہ نہیں پاؤں گا (ثانی)

(۹) قُلْ هُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ☆ اللّٰہُ الصَّمَدُ ☆ لَمْ یَلِدْ و لَمْ یُولَدْ ☆ وَلَمْ یَکُنْ لَہٗ کُفُوًا

احد. (الاخلاص)

اے رسول تو کہہ کہ بات یہ ہے کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس نے کسی کو جنانہ کسی سے وہ جنانہ اس کا کوئی ہمسر ہے

ان آیات بینات میں اس بات کو کھل کر، أَحَدًا اور أَحَدًا، سے بیان کر دیا کہ کوئی بھی ہو اگرچہ نبی ہو یا فرشتہ یا کوئی اور نیک شخصیت اللہ تعالیٰ کا کسی طرح بھی شریک و سہم نہیں، نہ ذات میں اور نہ ہی صفات و افعال میں کیونکہ رب العالمین ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے، وحدہ لا شریک ہے۔

عبادت کی تعریف

رابعاً، عبادت نہایت درجے کی عاجزی اور تذلل کو کہتے ہیں اقرب الموارد میں ہے،

عبدالله طاع له و خضع وذل و خدمه و التزم شرائع دينه و وحده،

یعنی عبد اللہ (اللہ کی عبادت کی) کے معنی ہیں اس کی اطاعت کی اور اس کے احکام کے آگے سر جھکا یا اور اس کی خدمت (دین) کی اور اس کے دین کے احکام پر مستقل طور پر عمل کرنے لگا اور اس کی توحید کا اقرار کیا،

لسان العرب میں ہے، معبد اذا كان مذلاً بجثرة الوطء ص ۳۷۲ ج ۳

یعنی لغت میں عبادت کا معنی اطاعت ہے جو خضوع و خشوع سے ہو، چنانچہ اس راستے کو جو بہت پائمال ہو اور اس پر آمدورفت زیادہ ہو، طریق معبد، کہتے ہیں (نیز کہا، المعبد المذل والتعبد التذل، مزید کہا ہے، طریق معبد ملوک مذلل، ص ۷۷۲

یہی معنی علامہ زمخشری نے، اساس البلاغة، میں عبادت کا، مذلل؛ کیا ہے، ص ۲۹۱)

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ عبادت کے لفظی معنی ہیں اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار اور اصطلاح شریعت میں خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے بذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بحالانا ہے اسی وجہ سے قرآن میں عبادت کا لفظ تکبر و غرور کے بالمقابل بولا

گیا ہے

ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم ذخرین۔ (المومن ۶۰)
ترجمہ۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے،

ومن عندہ لا یستکبرون عن عبادتہ ولا یتحسرون (الانبیاء ۱۹)
ترجمہ۔ جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے،

انما یؤمن بایتنا الذین اذا ذکروابہا خروا سجداً و سبحوا بحمد ربہم وہم لا یستکبرون (السجدہ) آیت نمبر ۱۵۔

ترجمہ۔ ہمارے احکام وہی لوگ مانتے ہیں کہ جب ان کو اس احکام کی بات نصیحت کی جائے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیحیں پڑھتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے (ثانی)

اس طرح کے مزید مقامات بھی قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں عبادت کے بالمقابل تکبر و غرور کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لہذا ثابت ہوا کہ تکبر و غرور کے معنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بڑا سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی گردن کو جھکانے سے عار کرنا ہے، تو عبادت کے معنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی پیروی کرنا ہے اسی وجہ سے قرآن و حدیث میں بندے کا ہر وہ کام جس سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو عبادت ہے، اس میں انسان کی نیت و ارادہ کا موقوف ہونا بھی از بس ضروری ہے، مثلاً اگر زید اپنی شہرت کے لیے کسی نیک کام کے لیے لاکھوں روپے دے ڈالے تو وہ عبادت نہیں ہوگی لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی تعمیل میں ایک روپیہ بھی کسی محتاج و فقیر کو دے تو عند اللہ وہ عبادت ہے، تعلیم الرسول میں یہ حکم و ارشاد واضح ہے،

انما الاعمال بالنیات،

اعمال کا دار و مدار نیت پر موقوف ہے (بخاری ص ۲ ج ۲ و مسلم ص ۴۰ ج ۲)

چنانچہ اس تعلیم محمدی میں پاک روزی کھانا اور اس کا شکریہ ادا کرنا بھی عبادت ہے (سورۃ البقرہ آیت ۱۷۲) سورہ ہود میں توکل یعنی کام کے لیے کوشش کر کے نتیجہ کو اللہ کے سپرد کر دینا عبادت کہا گیا ہے (ہود ۱۲۲) اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے (مریم ۶۶) کسی شکستہ دل سے تسکین و تشفی کی بات کرنا اور گناہ گار کو معاف کر دینا بھی عبادت ہے (البقرہ ۱۶۳)

ان دلائل کے ساتھ اگر کتب احادیث کا مطالعہ کر کے عبادات کو شمار کیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے مگر ہم اس پر اصولی گفتگو کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے احکام کی پیروی ہی شریعت حقہ میں عبادت شمار ہوتی ہے چنانچہ وہ لوگ جو اطاعت اللہ اور اطاعت رسول کے بالمقابل کسی پیرو فقیر و درویش وغیرہ کی بات کو حجت و دلیل جانتے ہیں اسے قرآن نے مشرک کہا ہے،

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وان الشیطن لیوحون الیٰ اولینہم لیجادلوکم وان اطعتموہم انکم

لمشركون۔ (الانعام آیت ۱۲۱)

ترجمہ۔ اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو اس وقت تم مشرک ہو (احمد رضا خاں)

اس کے حاشیہ میں بریلویت کا مفسر قرآن مولوی نعیم الدین مراد آبادی لکھتا ہے کیونکہ دین میں حکم الہی کو چھوڑنا اور دوسرے کے حکم کو ماننا اللہ کے سوا اور کو حاکم قرار دینا ہے (ف ۲۴۲ ص ۲۰۷) اس آیت کی تفسیر میں مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی فرماتے ہیں کہ، یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حلال کیے ہوئے کو حرام کیا یا حرام کیے ہوئے کو حلال کیا، وہ مشرک ہو جائے گا، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال اعتقاد کرے، تب وہ کافر و مشرک ہوگا اور اگر وہ اللہ کے حرام کیے ہوئے کاموں

کو اپنی نفسی خواہش سے کرتا ہو، لیکن وہ ان کاموں کو حرام ہی جانتا ہو تو وہ فاسق اور مرتکب معصیت کبیرہ ہوگا۔ کافر و مشرک نہیں ہوگا، تبیان القرآن ص ۶۲۲ ج ۳

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے احکام کی مجاکوری کا نام ہی عبادت ہے اور اس کی مخالفت اور غیر کی اتباع ہی دراصل اس کی عبادت میں شریک ٹھہرانا ہے اور یہی شرک ہے اور اس کا فاعل مشرک ہے

خود مفتی صاحب کو ہمارے اس بیان پر اعتبار ہے چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص شیطان کی پیروی میں کسی مسلمان سے مذہبی نفرت رکھتا ہے تو ایسا انسان مشرک ہے ان کے اصل الفاظ یہ ہیں جو شرک کرے وہ مشرک جو مشرکوں سے دینی محبت کرے وہ کافر ہے، جو مسلمانوں سے مذہبی نفرت رکھے وہ بھی مشرک و کافر ہے (نور العرفان ص ۲۲ طبع ادارہ کتب اسلامیہ گجرات)

دین کی تعریف

دین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کا حامل ہے، ایک تو یہ کہ غلبہ و اقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرف سیاست و فرمانبروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔

وَقَتْلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ، (البقرة آیت ۱۹۲)

اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے کفر اور ہوے دین واسطے اللہ کے (۲-۱۹۲) (شاہ رفیع الدین)

دوسرا مفہوم طاعت، فرمانبرداری غلامی ہے

أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ، (الزمر آیت ۳)

خبردار، ہو واسطے اللہ کے عبادت خالص، (۳-۳۹) شاہ رفیع الدین،

تیسرا مفہوم وہ عادت و طریقہ ہے جس کی انسان پیروی کرے،

مَا كَانَ لِیَأْخُذَ أَخَاهُ فِی دِینِ الْمَلِکِ، (یوسف آیت ۷۶)

وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو رکھ نہیں سکتا تھا (۱۲-۷۶)

وحید الزمان

ان تینوں مفہومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنی اس طرز عمل اور اس رویے کے ہیں جو کسی کی بالائے اور اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے، ہماری پہلی درج کردہ آیت سے واضح ہے کہ اس کا مستحق فقط اللہ کی ذات ہے، یعنی انسان اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام کی اطاعت کرے،

لیجئے جناب یہ ہے، ہماری طرف سے آپ کے چیلنج کا جواب! جس کا جواب الجواب انشاء الرحمن پوری دنیا کے مبتدعین بریلویہ پر قیامت کی صبح تک ادھار رہے گا،

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل بھی سنت میں داخل

ہے

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں نبی ﷺ نے فرمایا

فانه من يعش منكم بعدى يرى اختلافاً كثيراً وإياكم ومحدثات الأمور فانها

ضلالة فمن ادرك ذلك منكم فعليه بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا

عليها بالنواجذ.

الحديث ترمذی مع تحفه ص ۸۷ ج ۳، والبوداؤد ص ۲۷۹ ج ۲، وابن ماجہ ص ۵، و

سنن داری ص ۵۷ ج ۱، ومند احمد ص ۱۲۶ و ۱۲، وحاکم ص ۹۲ و ۹۷ ج ۱۔

جو شخص میرے بعد زندہ رہا وہ کثرت سے اختلاف دیکھے گا لہذا تم چاؤ اپنے آپ کو (دین

اسلام میں) نئے نئے نکلے ہوئے کاموں سے کیونکہ نئے کام گمراہی ہیں پس جو شخص تم میں سے

پائے ایسے زمانے کو تو اس پر لازم ہے کہ وہ میری اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو جو

ہدایت یافتہ ہیں، مضبوطی سے پکڑے اور اپنی ڈاڑھوں سے محکم طور پر قابو میں رکھے، ملا علی قاری حنفی مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں

فانهم لم يعملوا الابستى فالاضافة اليهم اما لعملهم بها اولاستنباطهم و

اختيارهم اياها. (مرقاۃ ص ۲۴۲ ج ۱)

اس واسطے کہ حضرات خلفاء راشدین نے درحقیقت نبی ﷺ کی سنت پر ہی عمل کیا پس سنت کی اضافت ان کی طرف یا تو اس لیے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا یا اس لئے کہ انہوں نے خود استنباط و اجتہاد کر کے اس کو اختیار کیا۔

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

فرماتے ہیں کہ :-

یہ بھی محض دھوکا ہے اس لئے کہ ہم نے مرقاۃ اور اشعۃ اللمعات کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ بدعت وہ کام ہے جو حضور علیہ السلام کے بعد پیدا ہوا، اس میں صحابہ کرام و تابعین کا ذکر نہیں نیز اس لیے کہ مشکوٰۃ باب قیام شہر رمضان میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں تراویح کی باقاعدہ جماعت کا حکم دیا پھر تراویح کی جماعت کو دیکھ کر فرمایا،

نعمت البدعة هذه .

یہ تو بڑی اچھی بدعت ہے،

خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مبارک فعل کو بدعت حسنہ فرمایا ہے، جاء الباطل

ص ۱۲۲۶ ج ۱

الجواب

اولاً فرار کے لئے مفتی صاحب نے جو مخلص تلاش کیا ہے، وہ کارآمد نہیں کیونکہ ہم نے حدیث مصطفیٰ پیش کی ہے، اس کے جواب کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہے، مگر مفتی

الجواب

اولاً صحابی رضی اللہ عنہ نے کس چیز کو بدعت کہا ہے اس کی تفصیل راقم نے، دین الحق ص ۵۵ ج ۱، میں کر دی ہے اسے وہاں ہی ملاحظہ کر لیا جائے
ثانیاً، حضرت حکیم الامت کو مغالطہ دینے میں بھی خوب مہارت ہے اور اس کمال میں وہ تمام بریلوی علماء سے زیادہ ملکہ رکھتے تھے

بات تو صرف اتنی سی تھی کہ امام ابومالک تابعیؒ نے اپنے والد محترم سے ایک فرضی مسئلہ پوچھا تھا اور اس فرضی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اسے بدعت قرار دیا مگر مفتی صاحب یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرام اس پر عمل پیرا تھے، جبکہ حدیث اس کی نفی کرتی ہے چنانچہ سنن نسائی میں ہے،

قال صلیت خلف رسول اللہ ﷺ فلم یقنت و صلیت خلف ابی بکر فلم

یقنت و صلیت خلف عمر فلم یقنت و صلیت خلف عثمان فلم

یقنت و صلیت خلف علی فلم یقنت، الحدیث،

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں (اور یہ تمام) قنوت نہیں پڑھا کرتے تھے (۱-۱۲۸، رقم الحدیث ۱۰۸۱)

مگر مفتی صاحب کا طرز استدلال ہی نرالا ہے کہ اس روایت سے ثابت کر رہے ہیں کہ صحابہ کرام میں قنوت نازلہ ہمیشہ اور بلا سبب پڑھی جاتی تھی پھر اس الٹی سمجھ پر عمل صحابہ پر بدعت سیئہ کا فتویٰ لگا رہے ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون) علماء بریلویہ کا فہم ہی عجیب تر ہے اثبات پر آئیں تو مولوی احمد رضا کے ایجاد کردہ عمل کو بھی بدعت تسلیم نہ کریں اور نفی پر اتریں تو عمل صحابہ کو بھی بدعت سیئہ قرار دے دیں

ثالثاً، متن روایت کے کن الفاظ کا معنی، بدعت سیئہ، ہے یقیناً جانئے کہ یہ مفتی صاحب

صاحب ہمیں مرتاہ وغیرہ کی ایک عبارت سے ٹر خا رہے ہیں جو ان کی بے بسی کی واضح برہان ہے

حضرت حکیم الامت اور مفتی صاحب، حضرت محمد ﷺ خود خلفاء راشدین کے طریقہ و عمل کو اپنی سنت میں داخل کر رہے ہیں تو غیر معصوم علماء کے اقوال انہیں سنت سے خارج نہیں کر سکتے۔

ثانیاً، رہا آپ کا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرنا تو اس کے لئے عرض ہے،

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تراویح کو بدعت کہنا لغوی ہے نہ کہ شرعی! جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ، علامہ شاطبیؒ، اور امام ابن رجبؒ نے صراحت کی ہے دیکھئے۔ مرقاة المفاتیح ص ۳۲۷ و ۳۲۸ ج ۴۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

قیام رمضان کی صورت میں میں تراویح کا وجود تو خود حضرت رسول اکرم ﷺ کے دور مسعود میں تھا تو پھر تراویح بدعت شرعی کیسے ہو گئی؟ دراصل رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک کے بعد نماز تراویح کا باجماعت اہتمام نہیں رہا تھا۔ جب یہ حضرت کے زمانہ میں دوبارہ ہوا تو اس پر حضرت عمرؓ نے نعمت البدعة ہذہ! فرمایا کہ اس کا از سر نو آغاز اچھی بات ہے۔ (محمد متحی گوندلوی)

مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض

ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، مشکوٰۃ شریف، باب القلوب (درست القنوت ہے ابو صہیب) میں حضرت ابوالمالک اشجعی سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے اپنے والد سے نماز فجر میں قنوت نازلہ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا اے بیٹے یہ بدعت ہے دیکھو زمانہ صحابہ کی چیز کو آپ بدعت سیئہ کہہ رہے ہیں اگر زمانہ صحابہ کی ایجادات بدعت نہیں ہوتیں تو قنوت نازلہ بدعت سیئہ کیوں ٹھہری، جاء الباطل ص ۲۲۶،

کا افترا ہے۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

بخاری جلد دوم کتاب فضائل القرآن باب جمع القرآن ، میں ہے کہ حضرت صدیق نے حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو قرآن پاک جمع کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ ، کیف تفعلون شینا لم یفعلہ رسول اللہ ﷺ قال ہو خیر ، آپ وہ کام کیوں کرتے ہیں جو حضور علیہ السلام نے نہ کیا۔ صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ کام اچھا ہے ، حضرت زید بن ثابت نے بارگاہ صدیقی رضی اللہ عنہ میں عرض کیا کہ قرآن کا جمع کرنا بدعت ہے آپ بدعت کیوں ایجاد کر رہے ہیں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ بدعت تو ہے مگر حسنہ ہے یعنی اچھی ہے ، جاء الباطل ص ۲۷۷ ،

الجواب

اولاً بخاری کی مذکورہ روایت تو کجا کسی بھی معتبر روایت میں یہ الفاظ نہیں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ قرآن جمع کرنا بدعت ہے ، یہ مفتی صاحب کا افترا اور ایجاد بندہ ہے اپنے خانہ ساز مذہب کو حضرت زید کی طرف منسوب کرنا مفتی جی کی جرات ہے ، سنیوں کو جھوٹے پر ہزار بار لعنت ہو۔

قارئین کرام روایت کے اسی ٹکڑے سے ہی مفتی صاحب کا استدلال ہے کہ خلیفہ راشد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فعل کو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بدعت قرار دیا ہے مگر ہمارا یہ چیلنج ہے کہ یہ قول حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قطعاً نہیں ! جب یہ قول ہی ان کا نہیں تو مفتی صاحب کا استدلال خود بخود باطل و مردود ہو گیا ، آئیے حدیث مبارکہ کے پورے متن کو ملاحظہ کریں ، حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے ،

ارسل الی ابوبکر مقتل اهل الیمامة فاذا عمر بن الخطاب عنده قال ابوبکر

رضی اللہ عنہ ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر يوم الیمامة بقرا القرآن وانی

اخشى ان استحر القتل بالقرا! بالمواطن فيذهب كثير من القران وانى ارى ان تأمر
 بجمع القران، فقلت لعمر كيف تفعل شيئا لم يفعله رسول الله ﷺ قال عمر هذا
 والله خير فلم يزل عمر يرا جعنى حتى شرح الله صدرى لذلك ورايت فى ذلك
 الذى راى عمر قال زيد قال ابوبكر انك رجل شاب عاقل لانتهمك كنت وقد
 تكتب الوحى الرسول الله ﷺ فتتبع القرآن فاجمعه فوالله لو كلفونى نقل جبل من
 الجبال ما كان اثقل على مما امرنى به من جمع القرآن قلت كيف تفعلون شيئا لم
 يفعله رسول الله ﷺ قال هو والله خير فلم يزل ابوبكر يرا جعنى حتى شرح الله
 صدرى للذى شرح له صدر ابى بكر و عمر رضى الله عنهما فتتبع القران اجمعه
 من العصب واللخاف و صدور الرجال حتى و جدت آخر سورة التوبة مع ابى
 خزيمة الانصارى لم اجدها مع احد غيره، لقد جائكم رسول من انفسكم عزيز
 عليه ما عنتم، التوبة آيت ۱۲۸، ۱۲۹، حتى خاتمه برآة فكانت الصحف عند ابى
 بكر حتى توفاه الله ثم عند عمر حياته ثم عند حفصة بنت عمر رضى الله عنه،

جب یمامہ کے جماد میں بہت سارے مسلمان شہید ہو گئے تو ابوبکر صدیق رضى الله عنه
 نے میری طرف پیغام بھیجا، میں گیا تو حضرت عمر فاروق رضى الله عنه بھی ان کے پاس تھے،
 تب حضرت ابوبکر رضى الله عنه نے (گفتگو شروع کی) کہا کہ میرے پاس عمر فاروق رضى الله عنه
 عنہ آئے اور فرمانے لگے یمامہ کے جماد میں قرآن پاک کے حافظ بہت زیادہ شہید ہو گئے ہیں،
 میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو اسی طرح ہی جمادوں میں حافظ شہید ہو جائیں اور قرآن کا
 بہت سا حصہ (جو ان کے سینوں میں محفوظ ہے) ہاتھ سے جاتا رہے تو میں مناسب سمجھتا ہوں

کہ آپ قرآن مجید کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا حکم دیدیتجئے اس وقت میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا یہ تو بتاؤ جو کام نبی ﷺ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرو گے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی قسم ہے یہ کام بہتر ہے،

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے برابر اس کے لئے کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو بھی کھول دیا، میں نے بھی اسی میں مصلحت سمجھی جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سمجھی تھی، حضرت زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا تو ایک جوان عقل مند شخص ہے اور مجھے تیری ذات پر اعتماد بھی ہے جبکہ تو نبی ﷺ کے لئے وحی لکھا بھی کرتا تھا لہذا

تو ایسا کر کہ قرآن کو تلاش کر اور اکٹھا کر، اللہ تعالیٰ کی قسم اگر یہ لوگ مجھ سے یہ کہتے کہ پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اٹھا لا تو تب بھی مجھ پر اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا کہ یہ کام دشوار تھا جو انہوں نے مجھے جمع قرآن کے متعلق حکم فرمایا تھا، تب میں نے ان سے یہ کہا کہ تم لوگ وہ کام کیوں کرتے ہو جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا، تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ تعالیٰ کی قسم ہے یہ کام بہت اچھا ہے،

اور برابر مجھ سے یہ بات کہتے رہے تب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں بھی یہ بات ڈال دی جیسا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں ڈالی تھی میں نے قرآن پاک کی تلاش شروع کی تو کیسے کھجور کی چھڑیوں پر کیسے باریک پتھروں پر لکھا پایا کچھ لوگوں کو زبانی یاد تھا،

سورۃ توبہ کی آیت لقد جاءکم من الفضل من آخر سورت تک میں نے صرف حضرت ابو خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس (لکھی ہوئی) پائی پھر یہ مصحف (جو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے تیار کیا تھا)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات تک ان کے پاس رہا پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس اور ان کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا، بخاری شریف کتاب الفضائل القرآن باب جمع القرآن، ص ۷۴۵ جلد دوم،

قارئین کرام ہم نے آپ کی تسلی کے لیے متن حدیث پورے کا پورا نقل کر دیا، بتائیے اس میں کہاں حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جمع قرآن بدعت ہے، معلوم ہوا کہ یہ مفتی صاحب کا جھوٹ ہے

ثانیاً، جمع قرآن کے متعلق راقم نے دین الحق کی جلد اول کے ص ۵۵۱ پر قدرے تفصیل سے لکھا ہے، قارئین وہاں سے ہی ملاحظہ کر لیں

البتہ بریلوی عوام پر اتمام حجت کے لئے اس مقام پر چند عبارات علماء بریلویہ کی عرض کردی جاتیں ہیں تاکہ حق و باطل میں فرق ہو جائے، چنانچہ بریلویہ کے مشہور مفسر قرآن پیر کرم شاہ الازہری بھیروی لکھتے ہیں کہ،

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق قرآن کی سورتوں اور سورتوں کی آیتوں کو مرتب فرمایا اور یہ موجودہ ترتیب وہی ترتیب ہے اس کے لیے متعدد دلائل ہیں تو ثابت ہوا کہ قرآن کریم عہد رسالت میں مکمل طور پر مرتب فرمادیا گیا تھا اور تمام صحابہ اسی کی پیروی اور پابندی کیا کرتے تھے، ضیاء القرآن ص ۱۵ ج ۱، خود حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں

جس وقت جو آیت اتری حضور علیہ السلام کے حکم کے مطابق اونٹ کی ہڈیوں پر کھجور کے پٹھوں پر اور مختلف کاغذوں پر لکھ لیتے تھے اور یہ چیزیں متفرق طور پر لوگوں کے پاس رہیں ترتیب خود حضور علیہ السلام نے دی تھی، حضور علیہ السلام کی وفات سے کچھ روز پہلے نزول قرآن کی تکمیل ہوئی (مگر) قرآن کریم کتابی شکل میں ایک جگہ جمع نہ ہو سکا البتہ مرتب ہو گیا (تھا) تفسیر نعیمی ص ۱۱۱ ج ۱۔

مفتی صاحب کا سوال؟

فرماتے ہیں۔ ہدایت ضروریہ، جو حضرات ہر بدعت یعنی نئے کام کو حرام جانتے ہیں وہ اس قاعدہ و کلیہ کے کیا معنی کریں گے کہ، الاصل فی الاشیاء الاباحۃ، تمام چیزوں کی اصل یہ ہے کہ وہ مباح ہے، یعنی ہر چیز مباح اور حلال ہے ہاں اگر کسی چیز کو شریعت منع کر دے تو وہ حرام یا منع ہے یعنی ممانعت سے حرمت ثابت ہوگی نہ کہ نئے ہونے سے یہ قاعدہ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ و اقوال فقہاء سے ثابت ہے غالباً کوئی مقلد کہلانیوالا تو اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ قرآن فرماتا ہے۔

یا یہا الذین امنوا لاتستلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم ان تستلوا عنها حین ینزل القرآن تبدلکم عفا للہ عنها، المائدہ آیت ۱۰۱۔

ترجمہ۔ اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھو کہ جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تم کو بری لگیں اور اگر ان کو اس وقت پوچھو گے کہ قرآن اتر رہا ہے تو ظاہر کردی جائیں گی اللہ ان کو معاف کر چکا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس کا کچھ بیان نہ ہوا ہو حلال ہونے کا نہ حرام تو معافی میں ہے اسی لئے قرآن کریم نے حرام عورتوں کا ذکر فرما کر فرمایا،

واحل لکم ماوراء ذلکم،

ان کے سوا باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں،

نیز فرمایا۔

وقد فصل لکم ما حرم علیکم،

تم سے تفصیل وار بیان کردی گئیں وہ چیزیں جو تم پر حرام ہیں،

یعنی حلال چیزوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں تمام چیزیں ہی حلال ہیں، ہاں چند محرمات ہیں جن کی تفصیل بتادی ان کے سوا سب حلال،

مشکوٰۃ کتاب الاطعمۃ باب آداب الطعام فصل دوم میں ہے،

الحلال ما احل اللہ فی کتبہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنه فہو

مما عفی عنه۔

حلال وہ جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے خاموشی فرمائی وہ معاف،

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چیزیں تین طرح کی ہیں ایک وہ جن کا حلال ہونا صراحتہ قرآن میں مذکور ہے دوسرے وہ جن کی حرمت صراحتہ آگئی ہے تیسرے وہ جن سے خاموشی فرمائی یہ معاف ہے، جاء الباطل ص ۲۲۹۔

کیا اشیاء میں اصل اباحت ہے

اولاً: اشیاء میں اصل اباحت ہے کہ نہیں اس اصول میں خود اکابرین احناف میں بھی بہت سا اختلاف ہے،

چنانچہ مشہور حنفی فقیہ امام علاء الدین (المتوفی س ۱۰۸۸ھ) فرماتے ہیں۔

علی ما هو المنصور من ان الاصل فی الاشیاء التوقف .

یعنی منصور مسلک یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے۔

درمختار مع فتاویٰ شامی ص ۱۰۵ ج ۱۔

ثانیاً: صحیح بات یہ ہے کہ حلال و حرام میں اصل اباحت ہے جیسا کہ ذیل کی حدیث سے واضح

ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال کان اهل الجاهلیہ یا کلون اشیاء ویترکون اشیاء تقذرا فبعث اللہ نبیہ ﷺ وانزل کتابہ واحل حلالہ وحرم حرامہ فما احل فهو حلال وما حرم فهو حرام وما سکت عنہ فهو عفو و تلا قل لا اجد فیما اوحي الی محرما علی طاعم یطعمہ الی اخر الایة ،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

زمانہ جاہلیت کے لوگ بعض چیزیں کھاتے تھے اور بعض کو برا جان کر چھوڑ دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ پر قرآن پاک نازل کیا حلال کو حلال اور حرام کو حرام کیا لہذا اس نے جو حلال کیا وہ حلال ہے اور جو حرام کیا وہ حرام ہے اور جس

سے سکوت کیا وہ معاف ہے اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ
اے نبی تو کہہ دے کہ میں وحی شدہ چیزوں میں کسی کھانے والی چیز میں سے کوئی چیز حرام نہیں
پاتا سوائے مردار، بہتے خون، سور کے گوشت کے کیونکہ وہ ناپاک ہے اور اس جانور کے جو خدا کے
سوا اور کے نام پر پکارا جائے،

سنن ابی داؤد مع عون المعبود، ج ۴ ص ۴۱۷، ج ۳،

اس روایت سے ثابت ہوا کہ حلال و حرام میں اصل اباحت ہے اور اس کی تائید قرآن حکیم
سے بھی ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے

خلق لكم مافي الارض جميعاً،

جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں سب کا سب، (البقرہ ۲۹)

ثالثاً - فریق ثانی نے جس قدر بدعات ایجاد کر رکھی ہیں ان کا تعلق کسی چیز کی حلت و حرمت
سے نہیں (اگر ایسا ہوتا تو شاید اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی) بلکہ ان کا تعلق عبادات سے ہے اور
بریلوی علماء سے لیکر عوام الناس تک انہیں عبادت سمجھ کر کرتے ہیں اور اباحت کے قانون کو عبادت
میں جاری کرنا مفتی صاحب کی سینہ زوری ہی نہیں بلکہ جہالت بھی ہے، کیونکہ عبادات ممنوع الاصل
ہیں، علامہ شاطبی فرماتے ہیں

ولا يصح ان يقال فيما تعبد انه مختلف فيه على قولين هل على المنع ام هو
على الاباحة بل هو امر زائد على المنع لان التعبديات انما وضع الشارح فلا يقال
في صلوة سادسة مثلاً انها على الاباحة فللمكلف وضعها على احد القولين ليتعبد
بها لله لانه باطل باطلاق،

امور تعبدیہ کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان کے متعلق اختلاف ہے کہ آیا یہ ممنوع الاصل
ہیں یا مباح الاصل، (کیونکہ یہ اس اختلاف کے تحت نہیں ہیں) اس لئے کہ امور تعبدیہ کو شارع علیہ
السلام نے مقرر کیا ہے،

فرض کریں کہ اگر کوئی انسان چھٹی نماز ایجاد کرے تو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا
کہ اباحت اصلیہ کے قول کی وجہ سے یہ مباح اور جائز ہے اور مکلف کو اس کے جاری کرنے کا حق

ہے کیونکہ یہ بالکل باطل ہے، ملخصاً۔ الاعتصام ص ۳۰۱ ج ۱،
علامہ شاطبی مرحوم کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اباحت کا قانون عبادت میں جاری کرنا سراسر
زیادتی اور جہالت ہے،
امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ

ولهذا كان احمد وغير من فقهاء اهل الحديث يقولون ان الاصل في
العبادات التوقيف ولا يشرع منها الا ما شرعه الله تعالى،

یعنی اس وجہ سے امام احمد بن حنبل وغیرہ فقہاء اہل حدیث میں سے یہ کہتے ہیں کہ عبادات
میں اصل توقف ہے، اور کوئی عبادت نہیں مگر وہی جسے اللہ تعالیٰ نے مشروع کیا ہے، مجموع فتاویٰ
ابن تیمیہ ص ۱۷ ج ۲۹،

آئیے اس ضابطہ و کلیہ کی علمائے بریلویہ سے تصدیق ملاحظہ کریں، مولوی غلام رسول سعیدی
بریلوی فرماتے ہیں کہ

اپنی عقل سے عبادت کے طور طریقہ وضع کرنا جائز نہیں ہے، لوگ اپنی عقل سے عبادت کے
طریقہ وضع کر لیتے ہیں، پھر اسکی تائید میں دلائل شرعیہ تلاش کرتے ہیں، اور ان کے بنائے ہوئے
طریقہ کے مطابق عبادت نہ کریں اس کو لعنت ملامت کرتے ہیں، اسی کا نام احداث فی الدین اور
بدعت سینہ ہے، عبادت صرف اسی طریقہ سے کرنی چاہئے جس طریقہ سے رسول اللہ ﷺ نے
عبادت کی ہے اور جس طرح آپ نے ہدایت دی ہے اور جماعت صحابہ کا اس پر عمل رہا ہے، تبیان
القرآن ص ۵۱ ج ۱ طبع فرید بک شال لاہور ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ مصنوعی
زاہدوں اور جعلی صوفیوں نے جو خود ساختہ شریعت وضع کر لی ہے، اس کا اسلام میں کوئی ثبوت نہیں
ہے، نیکی اور فضیلت حاصل کرنے کا اصل اور صحیح طریقہ وہ ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا اور
جو راستہ ہمارے لیے مقرر کیا اور جس طریقہ پر صحابہ کرامؓ گامزن رہے اور اختیار تابعین نے جس کو
اپنایا،

تبیان القرآن ص ۲۸۰ ج ۳ طبع فرید بک شال لاہور ۱۴۲۰ھ ۲۰۰۰ء

سعیدی صاحب کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عبادات اصل میں ممنوع الاصل ہیں مگر کمال

ہے کہ حضرت مفتی صاحب شریعت کے تمام احکام میں اباحت کے قائل ہیں، اگر وہ زندہ ہوتے تو ہم انہیں کسی اہل حدیث مدرسہ میں ترجمہ قرآن پڑھنے کا مشورہ ضرور دیتے۔

مفتی صاحب کی پہلی دلیل کا جواب

مفتی صاحب کی دلیل سورة المائدة کی آیت (۱۰۱) ہے اور اس کا تعلق خاص رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ سے ہے کہ لوگ عجیب و غریب سوالات پوچھا کرتے تھے جس سے آپ علیہ السلام کبیدہ خاطر ہوا کرتے تھے، مقصود آیت فقط اتنا ہے کہ تم لوگ بہت سوال نہ کیا کرو

اللہ تعالیٰ خود بخود جن احکام کو انسانوں کی رہبری کے لئے ضروری سمجھتا ہے ان کا نزول کر دے گا، اگر مفتی صاحب خود غور فرماتے تو، حین یزل القرآن (۵-۱۰۱) کے الفاظ انہیں اس امر کی رہنمائی کے لئے کافی تھے اور اس کے معنی کو ذرا وسعت دیں تو اب بھی یہی حکم ہے کہ بلاوجہ اور غیر ضروری مسائل میں جستجو اور سوال نہیں کرنا چاہیئے آج بھی لوگ پوچھا کرتے ہیں (۱) شداد کا باغ کیسا تھا (۲) حضرت سلیمان علیہ السلام سے جس چیونٹی نے بات کی تھی وہ مذکر تھی یا مونث (۳) براق کی شکل کیسی تھی (۴) اصحاب کھف کے کتے کی شکل اور رنگ کیا تھا (۵) قرآن کے اعراب کی تعداد کیا ہے (۶) موسیٰ علیہ السلام نے جس گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا وہ گائے تھی یا بیل (۷) حضرت نوح علیہ السلام نے جو کشتی بنائی تھی وہ کس درخت کی لکڑی تھی وغیرہ،

ایسی فضول اور بے مقصد تحقیقات میں پڑنے سے وقت کا زیاں اور منشاء الہی جو شریعت کے نزول کا ہے فوت ہو جاتا ہے

اصل مقصد تو قرآن کا اعمال صالحہ خشیت اللہ اور تقویٰ و طہارت ہے

دوسری دلیل کا جواب

مفتی صاحب کی دوسری دلیل سورة النساء کی آیت (۲۴) ہے اور اس سے مفتی صاحب کا استدلال کہ ان عورتوں کے علاوہ جن کا اس آیت میں ذکر ہے باقی میں اباحت ہے جس سے چاہے نکاح کر سکتا ہے اس کے متعلق، دین الحق ص ۷۲ جلد اول کو دیکھ لیا جائے، مفتی صاحب کی تردید کے لئے اتنا ہی جواب کافی ہے، تاہم اس جگہ ہم مزید بھی عرض کر دیتے ہیں

(۱) تین بار کی مطلقہ

حتی تنکح زوجا غیرہ، البقرہ، ۲۳۰۔

(۲) مثرکہ عورت،

ولاتنکحوا المشرکت حتی يؤمن، البقرہ، ۲۲۱۔

(۳) چار کے بعد پانچویں عورت، (۴) جس سے لعان ہو چکا ہو،

اور ان چار میں دو نمبر دین الحق کی پہلی جلد کے بھی شمار کر لیں، تو بقول مفتی صاحب ان چھ قسم کی عورتوں سے سورۃ النساء کی آیت کی وجہ سے نکاح میں اباحت ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، کسی نے کیا خوب کہا ہے، نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان،

مفتی صاحب کی تیسری دلیل کا جواب

مفتی صاحب کی یہ دلیل سورۃ الانعام کی آیت (۱۱۹) ہے جس میں ہے کہ تم اس سے کیوں نہیں کھاتے جس پر اللہ کا نام ذکر کیا جائے، اس کے متعلق فقط اتنا عرض ہے کہ یہ آیت حلت وحرمت کے بارہ میں ہے اور یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حلت میں اصل اباحت ہے، مگر عبادت میں اصل اباحت نہیں اور مفتی صاحب کی جماعت کی جملہ بدعات کا تعلق حلت وحرمت سے نہیں بلکہ عبادات سے ہے لہذا مفتی صاحب کی یہ دلیل دعویٰ اور اپنے عمل کے موافق نہیں ہے۔

اسی طرح مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت حلال وہ ہے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے خاموشی فرمائی وہ معاف ہے، کا تعلق بھی حلت وحرمت کے ساتھ ہے عبادات میں اس کا سرے سے کوئی واسطہ نہیں،

مفتی صاحب کی بڑ

مفتی صاحب نے اباحت کا اصول بیان کرنے سے قبل ایک تمہید باندھتے ہوئے یہ شیخی بھی ماری ہے کہ کوئی مقلد کہلانے والا تو اس کا انکار نہیں کر سکتا، جاء الباطل ص ۲۲۹،

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ حنفیہ میں کئی بزرگ اباحت کے قائل ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ

جمہور فقہاء احناف کا یہ قول نہیں بلکہ چند ایک کا ہے جب کہ جمہور کا موقف، توقف کا ہے چنانچہ صاحب درمختار فرماتے ہیں،

ان الصیح من مذهب اهل السنة ان الاصل فی الاشیاء التوقف والاباحة رائی المعتزلة،

بلاشبہ اہل سنت کا خالص اور صحیح مسلک یہ ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے اور اباحت کا قول معتزلہ کی رائے ہے، الدر المختار مع الرد المحتار ص ۱۶۱ ج ۴ کتاب الجہاد باب استیلاء الکفار،

درمختار کے مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے، درمختار بحر علم کی وہ درمختار ہے کہ جب سے تصنیف ہوئی مشارق و مغارب ارض میں فتوائے مذہب حنفی کا گویا مدار اس کی تحقیقات عالیہ پر ہو گیا، اللہ عزوجل رحمت فرمائے علامہ سید ابن عابدین شامی فرماتے ہیں۔ درمختار نے تمام عالم میں آفتاب چاشت کی طرح شہرت پائی مخلوق ہمہ تن اس سے گرویدہ ہو کر اپنے مہمات میں اس کی طرف التجا لائی یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے مطلوب بنائیں اور اس کی طرف رجوع لائیں کہ یہ دامن مذہب کی زرنگار گوٹ ہے، وہ تصحیح و تنقیح کے مسائل جمع ہیں کہ بڑی بڑی کتابوں میں مجتمع نہیں، آج تک اس انداز کی کتاب تصنیف نہ ہوئی،

العطا یا النبویة فی الفتاوی الرضویة، ص ۳۸۲ ج ۳. طبع احمد رضا اکیڈمی سن ۱۴۱۱ھ،

فقہ حنفی کے اتنے پائے کے مصنف سے مفتی صاحب کا دعویٰ ایک دیوانے کی بڑ ثابت ہو گیا، بلکہ اس عبارت کی روشنی میں سوچئے کہ مفتی صاحب کا مسلک اباحت! کس کا ہے اور اس کے مختلف فیہ ہونے میں تو شاید کوئی کوڑھ مغز ہی شک کرے۔ چہ جائے کہ ایک حکیم الامت، مفتی اعظم اور مفسر قرآن،

بدعات کے دلائل اور ان کا علمی و تحقیقی جائزہ

مفتی صاحب کی پہلی دلیل،

فرماتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے،

وجعلنا فی قلوب الذین اتبعواہ رافۃ ورحمة و رہبانۃ ابتدعوہا ما کتبناہا علیہم الابتغاء رضوان اللہ ،
پھر فرماتا ہے ،

فاتینا الذین امنوا منهم اجرہم .

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عیسائیوں نے بدعت حسنہ، یعنی تارک الدنیا ہو جانا ایجاد کیا، رب نے اس کی تعریف کی بلکہ اس پر اجر بھی دیا، ہاں جو اسے نبھانہ سکے ان پر عتاب آیا فرمایا گیا ،
فما رعوہا حق رعایتہا ،

دیکھو ایجاد بدعت پر عتاب نہیں ہوا بلکہ نہ نبھانے پر، معلوم ہو کہ بدعت حسنہ اچھی چیز ہے اور باعث ثواب ، جاء الباطل ص ۲۱۵ ،
الجواب

اولاً حضرات گرامی آپ مفتی صاحب کی عبارت کو مکرر پڑھیے اور غور کیجئے کہ حضرت جی نے آیات قرآن کا آخر ترجمہ کیوں نہیں کیا ! اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ترجمہ سے قارئین اصل حقیقت کی تہ تک پہنچ جائیں گے اور جواز بدعت کے استدلال کو غلط جان کر بریلویت کا دامن چھوڑ جائیں گے، اب آئیے الفاظ قرآن کا معنی و مفہوم پڑھیے ۔ ارشاد ہوتا ہے

پھر ہم نے ان کے قدموں پر ان کے پیچھے (اور) رسول بھیجے اور (سب سے) پیچھے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا اور اسے انجیل دی اور ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے اس کی پیروی کی مہربانی اور رحم ڈالا اور رہبانیت انہوں نے خود نکالی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کریں، پر اس کی وہ نگداشت نہ کر سکے جو اس کا حق تھا سو ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ان کا اجر دیا اور بہت ان میں سے فاسق تھے، سورة الحديد آیت ۲۷

قارئین کرام دیکھئے اللہ رب العزت تو یہ کہہ رہا ہے کہ انہوں نے دین عیسوی کو بگاڑ دیا اور اس میں بدعات ایجاد کی ، ہاں بدعات کی ایجاد میں ان کا مقصد رضا الہی تھا اگر بقول مفتی صاحب اللہ تعالیٰ نے ان کی یہاں تعریف کی ہے تو یہ تو ہر بدعتی کہتا ہے، یہاں تک کہ آج بھی جس قدر مبتدعین ہیں وہ تمام کے تمام یہی کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد رضا الہی ہے، قادیانیوں کو ہی لے لیجئے وہ

بھی اپنے مخصوص عقائد کو رضا الہی کا ہی نام دیتے ہیں کسی قادیانی نے بھی آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے قادیانیت کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے ساتھ کفر کرتے ہوئے اور اس کے غضب کو دعوت دینے کے لئے قبول کیا ہے! تو کیا صرف اتنی سی بات کو ہی لیکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ بدعات درست ہیں کیونکہ ان کا مقصود اللہ ہی ہے۔

ثانیاً، مفسرین حضرات نے اس کا یہ معنی بھی بیان کیا ہے کہ ہم نے ان پر یہ بدعات فرض نہ کی تھیں بلکہ فرض تو شریعت حقہ پر چل کر رضا الہی کا حصول کیا تھا۔ چنانچہ امام ابن کثیر فرماتے ہیں

وقوله تعالى (الابتغاء رضوان الله) فيه قولان (احدهما) انهم قصدوا بذلك رضوان الله قاله سعيد بن جبیر و قتادة (والاخر) ما كتبنا عليهم ذلك انما كتبنا عليهم ابتغاء رضوان الله .

یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان ۔

الا ابتغاء رضوان الله ،

میں دو قول ہیں ایک یہ کہ ان بدعات سے ان کا مقصود رضا الہی تھا (یہ امام سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا ہے، دوسرا یہ کہ بدعات ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھیں بلکہ فرض تو ان پر رضا الہی کا حصول تھا،

تفسیر ابن کثیر ص ۳۱۵ ج ۴،

اگر اس دوسرے معنی کو تسلیم کر لیا جائے تو مفتی صاحب کا استدلال ہی ختم ہو جاتا ہے اور اگر بالفرض نہ بھی مانا جائے تو تب بھی مفتی صاحب کا استدلال غلط ہے کیونکہ یہاں ان پر شرعی حکم بیان نہیں کیا جا رہا بلکہ ان کے دلی خیال اور ایجاد بدعت کی وجہ اور دین میں اختراعات کا پس منظر بیان کیا جا رہا ہے کہ شریعت سازی میں ان کی نیت فقط رضا الہی کا حصول تھا اور اس کا ہمیں اعتراف ہے کہ مبتدعین کے عوام سادہ لوح ہوتے ہیں وہ ان بدعات کو دین سمجھ کر کرتے ہیں اور اس سے ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہوتا ہے

اور یہی ہمارا اکابرین بریلویت سے اصولی و بنیادی اختلاف ہے کہ بریلوی عوام ان بدعات کو خالص اور ٹھیٹھ اسلام تصور کرتے ہیں اور ان کے ساتھ فرائض جیسا معاملہ کرتے ہیں منکرین پر ارکان

اسلام کو گھٹانے کا الزام لگاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ گیارہویں نہ دینے سے اللہ تعالیٰ اور پیر صاحب کا غضب زل ہوتا ہے اور بھینس کے دودھ میں خون آنا شروع ہو جاتا ہے، مرگیا مردود فاتحہ نہ درود وغیرہ (ان کی پوری تفصیل آگے آرہی ہے)

ثالثاً، مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ یہاں بدعت پر تو اللہ تعالیٰ راضی ہوئے اور ان کو اجر — رازا الخ تو یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ

فَاتِنَا الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنْهُمْ اَجْرُهُمْ ،

کا تعلق، ابتدعوها) سے قطعاً نہیں بلکہ،

وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ ،

سے ہے اور آیت قرآنی کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خالص پیروی کی اور دین عیسوی پر چلے اور نیک اعمال بجالائے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تصدیق کر لی، ان کو اللہ تعالیٰ نے اجر سے نوازا جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے

لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قٰئِمَةٌ يَتْلُوْنَ آيٰتِ اللّٰهِ اَنۡاءَ الْيَلِّ وَ هُمۡ يَسۡجُدُوْنَ ☆ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأۡمُرُوْنَ بِالْمَعۡرُوفِ وَيَنْهَوۡنَ عَنِ الْمُنۡكَرِ وَيُسَارِعُوۡنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ (ال عمران ۱۱۳ و ۱۱۴)

ترجمہ۔ سب ایک سے نہیں کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں اور یہ لوگ لائق ہیں (احمد رضا) ۳۔ (۱۱۳ و ۱۱۴)

یہی مضمون سورۃ الحديد کی اگلی آیت (۲۸) میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر تم محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لاؤ گے تو دوہرا اجر پاؤ گے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے کا، چنانچہ جملہ مفسرین کرام نے، اجر ہم، کی یہی تفسیر بیان کی ہے کہ اجر ان لوگوں کو ملا جو دین عیسوی پر قائم رہے نہ کہ مبتدعین کو چنانچہ علامہ زمخشری حنفی فرماتے ہیں،

یرید اهل الرحمة و الرأفة الذین اتبعوا عیسیٰ ، کشاف ص ۴۸۲ ج ۲ ،
علامہ نسفی حنفیؒ لکھتے ہیں

ای اهل الرأفة والرحمة الذین اتبعوا عیسیٰ علیه السلام او الذین امنوا
بمحمد ﷺ ، (مدارک التنزیل ص ۱۵۹ ج ۵) ،

اجران لوگوں کو ملا جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے رافت و رحمت ڈالی تھی اور دین عیسوی کے
پیروکار تھے اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے تھے ،

مگر اس کے برعکس مفتی صاحب اس بات پر بضد ہیں مبتدعین کو اجر ملائح اگر بالفرض مفتی جی
کے بیان کردہ مفہوم کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اجر کس چیز کا ملا؟؟ بدعت
کی ایجاد پر یا بدعت پر عمل کرنے کا؟ یقیناً بریلوی علماء کہیں کہ بدعت پر عمل کرنے کا، کیونکہ نیکی پر
محض اعتقاد سے اجر نہیں ملتا بلکہ اس پر عمل سے اجر ملتا ہے، جب آپ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا،
تو اب سنئے کہ بدعت پر تو انہوں نے کما حقہ عمل ہی نہیں کیا ارشاد ہوتا ہے ۔

فما رعوها حق رعایتها ، ۵۷-۲۷

اسے نہ نباہا جیسا کہ اس کے نباہنے کا حق تھا (احمد رضا)

معلوم ہوا کہ مبتدعین کو اجر ملنے کا مفہوم مفتی صاحب کا کشید کردہ ہے

رابعاً، اگر اجر مبتدعین کو ملا تو آگے جو اللہ رب العزت نے

و کثیر منهم فسقون ،

کہہ کر مذمت کی ہے، وہ کن لوگوں کے متعلق ہے؟ کیونکہ فسق کا فتویٰ تو کسی دین کے فرض
واجب رکن کے ترک پر ہی لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ مفتی صاحب نے بھی وجوب کے تارک پر فاسق
کا فتویٰ لگایا ہے (جاء الباطل ص ۷۹ ج ۲)

بدعت کو مبتدعین بریلویہ بھی کتابوں میں تحریر کی حد تک دین میں واجب کا درجہ نہیں دیتے،
بلکہ ان کے علماء نے صاف لکھا ہے کہ بدعات کے ساتھ فرض واجب کا سا معاملہ کرنا بدعت
سینہ ہے چنانچہ معروف بریلوی عالم مولوی غلام رسول سعیدی شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمہ کراچی
فرماتے ہیں ۔

اگر کوئی شخص صلوٰۃ و سلام (اذان سے پہلے) نہ پڑھے تو اس پر اعتراض اور ملامت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اعتراض اور ملامت صرف واجب اور فرض کے ترک پر کی جاتی ہے اگر اذان سے پہلے یا بعد صلوٰۃ و سلام نہ پڑھنے پر ملامت کی جاتی رہی تو یہ اس نفلی عبادت کو فرض اور واجب قرار دینے کے مترادف ہوگا اور یہ بعینہ بدعت سیئہ ہے۔

(شرح صحیح مسلم ص ۵۳۸ ج ۲ مطبوعہ فرید بک شال لاہور سن ۱۹۹۴م)

سعیدی صاحب کی اس طولانی عبارت سے واضح ہوا کہ بدعات کے منکر پر نکیر کرنا بدعت سیئہ ہے کیونکہ ملامت فقط فرائض یا واجبات میں ہی کی جاسکتی ہے

قارئین کرام جب آپ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تو اب بغور سنئے کہ قرآن کریم نے فاسق مبتدعین کو قرار دیا ہے چنانچہ تفسیر جامع البیان، میں ہے کہ

الذین غیر دین عیسیٰ، یعنی فاسق وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین عیسوی کو بگاڑ دیا تھا، ص

(۴۶۰)

لیجئے جناب اس دلیل فرقانی نے تو بات ہی صاف کر دی کہ مبتدعین جنہوں نے دین عیسوی میں رہبانیت (ترک دنیا) کی بدعت نکالی تھی وہ فاسق تھے اور یہ مبتدعین بریلویہ پر اقبال ڈگری ہے کیونکہ اس آیت سے بدعتی کی مذمت ثابت ہوگئی۔

خامساً۔ مفسرین کرام نے اس آیت کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا ہے انہوں نے نذر مان کر رہبانیت کی بدعت ایجاد کی تھی چنانچہ علامہ نسفی حنفی فرماتے ہیں۔

(رہبانیۃ ابتدعوھا) ای اخر جوھا من عند انفسم و نذروھا،

یعنی قرآنی الفاظ، رہبانیۃ ابتدعوھا، کا معنی ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے (دین میں چند چیزیں) نکالیں اور ان کی نذر و منت مانی، (مدارک التذریل ص ۱۵۹ ج ۵)،

اس تفسیر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انہوں نے جان کو مشقت میں ڈال کر عبادت کرنے کی ایک ایسی نذر مانی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تھا اور جان کو مشقت میں ڈالنے والی نذر ماننا بدعت ہے اور اس کے کرنے سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے منع فرمایا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ کان يقول لا تشددوا على انفسكم فيشدد عليكم، فان
قوما شددوا على انفسهم فشدد الله عليهم فتلک بقايا هم صی الصوامع والديار
، رهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم ،

رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ سختی مت کرو اپنی جانوں پر ورنہ تم پر بھی سختی ہوگی، کیونکہ
بعض لوگوں نے سختی کی تھی، اپنی جانوں پر، تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی، تو یہ سختی ان کی نشانیوں
میں سے باقی ہے ان کے گرجاؤں اور عبادت خانوں میں رهبانیت جو انہوں نے خود ایجاد کی جس کو
ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔

سنن ابوداؤد ص ۳۱۶ ج ۲، ومسند احمد ابو یعلیٰ ص ۲۱ ج ۴ رقم الحدیث (۳۶۸۲)
اس حدیث نے آیت قرآنی کا مفہوم واضح کر دیا کہ تکالیف شاقہ کی نذر ماننے کی انہوں نے
بدعت ایجاد کی تھی اور بانی اسلام نے اس سے منع فرمایا ہے خود اللہ رب العزت فرماتے ہیں۔

یرید الله بکم اليسر ولا یزید بکم العسر، البقرہ (۱۸۵)

اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں (۱۸۵/۲)

وما جعل علیکم فی الدین من حرج، سورہ الحج آیت ۷۸۔

تمہارے دین میں اس (اللہ نے) تنگی نہیں کی (۷۸-۲۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔

ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ

بے شک دین (اسلام) آسان ہے جو شخص سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب

کردے گا (بخاری ص ۱۰ ج ۱، ونسائی مجتبیٰ ص ۲۶۸ ج ۲)

الغرض سابقہ امم کے مبتدعین کے بدعی اعمال کے نقش قدم پر چلنے سے اللہ تعالیٰ اور رسول بر

حق نے منع فرمادیا ہے،

اور منع فرمانے کے باوجود جو شخص ان کی پیروی کرے اور ان کے عمل سے حجت لائے گا وہ

نادان و جاہل اور گمراہ ہوگا، العیاذ باللہ،

مفتی صاحب کا ایک مغالطہ

مذکورہ دلیل قرآنی درج کرنے کے بعد مفتی صاحب نے آگے مزید دلیل نقل کرنے کی بجائے، یہاں ایک عجیب بحث کی ہے، فرماتے ہیں، مشکوٰۃ باب الاعتصام کی پہلی حدیث ہے کہ،

من احدث فی امرنا هذا مالیر منه فهو رد،

جو شخص ہمارے اس دین میں وہ عقیدے ایجاد کرے جو دین کے خلاف ہوں وہ مردود ہے ہم نے ما کے معنی عقیدے اس لیے کیئے ہیں کہ دین عقائد ہی کا نام ہے، اعمال فروع میں بے نمازی گنہگار ہے بے دین یا کافر نہیں، بداعتقاد یا تو گمراہ ہے یا کافر۔ اس کے ماتحت مراقاة میں ہے۔

والمعنی ان من احدث فی الاسلام رایا فهو مردود علیہ اقول فی وصف هذا الامر اشارة الی ان امر الاسلام کمل،

معنی یہ ہیں کہ جو اسلام میں ایسا عقیدہ نکالے کہ دین سے نہیں وہ اس پر رد ہے، میں کہتا ہوں کہ ہذا الامر کے وصف میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کا معاملہ مکمل ہو چکا۔

ثابت ہوا کہ بدعت عقیدے کو فرمایا گیا۔ جاء الباطل ص ۲۱۵،

الجواب

مفتی صاحب نے اس پر خاصی لمبی گفتگو کی ہے اور ان کی تحریرات کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اعمال میں نئی ایجادات کو بدعت شرعی نہیں کہتے، اب ترتیب وار ان خرافات کا جواب سنئے

اولاً۔ علماء بریلویہ ہی وضاحت کر سکتے ہیں کہ، عالم الغیب، نور بشر، حاضر و ناظر، مختار کل وغیرہ جیسی بدعات کا تعلق عقیدے سے ہے یا بقول شخصے محض دل لگی کا سامان ہے۔

ثانیاً۔ فقہاء احناف نے بدعت کی یہ تعریف ذکر کی ہے کہ ما احدث علی خلاف الحق المتلقى عن رسول الله ﷺ من علم او عمل او حال بنوع شبهة واستحسان وجعل دینا قویماً وصرطاً مستقیماً بدعت وہ چیز ہے جو اس حق کے خلاف ایجاد کی گئی ہو جو رسول کریم ﷺ سے اخذ کیا گیا ہو خواہ وہ علم ہو یا عمل یا حال ہو اور کسی شبہ کی بنا پر اس کو اچھا سمجھ کر دین قویم اور صراط مستقیم بنا لیا گیا ہو، فتاویٰ شامی ص ۱۵۶۱ ج ۱ و البحر الرائق ص ۳۴۰۹ ج ۱،

اس کی شرح میں علامہ طحطاوی حنفی فرماتے ہیں

باعتبار علم کے بدعتی کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ کا منکر ہو، اور بدعتی باعتبار عمل کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص قبیلہ میں نیک کام کے لئے اذان دیتا ہو، اور بدعتی باعتبار حال کے یہ ہے کہ کوئی شخص اس نظریہ سے خاموش رہتا ہو کہ چپ رہنا عبادت ہے۔ (حاشیہ مراقی الفلاح ص ۱۸۱ طبع مصر ۱۳۵۶ھ، صفحہ ۳۰۳ طبع قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی باب فی بیان الاحق بالامامة

مگر گجرات کے بریلوی حکیم الامت کا باوا آدم ہی نرالا ہے وہ عقیدے کے علاوہ اعمال میں بدعات کو تسلیم ہی نہیں کرتے،

ثالثاً، علم حدیث میں یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ حدیث کے غریب الفاظ کا معنی کرنے کے لئے اس کے تمام طرق پر نگاہ رکھنی بھی ضروری ہے اور زیر بحث حدیث کے الفاظ میں صراحت سے عمل کے الفاظ موجود ہیں۔

من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد، جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہماری طرف سے کوئی دلیل نہیں تو اس کا وہ کام مردود ہے، بخاری ص ۱۰۹۲ ج ۲، و مسلم ص ۷۷ ج ۲، و خلق افعال العباد ص ۲۹، و مسند امام احمد ص ۱۴۶ و ۲۵۶ ج ۶، و دار قطنی ص ۲۲۷ ج ۴،

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ بدعت فقط عقیدے میں ہی نہیں ہوتی بلکہ افعال میں بھی ہوتی ہے اگر کسی رضوی محقق کو اب بھی اعتبار نہ ہو تو خود مفتی جی کی حسب ذیل عبارت کو پڑھ لیں، بدعت کے شرعی معنی ہیں وہ اعتقاد یا وہ اعمال جو حضور علیہ السلام کے زمانہ حیات ظاہری میں نہ ہو بعد میں ایجاد ہوئے نتیجہ نکلا کہ بدعت شرعی دو طرح کی ہوئی، بدعت اعتقادی اور بدعت عملی۔ جاء الباطل ص ۲۱۴،

اس عبارت میں حضرت مفتی صاحب نے صاف اقرار کیا ہے کہ بدعت اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی ہوتی ہیں، مگر آگے چل کر وہ اس سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ بزعم خود اس پر دلائل بھی لاتے ہیں، ان کی اس دورخی تحریر پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں، انہیں عادت ہے بھول جانے کی، یہ عادت فقط مفتی صاحب کی ہی نہیں بلکہ جملہ مبتدعین کی ہے کہ وہ ایک اصول بڑی دھوم دھام سے قائم

کرتے ہیں، پھر آگے چل کر اسی کے خلاف دوسرا گھڑ لیتے ہیں، اس عمل و کردار میں یہ مبتدعین بے بس ہیں، کیونکہ جب انسان شریعت سازی کرے، تو اس سے اس طرح کی ہیرا پھیریاں یقیناً ہوتی ہیں اللہ رب العزت نے کیا خوب کہا ہے،

ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا،

اور اگر قرآن اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف ہوتا (النساء ۸۲)

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

مشکوٰۃ باب العلم میں ہے،

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجور هم شي و من سن في الاسلام سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها من غير ان ينقص من اوزار هم شي،

جو کوئی اسلام میں اچھا طریقہ جاری کرے اس کو اس کا ثواب ملے گا اور اس کا بھی جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے ثواب سے کچھ کم نہ ہوگا اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ جاری کرے اس پر اس کا گناہ بھی ہے اور ان کا بھی جو اس پر عمل کریں اور ان کے گناہ میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی،

معلوم ہوا کہ اسلام میں کار خیر ایجاد کرنا ثواب کا باعث ہے اور برے کام نکالنا گناہ کا موجب

- جاء الباطل ص ۲۱۷،

الجواب

اولاً، مفتی جی نے اپنے تبصرے (معلوم ہوا کہ سے لیکر آخر تک) کو بھی متن حدیث کے بالمقابل ترجمہ میں درج کیا ہے تاکہ سادہ لوح عوام یہ سمجھ لیں کہ یہ بھی حدیث کے ٹکڑے کا ہی ترجمہ ہے، مزید یہ کیا کہ اس کے درمیان کوئی قومہ بھی نہیں ڈالا تاکہ اناڑی تو کجا کوئی اچھا خاصہ اردو دان بھی اس حقیقت تک نہ پہنچ سکے، مفتی جی کا یہ کردار بالکل اس یہودی کی طرح ہے جس نے آگے پیچھے سے تو تورات پڑھ دی تھی اور آیت رجم پر ہاتھ رکھ کر چھپا دیا تھا۔

ثانیاً۔ یہ مفتی صاحب کے دعویٰ کی دلیل قطعی طور پر نہیں ہے کیونکہ حدیث میں سنت حسنہ اور سیئہ کا ذکر ہے اس میں بدعت حسنہ اور سیئہ کا ذکر نہیں، لہذا یہ مفتی صاحب کی بدعت حسنہ کی دلیل کیسے بن گئی، جبکہ سنت کا لفظ لغت عرب میں، عادت، طور، طریقہ، اخلاق و کردار اور طبعیت پر بولا جاتا ہے، تو ثابت ہوا کہ یہاں پر سنت حسنہ کا لفظ ایسے آدمی پر بولا گیا ہے، جو اچھی عادات و کردار کا مالک ہے ایسا مزاج اور طور طریقے رکھنے والا قابل تحسین ہے اور اس کے برعکس کرنے والا مذموم ہے الغرض یہاں بدعت حسنہ و سیئہ کا کوئی ذکر ہی نہیں،

ثالثاً۔ مذکورہ حدیث میں یہ مراد نہیں کہ کسی امتی کا جاری کردہ عمل بھی سنت ہے کیونکہ امتی کی یہ شان نہیں بلکہ اس کا کام تو سنت پر چلنا اور اس سے تمسک کرنا ہے، ارشاد ہوتا ہے
انما كان قول المؤمنين اذا دعوا الى الله و رسوله ليحكم بينهم ان يقولوا
سمعنا و اطعنا و اولئك هم المفلحون (النور ۵۱)

ترجمہ۔ مسلمانوں کی بات تو یہی ہے جب اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان میں فیصلہ فرمائے کہ عرض کریں ہم نے سنا اور حکم مانا اور یہی لوگ مراد کو پہنچے (احمد رضا۔ ۲۴۔ ۵۱)
اس آیت قرآنی نے صراحت کر دی کہ امتی کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے ایک اور آیت قرآنی میں امت مرحومہ کو خیر الامت کہا گیا کہ یہ دین کی داعی ہے ارشاد ہوتا ہے

كنتم خير امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و
تؤمنون بالله ولو امن اهل الكتب لكان خيراً لهم منهم المؤمنون و اكثرهم
الفسقون (ال عمران) آیت ۱۱۰۔

ترجمہ۔ تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، (احمد رضا) ۳۔ ۱۱۰ اس دلیل فرقانی سے معلوم ہوا کہ امتی کا کام سنت جاری کرنا نہیں بلکہ سنت کی طرف دعوت دینا ہے خود مذکورہ حدیث میں من من فی الاسلام کی بجائے یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔

من دعا الى هدى۔ جس نے ہدایت کی طرف دعوت دی، صحیح مسلم ص ۳۴۱ ج ۲، وابن ماجہ

ان الفاظ نے، من سن فی الاسلام، کے لفظوں کا معنی بتا دیا کہ سنت و طریقہ جاری کرنا مراد نہیں بلکہ ہدایت کی طرف دعوت دینا اور اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو عمل کی تلقین کرنا مراد ہے۔

رابعاً۔ اس حدیث میں حسنہ کی قید موجود ہے اہل سنت کے نزدیک کسی امر شرعی میں حسن یا قبیح نہیں پایا جاسکتا جب تک اس کا ثبوت شریعت سے نہ ہو جبکہ بدعات کی تو بانی اسلام نے، کل بدعة ضلالة، کہہ کر چھوٹا کر دی ہے لہذا ان میں حسن کہاں سے ثابت ہوگا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ

کل بدعة ضلالة وان راها الناس حسنة،

یعنی ہر بدعت گمراہی ہے خواہ لوگ اسے اچھا ہی سمجھتے ہوں، المدخل للبیہقی (۱۹۱) و علم اصول

البدع ص ۹۲

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

اس دلیل کو مفتی صاحب نے مستقل شکل دے کر تو بیان نہیں کیا البتہ ابھی ہوئی بحث میں اس کو بیان کیا ہے جسے ہم نے سلجھا کر الگ ایک دلیل کے طور پر بیان کر دیا ہے کیونکہ اکثر اہل بدعت جملہ بدعات کے جواز پر اسی سے استدلال کرتے ہیں

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ۔

ماراه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن

جس کام کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہے، جاء الباطل ص ۲۱۹،

الجواب

اولاً۔ یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے علامہ زیلیعی حنفی فرماتے ہیں،

ولم اجده الاموقوف افعلى ابن مسعود،

نہیں پایا میں نے اس روایت کو مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر موقوف،

(نصب الراية ص ۱۳۳ ج ۴،)

ثانیاً۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ مذکورہ الفاظ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان نہیں بلکہ صحابی

رسول کا قول ہے جو گو سند کے اعتبار سے حسن درجہ کا ہے (الدرایہ ص ۱۸۷ ج ۲) مگر اس سے بدعات پر استدلال قطعاً درست نہیں، وجہ یہ کہ آج کے تمام مبتدعین، قادیانی، منکرین حدیث، نیچری، شیعہ وغیرہ اپنے اعمال کو حسن ہی جانتے ہیں، اور اگر اس سے تمام مسلمان مراد ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ عند اللہ بھی محمود ہوگی، تو اس سے مفتی صاحب اور ان کی جماعت کو ذرا بھی فائدہ نہیں، کیونکہ بدعات کی تحسین تمام مسلمانوں نے نہ کبھی کی ہے اور نہ کرتے ہیں اور نہ ہی کریں گے انشاء اللہ، اور اگر علماء بریلویہ اس سے کوئی مخصوص گروہ مراد لیں تو پھر اس سے صحابہ کرام کی مقدس جماعت مراد ہوگی جیسا کہ اسی حدیث کے ایک طریق میں اس کی وضاحت موجود ہے،

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

ان الله نظر في قلوب العباد فوجد قلب محمد ﷺ خير قلوب العباد فاصطفاه لنفسه فابتعته بر سالته ثم نظر في قلوب العباد بعد قلب محمد فوجد قلوب اصحابه خير قلوب العباد فجعلهم و وزراء نبیه یقاتلون علی دینہ فما رای المسلمون حسنا فهو عند الله حسن و ماراؤہ سینا فهو عند الله سيئي ،

یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں پر نظر کی تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دل کو تمام بندوں سے اچھا پایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا اپنے لئے اور انہیں رسالت دیکر مبعوث فرمایا پھر آپ ﷺ کے بعد بندوں کے دلوں میں دیکھا تو محمد ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں کو تمام بندوں سے اچھا پایا تو انہیں اپنے نبی کا وزیر بنایا جو اس کے دین (کے لئے حق) پر جہاد کرتے ہیں سو جس چیز کو وہ مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہوگی،

(مسند امام احمد ص ۳۷۹ ج ۱ رقم الحدیث ۳۵۸۹)

امام حاکمؒ نے اس سے مزید بھی الفاظ نقل فرمائے ہیں

ما رای المسلمون حسنا فهو عند الله حسن و ماراه المسلمون سینا فهو عند الله سيی وقد رای الصحابة جميعا ان یستخلفوا ابا بکر رضی اللہ عنہ ،
جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو مسلمان

برا جانیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی بری ہوگی اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا اور ان کی خلافت کو اچھا سمجھا لہذا ان کی خلافت اللہ کے ہاں بھی اچھی ہوگی،
(متدرک حاکم ص ۷۸ ج ۳، ونصب الراية ص ۱۳۳ ج ۴،)

ان دونوں روایات سے یہ بات کما حقہ ثابت ہوگئی کہ، المسلمون، سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقدس گروہ ہے بلکہ ایک روایت میں وہ اس کی تاکید بھی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلو، فرماتے ہیں

مَنْ كَانَ مُسْتَنًا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدَمَاتُ فَانَ الْحَيِّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أَوْلَاكَ
اصحاب محمد ﷺ كانوا افضل هذه الامة ابرها قلوبا واعمقها علما و اقلها
تكلفا اختارهم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم على اثر
هم و تمسكو ايما استطعتم من اخلاقهم و سيرهم فانهم كانوا على الهدى
المستقيم (رواه رزين / قال في تنقيح الرواة، ص ۲۵ ج ۱، رواه ايضا الطبراني في
الكبير مختصراً و رجاله رجال الصحيح،)

جو شخص سنت پر چلنا چاہتا ہے وہ ان لوگوں کی پیروی کرے جو وفات پا گئے ہیں کیونکہ زندہ پر
فتنوں سے امن نہیں کیا جاتا اور وہ لوگ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے صحابہ کرام ہیں جو اس امت کے
افضل ترین لوگ ہیں، اور نیک دل والے اور نہایت گہرے علم والے تھے، اور بہت کم تھے تکلف و
بناوٹ میں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین قائم کرنے کے لئے چن لیا، پس ان کی
عظمتوں کو پہچانو! اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرو، ان کے اخلاق اور سیرت کو جس قدر ممکن ہو
پکڑے رکھو، کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے،، روایت کیا اس کو رزین اور طبرانی نے معجم کبیر میں، (مشکوٰۃ
ص ۳۲،)

اس روایت سے ثابت ہوا کہ، مار المسلمون حسنا، سے ان کی مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا
مقدس گروہ تھا اور یہ وہی مضمون ہے جسے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے،
فعليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين.

یعنی میری اور میرے خلفاء کی سنت کو لازم پکڑو۔ (ترمذی مع تحفہ ص ۲۷۸ ج ۳، و ابوداؤد ص

۲۷۹ ج ۲، وابن ماجہ ص ۵، ودارمی ص ۵۷ ج ۱، و مسند احمد ص ۱۲۶ ج ۴،

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک دوسری روایت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے اور اس سے اعراض کو انہوں نے بدعت سے موسوم کیا ہے۔

اتبعوا ولا تبدعوا فقد کفیتم۔

(ہمارے) نقش قدم پر چلو اور اپنی طرف سے بدعتیں مت نکالو کیونکہ (اسلام مکمل ہو چکا ہے) تم کفایت کئے گئے ہو، (مجمع الزوائد ص ۱۸۶ ج ۱ باب الاقتداء بالسلف،)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مذکورہ روایت سے صحابہ کا مقدس گروہ مراد ہے اور یہ بات ہم باوازا بلند کہتے ہیں کہ مبتدعین کی جملہ بدعات کی صحابہ کرام سے تحسین ثابت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اور مبتدعین حضرات اپنے رفقاء سمیت بھی مل کر ان بدعات کا ثبوت صحابہ کرام سے مہیا نہیں کر سکتے !

معلوم ہوا کہ اس روایت سے ان کا استدلال باطل ہے

ثالثاً۔ اگر بالفرض دومنٹ کے لیے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ، المسلمون، میں الف لام استقراتی ہے جس میں ہر زمانہ کے لوگ شریک و سہیم ہیں تو اس سے اجماع امت مراد ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ جس کو تمام مسلمان اچھا جانیں وہ عند اللہ بھی اچھا ہوگا، اختلاف کی صورت میں اچھا ہونے کا دعویٰ کس دلیل پر قائم ہے، جبکہ ایجاد بدعت پر کبھی تمام مسلمان متفق نہیں ہوئے اور نہ آئندہ ممکن ہے انشاء اللہ۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

وفی حدیث مرفوع ولا تجمع امتی علی الضلالة،

اور حدیث مرفوع میں ہے کہ میری امت گمراہی پر متفق نہ ہوگی،

جاء الباطل ص ۲۱۹،

الجواب

اولاً۔ اس سے امت کا اجماع مراد ہے اور وہ بھی علماء اسلام کا نہ کہ عوام کا، چنانچہ ملا علی القاری حنفی المتوفی سن ۱۰۱۲ھ، اس کی شرح میں فرماتے ہیں

فالحديث يدل على ان اجتماع المسلمين حق والمراد اجماع العلماء ولا عبرة باجماع العوام لانه لا يكون عن علم.

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں کا اجماع حق اور صحیح ہے اور اجماع سے مراد علماء کا اجماع ہے عوام کا نہیں کیونکہ انہیں (دین) کا علم نہیں، مرقاة ص ۲۴۹ ج ۱ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)

ثانیاً۔ اگر ہم سے پوچھتے ہو تو ہمارے نزدیک فقط صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہی حجت شرعی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہوا ہے

ما انا عليه واصحابي، الحديث.

یعنی جنت میں وہ گروہ جائے گا جس نے میری اور میرے صحابہ کی پیروی کی، ترمذی کتاب الایمان باب ماجاء في افتراق هذه الامّة)

لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد کسی زمانہ میں بھی اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں کیونکہ اس کے علم کا ہمیں یقینی علم ناممکن ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فقہاء سکوت کو اجماع کہہ دیتے ہیں حالانکہ اس میں اختلاف کی حقیقت ہی معلوم نہیں ہوتی، یا کسی ایک علاقہ اور شہر کے اتفاق و اتحاد کو وہ اجماع کا نام دے دیتے ہیں حالانکہ وہ امت کا ایک جزو ہیں اور جزو کل نہیں ہو سکتا، انہیں حقائق کے پیش نظر حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں

من ادعى الاجماع فقد كذب، (رواہ عبد اللہ ابن الامام احمد عن ابیہ فی، مسائلہ ص ۳۹۰، علم اصول البدع ص ۱۳۵)

اجماع کا دعویٰ کرنے والا کاذب ہے،

امام شافعیؒ نے اسے ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے۔

ما لا يعلم فيه خلاف فليس اجماعاً،

جس مسئلہ میں اختلاف کا علم نہ ہو تو اس میں اجماع نہیں ہو سکتا، اعلام الموقعین ص ۲۳ ج ۱،
 ہاں اگر کسی قطعی و یقینی خبر سے اجماع جبری ثابت ہو تو وہ حجت ہے مگر شرط یہ ہے کہ قرآن و
 حدیث کے خلاف نہ ہو کیونکہ قرآن و سنت کے خلاف نہ اجماع حجت ہے نہ قیاس۔
 ثالثاً۔ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں سلیمان بن سفیان راوی
 ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۲۰۷ ج ۳،

جو کہ متکلم فیہ ہے چنانچہ امام دوری امام ابن معین سے نقل کرتے ہیں کہ ثقہ نہیں دوسری روایت
 میں کہا، لیس ہشتی (بیچ محض ہے) امام ابن مدینی فرماتے ہیں، منکر احادیث روایت کرتا ہے، امام
 ابوحاتم کا کہنا ہے، ضعیف الحدیث ہے اور ثقات سے منکر احادیث بیان کرتا ہے، امام ابوزرعمہ فرماتے
 ہیں منکر الحدیث ہے، امام دولابی کا کہنا ہے ثقہ نہیں امام بخاری فرماتے ہیں منکر الحدیث ہے دارقطنی
 کا فیصلہ ہے ضعیف ہے، تہذیب ص ۱۷۰ ج ۴، طبع مکتبہ فاروقیہ ملتان،

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

مشکوٰۃ کے شروع میں ہے

انما الاعمال بالنیات و انما لامرئ ما نوى.

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور انسان کے لیے وہی ہے جو نیت کرے، وجہ استدلال میں
 فرماتے ہیں، ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جو جائز کام نیت ثواب سے کیا جائے وہ عند اللہ بھی کار
 ثواب ہے۔ جاء الباطل ص ۲۱۹-۲۲۰،

الجواب

اولاً۔ اس حدیث میں فقط نیت فاسد اور نیت صالحہ کا بیان ہے، بدعات سے اس کا کیا تعلق

ہے؟

مفتی صاحب کا استدلال فقط اتنی بات پر ہے کہ چونکہ بریلوی مکتب فکر کے عوام و خواص ان
 بدعات کو خلوص دل سے نیک کام جان کر کرتے ہیں لہذا یہ بدعات کار ثواب ہیں، ہم پوچھتے ہیں
 کیا مکہ کے مشرکین بتوں کو سجدہ گناہ اور کفر سمجھ کر کرتے تھے؟ کیا آج کے بت پرست ہندو اور آگ

کی پرستش کرنے والے اسے دین داری اور صالحیت نہیں جانتے؟ اس سے بھی نیچے آئیے تو کیا آج کے مسلمان قبروں پر سجدہ عبادت جان کر نہیں کرتے؟ اور اس میں ان کی نیت صاف ہوتی ہے، قوالی کو تو خود مفتی صاحب نے اپنے استاد کے کہنے پر ترک کر دیا تھا، تذکرہ اکابر اہل سنت ص ۵۸)

تو کیا اس میں ان کی نیت صالحہ نہ تھی کہ استاذ نے منع کر دیا، اس سے بھی بڑھ کر سنئے کہ مثال کے طور پر ایک شخص کا مقصد تو یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوہ عورتوں کی پرورش ہے، مگر اس نیک کام کے لیے وہ چوری اور رہزنی کے ذریعہ روپیہ حاصل کرتا ہے، تو گو اس کا مقصد اور نیت نہایت پاکیزہ ہے، مگر کوئی مبتدعین کا مفتی بھی مذکورہ حدیث کی بنا پر اس کے فعل کو جائز قرار نہیں دے گا، بلکہ صاف فتویٰ صادر کرے گا شریعت کی نگاہ میں وہ چور اور رہزن ہے اس پر حدود قائم ہوں گی۔

لیکن اس کے برعکس ایک دوسرا شخص حقیقت میں تو لوگوں کو ٹھگ کر روپیہ کمانا چاہتا ہے، لیکن عوام پر اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے مسجد میں بیٹھ کر علم دین کی تعلیم دیتا ہے، مواعظ و نصائح کے دریا بہاتا ہے اور اپنا وقت ذکر الہی میں صرف کرتا ہے، تو گو اس کے یہ افعال نہایت مقدس ہیں مگر وہ گندا مقصد و نیت جس کے لئے اس نے یہ روپ دھارا ہے اس کے حسن عمل کی پونجی کو نہ صرف برباد کر دیتا ہے بلکہ اس پر فریب دینداری سے اس کا جرم اور بھی زیادہ سنگین ہو جاتا ہے اور یہی صورت آنحضرت ﷺ نے مذکورہ حدیث میں ہجرت کی مثال دیکر بیان فرمائی ہے کہ گو ہجرت ایک نیک اور دین کا اہم رکن ہے لیکن اگر کوئی شخص ہجرت اس بنا پر کرتا ہے کہ وہ کسی حسین و جمیل خاتون سے شادی کرے گا تو اس کی ہجرت عند اللہ غیر مقبول اور عبادت نہ ہوگی بلکہ شرعی طور پر وہ جس مقصد کے حصول کے لئے گیا تھا وہی عند اللہ لکھا بھی جائے گا۔

ثانیاً۔ جس طرح نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا کسی فعل کو کرنا سنت ہے اسی طرح کسی کام کو ترک کرنا بھی سنت ہے لہذا آپ علیہ السلام کے کسی فعل کے چھوڑنے کی اتباع بھی سنت ہے اسی حدیث، انما الاعمال بالنیات، کی شرح میں ملا علی القاری الحنفی لکھتے ہیں

والمتابعة كما تكون في الفعل يكون في الترك ايضاً فمن واطب على فعل لم يفعله الشارع فهو مبتدع

یعنی پیروی جس طرح فعل میں ہوتی ہے اسی طرح ترک میں بھی پیروی ہوتی ہے پس جس

نے کسی ایسے کام میں مواظبت کی جو شارع علیہ السلام نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۴۱ ج ۱،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی فرماتے ہیں۔

اتباع ہمچنان کہ در فعل واجب است در ترک نیز می باید پس آنکہ مواظبت نماید بر فعل آنچه شارع نکرده باشد مبتدع بود، کذا قال المحدثون۔
یعنی پیروی جس طرح فعل میں واجب ہے اسی طرح ترک میں بھی واجب ہوگی سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی جو شارع علیہ السلام نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہوگا اسی طرح محدثین کرام نے کہا ہے

اشعة الممعات ص ۳۶ ج ۱ طبع مکتبہ نورانی پشاور،

مولوی قطب الدین حنفی ترجمہ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ اور اتباع کرنا آنحضرت ﷺ کا جیسے فعل آنحضرت ﷺ میں حرام ہے ویسے ہی جو حضرت نے کبھی نہ کیا ہو اس فعل کے نہ کرنے میں بھی اتباع لازم ہے مظاہر حق ص ۱۲۱۹
طبع نول کشور

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ جن افعال کو نبی کریم ﷺ نے ترک کیا ہے ان کا چھوڑنا ہی سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے اور یہی ہم کہتے ہیں کہ آج مبتدعین کی جملہ بدعات جنہیں وہ کرتے ہیں ان کے دوائی و محرکات آنحضرت ﷺ کی زندگی مبارکہ میں بھی موجود تھے مگر آپ علیہ السلام نے ان کو چھوڑا اور آپ کا ان کو ترک کرنا سنت ہے اور اس کی پیروی کرنا سنت کی پیروی ہے اور اس کی مخالفت بقول محدثین کرام بدعت ہے

لہذا مفتی صاحب کائنات صالحہ سے ایجاد بدعت پر استدلال غلط ٹھہرا،

مفتی جی کا ایک سنت کو بدعت کہنا

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں

روزہ افطار کرتے وقت زبان سے دعا کرنا (اللھم لک صمت) الخ اور سحری کے وقت دعا مانگنا

کہ (اللھم بالصوم لک غداً نویت) بدعت ہے، جاء الباطل ص ۲۲۱ ج ۱،

الجواب

اولاً حضرت مفتی صاحب علم حدیث سے نہ صرف کہ کم آگہی رکھتے تھے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سرے سے ہی کورے چٹے تھے بلاشبہ روزہ رکھنے کی دعا کسی حدیث سے ثابت نہیں اور اسے یار لوگوں نے اختراع کر رکھا ہے، مگر روزہ افطار کرنے کی دعا کو مفتی صاحب کا بدعت قرار دینا زیادتی ہے کیونکہ یہ دعا تو، سنن ابوداؤد مع عون ص ۲۷۸ ج ۲، میں موجود ہے مانا کہ یہ سند کے اعتبار سے مرسل ہے لیکن مراہیل تو احناف کے نزدیک حجت ہیں خود مفتی صاحب کو اس اصول و ضابطے کا اقرار ہے، جاء الباطل ص ۷ ج ۲

لہذا اس پر بدعت کا فتویٰ صادر کرتے وقت مفتی صاحب کو بخوبی غور کرنا چاہیے تھا۔

ثانیاً، ایک حسن حدیث میں حسب ذیل دعا مروی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ افطاری کی وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے،
ذَهَبَ الظَّمَا وَابْتَلَّتِ الْعُرُوفُ وَتَبَّتِ الْأَجْرُ إِن شَاءَ اللَّهُ،

یعنی پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہو گئیں اور اجر ثابت ہو گیا اگر اللہ نے چاہا، ابوداؤد مع عون ص ۲۷۸ ج ۲، و مستدرک حاکم ص ۴۲۲ ج ۱، و بیہقی ص ۲۳۹ ج ۴ و دارقطنی ص ۱۸۵ ج ۲، و السنن الکبریٰ للنسائی ص ۸۲/۶ (رقم الحدیث ۱۰۱۳۱)

اس حدیث کو حاکم و ذہبی نے صحیح اور امام دارقطنی اور علامہ البانی نے ارواء الغلیل ص ۳۹ ج ۴ (۹۲۰) میں حسن کہا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ علی الاطلاق روزہ افطار کرنے کی دعا کو بدعت کہنے والا علوم اسلامیہ سے جاہل ہے اور وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے مبتدعین کا ہیرو کہا جائے۔

SCANNED BY: MUHAMMAD
SHAKIR

CONTACT : truemaslak@inbox.com

باب

فرداً فرداً بدعات پر تنقید

محفل میلاد کی شرعی حیثیت

شریعت کو کسی بڑے سے بڑے انسان کی موت و حیات سے اس طرح کوئی دلچسپی نہیں کہ ان کی (ثواب جان کر سا لگہ) منائی جائے یا نوحہ و غم کر کے ان کی بری رچائی جائے بلکہ صاف ارشاد فرمایا:-

تلك امة قد خلت لهما ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون (البقرہ، ۱۳۷)

ترجمہ:- یہ جماعت گزر چکی ان کو ان کے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال کا (۱۳۷-۲) آخر اتنے انبیاء کرام اس دنیا میں آئے جن کی تعداد خود رسول اللہ ﷺ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان فرمائی ہے، مشکوٰۃ ص ۵۱۱، اور بعض کو نہایت بے دردی سے شہید بھی کر دیا گیا (البقرہ آیت نمبر ۶۱) (ال عمران ۱۱۲)

اور تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا اسلام کا اہم اور بنیادی رکن ہے پہلے پارے کے ابتدا ہی میں متقی کی تعریف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا،

وما انزل من قبلک (البقرہ)

اور جو کتابیں تم سے پہلے (پیغمبروں پر) نازل ہوئیں (سب پر ایمان لاتے ہیں) ایک دوسرے مقام پر بعض انبیاء کرام کا ذکر بیان فرما کر ارشاد ہوا،

قولوا امنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراہیم و اسمعیل و اسحاق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ و عیسیٰ و ما اوتی النبیون من ربہم لانفرق بین احدہم و نحن لہ مسلمون (البقرہ، ۱۳۶)

ترجمہ:- (مسلمانوں) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر اور جو اور پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں ان (سب پر ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی اللہ واحد کے فرمانبردار ہیں ۲-۱۳۶۔

اس آیت کریم میں انبیاء کرام کے متعلق ایک اصل الاصول بتا دیا کہ اسلام میں بعض انبیاء کرام کے انکار کی گنجائش قطعاً موجود نہیں بلکہ سورۃ النساء میں اسے کفر سے تعبیر فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

ان الذين يكفرون بالله و رُسُلِهِ و يريدون ان يفرقوا بين الله و رُسُلِهِ و يقولون
نؤمن ببعض و نكفر ببعض و يريدون ان يتخذوا بين ذلك سبيلاً ☆ اولئك هم
الکفرون حقاً و اعتدنا للکافرين عذاباً مهيناً۔ (النساء ۱۵۰-۱۵۱)

ترجمہ۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء میں فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور ایمان اور کفر کے درمیان ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں وہ لوگ بلاشبہ کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے، (۴-۱۵۰-۱۵۱)

ان آیات میں بات کی رو سے ہم اس بات کے مکلف ٹھہرائے گئے ہیں کہ تمام انبیاء کرام پر ہم یکساں ایمان لائیں، اب اگر ہم ایک ایک کی عید میلاد منائیں تو دن میں بیسیوں دفعہ ہمیں محفل میلاد سجانا پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تیس سالہ زمانہ رسالت اور خلافت راشدہ میں ایسی کوئی محفل نظر نہیں آتی بلکہ خیر القرون کے پورے زمانہ میں دو عیدوں کے علاوہ ہمیں تیسری کوئی عید نظر نہیں آتی، عید میلاد کا انعقاد تو کجا کسی صحابی سے کوئی قول منقول نہیں کہ یہ بھی ثواب کا کام ہے حالانکہ ہم محبت نبوی ﷺ میں صحابہ کرام کی گردراہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

بقول مفتی احمد یار خان اس کی ابتدا چھٹی صدی ہجری میں ہوئی اور اس کا موجد مظفر الدین ابو سعید کوکبری (المتوفی ۶۳۰ھ) تھا، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں۔

جس بادشاہ نے پہلے اس کو ایجاد کیا وہ شاہ اربل ہے، جاء الباطل ص ۲۳۷، اسی طرح بریلویت کا معروف عالم دین مولوی عبد السمیع، رامپوری لکھتا ہے، میلاد شریف کا معین کرنا بعد میں ہوا یعنی چھٹی صدی کے آخر میں، انوار ساطعہ مع براہین قاطعہ ص ۱۶۳ طبع کراچی سن ۱۹۸۷ء، حافظ سیوطی نے الحاوی للفتاویٰ ص ۱۲۹ ج ۱ میں بھی یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اس کا موجد بادشاہ اربل ہے، ممکن ہے کہ موصل میں ابو سعید کوکبری نے سب سے اول اس کا انعقاد کیا ہو مگر اس کے موجد فاطمی خلفاء تھے، جیسا کہ علامہ مقریزی نے، المواعظ والاخبار بذکر الخطط والاثر ص ۴۹۰ ج ۱ میں علامہ

ابوالعباس احمد بن علی القلتشدی نے، صبح الاشی فی صناعة الانشاء ص ۴۹۸ ج ۳ میں، لکھا ہے، الغرض عید میلاد کے بانی رافضی ہیں، بہر حال جو بھی ہو یہ اسلام میں ایک ایسی بدعت ہے جس کے خیر القرون میں نہ ہونے کا بریلوی علماء کو بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ

مولانا غلام رسول سعیدی صاحب حنفی بریلوی شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ فرماتے ہیں
سلف صالحین یعنی صحابہ اور تابعین نے محافل میلاد نہیں منعقد کیں بجا ہے، شرح صحیح مسلم ص

۱۷۹ ج ۳،

پھر اس کی تاویل کرتے ہوئے عذر گناہ بدتر از گناہ، فرماتے ہیں

صحابہ اور تابعین کے محافل میلاد منعقد نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ دن رات دین کے اہم کاموں میں مشغول رہتے تھے مثلاً اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کرنا، کافروں کو مسلمان کرنا، مرتدوں اور دین کے باغیوں کو تہ تیغ کرنا، حدود الہیہ قائم کرنا اور اسلام کا سورج جو کہیں غروب نہ ہوتا تھا ان تمام شہروں میں نظم و نسق قائم کرنا، بلفظہ شرح مسلم ص ۱۷۹ ج ۳،

راقم عرض کرتا ہے کہ کیا آج ان اہم دینی کاموں کی ضرورت ختم ہو گئی ہے جہاد تو قیامت تک جاری رہے گا اسی طرح کفار کو مسلمان بنانا اور حدود الہی کو قائم کرنا بھی منسوخ نہیں ہوا تو پھر آپ حضرات ان اہم اور غیر معمولی شریعت حقہ کے ارکان کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں جبکہ ان کے کرنے والے کے ساتھ رب تعالیٰ کا وعدہ بھی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ الْيَمِّ؟ تَوَمَّنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ☆ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ يَدْخُلْكُمْ جَنَّةٍ تَجْرَى مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَ مَسْكَنٌ طَيِّبٌ فِي جَنَّةٍ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (الصف ۱۰ تا ۱۲)۔

ترجمہ۔ مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے نجات دے (وہ یہ کہ) اللہ رب العزت اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغہائے جنت میں، جس میں نہریں بہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں داخل کرے گا

یہ بڑی کامیابی ہے (۶۱-۱۲ تا ۱۰)۔

الغرض جو شخص اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کرتا ہے اس سے تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کا منکر پکا کافر اور دین اسلام سے خارج ہے اب اگر کوئی شخص ان اہم کاموں کو ترک کر کے محافل میلاد منعقد کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا میلاد منانا بقول سعیدی صاحب اسی وجہ سے ہوگا کہ وہ ان اہم اور غیر معمولی دین کے کاموں سے غفلت کرے گا کیونکہ جنہوں نے غفلت نہ کی تھی ان کا دامن ان بدعات سے پاک تھا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد نہ کرنے والا اور اس سے غفلت کرنے والے کے متعلق علماء بریلویہ کیا فرماتے ہیں، ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی، علامہ فاکہانی رحمہ اللہ سے اس کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے کہا کہ

لا اعلم لهذا المولد اصلاً فی کتاب ولا سنة ولا ينقل عمله عن احد من علماء الامة الذين هم القدوة فی الدين المتمسكون بالاثار المتقدمين بل هو بدعة احدثها الباطلون وشهوة نفسی اعتنى بها الا كالون،

یعنی کتاب اللہ اور سنت نبویہ میں اس میلاد کا، میں کوئی اصل نہیں جانتا اور علمائے امت جو کہ دین میں (آنے والوں کے لیے) نمونہ اور متقدمین کے آثار کو تھامنے والے تھے، ان میں سے کسی ایک سے بھی اس کا عمل منقول نہیں بلکہ یہ بدعت ہے، جسے باطل پرستوں اور نفسانی خواہشات کے خوگر اور پیٹ کے پجاریوں نے گھڑا ہے، المورد فی الکلام علی المولد، بحوالہ حسن المقصد فی عمل المولد، مندرجہ الحاوی للفتاویٰ ص ۲۲۳ ج ۱ طبع دار الفکر،

امام ابن الحاج فرماتے ہیں کہ

ومن جملة ما احدثوه من البدع مع اعتقادهم ان ذلك من اكبر العبادات و اظهار الشعائر ما يفعلون فی شهر ربیع الاول من المولد وقد احتوی علی بدع محدمات، یعنی لوگوں کی نئی بدعات میں سے جسے وہ سب سے بڑی عبادت اور شعائر اسلامیہ کے اظہار کا اعتقاد کرتے ہیں، ایک یہ بھی ہے جو ماہ ربیع الاول میں مجلس میلاد کا قیام ہے اور یہ بہت سی بدعات اور محرمات کو شامل ہے۔

المدخل ص ۲۲۹ ج ۲۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ

لم يفعلہ السلف مع قیام المقتضیٰ لہ وعدم المانع فیہ لو کان خیرا محضاً او راجحاً لکان السلف رضی اللہ عنہم احق بہ منا فانہم کانوا اشد محبة لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتعظیماً لہ منا، و ہم علی الخیر احرص و انما کمال محبتہ و تعظیماً فی متابعتہ و طاعتہ و اتباع امرہ و احیاء سنة باطناً و ظاہراً و نشر ما بعث بہ و الجہاد علی ذلک بالقلب و البدن و اللسان فان ہذہ طریقۃ السابقین الاولین من المهاجرین و الانصار و الذین اتبعوہم باحسان۔

یعنی سلف صالحین نے محفل میلاد کا انعقاد اس تقاضے کا قیام اور رکاوٹ و مانع کے نہ ہونے کے باوجود نہیں کیا اور اگر یہ محض خیر و بھلائی یا رائج بات ہوتی تو سلف صالحین ہماری نسبت اس کے زیادہ حق دار تھے، وہ ہماری نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تعظیم میں زیادہ سخت اور نیکی کے کاموں میں زیادہ حریص تھے، آپ کی محبت اور تعظیم کا کمال آپ علیہ السلام کی ظاہراً و باطناً اطاعت کرنے آپ علیہ السلام کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ کرنے اور جو احکامات دیکر آپ علیہ السلام کو بھیجا گیا انہیں پھیلانے اور ان امور پر دل ہاتھ زبان کے ساتھ جہاد کرنے میں ہے۔ اور یہی طریقۃ انصار و مهاجرین کا ہے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے اور ان کے اچھے طریقے کے ساتھ پیروی کرنے والوں کا تھا۔ (اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفة اصحاب الجحیم ص ۶۱۵ ج ۲)

الغرض اس بدعت کا وجود خیر القرون میں نہ تھا اس کی ایجاد شیعوں نے کی اور ان کی پیروی کرتے ہوئے چھٹی صدی ہجری میں ایک مسرف بے دین بادشاہ مظفر الدین ابوسعید کو کبریٰ نے اس کو سیاست دانوں کی طرح استعمال کیا؛ میلاد کی تقریب منانے کے لئے ماہ صفر میں ہی تیاری شروع کر دیتا ہر قسم کے قوال گانے بجانے والے حضرات اکٹھے ہو جاتے بقول حافظ ابن کثیر جس میں وہ خود بھی رقص (ناچ) کرتا تھا، البدایہ ص ۲۵۶ ج ۱۳ مترجم،

اور جس دنیا پرست مولوی نے اس کے لئے مواد جمع کیا، وہ عمر بن دحیہ ابو الخطاب التوفی سن ۶۳ تھا، اسکے متعلق حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں

کثیر الوقیعة فی الائمة و فی السلف من العلماء خبیث اللسان احمق شدید
الکبر قليل النظر فی امور الدین متهاونا،

وہ ائمہ دین اور علماء سلف کی شان میں کثرت سے گستاخیاں کرتا تھا، گندی زبان کا مالک تھا،
احمق اور بڑا متکبر تھا، کم علم اور دین کے کاموں میں بڑا بے پروا اور ست تھا، لسان المیزان ص ۲۹۶
ج ۴،

حافظ ابن حجرؒ نے ص ۲۹۵، میں ابن نجار کے حوالے سے صراحت کی ہے کہ محدثین اس کے
جھوٹے اور ضعیف ہونے میں متفق ہیں، لسان، اب جس کا جی چاہے وہ خیر القرون کی اتباع کرے یا
شیعوں و رافضیوں کی ایجاد کردہ بدعت اور نفس پرست بادشاہ اور احمق و متکبر مولوی کی سیاسی عیاری
کی؟ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

محبت رسول ﷺ کا معیار

محبت کا معیار نعرہ بازی نہیں اور نہ ہی یہ موٹی چیز ہے کہ ربیع الاول میں تو یہ سیلاب بن کر
آئے اور باقی سارا سال آپ کو احساس تک نہ ہو کہ ہمارا کوئی رسول بھی ہے، محبت والفت دائمی تعلق
کا نام ہے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے،

ان ربی رحیم و دود، سورہ، ہود آیت نمبر ۹۰۔

بیشک میرا پروردگار رحم کرنے والا (اور) محبت کرنے والا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت نے مخلوق پر رحم کرنے اور اس سے محبت کرنے کا کوئی خاص
دن اور وقت متعین نہیں کیا بلکہ وہ ہمہ وقت مخلوق پر مہربان اور محبت کرنے والا ہے اسی طرح خالق
ارض و سماء نے بہشت میں مومن کو ملنے والی حوروں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

فجعلنہن ابکارا عربا اترا با (الواقعة ۳۶، ۳۷)

پھر ہم نے ان کو کنواریاں بنایا شوہر سے محبت کرنے والیاں اور ہم عمر،

اس فرمان رب تعالیٰ کا بھی یہی منشا ہے کہ وہ حوریں مومن کی فرمانبردار اور مطیع ہوں گی، ان کے
اشاروں پر مر مٹنے والیاں اور غیر معمولی الفت و محبت کرنے والیاں ہوں گی وہ تعیل ارشاد میں ہمہ تن

گوش ہوں گی کیونکہ محبت والفت ہے ہی اسی چیز کا نام، ایسے ہی محبت رسول کا ہم سے تقاضا ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں ان کی سیرت اور اسوہ حسنہ کو اپنی زندگی کا محور بنائیں ان کے اقوال وافعال کو بلا شرکت غیر قبول کریں ان کے اعمال کو بغیر قیل وقال کے لائحہ عمل بنائیں ان کے حکم کو بغیر حیل و حجت کے تسلیم کریں ان کی ممانعت کو نص جان کر ترک کر دیں الغرض بڑی سادگی ہے ان کی تشریح و توضیح کو حرف آخر قرار دیں یہی ان کی ذات مقدسہ سے والہانہ عقیدت و محبت ہے

خود سید الثقلین امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ایک حدیث میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ اے میرے بیٹے اگر تجھ سے یہ بات ہو سکے کہ صبح و شام کسی کے لئے اپنے دل میں کھوٹ نہ رکھے تو پھر ایسا کر، پھر فرمایا اے میرے بیٹے،

ذلک من سنتی ومن احب سنتی فقد احبنی و من احبنی کان معی فی الجنة،

رواہ الترمذی

یعنی یہ کام میری سنت ہے اور جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا، مشکوٰۃ ص ۳۰۔

محبت رسول ﷺ کی آڑ میں لیڈروں کی سیاسی چالیں

جن لوگوں کو نماز روزہ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ سارے اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا وہ آج کل ہماری قوم کے لیڈر اور قائدین بن جاتے ہیں اور عوام سے ووٹ طلب کرتے ہوئے کہتے ہیں کلمہ طیبہ اور قرآن کریم آپ کے ووٹ کے حق دار ہیں، آپ حضرات نے ہمیں کیا، ان کو ووٹ دینا ہے پھر اقتدار میں آکر یہ لوگ عوام سے کیئے ہوئے تمام وعدے بھول جاتے ہیں، ہاں البتہ کوئی نا کوئی ایسا فعل و عمل کرتے ہیں جس سے ان کا مقصود نمائش و دکھلاوہ ہوتا ہے وہ کبھی عید میلاد کا ڈھونگ رچاتے ہیں تو کبھی معراج کے نام پر کوئی سیمینار منعقد کرتے ہیں تو کبھی بینک بیلنس کی شرح سود کو منافع کا نام دیتے ہیں تو کبھی عوام کی دولت ہڑپ کرنے کی غرض سے چارے کے کھیت پر عشر لگا کر دین دار طبقہ سے داد تحسین وصول کرتے ہیں، انہیں طبقہ ملوک کے متعلق حضرت عبداللہ بن مبارکؓ نے کیا خوب کہا ہے،

وہل افسد الدین الا الملوک، و احبار سوء و رہبا نہا،

ماہر نفسیات قسم کے یہ لوگ حقیقی معنوں میں عوام کے دین سے محبت و عقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور جاہل عوام کو خوش کرنے نیز اپنے اقتدار کو لمبا کرنے کے لئے یہ حضرات دین میں ایسے ایسے تصرفات کرتے ہیں کہ عقل و خرد اور ارباب حل و عقد تک کو یہ لوگ مات کر جاتے ہیں بادشاہی کے نشے سے چور یہ لوگ، اکبر کا دین الہی، تک مرتب کر دیتے ہیں قرآن جیسی نعمت جو کہ کلام الہی ہے کو مخلوق کہتے ہوئے یہ لوگ کوئی عار محسوس نہیں کرتے اگر بادشاہوں کا مرتب کردہ اسلام اور ان کے تصرفات کو قبول کرنے کا دروازہ کھول دیا جائے تو یقین جانئے

کہ اسلام کا حلیہ ہی بگڑ جائے اور دین اسلام کے بنیادی و اساسی عقائد و قواعد اور ضوابط بلکہ عبادات تک کا جنازہ نکل جائے، ان لوگوں کے سامنے جس نے بھی حق کا علم بلند کیا انہیں جیل دیکھنا پڑی یا تختہ دار پر لٹکا دیا گیا،

اسی لئے شریعت حقہ میں صاف کہا گیا ہے کہ خلافت فقط تیس سال ہی رہے گی اس کے بعد بادشاہی و ملوکیت پھیل جائے گی اور قابل عمل فقط خلفاء الراشدین ہی ہوں گے۔ صرف انہیں کا بنایا ہوا اصول و ضابطہ ہی تمہارے لئے نمونہ و اسوہ ہوگا وہی صرف دلیل کے لائق ہوگا کیونکہ ان کا عمل سنت خیر الانام میں داخل ہوگا ارشاد ہوتا ہے۔

فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین .

یعنی میری اور میرے خلفاء کی سنت کو لازم پکڑو، ترمذی ص ۳۷۸ ج ۳، و ابوداؤد ص ۲۷۹ ج ۲، وابن ماجہ ص ۴، و دارمی ص ۵۷ ج ۱، و مسند احمد ص ۱۲۶ ج ۴۔

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی ۔

ربنا انزل علینا مائدة من السماء تكون لنا عیداً لا ولنا و اخرنا ،

معلوم ہوا کہ مادہ آنے کے دن کو حضرت مسیح علیہ السلام نے عید کا دن بنایا آج بھی اتوار کو عیسائی اسی لئے عید مناتے ہیں کہ اس دن دسترخوان اتر ا تھا اور حضور علیہ السلام کی تشریف آوری اس مادہ سے بڑھ کر نعمت ہے لہذا ان کی ولادت کا دن بھی یوم العید ہے

الجواب

اولاً: اسے کہتے ہیں دو اور دو، چار روٹیاں، حضرت مفتی صاحب کو محفل میلاد کے لئے اگر کوئی

دلیل ملی ہے تو وہ بھی عمل نصاریٰ سے بہت خوب کھتا کبوتر باز باباز
ثانیاً: معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے آیت قرآنی کا ترجمہ کیوں بیان نہیں کیا ہم تو یہی جانتے
ہیں کہ کھتری کی طرح اس میں بھی کوئی مصلحت ہی ہوگی۔

حالت: آیت قرآنی کے الفاظ، لا ولنا و اخرنا، میں کون لوگ مراد ہیں اگر عیسائی ہیں یقیناً وہی
مراد ہیں جیسا کہ مفسرین کرام نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے۔

دیکھئے مدارک ص ۲۲ ج ۲

(والکشاف ص ۲۹۳ ج ۱)

چنانچہ بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین پیر کرم شاہ صاحب بھیروی فرماتے ہیں
لاولنا و اخرنا،

سے مراد یہ ہے کہ جو اس ماندہ کے نازل ہونے سے پہلے ایمان لا چکے اور جو بعد میں ایمان
لائیں گے یہ سب کے لئے فرحت و شادمانی کا دن ہوگا، ضیاء القرآن ص ۵۲۳ ج ۱؛

پیر کرم شاہ صاحب کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ اس کے مخاطب ہی عیسائی ہیں اور عمل
نصاریٰ سے حجت پکڑنا کم فہمی کی دلیل ہے کیونکہ دین عیسوی منسوخ ہو چکا ہے اور ان کے کسی قول
و فعل کو پکڑنے کے لئے شارع علیہ السلام کی تصدیق لازم ہے اگر بے تصدیق ہی منہ اٹھا کر ان کے
پیچھے چل دیئے تو نتیجہ برا نکلے گا، ارشاد ہوتا ہے

يا ايها الذين امنوا ان تطيعوا الذين كفروا يردوكم على اعقابكم فتنقلبوا
خسرين (ال عمران ۱۵۰)

مسلمانوں! اگر تم کافروں کا کہا مانو گے تو وہ تم کو الٹے پاؤں پھیر دیں گے اور تم گھائے میں
جا پڑو گے (۱۵۰-۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کے پیچھے چلنا ان کی ایسی باتوں پر عمل کرنا جس کی اللہ تعالیٰ اور
رسول اللہ ﷺ نے تصدیق نہیں کی، خسارے کا موجب اور عذاب الہی کو دعوت دینا ہے، اس تمہید کے
بعد ہم پورے جزم و یقین اور وثوق سے کہتے ہیں کہ کسی نعمت و انعام پر عید منانا رسول اللہ ﷺ نے
نہیں بتایا اور عمل نصاریٰ کی اللہ تعالیٰ اور ان کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے تصدیق نہیں کی۔

رابعاً: اگر ہر نعمت و انعام رب تعالیٰ پر عید منانا تسلیم کر لیا جائے تو عیدوں کا ایک لامتناہی
سلسلہ شروع ہو جائے گا، کیونکہ انعام باری تعالیٰ بے حد اور بے شمار ہیں

، ارشاد ہوتا ہے

وان تعدوا نعمت اللہ لاتحصوها (ابراہیم ۳۴)
اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کر سکو گے (احمد رضا ۱۴-۳۴)

یہی مضمون سورۃ النحل کی آیت (۱۸) میں بیان ہوا ہے کہ اللہ رب العزت کی نعمتوں کو شمار نہیں کیا جاسکتا، جب انعامات کو شمار نہیں کیا جاسکتا تو پھر ہر نعمت پر عید منانے کے کیا معنی ہوئے، اگر فریق ثانی اس بات پر بضد ہے کہ معلوم نعمتوں پر عید منانا ہی عین اسلام ہے تو ہم تاریخ اسلام پر نظر کر کے اور قرآن و سنت سے ثابت کر دیتے ہیں کوئی دن بھی نعمت الہی سے خالی نہیں ہوتا، تو کیا فریق ثانی تمام دنوں میں عید منانے کے لئے تیار ہے؟ اگر وہ تیار ہیں تو ہم دین الحق کے اگلے ایڈیشن میں پورے سال کی فہرست مہیا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

خاصاً: احسانات و انعامات رب تعالیٰ کی تحدیث عید سے نہیں بلکہ شکر سے ہوتی ہے۔

جس کی ضروری تفصیل مفتی صاحب کی دوسری دلیل کے جواب میں انشاء الرحمن آرہی ہے۔
سادساً: اگر یہ حکم منسوخ نہیں تو بریلوی مکتب فکر کے علماء عیسائیوں کا بڑا دن بھی اسی طرح نزک و احتشام سے کیوں نہیں مناتے، کیونکہ کل انبیاء کرام پر ایمان لانا اسلام کا بنیادی رکن ہے اور اگر منسوخ ہو گیا ہے تو پھر اس سے دلیل لانا فضول ہے۔

سابعاً: مادہ: تو کھانے کی چیز تھی، جو بنی اسرائیل کو بغیر کسی محنت و مشقت سے ملا تھا، اور یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ وہ پیٹ پالنے کی نعمت غیر مترقبہ پر خوش ہوتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن نے دعا میسج سے بیان کیا ہے۔ مگر یار لوگوں نے اس پر جشن و جلوس اور دیگر لوازمات کا بھی اضافہ کر لیا ہے، اور یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ ہم امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مادہ کی خوشی پر قیاس کر رہے ہیں، یہ ہیں عظمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹھیکے داری کا دعویٰ کرنے والے تو ایسے میلاد کی یہ دلیل نقل کی جائے علم نفسیات سے زیادہ تعلق رکھتی ہے کہ ان لوگوں کے پیٹ کی آگ کس ترقی پر ہے ٹامنا ہمارے شیخ فرماتے ہیں کیا متقدمین آئمہ کرام صحابہ اکرام یا تابعین عظام میں سے کسی ایک نے اس آیت کی تفسیر جشن میلاد سے کی ہے؟ ہرگز نہیں کی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا وہ اس تفسیر سے نابلد تھے یا امت بریلوی اس آیت کی تفسیر اپنی رائے سے کر کے خود کو من قال فی القرآن برائی کے مصداق ٹھہرا رہے ہیں؟ (محمد یحییٰ گوندلوی)۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

واما بنعمة ربك فحدث،

اپنے رب کی نعمتوں کا خوب چرچا کرو، اور حضور علیہ السلام کی دنیا میں تشریف آوری تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے کہ رب تعالیٰ نے اس پر احسان بتایا ہے اس کا چرچا کرنا اسی آیت پر عمل ہے، جاء الباطل ص (۲۳۱)۔

الجواب

اولاً، یہاں تحدیث نعمت کا ذکر ہے ناکہ نبی ﷺ کے یوم پیدائش کے روز عید منانے اور جلوس نکالنے کا۔

ثانیاً، یہاں جس نعمت کا ذکر ہے وہ دین اسلام کی نعمت ہے۔

چنانچہ علامہ نسفی حنفی فرماتے ہیں۔

ای حدث بالنبوة التي اتاك الله، وهي اجل النعم والصحيح انها تعم جميع

نعم الله عليه ويدخل تحته تعليم القرآن والشرائع.

یعنی نبوت کا اظہار کیجئے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطاء کی ہے اور یہ نعمت اجل ہے اور صحیح یہ ہے کہ تمام نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام پر کی ہیں اُس میں داخل تعلیم القرآن اور شریعت (کی نعمت)

تفسیر المدارک ص ۳۷۶ ج ۵،۔

امام ابن کثیر فرماتے ہیں۔

ما علمت من خير فحدث اخوانك .

یعنی جو بھلائی کی باتیں آپ کو معلوم ہیں وہ اپنے بھائیوں سے بیان کرو، ابن کثیر ص ۵۲۳ ج ۴، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں جس نعمت کا ذکر ہے وہ آپ کی نبوت اور آپ علیہ السلام کو ملنے والے

احکام شریعت ہیں۔

نبی ﷺ کی نبوت کی تشہیر کرنی آپ پر ایمان کی دعوت دینی کفار کو اسلامی تعلیم بیان کر کے حقانیت اسلام واضح کرنے کو عید میلاد سے کیا نسبت ہے، یار لوگوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے کہ اس سے عید میلاد کے جلوس پر استدلال کیا جا رہا ہے

ٹالٹا، اگر تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں نعمت سے مراد ہر وہ نعمت ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے کی ہے تو تب بھی یہ ہمارے مخالف نہیں اور مفتی صاحب کے موافق نہیں کیونکہ یہاں نعمت کے اظہار کا ذکر ہے، نعمت پر عید منانے بالخصوص میلاد النبی کا ذکر نہیں اور اظہار نعمت عید سے نہیں بلکہ احکام الہی کی پیروی سے ہوتی ہے جس کا خود مفتی صاحب کو اقرار ہے، دیکھئے نور العرفان ص ۹۷۶،

اسلام میں تحدیث نعمت کا طریقہ

جو لوگ تحدیث نعمت کا نام عید رکھ لیں اور پھر اسے خالص حق باور کرائیں! ان کی علمی بے مائیگی کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں! کیونکہ تحدیث نعمت کہتے ہیں کسی نعمت الہی کا اظہار کرنا، مثلاً زید کا کہنا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے علم وین سے نوازا یا کسی مال دار کا کہنا کہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ اسی طرح کے فقرات ہم روزمرہ کی گفتگو میں کہہ کر تحدیث نعمت کرتے ہیں مگر کوئی جاہل سے جاہل اور عقل و خرد سے خرد سے خرد بھی مس رکھنے والا یہ نہیں کہتا کہ زید اور بکر نے عید منائی ہے کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ وہ ایک نعمت کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کر رہا ہے

قرآن مجید میں اکل حلال اور اجتناب حرام کو نعمت الہی کا شکریہ کہا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

فکلوا مما رزقکم اللہ حلالات طیباً واشکروا نعمت اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون،

(النحل ۱۱۴)۔

تو اللہ کی دی ہوئی روزی حلال پاکیزہ کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اسے پوجتے ہو

(۱۶-۱۱۳ احمد رضا)۔

اس حکم قرآنی کے موافق اگر کوئی انسان محنت مزدوری کر کے حلال روزی کما کر بال بچوں کا پیٹ

پالتا ہے اور انہیں کوئی حرام کا لقمہ نہیں کھلاتا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ ادا کر رہا ہے مگر اسے کوئی بچہ بھی کہنے کو تیار نہیں کہ وہ عید منا رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا یہ نیک عمل نص قرآنی سے تحدیثِ نعمت میں شامل ہے۔ مگر عید سے خارج ہے۔

اس دلیل کے تحت حضرت مفتی صاحب نے جو مجہول اور فضول بحث کی ہے اس کا جواب علمی طور پر گو ہماری اس ساری بحث میں موجود ہے اور ہر وہ شخص جسے قرآن و سنت سے لگاؤ اور تھوڑی سی عقل و خرد رکھتا ہو وہ بھی ان کی حقیقت کو بخوبی جانتا ہے مگر ہم اس کو نیچے، قولہ، اور اقول، کے تحت نقل کر کے جوابات عرض کر رہے ہیں کہیں ان کے معقدین یہ باور نہ کرائیں کہ حضرت حکیم الامت اور مفسر قرآن اور مفتی اعظم صاحب کی یہ باتیں لا جواب ہیں۔

قولہ آج کسی کے فرزند پیدا ہو تو ہر سال تاریخ پیدائش پر سالگرہ کا جشن کرتا ہے، جاء الباطل ص ۲۳۱۔

اقول، مفتی صاحب بھی عجب کمال کے بندے تھے یہ دلیل ان پر قائم کی جا رہی ہے جن کے نزدیک سالگرہ بھی ناجائز و حرام ہے حضرت الامام محمد عبدالرحمن محدث مبارک پوریؒ شارح جامع الترمذی فرماتے ہیں۔

ہماری شریعت محمدیہ میں سالگرہ کرنا پایا نہیں جاتا نہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے زمانہ میں کسی کی سالگرہ کی گئی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور نہ تابعینؒ کے زمانہ میں کی گئی لہذا ممنوع ہے، فرعون مردود سالگرہ کیا کرتا تھا، فرعونی رسم ہے، واللہ اعلم بالصواب کتبہ محمد عبدالرحمن پنجابی، فتاویٰ نذیریہ ص ۱۹۹ ج ۱، و فتاویٰ علماء حدیث ص ۳۴۲ ج ۱۱، (سید محمد نذیر حسین)

قولہ، کسی کو سلطنت ملے تو ہر سال اس تاریخ پر جشن جلوس مناتا ہے تو جس تاریخ کو دنیا میں سب سے بڑی نعمت آئی اس پر خوشی منانا کیوں منع ہوگا؟ جاء الباطل ص ۲۳۲،

اقول، اس کا جواب بھی اوپر آچکا ہے آج بھی ۱۳ اگست کو یوم پاکستان منایا جاتا ہے مگر کوئی بھی اسے دین کا جزو اور حصہ تصور نہیں کرتا نہ ہی نماز روزہ کی طرح عبادت کا درجہ دیکر بغرض ثواب و نجات کرتا ہے، اور اس میں شمولیت اختیار نہ کرنے والے کو منکر عصمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ آج تک کسی بریلوی، عالم و مفتی نے بھی نہیں کہا جبکہ عید میلاد النبی ﷺ کو مبتدعین نماز

روزہ کی طرح عبادت کا درجہ دیکر کرتے ہیں، اور اس عمل حسنہ سے وہ تقرب الہی چاہتے ہیں بلکہ بعض جگہ تو باقاعدہ عید کی طرح نماز بھی ادا کرتے ہیں جیسا کہ قومی اخباروں میں ہر سال کسی نا کسی جگہ کی خبر چھپتی ہے۔ نیز اس کے منکر کو آپ حضرات بے دین تک کہہ دیتے ہیں اور علماء بریلوی نے اس کو اہل سنت کی علامت قرار دے رکھا ہے جبکہ یوم پاکستان منانا اور اسکی تقریب کے انعقاد کو قومی تہوار تو کہا جاتا ہے لیکن اسے عبادت اور ثواب جان کر کوئی بھی نہیں کرتا اور نہ ہی اہل سنت کی علامت ہے اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو برطانیہ وغیرہ دیگر ممالک میں رہنے والے بریلوی مکتب فکر کے عوام (جو یوم پاکستان میں شامل نہیں ہوتی) کو آپ بریلویت سے خارج ہونے کا فتویٰ صادر کریں، دیدہ باید، پھر یوم پاکستان منانا بھی ہمارے ہاں لغو اور بیہودہ عمل ہے جو غیر مسلم اقوام کی اندھی تقلید ہے۔

قولہ، خود قرآن کریم نے حضور علیہ السلام کا میلاد جگہ جگہ ارشاد فرمایا، فرماتا ہے (لقد جاءکم رسول الایۃ) اے مسلمانو تمہارے پاس عظمت والے رسول تشریف لے آئے، اس میں ولادت کا ذکر ہوا، پھر فرمایا، من انفسکم، حضور علیہ السلام کا نسب نامہ بیان ہوا کہ وہ تم میں سے یا تمہاری بہترین جماعت میں سے ہیں، حریص علیکم، سے آخر تک حضور علیہ السلام کی نعت بیان ہوئی آج میلاد شریف میں یہی تین باتیں بیان ہوتی ہیں غرضیکہ بہت سی آیات ہیں جن میں حضور علیہ السلام کی ولادت پاک کا ذکر فرمایا گیا، معلوم ہوا کہ میلاد کا ذکر سنت الہی ہے اب اگر جماعت کی نماز میں امام یہی آیات ولادت پڑھے تو عین نماز میں میرے آقا کا میلاد ہوتا ہے دیکھو امام صاحب کے پیچھے مجمع بھی ہے اور قیام بھی ہو رہا ہے پھر ولادت پاک کا ذکر بھی ہے، جاء الباطل ص ۲۳۲۔

اقول، اول مفتی صاحب کا عید میلاد کو فقط تین باتوں میں ہی مشروط قرار دینا امر واقع اور حقائق کے خلاف ہے، اگر راقم اپنی طرف سے کچھ عرض کرے تو بریلوی علماء کو یقین آنا تو کجا الٹا شیخ بنی مطعون کرنے لگ جائیں گے، اصلاح کی بجائے ناحیہ کو برا بھلا کہنا ان کے فرقے کا امتیازی وصف اور کمال ہے اور اسی ہنر و سلیقہ سے ہی ارباب عقل و خرد پہچان کرتے ہیں خیر بریلویت کے معروف عالم دین مولوی غلام رسول سعیدی شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ فرماتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض شہروں میں عید میلاد کے جلوس کے تقدس کو بالکل پامال کر دیا گیا ہے، جلوس تنگ راستوں سے گزرتا ہے اور مکانوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں سے نوجوان لڑکیاں اور عورتیں شرکاء جلوس پر پھول وغیرہ پھینکتی ہیں اور اوباش نوجوان فحش حرکتیں کرتے ہیں جلوس میں مختلف گاڑیوں پر فلمی گانوں کی ریکارڈنگ ہوتی ہے اور نوجوان لڑکے (بلکہ لڑکیاں) فلمی گانوں کی دھنوں پر ناچتے ہیں اور نماز کے اوقات میں جلوس چلتا رہتا ہے مساجد کے آگے سے گزرتا ہے اور نماز کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا اس قسم کے جلوس میلاد النبی کے تقدس پر بدنماداغ ہیں، اتنی بلفظہ شرح صحیح مسلم ص ۷۰ ج ۳، طبع فرید بک سٹال لاہور سن ۱۴۱۵ھ و ۱۹۹۵ء۔

سعیدی صاحب کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کی مذکورہ بتائی ہوئی باتوں کے علاوہ ان میں بے حیائی و فحاشی جیسی منکرات بھی شامل ہیں اور نماز جیسے اسلامی رکن تک کو ترک کر دیا جاتا ہے۔

ثانیاً، آپ علیہ السلام کی سیرت و کردار اور افعال و اقوال کو بیان کرنا بلا شکر و شبہ باعث نزول رحمت ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ سیرت اور سنت خیر الانام ﷺ کو معلوم کرے اور اس کو اپنی زندگی کیلئے مشعل راہ بنائے، ہر وقت کوئی ایسی گھڑی نہیں جس میں آپ علیہ السلام کی سیرت طیبہ سننا ممنوع ہو، یہ بات محل نزاع سے خارج ہے بلکہ خاص بارہویں ربیع الاول کو عید منانا اور اس میں دیگر لوازمات کا انعقاد کرنا باعث نزاع ہے کیونکہ محفل میلاد و عید میلاد النبی اور چیز ہے جبکہ تذکرہ ولادت باسعادت امر دیگر ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ مفتی صاحب تذکرہ حبیب بلکہ سیرت مصطفیٰ کا نام عید رکھ رہے ہیں حالانکہ ایک انٹری بھی جانتا ہے عید کا معنی ہوتا ہے بار بار آنا مقصد یہ کہ ایک ایسی خوشی جو بار بار آئے اور اسے انسان بطور تہوار و جشن کے منائے جبکہ تذکرہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی یاد آنا یا کسی کو یاد کرنا مثلاً قرآن حکیم میں ہے حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا مجھ سے کسی بات کے متعلق نہ پوچھنا۔

(۱) حتیٰ احدث لك منه ذکرا، (الکھف. ۷۰)

جب تک میں خود اس کا ذکر نہ کروں (احمد رضا)

کیا ان الفاظ قرآنی کا یہ منشا ہے کہ جب تک میں کسی بات پر عید نہ مناؤں تو مجھ سے اس کے متعلق نہ پوچھنا یا یہ مقصد ہے کہ جب تک بات کا تذکرہ نہ کروں تب تک سوال نہ کرنا۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

(۲) اولایذکر الانسان انا خلقنه من قبل ولم یک شیئاً (مریم ۶۷)۔

کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا اور وہ کچھ بھی چیز نہ تھا،

اب اگر کوئی شخص اپنی خلقت پر غور کرتا ہے تو کیا وہ اپنی خلقت کی عید مناتا ہے اور اگر بقول مفتی صاحب اگر پیش امام نماز میں اس کی قرات کرتا ہے تو کیا وہ نماز میں تخلیق بنی آدم کی عید مناتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے آپ علیہ السلام سے کہا۔

(۳) قالو تا الله تفتؤا تذکر یوسف ، (یوسف ۸۵)۔

بولے خدا کی قسم آپ ہمیشہ یوسف کی یاد کرتے رہیں گے (احمد رضا)۔

بقول مفتی صاحب اس آیت کا تو یہی مطلب ہوگا کہ اے ابا حضور آپ قبر میں جانے تک یوسف علیہ السلام کی عید مناتے رہیں گے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شریعت حقہ کا حکم ہے جب لین دین کرو تو معاہدہ ضبط تحریر میں لاؤ اور اس پر دو گواہ مقرر کرو، اگر دو عادل مرد گواہ دستیاب نہ ہو سکیں، تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنا لو، اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

(۴) ان تضیل احدہما فتذکر احدہما الاخری ، البقرہ ۲۸۲)۔

کہ کہیں ان میں ایک عورت بھولے تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے (احمد رضا) اسلام میں یہ حکم ہے کہ سواری پر سوار ہوتے۔

تذکروا نعمۃ ربکم ، الزخرف ۱۳)۔ تم اپنے رب کی نعمت کا تذکرہ

تو کیا گواہی کے وقت ایک عورت کا دوسری کو یاد کروانا، اور سواری پر سوار ہوتے وقت ذکر نعمت سے مراد عید منانا ہے، اور بقول حکیم الامت اگر پیش امام نماز میں ان کی تلاوت کرے تو عین نماز میں سوار ہونے کی اور گواہ کی عید منائی جا رہی ہے، تف ہے ایسی عقل پر اور حیرت ہے ایسے

مفتی پر اور تعجب ہے ایسے مفسر قرآن پر جو آسان سی بات بھی نہ سمجھ سکا۔ ایک اور مقام پر فرعونوں سے ایک مرد مومن نے کہا۔

(۶) فستذکرون ما اقول لکم (المومن ۴۴)۔

تو جلد وہ وقت آتا ہے کہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے یاد کرو گے (احمد رضا)۔
اس آیت کا تو مفتی صاحب کے معتقدین یہی معنی کریں گے کہ جلد ہی میرے کہنے پر تم عید مناؤ گے، اسی طرح عدت میں پیغام نکاح کا بیان فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(۷) علم اللہ انکم ستذکرونہن، (البقرہ ۲۳۵)۔

اللہ جانتا ہے کہ اب تم ان کی یاد کرو گے، (احمد رضا)۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا اور قوم نے توڑنے والے کی جستجو کی تو کہنے والوں نے کہا۔

(۸) فتی یدکرہم یقال لہ ابراہیم، الانبیاء ۶۰۔

ایک جوان کہ ذکر کرتا تھا ان کا کہتے ہیں اس کو ابراہیم (شاہ رفیع الدین)۔
بقول مفتی صاحب اس آیت کا تو یہی معنی ہوگا کہ (نعوذ باللہ من ذلک) ابراہیم علیہ السلام بتوں کی عید منایا کرتے تھے۔

فلسفہ جہاد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو، عبادت خانوں کو گرا دیا جاتا۔

(۹) و مسجد یدکر فیہا اسم اللہ کثیرا۔

اور مسجدیں جن میں اللہ رب العزت کا بکثرت نام لیا جاتا ہے (الحج ۴۰)۔
تو کیا اس کا یہ معنی کریں گے کہ اگر جہاد نہ ہوتا تو مساجد کو بھی گرا دیا جاتا جن میں اللہ رب العزت کی بکثرت عیدیں منائیں جاتیں ہیں، نعوذ باللہ ان بریلوی خرافات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ،
اسی طرح ذبح کا حکم بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

(۱۰) ولانا کلوا مما لم یدکر اسم اللہ۔

اور اسے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو (احمد رضا)۔

تو کیا اس کا یہ معنی ہے کہ جس پر اللہ کے نام کی عید نہ منائی گئی ہو وہ نہ کھانا۔ کیا ان تمام آیات کا یہ مفہوم ہے کہ یاد کا معنی عید منانا ہے کیا اللہ کی بھی عید منائی جاتی ہے اور بتوں کی بھی؟ نہیں یہ مفہوم نہیں بلکہ موصوف کی بدعات کے جواز میں تفسیر پالنے ہے جس کا سلف صالحین سے ذرہ برابر اشارہ نہیں ملتا۔

تلك عشرة كاملة

بلکہ یہ مقامات عشرۃ بتا رہے ہیں کہ ذکر سے مراد عید لینا غلط ہے اور اس غلطی کی وجہ سے مفتی صاحب کو کلمہ طیبہ میں بھی عید میلاد نظر آرہی ہے، تذکرہ حبیب ﷺ کا نام بھی وہ عید رکھ رہے ہیں بلکہ عین نماز میں مناقبت کی آیات کی قرأت کو وہ عید سے تعبیر فرماتے ہیں مگر یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ ذکر آنحضرت ﷺ خاص بارہویں ربیع الاول میں ہی کیوں خاص کر رہا ہوں، افسوس کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جس نے کلمہ پڑھا ہے، وہ ہر دن میں حضور ﷺ کو یاد کرتا ہے کم از کم نماز کی التحیات میں تو وہ علی النبی کہہ کر اور آخر میں درود پڑھ کر آپ ﷺ کی یاد کا اعادہ کرتا ہے مگر کوئی کوڑھ مغز بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ ہر روز عید میلاد مناتا ہے۔

جیسے سادون کے اندھے کو ہر ای ہر آنظر آتا ہے اسی طرح مفتی صاحب کو ہر بات میں عید ہی عید نظر آتی ہے کہ مریم علیہ السلام کا واقعہ بیان فرماتے ہیں اور کہتے ہیں قرآن کریم نے تو انبیاء کا بھی میلاد بیان فرمایا ہے (جاء الباطل ص ۲۳۲)۔

حالانکہ بیان کرنے اور منانے میں بہت سا فرق ہے کہیں قرآن نے انبیاء کا میلاد منانے کا بھی حکم فرمایا ہے تو بیان کیجئے، ورنہ مفتی صاحب کے چیلے گھر میں ہی اپنے مفتی کی ہفوات پر شرمندہ ہو جائیں۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

رب تعالیٰ فرماتا ہے۔

قل بفضل الله و برحمته فبذلك فليفرحوا.

یعنی اللہ کے فضل و رحمت پر خوب خوشیاں مناؤ، معلوم ہوا کہ فضل الہی پر خوشی منانا حکم الہی

ہے اور حضور علیہ السلام رب کا فضل بھی ہیں اور رحمت بھی، لہذا ان کی ولادت پر خوشی منانا اسی آیت پر عمل ہے اور چونکہ یہاں خوشی مطلق ہے (لہذا) ہر جائز خوشی اس میں داخل ہے، جاء الباطل ص (۲۳۳)۔

الجواب

اولاً: فرح کا معنی خوب خوشیاں مناؤ، کرنا مفتی صاحب کی قرآن میں معنوی تحریف ہے کیونکہ فرح کا معنی خوشی منانا نہیں بلکہ فقط خوشی ہے، فیروز الغات اردو ص ۹۲ (اور اس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے کہ جب کسی نعت پر خوش ہو کر اللہ کا شکر یہ ادا کرے، تو اسے عربی میں فرح کہتے ہیں ارشاد ہوتا ہے۔

فرحين بما اتهم الله من فضله، ال عمران ۱۷۰)۔

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا ہے اس پر خوش ہیں۔

مفتی صاحب کے استاذ المکرم مولوی محمد نعیم الدین مراد آبادی فرماتے ہیں فرح کسی پیاری اور محبوب چیز کے پانے سے دل کو جولنت حاصل ہوتی ہے اس کو فرح کہتے ہیں، حاشیہ ترجمہ قرآن بر مولوی احمد رضا خان بریلوی ص ۳۱۱)۔

یہی معنی لغت عرب کی عظیم الشان ڈکشنری، لسان العرب ص ۵۴۱ ج ۲، میں کیا گیا ہے علامہ فیومی فرماتے ہیں، الفرح لذة القلب، یعنی فرح دل کی لذت کو کہا جاتا ہے، المصباح المنیر ص ۴۶۶) ان عبارات سے معلوم ہوا کہ فضل الہی اور رحمت رب تعالیٰ پر مومن کا دل فرحت پاتا ہے اور اس سے کسے انکار ہے اور کون کرتا اور کر سکتا ہے۔

ثانیاً: اب آئیے مذکورہ آیت کا سیاق و سباق بھی ملاحظہ ہوتا کہ ساری حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آجائے، ارشاد ہوتا ہے۔

ياايها الناس قد جاءكم موعظة من ربكم وشفاء لما في الصدور وهدى ورحمة للمؤمنين ☆ قل بفضل الله و برحمته فبذلك فليفرحوا هو خير مما يجمعون (يونس ۵۷، ۵۸)۔

ترجمہ۔ اے لوگو بے شک تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے نصیحت آئی ہے اور اس (

بیاری) کی شفا (آئی ہے) جو سینوں میں ہوتی ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت (آئی ہے) کہو کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے پس چاہیے کہ اسی سے خوش ہوں یہ اس چیز سے بہتر ہے جسے وہ جمع کرتے ہیں، (۱۰-۵۷، ۵۸)، ترجمہ مرزا حیرت دہلوی۔

ان آیات بینات سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ، یہاں خوشی مطلق ہے، جہالت محض ہے، بلکہ اس مقام پر یہ کہا جا رہا ہے اللہ رب العزت کی طرف سے قرآن جیسی نعمت آئی ہے جو جامع فوائد اور مواضع حسنہ پر مشتمل ہے جس میں توحید کی تعلیم ہے جو دل کے عقائد فاسدہ کے لیے شفا ہے اور جو اس پر ایمان لائے اس کے لیے رحمت ہے، پس چاہیے کہ مومن مال و دولت کی بجائے اللہ رب العزت کی طرف سے آنے والی کتاب پر خوش ہوں کہ یہ دنیا کے مال و متاع سے کہیں بہتر ہے ان آیات کا یہی معنی جملہ کتب تفسیر میں لکھا مثلاً ہے ابن جریر، ابن کثیر، فتح القدیر، درمنثور، کشاف، مدارک، خازن، معالم، کبیر، وغیرہ، حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ۔

معنی آیت یہ ہے کہ ساتھ فضل اور رحمت میری کے اتری نصیحت اور شفا، پس اس کے خوش ہوویں کہ وہ بہتر ہے اس سے کہ جمع کرتے ہیں مال و دولت دنیا کی سے کہ زوال پانیوالا اور فنا ہونے والا ہے۔

موضح القرآن ص ۲۰۳، مطبوعہ ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور، بریلویت کے معروف مفسر قرآن اور حضرت مفتی صاحب کے استاذ المکرم جناب مولوی نعیم الدین مراد آبادی صاحب فرماتے ہیں۔

معنی یہ ہے کہ ایمان والوں کو اللہ کے فضل و رحمت پر خوش ہونا چاہیے کہ اس نے انہیں مواظظ اور شفا صدور اور ایمان کے ساتھ دل کی راحت و سکون عطا فرمائے حضرت ابن عباسؓ و حسنؓ و قتادہؓ نے کہا کہ اللہ کے فضل سے اسلام اور اس کی رحمت سے قرآن مراد ہے۔

حاشیہ کنز الایمان ص ۳۱۱ ف ۱۳۹ طبع بمبئی۔

الفاظ قرآنی اور بریلویت کے مفسر قرآن کی اقبال ڈگری سے ثابت ہوا کہ مذکورہ آیت کی فرحت کا تعلق قرآن سے ہے لیکن یہ فرحت کس طرح ہو؟ ظاہر ہے کہ اس کے لیے نہ چراغاں کی، نہ جلسے و جلوسوں کی اور نہ دھمالیں اور بھنگڑا ڈالنے کی اور نہ ڈیک پر انڈین گانے لگا کر ناچنے کی

ضرورت ہے، کیونکہ فرحت کا دل سے تعلق ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

حالت: فرحت کو عید قرار دینا بھی غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین تکمیل نزول قرآن کو، عید قرآن، قرار دیتے اور اس لحاظ سے اسلام میں ایک تیسری عید تکمیل قرآن کی ہوتی مگر وہ لوگ اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لازم و ضروری جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ کامیابی فقط اسی عمل میں ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے یا کرنے کا حکم فرمایا ہے علاوہ ازیں وہ یہ بھی بخوبی جانتے تھے فرحت، سرور کو کہا جاتا ہے، تہوار منانے کا نام فرحت نہیں، اسی معنی میں یہ لفظ قرآن میں مستعمل ہوا ہے غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے دلی خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے فرمایا۔

(۱) فرح المخلفون بمقعدہم .

پیچھے رہ جانے والے اس پر خوش ہوئے، (التوبہ ۸۱)۔

کیا منافقین نے اس پر عید منائی تھی۔

ایک جگہ فرمایا اگر ہم انسان کو نعمت دیکر چھین لیں تو وہ ناشکرا ہوتا ہے اور اگر کسی مصیبت کے بعد نعمت دنیا سے نوازیں تو۔

(۲) انه لفرح فخور .

بے شک وہ خوش ہونے والا بڑائی مارنے والا ہے، (ہود ۱۰)۔

تو کیا اس آیت کی رو سے انسان نعمت ملنے پر عید مناتا ہے۔

(۳) کل حزب بما لدیہم فرحون .

ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اسی پر خوش ہے (الروم ۳۲)۔

تو کیا یہاں بھی فرحت سے عید منانا ہی تسلیم کریں گے؟ جبکہ خود مفتی صاحب اس کی تفسیر میں

فرماتے ہیں ہر فرقہ اپنے جھوٹ کو سچ اور باطل کو حق سمجھ کر خوش ہو رہا ہے، نور العرفان ص ۶۵۰۔

(۴) وانا اذا اذقنا الانسان منا رحمة فرح بها .

اور جب آدمی کو اپنی طرف سے کسی رحمت کا مزہ دیتے ہیں اس پر خوش ہو جاتا ہے (الشوری

(۵) فلما جاءتهم رسلهم بالبينت فرحوا بما عندهم من العلم .

تو جب ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لائے تو وہ اسی پر خوش رہے جو ان کے پاس دنیا کا علم تھا، (المومن ۸۳)۔

(۶) حتی اذا فرحوا بما اوتوا .

یہاں تک جب وہ خوش ہوئے اس پر جو انہیں ملا، (الانعام ۴۴)۔

(۷) و فرحوا بالحیوة الدنیا .

اور کافر دنیا کی زندگی پر اتر آ گئے (الرعد ۲۶)۔

(۸) و جرین بهم بريح طيبة و فرحوا بها .

اور وہ اچھی ہوا سے انہیں لیکر چلیں اور اس پر خوش ہوئے (یونس ۲۲)۔

(۹) ویتو لو اوهم فرحون .

اور خوشیاں مناتے پھر جائیں، (التوبہ ۵۰)۔

(۱۰) ان الله لا يحب الفرحین .

بے شک اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا، (القصص ۷۶)۔

قرآن حکیم کے یہ مقامات عشرۃ جن کا ترجمہ ہم نے مولوی احمد رضا خاں بریلوی کا نقل کیا ہے اگر کسی بریلوی علامہ فہامہ میں جرات ہے تو ان میں، فرحوا، کے لفظ کا معنی عید منانا ثابت کرے، معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کا، فرح، کا معنی عید کرنا اپنی طرف سے اختراع اور من گھڑت ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

مواہب اللدنیہ اور مدارج النبوة وغیرہ میں ذکر ولادت میں ہے کہ شب ولادت میں ملائکہ نے (حضرت) آمنہ خاتون رضی اللہ عنہا کے دروازے پر کھڑے ہو کر صلاۃ سلام عرض کیا، ہاں ازلی راندہ ہوا شیطان رنج و غم میں بھاگا بھاگا پھرا، اس سے معلوم ہوا کہ میلاد سنت ملائکہ بھی ہے

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بوقت پیدائش کھڑا ہونا ملائکہ کا کام ہے، اور بھاگا بھاگا پھرنا شیطان کا فعل، اب لوگوں کو اختیار ہے کہ چاہے تو میلاد پاک کے ذکر کے وقت ملائکہ کے کام پر عمل کریں یا شیطان سمے، جاء الباطل ص ۲۳۳۔

الجواب

اولاً، واقعی امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیدائش کے روز بھاگا بھاگا پھرنا شیطانوں کا بنی کام ہے، خیر سے بریلوی مکتب فکر کے جید مولوی اسی دن ہی جلوس کی قیادت کر کے قریہ بستی بستی بلکہ پورے شہر کا چکر لگاتے ہیں، شاید یہ لوگ اپنے پرانے یار کی اقتدا میں ایسا کرتے ہیں، سنبھل کر رکھو قدم دشت خار میں مجنوں، کہ اس نواح میں سودہ برہنہ پا بھی ہے،

ثانیاً، سند کے اعتبار سے یہ حکایت گو قابل اعتماد نہیں مگر ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں ہم یہ بات کہتے ہیں کہ صلوٰۃ و سلام سے عید میلاد ثابت نہیں ہوتی کیونکہ نص قرآنی سے صلوٰۃ تو عام ایماندار لوگوں پر بھی فرشتے پڑھتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے۔

هو الذی یصلی علیکم و ملائکتہ، (الاحزاب ۴۳)۔

وہی (اللہ تعالیٰ) ہے کہ درود بھیجتا ہے تم پر وہ اور اس کے فرشتے (احمد رضا خاں) اس آیت کی رو سے بریلوی مکتب فکر کے مولوی یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ مومنوں کی اللہ رب العزت اور اس کے ملائکہ عید میلاد مناتے ہیں اگر نہیں یقیناً نہیں تو معلوم ہوا کہ صلوٰۃ و سلام سے مفتی صاحب کا عید میلاد ثابت کرنا غلط ہے،

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،

ان الله و ملائکتہ یصلون علی الصفوف الاول (الحديث)

یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں پہلی صف والے (نمازیوں) پر، مسند امام احمد ص ۲۹۶ ج ۴، و ابوداؤد ص ۹۷ ج ۱، و سنن نسائی ص ۹۳ ج ۱، و ابن خزیمہ ۲۴/۳، و ابن حبان (۲۱۵۸)

یہی حدیث ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، سنن ابوداؤد ص ۹۷ ج

۱، وابن ماجہ ص ۷۲، و بیہقی ص ۱۰۳ ج ۳، صحیح ابن حبان ص ۲۹۷ ج ۴، وغیرہ میں مروی ہے، ان احادیث صحیحہ کی رو سے کیا بریلوی علماء یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ پہلی صف والے نمازیوں کی اللہ رب العزت اور اس کے فرشتے عید میلاد مناتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قرآن کریم کی متعدد آیات سے یہ مسئلہ ثابت ہے کہ نیک بندوں پر اللہ رب العزت اور اس کے فرشتے سلام بھیجتے ہیں، نمونہ از خروارے چند آیات پیش خدمت ہیں۔

(۱) وسلم علی عبادہ الذین اصطفیٰ .

اور سلام اس کے چنے ہوئے بندے پر، (النمل ۵۹)۔

(۲) سلم علیکم بما صبرتم .

سلامتی ہو تم پر تمہارے صبر کا بدلہ (الرعد ۲۴)۔

(۳) تحیتہم فیہا سلم .

اس میں ان کے ملتے وقت کا اکرام سلام ہے، (ابراہیم ۲۳)

اس آیت کے حاشیہ میں مفتی صاحب کے استاذ المکرم فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور فرشتوں کی طرف سے، خزائن القرآن ص ۳۷۴۔

(۴) وقال لهم خزنتها سلم علیکم .

اور اس (جنت) کے داروغہ ان سے کہیں گے سلام تم پر (الزمر ۷۳)۔

(۵) ولقد جاءت رسلنا ابراهیم بالبشری قالوا سلما .

اور بے شک ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس مژدہ لیکر آئے بولے سلام (ہود ۶۹)۔

(۶) سلم علی ابراہیم .

سلام ہو ابراہیم پر (الصفت ۱۰۹)۔

(۷) سلم قولاً من رب رحیم .

ان پر سلام ہوگا مہربان رب کا فرمایا ہوا (یس ۵۸)۔

(۸) سلم علی نوح فی العلمین .

نوح پر سلام ہو جہاں والوں میں (الصفۃ ۷۹)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفتی صاحب کا استاذ المکرم فاضل مراد آبادی لکھتا ہے، یعنی ملائکہ اور جن و انس سب ان پر قیامت تک سلام بھیجا کریں گے، خدائن العرفان ص ۶۵۰۔

(۹) سلم علی موسیٰ و ہرون .

سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر (الصفۃ ۱۲۵)۔

(۱۰) سلم علی ال یاسین .

سلام ہو الیاس پر (الصفۃ ۱۳۰)۔

یہ دس آیات قرآنیہ (جن کا ترجمہ بھی ہم نے بریلویت کے اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خاں کا نقل کیا ہے) جن میں اللہ رب العزت نے پانچ انبیاء کرام کا نام لیکر اور سورۃ النمل میں تمام انبیاء کرام پر اور بقیہ آیات قرآنیہ میں اپنے محبوب برگزیدہ اولیاء کرام پر اپنی طرف سے اور ملائکہ کی جانب سے سلام بھیجنے کی صراحت کی ہے، تو کیا ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے فرشتے تمام انبیاء کرام کی بالخصوص عید میلاد مناتے ہیں؟ پھر اس میلاد میں اللہ رب العزت کے منتخب انبیاء و رسل ہی خاص نہیں بلکہ تمام اہل جنت کی ہر سال عید میلاد منائی جاتی ہے جیسا کہ آیات نمبر ۲، ۳، ۴، ۷ کا مفاد ہے۔

اگر علماء بریلویہ اس من گھڑت تفسیر کو ماننے کے لیے تیار نہیں، تو وہ اور ان کے حکیم الامت اور مفتی اعظم ایسی دلیل خصم کو کیوں حجت باور کراتے ہیں؟ جو خود ان کے ہاں غیر معتبر اور مردود ہے

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

خود حضور ﷺ نے مجمع صحابہ کے سامنے منبر پر کھڑے ہو کر اپنی ولادت پاک اور اپنے اوصاف بیان فرمائے، جس سے معلوم ہوا کہ میلاد سنت رسول اللہ ﷺ بھی ہے چنانچہ مشکوٰۃ جلد دوم باب ۱

فضائل سید المرسلین فصل ثانی میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دن حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، شاید حضور علیہ السلام تک خبر پہنچی تھی کہ بعض لوگ ہمارے نسب پاک میں طعن کرتے ہیں۔

فقام النبی ﷺ علی المنبر فقال من انا ،

پس منبر پر قیام فرما کر پوچھا بتاؤ میں کون ہوں ؟

سب نے عرض کیا آپ رسول اللہ ہیں فرمایا میں محمد ابن عبد اللہ بن عبد المطلب ہوں، اللہ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو ہم کو بہتر مخلوق میں سے کیا، پھر ان کے دو حصے کیے عرب و عجم ہم کو ان میں سے بہتر یعنی عرب میں پیدا کیا، پھر عرب کے چند قبیلے بنائے، ہم کو ان کے بہتر یعنی قریش میں پیدا کیا، پھر قریش کے چند خاندان بنائے ہم کو ان میں سے سب سے بہتر خاندان یعنی بنی ہاشم میں سے کیا، اسی مشکوٰۃ اسی فصل میں ہے کہ ہم خاتم النبیین ہیں اور ہم حضرت ابراہیم کی دعا حضرت عیسیٰ کی بشارت اور اپنی والدہ کا دیدار ہیں جو انہوں نے ہماری ولادت کے وقت دیکھا کہ ان سے ایک نور چمکا جس سے شام کی عمارتیں ان کو نظر آئیں، اس مجمع میں حضور علیہ السلام نے اپنا نسب نامہ اپنی نعت شریف اپنی ولادت پاک کا واقعہ بیان فرمایا یہ ہی میلاد شریف میں ہوتا، ایسی صدہا احادیث پیش کی جاسکتی ہیں، جاء الباطل ص ۲۳۴

الجواب

اولاً: حسب نسب میں طعن کرنے والے کون تھے؟ یقیناً بے ایمان خبیث کافر ہی تھے جیسا کہ ملا علی القاری الحنفی نے، مرقاۃ ص ۵۷ ج ۱۱ میں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے، اشعة اللمعات ص ۴۹۸ ج ۴ میں، حضرت مولانا محمد عبدالرحمن محدث مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی ص ۲۹۳ ج ۴ میں صراحت کی ہے،

اور کفار کے طعن کے جواب میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی عظمت بیان کرنی اور کفار کی بد زبانی کا منہ توڑ جواب دینا ہر مسلمان پر بالعموم اور علماء وقت پر بالخصوص فرض ہے اس میں کسی مسلمان کو نہ کلام ہے نہ ہوسکتا ہے، جب بے نظیر کے دور حکومت میں پیپلز پارٹی نے امریکہ کے دباؤ میں آکر گستاخ رسول کی سزا کو ختم کرنے کی ناپاک سازش کی تو راقم رات بھر چین سے آرام نہ کر سکا

اور سن ۱۹۹۴ء میں شاتم رسول کے واجب القتل ہونے پر آٹھ خطبات جمعہ پڑھائے تھے، اللہ تعالیٰ میرے اس عمل حسنہ کو قبول فرمائے اور میرے لیے اسے ذریعہ نجات اور کفارہ سیات بنائے اور اس عمل سے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی شفاعت سے بہرا مند کرے اور اپنے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کی جنت میں رفاقت نصیب فرمائے، آمین یا الہ العالمین

الغرض کسی سبب اور داعیہ کی وجہ سے عظمت مصطفیٰ بیان کرنا یا بلا تعین دن و ماہ آپ کی سیرت و اخلاق عوام الناس کو بتانا محل نزاع سے خارج ہے

ثانیاً: عظمت و شان اور رفعت مقام کو بیان کرنا منکرین دین اسلام کے اعتراضات کے جوابات دینے کو تہوار منانے سے کیا نسبت؟ ہم روزمرہ کی زندگی میں کہتے ہیں فلاں شخص بڑا سخی ہے فلاں انسان علوم دین میں گہری نظر رکھتا ہے زید اپریل ۱۴ تاریخ کو پیدا ہوا، بکر ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، ان الفاظ سے کوئی کوڑھ مغز بھی یہ نتیجہ نہیں اخذ کرتا کہ فلاں بندے کی سالگرہ منائی جا رہی ہے، مگر رضا خانی مولویوں کا طرز استدلال ہی نرالا ہے کہ وہ عظمت بیان کرنے کو سالگرہ اور تہوار کا نام دے رہے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثالثاً، ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا ہے مردود شیطان رشدی نے امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات مقدسہ و طاہرہ پر یکچڑ اچھالا تھا، جس سے پورے عالم اسلام میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی، ہر مسلمان کلمہ گو نے اس پر زبردست احتجاج کیا عالم اسلام کے اس اضطراب کو کوئی صاحب دماغ عید میلاد کہنے کی جسارت نہیں کر سکا، ہاں اگر بریلوی مولوی اس کا نام عید رکھ لیں تو بات الگ ہے، کیونکہ حقائق کے خلاف چلنا ان کا دین و ایمان ہے مگر جس کے دل میں محبت رسول ہے وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ شاتم رسول کے اعتراضات کے جوابات کو (خوشی) سے تعبیر کرے یہ فقط گجرات کے بقلم خود مفتی اعظم اور حکیم الامت کا ہی خیال فاسد ہے جو غالباً محبت رسول ﷺ کی چاشنی سے ویسے ہی بے بہرا تھا۔

ورنہ وہ اس حدیث سے میلاد کے جواز پر استدلال نہ کرتے اور ان کے غلط استدلال کے سامنے ان کی ایمانی رفق رکاوٹ بن جاتی۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

صحابہ کرام ایک دوسرے کے پاس جا کر فرمائش کرتے تھے کہ ہم کو حضور علیہ السلام کی نعت شریف سناؤ معلوم ہوا کہ میلاد سنت صحابہ بھی ہے چنانچہ مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین فصل اول میں ہے کہ حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ میں عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور عرض کیا کہ مجھے حضور علیہ السلام کی وہ نعت سناؤ جو کہ توریت شریف میں ہے انہوں نے پڑھ کر سنائی اسی طرح حضرت کعب احبار فرماتے ہیں ہم حضور علیہ السلام کی نعت پاک توریت میں یوں پاتے ہیں، محمد اللہ کے رسول ہیں میرے پسندیدہ بندے ہیں نہ کج خلق نہ سخت طبیعت ان کی ولادت مکہ مکرمہ میں اور ان کی ہجرت طیبہ میں ان کا ملک شام میں ہوگا ان کی امت خدا کی بہت حمد کرے گی کہ رنج و خوشی ہر حال میں خدا کی حمد بیان کرے گی۔

(مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین) جاء الباطل ص ۲۳۴۔

الجواب

اولاً: حدیث میں لفظ، خبری، ہے، مشکوٰۃ ص ۵۱۲۔

جو کہ خبر (ج اخبار) سے مشتق ہے اور یہ معروف لفظ ہے، ایسا واقعہ جس کا انسان کو علم نہ ہو اور کسی دوسرے ذریعے سے اسے اطلاع ہو وہ خبر ہے، قرآن میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بیوی محترمہ سے کہا۔

قال لاهله امکنوا انی انست ناراً لعلی اتيکم منها بخبر، (القصص ۲۹)

اپنی گھر والی سے کہا تم ٹھہرو مجھے طور کی طرف سے ایک آگ نظر پڑی ہے شاید میں وہاں سے کچھ خبر لاؤں (احمد رضا)۔

مگر مفتی صاحب اس کے برعکس خبر کا معنی نعت کرتے ہیں، شکر ہے کہیں مفتی اعظم نے اس کا معنی پیری کا درخت کر کے، لسان العرب ص ۲۲۸ ج ۴، اور تاج العروس ص ۱۶۷ ج ۴، وغیرہ کا حوالہ نہیں دے دیا، اگر ایسا کرتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

ثانیاً: امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت طیبہ آپ کے اخلاق و کردار کو معلوم کرنے

اور پوچھنے سے عید میلاد کو کیا نسبت ہے؟ ہر روز علماء سے عوام نبی کریم ﷺ کے حالات زندگی دریافت کرتے ہیں مگر کوئی اناڑی بھی اسے تہوار کا نام نہیں دیتا، نا جانے مفتی صاحب کس کیفیت میں کتاب کو تحریر کرتے رہے کہ دعویٰ اور دلیل میں ذرا سی بھی مناسبت موجود نہیں۔

ہم مبتدعین کے علماء سے ناصحانہ گزارش کرتے ہیں کہ آخر دنیا سے ہر انسان کو کوچ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے اس لیے اپنے اعمال کی اصلاح کیجئے اور اس طرح کے غیر متعلقہ دلائل سے بدعات کے جواز پر استدلال کر کے اپنی آخرت برباد نہ کیجئے کہ شریعت انسان کے گھر کی نہیں بلکہ اس کا بنانے والا اللہ تعالیٰ اور اس کی تشریح و توضیح کرنے والا انبیاء کرام علیہم السلام کا مقدس گروہ تھا آپ حضرات اس کو اپنے ہاتھ میں لیکر شریعت سازی کرتے ہیں جو کہ آپ کو قطعاً زیبا نہیں اور یہ عمل اخروی زندگی میں مہنگا پڑے گا، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو سمجھ کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا الہ العالمین۔

ثالثاً، اگر حدیث میں یہ ہوتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاص ربیع الاول کی بارہویں تاریخ کو اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے نعت سنتے اور اس سننے سے ان کا مقصد عید میلاد ہوتا تو ہم اس کو قبول کرتے اور، علیکم بسنتی، کے تحت اس کو سنت جانتے مگر حدیث میں کوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں، حالانکہ ان کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا انکار نہیں کیا جاسکتا

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

یہ تو مقبول بندوں کا ذکر تھا، کفار نے بھی ولادت پاک کی خوشی منائی، تو کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہی کر لیا، چنانچہ بخاری جلد دوم کتاب النکاح۔

باب واماہاتکم التی ارضعنکم و ما یحرم من الرضاعة، میں ہے۔

جب ابو لہب مر گیا تو اس کو اس کے گھر والوں نے خواب میں برے حال میں دیکھا، پوچھا کیا گزری؟ ابو لہب بولا کہ اس کلمے کی انگلی سے پانی ملتا ہے، کیونکہ میں نے ثوبیہ لونڈی کو آزاد کیا تھا۔

بات یہ تھی کہ ابو لہب حضرت عبداللہ کا بھائی تھا اس کی لونڈی ثوبیہ نے آکر اس کو خبر دی کہ

آج تیرے بھائی کے گھر فرزند پیدا ہوا ہے اس نے اس خوشی میں اس لونڈی کو انگلی کے اشارے سے کہا جا تو آزاد، یہ سخت کافر تھا جس کی برائی قرآن میں آرہی ہے مگر اس خوشی کی برکت سے اللہ نے اس پر یہ کرم کیا کہ جب دوزخ میں پیسا ہوتا ہے تو اپنی انگلی کو چوستا ہے، پیاس بجھ جاتی ہے حالانکہ وہ کافر تھا، جانا لباطل ص ۲۳۵۔

الجواب

اولاً: سند کے اعتبار سے یہ روایت گو کمزور ہے مگر ہم اسے نظر انداز کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ شریعت حقہ کا کوئی حکم کسی (سوائے نبی کے) شخص کی خواب سے ثابت نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً: خود صاحب خواب (یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ) کو خواب اس وقت آیا جب وہ مسلمان نہ تھے اور انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس خواب کو دلیل بنا کر عید میلاد نہ منائی اور نہ جلوس و چراغاں کا اہتمام کیا، کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ابولہب نے لونڈی کو آزاد رشتے داری کی وجہ سے کیا، نہ کہ نبی و رسول کی ولادت جان کر خوشی کی تھی اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ابولہب کے عمل کی نبی کریم ﷺ نے تحسین نہیں کی۔

ثالثاً: یہ خواب نص قرآنی کے مخالف ہے کیونکہ قرآن مجید نے صاف کہہ رکھا ہے کہ دوزخیوں کو ایسا کھانا ملے گا جس سے بھوک اور پیاس ختم نہ ہوگی۔

لایسمن ولا یغنی من جوع،

کہ نہ فرہی لائیں اور نہ بھوک میں کام دیں (الغاشیہ، ۷)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفتی صاحب کا استاذ المکرم فاضل مراد آبادی لکھتا ہے یعنی ان سے غذا کا نفع حاصل نہ ہوگا کیونکہ غذا کے دو ہی فائدے ہیں ایک یہ کہ بھوک کی تکلیف رفع کرے دوسرے یہ کہ بدن کو فرہ کرے یہ دونوں وصف جہنمیوں کے کھانے میں نہیں بلکہ وہ شدید عذاب ہے، ف ۶ ص ۸۶۳۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

لایدو قون فیہا بردا ولا شرابا، (النبا، ۲۴)۔

اس میں کسی طرح کی ٹھنڈک کا مزہ نہ پائیں گے اور نہ کچھ پینے کو (احمد رضا)۔

ان آیات بینات سے ثابت ہوا کہ کفار کو دوزخ میں کھانے کو ایسی چیزیں ملیں گی جن سے ان کی بھوک دور نہ ہوگی اور وہ دوزخ میں کبھی بھی کوئی ٹھنڈک نہ پائیں گے، ان واضح نصوص کو بریلوی مکتب فکر کے علماء ایک خواب سے رد کرنے کی کوشش میں ہیں کہ ابولہب کو انگلی چوسنے سے ٹھنڈک مل جاتی ہے، حالانکہ ان کے نزدیک صحیح حدیث جو کہ خبر واحد ہو اس سے بھی نص کی تخصیص نہیں کی جاسکتی، مگر یہاں خود غرضی دیکھئے کہ خواب کی بنا پر قرآنی آیات کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔

رابعاً: اگر بالفرض یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ابولہب نے لونڈی کو آزادی نیکی جان کر کیا تھا (حالانکہ اس نے فقط رشتے داری کے ناطے سے لونڈی آزاد کی تھی) اور اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے حضور مقبول بھی ہوا تو تب بھی یہ خواب مخالف قرآن ہونے کی وجہ سے مردود ہے کیونکہ قرآن نے یہ بات واضح سے واضح تر بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع اختیار نہ کی اور آپ علیہ السلام کی مخالفت کی ان کے اعمال ضائع گئے، ارشاد ہوتا ہے،

ان الذین کفروا و صدوا عن سبیل اللہ و شاقوا الرسول من بعد ما تبیین لهم
الہدیٰ لن یضروا اللہ شیئاً و سیحبط اعمالہم (محمد ۳۲)۔

جن لوگوں کو سیدھا راستہ معلوم ہو گیا (اور) پھر بھی انہوں نے کفر کیا اور (لوگوں) کو خدا کی راہ سے روکا اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سب کا کیا کرایا اکارت کر دے گا، ۴۷-۳۲۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ابولہب کا لونڈی آزاد کرنے کا عمل ضائع ہو گیا، مگر خواب سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عمل کی وجہ سے اسے جہنم میں سکون ملتا ہے یہ خواب چونکہ نص قرآنی کے مخالف ہے لہذا اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

خامساً: ابولہب شاتم رسول تھا جیسا کہ سورۃ لہب کے شان نزول سے ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدسہ کی شان میں ادنیٰ سے ادنیٰ گستاخی بھی ایک مسلمان و مومن کے اعمال کو برباد کر دیتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

یا یہا الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجہروا لہ بالقول

کجہر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون۔ (الحجرات، ۲)۔
ترجمہ۔ اے اہل ایمان اپنی آوازیں نبی کریم ﷺ کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو اس طرح ان کے رو برو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو، (۲۳۹)۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلمان بھی اگر نبی ﷺ کے سامنے اونچی آواز سے بولتا، تو اس کے اعمال ضائع ہو جاتے، اور جو شخص کافر ہو اور علی الاعلان وہ جناب رسالت مآب ﷺ کی توہین کرتا ہو اس کا عمل کیوں ضائع نہ ہوگا؟ خود مفتی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے،
جب ان کی بارگاہ میں اونچی آواز سے بولنے پر نیکیاں برباد ہیں تو دوسری بے ادبی کا ذکر ہی کیا، نور العرفان ص ۸۲۲،

اس آیت نے تمام عقدے ہی حل کر دیئے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا خواب امر واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ ابولہب کے شاتم رسول ہونے کی وجہ سے تمام نیکیاں اکارت گئیں الغرض اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ لونڈی کو آزاد کرنا ابولہب کی نیکی تھی تو نص قرآنی سے اس کی یہ نیکی تباہ و برباد ہو گئی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا خواب چونکہ نص قرآنی کے مخالف ہے لہذا اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور اس کو دلیل بنا کر عید میلاد النبی کا ثبوت نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یقین کو شک زائل نہیں کر سکتا۔

باب مجلس میلاد میں کھڑے ہونے کی شرعی حیثیت

محفل میلاد میں قیام کرنا دو باتوں پر مشتمل ہے

(۱) آپ علیہ السلام کے تذکرہ اور ذکر ولادت پر کھڑا ہونا واجب ہے کیونکہ یہ آپ کی تعظیم

میں شامل ہے،

(۲) چونکہ آنحضرت ﷺ خود تشریف لاتے ہیں اور جناب رسالت مآب کی تشریف آوری پر

کھڑا ہونا مسنون ہے؛

پہلی بات پر تبصرہ

ذکر ولادت پر کھڑے ہونے کی قرآن و سنت اور آثار صحابہ کرام میں اصل نہیں پائی جاتی اور خیر القرون میں اس کا وجود نہ تھا اس کی ایجاد بھی عید میلاد کے ساتھ ہوئی پھر آہستہ آہستہ اس کو فرض و واجب قرار دیا جانے لگا، چنانچہ معروف بریلوی مکتب فکر کا مولوی عبدالسمیع، محمد حسی مشق سابعہ سے نقل کرتا ہے۔

يجب القيام عند ذكر ولادة ﷺ (انوار ساطعه ص ۲۶۷)۔

آنحضرت ﷺ کی ولادت کے ذکر کے وقت کھڑا ہونا واجب ہے۔

اسی طرح رضا خانی مجموعہ فتاویٰ یعنی غایۃ المرام ص ۵۵، ۵۶، ۶۷، ۷۱، میں لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر محفل میلاد میں تشریف لاتے ہیں تعظیم کے واسطے کھڑا ہونا فرض ہے قیام نہ کرنے والا کافر ہے، بحوالہ راہ سنت ص ۱۴۹۔

جبکہ قیام میلاد پر صحابہ کرام کا عمل نہ تھا بلکہ ادلہ شرعیہ سے اس کا قطعاً کوئی وجود ہی نہیں ملتا مولانا عبدالحی حنفی (جو کہ میلاد کے جواز کے قائل اور علماء بریلوی کے نزدیک معتمد ہیں) فرماتے ہیں۔

بیان ولادت نبویہ ﷺ کے وقت جو قیام کیا جاتا ہے اس کی شرعاً کوئی معتمد بہ اصل نہیں ہے، مجموعہ فتاویٰ عبدالحی ص ۲۵۸ ج ۳۔

اس کے بے اصل ہونے کے علاوہ شریعت مطہرہ میں تذکرہ حبیب کبریہ ﷺ کے وقت درود و سلام پڑھنا سنت خیر الانام ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔

قال رسول الله ﷺ رغم انف رجل ذكر ت عنده فلم يصل على،

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کی ناک خاک آلودہ ہو جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا تو اس نے مجھ پر درود شریف نہ پڑھا،

الحديث مسند احمد ص ۲۵۴ ج ۲ رقم ۷۴۰۲، وترمذی مع تحفة ص ۲۷۱ ج ۲، و مستدرک حاکم ص

۵۴۹ ج ۱،

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نبی ﷺ کے ذکر کے وقت درود شریف پڑھنا سنت مصطفیٰ ﷺ ہے اسکے برعکس جو شخص ذکر رسالت مآب کے وقت قیام کرتا ہے وہ تعظیم النبی (ﷺ) کے لئے درود کو ناکافی جانتا ہے جہی تو وہ قیام کو لازم و ضروری جان کر کھڑا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی بدعت ہے جو سنت (درود پڑھنے) کو مٹانے کی ناپاک سعی ہے۔

دوسری بات کا جواب

اولاً، ذکروادات کے وقت امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا محفل میلاد میں آنا کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں، ہماری طرف سے پوری دنیا کے مبتدعین علماء بریلوی کو کھلا چیلنج ہے وہ کوئی ایسی آیت یا صحیح حدیث ہو (جس میں تاویل اور تحریف معنوی کو دخل نہ ہو) پیش کریں جس میں صراحت ہو کہ میں محفل میلاد میں ذکروادات پر تشریف لاتا ہوں یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اکٹھے ہو کر سرتوڑ کوشش کرنے کے باوجود ایسی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے،

یہی وجہ ہے کہ اکابرین امت نے ذکروادات کے وقت قیام کو بدعت قرار دیا ہے چنانچہ قاضی شہاب الدین (التوفی ۸۴۰) دولت آبادی فرماتے ہیں ۔

وما یفعله الجہال علی راس کل حول فی شہر الربیع الاول لیس بشئی و یقومون عند ذکر مولدہ ﷺ و یزعمون ان روحہ ﷺ یجئ فرعہم باطل بل هذا الا اعتقاد شرک وقد منع الائمة الاربعة مثل هذا .

اور جو کچھ جاہل لوگ ربیع الاول کے مہینہ میں کرتے ہیں (یہ تمام) بے اصل ہے اور کھڑے ہوتے ہیں آپ ﷺ کی ولادت کے بیان پر اور یہ گمان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی روح آتی ہے تو یہ ان کا عقیدہ باطل اور شرکیہ ہے اور آئمہ اربعہ نے ان جیسے عقائد (اختیار) کرنے سے منع فرمایا

ہے۔ فتاویٰ نذیریہ ص ۲۱۵ ج ۱

تحفة القضاء ص بحوالہ ساطعہ ص ۲۴۱۔

قاضی نصیر الدین فرماتے ہیں کہ

وقد احدث بعض جهال المشائخ امورا كثيرة لانجد لها اثرا في كتاب ولا في سنة منها القيام عند ذكر ولادة سيد الانام عليه التحية والسلام۔
آج کل جاہل صوفیوں نے بہت سی باتیں ایجاد کر لی ہیں جن کا کتاب و سنت میں کوئی نام و نشان نہیں پایا جاتا ان میں سے ایک (یہ بھی ہے) کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت کھڑے ہونا،

طريقة السلف ص بحوالہ فتاویٰ نذیریہ ۲۱۵-۱۴

صاحب سیرت شامی فرماتے ہیں

جرت عادة كثير من المحبين اذا سمعوا بذكر وضعه ﷺ ان يقوموا
تعظيماله ﷺ وهذا القيام بدعة لا اصل لها،
آج بہت سے مہمان کی عادت ہو چکی ہے کہ جب آپ ﷺ کی ولادت کا ذکر سنتے ہیں تو آپ علیہ السلام کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ کھڑا ہونا بدعت ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے، سیرت شامی بحوالہ انوار ساطعہ ص ۲۳۸، وکذا فی فتاویٰ نذیریہ ص ۲۱۵ ج ۱۔
مولانا عبدالحی مرحوم لکھنوی فرماتے ہیں۔ قیام میلاد بدعت ہے،
مجموعۃ الفتاویٰ ص ۲۵۸ ج ۳، مفہوما۔

آنحضرت ﷺ اپنے لیے قیام کو ناپسند کرتے تھے

ان تمام ابحاث کو ایک طرف رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی آمد پر قیام کو پسند کرتے تھے یا کہ مکروہ و ناجائز جانتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ان تمام پیچیدگیوں کو حل کر دیتی ہے آپ فرماتے ہیں۔

لم يكن شخص احب اليهم من رسول الله ﷺ وكانوا اذا رأوه لم يقوموا لما يعلمون من كراهيه لذلك .

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اور کوئی شخص محبوب نہ تھا لیکن جب وہ آپ علیہ السلام کو (آتے) دیکھتے تھے تو قیام نہ کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ علیہ السلام (قیام کو) مکروہ جانتے ہیں، ترمذی مع تحفہ ص ۷۷ ج ۴، مسند احمد ص ۱۳۲ و ۱۳۴ ج ۳، رقم ۱۱۹۳۶ و ۱۱۹۶۲) و ادب المفرد للبخاری ص ۲۴۴، مسند ابویعلیٰ ص ۴۸ ج ۴، رقم ۳۷۷۲۔ یہ حدیث اپنے معنی و مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ قیام تعظیمی کو مکروہ جانتے تھے، اتباع رسول کا تقاضا یہ ہے کہ جب آپ علیہ السلام تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کو مکروہ جانتے تھے تو ہم صحابہ کرام کی پیروی کرتے ہوئے ذکر ولادت کے وقت قیام نہ کریں۔

مسئلہ

انسان کی حالت دو طرح کی ہوتی ہے فاضل یا مفضول، اگر کسی کا تعلق پہلے گروہ سے ہے تو وہ اتباع رسول ﷺ کی پیروی میں اپنے لیے قیام کو ناپسند کرے اور اگر اس کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے تو وہ صحابہ کرام کی پیروی میں کسی کے لیے قیام نہ کرے

مفتی صاحب کا اعتراض

ان احادیث میں مطلق قیام سے منع نہیں فرمایا گیا ورنہ ہم نے جو احادیث اور اقوال فقہاء نقل کیے اس کے خلاف ہوگا بلکہ حسب ذیل امور سے ممانعت ہے اپنے لئے قیام چاہنا لوگوں کا دست بستہ سامنے کھڑا رہنا اور پیشوا کا درمیان میں بیٹھا رہنا، اشعة الممعات، میں ہے قیام تعظیمی کرنا اور نہ کرنا زمانہ اور حالات اور اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح صحابہ کرام نے کبھی تو حضور کے لئے قیام کیا اور کبھی نہیں۔

آپ کا قیام سے کراہت فرمانا تواضعاً و انکساراً تھا لہذا اس میں ہمیشہ کھڑے ہونے کی نفی ہے، جاء الباطل ص ۲۵۹۔

الجواب

اولاً، آپ کی پیش کردہ روایات کا جواب آگے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آرہا ہے کہ وہ اپنے معنی و مفہوم میں بریلوی مکتب فکر کی قطعاً دلیل نہیں علاوہ ازیں ان میں سے بعض ضعیف بھی ہیں، رہا احوال فقہاء تو وہ چونکہ صحیح صریح احادیث کے مخالف ہیں لہذا مردود ہیں، اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں،

حانیہ: مفتی صاحب کا اشعة اللمعات سے نقل کرنا کہ صحابہ کرام بھی آپ علیہ السلام کے لیے قیام کرتے تھے الخ دلیل کا محتاج ہے یقین جانے پوری دنیا کے مبتدعین اگر اکٹھے ہو کر سر توڑ کوشش کریں تو پھر بھی یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کر سکتے کہ کبھی کبھار صحابہ کرام نبی کریم علیہ السلام کے لیے تعظیماً کھڑے ہوتے تھے۔

ثالثاً، اسے مفتی صاحب کا تواضع و انکسار پر محمول کرنا بھی فضول ہے کیونکہ مسند احمد میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے فرمان نبوی موجود ہے۔

فقال رسول الله ﷺ لا يقيم لى، انما يقيم لله تبارك و تعالى .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے لئے قیام نہ کیا کریں کیونکہ قیام فقط اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہے، الحدیث مسند احمد ص ۳۱۷ ج ۵۔

اس حدیث نے تو تمام الجھنیں صاف کر دیں کہ قیام تعظیماً فقط اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے، مگر افسوس مفتی صاحب اسے تواضع پر محمول کر رہے ہیں، اور بزعم خود ہوائی فائرنگ سے اس مضبوط و مستحکم دلیل کو توڑنے کی سعی لا حاصل کر رہے ہیں،

اب جی کیا نبی کریم ﷺ کی تواضع و انکساری قابل اتباع اور نمونہ نہیں؟ جو آپ خصم کو حجت باور کر رہے ہیں، حکیم الامت صاحب نبی کا ہر قول و فعل اسوہ حسنہ (مگر جس کی شریعت نے تخصیص کر دی ہو) ہے لیکن یہ عقل و خرد کی باتیں مفتی صاحب کی بلا جانے، حقیقت یہ ہے کہ بدعت ایک ایسی منحوس اور خبیث چیز ہے جو انسان کو فہم و شعور سے خالی کر کے خطی بنا دیتی ہے۔

آخر اللہ تعالیٰ کے نبی (ﷺ) نے کہا ہے بدعتی پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، بخاری ص ۲۵۱ ج ۱، و مسلم ص ۴۴۱ ج ۱۔

ذکر ولادت کے وقت قیام کرنے پر مفتی صاحب کے دلائل اور ان کے جوابات

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ مشکوٰۃ کتاب الجہاد باب حکم الاسرا اور باب القیام میں ہے کہ جب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تو حضور علیہ السلام نے انصار کو حکم دیا، قوموا الی سیدکم، اپنے سردار کے لیے کھڑے ہو جاؤ، یہ قیام تعظیمی تھا۔ جاء الباطل ص ۲۴۹۔

الجواب

اولاً: مفتی صاحب نے ترجمہ حدیث غلط کیا ہے درست یہ ہے کہ اپنے سردار کی طرف کھڑے ہو، شرح صحیح مسلم ص ۲۸۳ ج ۵۔ مؤلفہ مولوی غلام رسول سعیدی طبع ربیع الثانی سن ۱۴۱۵ھ اس بے ایمانی کا پس منظر یہ ہے کہ محدثین کرام نے یہ کہا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے تو ان کو اتارنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا، یہی وجہ ہے کہ، قوموا الی سیدکم، (اپنے سردار کی طرف اٹھو) فرمایا قوموا الی سیدکم، (اپنے سردار کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاؤ) نہیں فرمایا، دیکھئے مرقاۃ ص ۸۳ ج ۹،

اس معنی کی تائید مسند احمد کی حسب ذیل روایت سے ہوتی ہے، قوموا الی سیدکم فاندلوہ، یعنی اپنے سردار کی طرف اٹھو اور اسے گدھے سے اتارو، الحدیث مسند امام احمد ص ۱۴۲ ج ۶۔ اس حدیث میں قیام کی وجہ تعظیم نہیں بلکہ سواری سے اتارنا بتائی گئی ہے ظاہر ہے کہ زیر بحث مسئلہ سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب اس سے استدلال کرتے ہیں اور پھر لطف کی بات تو یہ ہے کہ معنوی تحریف کرتے ہوئے بھی ان کا ضمیر انہیں ملامت نہیں کرتا، ہیں بزعم خویش ماشاء اللہ حکیم الامت اور مفسر قرآن۔

ثانیاً، مبتدعین کا موقف ہے کہ ذکر ولادت کے وقت آنحضرت ﷺ تشریف لاتے ہیں چنانچہ بریلوی مکتب فکر کا باوا آدم مولوی احمد رضا خان لکھتا ہے، تشریف آوری حضور کے اختیار میں ہے اور قیام تعظیمی ذکر قدوم (تشریف لانا، فیروز اللغات ص ۹۵۲، ابو صہیب) شریف کے لیے ہے،

فتاویٰ رضویہ ص ۱۳۷ ج ۶،

مفتی صاحب کا حق تھا پہلے دلائل صحیحہ سے محفل میں آنا ثابت کرتے اور بعدہ قیام تعظیمی کے لیے ثبوت دیتے، لیکن مفتی صاحب نے نہ تو آنے پر کوئی دلیل قائم کی ہے اور نہ ہی قیام تعظیمی کے لئے روایت نقل کی ہے

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

فرماتے ہیں کہ مشکوٰۃ باب القیام میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہے

فاذا قام قمنا قیاما حتیٰ نراہ قد دخل بعض بیوت ازواجہ ،

جب حضور علیہ السلام مجلس سے اٹھتے تو ہم بھی کھڑے ہو جاتے تھے

یہاں تک کہ ہم دیکھ لیتے تھے کہ آپ اپنی کس بیوی پاک کے گھر میں داخل ہو گئے ، جاء

الباطل ص ۲۴۹۔

الجواب

غالباً مفتی صاحب نے کبھی مجلس برخاست ہوتی نہ دیکھی تھی، جنہی تو اس حدیث سے قیام تعظیمی پر استدلال فرما رہے ہیں، اے جی جب مجلس برخاست ہو جائے تو سب ہی اٹھ جاتے ہیں، اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں۔

ای لا نفضاض المجلس لا للتعظیم لانہم ماکانوا یقومون له مقبلا فکیف یقومون له مدبرا۔

یعنی صحابہ کرام مجلس برخاست ہونے کے لیے کھڑے ہوتے تھے، تاکہ تعظیم کے لیے کیونکہ صحابہ کرام استقبال کے لیے کھڑے نہ ہوتے تھے تو (گھر کو) لوٹتے وقت کیسے کھڑے ہوتے ہوں گے، مرتقاۃ ص ۸۶ ج ۹۔

یہی مولوی قطب الدین حنفی مرحوم نے ترجمہ مشکوٰۃ مظاہر حق ص ۶۷ ج ۴ میں کہا ہے۔

قارئین کرام مبتدعین کا دعویٰ تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی تشریف آوری کے لیے محفل میلاد میں قیام کیا جاتا ہے، کما مر، لیکن دلیل مجلس برخاست کے قیام کی دی جا رہی ہے، جو چاہے حسن کرشمہ ساز کرے۔

تنبیہ

صاحب مشکوٰۃ نے مذکورہ حدیث کو بلاحوالہ نقل کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اسے سنن ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے، فتح الباری ص ۴۴ ج ۱۱، راقم الحروف کے سامنے ابوداؤد کے تین نسخے ہیں (۱) عون المعبود (۲) مولانا فخر الحسن صاحب کا (۳) مولانا محمود حسن خان صاحب کا، لیکن راقم کو ان تینوں سے یہ روایت نہیں مل سکی، ہاں البتہ علامہ ہیشمی نے اسے، مسند بزار، سے نقل کر کے صراحت کی ہے کہ یہ مرسل ہے،

کیونکہ محمد بن حلال اپنے والد حلال بن ابی حلال سے بیان کرتا ہے اور یہ تابعی ہے، مجمع الزوائد ص ۴۳ ج ۸، علاوہ ازیں حلال مجہول راوی ہے جیسا کہ علامہ ڈھمی نے صراحت کی ہے، میزان الاعتدال ص ۳۱۷ ج ۴، الغرض یہ روایت ارسال اور جہالت راوی کی وجہ سے ضعیف ہے لہذا مفتی صاحب کا استدلال ہی باطل ہے کیونکہ ضعیف روایت حجت نہیں ہوتی۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عین نماز پڑھاتے ہوئے جب حضور علیہ السلام کو تشریف لاتے دیکھا تو مقتدی بن گئے، اور بیچ نماز میں حضور علیہ السلام امام ہوئے، مشکوٰۃ باب مرض النبی، معلوم ہوا کہ بزرگان دین کی تعظیم عبادت کی حالت میں بھی کی جائے، جاء الباطل ص ۲۵۰۔

الجواب

اولاً: مفتی صاحب نے محض سن کر اس روایت کو درج کیا ہے مراجعت کا تکلف نہیں کیا، کیونکہ مشکوٰۃ میں، مرض النبی، کا کوئی باب نہیں بلکہ، وفات النبی، کا ہے، دیکھئے ص ۵۴۶، لیکن قصہ امامت ابی بکر رضی اللہ عنہ کی روایت اس میں نہیں بلکہ، باب ماعلی الماموم، میں یہ روایت ہے، دیکھئے مشکوٰۃ ص ۱۰۱۔

خیر مفتی صاحب کی شخصیت بالکل اس ضرب المثل کی طرح تھی۔

اونچی دوکان پھیکا پکوان۔

ثانیاً: روایات کا اس میں خاصہ اختلاف ہے کہ نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امام رہے یا مقتدی بن گئے لیکن حق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آمد پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکبر تھے اور رسول اللہ ﷺ امام، تفصیل کے لیے دیکھئے

‘مرعاة المفاتیح ص ۹۵ ج ۴، چونکہ مفتی صاحب کو اس حقیقت کا اعتراف ہے اس لیے یہاں دلائل کی ضرورت نہیں، قارئین کرام جب آپ نے اس حقیقت کو بخوبی جان لیا تو اب بریلوی مکتب فکر کے مجدد ملت اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خاں کا بھی ایک واقعہ سن لیجئے، کہتا ہے۔

مولوی برکات احمد کے انتقال کے بعد مولوی سید امیر احمد خواب میں زیارت حضور ﷺ سے مشرف ہوئے کہ گھوڑے پر تشریف لے جاتے ہیں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کہاں تشریف لے جاتے ہیں، فرمایا برکات احمد۔

کے جنازہ کی نماز پڑھنے، الحمد للہ یہ جنازہ مبارکہ میں نے پڑھایا۔

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، واللہ ذو الفضل العظیم۔

ملفوظات احمد رضا خاں بریلوی ص ۲۷ ج ۲۔

مولوی احمد رضا خاں کی اس بات سے واضح ہوا کہ اس کی اقتدا میں آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھی، اب بتائیے کہ اس نے ایک غیر فرضی نماز میں رسول اللہ ﷺ کا ادب کیوں نہ کیا؟ اور وہ گستاخی رسول کا مرتکب کیوں ہوا؟ اس نے امامت آنحضرت ﷺ کو کیوں تفویض نہ کی اور مقتدی بن کر نماز جنازہ کیوں نہ پڑھا؟

حالت: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو آنحضرت کی تشریف آوری کے وقت حالت قیام میں تھے جس کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے آنے کا احساس کیا تو پیچھے لوٹنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم مکاتک، اپنی جگہ کھڑا رہ، صحیح مسلم ص ۱۷۹ ج ۱، اس فرمان سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی آمد پر تعظیماً ابوبکر رضی اللہ عنہ قطعاً کھڑے نہیں ہوئے بلکہ نماز کی حالت ہی پہلے سے ہی قیام کی تھی، مگر مفتی صاحب اسے قیام تعظیمی پر محمول کر رہے ہیں۔

اگر علماء بریلوی کہیں کہ مفتی صاحب کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ حالت نماز میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ادب کیا تھا تو راقم عرض کرتا ہے بجا فرمایا مگر مولوی احمد رضا خاں تو بے ادب ثابت ہو گیا جو کہ یہ کہہ رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میری اقتدا میں نماز جنازہ پڑھی، پھر اس بے ادبی پر نابکار و نالائق کلمہ الحمد للہ کہہ کر شکر یہ ادا کر رہا ہے، گویا بد نصیب اس گستاخی پر ندامت کی بجائے فخر و تکبر کر رہا ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

مسلم جلد دوم باب حدیث توبہ (کعب) ابن مالک، کتاب التوبہ میں ہے۔

فقام طلحہ ابن عبید اللہ یہرول حتی صافحنی و ہنانی۔

پس ابن عبید اللہ کھڑے ہو گئے اور دوڑتے ہوئے آئے مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی

، جاء الباطل ص ۲۵۱ ج ۱۔

الجواب

اولاً: حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے تھے بلکہ حضرت کعب بن مالک رضی

اللہ عنہ کی توبہ قبول ہوئی تھی اور اس کی مبارک باد دینے کے لیے دوڑ کر گئے تھے، اور یہ ہمارے

نزدیک بھی جاتے ہیں، اختلاف تعظیمی قیام میں ہے اس کی دلیل دیجیئے۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

مشکوٰۃ کتاب الادب باب المصافحۃ میں ہے کہ زید بن حارثہ دروازہ پاک مصطفیٰ علیہ السلام

پر حاضر ہوئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

فقام الیہ رسول اللہ ﷺ عرباناً فاعتنقہ و قبلہ۔

ان کی طرف حضور علیہ السلام بغیر چادر شریف کے کھڑے ہو گئے، پھر ان کو گلے لگایا اور بوسہ

دیا، جاء الباطل ص ۲۵۱۔

الجواب

اولاً، راقم الحروف نے جب مفتی صاحب کی اس دلیل کو پڑھا تو میری محبت رسول اللہ ﷺ کی

حس ایمانی نے کہا کہ یہ روایت مردود ہے، عظمت مصطفیٰ ﷺ کے ٹھیکے دار و تمہارے بقلم خود حکیم

الامت نے کمال عیاری سے متن روایت میں معنوی تحریف کی ہے اس مردود عبارت کا معنی یہ ہے کہ

حضرت زید رضی اللہ عنہ کی طرف رسول اللہ ﷺ ننگے کھڑے ہوئے، استغفر اللہ، لاجول

ولا قوۃ الا بالہ العلیٰ العظیم الف الف مرۃ۔

اس کی سند میں پہلا مجروح راوی ابراہیم بن یحییٰ ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۳۹۹ ج ۳، اسے امام ابو حاتم نے ضعیف اور امام ازدی نے منکر الحدیث کہا ہے، تھذیب ص ۱۵۴ ج ۱، و میزان ص ۷۴ ج ۱، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں، لین الحدیث، ہے تقریب ص ۱۶۔

دوسرا راوی ابراہیم کا والد یحییٰ بن محمد ہے اسے ابو حاتم نے ضعیف قرار دیا ہے امام ساجی کا کہنا ہے کہ اس کی مرویات میں مناکیر اور خطائیں ہیں اور تلقین کو قبول کر لیتا تھا، تھذیب ص ۲۷۳ ج ۱۱، و تقریب ص ۲۷۸۔

امام عقیلی فرماتے ہیں،

فی حدیثہ منا کیر وا غالیط وکان ضریرا فیما بلغنی انه یلقن .

اس کی روایات میں مناکیر اور خطائیں ہیں موصوف نابینا تھا مجھے خبر پہنچی ہے کہ لقمہ کو قبول کر لیتا تھا، الضعفاء الکبیر ص ۴۲۷ ج ۴، و میزان الاعتدال ص ۲۰۶ ج ۴۔

تیسرا راوی اس میں محمد بن اسحاق ہے جو کہ بلاشبہ ثقہ ہیں مگر زبردست مدلس ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

مشہور بالتدلیس من الضعفاء والمجهولين وعن شرمهم وصفه بذلك

احمد والدارقطنی و غیر ہما،

یعنی ضعیف و مجہول اور ان سے بھی بدتر سے تدلیس کرنے میں مشہور ہے اس کی صراحت امام احمد بن حنبل اور امام دارقطنی نے کی ہے، طبقات المدلسین ص ۵۱، جبکہ زیر بحث روایت صیغہ عن سے بیان کر رہا ہے،

الغرض جس روایت کی سند میں دو مجروح راوی ہوں تیسرا زبردست مدلس ہو، اس کے مردود ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے،

اس روایت کو حافظ ذہبیؒ نے، منکر، محدث مبارک پوری نے ضعیف، اسی طرح مولانا احمد حسن اور امام العصر محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ضعیف کہا ہے، میزان ص ۴۰۷ ج ۴، و تحفۃ الاحوذی ص ۳۹۹ ج ۳، و تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث مشکوٰۃ ص ۲۸۸ ج ۳، و ضعیف سنن ترمذی ص ۳۲۶۔

ثانیاً، یہ روایت صحیح حدیث کے مخالف ہونے کی وجہ سے بھی قابل اعتماد نہیں، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نبوت سے پہلے بچپن میں) کعبہ کی تعمیر کے لیے قریش کے ساتھ پتھر ڈھورہے تھے اس وقت (کرتہ عربی کے نیچے) تہبند باندھے ہوئے تھے آپ علیہ السلام کے چچا عباس نے کہا بھتیجے اپنا تہبند کھول کر کندے کے اوپر اور پتھر کے نیچے رکھ لو (تا کہ پتھر کو منتقل کرنے میں آسانی رہے) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ علیہ السلام نے تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لیا، اسی وقت غش کھا کر (زمین پر) گر پڑے، اس کے بعد آپ کبھی ننگے نہیں دیکھے گئے، بخاری ص ۵۲ ج ۱، و مسلم ص ۱۵۴ ج ۱، اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رحمت دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پنڈلیاں ننگی ہونے کو اللہ تعالیٰ نے گوارہ نہیں کیا اور اسی وقت آپ معجزانہ طور پر غش کھا کر زمین پر گر پڑتے ہیں پھر صحابی کہتا ہے کہ اس کے بعد آپ کو کبھی بھی ننگے نہیں دیکھا گیا مگر روایت مذکورہ میں زمانہ نبوت میں آپ ﷺ کے ننگے ہونے کی صراحت ہے، جو اس صحیح حدیث کے صریحاً معارض اور خلاف واقعہ ہے۔

ثالثاً، کیا مفتی صاحب نے یا ان کے کبھی کسی مرید و شاگرد نے بھی کبھی ایسا کیا ہے کہ جب کوئی محبوب دروازہ کھٹکھٹائے تو ننگے جا کر اس کا استقبال کیا ہو، جب آپ ایسے فعل کو اپنے لیے پسند کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر عظمت مصطفیٰ کے متعلق آپ نے کیسے باور کر لیا ہو۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

مشکوٰۃ۔ اسی باب میں ہے کہ جب حضرت خاتون جنت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں،

قام الیہا فاخذ بیدہا فقبلہا واجلسہا فی مجلسہ،

ان کے لیے کھڑے ہو جاتے اور ان کا ہاتھ پکڑتے ان کو چومتے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے الخ

جاء الباطل ص-۲۵۱،

الجواب

اولاً: بلاشبہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے مگر یہ مبتدعین کی دلیل قیام تعظیسی کی قطعاً نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تعظیم کے لیے قیام نہ فرماتے تھے بلکہ ان کو بٹھانا اور مجلس میں جگہ دینا مقصود ہوتا تھا، آج بھی اگر کسی کی بیٹی آئے خواہ وہ عالمہ فاضلہ ہی کیوں نہ ہو تو اس کا والد اس کی تعظیم کے لیے قطعاً کھڑا نہیں ہوتا۔

علامہ البانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس پر پُر مغز گفتگو کرنے کے بعد، علامہ عصام شافعیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

ومن ذلک قیامہ ﷺ الی ابنتہ فاطمة اذا دخلت علیہ و قیامہا الیہ ﷺ اذا دخل علیہا ، فانہ صحیح الاسناد، ولكن ليس فیہ القیام المتنازع فیہ ، لانه قام الیہا لیجلسہا فی مجلسہ، وقامت الیہ لتجلسہ فی مجلسہا

، وهذا مما لا خلاف فیہ ألسنت تری القائلین باستحباب القیام المزعوم لا یقوم احدہم لابنہ ولو کان عالماً ، فاضلاً؟! بل قال العصام الشافعی کما فی شرع المناوی علی ، الشمال.

وقد اتفق الناس فی القديم والحديث علی استہجان قیام الوالد لولدہ وان عظم ، ولو وقع ذلک من بعض الاء لاتخذہ الناس ضحکة و سخروا

منہ .

قیام تعظیسی کے قائلین کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب نبی ﷺ پر آپ علیہ السلام کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا داخل ہوتیں تو آپ علیہ السلام اُس کی طرف کھڑے ہوتے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے تو وہ بھی آپ علیہ السلام کے لیے قیام کرتیں تھیں، اور یہ صحیح الاسناد ہے۔

لیکن اس میں متنازع قیام کی دلیل نہیں کیونکہ آپ علیہ السلام اس لیے کھڑے ہوتے تھے تاکہ اسے اپنی مجلس میں بٹھائیں اور اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی بٹھانے کے لیے کھڑی ہوتیں اور یہ ایسی چیز ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ قیام کو مستحب جاننے والے بھی اپنے بیٹے کے لیے کھڑے نہیں ہوتے اگرچہ وہ عالم و فاضل ہی ہو

، بلکہ عصام شافعی نے کہا ہے، جیسا کہ شرح شمائل للمناوی میں ہے کہ اگلے پچھلے تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ والد کا اولاد کے لیے کھڑا ہونا معیوب ہے خواہ اولاد صاحب عظمت ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کسی والد سے ایسا سرزد ہو تو لوگ اسے مذاق بنالیں گے اور ایسے شخص کو تمسخر کریں گے۔ سلسلہ الاحادیث الضعیفۃ و الموضوعة واثرها السی فی الامۃ ص ۶۳۷ ج ۳۔

حانیاء: ہم خداداد فراست دینیہ اور اس کے علم کو کام میں لا کر اپنے ایمان و دین کی محکمی سے کہتے ہیں کہ دین اسلام کی تعلیم میں والدین کی تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان سے تعظیم کروانے کی کوئی اصل نہیں، اور کوئی بریلوی مائی کا لعل اس کا ثبوت قرآن و سنت سے قطعاً نہیں دے سکتا۔ جب آپ نے اس بات کو بخوبی جان لیا تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت حقہ کے اصول و ضوابط کے تحت بھی یہی ثابت ہوا کہ آپ ﷺ اپنی بیٹی کی تعظیم کے لیے قطعاً کھڑے نہ ہوتے تھے بلکہ قیام کا مقصد ان کو بٹھانا ہوتا تھا۔

اگر بریلوی مکتب فکر کے مولوی اس حقیقت سے انکار کریں تو ان سے کہیے کہ آپ اس سنت پر عمل کیوں نہیں کرتے کہ جب بیٹی گھر آئے تو اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں۔ حدیث سے ثابت ہے، چھوٹے پر رحم اور تکریم بڑے کی جائے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

لیس منا من لم یرحم صغیرنا و یوقر کبیرنا، الحدیث۔ ہماری (امت سے) نہیں ہے جو (شخص) چھوٹے پر رحم نہیں کرتا اور بڑے کی عزت نہیں کرتا، مسند احمد ص ۲۵۷ ج ۱، و ترمذی باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان، مگر مبتدیین کا باوا آدم ہی نرالا ہے انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ شریعت کے ہر حکم کے خلاف چلنا ہے، پلے کچھ پڑے یا نہ پڑے۔ یہ الگ بات ہے

یہ سب سنت سے انحراف کی پھنکار اور بدعت سے لگاؤ کا نتیجہ ہے، اللہ معاف کرے۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

مشکوٰۃ کتاب الایمان فصل ثالث میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک خوشخبری سنائی۔

فقمت الیہ و قلت بابی وامی انت احق بها .

تو میں کھڑا ہو گیا اور میں نے کہا کہ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں آپ اسی کے لائق ہیں، جاء الباطل ص ۲۵۱ ج ۱۔

الجواب

مذکورہ روایت کا حاصل یہ ہے کہ ایک مجلس میں صحابہ کرام میں اس بات کا تذکرہ چل پڑا کہ نجات کس چیز میں ہے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ افسوس کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں اور ہم نے اس کے متعلق دریافت ہی نہیں کیا، تب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میں نے اس بات کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تب میں اٹھ کر ان کی طرف کھڑا ہوا، الحدیث، مشکوٰۃ کتاب ایمان و مسند احمد ص ۶ ج ۱۔

اور یہ چیز محل نزاع سے خارج ہے، آج بھی اگر مجلس میں کوئی بات کرے تو بعض لوگ اٹھ کر اس کی طرف چلے جاتے ہیں، اور کوئی اناڑی سے اناڑی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوا ہے بلکہ ہر صاحب دماغ یہی کہے گا کہ اسکے اٹھنے کا مقصد اس کی طرف متوجہ ہونا ہے، چنانچہ اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں۔

(فقمت) ای من کمال الفرح متوجھا (الیہ) و متمثلابین یدیه .

(میں کھڑا ہوا) یعنی کمال خوشی سے ان کی طرف متوجہ ہوا (طرف ان کی) اور سیدھا کھڑا ہو گیا ان کے آگے۔ مرقاة ص ۱۱۵ ج ۱۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی مرحوم معنی کرتے ہیں۔

پس ایستادم بسوے ابوبکر رضی اللہ عنہ و رفتم بجانب او اشعة المعات ص ۷۳ ج ۱۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اٹھ کر متوجہ ہوئے۔ (تغیماً قطعاً قیام نہ کیا تھا)۔

مفتی صاحب کی آٹھویں دلیل

کوئی کافر اگر اپنی قوم کا پیشوا ہو۔ اور اس کے اسلام لانے کی امید ہو تو اس کے آنے پر اس کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا سنت ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے لئے حاضر خدمت ہوئے تو حضور علیہ السلام نے کھڑے ہو کر ان کو سینے سے لگایا۔ کتب تواریخ۔ جاء الباطل ص ۲۵۲۔

الجواب

اگر کسی معتبر دلیل سے ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ تو ہم اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ روایت اصول حدیث کی رو سے صحیح و صریح ہو کوئی ایچ پیج نہ ہو غرض کہ مبتدعین کے ہاتھ کی صفائی نہ ہو۔ اب ہم عرض کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے پاس اسلام قبول کرنے کے لئے گئے تو آپ علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین مولوی غلام رسول سعیدی صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ فرماتے ہیں۔

میں نے (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) دروازہ کھٹکھٹایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دروازہ کھول دو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خیر کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اس کو ہدایت عطا فرمائے گا۔ پھر دروازہ کھولا اور دو شخص مجھے بازو سے پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو۔ میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا آپ نے فرمایا اسلام قبول کر لو میں نے کہا اشہد ان لا الہ الا اللہ و انک لرسول اللہ۔

شرح صحیح مسلم ص ۹۱۵ جلد ششم بحوالہ اسد الغابہ ص ۵۸ ج ۴

اس کا واضح مفاد یہ ہے کہ آپ علیہ السلام اپنی اسی حالت (بیٹھے) میں ہی رہے تب ہی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سامنے بیٹھ گئے تھے جو مفتی صاحب کے موقف کے صریحاً

خلاف ہے۔

کیا کھڑے ہو کر کھانا مکروہ ہے

مفتی صاحب فرماتے ہیں چند جگہ قیام مکروہ ہے اولاً آب زمزم اور وضو کے سوا اور پانی کو پیتے وقت کھڑا ہونا بلا عذر مکروہ ہے۔ جاء الباطل ص ۲۵۲۔

الجواب

اولاً: صحیح سند سے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

كنا ناكل على عهد رسول الله ﷺ ونحن نمشي ونشرب ونحن قيام.

یعنی ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں چلتے پھرتے کھاتے تھے اور کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔

ترمذی مع تحفہ ص ۱۱۱ ج ۳، وابن ماجہ ص ۲۳۷، وسنن دارمی ص ۱۶۲ ج ۲، ومسند امام احمد ص

۱۲ و ۲۳ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کھڑے ہو کر کھانے پینے کا جواز موجود ہے گو ممانعت کی روایات بھی موجود ہیں مگر وہ کراہت تنزیہ پر محمول ہیں اور مذکورہ روایت بیان جواز مع الکراہت کے لئے ہے یہی بریلوی مکتب فکر کا موقف ہے چنانچہ مولوی غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں۔

ان تمام احادیث آثار اور اقوال علماء کا بغور مطالعہ کرنے سے بات معلوم ہوتی ہے کہ کھڑے

ہو کر کھانا پینا کراہت کے ساتھ جائز ہے اور مستحب یہی ہے کہ بیٹھ کر کھانا پینا چاہیے۔ کیونکہ کسی

حدیث میں بھی نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر کھانے پینے کا حکم نہیں دیا۔ شرح صحیح مسلم ص ۲۷۹ ج ۶۔

لیکن کمال ہے کہ مفتی صاحب اسے مکروہ (حرام) کہہ رہے ہیں، گویا کہ اس بارہ میں ان

کے اپنے گھر میں یہ تضاد موجود ہے۔

خلاصہ کلام

حضرت مفتی صاحب نے قیام تعظیمی میں کل آٹھ دلائل پیش کیے ہیں، مگر ان میں سے ایک

میں بھی قیام تعظیمی کا ثبوت نہیں، کیونکہ تمام کی تمام روایات کا زیر بحث موضوع سے دور کا بھی

واسطہ نہیں اور ہماری طرف سے پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام کو چیلنج ہے کہ کوئی ایسی حدیث صحیح صریح پیش کرو جس میں یہ ہو کہ امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذکر کے وقت قیام کرنا سنت یا مستحسن ہے۔

یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ذکر مصطفیٰ کے وقت قیام کرتے تھے، یا خیر القرون میں اس پر عمل تھا، یا آئمہ اربعہ میں کسی نے اس پر عمل کیا ہو یا ارشاد فرمایا ہو۔ یقین جانئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے اس جگہ پر مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے مسلمانوں ہمارے نبی کی مدد کرو اور انکی تعظیم کرو، تعظیم میں کوئی پابندی نہیں بلکہ جس زمانہ میں اور جس جگہ جو طریقہ تعظیم کا ہو اس طرح کرو بشرطیکہ شریعت نے اس کو حرام نہ کیا جیسے کہ تعظیمی سجدہ و رکوع۔ جاء الباطل ص ۲۵۴ ج ۱۔

مفتی صاحب جیسے رب تعالیٰ نے تعظیم کا حکم دیا ہے اسی طرح اس نے اپنے نبی کی زبانی اس کی تشریح و توضیح بھی کر دی ہے۔ اس بات کو آپ نے خود تسلیم کر لیا ہے کیونکہ آپ نے بھی تعظیمی سجدہ و رکوع کو حرام کہا ہے اسی طرح ہم کہتے ہیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے تعظیمی سجدہ کو ناجائز و حرام کہا ہے اسی طرح اپنے لئے قیام تعظیمی کو بھی منع فرمایا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث اس کا واضح اور کھلا ثبوت ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ ذکر ولادت کے وقت قیام فرمان رسول ﷺ کی مخالفت اور بدعت قبیحہ ہے۔

تعظیم رسول ﷺ کا مفہوم

مفتی صاحب کی پیش کردہ آیت سورۃ الفتح (۹) کی ہے جس میں لفظ۔ تو قرؤہ۔ استعمال ہوا ہے اور وقار کا معنی سنجیدگی اور عظمت آتا ہے (المنجد ص ۱۱۴۰)

امام راغب نے اس کا معنی سنجیدگی اور حلم کیا ہے، المفردات ص ۵۲۹، علامہ ابن منظور بھی اس کا معنی، الحکم والرزانۃ لکھتے ہیں، لسان العرب ص ۲۹۰ ج ۵۔

اور۔ وقر، کے معنی کسی صاحب مرتبہ کے مرتبہ کو ملحوظ رکھنا اور اس کے منافی کوئی بات نہ کرنا کے لئے آتا ہے چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے اس آیت کا معنی ہی اس طرح کیا ہے

مضبوطی و قوت دو اس کے دین کو اور عزت اور بزرگی اس کے حکم کو۔ موضح القرآن ص ۵۳۲۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تعظیم رسول اللہ ﷺ کا یہ معنی نہیں کہ انسان صرف زبان سے محبت کا دم بھرے اور عملی طور پر آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو بالائے طاق رکھ دے، بلکہ تعظیم یہ ہے کہ انسان آپ کے اقوال و افعال کا اتباع کرے لہذا تعظیم یہ ہے کہ قیام نہ کیا جائے کیونکہ آپ اس کو مکروہ جانتے تھے۔

باب۔ مسئلہ ایصال ثواب کن چیزوں کا میت کو ثواب پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ۔

(۱) الا تزر وازرة وزر اخرى ☆ وان ليس للانسان الا ماسعى ☆ وان سعيه سوف يرى ☆ ثم يجزاه الجزاء الاوفى (النجم آیت ۳۸ تا ۴۱)
ترجمہ۔ یعنی کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (۵۳۔ ۳۸ تا ۴۱)

(۲) من عمل صالحاً فلنفسه ومن اساء فعليها ثم الى ربكم ترجعون۔ (الجاثية آیت ۱۵)۔

ترجمہ۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا تو اپنے لئے اور جو برے کام کرے گا تو ان کا ضرر اسی کو ہوگا پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ (۱۵۔ ۴۵)۔

واضح رہے کہ پہلی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ اصول بتایا ہے کہ انسان کو وہ ملے گا جس کی اس نے سعی و کوشش کی۔ اور دوسری آیت میں یہ قانون اور دستور بتایا کہ جس نے نیکی کی اسے اس کا بدلہ ملے گا اور اس کی نیکی اس کے نفس کے لئے ہی ہے۔

اس مضمون کی متعدد آیات قرآن کریم میں موجود ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل۔

- (١) سورة بنى اسرائيل آيت ١٥ (٢) سورة الاعراف آيت ٨
 (٣) سورة القارعة آيت ٩ تا ٨
 (٤) سورة القصص آيت ٨٢
 (٥) سورة الروم آيت ٢٢ و ٢٥
 (٦) سورة الاحزاب آيت ٢٢
 (٧) سورة سبا آيت ٢
 (٨) سورة المؤمن آيت ١٤
 (٩) سورة البينة آيت ٤ و ٨
 (١٠) سورة البقرة آيت ٢٨٦
 (١١) سورة النمل آيت ٨٩ و ٩٠
 (١٢) سورة القصص آيت ٦٤
 (١٣) سورة العنكبوت آيت ٤
 (١٤) سورة لقمن آيت ٨ و ٩
 (١٥) سورة الروم آيت ١٥
 (١٦) سورة النساء آيت ٢١ و ٢٢
 (١٧) سورة الفتح آيت ٢٩
 (١٨) سورة قاطر آيت ٤
 (١٩) سورة السجدة آيت ١٩
 (٢٠) سورة الشورى آيت ٢٢ و ٢٣
 (٢١) سورة حم السجدة آيت ٨
 (٢٢) سورة محمد آيت ٢ و ١٢
 (٢٣) سورة الجاثية آيت ٣٠
 (٢٤) سورة التغابن آيت ٩
 (٢٥) سورة الطلاق آيت ١١
 (٢٦) سورة البروج آيت ١٠
 (٢٧) سورة البقرة آيت ٦٢
 (٢٨) سورة النساء آيت ١٢٢
 (٢٩) سورة المائدة آيت ٩
 (٣٠) سورة يونس آيت ٩
 (٣١) سورة الرعد آيت ٢٩
 (٣٢) سورة النحل آيت ٩٤
 (٣٣) سورة الكهف آيت ١٠٤
 (٣٤) سورة مريم آيت ٦٠
 (٣٥) سورة طه آيت ٤٥ و ٤٦
 (٣٦) سورة الانبياء آيت ٩٢
 (٣٧) سورة الفرقان آيت ٤٠
 (٣٨) سورة الحج آيت ١٢
 (٣٩) سورة ابراهيم آيت ٢٤
 (٤٠) سورة يونس آيت ٢٦
 (٤١) سورة العصر آيت ٣
 (٤٢) سورة الفرقان آيت ٤٠

یہ آیات فرقانیہ

ہم نے سرسری طور پر نشان دہی کی ہے۔ ان کو مکرر قرآن پاک سے نکال کر ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ تو آپ حضرات کے لئے بہتر اور مفید ہوگا۔ جہاں مسئلہ کی سمجھ آئے گی وہاں آپ کو تلاوت قرآن کا اجر بھی ضرور ملے گا ان شاء اللہ۔

حضرات محترم ان آیات میں اللہ رب العزت نے یہ مسئلہ کھل کر بیان فرمایا ہے کہ جو لوگ عمل صالح کریں گے انہیں بہشت عطاء کروں گا۔ انہیں اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز کروں گا اور انکا اخروی ٹھکانا بہتر ہوگا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ لیکن قرآن کی کسی آیت میں یہ اصول و دستور نہیں بتایا گیا کہ جس عمل میں انسان کا عمل و دخل نہ ہو۔ اس کا اجر و ثواب بھی انسان کو مل جاتا ہے جیسا کہ ہم ابتدا میں الفاظ قرآن کریم نقل کر چکے ہیں کہ انسان کے لئے وہی ہے جس کی اس نے سعی و کوشش کی تھی۔

انسان کی اولاد میں بھی چونکہ والدین کی سعی و کوشش کا دخل ہوتا۔ اور اولاد کی دینی تربیت کا سہرا والدین پر ہوتا ہے لہذا اولاد والدین کی طرف سے صرف و تمیرات وغیرہ کرے تو یہ درست اور حق ہے اور اس پر قرآن و سنت سے دلائل موجود ہیں۔ لیکن کوئی ایسی ذات جس کا انسان سے باپ یا ماں کا رشتہ نہیں اسے ایصال ثواب کرنے کی شرعی طور پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ ہم پوری ذمہ داری سے ساری دنیا کے مبتدعین کو کھلا چیلنج دیتے ہیں کہ وہ قرآن کی کسی آیت یا حدیث صحیح سے والدین کے علاوہ ایصال ثواب ثابت نہیں کر سکتے۔

اولاد میں والدین کی سعی شامل ہے

حضرت ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

ان من اطیب ما اکل الرجل من کسبه و ولده من کسبه .

بہت پاکیزہ خوراک آدمی کی وہ ہے جو اس کے کسب سے ہو اور اس کی اولاد بھی اس کے کسب

سے ہے۔

ابوداؤد مع عون ص ۳۱۲ ج ۳، (۳۵۲۲) و نسائی ص ۲۰۳ ج ۲، و ترمذی مع تحفہ ص ۲۸۷ ج ۲، و دارمی (۲۵۳۷) و مسند احمد ص ۴۲، ۴۳، ۲۲۰، ج ۶، و بیہقی ۴۸۰ ج ۷، و ابن ماجہ (۲۱۳۷) و عبدالرزاق (۱۶۶۴۳) وغیرہ۔

یہ حدیث اس بات کی گواہ ہے کہ انسان کی سعی و کوشش میں اس کی اولاد بھی داخل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مذکورہ آیات قرآنیہ میں جو انسان کو اس کی کوشش و کاوش کا ہی بدلہ ملنے کا ذکر ہوا ہے اس میں اولاد خود بخود داخل ہے۔ جس سے نیابت کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے لیکن شریعت اسلامیہ میں نیابت فقط حج اور روزہ میں ثابت ہے۔ جس کی ضروری تفصیل آگے اپنے مقام پر آرہی ہے۔

ایصال ثواب کا مشروع طریقہ

قرآن و سنت میں جس قدر اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

دعا

کے بارے سب کا اتفاق ہے کہ اگر میت مشرک و کافر نہ ہو تو اس کے حق میں مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کرنا مسنون ہے اور مومن کے لئے مفید ہے، اور بعد والوں کا اسلاف کے لئے دعا کرنا حکم شرعی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (الحشر آیت ۱۰)۔

ترجمہ۔ اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (و حسد) نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے (۵۹-۱۰)۔

اس مضمون کی متعدد آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ خود صاحب قرآن کی عملی زندگی ہمارے سامنے حد تو اترا تک پہنچی ہوئی ہے کہ آپ علیہ السلام فوت شدگان کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے

تھے، الغرض فوت شدگان کے لئے دعا کرنی مسنون و مشروع فعل ہے اور ہر اذان کے بعد امت مرحومہ رسول اللہ ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ سے، وسیلہ، فضیلت اور مقام محمود کی دعا کرتی ہے الغرض زندوں کی طرف سے مردوں کے لئے بہترین تحفہ دعا ہے۔

لیکن بعض حضرات دعا کو ایصالِ ثواب کے زمرہ میں لاتے ہیں، جو درست نہیں کیونکہ دعا اور ایصالِ ثواب میں ایک جوہری فرق ہے۔ دعا شفاعت کی قسم سے ہے اور ایصالِ ثواب اہل کے ضمن سے ہے علاوہ ازیں دعا زندوں و مردوں کے لئے کی جاسکتی ہے جبکہ ایصالِ ثواب فقط مردوں کے ساتھ خاص ہے۔

صدقہ جاریہ

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جاریة او علم ینتفع به او ولد صالح ید عوله .

یعنی جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع (ختم) ہو جاتا ہے مگر تین چیزیں باقی رہتی ہیں، صدقہ جاریہ، یا علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔

صحیح مسلم ص ۴۱ ج ۲، و ابوداؤد ص ۴۲ ج ۲، و ترمذی مع تحفہ ص ۲۹۸ ج ۲، و نسائی ص ۱۲۳ ج ۲، و مسند احمد ص ۳۷۲ ج ۲، و بیہقی ص ۲۷۸ ج ۶۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے تین چیزوں میں حصر فرما دیا ہے کہ ان چیزوں کا میت کو ثواب پہنچتا ہے۔ گو اس سلسلہ میں مزید بھی احادیث صحیحہ اور حسنہ موجود ہیں جس میں صدقہ جاریہ کے ضمن میں آنے والی چیزوں کی تعداد تقریباً دس تک پہنچتی ہے (۱) علم سلسلہ (۲) نیک بچے کی دعا (۳) قرآن مجید چھوڑنا (۴) مسجد بنوانا (۵) سرائے تعمیر کرانا (۶) شہر جاری کرانا (۷) کوئی صدقہ جو زندگی میں بحالت صحت کیا ہو (۸) مردہ سنت کو جاری کرنا (۹) جہاد میں مرنا (۱۰) درخت لگانا یا کھیتی بونا۔ دیکھئے، ابن ماجہ (۲۴۱) و ابن حبان (۹۳) و ابن ماجہ (۲۴۲) و ابن

خریمہ (۲۳۹۰) وادب المفرد ص ۲۰، ۲۱۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو حقیقت ان تین اقسام کے درمیان ہی گھومتی ہے فرق صرف تفصیل اور اجمال کا ہے۔ الغرض مذکورہ تمام صورتیں صدقہ جاریہ میں شامل ہیں صرف دعا صدقہ جاریہ کے بجائے شفاعت کی قسم میں داخل ہے۔ حضرت مولانا محمد عبدالرحمن محدث مبارک پوری (شارع سنن ترمذی) فرماتے ہیں۔

عبادات مالیہ کا بھی ثواب میت کو پہنچنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور تمام علمائے اہل سنت و کاذہب بھی یہی ہے کہ عبادات مالیہ کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔

بخاری ص ۱۸۶ ج ۱، و مسلم ص ۴۱ ج ۲، میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میری ماں یا ایک مرگئی اور میرا گمان ہے کہ اگر وہ بات کرتی یعنی بات کرنے کا اس کو موقع ملتا تو وہ صدقہ کرتی۔ سو اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کا ثواب اس کو پہنچے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں

بخاری ص ۳۸۶ ج ۱۔ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میری ماں وفات پا گئی ہے اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اس کو نفع پہنچے گا؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا میرے پاس ایک باغ ہے آپ کو گواہ رکھتا ہوں کہ میں نے اس باغ کو اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کر دیا۔

مسند احمد اور نسائی میں سعد بن عبادہ سے روایت ہے کہ ان کی ماں مرگئی تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے میں ان کی طرف سے صدقہ کروں؟

آپ نے فرمایا ہاں! انہوں نے کہا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا پانی پلانا۔ ابوداؤد ص ۲۳۶ ج ۱، کی روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا پانی۔ پس انہوں نے ایک کنواں کھودوایا اور کہا کہ یہ کنواں ام سعد کے واسطے ہے، یعنی اس کا ثواب سعد کی ماں کو پہنچے۔

ان احادیث صحیحہ صریحہ سے عبادات مالیہ کا ثواب میت کو پہنچنا صاف طور پر ثابت ہوتا ہے۔

کتاب الجنائز ص ۹۵۔

نیابت

ایصال ثواب کی تیسری صورت نیابت ہے یعنی میت کی طرف سے کوئی شخص نائب وقائم مقام ہو کر کام کرے اس سلسلہ میں حسب ذیل امور کا خاص خیال رکھا جائے۔

(۱) نائب کے اندر نیابت کی اہلیت موجود ہو، احادیث نیابت میں یا تو بچے کا ذکر ہے یا ولی کا یا قریبی کا، اجنبی کے بارے میں کوئی دلیل شرعی موجود نہیں۔

(۲) نیابت صرف مسلمان کی طرف سے کی جاسکتی ہے۔

(۳) عبادات شرعیہ میں کوئی شخص دوسرے کا قائم مقام نہیں ہو سکتا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ارشاد ربانی ہے کہ۔ کوئی شخص دوسرے انسان کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

نیز۔ نیابت کا یہ عمل عقل و حکمت کے بھی خلاف ہے کیونکہ بندگی کی روح تقویٰ اور اخلاص ہے، عجز و انکساری خشوع و خضوع حضور قلب اور انابت الی اللہ یہ سب صفات عامل کے ساتھ مخصوص ہیں کیونکہ یہ دل کے اعمال ہیں جو صاحب دل ہی کے ساتھ متصف ہو سکتے ہیں اس لئے نائب کسی طرح بھی وہ قلبی کیفیات اپنے اندر نیابت کے وقت پیدا نہیں کر سکتا جو منوب عنہ کے ساتھ مخصوص ہیں یہ ممکن ہے کہ مالی عبادات میں کوئی دوسرے کی طرف سے زکوٰۃ اور قرض ادا کر کے منوب کو سبکدوش کر دے لیکن دیگر عبادات میں تو اس قسم کی نیابت ممکن ہی نہیں کیونکہ اعمال کی قبولیت کے لئے اوصاف کی ضرورت ہے نائب ان میں نیابت کر ہی نہیں سکتا، اگر نیابت عبادات بدنہ میں جائز ہوتی تو اعمال قلبیہ میں بھی درست ہونی چاہیے جیسے ایمان، صبر، شکر، توکل، خوف، رجاء، وغیرہ اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح دراز ہوا تو سارا دین ہی نیابت پر چل سکتا ہے، پھر نہ فرد کے ایمان کی اہمیت نہ اعمال کے لئے ریاضت کی حاجت نہ صبر و استقامت کی ضرورت، بس سارے امور دین نیابت اور وکالت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ذریعے سے طے پاتے رہیں گے، اسی طرح نہ اصل قاتل سے قصاص کی ضرورت نہ اصل مجرمین پر حدود کے اجرا کی کوئی دلیل رہے گی، بس نائین ہی کافی رہیں گے۔

نیابت کا مشروع طریقہ

نیابت کے بارے میں صحیح و مسند احادیث کے مجموعہ سے حج اور روزہ میں نیابت جائز و ثابت ہے دیگر امور میں نہیں۔

صحیح بخاری ص ۲۵۰ ج ۱، میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنو جہینہ کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور کہا میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی اور حج کئے بغیر مر گئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا تاؤ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم ادا کرتی؟ اللہ کا حق ادا کرو، اللہ اپنے حق کے وفا کا زیادہ مستحق ہے۔ مسلم ص ۳۶۲ ج ۱، و مسند احمد ص ۲۲۷، ۲۵۸، و بیہقی ص ۲۵۵ ج ۴، و دارقطنی ص ۳۶۲ ج ۲، کی روایت میں ایک ماہ روزے کا بھی ذکر ہے، واضح رہے کہ زندہ کی طرف سے نیابت کے لئے اس کے عجز اور استطاعت کی شرط بھی ضروری ہے یعنی آدمی زندہ ہو لیکن اتنا مجبور و معذور ہو کہ اپنا فرض خود پورا نہ کر سکتا ہو تو اپنی زندگی ہی میں کسی کو نائب بنا کر فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو سکتا ہے جیسا کہ بخاری ص ۲۵۰ ج ۱ میں ہے کہ ایک عورت نے کہا میرے باپ پر حج فرض ہے، لیکن وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتے، کیا میں اپنے والد کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں۔

اس صورت کو حج بدل کہا جاتا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ حج بدل کرنے والا شخص اپنا حج کر چکا ہو جیسا کہ ابو داؤد ص ۲۵۲ ج ۱، میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص سے سنا کہ وہ کہہ رہا ہے۔ لبیک عن شرمۃ۔ شرمۃ کی طرف سے میں حاضر ہوں، آپ نے فرمایا شرمۃ کون ہے؟ اس نے کہا میرا بھائی میرا قریبی ہے آپ نے پوچھا تو نے اپنا حج ادا کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اپنا حج ادا کرو پھر شرمۃ کی طرف سے کرنا۔

اگر اولاد والدین کی وصیت یا بغیر وصیت کے حج کرے تو جائز ہے، اسی طرح والدہ یا والد نے صدقہ دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اور فوت ہو گئے ہیں تو اولاد کو ان کی طرف سے صدقہ دینا چاہیے البتہ حج بچے کے سوا دوسرے بھی اس کی طرف سے کر سکتے ہیں۔

روزہ میں نیابت کی دلیل

حج کی طرح روزہ میں بھی نیابت جائز ہے البتہ اس میں ضروری ہے کہ منوب عنہ کی وفات ہو چکی ہو، زندہ شخص کی طرف سے روزہ رکھنے کی اجازت ثابت نہیں۔

بخاری ص ۲۶۲ ج ۱، میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ میری ماں مر گئی ہے اور اس پر ایک ماہ کے روزے ہیں! کیا میں اپنی ماں کی طرف سے سب قضا روزے ادا کر دوں؟ آپ نے فرمایا ہاں،

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو مر جائے اور اس پر روزے ہوں اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے۔ صحیح بخاری شریف ص ۲۶۲ ج ۱۔ حافظ ابن حجر، فتح الباری ص ۱۵۶ ج ۴، میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ بعض اہل ظاہر قضا روزوں کے وجوب کے قائل ہیں اہل حدیث کا مسلک بھی یہی ہے کہ میت کی طرف سے روزے رکھے جاسکتے ہیں، باب من مات وعلیہ صوم۔

نیابت اور اہدا کا فرق

بعض حضرات ایصال ثواب کے ثبوت میں حج بدل نیز روزہ اور صدقہ والی احادیث کا ذکر کرتے ہیں جبکہ نیابت اور اہدا میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نیابت میں عامل اپنے آپ کو دوسرے شخص کے قائم مقام قرار دیتا ہے مثلاً حج جس میں یوں کہتا ہے۔

لبیک عن فلان۔ اے اللہ میں فلاں شخص کی طرف سے حاضر ہوں اور اہداء ثواب کی صورت یہ ہے کہ حج اپنی طرف سے کرے اور بعد میں کہے یا اللہ میرے اس حج کا ثواب فلاں شخص کو دے، پہلی شکل تو ثابت اور منصوب ہے اور دوسری شکل بقول مولانا اسماعیل شہیدؒ بدعتِ ہقیقیہ ہے۔

چنانچہ۔ ایضاح الحق الصریح فی احکام لیت والصریح، میں لکھتے ہیں کہ۔

زندوں کا مردوں کو عبادت کا ثواب بخشنا بدعتِ ہقیقیہ ہے، بخلاف مالی عبادات میں نیابت کے کہ وہ اصل میں صحیح ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی عبادات میں حج اور صدقہ کے سوا ایصال ثواب کے قائل

نہیں

علماء حنا بلہ بھی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول نقل کرتے ہیں۔

وقال شيخنا لم يكن من عادة السلف اهداء ذلك الى موتى المسلمين بل

كانوا يدعون لهم فلا ينبغي الخروج عنهم .

یعنی مردوں کو ثواب بخشنا اہل سلف کا دستور نہ تھا، وہ صرف ان کے لئے دعا کرتے تھے لہذا

ان کے طریقہ سے ٹکنا جائز نہیں۔

نیز موافقات میں علامہ ابوالاسحاق کا یہ قول کتنا جامع ہے کہ اهداء ثواب کے منع کی دو وجہیں

ہیں، اول شریعت میں مال کے ہبہ کا ثبوت ہے، ثواب کے ہبہ کا نہیں، جب اهداء ثواب کی کوئی

دلیل ہی نہیں تو اس کا قائل ہونا بھی غلط ہے، دوم ثواب اور عقاب شارع علیہ السلام کے مقرر کردہ

ہیں نیز جزا عمل کے تابع ہے جیسا عمل ویسی جزا، جزاء بما کانوا یعملون (سورہ السجدہ آیت ۱۷)،

بدلہ ہے اس کا جو وہ عمل کرتے تھے، اس میں عامل کو کوئی اختیار نہیں۔

سوم، ثواب اللہ کا فضل و انعام ہے عامل کو اس میں تصرف کا کوئی اختیار نہیں، لہذا اپنے عمل

کے ثواب کو کسی دوسرے کے لئے ہدیہ اور ہبہ کرنے کا عامل کو حق نہیں۔

شبہات اور ان کا ازالہ

(۱) کسی بھائی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ثواب کی طرح مال بھی اللہ کا فضل ہے اور جب مال

کا ہبہ کرنا جائز ہے تو ثواب کا ہبہ کرنا بھی جائز ہونا چاہیے لیکن یہ شبہ حقیقت کے خلاف ہے اس لئے

کہ مال تو ایک محسوس و مقبوض اور قابل انتقال چیز ہے ایک کے قبضہ سے لیکر دوسرے کے قبضہ میں

دی جاسکتی ہے، لیکن ثواب تو غیر محسوس اور مرنی شے ہے اور قلب کی اس کیفیت کے تابع ہے جو

عامل کو کرنے سے حاصل ہوتی ہے، لہذا اس کا انتقال ممنوع و محال ہے اس لئے ثواب کو مال پر

قیاس کرنا ہی قیاس مع الفارق ہے، یہ صحیح ہے کہ جزا عمل کے تابع ہے لیکن عامل کو جزاء سے انتفاع

اور استمتاع کا حق ہے نہ کہ انتقال و ہبہ و اهداء کا، اس فرق کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیے تاکہ غلط

بحث نہ ہو۔

(۲) اسی طرح یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کی طرف سے قربانی کی اور اس کا ثواب امت مرحومہ کو پہنچایا، تو یہ قیاس بھی بے محل اور غلط ہے اس لئے کہ اول تو قربانی ایک مالی صدقہ ہے جس میں نیابت جائز ہے اور آنحضرت ﷺ کی حیثیت امت کے لئے ایسی ہے جیسے گھر والوں کے لئے قیم اور ولی کی ہوتی ہے، جس طرح ایک مرد اپنے پورے گھر والوں کی طرف سے قربانی کر سکتا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی اور اپنی آل اور اپنی امت کی طرف سے قربانی فرمائی اس کا حق سب سے زیادہ آپ علیہ السلام ہی کو پہنچتا تھا، آپ علیہ السلام سب سے اولیٰ ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے۔

النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم (الاحزاب ۶)

نبی ﷺ مؤمنین کے ساتھ ان کی جانوں سے بھی زیادہ اولیٰ ہیں۔

الغرض اس حدیث سے اهداء ثواب پر استدلال غلط اور بے محل ہے کیونکہ اس سے نیابت ثابت ہوتی ہے نہ کہ اهداء، نیابت اور اهداء دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

(۳) تیسرا شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ابلہ شہر والوں کو کہا، کون شخص اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ میرے لئے مسجد عشر میں دو یا چار رکعت پڑھے اور کہے کہ یہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے لئے ہے۔

اس قصہ سے ایصال ثواب کا ثبوت پیش کرنا کئی وجہ سے غلط ہے اول تو یہ روایت ہی نہایت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے اس کی سند میں ایک راوی، ابراہیم بن صالح بن درہم، ہے، سنن ابی داود مع عون المعبود ص ۱۹۰ ج ۴۔

اور یہ راوی ضعیف ہے۔

امام بخاری کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی متابع موجود نہیں، عقیلی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث میں مشہور نہیں اور اس کی (مذکورہ) روایت غیر محفوظ ہے، دارقطنی نے ضعیف کہا ہے، تہذیب التہذیب ص ۱۱۱ ج ۱، و میزان ص ۳۷ ج ۱، و خلاصہ ص ۴۶ ج ۱، حافظ ابن حجر کا کہنا ہے، فیہ ضعف، یعنی اس راوی میں ضعف پایا جاتا ہے، تقریب ص ۱۳،

(۴) چوتھا شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ بخاری میں ہے کہ ایک مرد نے کہا میری ماں مر گئی ہے

اگر صدقہ کروں تو اس کے لئے مفید ہوگا؟ فرمایا ہاں! پھر اس نے ایک باغ صدقہ کر دیا، ایک روایت میں ہے کہ ناگہاں مر گئی ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو صدقہ کرتی، کیا اس کی طرف سے کفایت کرے گا، فرمایا: ہاں، پہلی روایت میں یہ بھی ہے کہ اگر وہ کلام کرتی تو صدقہ کرتی۔ صحیح بخاری شریف ص ۱۸۶ ج ۱، وص ۳۸۶ ج ۱۔

یہ تمام احادیث اور اسی قسم کی جملہ احادیث صحیحہ اولاد کے بارے میں ہیں اور ان سب میں نیابت کی صورت متحقق ہے، یہ دونوں عورتیں صدقہ کا پختہ ارادہ کر چکی تھیں اگر ان کو فرصت ملتی تو صدقہ ضرور کرتیں۔ لہذا ان کی اس نیت کو ان کی اولاد نے نائب بن کر پورا کیا، ایسی نیابت جائز اور ثابت ہے لیکن اس حدیث سے اهداء ثواب کا کچھ تعلق نہیں۔

از افادات شیخ العرب والعجم حضرت حافظ محمد صاحب محدث گوندلوی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

فرقہ بریلویہ کے لئے لمحہ فکر یہ اور ان کے اکابرین کو کھلا چیلنج

اس ساری تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بدنی عبادت کا ثواب پہنچانا کسی بھی حدیث صحیح سے ثابت نہیں اور یہ کہ مالی عبادت میں نیابت سے میت کو ثواب پہنچتا ہے۔

اس لئے ہماری طرف سے پوری دنیا کے مبتدعین کو کھلا چیلنج ہے کہ کوئی ایسی حدیث صحیح مرفوع ثابت کرو جس میں غیر اولاد کی طرف سے مالی عبادت کا ثواب پہنچانا ثابت ہو، اگر آپ حضرات ایسی کوئی حدیث صحیح مرفوع ثابت کر دیں تو ہم اپنے موقف کو غلط تسلیم کرنے کے علاوہ آپ کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے آپ کی قرآن دانی اور حدیث فہمی کے قائل ہو جائیں گے۔

مگر یاد رہے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت مل کر سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود ایسی کوئی حدیث صحیح مرفوع ثابت نہیں کر سکتے۔

فان لم تفعلوا ولن تفعلوا

قارئین کرام اگر یہ حضرات اپنے موقف پہ کوئی حدیث پیش نہ کر سکے اور یقیناً پیش نہیں کر سکیں گے، تو اسی ایک بات سے ہی ان کے گیارہویں کے دلائل اور قبروں پر نذر و نیاز کی حقیقت بھی کھل

جائے گی کہ یہ سب بے بنیاد اور بدعات قبیحہ اور اپنی طرف سے شریعت حقہ میں لاحقہ و اضافہ ہے۔

قرآنِ قرآن

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ بدنی عبادت کا ایصالِ ثواب کرنا کسی حدیث صحیح سے ثابت نہیں اور قرآنِ قرآن بھی بدنی عبادت ہے۔

ہم پورے جزم و یقین کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ میت کے لئے قرآنِ قرآن کرنے کی کوئی شرعی دلیل نہیں، قرآنِ پاک کی کسی آیت سے یا حدیثِ نبوی سے میت کے لئے قرآن پڑھنے کی صراحت نہیں، نہ ہی کسی صحابی رضی اللہ عنہ و تابعی سے ایسا قول و عمل منقول ہے، بلکہ خیر القرون کے زمانہ میں سرے سے یہ رواج ہی نہ تھا اور نہ ہی سلفِ صالحین کی عادت تھی کہ وہ مردوں کی روح کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی کرتے ہوں۔

حافظ ابن کثیرؒ، امام شافعی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ۔

و من هذه الآية الكريمة استنبط الشافعي رحمه الله و من اتبعه ان القراءة لا يصل اهداء الثوابها الى الموتى لانه ليس من عملهم ولا كسبهم ولهذا لم يندب اليه رسول الله ﷺ امته ولا حثهم عليه ولا ارشد هم اليه بنص ولا ايماء ولم ينقل ذلك عن احد من الصحابة رضي الله عنهم ولو كان خيرا لسبقونا اليه وباب القربات يقتصر فيه على النصوص ولا يتصرف فيه بانواع الاقيسة والاراء ، فاما الدعاء والصدقة فذاك مجمع على و صولهما و منصوص من الشارع عليهما .

یعنی آیت (وان لیس للانسان الا ما سمی) سے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے تبعین نے استنباط کیا ہے کہ قرآن شریف پڑھنے کا ثواب مردوں کو نہیں پہنچتا، کیونکہ یہ مردوں کا عمل و کسب نہیں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کو اس کا حکم نہیں دیا اور اشارۃ و صراحتہ بھی اس طرف امت کی راہنمائی نہیں فرمائی نہ اس کی ترغیب انہیں دی، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے یہ بات ثابت نہیں کی گئی، اگر میت کے لئے قرآن خوانی کوئی کار خیر ہوتا تو حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہم سے پہلے اس کی سعادت حاصل کر لئے ہوتے، اعمال خیر میں صرف نصوص پر ہی انحصار کیا جاتا ہے، رائے اور قیاس کو اس میں دخل نہیں ہوتا، البتہ دعا اور صدقہ کے بارے میں اتفاق ہے

، شارع علیہ السلام کی طرف سے واضح نص موجود ہے، کہ ان کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔
تفسیر ابن کثیر ص ۲۵۸ ج ۴، زیر آیت وان لیس للانسان الا ما سعی

قل دسواں چالیسواں وغیرہ کی بحث

رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارکہ ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے، ہم صرف اسی کی پیروی کے مکلف ہیں جس طرح کسی فعل کی پیروی سنت ہے اسی طرح جس کام کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا اس کا ترک کرنا بھی سنت اور اسلام کی عین تعلیم ہے۔ اس کی پوری تفصیل ہم نے ابتدا میں بدعت کے جواز پر مفتی صاحب کی پانچویں دلیل کے جواب میں عرض کر دی ہے اسے وہاں سے ایک بار مکرر پڑھ لیجئے۔

قارئین کرام جب آپ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا ہے کہ قل وغیرہ کا جو طریقہ مبتدعین میں رائج ہے اور جس ضابطہ سے یہ لوگ ایصال ثواب کرتے ہیں یہ رسم دور نبوی میں تو کجا پورے زمانہ خیر القرون میں نہیں پائی جاتی تھی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی فرماتے ہیں کہ

نبی ﷺ کی عادت نہ تھی کہ میت کے لئے نماز (جنازہ) کے علاوہ وقت میں جمع ہوں، اور قرآن خوانی کریں اور ختم پڑھیں، قبر ہو خواہ کوئی دوسری جگہ ہو اور یہ ساری چیزیں بدعت و مکروہ (حرام) ہیں۔

شرح سفر السعادت ص ۲۷۳ ترجمہ از فارسی عبارت)

و مدارج النبوت ص ۴۲۱ ج ۱، طبع نول کشور، و اھۃ الممعات ص ۴۵ ج ۱، واللفظ لہ)

شیخ اپنی معروف کتاب، جامع البرکات، میں فرماتے ہیں کہ

ششماہی یا چہل روز دریں دیار پزند و در میان برادران بخشش کنند و آں بھاجی میگویند چیزے داخل اعتبار نیست بہتر آنست کہ نہ خورد۔

بحوالہ فتاویٰ رضویہ ص ۲۳۰ ج ۴،

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ تعین ایام کے ساتھ کھانا سامنے رکھ کر ختم دینا اور مرنے والے کی

روح کو ایصالِ ثواب کرنا، نبی ﷺ سے ثابت نہیں تو اب سینے کہ جس فعل کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے نہ ہو وہ کام بدعتِ سیئہ اور گمراہی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ

من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد۔

یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے کرنے کا ہم نے ارشاد نہیں فرمایا تو وہ کام مردود ہوگا۔ بخاری ص ۱۰۹۲ ج ۲، مسلم ص ۷۷ ج ۲، مسند احمد ص ۱۳۶ ج ۶، ۲۵۶، و دارقطنی ص ۲۲۷ ج ۴،

بلکہ ایک روایت کے الفاظ ہیں

من صنع امرأ على غير أمرنا فهو رد۔

یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جو ہماری سنت کے علاوہ ہے وہ مردود ہے۔

ابوداؤد ص ۲۷۶ ج ۲، و بیہقی ص ۲۵۲ ج ۱۰،

یہ حدیث اس بات کی برہان قاطع ہے کہ جس فعل کو کرنے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم اور ارشاد نہیں فرمایا، یا جس عمل پر کوئی ثبوت رسول اللہ ﷺ سے نہیں وہ بدعت و مردود ہے، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ رسم قل وغیرہ چونکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں لہذا بدعت و گمراہی ہے، اور ہماری طرف سے عام دعوت فکر ہے کہ اگر مبتدعین اس کا ثبوت کسی حدیث صحیح یا حسن سے دے دیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تعین ایام کے ساتھ کسی بھی مرنے والے کے قل وغیرہ اس کیفیت کے ساتھ کیے ہوں کہ کھانا سامنے رکھ کر اس پر قرآن کریم کی تلاوت کر کے آخر میں دعا کے ذریعے اسے ایصالِ ثواب کیا ہو، تو ہم اسے قبول کرتے ہوئے قل وغیرہ کو قبول کر لیں گے اور جماعتی سطح پر اس کے مسنون ہونے کا اعلان کریں گے۔

مگر یاد رہے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت اور عاشقین بدعات ملکر سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

فان لم تفعلوا ولن تفعلوا۔

مرنے والے کے وارثوں سے مسنون سلوک

مسنون اور شرعی اصول کا تقاضا تو یہ ہے کہ مرنے والے کے گھر میں کھانا پکا کر بھیجا جائے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ اصنعوا ل آل جعفر طعاما فإنه قد اتاهاهم امر يشغلهم.

یعنی (جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر پہنچی تو) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جس نے ان کو مشغول کر دیا ہے۔ سنن ابوداؤد (۳۱۲۶) و ترمذی معہ تحفہ ص ۱۳۲ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۱۱۶، و مسند احمد ص ۲۰۵ ج ۱، و بیہقی ص ۶۱ ج ۴، و مستدرک حاکم ص ۳۷۲ ج ۱، و سنن دارقطنی ص ۷۹ ج ۲،

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرنے والے کے وارثوں کے گھر کھانا بھیجنا مسنون طریقہ ہے مگر مبتدعین کا اس حدیث کے برعکس عمل ہے وہ یہ کہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو دفن کرنے کے بعد عزیز و اقارب اور دوست و احباب یہ پوچھنے لگ جاتے ہیں کہ رسم قل وغیرہ کب ہوگی؟ جس پر میت کا وارث انہیں اگلے روز یا اس کے بعد کے دن، کی تاریخ وغیرہ دے دیتا ہے، جس پر مقررہ تاریخ پر تمام رشتہ دار اور برادری وغیرہ جمع ہو جاتی ہے اور ایک دعوت کا سماں ہوتا ہے اور شادی وغیرہ جیسی دعوت کا انتظام کیا جاتا ہے اور عمدہ عمدہ کھانے پکائے جاتے ہیں اور ختمی ملا جمع ہو کر پہلے موت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں پھر بعد میں کہا جاتا ہے کہ اس قدر تلاوت قرآن اور کلمہ طیبہ وغیرہ پڑھا گیا ہے جسے مولوی صاحب حسب روایت وصول کرتے ہیں اور دعا کے ذریعہ کھانا سامنے رکھ کر مردے کی روح کو بخشتے ہیں جس قدر کسی بدعتی فاضل کا علم رسم یہ زیادہ ہوگا اس قدر اس کا ختم بھی لمبا ہوتا جائے گا اور کھانے پر دعا سے قبل قرآۃ بھی لمبی و طویل ہوتی جائے گی آخر مولوی صاحب ختم شریف کو مکمل کر لیں گے تو تمام حاضرین کی فروٹ وغیرہ سے ضیافت کی جاتی ہے۔ اور بعد میں کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے جسے تمام حاضرین تناول کرتے ہیں اور مرنے والے کا گھر اس کی وفات کے اگلے روز ہی ایک ضیافت خانہ بن جاتا ہے اور کوئی شخص کسی مجبوری سے نہ کر سکے یا کسی کا کرنے والا نہ ہو تو اس کے بارے میں مبتدعین میں ایک معروف مثل ہے کہ فاتحہ نہ درود مر گئے مردود، فیروز اللغات ص ۹۲۱،

اس لعن و طعن سے بچنے کی غرض سے کئی حضرات غربت و تنگ دستی کے باوجود قرض لیکر رسم قتل کرتے ہیں۔

بیان کیا مجھ سے محبی و انہی مناظر اسلام فاتح بریلویت حضرت قاضی عبدالرشید راشد حفظہ اللہ نے (آف جلمن ضلع گوجرانوالہ) کہ

میرے ہمسائے ایک نیک مخلص بزرگ رہتے تھے گھر میں افلاس اور غربت تھی اور اکثر بیمار رہا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے انکو آخری عمر میں ایک بچہ اور ایک بچی عطا فرمائی تھی بیماری اور غربت کی بناء پر اگر کوئی انکو دے جاتا تو ان کے گھر کھانا پکتا تھا ورنہ وہ بیچارے..... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ مختصر کتبہ رمضان المبارک میں شام کیوقت لال مرچ کیساتھ اکثر روزہ افطار کیا کرتا۔

آخر وقت آیا کہ وہ بزرگ فوت ہو گئے اسوقت انکا بچہ دوسری کلاس میں پڑھتا اور بچی پہلی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اور ان کی بیوہ بوڑھی جس کو اللہ تعالیٰ نے شادی کے پچیس ۳۵ سال بعد اولاد دی تھی بہت غمگین اور حزین خاطر تھی۔ کہ لوگوں کے اصرار پر اس بزرگ کا قتل کا ختم دیا گیا مولوی صاحب ختم دے کر کافی فروٹ اپنے رومال میں لیکر جا رہے تھے کہ میری ملاقات ہو گئی۔ میں سب کچھ سمجھ گیا میری مولوی صاحب کے ساتھ بے تکلفی تھی۔ اس لئے میں نے پوچھا مولوی صاحب کیا یہ مال وہی نہیں جس کے بارے قرآن نے کہا کہ یتیموں کا مال کھا کر اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ بھرتے ہیں یہ بچے یتیم ہیں اور عورت بوڑھی بیوہ ہے آپ نے اس سے یہ پوچھا ہے کہ شام کیلئے آپ کے گھر آنا بھی ہے یا نہیں؟ تو ہنس کر کہنے لگے لوگ ہم کو بلاتے ہیں تو ہم آتے ہیں نہ بلائیں تو نہ آئیں ہمیں بنے کھا چکا ہے کسی نے کوئی کسی کا مرے تیری عید ہو گئی مردہ جنت گیا رسید ہو گئی۔

اسی طرح ہمارے محلہ میں ایک اور غریب آدمی تھا اس کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے۔ تھے زکوٰۃ و خیرات لیکر اپنا وقت پاس کرتا تھا اس کے مکان کی چھت گر گئی کچا مکان تھا چھت گرنے سے اس کا ایک بچہ نیچے آ کر فوت ہو گیا غربت کا یہ عالم تھا کہ مکان پر چھت ڈلوانا تو درکنار گھر میں کھانے کیلئے کچھ نہ تھا میں نے کچھ ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ جماعتی طور پر باضابطہ چندہ اکٹھا کر کے اسکو

گندم اور نقدی وغیرہ دی مگر افسوس کہ کھانے والوں اور پیٹ کے پجاریوں نے اس کو مجبور کر کے بچے کے رسم ختم پر نقدی خرچ کرادی..... انا للہ وانا الیہ راجعون.....

قاضی عبدالرشید راشد جہن ضلع گوجرانوالہ

۷ محرم ۱۴۲۱ھ

الغرض یہ حضرات قل وغیرہ کو نماز روزہ سے بھی زیادہ وقعت دیتے ہیں اگر اعتبار نہ ہو تو کسی بھی قل و دسواں میں شرکت کر کے دیکھ لیں کہ محفل قل میں تو تل دھڑنے کو جگہ نہ ہوگی لیکن ان کی مساجد میں نمازی حضرات کی کمی بے دینی کی حد تک ہے، راقم الحروف کو متعدد بار ایسا موقع ملا ہے کہ مبتدعین کا پیش امام اذان دیکر انتظار کرتے کرتے تھک کر آخر اعلان کرتا ہے کہ دو نمازی حضرات آجائیں تو جماعت ہی ہو جائے۔

آخر سوال یہ ہے کہ عوام کے ذہن میں یہ باتیں کس نے راسخ کی ہیں کہ نماز سے لاپرواہی اور قل کا اس قدر التزام کہ اسے اہل سنت کی علامت اور امتیازی مسئلہ بنا دیا جائے، یقیناً بریلوی مکتب فکر کے عوام کے عمل و رسوم میں ان کے قائدین کا کردار ہے جنہوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔

حتی الامکان اتباع شریعت نہ چھوڑو، اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے، اللہ توفیق دے، وصایا شریف ص ۸

فقہائے احناف کی صراحت

فرقہ بریلویہ خود کو حنفی المذہب کہتے ہیں بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں اگر کوئی مکتب فکر خالص حنفی ہے تو وہ مولوی احمد رضا خاں بریلی کی نسبت سے معروف بریلوی مکتب فکر ہے۔

جبکہ دیوبندی وغیرہ کو یہ حضرات گلابی وہابی سے تعبیر کرتے ہیں، دیکھئے جاء الباطل ص ۶ ج ۱، الغرض یہ گروہ خود کو خالص و اصلی حنفی باور کراتے ہیں، اسی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے چند عبارات کتب فقہ حنفیہ سے نقل کی جاتی ہیں تاکہ ثابت ہو جائے کہ مبتدعین کی اس پیٹ پوجا کی تردید ان کی کتب میں پائی جاتی ہے اور شکم پروری کے اس طریقہ کی اکابر احناف نے جڑ کاٹ

کر رکھ دی ہے اور ایصالِ ثواب کے نام سے عوام کے مال کو کھانا حرام و مکروہ قرار دیا ہے۔

چنانچہ امام فخر الدین حسن بن منصور المتوفی سن ۲۹۵ھ، خفی فرماتے ہیں کہ

ویکروہ اتخاذ الضیافة فی ایام المصیبة لانها ایام تاسف فلا یلیق بها ماکان للسرور.

اور مکروہ ہے مصیبت کے دنوں میں ضیافت کرنا کیونکہ جو کام خوشی کے وقت ہو وہ غمی کے مناسب نہیں ہے، فتاویٰ قاضی خاں ص ۴۰۵ ج ۳، علی حاشیہ عالم گیر، کتاب الحظر والاباحۃ، علامہ محمد بن شہاب کردری الحنفی المتوفی سن ۸۲۷، فرماتے ہیں کہ

ویکروہ اتخاذ الضیافة ثلاثة ایام و اکلها لا نهيا مشروعة للسرور.....

ویکروہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول و الثالث و بعد الاسبوع والاعیاد و نقل الطعام الی القبر فی المواسم و اتخاذ الدعوة بقراءة القرآن و جمع الصلحاء أو لقرا للختم أو لقراءة سورة الانعام أو للاخلاص فالاحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لاجل الاکل یکرہ.

اور مکروہ ہے تین دن تک ضیافت اور اس کا کھانا بھی، اس لئے ضیافت تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے..... اور مکروہ ہے پہلے دوسرے اور تیسرے روز کھانا تیار کرنا، اور ہفتہ کے بعد اور عیدوں کے موقع پر اور اسی طرح موسم بموسم قبروں کی طرف کھانا لے جانا بھی مکروہ ہے اور قرآن کو پڑھنے کے لئے نیک لوگوں اور قاریوں کو جمع کر کے ختم قرآن کے لئے دعوت کرنا بھی مکروہ ہے، یا سورۃ الانعام اور اخلاص (قل هو اللہ) کی تلاوت کے لئے کھانا تیار کرنا بھی مکروہ ہے الغرض قرآن کے وقت کھانا کھانے کے لئے طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

فتاویٰ بزازیہ علی حاشیہ فتاویٰ عالم گیر ص ۸۱ ج ۴، آخر کتاب الجنائز،

علامہ ابن ہمام الحنفی المتوفی سن ۸۶۱، شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ

ویکروہ اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل الميت لانه شرع فی السرور لافی

الشور وھی بدعة مستقبحة.

اور مکروہ ہے اہل میت کے گھر کھانا تیار کرنا، اس لئے کہ ضیافت کا کھانا تو خوشی کے موقع پر

ہوتا ہے ناکہ غمی میں ، اور یہ بدترین بدعت ہے ، فتح القدیر ص ۱۰۲ ج ۲ ، آخر فصل فی الدفن ۔

علامہ سراج الدین اودی حنفی متوفی فرماتے ہیں کہ

ولا یباح اتخاذ الطعام ثلاثة ايام فی المصيبة .

یعنی تین دن تک مصیبت والے گھر میں (جن کا فوت ہو گیا) کھانا تیار کرنا مکروہ ہے ۔

فتاویٰ سراجیہ ص ۷۵ ۔

علامہ قہستانی حنفی فرماتے ہیں کہ

ویکروہ اتخاذ الضیافة فی هذه الايام و کذا اکلها کما فی خیرة الفتاوی ،

یعنی خیرة الفتاوی میں ہے کہ ان دنوں میں میت کے گھر کھانا تیار کرنا اور تناول کرنا دونوں

مکروہ ہیں ، جامع الرموز ص ۴۴۳ ج ۳ ، آخر الکراہیۃ ،

برصغیر کے پانچ صد علماء کے مرتب کردہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ

ولا یباح اتخاذ الطعام ثلاثة ايام کذا فی التتار خانیه .

یعنی فتاویٰ تتار خانیه میں ہے کہ میت کے گھر تین دن تک کھانا تیار کرنا مکروہ ہے ۔ فتاویٰ

عالمگیریہ ص ۱۶۷ ج ۱ ، باب مسائل التعزیه ،

علامہ شامی حنفی فرماتے ہیں کہ

و قال ایضاً ویکروہ اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی

السرور لا فی الشرور ، وہی بدعة مستقبحة ، وروی الامام احمد و ابن ماجہ

باسناد صحیح عن جریر بن عبد اللہ قال ، کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت و

صنعهم الطعام من النیاحۃ ، و فی البزازیۃ ، ویکروہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول

والثالث و بعد الأسبوع و نقل الطعام الی القبر فی المواسم ، و اتخاذ الدعوة لقراءة

القرآن و جمع الصلحاء والقرأ للختم أو لقراءة سورة الانعام أو الاخلاص ،

والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لاجل الأکل یکروہ ، و فیہا من کتاب

الاستحسان وان اتخذ طعاما للفقراء وکان حسناً ، و أطل فی ذلک فی المعراج

، وقال وهذه الافعال كلها للسمعة والرياء فيجتريز عنها لانهم لا يريدون بها وجه الله تعالى ، وبحث هنا في شرح المنية بمعارضة حديث جرير المار بحديث آخر فيه ، أنه عليه السلام دعته امرأة رجل ميت لمارجع من دفنه فجاء وجى بالطعام ، اقول فيه نظر ، فانه واقعة حال لا عموم لها مع احتمال سبب خاص بخلاف مافى حديث جرير ،

على أنه بحث فى المنقول فى مذهبا و مذهب غيرنا كا الشافعية والحنابلة استدلالاً بحديث جرير المذكور على الكراهة ، ولا سيما اذا كان فى الورثة صغار أو غائب ، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات الكثيرة كايقاد الشموع والقناديل التى توجد فى الافراح ، وكسق الطبول والغناء بالأصوات الحسان ، واجتماع النساء والمردان ، وأخذ الأجرة على الذكر قرأة القرآن ، وغير ذلك مما هو مشاهد فى هذه الأ زمان وما كان كذلك فلا شك فى حرمة وبطلان الوصية به .

يعنى علامہ ابن ہمام نے ، فتح القدیر ، میں کہا ہے کہ اہل میت کی طرف سے کھانے کی ضیافت مکروہ ہے اس لئے کہ یہ تو خوشی کے موقع پر مشروع ہے ناکہ غمی کے موقع پر ، امام احمد اور امام ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میت کے گھر جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرنے کو نوحہ میں شمار کرتے تھے ، اور فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ پہلے اور تیسرے دن کھانا تیار کرنا مکروہ ہے اسی طرح ہفتہ کے بعد اور تہوار کے موقع پر قبر کی طرف کھانا لے جانا ، اور ختم کے لئے قاریوں اور نیک لوگوں کو جمع کر کے قرأت قرآن کے لئے دعوت کرنا ، یا سورۃ الانعام اور اخلاص کی تلاوت کے لئے ، مکروہ ہے ۔

الغرض قرأت قرآن کے وقت کھانا کھانا مکروہ ہے ، اور فتاویٰ بزازیہ کی کتاب الاستحسان میں ہے کہ اگر فقرا کے لئے کھانا تیار کرے تو اچھا ہے اور معراج الدرایہ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی

ہے اور پھر کہا ہے کہ یہ تمام افعال نمود و نمائش اور ریا و بناوٹ کے لئے ہیں لہذا ان سے احتراز کرنا چاہئے کیونکہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود نہیں ہے، اور شارح منیہ نے اس پر بحث کرتے ہوئے حدیث جریر پر یہ معارضہ قائم کیا ہے ایک دوسری حدیث سے کہ آپ علیہ السلام کی ایک عورت نے دعوت کی جب اس کے خاوند کو فن کر کے آنحضرت ﷺ واپس لوٹے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ

میں کہتا ہوں کہ اس استدلال میں کلام ہے کیونکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس میں عموم نہیں بلکہ کسی خاص سبب کا احتمال ہے، بخلاف حدیث جدیر رضی اللہ عنہ میں جو ہے وہ عموم ہے۔

ہمارے مذہب اور غیر کے مذہب جیسا کہ شافعیہ اور حنبلیہ وغیرہ میں یہ بحث منقول ہے اور ان کا استدلال مذکورہ حدیث جریر سے ہے کہ یہ افعال مکروہ ہیں بالخصوص جب وارثوں میں نابالغ یا غیر حاضر بھی ہوں، قطع نظر اس کے کہ ان میں بہت سی منکرات کے، جو ان مواقع پر کی جاتی ہیں جیسا کہ شمعیں اور قندلیں جلانا، ڈھول بجانا خوش الحانی کے ساتھ (میت کی مدح میں) قصیدہ گانا عورتوں اور بے ریش لڑکوں کا جمع ہونا، ختم اور قرآن قرآن کی اجرت لینا وغیرہ جن کا اس زمانہ میں مشاہدہ ہو رہا ہے اور اس طرح کی چیزوں کا حرام ہونا اور ایسی وصیت کے باطل ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں۔

فتاویٰ شامی ۲۴۰ تا ص ۲۴۱ ج ۲ باب کراہیۃ الضیافۃ من اہل المیت۔

تنبیہ

علامہ شامی نے جو عبارت شارح منیہ علامہ ابراہیم حلبی حنفی متوفی سن ۹۵۶ھ، کی نقل کر کے جواب دیا ہے، ہمارے نزدیک یہ جواب ادھورا اور ناقص ہے، کیونکہ علامہ حلبی نے اس روایت کو مسند احمد اور سنن ابی داؤد سے نقل کیا ہے کہ

استقبلہ داعی: امراتہ،

یعنی میت کی بیوی کا ایک قاصد رسول اللہ ﷺ کو کھانے کی دعوت دینے آیا، حلبی کبیر ص ۹۰۶،

مگر علامہ ابراہیم کو حدیث کے الفاظ نقل کرنے میں وہم ہوا ہے (یا غالباً مشکوٰۃ ص ۵۴۴ سے نقل کی ہے) کیونکہ حدیث میں الفاظ، داعی امراتہ، کے نہیں بلکہ، داعی امراتہ، یعنی کسی عورت کے قاصد نے آپ کو دعوت دی تھی، چنانچہ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت حسب ذیل کتب حدیث میں موجود ہے۔

دلائل النبوة للبیہقی ص ۳۱۰ ج ۶، و ابوداؤد ص ۱۱۷ ج ۲ طبع کراچی، و ابوداؤد ص ۱۱۷ ج ۲ طبع مکتبہ امدادیہ، و ابوداؤد (۳۳۳۲) طبع بیروت، و طبع دارالسلام الریاض و ابوداؤد مع عون (۳۳۲۶) و ابوداؤد مع بذل الجہود ص ۲۳۹ ج ۴، و السنن الکبری للبیہقی ص ۵۳۳ ج ۵، و دارقطنی ص ۲۸۶ ج ۴، و مسند احمد ص ۲۹۴ ج ۵، و شرح معانی الآثار ص ۳۵۲ ج ۲، و نصب الرایہ ص ۱۶۸ ج ۴، لہذا سرے سے اس روایت سے استدلال ہی غلط ہے۔

مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری فرماتے ہیں کہ۔
مشکوٰۃ کی حدیث مذکورہ میں، داعی امراتہ، صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے داعی امراتہ، ہونا چاہیے، دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ حدیث مشکوٰۃ میں ابوداؤد سے نقل کی گئی ہے اور ابوداؤد میں، داعی امراتہ، نہیں ہے بلکہ، داعی امراتہ، ہے، کتاب الجنائز ص ۷۷۔
رجوع الی المقصد

ملا علی القاری حنفی مشکوٰۃ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

قررہ اصحاب مذهبنا من انه یکره اتخاذ الطعام فی اليوم الاول او الثالث او بعد الاسبوع کما فی البزازیة و ذکر فی الخلاصة انه لایباح اتخاذ الضیافة عند ثلاثة ايام..... وقال ابن الهمام یکره اتخاذ الضیافة من اهل الميت و الكل عللوه بانہ شرع فی السرور لافی السرور وقال وهی بدعة مستقبحة.

یعنی ہمارے مذہب حنفی کے فقہاء کرام نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ میت کے پہلے اور تیسرے دن اور اسی طرح ہفتہ کے بعد طعام تیار کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ، فتاویٰ بزازیة میں ہے اور خلاصہ میں ہے کہ تین دن تک میت کے گھر میں کھانا تیار کرنا مکروہ ہے۔

اور علامہ ابن ہمام نے (فتح القدیر میں) کہا کہ میت کے گھر میں کھانا تیار کرنا مکروہ ہے اور

ان تمام کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ طعام کا کھلانا تو خوشی کے موقع پر ہوتا ہے نا کہ غمی میں اور مزید کہا ہے کہ یہ بدترین بدعت ہے، مرقاة المفاتیح ص ۲۲۳ ج ۱۱۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی فرماتے ہیں کہ

فتح العزیز میں ہے کہ سوم کا مقرر اور اسے ضروری سمجھنا شرعاً ثابت نہیں اور صاحب نصاب الاحساب نے ان کو مکروہ لکھا ہے بلا تقرر یوم (دن) اور بغیر رسوم دنیاوی میت کو ثواب پہنچائیں تو باعث خیر ہے اور میت اپنی موت کے قریب ثواب کی زیادہ محتاج ہوتی ہے جہاں تک ہو سکے ثواب پہنچانا چاہیے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شرح سفر السعادت، میں تحریر فرماتے ہیں۔

اور عادت نہیں تھی کہ میت کے لئے غیر وقت نماز میں جمع ہوں اور قرآن پڑھیں اور ختم کریں نہ قبر پر نہ اور کہیں اور یہ سب بدعت اور مکروہ ہے اہل میت سے تعزیت کرنا اور انہیں تسلی دینا اور صبر کی تعلیم کرنا سنت اور مستحب ہے لیکن نتیجے کے دن اس مخصوص صورت سے جمع ہونا اور تکلفات مروجہ کرنا اور یتامی کے مال سے بے وصیت مال صرف کرنا بدعت اور حرام ہے،

مجموعۃ الفتاوی ص ۳۴۲ ج ۱، مترجم طبع ایچ ایم سعید سن ۱۴۰۴ھ،

شیخ الاسلام، کشف الغطاء، میں فرماتے ہیں کہ

آنچه متعارف شده از پختن اهل مصیبت طعام را در رسوم و قسمت نمودن آن میان اهل تعزیت و اقران غیر مباح و نامشروع است و تصریح کرده بران درخزانہ چہ شریعت دعوت نذد سرور است نہ نذد شرور و هو المشہور عند الجمہور،

بحوالہ فتاوی رضویہ ص ۱۳۱ ج ۴، واحکام شریعت ص ۲۹۴،

اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی مرحوم لکھتے ہیں کہ

بعد مردن من رسوم دینوی مثل دھم و بستم و جھلم و ششماہی و برسینی ہیچ نہ کنند، کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ از سہ ماتم کردن جائز نہ داشتہ اندو حرام ساختہ اند،

یعنی میرے مرنے کے بعد دنیاوی رسمیں مثلاً دسواں اور بیسواں اور چالیسواں اور ششماہی اور

سالانہ (یعنی عرس) کچھ بھی نہ کرنا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تین دن سے زیادہ سوگ کرنے کو جائز نہیں رکھا بلکہ حرام قرار دیا ہے۔

وصیت نامہ ملحقہ مالا بدمنہ ص ۱۵۲ طبع برکت علی اینڈ سنز سن ۱۹۳۲۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ

دیگر از عادات شنیعہ ما مردم اسراف است درما تمہا و سیوم و جہلم و ششماہی و وفاتحہ سالینہ وایں ہمہ را درعرب اول وجود نہ بود مصلحت آن ست کہ غیر تعزیت وارثان میت تاسہ روز و اطعام شان یک شب وروز رسمے نباشد۔

اور ہم لوگوں کی بری عادتوں میں سے ہے کہ موت کے بعد تیسرے چہلم ششماہی اور سالانہ فاتحہ کے موقع پر اسراف کرنا اور یہ عرب (یعنی اسلام) کے ابتدائی دور میں ان امور کا کوئی وجود نہ تھا اور مصلحت اسی میں ہے کہ تین دن تک میت کے وارثوں کی تعزیت اور ان کی صبح و شام کھانے کے بغیر اور کوئی رسم نہ ہو۔

تقیہیات الہیہ ص ۴۲ ج ۲۔

مفتی صاحب کا اعتراض

فرماتے ہیں کہ فقہاء نے میت کے ایصالِ ثواب سے منع نہیں کیا بلکہ حکم دیا جیسا کہ ہم پہلے باب میں عرض کر چکے ہیں، جس کو فقہاء منع کرتے ہیں وہ چیز ہی اور ہے، وہ میت کے نام پر برادری کی روٹی لینا یعنی قوم کے طعنہ سے بچنے کے لئے جو میت کے تیجے دسویں وغیرہ میں برادری کی دعوت عام کی جاتی ہے وہ ناجائز ہے۔

اس لئے کہ یہ نام و نمود کے لئے ہے اور موت نام و نمود کا وقت نہیں، اگر فقراء کو بغرض ایصالِ ثواب فاتحہ کر کے کھانا کھلایا تو سب کے نزدیک جائز ہے، شامی کتاب الجنائز باب الدفن میں ہے یعنی میت والوں سے دعوت لینا مکروہ ہے کیونکہ یہ تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے نہ کہ غمی کے موقع پر۔

دعوت لینے کے وہ ہی معنی کہ برادری مجبور کرے کہ روٹی کر، پھر فرماتے ہیں یہ سارے کام محض دکھاوے کے ہوتے ہیں لہذا ان سے بچے کیونکہ اس سے اللہ کی رضا نہیں چاہتے۔

صاف معلوم ہوا کہ فخر یہ طور پر برادری کی دعوت منع ہے، پھر فرماتے ہیں اگر اہل میت نے

فقرا کے لئے کھانا پکایا تو اچھا ہے، یہ فاتحہ کا جواز ہے، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کا اپنے نتیجہ دسویں سے منع فرمانا بالکل درست ہے وہ فرماتے ہیں رسوم دنیاوی جو نتیجہ وغیرہ وہ نہ کریں، رسوم دنیا کیا ہیں، عورتوں کا نتیجہ وغیرہ کو جمع ہو کر رونا پیٹنا نوحہ کرنا وہ واقعی حرام ہے، اسی لئے فرماتے ہیں کہ تین دن سے زیادہ تعزیت جائز نہیں، اس جگہ ایصال ثواب اور فاتحہ کا ذکر نہیں، جس کا مقصد یہ ہوا کہ نتیجہ وغیرہ میں ماتم نہ کریں، جاء الباطل ص ۲۶۸ ج ۱۔

الجواب: اولاً: یہ بات بھی درست ہے کہ اہل میت سے برادری کے نام روٹی لینا اور مرنے والے کا عزیز و اقارب اور تعلق داروں کے لئے دعوت کا انتظام کرنا غلط ہے، مولوی احمد رضا خاں بریلوی سے جب اسی طرح کا سوال ہوا کہ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں اکثر بلاد میں رسم ہے کہ میت کے روز وفات سے اس کے اعزہ و اقارب و احباب کی عورتیں اس کے جمع ہوتی ہیں اس اہتمام کے ساتھ جو شادیوں میں کیا جاتا ہے پھر کچھ دوسرے دن اکثر تیسرے دن واپس آتی ہیں بعض چالیسویں تک بیٹھتی ہیں اس مدت اقامت میں عورات کے کھانے پینے پان چھالیہ کا اہتمام اہل میت کرتے ہیں جس کے باعث ایک صرف کثیر زیر بار ہوتے ہیں اکثر اس وقت انکا ہاتھ خالی ہو تو اس ضرورت سے قرض لیتے ہیں یوں نہ ملے تو سودی نکلو اتے ہیں اگر نہ کریں تو مطعون و بدنام ہوتے ہیں یہ شرعاً جائز ہے یا کیا، بینوا تو جروا۔

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم . الحمد لله الذى ارسل نبينا الرحيم الغفور بالرفق و التيسير و اعدل الامور فسن الدعوة عند السرور دون الشرور ﷺ وبارك عليه و على اله الكرام و صحبه الصدور.

سبحان الله، اے مسلمان یہ پوچھتا ہے، جائز ہے یا کیا، یوں پوچھ کہ یہ ناپاک رسم کتنے قبیح اور شدید گناہوں سخت و شنیع خرابیوں پر مشتمل ہے۔

اولاً۔ یہ دعوت خود ناجائز و بدعت شنیعہ قبیحہ، امام احمد نے اپنے مسند اور ابن ماجہ سنن میں بہ صحیح حضرت جریر بن عبد اللہ بکلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

کنا نعد الا اجتماع الى اهل الميت و صنعهم الطعام من النياحة .

ہم گروہ صحابہ رضی اللہ عنہم اہل میت کے یہاں جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرانے کو مردے کی نیاحت سے شمار کرتے تھے، جس کی حرمت پر متواتر حدیثیں ناطق -

اس کے بعد خاں صاحب نے تقریباً بیس کتب فقہ حنفیہ سے اس کے حرام و مکروہ ہونے کی صراحت نقل کی ہے، فتاویٰ رضویہ ص ۱۳۱ ج ۴ -

الغرض یہ چیز محل نزاع سے خارج ہے اور ختم و قل وغیرہ کو جواز کا لبادہ پہنانے کا ایک بہانا ہے کیونکہ قل وغیرہ کی رسم کا یہ بنیادی جزو اور پتھر ہے کہ میت کے فوت ہونے کے دن سے ایک دودن چھوڑ کر قل کے نام پر دعوت کی جاتی ہے جس میں عزیز و اقارب اور دوست و احباب جمع ہوتے ہیں اور حسب دستور کھانا تیار کیا جاتا ہے اور قل کا ختم پڑھ کر تمام حاضرین کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور جو رشتہ دار کھانے کو نہ کھائے یا اس دعوت میں شامل نہ ہو اس سے ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے یہ جھوٹا بہانا ہے کہ کھانا فقط فقراء کو ایصال ثواب کی نیت سے کھلایا جاتا ہے -

بلکہ کھانا تمام حاضرین تناول کرتے ہیں، خواہ کوئی امیر ہو یا غریب بلکہ جس کھانے پر فاتحہ پڑھی گئی ہو اسے بطور تبرک حاضرین میں تقسیم کیا جاتا ہے جسے لوگ خوشی سے کھاتے پیتے ہیں -

الغرض مفتی صاحب کا یہ لکھنا کہ فاتحہ کا کھانا صرف فقراء کو کھلایا جاوے - فقط کاغذی کاروائی ہے، ورنہ یہ لوگ کیوں فتویٰ نہیں دیتے کہ قل وغیرہ میں شامل امیر و دولت مند حضرات اگر کھانا تناول کریں گے تو ان کا کھانا حرام اور سور کی طرح مردار نہ ہے، مگر یہ حضرات کبھی بھی ایسا فتویٰ صادر کرنے کو تیار نہیں ہوں گے کیونکہ جب امراء کے لئے منع کا فتویٰ ہوگا تو مولویوں کے لئے جواز کا فتویٰ کیسے ہوگا

ثانیاً: حضرت مفتی صاحب نے جس انداز اور ترتیب سے، فتاویٰ شامی، سے عبارت نقل کی ہے، اس ترتیب اور انداز میں قطعاً نہیں، قارئین کرام ہم پہلے شامی کی مفصل عبارت نقل کر چکے ہیں اسے ایک بار مکرر ملاحظہ کر لیں کہ آیا عبارت کا اسلوب یہی ہے جو مفتی صاحب بیان کر رہے ہیں

حضرات محترم جب آپ نے عبارت کو پڑھ لیا ہے تو پھر غور کیجئے کہ مفتی صاحب نے عبارت میں ہیر پھیر کر کے مفہوم کو بگاڑا ہے کہ نہیں! اگر بگاڑا ہے اور یقیناً بگاڑا ہے تو اس پر ہم، بھی کہہ

سکتے ہیں کہ حکیم الامت جیسے القاب اختیار کرنے کا مقصد صرف اس طرح کی عیاریاں کرنا ہے۔
اب آئیے ہم آپ کو علامہ شامی کی مفصل عبارت کا مفہوم سمجھا دیں، تاکہ حق واضح ہو جائے۔
علامہ شامی نے پہلے ”فتاویٰ بزازیہ“ سے اس کا مکروہ (حرام) ہونا نقل کیا ہے۔ پھر فرماتے
ہیں کہ فتاویٰ بزازیہ کی کتاب الاستحسان میں ہے کہ اگر کھانا پکا کر فقرا کو کھلایا جائے تو اچھا ہے،
معراج الدراہیہ شرح ہدایہ، سے اس کی تردید نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سارے کام محض
دکھاوے کے لئے ہوتے ہیں لہذا ان سے بچنا چاہئے۔
اس کے بعد علامہ شامی نے مفصل رد تحریر کیا ہے، مگر مولف جاء الباطل نے اپنے روایتی کردار
سے اس عبارت کو ہی بگاڑ دیا ہے۔

حکم: حضرت قاضی ثناء اللہ مرحوم پانی پتی کی عبارت کا یہ مفہوم نکالنا کہ انہوں نے قل و
دسواں سے منع نہیں کیا بلکہ دنیاوی رسوم سے منع کیا، مفتی صاحب کی جہالت اور تعصب کا منہ بولتا
ثبوت ہے کیونکہ قاضی صاحب تو یہ کہہ رہے ہیں کہ قل و دسواں وغیرہ نہ کرنا کہ یہ تمام دنیاوی رسوم
ہیں یعنی قاضی صاحب انہیں دنیاوی رسوم میں داخل کر کے اس پر حرمت کا فتویٰ لگا رہے ہیں،
مگر انہوں نے مفتی صاحب اس کا مطلب بگاڑ کر اپنے پیٹ کی خاطر ان پر افترا کر رہے ہیں یاد
رہے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت اور عاشقین بدعات قاضی صاحب سے وہ بات ثابت نہیں کر سکتے
جو مفتی صاحب نے ان کی طرف منسوب کی ہے، اللہ تعالیٰ مبتدعین کو ہدایت اور سمجھ عطا کرے،
آمین یا الہ العالمین۔

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

تفسیر روح البیان پارہ ۷ سورۃ الانعام زیر آیت، و هذا کتاب انزلناہ مبارک، میں ہے
وعن حمید الاعرج قال من قرء القرآن و ختمه ثم دعا امن علی دعائه اربعۃ
الاف ملک ثم لا یدالون یدعون له و یتغفرون و یصلون علیہ الی المساء او الی
الصباح۔

حضرت اعرج سے مروی ہے کہ جو شخص قرآن ختم کرے پھر دعا مانگے تو اس کی دعا پر چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں پھر اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اور مغفرت مانگتے رہتے ہیں، شام یا صبح تک۔

یہ مضمون نووی کی کتاب الاذکار کتاب تلاوت القرآن میں بھی ہے، معلوم ہوا کہ ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، اور ایصال ثواب بھی دعا ہے لہذا اس وقت ختم پڑھنا بہتر ہے۔ جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ۱۔

الجواب

اولاً: امام الاعرج (حمید بن قیس مکی) اتباع تابعین سے ہیں ظاہر ہے کہ اتباع تابعین سے کسی کا قول شرعی طور پر حجت نہیں ہے۔

ثانیاً: روایت کے الفاظ ہمارے سامنے ہیں اس میں صاف بیان ہے کہ جو قرآن کو ختم کرے اس کے لئے فرشتے مغفرت کی دعا کرتے ہیں، کسی اور کے لئے قطعاً نہیں۔

ثالثاً: روایت میں اس کا بھی ذکر قطعی طور پر نہیں کہ کھانا سامنے رکھ کر دعا کی جائے تو تب فرشتے آمین کہتے ہیں، جیسا کہ مبتدعین کا عمل ہے علاوہ ازیں اس کی سند میں قذعہ بن سوید راوی ہے، داری ۵۶۰/۲ کتاب فضائل القرآن باب فی ختم القرآن رقم الحدیث (۳۴۸۱) جو کہ ضعیف ہے تقریب ص ۲۸۲ تفصیل کے لئے دیکھئے تھذیب ص ۳۷۶ ج ۸۔

رابعاً: اس روایت کی صحت کو بالفرض اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو تب بھی یہ مبتدعین کی دلیل قطعی طور پر نہیں بن سکتی، کیونکہ روایت میں بہر حال اس کا ذکر نہیں کہ جب کوئی وفات پا جائے تو اس کے لئے کھانے پر قرآن خوانی کرتے ہوئے آخر میں اس کے حق میں مغفرت کی دعا کرو، تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے اور مرنے والے کو یہ ایصال ثواب کچھ نفع و فائدہ پہنچاتا ہے۔

خامساً: مفتی صاحب کا ایصال ثواب اور دعا کو ایک قرار دینا، غلط ہے کیونکہ اس کا قرآن و سنت سے ثبوت نہیں، علاوہ ازیں دعا شفاعت کی قسم سے ہے اور ایصال ثواب ہدیہ کے قبیل سے ہے۔

دوسری دلیل

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

انوار ساطعہ ص ۱۲۵، اور حاشیہ خزائنہ الروایات، میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے لئے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں دن اور چھٹے ماہ اور سال بھر بعد صدقہ دیا، یہ نتیجہ ششماہی اور برسی کی اصل ہے۔

جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ۱،

الجواب

اولاً: کتاب انوار ساطعہ، ایک بریلوی مولوی عبدالسمیع رامپوری کی بدعات کے دفاع اور جواز میں تصنیف کردہ ہے، اور حاشیہ خزائنہ الروایات، کوئی حدیث کی کتاب ہی نہیں، الغرض یہ روایت محض من گھڑت اور بے اصل ہے اور کوئی محقق بریلویت اس کو ثابت نہیں کر سکتا، ہم ثبوت دینے والے رضوی علامہ فہامہ کی قرآن فہمی اور حدیث دانی کے علاوہ جماعتی سطح پر، تیسرے، ساتویں اور چالیسویں روز صدقہ کرنے اور برسی منانے کو مسنون تسلیم کر لیں گے، مگر یاد رہے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت اور عاشقین بدعات سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں دے سکتے، قیامت تک مہلت ہے تجربہ کر دیکھئے۔ واضح رہے کہ من گھڑت روایات خود بریلوی مذہب کے جید علماء کے نزدیک بھی قابل استدلال نہیں ہوتیں جیسا کہ آگے انکو ٹھے چومنے کی بحث میں ہم نے، علماء بریلویہ کا اعتراف کے زیر عنوان ان کی عبارات نقل کی ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ، خزائنہ الروایات، فقہ حنفی کی کتاب ہے اور کتب فقہ میں مروی روایات کا سرے سے کوئی اعتبار ہی نہیں، جیسا کہ ہم نے، دین الحق ص ۷۱، ۶۵۲، ج ۱، میں تفصیل عرض کر دی ہے۔ جب آپ اس بات کو بخوبی جان گئے ہیں کہ فقہ حنفی میں مرویات کو دلیل بنانا تو کجا سرے سے وہ قابل اعتماد ہی نہیں،

تو پھر سنئے کہ ہم اپنے دین و ایمان کی محکمی اور خدا داد قرآن و سنت کے علم کو بروئے کار

لاتے ہوئے پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ بات عرض کرتے ہیں کہ یہ روایت من گھڑت اور بلاسند ہے، اور اس کو بسند صحیح ثابت کرنے والے محقق بریلویہ کو منہ مانگا انعام دیں گے۔

ثانیاً: اس من گھڑت روایت میں ایام کی تخصیص ہے اور خود مفتی صاحب کے گرو مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے اعتراف کر رکھا ہے کہ شریعت میں ثواب پہنچانا ہے دوسرے دن ہو خواہ تیسرے دن باقی یہ تعین عرفی ہے، جب چاہیں کر لیں انہیں دنوں کی گنتی ضروری جاننا جہالت و بدعت ہے، فتاویٰ رضویہ بحوالہ توضیح البیان ص ۱۳۲۔

تعب ہے کہ ان ایام کی تعین کو ضروری جاننے کو تو خاں صاحب بھی جہالت و بدعت قرار دیں؟ اگر ان کے نزدیک یہ حدیث ثابت ہوتی تو وہ اسے ضرور واجب یا کم از کم سنت ہی قرار دیتے مگر انہوں نے اسے بدعت کہہ کر اس روایت کو من گھڑت تسلیم کر لیا ہے۔

ثالثاً۔ اس من گھڑت روایت میں بھی فقط ایصال ثواب کا ذکر ہے، محفل چہلم وقل وغیرہ کا اس میں سرے سے بیان ہی نہیں نہ ہی ختم قرآن اور دعا کا ذکر! جیسا کہ مبتدعین کا عمل ہے۔ خاں صاحب فرماتے ہیں کہ۔

ثواب پہنچانا صرف نیت ہی سے نہ ہو بلکہ اس کی دعا بھی ہو، فتاویٰ رضویہ ص ۲۱۸ ج ۴۔ جب کہ روایت ان تمام امور سے ساکت ہے۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

نوودی نے کتاب الاذکار باب تلاوة القرآن میں فرمایا کہ انس بن مالک ختم قرآن کے وقت اپنے گھر والوں کو جمع کر کے دعا مانگتے، حکیم بن عتبہ فرماتے ہیں کہ ایک مجمع کو مجاہد و عبیدہ ابن ابی لبابہ نے بلایا اور فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ آج ہم قرآن پاک ختم کر رہے ہیں، اور ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، حضرت مجاہد سے بروایت صحیح منقول ہے کہ بزرگان دین ختم قرآن کے وقت جمع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس وقت رحمت نازل ہوتی ہے، لہذا تیج و چہلم کا اجتماع سنت سلف ہے، جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اثر کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں

كان اذا ختم القرآن جمع اهلہ و ولده فدعاهم.

یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ جب قرآن مجید ختم کرتے تو اپنے اہل بیت اور اولاد کو جمع کرتے

اور ان کے لئے دعا کرتے، مجمع الزوائد ص ۷۵ ج ۷۔

ظاہر ہے کہ اس اثر کو مبتدعین کے مروجہ ختم سے کوئی تعلق ہی نہیں، کیونکہ قرآن حکیم کو پورا پڑھ کر آخر میں اولاد کے حق میں دعائے خیر کرنا، بات ہی دیگر ہے جب کہ مبتدعین کسی شخص کے مرنے پر متونی کے ایصال ثواب کے لئے قرآن قرآن کرتے ہیں پھر اس قرأت کے ثواب کو پہنچانے کی غرض سے قل وغیرہ کی مجلس کا انعقاد ہوتا ہے جس میں پیش امام طعام کو سامنے رکھ کر چند آیات قرآنی متعدد مقامات سے تلاوت کرنے کے بعد حاضرین سے قرأت قرآن کا اجر و ثواب وصول کر کے مرنے والے کو دعا کے ذریعہ بخشا ہے۔

ایمان سے کہنا کہ اس عمل کو اثر انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے دور کا بھی کوئی تعلق و واسطہ ہے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں، تو پھر نامعلوم کہ مفتی صاحب نے کس مناسبت سے اسے یہاں بیان کر دیا ہے، غالباً انہوں نے قرأت کے بعد دعا کو مکمل استدلال بنایا ہے، حالانکہ تلاوت قرآن کے بعد دعا نہ ہی تو موضوع بحث ہے اور نہ ہی اس سے مبتدعین کا عمل ثابت ہوتا ہے

ثانیاً۔ حکم بن عتیبة کے قول کو نقل کرنے میں بھی مفتی صاحب نے متعدد اغلاط کی ہیں۔

تفصیل میں جانے سے قبل آئیے پہلے اصل عبارت ملاحظہ کریں۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ

واخرج ابن ابی داود عن الحكم بن عتيبة قال ارسل الى مجاهد و عنده ابن

ابی امامة و قالوا انا ارسلنا اليك لانا اردنا ان نختم القرآن، والدعا يستجاب عند

ختم القرآن .

یعنی ابن ابی داؤد نے حکم بن عتیبة سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا مجھے مجاہد نے پیغام بھیجا

اور میں گیا تو ان کے پاس ابن ابی امامہ بھی موجود تھے، مجاہد اور ابن ابی امامہ دونوں نے مجھ سے کہا

ہم نے تم کو اس لئے بلوایا ہے کہ ہم قرآن ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ بحوالہ اتقان فی علوم القرآن ص ۱۳۵ ج ۱۔

دیکھئے مفتی صاحب نے (۱) حکم کو حکیم بنادیا (۲) عتیبہ کو عتبہ لکھ دیا، (۳) ابن ابی امامہ کو ابن ابی لبابہ سے بدل دیا (۴) وعبدہ کو اپنی طرف سے داخل کر دیا (۵) اور ارسل الی، کا معنی ایک مجمع کو مجاہد وعبدہ ابن ابی لبابہ نے بلایا، کیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ ہے جناب مبتدعین کا شیر بہادر حکیم الامت جو عربی کی ڈیڑھ سطر سمجھنے کی بھی لیاقت نہیں رکھتا، اسے کہتے ہیں ع۔ لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔

حالت: مبتدعین کی رسم قل وغیرہ میں تین چیزیں اس کی جزو تصور کی جاتی ہیں جن کے بغیر یہ حضرات ختم کو ناقص و ادھورا تصور کرتے ہیں (۱) تعین ایام (۲) قرأۃ قرآن (۳) اور دعا کے ذریعہ ثواب پہنچانا، لیکن زیر بحث روایات کو اگر درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو تب بھی ان کے مذعوم دعوے ثابت نہیں ہوتے، کیونکہ زیر بحث روایات میں نہ ہی تو کسی کو ثواب بخشنے کا بیان ہے اور نہ ہی تعین ایام، خواہ عرفی ہی ہوں، کا تذکرہ ہے اور نہ ہی میت کو ثواب بخشنے کی غرض سے تلاوت قرآن کا بیان ہے اس کے باوجود حضرت مفتی صاحب اسے کھینچ تان کے یہ باور کرانے کے درپہ ہیں کہ تیجہ وچہلم کا اجتماع سنت سلف ہے، جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ۱۔

اے جی بتاؤ مذکورہ روایات کے کن الفاظ کا یہ معنی ہے جسے آپ سلف صالحین کی سنت قرار دے رہیں ہیں؟

چوتھی دلیل

در مختار بحث قرأة للمیت باب الدفن میں ہے،

فی الحدیث من قرء الاخلاص احد عشر مرة ثم وهب اجرها للاموات اعطى من الاجر بعدد الاموات.

حدیث میں ہے کہ جو شخص گیاراں بار سورۃ اخلاص پڑھے پھر اس کا ثواب مردوں کو بخشے تو اس کو تمام مردوں کے برابر ثواب ملے گا۔ جاء الباطل ص ۲۶۳ ج ۱۔
شامی میں اسی جگہ ہے،

و یقرء من القرآن ما تیسر له من الفاتحة و اول .

جو ممکن ہو قرآن پڑھے، سورۃ فاتحہ بقرہ کی اول آیات اور آیت الکرسی اور امن الرسول اور یس اور ملک اور سورۃ تکاثر اور سورۃ اخلاص بارہ یا گیارہ یا سات یا تین دفعہ پھر کہے کہ یا اللہ جو کچھ میں نے پڑھا اس کا ثواب فلاں کو یا فلاں لوگوں کو پہنچا دے۔

الجواب

اولاً۔ صاحب در مختار نے روایت کے درست الفاظ نقل نہیں کیئے جبکہ درست الفاظ یہ ہیں کہ
من مر علی المقابر فقرأ قل هو الله أحد إحدى و عشرين مرة ثم وهب اجره للاموات اعطى بعدد الاموات.

فردوس الاخبار للذیلی ص ۳۸ ج ۴، و تذکرۃ الموضوعات ص ۲۹۲۔

اور بعض روایات میں، احدی وعشرين، کی بجائے، احد عشرة، کے الفاظ ہیں، کنز العمال (۴۲۵۸۹) ص ۲۷۶۔ ۱۵۴ مطبوعہ نشر السنۃ لمطان و کشف الخفا ص ۲۸۲ ج ۲، و سلسلہ احادیث الضعیفہ ص ۴۵۲ ج ۵۳۔

ظاہر ہے کہ یہ روایت متن کے لحاظ سے مضطرب ہے۔

ثانیاً: اس کی سند میں دو راوی، عبد اللہ بن احمد اور اس کا والد احمد بن عامر الطائی ہیں، تسدید القوس علی هامش مسند فردوس ص ۳۸ ج ۴،

اور یہ دونوں کذاب راوی ہیں جیسا کہ امام سخاوی کے حوالے سے علامہ البانی نے بیان کیا ہے، سلسلہ احادیث الضعیفہ (۱۲۹۰) علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال ۳۹۰ ج ۲ میں اور علامہ محمد طاہر فتنی نے قانون الموضوعات و الضعفاء ص ۲۳۶، ۲۷۱، میں صراحت کی ہے کہ عبد اللہ بن احمد بن عامر کے والد کے پاس ایک مجموعہ باطل تھا جس سے وہ آئمہ اہل بیت سے من گھڑت روایات نقل کرتا تھا جس کی کوئی اصل نہ تھی اور احمد بھی وہی روایات نقل کرتا ہے۔

الغرض یہ روایت من گھڑت اور بے اصل ہے، جو اس کی صحت کا مدعی ہے، وہ عبد اللہ اور اس کے والد احمد کی عدالت و ثقافت ثابت کرے، تو ہم اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔

علامہ البانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

اگر اس روایت کی کوئی اصل ہو تو یہ موضوع بحث میں حجت ہوگی جس سے اختلاف ختم ہو جائے گا (یعنی ہم قبول کر لیں گے) سلسلہ احادیث الضعیفہ ص ۴۵۳ ج ۳۔

ثالثاً: اس روایت میں تو یہ ہے کہ، من مر علی المقابر، جو شخص قبرستان سے گزرے، تو وہ گیارہ بار قل ھو اللہ، پڑھ کر اموات کو ثواب بخشے۔

صاحب درمختار اور اس کے شارح علامہ شامی نے بھی، فتاویٰ شامی ص ۲۴۳ ج ۲، میں اسے زیارت قبور کے بارے میں کہا ہے مگر ہمارے مفتی صاحب اس من گھڑت روایت سے کھانے پر قرأۃ ثابت کر کے ختم کا ثبوت دے رہے ہیں، جو کہ ان کی زیادتی ہے، کیونکہ روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو مبتدعین کے عمل کی دلیل بن سکے کہ تعین ایام کے ساتھ میت کے ورثا ایک محفل قل وغیرہ کی منعقد کر کے ختم دلوائیں اور قرأۃ قرآن کروا کر میت کی روح کو ثواب پہنچائیں۔

رابعاً: یہ من گھڑت روایت سنت متواترہ کے مخالف و معارض ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو قبرستان جانے کے لئے مسنون دعا، اسلام علیکم الخ مشکوٰۃ ص ۱۵۴، سکھائی ہے۔

خامساً: اسی طرح جو مفتی صاحب نے، فتاویٰ شامی، سے عبارت نقل کی ہے کوئی حدیث مرفوع نہیں، نہ ہی وہ کسی صحابی کا فتویٰ ہے بلکہ علامہ شامی نے اسے، شرح اللباب، سے نقل کیا ہے، فتاویٰ شامی ص ۲۴۳ ج ۲۔

اور یہ بات کسی شک شبہ سے بالاتر ہے کہ شارح، صاحب اللباب، کا قول کوئی دلیل شرعی

نہیں جو مفتی صاحب خصم کو باور کرا رہے ہیں۔

تنبیہ

حضرت مفتی صاحب کو جب من گھڑت روایات کے کیسہ دلائل سے مروجہ ختم ہوتا نظر نہ آیا تو انہوں نے عبارات اکابر کو اپنا مدگار و معاون جان کر انہیں نقل کر دیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے یہ لکھا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نتیجہ ہوا تھا۔
- جاء الباطل ص ۲۶۳ ج ۱ -

حالانکہ تعین ایام کو خود حضرت شاہ عبدالعزیز بدعت سے تعبیر کرتے ہیں، فتاویٰ عزیزی ص ۹۳ ج ۱ -

اور حضرت شاہ ولی اللہ کا اگر کسی نے بفرض محال نتیجہ کیا ہے تو اس سے مسئلہ کیسے ثابت ہو گیا، لوگ تو امام حسین رضی اللہ عنہ کا ماتم بھی کرتے ہیں! تو کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ماتم کرنا یا ماتم کرنے کا جواز ثابت ہو جائے گا، ہرگز نہیں، اسی طرح اگر کسی نے حضرت شاہ ولی اللہ کا نتیجہ کیا ہے تو حضرت کا دامن اس سے صاف ہے، کیونکہ حضرت نے کھل کر اس کی تردید کی ہے، دیکھئے فقہیمات ص ۲۲۷ ج ۲ -

SCANNED BY : MUHAMMAD SHAKIR

COMMENTS, CONTACT: truemaslak@inbox.com

شریعت میں مکاشفہ کی حیثیت

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

مولوی محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند، تحذیر الناس ص ۲۴ پر فرماتے ہیں کہ جنید کے کسی مرید کا رنگ یکا یک متغیر ہو گیا، آپ نے سبب پوچھا تو بروے مکاشفہ اس نے یہ کہا کہ اپنی ماں کو دوزخ میں دیکھتا ہوں حضرت جنید نے ایک لاکھ پانچ ہزار بار کلمہ پڑھا تھا۔ یوں سمجھ کر بعض روایات میں اس قدر کلمے کے ثواب پر وعدہ مغفرت ہے، آپ نے جی ہی جی میں اس مرید کی ماں کو بخش دیا اور اس کی اطلاع نہ دی، بخشتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ وہ جوان ہشاش بشاش ہے، آپ نے سبب پوچھا اس نے عرض کیا کہ اپنی ماں کو جنت میں دیکھتا ہوں، آپ نے اس پر فرمایا کہ اس جوان کے مکاشفہ کی صحت تو مجھ کو حدیث سے معلوم ہوئی اور حدیث کی تصحیح اس کے مکاشفہ سے ہوگئی،

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کلمہ طیبہ ایک لاکھ پانچ ہزار بخشتے سے مردے کی بخشش کی امید ہے اور تیجہ میں جنوں پر یہ ہی پڑھا جاتا ہے، تمام عبارات سے فاتحہ اور تیجہ وغیرہ کے تمام مراسم کا جواز معلوم ہوا، جاء الباطل ص ۲۶۴ ج ۱۔

اولاً: معلوم ہوا کہ ولی اللہ عالم الغیب نہیں ہوتے، تب ہی جنید کو بار بار پوچھنا پڑا کہ حالت غیر کیوں ہے اور اب ہشاش و بشاش کیوں ہو۔

ثانیاً: یہ نقل مطابق اصل نہیں کیونکہ، تحذیر الناس، میں ایک لاکھ یا پچھتر ہزار (۷۵) کے الفاظ ہیں، صفحہ ۴۴، یعنی ایک لاکھ بخشا، یا ۷۵ ہزار مفتی صاحب غالباً اردو عبارت سمجھنے کی بھی لیاقت نہیں رکھتے تھے کہ فقرہ، ایک لاکھ یا پچھتر ہزار بار کبھی کلمہ پڑھا تھا، سے یہ کشید کر لیا کہ ڈیڑھ لاکھ کلمہ طیبہ کبھی پڑھا تھا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثالثاً: یہ قصہ محض بے سند اور بریلوی مکتب فکر جیسی سوچ رکھنے والے لوگوں کا گھڑا ہوا ہے اسے ہم دین کا ایک حصہ و جزو کس دلیل سے بنالیں، جب کہ مولانا قاسم صاحب نے بھی اسے بے دلیل نقل کیا ہے۔

رابعاً: اس حکایت بیہودہ میں جو روایت نقل کی گئی ہے وہ بھی محض سینہ گزٹ ہے حدیث کی

کسی کتاب میں اس کا قطعاً وجود نہیں، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو اسے ثابت کریں ورنہ آئندہ کبھی اس کا نام نہ لینا۔

خامساً: کشف و مکاشفہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کو کسی دینی و شرعی معاملہ میں بطور حجت و سند تسلیم کر لیا جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ
 لم یبق من النبوة الا المبشرات، قالوا، وما المبشرات؟ قال، الرؤيا الصالحة.
 یعنی نبوت سے کچھ بھی باقی نہیں رہا، مگر مبشرات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ
 حضور ﷺ مبشرات کیا ہیں؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ نیک خواب۔
 صحیح بخاری (۶۹۹۰) باب المبشرات۔

یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، ام کرز رضی اللہ عنہا،
 حذیفہ رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا، اور انس رضی اللہ عنہ، جیسے جلیل القدر حضرات صحابہ کرام
 رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے، فتح الباری ص ۳۱۶ ج ۱۲، ادوا الغلیل (۲۵۳۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جسے وحی سے مناسبت رہی ہو مگر سچے
 خواب، اور یہ ظاہر ہے کہ کشف و مکاشفہ اور الہام وغیرہ خواب نہیں کیونکہ یہ حالت بیداری میں
 ہوتے ہیں جبکہ خواب کا معاملہ نیند سے تعلق رکھتا ہے، تو ثابت ہوا کہ کشف و الہام بے اصل اور
 شیطانی وسوساں ہوتے ہیں، جو وہ اپنے پیاروں اور یاروں کے دلوں میں ڈالتا ہے اگر خواب کے علاوہ
 بھی کوئی چیز وحی سے مناسبت رکھنے والی باقی ہوتی تو نبی ﷺ بیان فرماتے، مگر آپ علیہ السلام نے تو
 فقط خواب میں ہی حصر فرمادیا کہ اس کے علاوہ باقی کچھ رہا ہی نہیں۔

لہذا مفتی صاحب کا مکاشفہ وغیرہ پیش کر کے کلمہ طیبہ کا ایصال ثواب ثابت کرنا، سودمند نہیں۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

فرماتے ہیں کہ، مشکوٰۃ باب آداب طعام میں ہے کہ حضور علیہ السلام جب کھانے سے فارغ
 ہوتے تو فرماتے،

الحمد لله حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه غير مكفئ ولا مودع ولا مستغنا عنه ربنا،

جس سے معلوم ہوا کہ کھانے کے بعد دو چیزیں مسنون ہیں حمد الہی کرنا اور صاحب طعام کے لئے دعا کرنا اور فاتحہ میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں، اور غالباً اس قدر کا انکار مخالفین بھی نہیں کرتے ہوں گے، رہا کھانا سامنے رکھ کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا اس کی بہت سی احادیث آئی ہیں، مشکوٰۃ باب المعجزات فصل دوم میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کچھ خڑے حضور علیہ السلام کی خدمت میں لایا اور عرض کیا کہ اس کے لئے دعائے برکت فرمادیں۔

فضمهن ثم دعا لى فيهن بالبركة .

آپ نے ان کو ملایا اور دعائے برکت کی۔ جاء الباطل ص ۲۶۴ ج ۱۔

کیا کھانے کے بعد کی دعا مسنون سے ختم ثابت ہوتا ہے؟ الجواب

اولاً: کھانا کھا کر اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرنا اور دعوت کرنے والے کیلئے نیک دعا کرنا محل بحث سے خارج ہے کیونکہ اختلاف تو ہے تیجہ وغیرہ سے، جسے آپ حضرات دن تعین کر کے کھانا وغیرہ پر قرأت قرآن کرتے ہیں اور آخر میں دعا کے ذریعہ سے ایصال ثواب کرتے ہیں، اسی طرح دوسری حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں بھی ایصال کا ثواب کی غرض سے دعا کرنے کا بیان نہیں بلکہ بطور برکت آنحضرت ﷺ کے دعا کرنے کا ذکر ہے اور یہ چیز محل نزاع سے خارج ہے۔

ثانیاً: جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ مذکورہ روایات میں دعا ایصال ثواب کی غرض سے نہ تھی، تو اب سنیے کہ ان روایات کو تیجہ و دسواں وغیرہ رسوم سے کوئی تعلق و واسطہ ہی نہیں کیونکہ نہ تو یہ کسی کے وصال پر ایسا ہوا ہے اور نہ ہی محفل تیجہ میں قرآن خوانی کا ذکر ہے اور نہ ہی تعین ایام کا ذکر ہے بلکہ یہ روایت تو تعین ایام کو رد کرتی ہے کیونکہ اس کے ابتدائی الفاظ کچھ اس طرح کے ہیں۔

کان اذا رفع مائدته .

یعنی جب کھانا کھا کر فارغ ہوتے تو تب یہ کلمات پڑھتے تھے۔ بخاری (۵۴۵۸) و مشکوٰۃ ص ۳۶۵۔

حضرت امام بخاری نے اس پر عنوان ، باب ما یقول اذا فرغ من طعامہ ، قائم کیا ہے بلکہ امام ابو عاصم کی روایت میں ، اذا فرغ من طعامہ ، کے الفاظ ہیں ، بخاری (۵۴۵۹) اس ساری بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ آنحضرت ﷺ جب بھی کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ کلمات پڑھا کرتے تھے ، کسی جگہ وقت کا تعین نہ تھا۔

مگر کمال ہے کہ حضرت مفتی صاحب اس سے تیجہ وغیرہ کی رسوم ثابت کرنے کے درپے ہیں ، سوال یہ ہے کہ اگر اس دعا سے مبتدعین کی بدعت تیجہ وغیرہ ثابت ہوتی ہے ، تو کیا یہ حضرات جب بھی کھانا کھاتے ہیں ، کسی کا تیجہ ہی کر کے کھاتے ہیں ، اگر نہیں یقیناً نہیں تو پھر یہ مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی ، اگر بدعتی صبح کا ناشتہ ، دوپہر کا کھانا اور ڈینر کھا کر یہ مسنون دعا کرے یا مفتی صاحب کا کوئی مرید کسی کی دعوت ولیمہ تناول فرما کر مذکورہ دعا مانگے تو کیا وہ تیجہ و دسواں وغیرہ ہو جائے گا؟ قطعاً نہیں۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

مشکوٰۃ باب المعجزات فصل اول میں ہے کہ غزوہ تبوک میں لشکر اسلام میں کھانے کی کمی ہوگئی حضور علیہ السلام نے تمام اہل لشکر کو حکم دیا کہ جو کچھ جس کے پاس ہو لاؤ سب حضرات کچھ نہ کچھ لائے ، دسترخوان بچھایا گیا اس پر یہ سب رکھا گیا۔

فدعاء رسول اللہ ﷺ بالبرکۃ ثم قال خذوا فی او عیتکم۔

پس اس پر دعا فرمائی اور فرمایا کہ اب اس کو اپنے برتنوں میں رکھ لو ، اسی مشکوٰۃ اسی باب میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کچھ کھانا بطور ولیمہ پکایا ، لیکن بہت لوگوں کو بلایا گیا۔

فراءیت النبی ﷺ وضع یدہ علی تلک تحدیسة و تکلم بما شاء اللہ ۔

اس کھانے پر دست مبارک رکھ کر حضور علیہ السلام نے کچھ پڑھا۔

اسی مشکوٰۃ کے اسی باب میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے غزوہ خندق کے دن کچھ تھوڑا

کھانا پکا کر حضور علیہ السلام کی دعوت کی حضور علیہ السلام ان کے مکان پر تشریف لائے ،
فاخر جت له عجیناً فبصق فیہ وبارک .

آپ کے سامنے گندھا (لفظ 'گوندھا' ہے ، ارشد) آنا پیش کیا گیا تو اس میں لعاب شریف
ڈالا اور دعائے برکت کی ۔

اس قسم کی بہت سی روایات پیش کی جاسکتی ہیں مگر اتنے پر کفایت کرتا ہوں ، جاء الباطل ص

۱۷۲۶۵

کیا معجزہ احکام میں دلیل شرعی ہے؟

الجواب

اولاً: یہ تو آنحضرت ﷺ کے معجزات کے قبیل کی احادیث ہیں ، انہیں تیجہ وغیرہ کی رسوم
سے کیا نسبت ، کیونکہ احکام شرعیہ میں معجزات حجت نہیں ہوتے ، جو اس کا مدعی ہے کہ احکام میں بھی
معجزہ معتبر ہے ، وہ دلیل شرعی پیش کرے ، کیونکہ معجزہ کا تعلق خاص نبی سے ہوتا ہے ، جو اللہ تعالیٰ کا
فعل نبی کے ہاتھوں پر صادر ہوتا ہے ، اسے معجزہ کہتے ہیں اور اس کا نبی سے خاص ہونا مبتدعین کو
بھی مسلم ہے ورنہ یہ لوگ تیجہ وغیرہ کی رسوم میں کھانے میں اپنا لعاب و تھوک کیوں نہیں ڈالتے جبکہ
اسی حدیث میں آنحضرت ﷺ کا گوندھے ہوئے آٹے میں لعاب ڈالنا ثابت ہے ۔

ثانیاً: کھانے پر آنحضرت ﷺ کی دعا برکت کیلئے تھی ، کسی کو ایصال ثواب پہنچانے کی غرض
سے نہ تھی ، جیسا کہ مبتدعین کا عمل ہے ، تو پھر یہ مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی ، جب کہ دونوں کے
درمیان واضح فرق ہے ۔

ثالثاً: یہ کسی کے مرنے پر دن وغیرہ مقرر کر کے نہ تو قرآن و غیرہ کا ذکر ہے اور نہ ہی
ایصال ثواب کا بیان ہے ، بلکہ یہ تو برکت کی غرض سے دعا تھی ۔

جسے مفتی صاحب کھنچ تان ایصال ثواب کی طرف لے آئے ہیں ، فرض کیجئے کہ زید کے پاس
کل پونجی دس روپے رہ جاتی ہے اور وہ دعا کرتا ہے کہ اے میرے مالک و خالق ان میں برکت ڈال

تو کیا مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند پارٹی اسے تیجہ وقل کہے گی، نہیں ہرگز نہیں، کیونکہ برکت کی دعا اور ایصال ثواب میں بعد المشرقین ہے، اور ان کا آپس میں سرے سے کوئی تعلق و واسطہ ہی نہیں۔

ساتویں دلیل

جس کیلئے دعا کرنا ہو اس کو سامنے رکھ کر دعا کرنا چاہیے، جنازے میں میت کو سامنے رکھ کر نماز جنازہ پڑھتے ہیں، کیونکہ اسی کیلئے دعا ہے، اس کو سامنے رکھ لیا، اسی طرح سامنے کھانے کو رکھ کر دعا کی تو کون سی خرابی ہے، اسی طرح قبر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا پڑھتے ہیں، حضور علیہ السلام نے اپنی امت کی طرف سے قربانی فرما کر مذبحہ جانور سامنے رکھ کر پڑھا۔

اللهم هذا من امة محمد،

اے اللہ یہ قربانی میری امت کی طرف سے ہے۔

حضرت خلیل اللہ نے کعبہ کی عمارت سامنے لے کر دعا کی۔

ربنا تقبل منا۔

اب بھی عقیدہ کا جانور سامنے رکھ کر ہی دعا پڑھی جاتی ہے، لہذا اگر فاتحہ میں بھی کھانا سامنے رکھ کر ایصال ثواب ہو تو کیا حرج ہے، جا الباطل ص ۲۶۶ ج ۱۔

کیا قربانی کی دعا سے ختم ثابت ہوتا ہے؟

الجواب

اولاً: ان افعال میں کسی کو ایصال ثواب کرنے کی غرض سے دعا کرنا مقصود نہیں بلکہ اپنے عمل کو قبول کرنے کی اپنے رب سے التجاء ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کو تعمیر کرتے وقت دعا کی تھی ایسے ہی نماز جنازہ میں بخشش کی دعا ہے ناکہ کسی کو ایصال ثواب کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

ثانیاً: عقیدہ کے وقت جانور کو پیش کر کے دعا کرنے کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہاں اگر کوئی احیاناً ایسا کر دے کہ اے میرے مالک قبول فرما تو اس میں بھی اس کا مقصود ایصال ثواب کرنا نہیں بلکہ

اپنے عمل حسنہ کو قبول کرنے کی التجا ہے، ثم اقول، عقیقہ کا نام کس منہ سے لیتے ہو اسے تو آپ کے امام ابو حنیفہ جاہلیت کی رسم کہتے ہیں۔ تاریخ بغداد ص ۴۱۱ ج ۱۳۔
امام محمد فرماتے ہیں کہ

ولا يعق عن الغلام وعن الجارية،

یعنی عقیقہ نہ بچے کی طرف سے کیا جائے اور نہ ہی بچی کی طرف سے، الجامع الصغیر ص ۵۳۴۔
مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی فرماتے ہیں کہ اس عبارت کا مقصود یہ ہے کہ عقیقہ غیر مشروع یا مکروہ ہے، التعلیق المجدد ص ۲۸۸ حاشیہ ۱۲۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب بدائع الصنائع میں علامہ کاسانی فرماتے ہیں کہ

و ذكر في الجامع الصغير ولا يعق عن الغلام ولا عن الجارية وانه اشارة الى الكراهة.

یعنی جو امام محمد نے الجامع الصغیر میں کہا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عقیقہ مکروہ ہے، بدائع الصنائع ص ۶۹ ج ۵، و فتاویٰ عالمگیری ص ۳۶۲ ج ۵۔

حاشیہ: قربانی کرتے وقت جو دعا رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، اس پر بفضلہ تعالیٰ اہل حدیث عمل پیرا ہیں، مگر اس سے آپ کا رسم قل ثابت کرنا سینہ زوری ہے کیونکہ یہ دعا و التجا اللہ سے اپنے عمل کو قبول کرنے کی تھی ناکہ کسی کو ایصالِ ثواب کی غرض سے تھی اور اس پر حدیث کے الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ امر بكبش اقرن يطاء في سواد و يبرك في سواد و ينظر في سواد فاتى به ليضحى به قال فقال لها عائشة هلمى المديية ثم قال اشحذىها بحجر ففعلت ثم اخذها واخذ الكبش فاضجعه ثم ذبحه ثم قال باسم الله اللهم تقبل من محمد و آل محمد و من امة محمد ثم ضحى به .

رسول اللہ ﷺ نے ایک سیننگدار مینڈھا لانے کا حکم فرمایا، جو سیاہی میں چلتا ہو، اور سیاہی میں بیٹھتا ہو، اور سیاہی میں دیکھتا ہو، چنانچہ ایسا مینڈھا قربانی کیلئے لایا گیا، آپ علیہ السلام نے

فرمایا کہ اے عائشہ چھری لاؤ، پھر فرمایا پتھر سے تیز کر دے، میں نے تیز کر دی تو آپ علیہ السلام نے چھری لے لی، مینڈھے کو پکڑا پھر اسے لٹایا اور ذبح کیا، اور فرمایا کہ

باسم اللہ تقبل من محمد و آل محمد و من امة محمد،

چنانچہ اس طرح سے آپ نے قربانی کی۔ صحیح مسلم ص ۱۵۶ ج ۲، و ابو داؤد ص ۳۰ ج ۲، ابن حبان (۵۸۸۵)، و تہذیب ص ۲۸۶ ج ۹۔

یہ حدیث اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قربانی نبی کریم ﷺ نے گھر میں دی تھی جہی تو حضرت اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو چھری اور اس کو تیز کر کے لانے کا حکم فرمایا، پھر اس قربانی میں جہاں آپ علیہ السلام خود شریک تھے وہاں ہی امہات المؤمنین اور دیگر اہل بیت اور امت اسلامیہ بھی شریک تھی جس پر حدیث کے الفاظ،

اللہم تقبل من محمد و من آل محمد و من امة محمد،

دلائل کرتے ہیں، اور یہ چیز زندوں کی طرف سے قربانی ثابت کرتی ہے نہ کہ مردوں کی جانب سے جو ایصال ثواب کا معاملہ پیش آیا۔

امت مرحومہ کے جلیل القدر آئمہ کرام نے بھی اس سے یہی سمجھا ہے اور ایصال ثواب کی بجائے یہ ثابت کیا ہے کہ پورے گھرانے کی طرف سے ایک ہی قربانی کفایت کر جاتی ہے۔

تفصیل کیلئے دیکھئے، نووی شرح مسلم ص ۱۵۶ ج ۲، و تحفۃ الاحوذی ص ۳۵۸، و مرعاة ص ۵۷ ج ۵۔

لیکن مبتدعین کی عیاریاں دیکھئے کہ جو چیز اس سے ثابت ہوتی ہے اسے تو یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ صاف کہتے ہیں کہ پورے گھرانے کی طرف سے ایک قربانی کرنی درست نہیں اور نہ ہی پورے اہل بیت کی طرف سے ایک قربانی کفایت کرتی ہے۔

چنانچہ دشمن توحید و سنت مجدد بدعات مولوی احمد رضا خاں سے سوال کیا جاتا ہے کہ قربانی ولی کرے تو سب گھروالوں کی طرف سے ہو جائے گی؟

الجواب: ایک قربانی نہ تو سب گھروالوں کی طرف سے ہو سکتی ہے نہ سوا مالک نصاب کے کسی اور پر واجب ہے، فتاویٰ رضویہ ص ۳۹۲ ج ۸۔

امام طحاوی حنفی نے مذکورہ حدیث کا یہ مفہوم تسلیم کر کے پھر اس کا یہ رد تحریر کیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے یا آنحضرت ﷺ سے مخصوص ہے، شرح معانی الآثار ص ۳۳۳ ج ۲

امام طحاوی کے دعویٰ نسخ کا رد تو محدث مبارک پوریؒ نے بخوبی کیا ہے، جس کا جواب ممکن نہیں، تحفۃ الاخوان ص ۳۵۸ ج ۲۔

لیکن ہم نے جو بات یہاں عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اس روایت کا تعلق ایصالِ ثواب کی بجائے پورے گھر کی طرف سے ایک قربانی کفایت کرنے سے ہے۔ امام طحاوی نے بھی اس کا یہی مفہوم تسلیم کیا ہے، اگر اسکا ایصالِ ثواب سے کوئی تعلق ہوتا تو امام طحاوی اس کی صراحت کرتے۔

باقی رہا امت کی جانب سے قربانی کرنا تو یہ آنحضرت ﷺ سے خاص ہے جس کی ضروری تفصیل محدث مبارک پوریؒ نے عرض کر دی ہے جہاں تک راقم کے مطالعہ کا تعلق ہے کسی قابل ذکر عالم نے اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا کہ کوئی عامی بھی امت کی طرف سے قربانی کر سکتا ہے امت مرحومہ کا یہ تعامل ثابت کر رہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے خاص ہے۔

رابعاً۔ حنفیہ کا اس حدیث کے بارے میں یہی موقف ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

جیسا کہ امام طحاوی نے، شرح معانی الآثار ص ۳۳۳ ج ۲، میں بیان کیا ہے، تو کیا کسی منسوخ حکم سے بھی استدلال کرنا درست ہے؟

خامساً۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قربانی کرنے والا ذبح کے وقت تکبیر و تسبیح کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اللھم تقبل منی (یعنی الہی میری طرف سے اس قربانی کو قبول کیجئے) مگر مبتدعین جس امام کی تقلید کا دعویٰ کرتے ہیں میری مراد ان سے ابو حنیفہ ہے ان کا کہنا ہے کہ ایسے کلمات کا کہنا مکروہ ہے، نووی شرح مسلم ص ۲۵۶ ج ۲۔

امام صاحب کا یہ فتویٰ باوازا بلند کہہ رہا ہے کہ مفتی صاحب کے محل استدلال کے الفاظ کو ان کے مذعومہ پیشوا ماننے کو تیار نہیں۔

مگر کمال ہے کہ حضرت مفتی صاحب اپنے امام کے فتویٰ کے خلاف دعویٰ کر کے خود کو غیر مقلدوں کی صف میں شامل کر رہے ہیں حالانکہ ان کا قول ہے کہ غیر مقلدیت مردودوں کا راستہ ہے، جاء الباطل ص ۲۵۴ ج ۲۔

یہ بات ہم مبتدعین پر چھوڑتے ہیں کہ مفتی صاحب اپنے امام کی تقلید کو ترک کر کے مردود بن گئے تھے یا نہیں؟ ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

عقلی دلیل

فرماتے ہیں کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے فاتحہ دو عبادتوں کے مجموعہ کا نام ہے تلاوت قرآن اور صدقہ، اور جب یہ دونوں کام علیحدہ علیحدہ جائز ہیں تو ان کو جمع کرنا کیوں حرام ہوگا، بریانی کھانا کہیں بھی ثابت نہیں مگر حلال ہے کیوں اس لئے کہ بریانی چاول گوشت گھی وغیرہ کا مجموعہ ہے، اسکے سارے اجزاء حلال تو بریانی بھی حلال، جاء الباطل ص ۲۶۵ ج ۱۔

الجواب:

اولاً۔ بحث عرس میں ہم نے اس ضابطہ پر کھل کر بات کی ہے کہ دو چیزوں کے مل جانے سے چونکہ کیفیت بدل جاتی ہے اور کیفیت بدل جانے سے حکم شرعی بھی بدل جاتا ہے، اسے وہاں ہی ملاحظہ کر لیا جائے، رہا مفتی صاحب کا بریانی کی مثال دینا، تو یہ بھی ہمارے موقف کی تائید ہے، بھائی اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھنے کی توفیق عطا کرے، چاول، گھی اور گوشت وغیرہ جب علیحدہ علیحدہ تھے تو بریانی نہ تھی جب ان کا مجموعہ تیار ہو گیا تو اسے بریانی کا نام دے دیا گیا، گویا ان کی صورت بدلنے سے ان کا نام بھی بدل گیا۔

ثانیاً۔ مبتدعین پر لازم ہے کہ کسی صحیح حدیث سے مردہ کیلئے بطور ایصال ثواب قرآن پڑھنا ثابت کریں، یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، اسی طرح صدقہ کو دن مقرر کر کے کرنا بھی ان پر آج تک ادھار ہے، حضرت جی یہ تو منفرد بھی ثابت نہیں مگر آپ اس کے مجموعہ کی بات کرتے ہیں، حضرت جی پہلے ان کا انفرادی طور پر کرنا تو ثابت کیجئے، مجموعہ کی بات بعد میں ہوگی۔

اور میت کیلئے قرآن خوانی کی جو روایت آپ نے بحوالہ درمختار پیش کی ہے اسکی حقیقت پہلے عرض کر دی گئی ہے کہ یہ من گھڑٹ اور افتراء علی الرسول کے قبیل سے ہے۔

مفتی صاحب کا ایک سوال

قرآن کریم تو مسلمانوں کیلئے رحمت اور شفاء ہے، شفاء و رحمة للمؤمنین، پھر اگر اسکی تلاوت کر دینے سے کھانا حرام ہو جائے تو قرآن رحمت کہاں رہا، زحمت ہوا، مگر ہاں مؤمنین کیلئے رحمت ہے کفار کیلئے زحمت۔

ولایزید الظلمین الا خساراً۔

اس سے ظالم تو نقصان میں رہے ہیں کہ اس کے پڑھے جانے سے کھانے سے محروم ہو گئے، جاء الباطل ص ۲۶۶ ج ۱۔

کیا قراۃ قرآن مبتدعین کے لیے رحمت ہے؟

الجواب: اولاً۔ حقیقت ہے کہ مفتی صاحب نے نہایت غلط بات کہہ کر منکرین بدعات پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے، حالانکہ محض قرآن کی تلاوت سے ہم کھانے کو حرام نہیں کہتے بلکہ آپ کی رسومات بدعت ہونے کی وجہ سے حرام کہتے ہیں، کیونکہ یہ دین میں نیا کام ہے اور دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے جیسا کہ ابتدا میں ہم عرض کر چکے ہیں، حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

جو امام کے پیچھے قراۃ کرے اس کے منہ میں آگ ہو، جاء الباطل ص ۳۰ ج ۲۔

کیوں جناب قرآن تو رحمت ہے آپ اس کی تلاوت سے منہ میں آگ کیسے دے رہے ہیں۔ حالانکہ امام کے پیچھے سورت فاتحہ کی قرات واجب ہے۔

فما کان جو ابکم فہو جو ابنا۔

خاکسار کو رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ احمد یار مفتی اعظم اور مفسر قرآن بلکہ حکیم الامت وغیرہ ہو کر بھی غلط بیانی کرتے ہوئے شرم و حیا محسوس نہیں کرتا؟ آئیے مذکورہ آیت قرآن کو ملاحظہ کریں ارشاد ہوتا ہے،

وَنُزِّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا،

سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۲،

اور ہم (اللہ) قرآن کو ایمانداروں کی شفا اور رحمت کرتے ہیں اور ظالم اس سے سراسر نقصان ہی اٹھاتے ہیں (ثانی) ۸۲-۱۷،

قارئین کرام غور کیجیے اللہ تعالیٰ کیا کہہ رہا ہے اور مفتی کیا بتا رہے ہیں آئیے ہم آپ کو قرآن کے الفاظ کا مفہوم بتائیں، اللہ آپ کو سمجھنے کی توفیق عطا کرے، بریلوی بھائیوں ضد اور تعصب کی پٹی اتار کر ملاحظہ کرو،

قرآن کو اللہ نے شفاء و رحمت کہا، کیوں؟ اس لیے کہ جن لوگوں نے کتاب اللہ کو مان کر اسے اپنا دستور العمل بنا لیا ان کے لئے تمام ذہنی، نفسانی، اخلاقی، تہذیبی، کفر و شرک اور نفاق جیسی من گھڑت امراض کا علاج ہے، مگر جو ظالم اسے رد کر کے اور اس کی رہنمائی سے منہ موڑ کر اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں وہ خسارے میں جاتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ قرآن کے نزول سے قبل جب تک وہ اس سے واقف نہ تھے، ان کا خسارہ محض جہالت کا خسارہ تھا مگر قرآن نے نازل ہو کر حق و باطل میں فرق کر دیا تو ان پر تمام حجت ہو گئی، اب اگر وہ اسے رد کر کے گمراہی پر اصرار کرتے ہیں، تو وہ جاہل نہیں بلکہ ظالم و باطل پرست ہیں، اب ان کی حیثیت جاہل کی نہیں بلکہ اس شخص کی سی ہے جو زہر اور تریاق کو دیکھ کر زہر کا انتخاب کرنے والے کی ہوتی ہے، یہ خسارہ جہالت کا نہیں بلکہ شرارت کا ہے جو بہر حال جہالت کے خسارے سے بڑھ کر بھی ہونا چاہیے پھر قرآن کے الفاظ میں، ظالم اور خسارہ، کے الفاظ ہیں، ان کی وضاحت بھی ہم ضروری جانتے ہیں، واضح رہے کہ قرآن کی رو سے بڑھکر ظالم وہ لوگ ہیں، جو اللہ پر افترا کرتے ہیں، جیسا کہ سورہ انعام (آیت ۹۳ و ۲۱) اور متعدد مقام پر اس مسئلہ کو بیان کیا ہے، ظاہر ہے کہ افترا کا مطلب تو یہی ہے کہ اپنے پاس سے شریعت سازی کر لی جائے اور دین میں وہ مسائل ایجاد کیئے جائیں جنہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق علیہ السلام نے بیان نہیں کیا، دوسرے لفظوں میں دین میں بدعات ایجاد کی جائیں، یہ محکمہ خیر سے آپ کے پاس ہے، اور آپ نے ہی دین میں بدعات ایجاد کر کے رکھی ہیں،

اور انشاء اللہ بدعت پسند پارٹی ہی خسارے میں رہے گی، کیونکہ قرآن کو قبر پر یا تیجہ وغیرہ پر ختمی ملانے ہی پڑھا تھا اور یہی اس کے لیے قیامت کے روز خسارے کا موجب بن جائے گا، جب یہ لوگ حوض کوثر کی طرف جائیں گے تو انہیں روک دیا جائے گا، آنحضرت ﷺ کے سوال کرنے پر

فرشتے جواب دیں گے کہ

انک لا تدری ما احدثوا بعدک، بخاری ۴۶۲۵) یعنی آپ ﷺ کو معلوم نہیں تیرے بعد ان لوگوں نے دین میں کیا کیا بدعات ایجاد کر لی تھیں، الحدیث، بخاری ص ۶۶۵ ج ۲ و مسلم ص ۳۸۲ ج ۲ اصل خسارہ تو اخروی ہی ہے، دنیا کا خسارہ کوئی خسارہ ہی نہیں، ہم اللہ کے دیئے ہوئے مال سے حلال و طیب کھا کر اپنے مولیٰ حقیقی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں توحید و سنت کی نعمت عظمیٰ سے نوازہ اور قوم کا مال باطل طریقوں سے کھانے سے بچالیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصْلُدُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ، سورہ التوبہ آیت ۳۴،

مسلمانو! بہت سے پادری اور درویش ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں، اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، (ثانی) ۹-۳۴)

وہ دن بھی کیا خوب ہوگا جب اہل توحید مہشت میں ہونگے اور بدعت پسند پارٹی کو حوض کوثر کی طرف جانے سے روک دیا جائے گا،

اور اہل توحید و سنت ان کے اخروی خسارے کو دیکھ کر ان پر قہقہے اڑائیں گے،
فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ، عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ، هَلْ نُؤْتِبُ الْكُفَّارَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ،

سورہ المطففين آیت ۳۴ تا ۳۶

پس آج ایمان والے ان کافروں پر نہیں گے، تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے، کہ کیا اب ان منکروں نے جیسا یہ کرتے تھے، پورا پورا بدلہ پالیا ہے؟ (۸۳ ب ۳۴ تا ۳۶)

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے اس استدلال میں مرزا غلام احمد قادیانی کی پیروی کی ہے وہ اپنی تالیف، کشتی نوح میں لکھتا ہے کہ۔

پھر یہ امت خیر الامم کس وجہ سے ہوئی بلکہ شر الامم ہوئی کہ ہر ایک شرکا نمونہ ان کو ملا مگر نیکی کا نمونہ نہ ملا، کیا ضروری نہیں کہ اس امت میں بھی کوئی نبیوں اور رسولوں کے رنگ میں نظر آوے
ص ۴۴۔

مرزا جی کی تحریر کا مقصد یہ ہے کہ نبوت رحمت ہے اگر اس امت پر ختم نبوت کا عقیدہ رکھا جائے تو یہ رحمت سے بعید ہو کر شر الامم کہلائے گی۔

کیونکہ برائی تو ان میں ہر ایک موجود ہے جبکہ نبوت جیسی رحمت نہ رہی، حالانکہ متنبی قادیان کو اتنا بھی علم نہیں کہ ہم نبوت کی رحمت سے محروم نہیں بلکہ وہ اتم درجہ ہم میں موجود ہے، تو ہم شر الامم کس طرح ہو گئے، اسی طرح حضرت مفتی صاحب بھی قرآن خوانی کو رحمت قرار دیکر قل کے منکرین کو زحمت کا طعنہ دے رہے ہیں، حالانکہ قرآن کے رحمت ہونے سے انکار نہیں بلکہ قل و دسواں وغیرہ کی رسومات سے انکار ہے، جن کے رحمت ہونے پر مفتی صاحب ابھی تک کوئی دلیل شرعی قائم نہیں کر پائے، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو قرآن کی کسی آیت یا حدیث صحیح سے یہ ثابت کریں کہ قرآن خوانی کا ثواب میت کو پہنچ جاتا ہے اور مرنے والے کے حق میں وہ رحمت ہو کر اس کی زحمت کو دور کر دیتا ہے، تو ہم اسے قبول کرنے اور اپنے سابقہ موقف کو بدلنے کے لئے تیار ہیں، مگر یاد رہے کہ دنیا بھر کے منکرین سنت اس کا ثبوت سورج کے مغرب سے طلوع ہونے تک نہیں دے سکتے۔

باب۔ نماز جنازہ کے بعد اجتماعی دعا

انسان کی وفات کے بعد اس کیلئے مغفرت کی دعا کرنا حسن سلوک کے قبیل سے ہے اس کیلئے کوئی خاص وقت متعین نہیں، انفرادی صورت میں انسان اس کیلئے جب چاہے دعا کر سکتا ہے اس میں کوئی شرعی روک ٹوک اور برائی نہیں ہے، بلکہ کتاب و سنت سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

ربنا اغفر لی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب (ابراہیم آیت ۴۱)
ترجمہ۔ اے ہمارے پروردگار قیامت کے دن مجھے اور میرے ماں باپ کو اور مومنوں کو بخش دے۔ ۱۳-۴۱۔

والذین جاء و من بعدهم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤوف رحیم۔ (الحشر - ۱۰)
ترجمہ۔ (وہ یہ) دعا کرتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ نہ پیدا ہونے دے، اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔ ۵۹-۱۰۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِي مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا
ترجمہ۔ اے ہمارے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو اور جو ایمان لا کر میرے گھر میں داخل ہوئے اور تمام مومن مرد اور ایمان والی عورتوں کو معاف فرما، اور ظالم لوگوں کیلئے اور زیادہ تباہی بڑھا۔ ۷۱-۲۸۔

ان آیات کے ساتھ اس فرمان نبوی کو بھی شامل کر لیجئے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ زاعمی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة، من صدقة جاریة او علم ینتفع به، او ولد صالح یدعو له۔

جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کیلئے اعمال (کا ثواب) منقطع ہو جاتا ہے مگر تین (عملوں کا ثواب جاری رہتا ہے) صدقہ جاریہ، علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں یا نیک اولاد جو اس کیلئے

(مغفرت کی) دعا کرے۔

صحیح مسلم شریف ص ۴۱ ج ۲۔

ان نصوص شرعیہ سے ثابت ہوا کہ میت کے حق میں دعا مفید ہے، لیکن اجتماعی طور پر میت کیلئے دعا کا ثبوت صرف نماز جنازہ اور دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر کرنے کی صورت میں ہی ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں رسول اللہ ﷺ جب میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو اس (کی قبر) پر ٹھہرتے اور لوگوں سے فرماتے کہ اپنے بھائی کیلئے دعائے مغفرت کرو اور اس کیلئے ثابت قدم رہنے کا سوال کرو اس لئے کہ اس وقت اس سے سوال ہوگا۔ سنن ابی داؤد مع عون المعبود ص ۲۰۹ ج ۳۔

میت کیلئے ان مواضع کے علاوہ شریعت نے اجتماعی طور پر دعا کا طریقہ نہیں بتایا، چنانچہ کنز الدقائق میں نماز جنازہ کی ترتیب میں لکھا ہے

وهی اربعة تكبيرات بشاء بعد الاولى و صلوة على النبي ﷺ بعد الثانية و دعاء بعد الثالثة .

یعنی نماز جنازہ کی چار تکبیریں ہیں پہلی کے بعد ثانی دوسری تکبیر کے بعد نبی ﷺ پر درود شریف اور تیسری کے بعد دعا ہو۔

کنز الدقائق مع البحر الرائق ص ۱۸۳ ج ۲۔

اہل علم اور احباب عقل و خرد جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خیر القرون کے جملہ مسلمانوں نے لاکھوں جنازے پڑھے پڑھائے مگر مولوی احمد رضا خاں تک کسی فرد واحد سے بھی ثابت نہیں کہ اس نے جنازے کے فوراً بعد مروجہ طریقہ سے اجتماعی طور پر میت کیلئے دعا مانگی ہو۔

انہیں حقائق کے پیش نظر حضرات فقہاء احناف نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنے سے منع کیا ہے اور اس عمل کو مکروہ قرار دیا ہے چنانچہ فقہ حنفی کے نامور امام ابو بکر حامد الحنفی (م ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں

ان الدعاء بعد صلوة الجنائز مکروہ .

یعنی نماز جنازہ کے بعد دعا (مانگنا) مکروہ ہے۔ محیط باب الجنائز و برجندی ص ۱۸۰ ج ۱۔

مفتی صاحب کا اعتراض

ابو بکر حامد کی جو عبارت پیش کی گئی ہے، یہ قنویہ کی عبارت ہے، مگر قنویہ غیر معتبر ہے مقدمہ شامی بحث رسم المفتی میں ہے کہ صاحب قنویہ ضعیف روایت بھی لیتا ہے اس سے فتویٰ دینا جائز نہیں اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے، بذل الجواز، میں فرمایا کہ قنویہ معتزلی بد مذہب تھا، اگر قنویہ کی عبارت صحیح مان لی جائے تو خود مخالفین کے بھی خلاف ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا منع ہے تو بعد دفن بھی دعا ناجائز ہونا چاہیے کیونکہ یہ وقت بھی نماز کے بعد ہی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۸۱۔

کیا کلام الہی کے علاوہ ہر کتاب کا ہر کلمہ قطعی حق ہوتا ہے؟

الجواب: اولاً ہم نے قنویہ سے نقل ہی نہیں کیا تاکہ یہ بہانہ نہ بنایا جاسکے، اور علماء نے صراحت کی ہے کہ جب قنویہ کی مطابقت مل جائے تب اس کی روایات پر عمل جائز ہے، مولانا عبدالحی لکھنوی فرماتے ہیں

صرح ابن و ہبان وغیرہ انہ معتزلی الاعتقاد حنفی الفروع و تصانیفہ غیر معتبرۃ مالم یوجد مطابقتها لغيرها۔

یعنی ابن و ہبان وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ صاحب قنویہ اعتقاد میں معتزلی تھا اور فروع میں حنفی، اور اس کی کتب غیر معتبر ہیں جب تک اس کی کوئی دوسرا مطابقت نہ کرے، الفوائد البھیہ ص ۲۱۳۔

علامہ لکھنوی کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ قنویہ کا صرف وہی حوالہ غیر معتبر ہوگا جس کی دوسرے فقہاء نے تائید نہ کی ہو۔

خود مفتی صاحب کے ہاں تو قنویہ کلی طور پر معتمد علیہ ہے چنانچہ انہوں نے آنے والے کیلئے تعظیماً قیام کی مشروعیت کو قنویہ سے ہی نقل کیا ہے دیکھئے جاء الباطل ص ۲۵۰ جلد اول، سوال یہ ہے کہ

مبتدعین کیلئے تعظیسی قیام میں آخر وہ ثقہ و معتبر کیوں ہے؟

علاوہ ازیں راقم عرض کرتا ہے کہ کتاب اللہ کے علاوہ اور کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے مضامین کا ہر ہر لفظ اور فقرہ قطعاً حق و ثواب اور واجب الاتباع ہو، خیر القرون سے لیکر تاحال علماء نے دینی کتب تحریر کی ہیں، مگر کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا ہر ایک جملہ قطعی حق اور واجب الاتباع ہے، اور اس میں شک کرنے والا کافر اور دین اسلام سے خارج ہے، کیونکہ یہ مقام تو کتاب اللہ کا ہے۔

جس کو اللہ تعالیٰ نے جبریل امین علیہ السلام کے واسطے سے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ

پر نازل فرمایا۔ در مختار میں ہے

ویابی اللہ العصمة، لکتاب غیر کتابہ،

یعنی عصمت کو اللہ نے کسی کتاب کیلئے مقرر و معین نہیں فرمایا سوائے اپنی کتاب کے۔

اس کی شرح میں ابن عابدین شامی فرماتے ہیں،

وهذا اعتذار منه رحمه الله تعالى، ای إن هذا الكتاب وإن كان مشتملاً علی

ما حذرہ المتأخرون و علی التحقیقات المذكورة لكنه غیر معصوم، ای غیر

ممنوع من وقوع الخطأ والسهو فيه، فإن الله تعالى لم يرض، اولم يقدر العصمة

لكتاب غیر کتابہ العزیز الذی قال فيه، لا یأتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه

فغیره من الكتب قد یقع فيه الخطأ والزلل لأنها من تألیف البشر والخطأ والذلل من

شعارهم۔

یعنی صاحب دُر کا قول مذکورہ اپنی طرف سے عذر ہے ان کا مقصود یہ ہے کہ میری کتاب گو

متاخرین کی تحریرات اور تحقیقات پر مشتمل ہے لیکن پھر بھی سہو و نسیان سے محفوظ نہیں اس لئے کہ اللہ

تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کتاب کیلئے مقرر نہیں فرمایا کہ اس کے آگے پیچھے

سے باطل نہیں آسکتا اس کی کتاب کے علاوہ جتنی کتب ہیں سب میں خطا و زلل واقع ہو جاتا ہے

کیونکہ وہ کتابیں بشر کی تألیفات سے ہیں اور وہم و نسیان بشریت کا شعار ہے۔

(فتاویٰ شامی ص ۱۲۷ ج ۱۔)

یہ عبارت اس بات کی برہان واضح ہے کہ بشر کی تصنیف کردہ کتاب اغلاط سے پاک و صاف نہیں ہو سکتی کہ یہ شان کتاب اللہ کی ہے اور اگر کوئی شخص کسی بشری تصنیف کو قطعی حق اور غلطی سے پاک مانتا ہے تو وہ دوسرے لفظوں میں اسے کلام الہی قرار دے رہا ہے علامہ شامی نے مذکورہ عبارت کیساتھ ہی، تنبیہ، کے عنوان سے، علامہ عبدالعزیزؒ کی شرح اصول بزدوی سے نقل کیا ہے۔

إني صنف هذه الكتب فلم آل فيها الصواب ولا بد أن يوجد فيها ما يخالف كتاب الله تعالى و سنة رسوله ﷺ قال الله تعالى لو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيراً ، فما وجدتم فيها مما يخالف كتاب الله تعالى و سنة رسوله ﷺ فإني راجع عنه إلى كتاب الله تعالى و سنة رسوله ﷺ ، قال المزماني قراءة كتاب الرسالة على الشافعي ثمانين مرة فما من مرة الا و كان يقف على خطأ فقال الشافعي هيه ، ابي الله ان يكونا كتاباً صحيحاً غير كتابه .

یعنی امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں حق و صواب کو بیان کرنے کی کمی نہیں کی پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ان میں ایسی چیز پائی جائے گی جو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے خلاف ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف پایا جاتا لہذا اگر میری کتب میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف پایا جائے تو میں یقیناً ان سے رجوع کرنے والا ہوں۔

امام مزنی رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے اپنے استاذی المکرم امام شافعیؒ کے سامنے انکی کتاب الرسالة (جو انہوں نے اصول پر تصنیف کی ہے) کو اسی ۸۰ بار پڑھا تو ہر بار وہ خطا پر مطلع ہوئے پھر حضرت امام نے فرمایا ہٹاؤ اللہ تعالیٰ نے کسی کتاب کے صحیح ہونے کو مقرر و معین نہیں فرمایا سوائے اپنی کتاب کے، فتاویٰ شامی ص ۲۷ ج ۱۔

ان اکابرین کی تصریحات میں اس بات کی واضح صراحت ہے کہ کسی بشری تصنیف میں غلطی کا نہ ہونا ناممکن ہے لہذا اگر قہیہ میں چند ایک روایات حنفیہ کے مخالف ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کلی طور پر ناقابل قبول ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا لفظ، بعد، سے یہ کشید کرنا کہ قبر پر دعا بھی تو نماز کے بعد ہی ہے، تو

یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ، بعد، کا معنی پیچھے ہوتا ہے جو کہ قبل کی ضد ہے،
المفردات ص ۵۳۔

آئمہ لغت نے صراحت کی ہے یہ (ساتھ) کے معنی میں بھی آتا ہے علامہ مرتضیٰ زبیدیؒ
فرماتے ہیں

وتاتی بمعنی مع کقولہ تعالیٰ فمن اعتدی بعد ذلک، ای مع ذلک.
یعنی بعد کا لفظ ساتھ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے اللہ رب العزت کا فرمان ہے
فمن اعتدی بعد ذلک.
میں بعد بمعنی ساتھ ہے۔

تاج العروس من جواهر القاموس ص ۳۰۳ ج ۲۔
علامہ فیومی فرماتے ہیں

وتانی بمعنی مع کقولہ تعالیٰ، عتل بعد ذلک، ای مع ذلک.
یعنی یہ کبھی ساتھ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے اللہ رب العزت کا قول
عتل بعد ذلک

(اس کے ساتھ ساتھ وہ حرامی بھی ہے۔)
میں بعد ساتھ کے معنی میں آیا ہے۔ المصباح المنیر ص ۵۳ ج ۱۔
منجد میں ہے

وتاتی بعد بمعنی حتی الان،
یعنی یہ لفظ بعد ازاں کے معنی میں بھی آتا ہے۔ منجد ص ۲۰۶۔
لیجے جناب اس موخر الذکر حوالے نے سارے معاملات ہی حل کر دیئے کہ یہ لفظ متصل کے
معنی میں بھی آتا ہے،

فقہائے احناف کی صراحت
اب ہم پھر اپنے اصل مقصد کی طرف عود کرتے ہوئے فقہاء احناف کے مزید اقوال نقل کرتے
ہیں۔

امام شمس الاممہ حلوانی الحنفی (التونی ۳۵۴ھ) اور بخارا کے مفتی و قاضی علامہ شغدی الحنفی (التونی ۳۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ

(۲) لا يقوم بالدعاء بعد صلوة الجنابة. فنيه ص ۵۶ ج ۱.

نہ ٹھہرے کوئی شخص نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے۔

امام طاہر بن احمد البخاری الحنفی (المتممی ۳۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ

(۳) لا يقوم بالدعاء فى قراءة القرآن لاجل الميت بعد صلوة الجنابة و قبلها،

خلاصة الفتاوى ص ۲۲۵ ج ۱

نہ دعا مانگی جائے میت کیلئے قرآن پڑھ کر نماز جنازہ سے پہلے اور بعد میں،

علامہ سراج الدین اودى الحنفی (التونی فی حدود ۷۰۰ھ) لکھتے ہیں

(۴) اذا فرغ من الصلوة لا يقوم بالدعاء. فتاوى سراجيه ص ۲۳

جب نماز جنازہ سے فارغ ہو جائے تو دعا کے واسطے نہ ٹھہرے۔

امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردری الحنفی (م ۸۲۷ھ) فرماتے ہیں

(۵) لا يقوم بالدعاء بعد صلوة الجنابة لانه دعا مرة. فتاوى هندية

ص ۲۸۳ ج ۱.

نہ ٹھہرے نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے کیونکہ اس نے ایک مرتبہ (نماز جنازہ کے اندر) دعا

کر لی ہے۔

امام شمس الدین محمد خراسانی کوہستانی الحنفی (م ۹۳۴ھ) لکھتے ہیں کہ

(۶) ولا يقوم داعياله، جامع الرموز ص ۱۲۵ ج ۱.

اور (نماز جنازہ کے بعد) نہ ٹھہرے میت کیلئے دعا مانگنے کے واسطے۔

علامہ ابن نجیم الحنفی کنز الدقائق کی شرح میں فرماتے ہیں

(۷) ولا يدعوا بعد التسليم، البحر الرائق ص ۱۸۳ ج ۲.

نہ دعا کرے نماز جنازہ سے سلام پھیرنے کے بعد۔

مفتی محمد نصیر الدین الحنفی لکھتے ہیں کہ

(۸) و بعد ایستادہ نمازند برائے دعا، فتاویٰ برہنہ ص ۳۶

اور بعد نماز جنازہ کے دعا کرنے کیلئے نہ ٹھہرے۔

ملا علی القاری الحنفی (م ۱۰۱۴ھ) مشکوٰۃ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ۔

(۹) ولا يدعوا لل میت بعد صلوة الجنائزۃ لانه يشبه الزیادۃ فی صلوة الجنائزۃ.

نہ دعا کرے میت کیلئے نماز جنازہ کے بعد کیونکہ یہ نماز جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے۔ مراقۃ

ص ۶۴ ج ۴ وحاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۲۷

مفتی سعد اللہ صاحب الحنفی (م ۱۲۹۲ھ) لکھتے ہیں۔

(۱۰) خالی از کراہت زیر انکہ اکثر فقہاء بوجہ زیادۃ بودن بر امر مسنون

منع میکنند، فتاویٰ سعیدیہ ص ۱۳۰.

یعنی جنازہ کے بعد دعا کراہت سے خالی نہیں کیونکہ اکثر فقہاء اس وجہ سے منع کرتے ہیں کہ

یہ امر مسنون سے زائد ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی فرماتے ہیں

(۱۱) بعد نماز جنازہ کے دعا کرنا مکروہ ہے، نفع المفتی والساہل ص ۶۱۔

نواب قطب الدین حنفی ترجمہ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں

(۱۲) اور دعا نہ کرنا میت کیلئے بعد نماز جنازہ کے اس لئے کہ یہ مشابہ ہوتا ہے ساتھ زیادتی

کے نماز جنازہ میں، (مظاہر حق ص ۵۵ ج ۲)۔ مطبوعہ نول کشور ۱۹۳۴ء

عبارات فقہاء پر مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہو۔ جاء الباطل ص ۲۸۰۔

الجواب

مفتی صاحب کو جھوٹ لکھتے وقت ذرا بھر شرم نہیں آئی کہ فقہاء کی عبارات میں تو، بعد صلوة

الجنائزہ، کے الفاظ لکھتے ہیں، دیکھئے نمبر ۴، ۳، ۵ و ۹۔ اذا فرغ من الصلوۃ، دیکھئے نمبر ۴، اور، بعد

التسلیم، دیکھئے نمبر ۷ کی قید لگاتے ہیں مگر مفتی صاحب کمال عیاری سے چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام

پھرنے سے پہلے پر محمول کر رہے ہیں جو کہ ان کی سینہ زوری ہے۔

دوسرا اعتراض

دوم یہ کہ دعائیں زیادہ لمبی نہ ہوں جس میں دفن میں بہت تاخیر ہو۔
جاء الباطل ص ۲۸۰۔

الجواب

اولاً۔ اس اعتراض میں مفتی صاحب کو یہ مُسلم ہے کہ عبارات فقہاء کا تعلق نماز جنازہ کے بعد سے ہے۔

ثانیاً۔ مفتی جی نے ہی لکھا ہے کہ بعد نماز جنازہ دعا جائز بلکہ سنت ہے جاء الباطل ص ۲۸۱، بتائیے اگر یہ مسنون ہے تو اس کیلئے تاخیر کیوں درست نہیں؟

ثالثاً۔ فقہاء احناف میں سے کسی ایک سے بھی یہ ثابت نہیں کہ ممانعت لمبی لمبی دعاؤں سے ہے اور مختصر قسم کی دعائیں جائز ہیں، یہ مولوی احمد رضا کا خود گھڑا ہوا فلسفہ ہے اور مفتی صاحب نے بغیر سوچے سمجھے اندھے مقلد کی طرح پلے باندھ لیا ہے۔

تیسرا اعتراض

تیسرے یہ کہ اسی طرح نصف بستہ بحیثیت نماز دعا کی جاوے کہ دیکھنے والا سمجھے نماز ہو رہی ہے، یہ زیادتی کے مشابہ ہے لہذا اگر بعد سلام بیٹھ کر یا صفیں توڑ کر تھوڑی دیر دعا کی جاوے تو بلا کراہت جائز ہے، جاء الباطل ص ۲۸۱۔

الجواب

اولاً۔ لایقوم بالداء، کا یہ معنی کرنا کہ کھڑے ہو کر دعا نہ کرے مفتی صاحب کا انتہاء درجے کا مغالطہ یا قلت فہم کا نتیجہ ہے، کیونکہ یہاں فقط، یقوم، ہی نہیں بلکہ، یقوم بالداء، ہے اور قام یقوم، جب باء کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے، قائم رہنا، کسی چیز پر استقامت اختیار کرنا، قرآن میں ہے۔

تمام کے معنی پر آئمہ لغت کی تصریحات راقم نے دین الحق کی جلد اول ص ۵۹۰ میں، جمع بین الصلوٰتین، میں مفتی صاحب کی چوتھی دلیل کے جواب میں، اقامت کا معنی و مفہوم، کے زیر عنوان پیش کردی ہیں مزید تفصیل مقصود ہو تو وہاں ملاحظہ فرمائیں اس مقام پر بھی اتمام حجت کیلئے اس معنی کی وضاحت کردی جاتی ہے تاکہ بریلویت کے حکیم الامت مفسر قرآن اور مفتی اعظم کا علمی حدود اربعہ بخوبی معلوم ہو جائے،

علامہ فیومی (التونی ص ۷۷) فرماتے ہیں

قام بالامر يقوم به قيام فهو قوام وقائم و استقام الامور (، المصباح المنير ص ۵۲۰ ج ۲)۔

الغرض - لایقوم بالدعاء، کا لغوی معنی ہوگا دعا قائم نہ کرے اس کیلئے ٹھہرے نہ، بلفظ دیگر دعا نہ مانگے۔

ثانیاً فقہاء کرام کی عبارات میں لایقوم، ہی نہیں (جس سے یہ مغالطہ دیا جاسکے کہ نفس دعا سے منع نہیں کر رہے بلکہ کھڑے ہو کر دعا کرنے سے منع کیا ہے) بلکہ ان میں سے، البحر الرائق، کے الفاظ تو، لایدعوا بعد التسليم، ہیں ان میں تو مطلق دعا کی نفی کی گئی ہے، خواہ کھڑے ہو کر کی جائے یا صف بستہ اس کو ادا کیا جائے یا صفوف توڑ کر وقفہ سے مانگی جائے یا اور کسی بھی حالت میں ہو کیونکہ، لایدعوا، عام ہے۔

مفتی صاحب کے دلائل کا تجزیہ

پہلی دلیل

مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الجنائزہ فصل ثانی میں ہے

اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء

جب تم میت پر نماز پڑھ لو تو اسکے لئے خالص دعا مانگو۔

ف، سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے بعد فوراً دعا کی جاوے بلا تاخیر جو لوگ اس کے معنی کرتے ہیں کہ نماز میں اس کیلئے دعا مانگو وہ ف کے معنی سے غفلت کرتے ہیں صلیتم شرط ہے اور فاخلصوا،

اس کی جزا، شرط اور جزا میں تغایر چاہے نہ یہ کہ اس میں داخل ہو، پھر صلیتم ماضی ہے اور دعا کا حکم نماز پڑھ چکنے کے بعد ہے۔

الجواب

اولاً۔ اسکی سند میں محمد بن اسحاق امام مغازی ہیں، سنن ابو داؤد ص ۱۰۰ ج ۲، و بیہقی ص ۴۰ ج ۴، وابن ماجہ، وغیرہ گو ہمارے اہل حدیث کے نزدیک ثقہ ہیں مگر احتلاف انہیں دجال و کذاب اور نامعلوم کیا کیا کہتے ہیں، مگر یہاں اس کی روایت سے استدلال کر لیا ہے، اسے عیاری کہیں یا کہ مکاری یا خود غرضی سے تعبیر کریں، جو مزاج یار میں آئے۔

ثانیاً۔ مفتی جی آپ بوجہ پیرانہ سالی ایک بکلت بھول گئے ہیں وہ یہ کہ جب اذا ماضی پر داخل ہوتا ہے تو وہ اسے خالص استقبال کے لئے کر دیتا ہے، شرح جامی میں ہے،

و منها اذا وهی اذا كانت زمانیة للمستقبل ای للزمان المستقبل وان كانت داخلۃ علی الماضی۔

اور (ملروف مہیہ) میں سے اذا ہے جب وہ زمانیہ ہو تو استقبال کیلئے ہوگا اگر چہ ماضی پر داخل ہوا ہو، شرح جامی ص ۲۳۶ طبع دہلی ۱۲۶۹ھ۔

مثلاً لفظ جاء، ماضی ہے لیکن جب اس پر، اذا، آجائے گا تو خالص استقبال کیلئے ہو جائے گا، قرآن میں ہے،

اذا جاء نصر الله والفتح۔ (النصر آیت ۱)

ترجمہ۔ جب اللہ کی مدد اور فتح آئے، (احمد رضا خاں)

ماضی کو مضارع کے معنی میں قرآن میں یہ لفظ متعدد بار آیا ہے، دیکھئے البقرہ ۱۴، التکویر آیت ۱) العنکبوت ۲۸ وغیرہ۔

اور مذکورہ حدیث میں لفظ صلیتم (جو کہ ماضی ہے) سے قبل حرف اذا آیا ہے لہذا معنی اس حدیث کا یہ بنے گا کہ جب تم نماز جنازہ پڑھو تو میت کیلئے خلوص دل سے دعا کرو۔

چنانچہ احتلاف کے سرخیل اور مبتدعین کے معتمد علیہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی مرحوم اس کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

چوں نماز گزارید بر میت پس خالص کنید برائے وے دعا، اشعة اللمعات
ص ۳۱ ج ۱ طبع مکتبہ نورانی پشاور،
حضرت شیخ نے، اذا صلیتم، کا معنی

چوں نماز گزارید، کیا ہے گزارید گزاردن، گزاریدن، گزاشتن،
مصادر سے مضارع جمع حاضر کا یا امر جمع حاضر کا صیغہ ہے، یعنی جب تم نماز ادا کرو یا پڑھو الخ
اگر اس کا وہ ترجمہ ہوتا جو حضرت حکیم الامت اور مفسر قرآن جناب مفتی اعظم الحاج احمد یار خان نے
کیا ہے، جب تم نماز پڑھ لو..... تو شیخ کی عبارت اس طرح ہوتی،
چوں نماز گزارید یہ بر میت،

یعنی جب نماز ادا کر لو یا پڑھ لو۔ مزید دیکھئے، دین الحق ص ۶۸۵ ج ۱، یہ حدیث بالکل اس
حدیث کی طرح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ، اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم، الحدیث مسلم ص
۱۷۴ ج ۱، وابوداؤد مع عون ص ۳۶۷ ج ۱ وغیرہ، اس کا معنی مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی اس
طرح کرتے ہیں، جب تم نماز پڑھنے لگو تو سب سے پہلے اپنی صفیں درست کرو، شرح صحیح مسلم
ص ۱۱۶۶ ج ۱

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا حرف فا پر موشگافی کرنا تو اس کا جواب مولانا سرفراز خاں صاحب
نے بہت اچھا دیا ہے آپ فرماتے ہیں، مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ شرط اور جزا میں تغایر ہونا چاہیے تو
یہ مسلم ہے کہ یہ تغایر کبھی ذات اور ذات کا ہوتا ہے جیسے،

فاذا طعمتم فانتشروا،

میں کھانا الگ ایک حقیقت ہے اور انتشار الگ، اور کبھی یہ تغایر جزو کل کا ہوتا ہے جیسے،

و اذا قرأ القرآن فاستعذ بالله من الشیطان الرجیم،

مطلق قرآن کا پڑھنا کل ہے اور صرف،

اعوذ بالله من الشیطان الرجیم،

کا پڑھنا جزو ہے، یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اعوذ باللہ الخ قرآن کریم کے بالکل مغایر ہے اسی
طرح کبھی یہ تغایر اطلاق و تقید کا ہوتا ہے جیسے،

اذا سالتموهن متاعا فاستلوهن من وراء حجاب،

میں جملہ شرطیہ کے اندر جو سوال ہے وہ مطلق ہے اور جملہ جزائیہ میں جو سوال ہے وہ، من وراء حجاب، کے ساتھ مقید ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جملہ شرطیہ میں جو سوال ہے وہ اس سوال کے بالکل متغایر ہے جو جملہ جزائیہ میں ہے جیسا کہ کسی بھی اہل علم پر یہ مخفی نہیں ہے، اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ مطلق نماز جنازہ (جس میں فاتحہ اور درود شریف وغیرہ کا پڑھنا اور با وضو ہو کر قبلہ رخ ہو کر قیام کرنا وغیرہ بھی کچھ ہے) کل ہے اور میت کیلئے دعا جزو ہے، اور شرط و جزا کیلئے اتنا تغایر کافی ہے اور اگر مفتی صاحب اذا قمت الی الصلوٰۃ (الایۃ) اور اذا قرأ القرآن (الایۃ) اور اذا سالتموهن (اللہ) وغیرہ میں ارادہ وغیرہ مقدمہ تسلیم کرتے ہیں وہ فرمائیں کہ اذا صلیتم علی میت (الحدیث) میں ارادہ کے نکالنے سے کیا چیز مانع ہے؟ وجہ فرق بین ہونی چاہے۔

الغرض یہ مفتی صاحب کے صواب دید پر موقوف ہے کہ اگر وہ ان آیات میں کوئی مقدر نکالتے ہیں تو حدیث میں بھی تسلیم کر لیں یا جزو، وکل وغیرہ کا تغایر مانتے ہیں تو وہ مان لیں، یہ ان کی مرضی ہے، باقی حرف الی نماز کے قیام کیلئے بھی آیا ہے سینکڑوں حدیثیں اس پر پیش کی جاسکتی ہیں مگر بخوف طوالت ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ف سے تاخیر ہی معلوم ہوئی، حقیقی معنی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں، تو یہ ان کا کہنا اصول سے بے خبری پر مبنی ہے۔

اولاً۔ اس لئے کہ جیسے تاخیر و تعقیب زمانی ہوتی ہے ایسے ہی مرتبی بھی ہوتی ہے اور جزا کیلئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ زمانہ کے لحاظ سے شرط سے متاخر ہو، بلکہ بسا اوقات جزا شرط کیلئے علت ہوتی ہے اور علت کا معلول پر مقدم ہونا ایک بین امر ہے، علماء اصول نے اس کی تصریح کی ہے کہ،

اذا الجزأ قد تكون علة للشرط كان وجد النهار فالشمس طالعة، شرح تلویح

ص ۲۴۱،

کبھی جزا شرط کیلئے علت ہوتی ہے جیسے کہ یہ مثال (وان وجد النهار فالشمس طالعة) اگر دن موجود ہے تو اس لئے کہ سورج نکل چکا ہے۔

ثانیاً۔ اس لئے کہ میت کیلئے نماز جنازہ میں دعا کی جاتی ہے تو وہ ثناء اور درود شریف کے بعد

کی جاتی ہے اور اس میں جملہ جزائیہ کی جملہ شرطیہ سے زمانی تاخیر بھی متحقق ہے اور علماء نے تصریح کی ہے۔

التراخی بزمان وان قل، هامش تلویح ص ۲۴۱،
کہ تراخی بہت قلیل زمانہ میں بھی متحقق ہو جاتی ہے، راہ سنت ص ۲۱۶۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

اسی مشکوٰۃ میں اسی جگہ ہے

قراء علی الجنازہ بفاتحة الكتاب،

حضور علیہ السلام نے جنازہ پر سورۃ فاتحہ پڑھی، اس کی شرح میں

احۃ الممعات میں ہے۔ و احتمال دارد کہ ہر جنازہ بعد از نماز یا پیش از

بقصد تبرک خواندہ باشد چنانکہ آلاء متعارف است،

ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام نے سورۃ فاتحہ نماز کے بعد یا نماز سے پہلے برکت کیلئے پڑھی ہو

جیسا کہ آج کل رواج ہے، جاء الباطل ص ۲۷۵۔

الجواب

اولاً۔ مذکورہ عبارت سے قبل شیخ فرماتے ہیں کہ

ظاہر آن است کہ مراد قراءۃ فاتحہ در نماز جنازہ باشد،

اس حدیث کا ظاہر یہی ہے کہ فاتحہ کو نماز جنازہ کے اندر پڑھا، احۃ الممعات ص ۳۱ ج ۱۔

جب حضرت محدث دہلوی مرحوم کو اس کے اصلی و حقیقی معنی کا اقرار ہے کہ مراد اس سے نماز

جنازہ کے بیچ میں فاتحہ پڑھنا ہے تو اب ان حقیقی و اصلی معنی کو ترک کرنے کی ان کے پاس کیا دلیل

ہے، محض احتمال تو کوئی دلیل نہیں، جبکہ خود مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

حقیقی معنی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں، جاء الباطل ص ۲۷۴۔

پھر حضرت محدث دہلوی تو برکت کا احتمال پیش کرتے ہیں، جسے مفتی صاحب کھینچ تان کے دعا

بنارہے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مگر یہ چیزیں بریلوی کتب فکر کے حکیم

الامت اور مفسر قرآن کو کون سمجھائے۔

ثانیاً۔ یہ روایت ہی ضعیف ہے خود مفتی صاحب فرماتے ہیں

یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ اس کی اسناد میں ابراہیم بن عثمان واسطی ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے، جاء الباطل ص ۲۳۳ ج ۲۔

مفتی صاحب نے اس حدیث کو یہاں تو استدلال میں پیش کر لیا ہے، جب کہ جاء الباطل کے حصہ دوم میں اسکو خود ہی ضعیف قرار دیا ہے، چونکہ وہاں تو مخالفین کے دلائل میں اس کا ذکر تھا اور یہاں اسے اپنی دلیل کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا لہذا خاموشی اختیار کر لی ہے، تف ہے ایسی دیانت داری پر اور، لعنت ہو ایسی عصبيت پر، اللہ رب العزت بچائے اس جیسی ہیرا پھیری کرنے سے اور دین کے معاملہ کو کھیل کود بنانے سے آمین یا الہ العالمین۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

فتح القدیر کتاب الجنائز باب صلوة الجنائز میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے منبر پر قیام فرما کر غزوہ موتہ کی خبر دی اور اسی اثناء میں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی،

فصلی علیہ رسول اللہ ﷺ و دعا له و قال استغفر والہ،

پس اس پر نماز جنازہ پڑھی اور ان کیلئے دعا فرمائی اور لوگوں سے فرمایا کہ تم بھی ان کیلئے دعائے مغفرت کرو۔

دعا کے واؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا نماز کے علاوہ تھی۔

مواعب الدنیہ جلد دوم القسم الثانی (فیما خبر الغیوب) میں یہی واقعہ نقل فرما کر کہا،

ثم قال استغفروا استغفروا، جاء الباطل ص ۲۷۵ ج ۱

الجواب: اولاً۔ بلاشبہ امام ۲ ابن ہمام نے ہدایہ کی شرح فتح القدیر ص ۸۰ ج ۲ میں اس روایت کو

درج کیا ہے، مگر باب کا عنوان، فصل فی الصلوة علی لمیت، ہے، علی الجنائزہ، نہیں ہے،

ثانیاً۔ یہ واقعہ مسجد نبوی کا ہے حالانکہ احناف کے نزدیک مسجد نبوی بلکہ تمام مساجد میں جنازہ جائز نہیں، ہدایہ، میں ہے کہ،

ولا یصلی علی میت فی مسجد، یعنی مسجد میں نماز جنازہ نہ پڑھا جائے، ہدایہ مع فتح القدیر ص ۲۹۰ ج ۲۔

دشمن توحید و سنت مجدد بدعات مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے،
جنازہ مسجد میں رکھ کر اس پر نماز مذہب حنفی میں مکروہ تحریمی ہے۔

العطایا النبویة فی الفتاوی الرضویة ص ۵۷ ج ۴،
ثالثاً۔ حنفیہ کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ ناجائز اور حرام قطعی ہے، چنانچہ بریلوی مکتب فکر کے
باوا آدم مولوی احمد رضا خاں نے خاص اس مسئلہ کے رد میں
النهی الحاجز عن تکرار صلاة الجنائز،

اور

الهادی الحاجب عن جنازة الغائب،

کے عنوان سے دو عدد رسائل لکھے ہیں جو اس کے فتاویٰ کی جلد چہارم میں مندرج ہیں، موخر
الذکر میں خاں صاحب نے دو سو تیس دلائل کتب فقہ حنفیہ سے اسکے عدم جواز پر دیئے ہیں
ص ۲۸ ج ۴۔

اگر مفتی صاحب مذکورہ روایت سے نماز جنازہ کے بعد دعا ثابت کرتے ہیں تو اسی روایت سے
جنازہ غائبانہ ثابت ہوگا، جو کہ مفتی جی کے تقلیدی مذہب میں ناجائز ہے۔ فما کان جوابکم فہو
جوابنا،

رابعاً۔ افسوس کہ مفتی جی نے فتح القدیر سے روایت کے الفاظ تو نقل کر لئے ہیں، لیکن آگے جو
امام ابن ہمام نے اس روایت پر جرح کی تھی، اسے بے ڈکار ہضم کر گئے ہیں، چنانچہ آپ فرماتے
ہیں

وهذا مع ضعف الطرق فما فی المغازی مرسل من الطریقین و مافی الطبقات
ضعیف بالعاء وهو ابن زید و یقال ابن یزید اتفقوا علی ضعفه،

یعنی مغازی واقدی میں یہ روایت مرسل طرق سے مروی ہے پھر اس کے ساتھ ضعیف بھی ہے
اور طبقات ابن سعد میں علاء (کے سبب ضعیف) ہے اور وہ ابن زید (ہے) اور کہا جاتا ہے کہ وہ ابن

یزید ہے اس کے ضعیف ہونے پر تمام متفق ہیں، فتح القدیر ص ۸۱ ج ۲۔

علامہ ابن ہمام کے علاوہ ملا علی القاری حنفی نے مشکوٰۃ کی شرح، مراقہ ص ۴۶ ج ۴ میں، علامہ حلبی حنفی نے منیۃ المصلیٰ کی شرح غنیۃ المستملیٰ ص ۵۸۴ میں علامہ زیلیعی حنفی نے تخریج ہدایہ، نصب الرایہ ص ۲۸۴ ج ۲ میں، اور مبتدعین کے پیرومرشد مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے، الہادی الحاجب عن جنازة الغائب، میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے دیکھئے فتاویٰ رضویہ ص ۷۳ ج ۴۔

اس کے غیر معتبر ہونے کی کئی ایک وجوہات ہیں (۱) یہ مرسل ہے اور مراسل محدثین کے ہاں ضعیف ہیں، دیکھئے دین الحق ص ۱۵ (۲) اس کی سند میں واقدی ہے جو کہ کذاب روای ہے، دین الحق ص ۸۶ (۳) واقدی کا استاذ عبد الجبار ہے جو کہ مجھول ہے، میزان الاعتدال ص ۵۳۴ ج ۲۔ جس روایت کی سند میں ایک راوی کذاب، دوسرا مجھول ہو، اور اس کا طریق بھی مرسل ہو، اس کے ضعیف و متروک ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

خامساً۔ اس میں جنازہ کا ذکر نہیں بلکہ فقط دعا کا بیان ہے چنانچہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے ایک صفحہ بھر میں اس بحث کو لکھا ہے آخر اپنے راگ کی تان اس پر توڑتا ہے کہ باجماع فریقین یہاں صلاة بمعنی دعا ہے، ملخصاً فتاویٰ رضویہ ص ۷۴ ج ۴۔

جب اصل نماز جنازہ ہی ثابت نہیں تو دعا بعد الجنازہ کا کیا مطلب، امید ہے کہ مبتدعین اپنے پیرومرشد کی گواہی پر مطمئن ہو جائیں گے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

منتخب کنز العمال کتاب الجنائز میں ابراہیم ہجری سے روایت کرتے ہے

قال رائيت ابن ابی اوفی وکان من اصحاب الشجرة ماتت ابنته الى ان قال ثم کبر علیها اربعاً ثم قال بعد ذلك قدر ما بین التكبير تین وقال رائيت رسول الله ﷺ کان يصنع هكذا۔

میں نے ابن ابی اوفی کو دیکھا یہ بیعت الرضوان والے صحابی ہیں کہ ان کی دختر کا انتقال ہوا پھر ان پر چار تکبیریں کہیں پھر اس کے بعد دو تکبیروں کے فاصلہ کی بقدر کھڑے ہو کر دعا کی اور فرمایا

میں نے حضور علیہ السلام کو ایسے کرتے ہوئے دیکھا، جاء الباطل ص ۲۷۵ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس حدیث سے مبتدعین کے حکیم الامت کا بعد نماز جنازہ کی دعا پر استدلال کرنا معنوی تحریف ہے کیونکہ اس میں جنازہ کے ختم ہونے کے بعد کی دعا کا بیان نہیں بلکہ چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام پھیرنے سے پہلے دعا کا بیان ہے، مسند احمد میں ہے کہ

ثم كبر عليها اربعاً ثم قام بعد الرابعة قدر ما بين التكبيرتين يدعو، الحديث.
(عورتوں کو صبر کی تلقین کے بعد) پھر عبد اللہ بن ابی اوفی نے نماز جنازہ پر چار تکبیریں کہیں پھر چوتھی تکبیر کے بعد دو تکبیروں کی مقدار آپ ٹھہرے اور دعا کی (بیٹی کیلئے) الحدیث مسند احمد امام احمد ص ۳۵۶ ج ۴۔

متدرک حاکم کی روایت میں ہے

ثم صلى عليها فكبر عليها اربعاً ثم قام بعد الرابعة قدر ما بين التكبيرتين يستغفر لها ويدعو. الحديث

اس کے بعد آپ نے بیٹی پر نماز جنازہ پڑھا اور چار تکبیریں کہیں اور چوتھی تکبیر کے بعد آپ دو تکبیروں کی مقدار کھڑے رہے (اور بچی کیلئے) استغفار اور دعا فرماتے رہے۔ متدرک حاکم ص ۳۶۰ ج ۱

اب بھی اگر کسی بدعتی کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ اس بات پر ہی بضد ہے کہ جنازہ کے بعد ہی دعا کی گئی تھی تو وہ اٹھائے نبھتی شریف جس میں مذکورہ روایت سے بھی بڑھکر صراحت ہے۔

امنا عبد الله بن ابي اوفى على جنازة ابنته فكبر اربعاً فمكث ساعة حتى ظننا انه سيكبر خمسا ثم سلم عن يمينه و عن شماله.

یعنی عبد اللہ بن ابی اوفی نے ہمیں اپنی بیٹی کی نماز جنازہ کی امامت کرائی جس میں انہوں نے چار تکبیریں کہیں اور ایک ساعت ٹھہرے رہے حتیٰ کہ ہم نے خیال کیا کہ وہ پانچویں تکبیر بھی کہیں گے مگر انہوں نے دائیں اور بائیں سلام پھیر دیا۔

السنن الکبریٰ ص ۴۳ ج ۴، وریاض الصالحین ص ۲۵۵، واللفظ له

اس روایت نے مبتدعین کی جملہ تاویلیں اور ہیرا پھیریوں پر پانی پھیر دیا ہے، یہی روایت سنن ابن ماجہ میں قدرے الفاظ کے اختلاف سے مروی ہے کہ

صليت مع عبد الله بن ابي اوفى الاسلامي صاحب رسول الله ﷺ على جنازة ابنة له فكبر عليها اربعا فمكث بعد الرابعة شيئا قال سمعت القوم يسبحون به من نواحى الصفوف فسلم ثم قال اكنتم ترون انى مكبر خمسا قالوا تخوفنا ذلك قال لم اكن لا فعل و لكن رسول الله ﷺ كان يكبر اربعا ثم يمكث ساعة فيقول ماشاء الله ان يقول ثم يسلم، ص ۱۰۹ /

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی عبد اللہ بن ابی اوفی کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی ان کی بیٹی پر، تو انہوں نے چار تکبیریں کہیں، پھر چوتھی تکبیر کے بعد ذرا ٹھہرے، میں نے لوگوں سے سنا کہ وہ صفوں کے کناروں سے سبحان اللہ کہہ رہے تھے (اس وجہ سے شاید عبد اللہ بھول گئے ہیں) آخر انہوں نے سلام پھیر دیا پھر کہا کیا تم سمجھتے تھے کہ میں پانچ تکبیریں کہوں گا؟ مقتدیوں نے کہا ہم اسی سے ہی ڈرے، عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں ایسا کرنے والا نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ چار تکبیریں کہتے تھے پھر تھوڑی دیر ٹھہرتے اور جو اللہ کو منظور ہوتا وہ کہتے پھر سلام پھیرتے۔

سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فى التكبير على الجنائز اربعا .

اس روایت نے رہی کسبھی نکال دی ہے اور مفتی صاحب کے استدلال بلکہ خیانت و بے ایمانی کا ایسا کچومر نکالا ہے کہ مبتدعین کو لینے کے دیئے پڑ گئے ہیں۔

ثانیاً۔ سند کے اعتبار سے یہ روایت پرلے درجے کی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ابراہیم بن مسلم الکوفی معروف لہجری ہے اور اسے محدثین کرام کی جماعت نے ضعیف و متروک کہا ہے چنانچہ امام ابن معین فرماتے ہیں کہ اس کی روایات بیچ محض ہیں امام ابو زرعہ کہتے ہیں وہ ضعیف ہے ابو حاتم اس کو ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں امام بخاری اسے منکر الحدیث قرار دیتے ہیں امام ترمذی اس کی تضعیف کرتے ہیں امام نسائی کا کہنا ہے کہ منکر الحدیث ہے اس کی روایات کو لکھا ہی نہ جائے امام ابو احمد الحاکم کہتے ہیں محدثین کرام اسکی روایات کی تضعیف کرتے ہیں اور میرے نزدیک اس کی روایات قابل احتجاج نہیں، امام احمد امام ابن سعد، سعدی، حربی، وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں امام علی ابن حسن بن جنید اس کو متروک الحدیث فرماتے ہیں، جہذیب ص ۱۴۲ ج ۱ طبع فاروقی کتب خانہ۔

حافظ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ موقوف روایات کو مرفوع بنا دیا کرتا تھا، تقریباً ص ۱۶، علامہ ذہبی نے محدث ابن عیینہؒ کا چشم دید واقع نقل کیا ہے کہ موصوف شطرنج کھیلا کرتے تھے، میزان ص ۶۶ ج ۱، امام ابن عدی نے، الکامل ص ۲۱۴ ج ۱ میں امام عقیلی نے، الضعفاء الکبیر ص ۶۵ ج ۱ میں اسے ضعفاء میں شمار کیا ہے، الغرض ہجری کی وجہ سے یہ روایت ہی ضعیف ہے لہذا سرے سے یہ قابل التفات ہی نہیں، خلاصہ کلام یہ کہ مذکورہ روایت مفتی صاحب کی عدم دلیل کے باوجود ضعیف ہے، اللہ اللہ خیر سلا۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

بیہقی میں ہے

وعن المستظل بن حصین ان علیاً صلی علی جنازۃ بعد ماصلی علیہ۔
مستظل بن حصین سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے پر نماز کے بعد دعا مانگی۔ جاء الباطل ص ۲۷۵ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے روایت کا ترجمہ غلط کیا ہے، کیونکہ اس میں دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا بیان ہے، امام بیہقی نے اس روایت کو درج ہی دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کے باب میں کیا ہے، پھر اس روایت کے اجمال کو دور کرنے کیلئے انہوں نے اس سے پہلے دو روایات مزید نقل کی ہیں جن کے الفاظ یہ ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ نے ایک نماز جنازہ پڑھایا بعد میں مزید لوگ آئے تو انہوں نے کہا۔

فقالوا یا امیر المومنین لم نشهد الصلوة علیہ فصلی بہم فکان امامہم قرظہ
بن کعب، السنن الکبریٰ ص ۴۵ ج ۲۔

انہوں نے کہا کہ اے امیر المومنین! ہم اس کی نماز جنازہ میں شامل نہیں ہو سکے تو آپ رضی اللہ عنہ نے انکے ساتھ (مکرر) نماز پڑھی اور ان کے امام قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔

الغرض مفتی صاحب کی مذکورہ دلیل فقط نماز جنازہ کو دوبارہ پڑھنے کے بیان میں ہے، جو ان کے تقلیدی مذہب پر حجت تامہ ہے مگر مفتی صاحب اس روایت سے دعا کا استدلال کر رہے ہیں،

اے جی اس بات کی وضاحت تو کیجئے کہ امامت کا تعلق نماز سے ہے یا کہ دعا سے؟ جو کہ آپ اس سے دعا بعد نماز جنازہ ثابت کرنے کے درپے ہیں،

ثانیاً۔ مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ سلسلہ اسناد میں امام سفیان ثوری ہیں جو کہ بلاشبہ ثقہ حافظ عابد ہیں مگر مدلس ہیں ان کی تدلیس کی بحوالہ صراحت دین الحق جلد اول ص ۴۱۱ میں گزر چکی ہے وہاں سے دیکھ لی جائے، ہاں البتہ یہاں بریلوی مکتب فکر پر حجت قائم کرنے کی غرض سے ان کے کلمہ محدث اعظم کا ایک حوالہ نقل کر دیا جاتا ہے، چنانچہ مولوی محمد شریف آف کوٹلی لوہاراں (تلمیذ احمد رضا) لکھتا ہے کہ

سفیان کی روایت میں تدلیس کا شبہ ہے، فقہ الفقہ ص ۱۳۴،

اور زیر بحث روایت سماع کی صراحت کے بغیر صیغہ عن سے مروی ہے لہذا حجت نہیں، الغرض یہ روایت مفتی صاحب کے مخالف بھی ہے اور عدم دلیل کے علاوہ ضعیف بھی!

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

مدونة الکبریٰ میں ہے

يقول هكذا كلما كبروا اذا كان التكبير الاخر قال مثل ذلك ثم يقول اللهم

صلى على محمد .

ہر تکبیر پر اسی طرح کہے کہ جب آخری تکبیر ہو تو اسی طرح کہے پھر کہے اللھم صلی علی محمد۔ اس

سے معلوم ہوا کہ بعد نماز جنازہ درود شریف پڑھے، جاء الباطل ص ۲۷۶ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ مالکی فقہ کی کتاب ہے، معلوم نہیں کہ مفتی صاحب حنفی ہو کر مالکی کتب سے قے خوری

کیوں کر رہے ہیں،

ثانیاً۔ مفتی جی نے جو حوالہ پیش کر کے مطلب نکالا ہے وہ حقیقتاً عبارت کا مفہوم نہیں بلکہ مفتی صاحب کا اپنا تصور اور قطع و برید ہے کیونکہ مذکورہ عبارت سے قبل ایک دعا کا ذکر ہے اور مطلب عبارت کا یہ ہے کہ ہر تکبیر کے بعد وہ دعا پڑھے اور جب آخری تکبیر ہو تو وہ دعا پڑھے اور درود شریف بھی، ثم ینصرف، پھر سلام پھیر دے،

دیکھئے مدونۃ الکبریٰ ص ۱۵۹ مطبع خیریہ،

مگر مفتی صاحب کمال عیاری سے اسے بعد نماز جنازہ پر محمول کر رہے ہیں جو کہ ان کی صریحاً بدیانتی ہے، افسوس کہ مفتی صاحب کا لقب تو حکیم الامت مفتی اعظم ہے اور ہیرا پھیریاں کرنے میں یہود سے بھی سو ہاتھ آگے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون، اس سے ثابت ہوا کہ یہ شخص حکیم الامت کی بجائے مریض الامت اور مفتی اعظم کی بجائے مفتی اعظم تھا،

ثالثاً۔ اگر بالفرض انہوں نے ایسا لکھا بھی ہو تو ہم پر قرآن و سنت کے علاوہ کسی کا قول و عمل حجت نہیں، ایسے اقوال جو مخالف قرآن و حدیث ہیں انہیں اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

مبسوط شمس الائمہ سرخسی جلد دوم ص ۶۷ باب غسل لیت میں روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک جنازے پر بعد نماز پہنچے اور فرمایا۔

ان سبقتموننی بالصلوۃ علیہ فلا تسبقونی بالدعاء.

اگر تم نے مجھ سے پہلے نماز پڑھ لی ہے تو دعا میں مجھ سے آگے نہ بڑھو یعنی آؤ میرے ساتھ مل کر دعا کرو۔

جاء الباطل ص ۶۷ ج ۱۷

الجواب

اولاً۔ یہ روایت حدیث کی کس کتاب میں مروی ہے؟ اس کا ثبوت مبتدعین پر ادھار ہے، اگر علماء بریلی کہہ دیں کہ مبسوط میں علامہ سرخسی نے نقل تو کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء احناف نقل احادیث میں معتبر نہیں جس کی ضروری تفصیل دین الحق جلد اول کے ص ۱۷ میں راقم نے کر دی ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا متن روایت کے بالمقابل یہ لکھنا، آؤ میرے ساتھ مل کر دعا کر لو، غلط بیانی ہے کیونکہ روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ معنی ہو، یہ مفتی صاحب کی ذاتی اختراع اور خانہ ساز عبارت ہے جو کہ سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

ثالثاً۔ یہ دعا کب کی گئی، دفن سے پہلے یا بعد، قبرستان میں، یا مسجد میں، یا گھر میں، اس روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، مفتی صاحب کا اسے خاص بعد از جنازہ باور کرانا ایجاد بندہ ہے، و بس۔

مفتی صاحب کی آٹھویں دلیل

مشکوٰۃ باب الذکر بعد الصلوٰۃ میں ہے

قيل يا رسول الله ﷺ اى الدعاء اسمع قال جوف الليل الاخر و دبر الصلوات المكتوبات.

حضور علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کون سی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے؟ فرمایا کہ آخر رات کے درمیانی حصہ میں اور فرض نمازوں کے پیچھے۔

مفتی صاحب وجہ استدلال میں فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ بھی فرض نماز ہے پھر اس کے بعد کیوں دعا نہ کی جاوے، جاء الباطل ص ۲۷۷ ج ۲۔

الجواب

اولاً۔ اس روایت میں اجتماعی دعا بعد از نماز جنازہ کا قطعاً بیان نہیں ہے، کیونکہ مفتی جی کا دعویٰ تو خاص ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعی خاص ہے اور اہل بنی ش جانتے ہیں کہ عام سے خاص ثابت نہیں ہوتا مثلاً اگر بکر کہے کہ زید گھر سے چلا گیا ہے تو اس فقرے کا یہ معنی لینا کہ زید ضرور بھر ضرور حج بیت اللہ کیلئے گیا ہے، غلط ہے، اس لئے کہ حج کو جانا ایک خاص سفر ہے اور زید کے گھر سے جانے سے اس کے بیت اللہ جانے کی دلیل نہ ہوگا۔

ثانیاً۔ دبر الصلوٰۃ، کا معنی سلام پھیر کر اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر امام کا دعا منگوانا اور مقتدیوں کا آمین آمین کہنا، لغت کی کس کتاب میں لکھا ہے، جان من لغت میں دبر کسی چیز کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں۔

علامہ زبیدی فرماتے ہیں

الدبر من كل شى عقبه و موخره و من المجاز جنتك دبر الشہر اى آخره.

یعنی دبر ہر چیز کی انتہا اور آخری حصہ کو کہتے ہیں اور مجاز میں سے ہے آیا تیرے پاس مہینے

کا، دبر، سو اس کا معنی ہے مہینے کا آخر آیا۔ تاج العروس ص ۱۹۷ ج ۳۔

علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں

الدبر نقيض القبل و دبر كل شىء، عقبه و مؤخره۔
یعنی دبر (پچھلا حصہ) قبل (اگلے حصے) کی ضد ہے اور معنی اسکا ہر چیز کا آخری حصہ ہے۔

لسان العرب ص ۲۶۸ ج ۴

علامہ فیومی فرماتے ہیں

الدبر خلاف القبل من كل شىء و منه يقال الاخر امر۔ دبر
یعنی دبر قبل کے خلاف ہے، تمام چیزوں میں، اور اسی وجہ سے الاخر امر، کو دبر کہتے ہیں۔
المصباح المنیر ص ۱۸۸۔

مولوی فیروز الدین کہتے ہیں

دبر (ع-ا-مٹ) کسی چیز کا پچھلا حصہ، فیروز اللغات ص ۶۱۵۔

الغرض کسی چیز کے آخری حصہ کو دبر کہتے ہیں اور آخری حصہ تب ہی ممکن ہے جب وہ اسکا جزو
ہوگی ورنہ اس سے علیحدہ کہلائے گی، جب آپ نے اس چیز کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب آئیے ہم آپ
کو دبر الصلوٰۃ کا معنی و مفہوم بتاتے ہیں کہ تشہد میں درود کے بعد اور سلام سے پہلے حصہ کو دبر الصلوٰۃ
کہتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سید دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ دعائیں مانگا کرتے تھے، سلام
کے بعد اذکار تو آپ علیہ السلام سے منقول ہیں مگر دعائیں مروی نہیں، گویا سنت فعلی نے، دبر
الصلوٰۃ، کا معنی متعین کر دیا کہ تشہد میں درود کے بعد اور سلام سے پہلے حصہ کو، دبر الصلوٰۃ، کہا جاتا
ہے۔

ثالثاً۔ مذکورہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اس پر دو وجہ سے کلام ہے (۱) سند میں
ابن جریج ہیں، ترمذی مع تحفة ص ۲۵۸ ج ۴، جو کہ زبردست مدلس ہیں۔

حافظ ابن حجر طبقات کے تیسرے درجے میں انہیں شمار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

وصفه النسائي و غيره بالتدليس، قال الدارقطني، شر التدليس تدليس ابن
جریج، فانه قبيح التدليس، لا يدلّس الا فيما سمعه من مجروح۔

یعنی اس کے مدلس ہونے کی امام نسائی وغیرہ نے صراحت کی ہے امام دارقطنی فرماتے ہیں
بدترین تدلیس ابن جریج کی ہے کیونکہ وہ نہیں تدلیس کرتے مگر مجروح راویوں سے،

طبقات المدلسین ص ۴۱ رقم ۸۳) تقریب میں فرماتے ہیں کہ ابن جریج ثقہ اور فہم ہیں لیکن تدلیس کرتے ہیں تقریب ص ۱۶۵) علامہ ذہبی فرماتے ہیں ابن جریج مدلس ہیں۔

میزان الاعتدال ص ۶۵۹ ج ۲۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ابن جریج گو ثقہ ہیں مگر زبردست اور بدترین قسم کی تدلیس کرتے ہیں اور زیر بحث روایت میں وہ سماع کی صراحت کے بغیر صیغہ عن سے بیان کر رہے ہیں لہذا حجت نہ ہوئی۔
(۲) حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے عبدالرحمان بن سابط ہے اور اس کی کسی صحابی سے ملاقات ثابت نہیں، حافظ ابن حجر، الاصابہ، میں فرماتے ہیں۔

لا یصح لہ سماع من صحابی .

یعنی انکا کسی صحابی سے سماع ثابت نہیں۔ ص ۱۴۸ ج ۳، القسم الرابع من حرف العین، وکذا فی مرعاة ص ۳۲۶ ج ۳۔

فن حدیث کے عظیم الشان امام یحییٰ بن معینؒ کے حوالے سے امام ابو حاتم فرماتے ہیں۔

قیل لیحییٰ سمع من ابی امامۃ؟ قال، لا،

یعنی امام یحییٰ بن معینؒ سے کہا گیا کیا عبدالرحمان نے حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے سماع کیا ہے تو انہوں نے کہا نہیں، مراسل ابن ابی حاتم ص ۱۴۸، امام یحییٰ کے اس قول کو حافظ ابن حجر نے بھی، تہذیب ص ۱۶۳ ج ۶، میں نقل کر کے اس پر خاموشی اختیار کی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا بھی یہی رجحان ہے، آئیے ہم آپ کو حنفیت کے نامور وکیل جناب علامہ زیلعیؒ سے اس کی تصدیق کروا دیتے ہیں، چنانچہ موصوف تخریج ہدایہ، میں امام ابن قطان کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ

واعلم ان ما یرویہ عبد الرحمن بن سابط عن ابی امامۃ لیس بمتصل وانما ہو منقطع، لم یسمع منہ.

معلوم ہونا چاہیے کہ عبدالرحمن بن سابط جو حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتا ہے وہ متصل نہیں بلکہ منقطع ہے کیونکہ اس نے حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی سنا نہیں،

نصب الرایۃ ص ۲۳۵ ج ۲

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس میں ابن جریج کی بدترین تدلیس کے علاوہ سند کے لحاظ سے روایت منقطع ہے۔

مفتی صاحب کی نویں دلیل

مشکوٰۃ کتاب الدعوات میں ہے کہ

الدعاء هو العبادة۔ اسی جگہ یہ بھی ہے۔ الدعاء مخ العبادة، دعا عبادت بھی ہے، یاد دعا اصل عبادت ہے۔

دعا مانگنے کے لئے کوئی وقت وغیرہ کی پابندی نہیں، تو اس کی کیا وجہ ہے کہ نماز جنازہ سے پہلے تو دعا جائز اور دفن کے بعد بھی جائز مگر نماز کے بعد اور دفن سے پہلے حرام؟
نماز جنازہ بھی کوئی جادو ہے کہ اس کے پڑھتے ہی دعا کرنا۔ ایصال ثواب کرنا سب حرام اور دفن میت اس جادو کا اتار ہے کہ دفن ہوا اور سب جائز ہو گیا۔ لہذا ہر وقت دعا اور ایصال ثواب جائز ہے کسی وقت کی پابندی نہیں ہیں۔ جاء الباطل ص ۲۷۸ ج ۱

الجواب

اولاً، میت کے لئے دعا اور ایصال ثواب کو ایک باور کرانا مفتی صاحب کی غلط بحث ہے کیونکہ دعا تو شفاعت کے زمرے میں آتی ہے اور ایصال ثواب ہدیہ کے قبیل سے ہے۔

ثانیاً مذکورہ روایات کو بعد از نماز جنازہ کے متعلق کہنا مفتی صاحب کی غلط بیانی ہے کیونکہ ان میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ معنی ہو کہ جنازہ کے بعد دعا، عبادت ہے یا عبادت کا مغز ہے، جب اس حدیث میں ایسا کوئی لفظ ہی نہیں تو پھر یہ آپ کے دعوے کی دلیل کیسے ہوئی، جان من دلیل عام سے حکم خاص ثابت نہیں ہوتا،

ثالثاً۔ آپ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد اجتماعی طور پر دعا مانگنا فرض اور واجب نہیں ہے چنانچہ دشمن توحید وسنت مجدد بدعات مولوی احمد رضا خان فاضل بریلی لکھتا ہے۔

نماز (جنازہ) کے علاوہ دعا شرعاً ضروری و واجب نہیں جس کے لئے قیام و درنگ (دیر) پسند کریں شرع میں بخشنی دعا ضروری تھیں یعنی نماز جنازہ وہ ہو چکی،

بذل الجواز علی الدعا بعد صلاة الجنائز مندرجہ فتاویٰ رضویہ ص ۲۷ ج ۴، جب بقول مولوی احمد رضا خان بعد نماز جنازہ اجتماعی دعا واجب تو کجا سرے سے ضروری ہی نہیں تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ مغز کیسے ہوئی، کیا کسی چیز کا مغز بھی غیر ضروری ہوتا ہے، مفتی جی آئیے ہم آپ کو حدیث کا مفہوم سمجھائیں۔ نماز میں جودعا فرض و واجب ہے وہی اس کا مغز ہے جنازہ میں میت کے حق میں دعا فرض ہے اور یہی اس کا مغز ہے عام نمازوں (سنن و فرائض) میں فاتحہ کی دعا فرض ہے۔ اور یہی ان کا مغز ہے۔

رابعاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ جنازہ ہی کو ایسا منتر ہے جس سے دعا للمیت منع ہوگی، تو جواباً عرض ہے کہ آپ کے نزدیک بھی چوتھی تکبیر کے بعد دعا کرنا منع ہے۔ جاء الباطل ص ۲۸۱، تو صراحت کیجئے اس کے بعد کیوں ناجائز ہے اگر بریلوی مکتب فکر کے علماء کہہ دیں کہ اس کا ثبوت شریعت میں نہیں: تو ہم بھی کہتے ہیں اس کا بھی ثبوت شریعت سے نہیں ہے۔

تنبیہ اول

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت۔ الدعاء مخ العبادۃ، کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی صراحت کی ہے،

هذا حديث غريب من هذا الوجه لا نعرفه الا من حديث ابن لهيعة،
یعنی یہ روایت غریب ہے (یعنی صرف اسی ایک ہی سند سے مروی ہے) اس وجہ سے کہ اسے ہم نہیں جانتے مگر ابن لہیعہ کی حدیث سے،

ترمذی مع تحفہ ص ۲۲۳ ج ۴، اور امام ترمذی نے، السنن، کے باب الرخصة فی استقبال القبلة بغائط و بول، میں صراحت کی ہے کہ ابن لہیعہ محدثین کرام کے نزدیک ضعیف ہے اسے امام یحیی القطان نے ضعیف کہا ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۲۱ ج ۱، علاوہ ازیں عبد اللہ بن لہیعہ۔ زبردست قسم کے مدلس تھے امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ کان صالحاً ولكن يدلس عن الضعفاء، یعنی ضعفاء سے تدلیس کرتا تھا، کذا فی طبقات المدلسین صفحہ ۵۴، اور زیر بحث روایت سماع کی صراحت کے بغیر عن سے مروی ہے الغرض ابن لہیعہ کے ضعف و تدلیس کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے،

تنبیہ ثانی

دفن کے بعد قبر پر قراۃ قرآن کا مسئلہ

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں مفتاح الصلاۃ صفحہ ۱۱۲ مصنف مولانا فتح محمد صاحب برہان پوری میں ہے کہ جب نماز جنازہ سے فارغ ہوں تو مستحب ہے کہ امام یا کوئی اور صالح آدمی سورۃ بقرہ کا شروع رکوع مفلحون تک جنازے کے سرہانے اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات امن رسول میت کے بائیں طرف پڑھے کہ حدیث میں آیا ہے بعض احادیث میں دفن کے بعد واقعہ ہوا ہے میسر ہو تو دونوں وقت پڑھے جائز ہے، جاء الباطل ص ۲۷۶۔

الجواب: اولاً، دفن کے بعد قبر پر سورہ بقرہ کی تلاوت کرنے کی روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے موقوف اور مرفوع مروی ہے، موقوف روایت کو امام بیہقی نے، السنن الکبریٰ ص ۵۶ ج ۴ میں اور مرفوع کو امام طبرانی نے، معجم کبیر ص ۳۴۰ ج ۱۲ (۱۳۶۱۳) میں اور بیہقی نے، شعب الایمان ص ۱۶ ج ۷ (۹۲۹۴) میں روایت کیا ہے، بعض نے مرفوع کی تضعیف کر کے موقوف روایت کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ یہ روایت دونوں ہی طریق سے سخت ضعیف ہے، ہمارے شیخ اور استاذی المکرم مولانا محمد یحییٰ گوندلوی فرماتے ہیں کہ

مرفوع روایت یحییٰ بن عبد اللہ بن الضحاک الباہلی کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس کا استاد ایوب بن نہیک کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ خطا کرتا تھا ابو حاتم وغیرہ کہتے ہیں ضعیف ہے، ازدی کہتے ہیں متروک ہے (میزان ص ۲۹۴ ج ۱، علاوہ ازیں اس روایت میں انقطاع بھی ہے۔

موقوف روایت میں راوی عبد الرحمن بن علاء بن الجلاح کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور کسی محدث سے انکی توثیق نہیں ہو سکی، البانی نے اسکو مجہول کہا ہے اور ترمذی سے بھی اس کے مجہول ہونے کا اشارہ نقل کیا ہے (مشکوۃ البانی ص ۴۹۲ و ص ۵۳۸ ج ۱) اور اسی بناء پر حوالہ مذکورہ ص ۵۳۸ ج ۱ میں اس روایت پر ضعیف کا حکم لگایا ہے۔

جن محدثین کرام نے اس پر سکوت کیا ہے غالباً ان کے پیش نظر ابن حبان کی توثیق ہے مگر

اکیلے ابن حبان کی توثیق کسی صحت روایت کیلئے کافی نہیں کیونکہ مجاہیل کی توثیق میں ان کا مذہب معروف ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ راوی جس سے صرف ایک راوی نے روایت کی ہوں وہ ان کے ہاں ثقہ ہے جبکہ وہ متروک اور کذاب نہ ہوں ان کا مذہب ہے کہ جب تک قدح اور جرح معلوم نہ ہوں تو راوی ثقہ ہے جیسا کہ فرماتے ہیں۔

لان العدل من لم يعرف منه الجرح ضد التعديل فمن لم يعلم بجرح فهو عدل
اذا لم يتبين ضده اذ لم يكلف الناس معرفة ما غاب عنهم وانما كلفوا الحكم
بالظاهر من الاشياء غير المغيب عنهم (کتاب الثقات ص ۱۳ ج ۱)

یہی وجہ ہے کہ انکی ثقات میں بہت سے راوی ایسے ہیں جن پر اسلاف نے مجہول ہونے کا حکم لگایا ہے، میزان الاعتدال ص ۹۹ ج ۲ و ص ۱۵۱ ج ۲، اور دیگر بہت سی جگہوں میں ابن حبان کے اس قاعدے کو ذکر کر کے راوی کو مجہول قرار دیا ہے حالانکہ ابن حبان کے نزدیک وہ ثقہ ہے۔ بنابرین قاعدہ یہی ہے کہ ابن حبان اکیلے کی توثیق صحت روایت کے لئے کافی نہیں ہوتی، عبد الرحمن بن علاء کی روایت ترمذی میں موجود ہے مگر امام ترمذی نے اس پر کوئی حکم نہیں لگایا ہے بلکہ صرف یہی فرمایا ہے انما نعرفه من هذا الوجه (ترمذی مع تحفہ ص ۱۲۸ ج ۲ حالانکہ، ضعیف روایت کو حسن کہنے کا تساہل امام ترمذی کا معروف ہے۔

ثانیاً۔ روایت ضعیف ہونے کے ساتھ مفتی صاحب کے موقف کی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس میں ہے جب تم مجھے قبر میں داخل کر لو تو پھر یہ کچھ پڑھو۔ جبکہ مفتی صاحب اسے بعد از نماز جنازہ کی دعا کی دلیل بنا رہے ہیں۔ (محمد یحییٰ گوندلوی)

ثالثاً۔ راقم عرض کرتا ہے کہ قراۃ قرآن عبادت ہے، اور قبر محل عبادت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورہ بقرہ پڑھی جائے، مسلم ص ۲۶۶ ج ۱، اس سے ثابت ہوا کہ قبر سورہ بقرہ پڑھنے کی جگہ نہیں ہے، یہ حدیث بالکل اس حدیث کی طرح ہے جس میں آپ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ گھروں کو قبرستان نہ بناؤ! ان میں نماز پڑھا کرو، صحیح مسلم ص ۲۶۵ ج ۱، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح قبرستان میں قرآن بھی جائز نہیں۔

نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

اور ہر نماز کے بعد دعا مسنون ہے جاء الباطل ص ۲۷۷، اس عبارت کے بعد انہوں نے جوف اللیل کی روایت کو پیش کیا ہے جس سے غالباً ان کا مقصود اجتماعی طور پر دعا مانگنے کو ضروری قرار دینا ہے حالانکہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی طور دعا مانگنا مسنون تو کجا بدعت ہے اس کا شریعت حقہ سے قطعاً ثبوت نہیں ملتا، چنانچہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی حنفی، سفر السعادة کی شرح میں فرماتے ہیں کہ، اما این دعا کہ آئمہ مساجد بعد از سلام میکنند و مقتدیان آمین آمین میگویند چنانچہ الآن در دیار عرب و عجم متعارف است از عادت پیغمبر خدا ﷺ نہ بود و درین باب هیچ حدیث ثابت نہ شد،،

یعنی یہ دعا جو آئمہ مساجد میں سلام پھیرنے کے بعد کرتے ہیں اور مقتدی آمین آمین کہتے ہیں چنانچہ عرب و عجم کے ممالک میں رائج ہے یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ سے نہیں اور اس باب میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہوئی، شرح سفر السعادة ص ۹۰۔ طبع مکتبہ رضویہ سکھر ۱۳۹۸ھ۔ علامہ حموی الاشباہ والنظائر کی شرح میں فرماتے ہیں،

وصرح ابن حجر بان الاجتماع للدعاء برفعه بدعة اقول ما قال ابن حجر هو الحق الذي لا مربة فيه فان تعريف البدعة صادق عليه .

یعنی ابن حجر نے اسکی تصریح کی ہے کہ ہاتھ اٹھا کر جمع کے ساتھ دعا کرنا بدعت ہے، میں احمد کہتا ہوں کہ ابن حجر نے جو کہا ہے وہ بالکل حق ہے جس میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ بدعت کی تعریف اجتماعی دعا پر صادق آتی ہے۔ حموی شرح الاشباہ ص ۴۰۰

مولانا عبدالحق لکھنوی جو کہ ماضی قریب میں حنفیت کے نامور وکیل گزرے ہیں فرماتے ہیں یہ طریقہ جو فی زمانہ مروج ہے کہ امام سلام کے بعد رفع یدین (ہاتھ اٹھا کر) کے ساتھ دعا مانگتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں حضور سرور عالم ﷺ کے زمانے میں نہ تھا جیسا کہ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس کی تصریح کی ہے، مجموعۃ الفتاویٰ عبدالحق مترجم ص ۲۳۲ ج ۱۔

مذکورہ دونوں عبارات تو بریلوی علماء کے لیے خاکسار نے نقل کی ہیں، سلفی علماء کے لیے عرض ہے کہ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ، اما دعا الامام والمأمومین جميعا عقیب الصلاة بدعة، لم یکن علی عهد النبی ﷺ، بل انما کان دعاؤه فی صلب الصلاة، فان المصلی یناجی ربہ فاذا دعا حال مناجاته له کان مناسباً.

یعنی نماز کے بعد امام اور مقتدیوں کا مل کر دعا کرنا بدعت ہے، نبی ﷺ کے زمانہ میں یہ طریقہ نہ تھا، بلکہ آپ علیہ السلام کی دعا نہ تھی مگر نماز کے اندر (مانگتے تھے) کیونکہ نمازی اپنے رب سے مناجات کرتا ہے، پس مناجات کے وقت دعا کرنا اس کے لئے مناسب ہے، مجموع فتاویٰ ص ۵۱۹ ج ۲۲

SCANNED BY: MUHAMMAD SHAKIR

FOR COMMENTS, CONTACT:

TRUEMASLAK@INBOX.COM

قبروں پر مزارات کی تعمیر

رسول اللہ ﷺ کی نظر میں

پہلی حدیث

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

نہی رسول اللہ ﷺ ان یجصص القبروان یقعد علیہ و ان ینبئ علیہ۔
یعنی رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے اور اس پر عمارت تعمیر کرنے اور اس پر (مجاور بن کر)
بیٹھنے سے منع فرمایا۔

صحیح مسلم ص ۳۱۲ ج ۲، و مسند امام احمد ص ۲۹۵ ج ۳، و ابوداؤد
ص ۱۰۲ ج ۲، و نسائی (مجتبى) ص ۲۳۱ ج ۱، و ابن ماجہ ص ۱۱۳، و ترمذی
مع تحفه ص ۱۵۵ ج ۲، و السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۴ ج ۴، مستدرک حاکم
ص ۳۷۰ ج ۱، و صحیح ابن حبان رقم الحدیث ۳۱۵۴۔
یہ حدیث قبور پر مزارات تعمیر کرنے کے رد میں نص صریح ہے، اس صحیح حدیث سے مفتی صاحب
نے جس طرح جان چھڑانے کی سعی لاحاصل کی ہے وہ قابل دید ہے ان کے خرافات کا ترتیب وار
جواب ملاحظہ کریں۔

پہلا عذر

جواب۔ قبر کو پختہ کرنے سے منع ہونے کی تین صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ قبر کا اندرونی حصہ جو
کہ میت کی طرف ہے اس کو پختہ کیا جائے، اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا،
ان یجصص القبور۔ فرمایا گیا، یہ نہ فرمایا گیا، علی القبور، جاء الباطل ص ۲۹۰ ج ۱۔

قبر اور مقبرہ کا معنی و مفہوم

الجواب: اولاً۔ حدیث میں قبر کا لفظ ہے جو کہ میت کے دفن کرنے کی جگہ پر بولا جاتا ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں۔

القبر مقر المیت.

یعنی میت کے قرار کی جگہ کو قبر کہتے ہیں، مفردات ص ۳۹۰، اور یہ فقط اندر کے حصے کو ہی نہیں کہتے بلکہ سارے مقبرے کو ہی کہا جاتا ہے جیسے زندہ انسان کے گھر کو اس کی قرار گاہ بولا جاتا ہے، کوئی باشعور انسان گھر کی چھت کو قرار گاہ سے خارج نہیں کہہ سکتا اسی طرح قبر کی اوپر والی سطح بھی قبر میں ہی شامل ہے، علامہ زنجیری حنفی نے تو اس پر مسئلہ بھی دی ہے کہ

وهذا مقبر فلان والبقیع مقبرة المدينة.

یعنی یہ فلاں شخص کی قبر ہے اور بقیع اہل مدینہ کا قبرستان ہے، اساس البلاغة ص ۳۵۲۔ کیوں جناب جب انسان قبر کے تعارف میں کہتا ہے، یہ فلاں شخص کی قبر ہے، تو اشارہ اوپر ڈالی گئی مٹی کی طرف کرتا ہے یا ہاتھ قبر کے اندر داخل کر کے کہتا ہے کہ یہ زید کی قبر ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔

(۱) نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها، الحديث،

یعنی میں پہلے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کرتا تھا مگر اب کیا کرو، صحیح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱، و مشکوٰۃ ص ۱۵۴۔

تو کیا مفتی صاحب اس حدیث کا یہ معنی کریں گے کہ میں تمہیں پہلے تو قبر کی زیارت سے منع کرتا تھا مگر اب اوپر ڈالی گئی مٹی کو علیحدہ کر کے لحد کی زیارت کیا کرو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

(۲) فزروا القبور فانها تذکرو الموت،

یعنی قبروں کی زیارت کیا کرو کہ یہ موت کو یاد دلاتی ہیں، صحیح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱، و مشکوٰۃ

اب اس کا تو مفتی صاحب یہی معنی کریں کہ مقبرے کے اندر والی جگہ لحد کی زیارت کیا کرو کہ یہ موت کو یاد دلاتی ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ ہمیں،

السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین و المسلمین و انا ان شاء الله بکم
للاحقون نسال الله لنا و لکم العافیة۔

کی دعا سکھاتے تھے،

اذا خرجوا الى المقابر،

جب قبرستان کی طرف جاتے، صحیح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱، و مشکوٰۃ ص ۱۵۴۔

اس کا معنی تو مفتی صاحب یہی کرتے ہوئے جب نبی ﷺ لحدوں کی طرف جاتے الخ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے،

لعن زوارات القبور،

قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ مسند احمد ص ۳۳۷ ج ۲ و ترمذی مع

تخفہ ص ۱۵۶ ج ۲، وابن ماجہ ص ۱۱۴، و سنن الکبریٰ للبیہقی ص ۷۸ ج ۴۔

اس حدیث کا مفتی صاحب غالباً یہی معنی بیان کرتے رہے ہوئے کہ لحدوں کی زیارت کرنے

والیوں پر لعنت ہے، انا لله وانا الیہ راجعون۔

اس طرح کی ہم بیسیوں امثلہ پیش کر سکتے ہیں جن میں مقبرہ کو قبر کہا گیا ہے، الغرض قبر فقط

اندر کے حصہ لحد کو ہی نہیں کہا جاتا بلکہ سارے مقبرے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور مفتی صاحب

کا اسے لحد سے ہی خاص کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے اور وہ کسی دلیل شرعی سے اپنے دعویٰ کو قطعاً ثابت

نہیں کر سکتے۔

ثانیاً۔ حدیث میں، ان یجصص القبور، اور بعض روایات میں، القبور، کے الفاظ ہیں، اگر اندر

کا حصہ لحد ہی مراد ہوتا تو حدیث کے الفاظ۔

ان یجصص فی القبور، کے ہوتے ناکہ، ان یجصص القبور، کے، کیونکہ جب قبر کے اندر

کا حصہ بولا جاتا ہے تو اس کیلئے جملہ، فی القبور، ہی مناسب ہے جیسا کہ عذاب قبر اور منکر نکیر کے

سوالات کی احادیث میں اسی طرح کے الفاظ مروی ہیں۔ مشکوٰۃ ص ۲۲

مفتی صاحب کا دوسرا عذر

دوسرے یہ کہ عامۃ المسلمین کی قبور پختہ کی جاویں کیونکہ یہ بے فائدہ ہے تو معنی یہ ہوئے کہ ہر قبر کو پختہ کرنے سے منع فرمایا، جاء الباطل ص ۲۹۰۔

کیا یہ حکم خاص ہے

الجواب: اولاً۔ اس عذر میں خیر سے مفتی صاحب کو یہ مسلم ہوا کہ، ان یجصص، میں لحد نہیں مقبرہ مراد ہے، ورنہ اس تاویل بلکہ تحریف کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ثانیاً۔ حدیث کے الفاظ عام ہیں، انہیں خاص کرنے کی مبتدعین کے پاس کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، محض اپنے قیاس فاسد سے اسے مقید کر رہے ہیں جبکہ حدیث کے الفاظ عام ہیں۔
ثالثاً۔ معتقدین ہمیشہ اپنے زعم میں نیک و صالح کی قبر پر ہی مزارات تعمیر کرتے ہیں گو وہ نیک و صالح ہو یا نہ ہو یہ الگ بات ہے۔

جب شریعت نے عموم سے قبور پر تعمیر عمارت سے منع فرمایا تو اولیاء کی قبور اس سے مستثنی نہ رہیں۔

چنانچہ قاضی شمس الدین صاحب پانی پتی لکھی (م ۱۲۲۵ھ) فرماتے ہیں۔

آنچه بر قبور اولیاء عمارت هائے رفیع بنا میکنند و چراغان روشن می کنند و ازین قبیل هر چه میکنند حرام است، مالا بدمنه ص ۹۵۔

وہ جو کچھ بھی حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر کیا جاتا ہے کہ اونچی عمارتیں بنائی جاتی ہیں اور چراغ روشن کیے جاتے ہیں اور اسی طرح کی تمام چیزیں جو کرتے ہیں حرام ہیں۔

تیسرا عذر

تیسرے یہ کہ قبر کو سجاوٹ تکلف یا فخر کیلئے پختہ کیا، یہ تینوں صورتیں منع ہیں اور اگر نشان باقی رکھنے کیلئے کسی ولی اللہ کی قبر پختہ کی جائے تو جائز ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے حضرت عثمان بن

مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پختہ پتھر کی بنائی جیسا کہ پہلے باب میں عرض کیا گیا ہے، لمعات میں اسی، ان یحصص القبر، کے ماتحت ہے، لمافیہ من الزینۃ والتکلف، کیونکہ اس میں محض سجاوٹ اور تکلف ہے جس سے معلوم ہوا کہ اگر اس لئے نہ ہو تو جائز ہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۰ ج ۱۔

کیا مزار تعمیر کرنے کی ممانعت سجاوٹ کی وجہ سے ہے

الجواب: اولاً۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر پر پتھر نصب کرنے کا جواب آگے مفتی صاحب کی پہلی دلیل کے زیرِ مہ عنوان آ رہا ہے۔

ثانیاً۔ یہ توجیہ مفتی صاحب کی اپنی من گھڑت ہے جسے شارع علیہ السلام نے قطعاً بیان نہیں فرمایا، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو وہ اس تخصیص پر کوئی نص پیش کریں، محض اپنی آراء سے حدیث کے عموم کو خاص نہیں کیا جاسکتا، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی عبارت کو مفتی صاحب نے الٹا سمجھا ہے یا عوام الناس کو مغالطہ دیا ہے کیونکہ شیخ تو یہ کہہ رہے ہیں۔

ان یحصص القبور، لمافیہ من الزینۃ و التکلف، لمعات بحوالہ حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۳۸۔

یعنی قبور کو چونا گچ کرنے سے منع فرمایا کیونکہ اس میں تکلف اور سجاوٹ ہے۔

دیکھئے ان کی عبارت کا مفہوم تو یہ ہے کہ قبر کو پختہ کرنا سجاوٹ اور تکلف ہے، مگر مفتی صاحب اس کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ تکلف و سجاوٹ کی وجہ سے ممانعت ہے، اگر یہ نہ ہوں تو تب قبور پر مزارات کی تعمیر جائز ہے، لعنت اللہ علی الکاذبین۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ حالانکہ سجاوٹ اور تکلف والا محض مغالطہ ہے جس قدر مزارات کی تعمیر میں سجاوٹ اور تکلف کیا جاتا ہے وہ دوسری عمارتوں میں نہیں، کسی بھی مزار کو دیکھ لو اس پر کتنا نقش و نگار ہوا ہوگا اور کتنے لاکھ روپے اس کی سجاوٹ پر صرف ہوئے ہونگے۔ (محمد یحییٰ گوندلوی)۔

ثالثاً۔ نماز اسلام کا بنیادی رکن اور اللہ تعالیٰ کی بہترین عبادت ہے اس کو بھی اگر نمائش کیلئے پڑھا جائے تو یہ بھی ناجائز ہے، جیسا کہ رب العزت نے سورۃ النساء (۱۳۲) میں منافقین کی نماز کا تذکرہ فرمایا ہے۔

الغرض اگر نمائش کا حکم فقط مزارات کے متعلق ہی ہوتا تو ایک بات تھی اور مفتی صاحب کو مفید تھی مگر اس کا حکم تو دین اسلام کے ہر حکم و عمل پر لاگو ہوتا ہے مزارات کی تخصیص ہی کیا ہے۔

چوتھا عذر

ان یبنی علیہ، یعنی قبر پر عمارت بنانا منع فرمایا، اس کے بھی چند معنی ہیں، اولاً تو یہ کہ خود قبر پر عمارت بنائی جاوے اس طرح کہ قبر دیوار میں شامل ہو جاوے، چنانچہ شامی باب الدفن میں ہے۔
و تکرہ الزیادة علیہ لمافی المسلم نہی رسول اللہ ﷺ ان یحصص القبر و ان یبنی علیہ۔

قبر کو ایک ہاتھ سے زیادہ اونچا کرنا منع ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے قبر کو پختہ کرنے اور اس پر کچھ بنانے سے منع فرمایا۔
در مختار میں ہے کہ،

و تکرہ الزیادة علیہ من التراب لانه بمنزلة البناء۔

قبر پر مٹی زیادہ کرنا منع ہے کیونکہ یہ عمارت بنانے کے درجہ میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قبر پر بنانا یہ ہے کہ قبر دیوار میں آ جاوے اور گنبد بنانا یہ حول القبر یعنی قبر کے ارد گرد بنانا ہے، یہ ممنوع نہیں۔ جاء الباطل ص ۲۹۱ ج ۱۔

قبر پر عمارت تعمیر کرنے کا مفہوم

الجواب: اولاً۔ مفتی صاحب نے اس عبارت میں جو جو ہیرا پھیریاں کی ہیں ان کی تفصیل میں جانے سے پہلے آئیے ذرا فتاویٰ شامی کی عبارت کا معنی و مفہوم معلوم کر لیں، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فتاویٰ شامی در مختار کی شرح ہے علامہ صفحی نے در مختار میں لکھا تھا کہ

وبہال التراب علیہ و تکرہ الزیادة علیہ من التراب لانه بمنزلة البناء۔

یعنی قبر پر مٹی ڈالتے وقت (قبر سے نکالی گئی مٹی سے) زیادہ مٹی ڈالنا مکروہ ہے کیونکہ یہ عمارت کے مشابہ ہے۔

(وتکرہ الزیادہ) کی شرح میں علامہ ابن عابدین نے اس کی دلیل درج کرتے ہوئے صحیح مسلم

سے حدیث جابر نقل کی ہے، ولس، دیکھئے فتاویٰ شامی ص ۲۳۶ ج ۲۔

اس تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوئیں (۱) علامہ ہفکی نے یہ قطعاً نہیں کہا کہ عمارت وہی منع ہے جس کی دیوار میں قبر آجائے بلکہ وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ زیادہ مٹی ڈالنا بھی عمارت کے مشابہ ہے، نہ یہ کہ حقیقتاً زیادہ مٹی ڈالنا ہی عمارت ہے۔

معلوم نہیں مفتی صاحب کی عربی اتنی کمزور کیوں تھی، یا جان بوجھ کر اس قدر سطحی باتیں لکھ کر عوام الناس کو اصل مسئلہ سے ہٹا کر ادھر ادھر کے مسائل میں الجھا کر پلہ چھڑانے کی کوشش کرتے تھے، ورنہ ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ عربی میں، بمنزلۃ، سے کسی سے مشابہت دینا مقصود ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا۔

انت منی بمنزلۃ ہرون من موسیٰ، بخاری ص ۵۲۶ ج ۱، و ص ۶۳۳ ج ۲، و مسلم ص ۲۷۸ ج ۲، و مشکوٰۃ ص ۵۶۳۔

(اے علی رضی اللہ عنہ) تو میرے ساتھ ایسے ہی ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ

ہارون،

تو کیا اس حدیث کا یہ معنی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح تھے، نہیں بلکہ یہاں رسول اللہ ﷺ نے فقط تشبیہ دی ہے۔

بالکل اسی طرح علامہ ہفکی نے زیادہ مٹی ڈالنے کو، بناء، کے مشابہہ قرار دیا ہے نہ کہ زیادہ مٹی ڈالنا ہی، بناء علی القبر، ہے۔

(۲) وتکرہ الزیادۃ علیہ، علامہ شامی کی عبارت نہیں بلکہ درمختار کی ہے اور علامہ شامی نے اسے شرح کی غرض سے نقل کیا ہے اور اوپر خط بھی کھینچ دیا ہے تاکہ اشتباہ نہ رہے مگر مفتی جی کا خط دیکھئے کہ وہ اسے علامہ شامی کی عبارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

ثانیاً۔ ان بیانی علیہ، کے یہ اچھوتے معنی آج تک کسی محدث و مفسر نے بیان نہیں کیے، یہ مفتی صاحب کی ذاتی اختراع ہے، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو وہ کسی مسلمہ محدث و فقہی اور لغوی سے اس کا ثبوت دیں ورنہ گھر میں ہی شرما چھوڑیں۔

آئیے ہم آپ کو ایک بات بتائیں جو آپ بوجہ پیری کے بھول گئے ہیں وہ یہ کہ لفظ نخی کا اطلاق

کسی عمارت کے بنانے پر ہوتا ہے، اور بناء کسی تعمیر کی بلندی پر بھی دلالت کرتا ہے، قرآن میں ہے

الذی جعل لکم الارض فراشا والسما بناءً. (البقرہ ۲۲)

وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا۔

انہیں حقائق کے پیش نظر آئمہ لغت نے اس کا ایک معنی قبة بھی کیا ہے۔

دیکھئے تاج العروس ص ۴۶ ج ۱۰، ولسان العرب ص ۹۶ ج ۱۲۔

جب آپ نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ، بنی، کا لفظ جب، علیہ،

کی طرف مضاف ہو تو کسی چیز کے ارد گرد عمارت بنانا ہوتا ہے قرآن میں ہے

فقالوا ابنو علیہم بنیاناً. (الکھف ۲۱)

اور کہنے لگے کہ ان پر عمارت بنا دو۔

اس آیت کی تفسیر میں خود مفتی صاحب نے، روح البیان، سے نقل کیا ہے انہوں نے کہا کہ

اصحاب کھف پر ایسی دیوار بناؤ جو ان کی قبر کو گھیرے، جاء الباطل ص ۲۸۴ ج ۱۔

کیوں جناب گھیرنے کیلئے حول القبر دیوار کا ہونا شرط ہے کہ نہیں؟ اگر ہے یقیناً ہے تو پھر، ان

بینی علیہ، کا معنی کسی چیز کے ارد گرد قبة نما عمارت بنانا، ثابت ہو گیا، اس چیز کو ہی فقہاء نے، فوق

القبر، وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، امام فخر الدین قاضی خاں حنفی التوفی ۲۹۵ھ اس حدیث کا معنی

بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ولا یجصص القبر لماروی عن النبی ﷺ انه نہی عن التخصیص و

التفضیص و عن البناء فوق القبر قالوا اراد بالبناء السط الذي یجعل علی القبر فی

دیارنا، لماروی عن ابی حنیفہ رحمۃ اللہ انه قال لا یجصص القبر ولا یطین ولا

یرفع علیہ بناء و سبط۔

یعنی قبر کو پختہ نہ کیا جائے کہ نبی ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے، چاندی کے پانی سے مرصع کرنے

اور اس کے اوپر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے، فقہاء کرام کہتے ہیں کہ، بناء، سے مراد ایسا قبة ہے

جیسا کہ ہمارے دیار میں قبروں پر (مزارات) تعمیر کئے جاتے ہیں، کیونکہ امام ابو حنیفہؒ نے قبر کو پختہ

کرنے، اس کی لپائی کرنے، اس پر عمارت بلند کرنے اور قبة وغیرہ سے روکا ہے، فتاویٰ قاضی خاں

برجاشیہ عالم گیری ص ۱۹۲ ج ۱ طبع حافظ کتب خانہ کوئٹہ ۱۹۸۳ء)

پانچواں عذر

اس بنانے کی تفسیر خود دوسری حدیث نے کردی جو کہ مشکوٰۃ باب المساجد میں ہے

اللهم لاتجعل قبری و ثنا یبعد اشتد غضب الله علی قوم ن اتخذوا قبور انبیاء

هم مسجد.

اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی پوجا کی جائے اس قوم پر خدا کا سخت غضب ہے جس

نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قبر کو مسجد بنانا اس پر عمارت بنا کر اس کی طرف نماز پڑھنا حرام ہے یہ

ہی اس حدیث سے مراد ہے، قبروں پر کیا نہ بناؤ مسجد، قبر کو مسجد بنانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی

عبادت کی جاوے، یا کم از کم اس کو قبلہ بنا کر اس کی طرف سجدہ کیا جاوے، علامہ ابن حجر عسقلانی فتح

الباری شرح بخاری میں فرماتے ہیں

قال البيضاوی لما كانت اليهود و النصری يسجدون لقبور الانبياء تعظيما

لشانهم و يجعلونها قبله يتوجهون فی الصلوة نحوها و اتخذوها او ثانا لعنهم و منع

المسلمين عن مثل ذلك.

بیضاوی نے فرمایا کہ جبکہ یہود و نصاریٰ پیغمبروں کی قبروں کو تعظیماً سجدہ کرتے تھے اور اس

کو قبلہ بنا کر اس کی طرف نماز پڑھتے تھے اور ان کی قبور کو انہوں نے بت بنا کر رکھا تھا لہذا اس پر

حضور علیہ السلام نے لعنت فرمائی اور مسلمانوں کو اس سے منع فرمایا گیا۔

یہ حدیث معترض کی پیش کردہ حدیث کی تفسیر ہو گئی، معلوم ہو گیا کہ قبہ بنانے سے منع نہیں فرمایا

بلکہ قبر کو سجدہ گاہ بنانے سے منع فرمایا۔ جاء الباطل ص ۲۹۱ ج ۱۔

کیا وثن اور عمارت ہم معنی ہے؟

اولاً: ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی مذکورہ شرح علامہ بیضاوی کی اپنی رائے ہے،

جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ یہ رائے ان صحیح احادیث کے خلاف ہے، جیسا کہ حضرت ابو

سعید خدریؒ فرماتے ہیں حضرت نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ ”ان بینی علی القبر“ صحیح ابن ماجہ ص ۲۶۱ ج ۱ کہ قبر پر عمارت نہ کی جائے۔

اور یہ حدیث کہ:

نہی النبی ﷺ ان بینی القبور او یعقد علیہا او یصلی علیہا
رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر عمارت بنانے سے اور ان پر (مجاور بن کر) بیٹھنے سے یا ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے منع فرمایا، مسند ابویعلیٰ ص ۲۶۱ ج ۲۔

اس حدیث میں مطلقاً قبر پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ مطلقاً اس پر بیٹھنے یا اس کی طرف نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ ظاہر ہے جو قبر پر کسی نیت سے بھی بیٹھتا ہے یا قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے تو وہ اس حدیث کی وعید میں شامل ہے، اس طرح جو شخص بھی خواہ کسی نیت سے قبر پر عمارت تعمیر کرتا ہے، خواہ اس کی نیت تعظیم کی ہو یا نہ ہو بہر حال وہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہے جس سے واضح ہے کہ علامہ بیضاوی کی توضیح بالکل غلط ہے، (محمد یحییٰ گوندلوی)۔

ثانیاً۔ وثن، کیلئے عمارت شرط نہیں یہ مفتی صاحب کی زیادتی ہے، لغت عرب کی معروف اور مستند کتاب لسان العرب میں ہے۔

قال ابن الاثیر الفرق بین الوثن والصنم ان الوثن کل ماله جثة معمولة، من جواهر الارض او من الخشب والحجارة كصورة الادمی تعمل و تنصب فتعبد۔
یعنی امام ابن اثیر نے کہا ہے کہ وثن اور صنم میں یہ فرق ہے کہ وثن کہتے ہیں ہر وہ چیز جس کا جثہ (جسم) جواہر الارض سے ہو خواہ وہ لکڑی ہو یا پتھر، انسانی صورت کی بناوٹ جیسا وضع کیا گیا ہو اور اسے گاڑ کر پرستش کی جائے۔ لسان العرب ص ۴۴۲ ج ۱۳۔

یہی معنی لغت عرب کی عظیم الشان ڈکشنری، تاج العروس ص ۳۵۸ ج ۹، میں کیا گیا ہے۔
علامہ فیومی فرماتے ہیں

الوثن الصنم سواء كان من خشب او حجر او غیرہ۔

یعنی وثن بت کو کہتے ہیں خواہ وہ لکڑی کا ہو یا پتھر کا یا کسی اور چیز کا، المصباح
المیر ص ۶۲۷ ج ۲۔

علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ ”وکل ما یبعد من دون اللہ فهو وثن صنما کان او غیر صنم“ یعنی اللہ کے علاوہ جس کی بھی عبادت کی جائے وہ وثن ہے خواہ وہ صنم ہو یا نہ ہو۔ (التمہید ص ۴۵ ج ۵)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس چیز کی بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ عبادت کی جائے اسے وثن و بت کہتے ہیں، عمارت کو وثن نہیں کہتے، اور نبی ﷺ اسی کی دعا کر رہے ہیں کہ اللہ میری قبر کو وثن نہ بنانا کہ لوگ میری قبر کی عبادت کریں، اللہ تعالیٰ کا اس قوم پر سخت غضب ہے جنہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو مسجد بنایا۔ (موطا امام مالک صفحہ ۱۵۹)

مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ اس حدیث میں لفظ، مسجد، کا معنی عبادت ہے ان کے الفاظ ہیں کہ

قبر کو مسجد بنانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی عبادت کی جاوے، جاء الباطل ص ۲۹۱ ج ۱۔
لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اس سے معلوم ہوا کہ کسی قبر کو مسجد بنانا اس پر عمارت بنا کر اس کی طرف نماز پڑھنا حرام ہے، ص ۲۹۱ ج ۱۔

غلط بیانی ہے کیونکہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں عمارت سے منع فرمایا ہے اور مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت میں عبادت سے منع فرمایا، ظاہر ہے کہ عمارت کی عبادت تفسیر نہیں ہو سکتی، الغرض مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت کا الگ مقام و محل ہے کیونکہ وثن اسے کہتے ہیں جس کی عبادت کی جائے خواہ وہ کچی قبر ہی کیوں نہ ہو جبکہ زیر بحث مسئلہ قبر پر قبہ تعمیر کرنے کا ہے، لہذا ان دونوں کو آپس میں گڈ مڈ نہیں کیا جاسکتا۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے دوہری اذان کی صحیح حدیث کو اس بہانے سے ناقابل عمل قرار دے دیا تھا کہ اس کے الفاظ میں تعارض ہے، دیکھئے جاء الباطل ص ۲۰۳ ج ۲۔

جبکہ یہاں ان کے عذرات میں شدید قسم کا تعارض ہے، کہتے ہیں قبر کو نہیں بلکہ لحد کو پختہ کرنے کی ممانعت ہے۔ (۲) پھر اس کے الٹ فرماتے ہیں کہ ہے تو قبر کو ہی پختہ کرنے کا ذکر مگر عامۃ المسلمین کی قبور کا بیان ہے۔

(۳) کبھی یہ کہہ کر پلہ چھڑانے کی فضول کوشش کرتے ہیں کہ ایسی عمارت کی ممانعت ہے جس

میں قبر کا کچھ حصہ شامل کر لیا جائے، (۴) پھر ان تمام ہفوات کے معارض یہ ڈھکوسلہ گھڑتے ہیں کہ ایسی عمارت کی ممانعت ہے جو صاحب قبر کی عبادت کیلئے بنائی جائے۔

اس قسم کے واہیات عذر پیش کرتے ہیں کہ جو آپس میں ہی ٹکرا کر پارہ پارہ ہو گئے ہیں۔ ہماری طرف سے دنیا بھر کے مبتدعین کو کھلا چیلنج ہے کہ مفتی صاحب کے ان اعتراضات کی آپس میں موافقت ثابت کر دیں، جب یہ ثابت نہ کر سکیں اور کبھی بھی ثابت نہ کر سکیں گے تو پھر جان لینا چاہیے کہ انکے پاس کوئی تسلی بخش جواب تو کجا دل کو بہلانے کیلئے بھی کوئی بہانہ نہیں۔

رابعاً۔ ہمارا تو یہ مشاہدہ ہے کہ عوام مزارات پر جا کر قبروں پر سجدہ کرتے ہیں اور صاحب قبر کو حاجت روا مشکل کشا اور مالک کل تصور کرتی ہیں ان کی قبور کا طواف کرتے ہیں، چنانچہ ملا علی القاری الحنفی التونی ۱۰۱۴ھ مشکوٰۃ کی شرح میں، حدیث اللہم لاتجعل قبری وثناً، کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

ای لاتجعل قبری مثل الوثن فی تعظیم الناس و عودهم للزيارة بعد بدنهم و استقبالهم نحوه فی السجود كما نسمع و نشا هذا الان فی بعض المزارات و المشاهد.

یعنی اللہ میری قبر کو وثن کی طرح نہ بنانا، لوگوں کی تعظیم، زیارت کیلئے گھومنے، ناگاہ استقبال کرنے اور سجدہ جیسی چیزوں سے، جیسا کہ ہم اب بعض مزارات پر (ایسے افعال کا کیا جانا) دیکھتے اور سنتے ہیں۔ مرقاۃ المفاتیح ص ۲۲۸ ج ۲۔

بریلوی مکتب فکر کے شیخ الحدیث اور شارح صحیح مسلم مولوی غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں کہ ان پڑھ لوگوں کو اولیاء اللہ کی نذریں مانتا دیکھ کر، ان کے مزارات مقدسہ کا طواف اور سجدہ کرتے دیکھ کر اور مزارات کی تعظیم میں رکوع کی حد تک ان پڑھ لوگوں کو جھکتے ہوئے دیکھ کر مجھے ایک بڑے عرصہ سے رنج اور قلق رہتا ہے ہر چند کہ ان میں سے کوئی چیز کفر اور شرک نہیں ہے (نعوذ باللہ ابو صہیب) لیکن ان کے حرام ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، شرح صحیح مسلم ص ۵۴۴ ج ۵، طبع فرید بک شال الطبع الرابع ۱۴۱۵ھ ۱۹۹۵ء۔

سعیدی صاحب نے اس عبارت میں قبروں پر سجدہ کرنا ان کا طواف کرنا اور نذر جیسی خالص

عبادت کا ہونا تسلیم کر لیا ہے گو اس کے کفر و شرک ہونے سے انکار کیا ہے مگر حرمت کا اقرار کر لیا ہے، پھر دل کو بہلانے کیلئے ان افعال قبیحہ کا مرتکب عوام کو قرار دے دیا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ کیا حدیث میں اس بات کی تخصیص ہے؟

اگر نہیں قطعاً نہیں تو پھر آپ حضرات ان حرکات کی وجہ سے موجودہ دور کے جملہ مزارات کو وثن و صنم اور بت تسلیم کیوں نہیں کرتے!

کیا آپ کسی معتبر دلیل شرعی سے ثابت کر سکتے ہیں کہ وثن و صنم اور بت فقط وہی ہے جس کی خواص نذریں مانیں ان کی قبور کا طواف کریں ان پر سجدہ کریں، اگر ایسا کوئی ثبوت آپ کے پاس ہی نہیں، تو پھر آپ ہمت کر کے آج ہی ان مزارات پر کفر و شرک اور بقول آپ کے فعل حرام، کی وجہ سے وثن و صنم اور بت ہونے کا جماعتی طور پر اعلان کیجئے اور وقت کی ضرورت کے پیش نظر اس کے خلاف دعوت و تبلیغ کا کام کریں اور ان پڑھ لوگوں کو مزارات پر جا کر اس بات کا قائل کریں کہ آپ کی یہ حرکات شریعت کی نگاہ میں حرام ہیں۔

مگر قارئین کرام آپ اس بات کو جان لیں کہ بریلوی مکتب فکر جماعتی اس کام کو کبھی بھی نہیں اپنائے گا کیونکہ ایسی دعوت و تبلیغ سے خود بریلوی مذہب کو ڈوبنے کا خطرہ لاحق ہو جائے گا، اور مبتدعین کے عوام نجدی نجدی کر کے ان کے ایسے پیچھے پڑیں گے کہ انہیں جان کا جنجال پڑ جائے گا اور ان کے علماء یہ کہہ کر میدان چھوڑ دیں گے کہ جان بچی اور لاکھوں پائے۔

کیا مزار تعمیر نہ کرنے کا حکم تقویٰ کی وجہ سے ہے؟

یہ ممانعت حکم شرعی نہیں بلکہ زہد و تقویٰ کی تعلیم ہے جیسے کہ ہم پہلے باب میں عرض کر چکے ہیں کہ رہنے کے مکانات کو پختہ کرنے سے بھی روکا گیا، بلکہ گرا دیئے گئے۔ جاء الباطل ص ۲۹۱ ج ۱۔
الجواب: اولاً۔ اس اعتراض میں مفتی صاحب کو یہ تو اقرار کرنا پڑا کہ قبروں پر عمارتیں بنانے کی ممانعت موجود ہے مگر اس ممانعت کو وہ زہد و تقویٰ پر محمول کر رہے ہیں جبکہ پہلے اعتراضات میں سرے سے ہی اس حدیث سے مزارات کی ممانعت کے منکر تھے۔

ثانیاً۔ اگر بالفرض مفتی صاحب کے اس اعتراض کو تسلیم کر لیا جائے، تو سوال یہ ہے کہ کیا

بریلوی مکتب فکر کے تمام لوگوں میں بالخصوص علماء میں یکسر زہد و تقویٰ ختم ہو گیا ہے کہ وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہیں، اور ان کے بڑے بڑے جید علماء نے آخر مرتے وقت یہ کیوں وصیت نہ کی کہ میری تربت پر مزار تعمیر نہ کرنا کہ یہ زہد و تقویٰ کے منافی ہے۔

ثالث۔ مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں، جاء الباطل ص ۱۲۷ ج ۱، تو یہاں آپ نے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی کس دلیل شرعی سے لیا ہے۔

کیا مزارات کی تعمیر پر کوئی صحیح حدیث تو کجا کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی موجود ہے کہ آپ ان میں موافقت کی یہ صورت پیدا کر کے، حدیث جابر رضی اللہ عنہ کو زہد و تقویٰ پر محمول کر رہے ہیں، اگر نہیں یقیناً نہیں! تو پھر یہ مجازی معنی ہم بلا قرینہ و دلیل کیسے تسلیم کر لیں، اے جی آپ کا فقط احتمال پیدا کرنا کوئی دلیل نہیں بلکہ آپ کے احتمال کی دلیل درکار ہے، جو آپ کے پاس قطعاً نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب دعویٰ کرتے ہوئے تو آسمان پر جا ٹھہرتے ہیں اور دلیل دیتے ہوئے تحت الثریٰ پر بھی نہیں رکتے۔

رابعاً۔ رہا مفتی صاحب کا پختہ مکان کا عذر لنگ، تو راقم عرض کرتا ہے کہ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کیونکہ پختہ مکان تعمیر کرنے کی ممانعت پر کوئی صحیح حدیث موجود نہیں، اور مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت ضعیف ہونے کے علاوہ ان کے مذہب کی دلیل بھی نہیں، تفصیل آگے ان شاء الرحمن، مفتی صاحب کا اصل موضوع سے انحراف، کے زیر عنوان آرہی ہے۔

ساتواں عذر

جب بنانے والے کا یہ اعتقاد ہو کہ اس عمارت سے میت کو راحت یا فائدہ پہنچتا ہے تو منع ہے کہ غلط خیال ہے اور اگر زائرین کی آسائش کیلئے عمارت بنائی جاوے تو جائز ہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۱ ج ۱۔

کیا زائرین کی آسائش کیلئے مزار بنانا جائز ہے؟

الجواب: اولاً۔ اس اعتراض میں بھی قبر پر عمارت تعمیر کرنے کی ممانعت کا مفتی صاحب نے اقرار کر لیا ہے مگر یہاں زہد و تقویٰ کی بجائے عوام کے غلط خیال پر اسے قیاس کر رہے ہیں، مگر ان کے

اس قیاس پر کوئی دلیل شرعی سرے سے موجود نہیں بلکہ یہ ان کا اپنا قیاس ہے جو غلط اور لغو ہے۔

ثانیاً۔ سوال یہ ہے کہ زائرین کو فقط قبر پر عمارت سے ہی آسائش پہنچتی ہے اگر یہی مقصود ہے تو قبرستان میں درخت لگائے جاسکتے ہیں جس پر ملکی دولت بھی خرچ نہ ہوگی اور ملک کی معیشت پر بوجھ پڑنے کی بجائے، غریب عوام کا رویہ ملک و قوم کی بہتری کیلئے صرف ہوگا، معلوم ہوا کہ زائرین کی آسائش مقصود ہی نہیں ورنہ یہ بتائیں کہ کتنے اولیاء کی قبروں پر انہوں نے مزار کی بجائے درخت لگائے ہیں، ثابت ہوا کہ مفتی صاحب نے پلہ چھڑانے کیلئے ایک بہانہ تلاش کیا ہے! ولس۔

ثالثاً۔ زیارت قبور کا اگر یہ مقصود ہو کہ مردوں کے واسطے استغفار اور دعا کی جائے، قبروں کو دیکھ کر عبرت حاصل ہو اور اپنی موت اور آخرت یاد پڑے، تو تب یہ کام جائز اور امر مستحب ہے، مگر ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ بریلوی مکتب فکر کے لوگ زیارت قبور کی بجائے میت سے فیض حاصل کرنے، ان کے نام کی نذریں چڑھانے کی غرض سے مزارات پر جاتے ہیں، اور ایسے زائرین کیلئے وہاں آسائش کیلئے مزارات تعمیر کرنا، اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔

چنانچہ فقہ حنفی کی معروف کتاب، درمختار میں ہے

واعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام و ما یؤخذ من الدراهم والسمع والذیت و نحوھا الی ضرائح الاولیاء الکرام تقربا الیھم فھو بالاجماع باطل و حرام۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اکثر عوام مردوں کے نام پر جو نذریں دیتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اولیاء کرام کا تقرب حاصل کرنے کیلئے مالی نذرانے پیش کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر چراغ اور تیل جلاتے ہیں وغیرہ یہ سب چیزیں بالاجماع باطل اور حرام ہیں۔

باطل و حرام کی شرح میں علامہ عابدین حنفی فرماتے ہیں

لوجوہ منھ انہ نذر لمخلوق و النذر للمخلوق لایجوز لانبہ عبادۃ و العبادۃ لاتکون لمخلوق و منھا ان المنذور لہ میت و المیت لایملک و منھا انہ ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ تعالیٰ و اعتقادہ ذلک کفر۔

یعنی اس کے باطل و حرام ہونے کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ مزارات پر

چڑھاوے مخلوق کی نذریں ہیں اور مخلوق کی نذریں جائز ہی نہیں کیونکہ نذر (بھی) عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں، اور ایک یہ کہ جس کی نذر دی جاتی ہے وہ مردہ ہے اور مردہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا، ایک وجہ یہ ہے کہ نذر دینے والا شخص مردوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کائنات میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور اس کا یہ اعتقاد کفر ہے۔ فتاویٰ شامی ص ۲۳۹ ج ۲۔

کتاب الصوم باب، مطلب فی النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام من شمع اوزیت او نحوہ، طبع ایچ ایم سعید کمپنی کراچی۔

اس حقیقت کا خود مفتی صاحب کو بھی اقرار ہے فرماتے ہیں کہ

فقہاء اس کو حرام کہتے ہیں جو کہ اولیاء کے نام کی نذر شرعی مانی جائے اسی لئے فرماتے ہیں، تقریباً ایسٹیم، نذر شرعی عبادت ہے اور وہ غیر اللہ کیلئے ماننا یقیناً کفر ہے۔ جاء الباطل ص ۳۰ ج ۱۔ جب بریلوی مکتب فکر کے حکیم الامت مفتی اعظم اور نام نہاد مفسر قرآن کو اس کے کفر کا اقرار ہے تو پھر ہم اس مقام پر علماء بریلویہ کو دعوت فکر دیتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ آپ پاک و ہند کے کسی مزار پر تشریف لے جائیں، وہاں آپ زائرین سے سوال کریں کہ یہاں آپ کس مقصد کے حصول کیلئے آئے ہیں؟ یقین جانئے کہ آپ کو تمام زائرین یہی کہیں گے میں تو دعا کرنے آیا تھا کہ میری فلاں مصیبت و غم دور ہو کیونکہ یہاں اس کے وسیلہ و برکت سے دعا زیادہ قبول ہوتی ہے اور میں نے نذر مانی ہے کہ اگر مصیبت دور ہوئی تو میں اس کے نام کی ایک دیگ اتاروں گا، یا یہاں لا کر بکرا ذبح کروں گا، بعض ایسے بھی ہونگے جنہوں نے ہاتھ میں کلڑ پکڑا ہوگا اور وہ قبر پر کہہ رہے ہوں گے کہ لے لے کلڑ دے دے پتر۔

بعض لوگ اس کی قبر پر جبین رگڑ رہے ہونگے اور زبان حال سے کہہ رہے ہونگے کہ داتا میری فلاں مراد پوری کر دے، کئی حضرات بکرا پکڑے جا رہے ہونگے آپ کے سوال کرنے پر جواب دیں گے کہ میں نے فلاں وجہ سے داتا کی نذر مانی تھی۔ بعض مقام پر کئی کم بخت آپ کو قبر کا طواف کرتے بھی ملیں گے۔

یہ ہماری بدظنی نہیں آئیے فقہاء احناف سے اس کی تصدیق کروا دیتے ہیں، علامہ ابن نجیم حنفی،

شارح کنز الدقائق، اپنی شرح میں شیخ قاسم کی، شرح الدرر، سے نقل کرتے ہیں کہ

واما النذر الذی یبذره اکثر العوام علی ما هو مشاهد کان یكون لانسان غائب او مریض او له حاجة ضرورية فیاتی بعض الصلحاء فیجعل سترة علی راسه فیقول یا سیدی فلان ان رد غائبی اور عوفی مریض او قضیت حاجتی فلک من الذهب کذا، او من الفضة کذا او من الطعام کذا او من الماء کذا او من الشمع کذا او من الذیت کذا فهذا النذر باطل بالاجماع لوجوه منها انه نذر مخلوق والنذر للمخلوق لا یجوز لانه عبادة والعبادة لا تكون للمخلوق ومنها ان المنذور له میت والمیت لا یملک ومنها ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون الله تعالی واعتقاده ذلک کفر.

یعنی اکثر عوام نذر مانتی ہے اور مشاہدہ ہے وہ کسی غائب انسان کے لئے ہوتی ہے یا مریض کے لئے یا اس کے لئے کہ کوئی ضروری حاجت ہوتی ہے تو بعض نیک لوگوں کی قبروں پر آ کر اس کا غلاف اپنے مرید رکھ کر کہتے ہیں کہ اے میرے آقا! اگر میرا غائب واپس کر دیا گیا یا میرا مریض شفا یاب ہو گیا یا میری حاجت پوری کر دی گئی تو تیرے لیے اتنا سونا یا اتنی چاندی یا اتنا غلہ یا اتنا پانی یا اس قدر شمع یا اتنا تیل نذر دوں گا، یہ نذر اجماع کے ساتھ باطل ہے، جس کی کئی وجوہات ہیں، ایک یہ کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور مخلوق کے لئے نذر ماننا جائز نہیں، اس لئے کہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ جس کے لئے نذر مانی ہے وہ مردہ ہے، اور مردہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا، تیسرا یہ کہ نذر ماننے والے نے یہ یقین کیا کہ میت اللہ کے علاوہ متصرف فی الامور ہے تو اس کا یہ عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ (البحر الرائق ص ۲۹۸ ج ۲)۔

آپ کو لاکھوں میں ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہ ہوگا جو یہ کہے کہ میں نے نذر تو اللہ کی مانی تھی مگر ساتھ یہ قید لگائی تھی اس کا ثواب شیخ کی روح کو ملے یا اس کے جوار میں بنی ہوئی مسجد کے لوگوں کو یہ کھانا کھلاؤں گا جیسا کہ بریلوی علماء نے اس کفر و شرک کی یہ تاویل کر رکھی ہے۔

جب یہ صورت حال ہے تو کیا آپ اس صریح کفر و شرک کی آسائش کیلئے مزارات تعمیر کرواتے ہیں، آپ حضرات کا محض کتابوں میں یہ لکھ دینا کہ ان پڑھ لوگوں کو اولیاء اللہ کی نذریں

مانتا دیکھ کر، ان کے مزارات مقدسہ کا طواف اور سجدے کرتے دیکھ کر اور مزارات کی تعظیم میں رکوع کی حد تک ان پڑھ لوگوں کو جھکتے ہوئے دیکھ کر مجھے ایک بڑے عرصہ سے رنج و قلق رہتا ہے، شرح مسلم ص ۵۴۴ ج ۵۔

کافی نہیں ہے کیونکہ اس بیماری کی اصل جڑ مزارات ہیں ناکہ ان پڑھ ہونا کیونکہ عوام تو اہلحدیث کے بھی علوم اسلامیہ سے ناواقف ہوتے ہیں، مگر وہ ان تمام افعال شنیعہ سے بفضلہ تعالیٰ محفوظ رہتے ہیں اس کے برعکس آپ حضرات نے انہیں ایسی لائن پر چلایا ہے جو شریعت کی اصل راہ کو ہی بھلا دینے والی ہے اور انسان اس پر چل کر گمراہ ہو کر کفر و شرک کی وادی میں غوطہ زن ہونے لگتا ہے، خلاصہ کلام یہ کہ ایسے لوگوں کی آسائش کے بہانے سے مزارات کی تعمیر کا جواز فراہم کرنا خالص توحید دشمنی ہے۔

تنبیہ اول

حضرت مفتی اعظم نے مذکورہ توجیہات بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ہم نے یہ تو جہیں اس لئے کہیں کہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خاص خاص قبروں پر عمارات بنائی ہیں، اس کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ منشی شرح موطا امام مالک میں ابو عبد سلیمان علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زینب (بنت) جحش کی قبر پر قبہ بنایا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمان کی قبر پر قبہ بنایا محمد بن حنفیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قبر پر قبہ بنایا اور جس نے قبہ بنانا مکروہ کہا ہے تو اس کیلئے کہا جو کہ اس کو فخر و ریا کیلئے بنائے، جاء الباطل ص ۲۹۲ ج ۱۔

کیا صحابہ کرامؓ نے خاص خاص قبروں پر قبہ بنائے تھے؟

الجواب: اولاً۔ منتقی کے مولف کا نام ابو الولید سلیمان بن خلف الباجی (المتوفی ۷۴۷ھ) ہے

معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے کہاں سے اس عبارت کو نقل کر کے نام علامہ باجی کا لگا دیا ہے۔

ثانیاً۔ علامہ باجی کی منشی، موطا کی شرح ابن عبدالبر کی تلخیص ہے، مقدمۃ تحفۃ الاحوذی

ص ۸، اور امام ابن عبدالبر کی شرح کو دیکھ لیا گیا ہے اس میں ایسی کوئی روایت موجود نہیں، دیکھنے التمهید لمافی الموطا من المعانی والاسانید ص ۴۱ ج ۵۔

اس تحریر کے بعد راقم نے مولانا عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ کی لائبریری میں جا کر علامہ باجی کی شرح موطا کو بھی دیکھ لیا تھا، مگر اس میں ایسی کوئی روایت نہیں، یہ سب مبتدعین کے مفتی کی سینہ گزٹ باتیں اور کذب و افترا ہے، اللہ انہیں سمجھ کی توفیق دے، ابو صہیب - (۱۲- جمادی الثانی ۱۲۲۰ھ)

الفرض یہ اور اسی طرح کی جملہ روایات بے سند ہیں، فریق ثانی پہ لازم ہے کہ وہ انکی کوئی صحیح و متصل سند ثابت کریں ورنہ اکابرین امت پر جھوٹ بولنے سے گریز کرے کہ کل اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے۔

ثالثاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خارج میں ان کی کوئی صحیح و معتبر سند موجود ہے (جو کہ حقیقت میں قطعاً نہیں) تو جواب ان کا یہ ہے کہ یہ روایات موقوف ہیں جو کہ حدیث مرفوع متصل کے معارض نہیں ہو سکتیں، خود حضرت حکیم الامت مفتی اعظم اور مفسر قرآن الحاج احمد یار خاں گجراتی فرماتے ہیں

حدیث مرفوع کے مقابل اجتہاد صحابی قبول نہیں، جاء الباطل ص ۱۸۹ ج ۱۔

مولانا غلام رسول سعیدی الحنفی بریلوی فرماتے ہیں کہ

یاد رکھیے کہ جب کوئی مسئلہ حدیث سے ثابت ہو اور اس کے معارض اور مخالف کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہ ہو تو ایسی صورت میں اس حدیث پر عمل کرنا ہی صحیح دین ہے اور کوئی شخص اپنی جگہ پر کتنا ہی بڑا بزرگ اور عالم دین کیوں نہ ہو لیکن جب وہ حدیث صریح کے خلاف کوئی بات محض اپنی رائے سے بلا دلیل کہتا ہو تو صحیح اور صریح حدیث کے مقابلہ میں اس کی ذاتی رائے کو چھوڑ دینا ہی ہدایت اور راہ استقامت ہے بعد کا کوئی شخص علم و فضل میں کتنا ہی فائق کیوں نہ ہو صحابہ سے نہیں بڑھ سکتا اور جب اصول یہ ہے کہ قول صحابی بھی اگر حدیث رسول کے معارض ہو تو حدیث کے مقابلہ میں اس قول کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ذکر بالجہر ص ۱۰۵۔

اگر حدیث رسول کے خلاف صحابہ رضی اللہ عنہم بھی کوئی بات محض اپنی رائے سے کہیں تو حضور

ﷺ کے مقابلہ میں ان کی رائے کا بھی کوئی اعتبار نہ ہوگا، ایضاً ص ۱۲۵ طبع فرید بک شال ۱۳۹۷ھ
۱۹۷۷ء۔

یہی کچھ یہاں ہم کہتے ہیں کہ اگر بالفرض ان اقوال کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو تب بھی یہ احادیث صحیحہ و صریحہ کے معارض ہونے کی وجہ سے مردود ہیں۔

تنبیہ ثانیہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آنحضرت ﷺ نے قبروں پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے اور بذم خود مفتی صاحب نے اس کا جواب بھی عنایت فرمایا ہے جس کی پوری تفصیل آگے ان شاء الرحمن آرہی ہے لہذا اسے ہم یہاں غیر متعلقہ مقام پر ذکر کرنا مناسب نہیں جانتے، اس لئے قارئین ورق الٹ کر اسے وہاں سے ہی ملاحظہ کر لیں۔

مزارات کے رد میں دوسری حدیث

معروف تابعی حضرت ابی الہیاج الاسدی کوئی فرماتے ہیں

قال لی علی الا ابعثک ما بعثنی علیہ رسول اللہ ﷺ ان لاتدع تمثالا الا طمستہ ولا قبر مشرفا الا سویتہ:

مجھے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا میں تجھے اس کام کے واسطے نہ بھیجوں جس کیلئے مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا وہ یہ کہ کوئی فوٹو اور مجسمہ منائے بغیر نہ چھوڑنا اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑنا مگر یہ کہ اسے (عام قبروں) کے برابر کر دینا۔

صحیح مسلم ص ۳۱۲ ج ۱، و مسند احمد ج ۱ ص ۹۶ و ۱۱۱ و ۱۲۹ و ۱۳۵، و ترمذی مع تحفہ ص ۱۵۴ ج ۲، و ابوداؤد ص ۱۰۳ ج ۲، و نسائی (مجتبى) ص ۲۳۱ ج ۱، و السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۳ ج ۲، و مستدرک حاکم ص ۳۶۹ ج ۱، و ابو یعلیٰ ص ۱۹۹ ج ۱.

اس صحیح و صریح حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو

اونچی قبروں کو گرانے کا حکم فرمایا، اس صحیح حدیث سے انکار کیلئے مفتی صاحب نے جو چور دروازے نکالے ہیں انکی حقیقت ترتیب وار ملاحظہ کریں۔

مفتی صاحب کا پہلا عذر

جن قبروں کو گرانے کا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا وہ کفار کی قبریں تھیں اس کی چند وجوہ ہیں اولاً تو یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تم کو اس کام کیلئے بھیجتا ہوں جس کیلئے مجھے حضور علیہ السلام نے بھیجا۔

حضور علیہ السلام کے زمانہ میں جن قبروں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گرایا وہ مسلمانوں کی قبریں نہیں ہو سکتیں، کیوں کہ ہر صحابی کے دفن میں حضور علیہ السلام شرکت فرماتے تھے۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کوئی کام بھی حضور علیہ السلام کے بغیر مشورہ کے نہ کرتے تھے لہذا اس وقت جس قدر قبور مسلمین بنیں، وہ یا تو حضور کی موجودگی میں یا آپ کی اجازت سے، تو وہ کون سے مسلمانوں کی قبریں تھیں جو کہ ناجائز بن گئیں اور ان کو مٹانا پڑا! ہاں عیسائیوں کی قبور اونچی ہوتی تھیں، بخاری شریف ص ۶۱ مسجد نبوی کی تعمیر کے بیان میں ہے۔

امر النبی ﷺ بقبور المشرکین فنہشت .

حضور علیہ السلام نے مشرکین کی قبروں کا حکم دیا پس اکھیر دی گئیں۔

بخاری شریف ص ۶۱ میں ایک باب باندھا، باب هل ینش قبور مشرکی الجاہلیۃ ، کیا مشرکین زمانہ جاہلیت کی قبریں اکھیر دی جاویں اسی کی شرح میں حافظ ابن حجر فتح الباری شرح جلد دوم ص ۲۶ میں فرماتے ہیں ما سوا انبیاء اور ان کے متبعین کے کیونکہ انکی قبریں ڈھانے میں ان کی اہانت ہے، اس حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ جو قبرستان ملک میں آگیا اس میں تصرف کرنا جائز ہے اور پرانی قبریں اکھاڑ دی جاویں بشرطیکہ محترمہ نہ ہوں۔

اس حدیث اور اس کی شرح نے مخالف کی پیش کردہ حدیث علی رضی اللہ عنہ کی تفسیر کر دی ہے کہ مشرک کی قبریں گرائی جاویں دوسرے اس لئے کہ اس میں قبر کے ساتھ فوٹو کا کیوں ذکر ہے مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ کفار کی قبریں ہی مراد ہیں کیونکہ ان کی قبروں پر میت کا فوٹو بھی ہوتا ہے۔

(جاء الباطل ص ۲۹۴ ج ۱)

الجواب: اولاً۔ مفتی صاحب کو پہلی بات تب مفید تھی جب وہ دلائل سے ثابت کر دیتے کہ قبروں پر قبہ بنانے کی ممانعت پہلے کی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قبوں کے گرانے کا حکم بعد میں ملا تھا، جب اس کا ان کے پاس کوئی ثبوت ہی نہیں تو پھر یہ اعتراض ہی لغو ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا نیش قبور اور تسویہ قبور کو ایک قرار دینا ان کی جہالت محض ہے، بات یہ ہے کہ جب انسان راہ ہدایت سے بھٹک جاتا ہے تو وہ عقل و خرد سے کورا اور علم دین سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔

آئیے ہم آپ کو انکی حقیقت سمجھا دیں اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو سمجھنے اور سوچ و بچار کی توفیق عطا کرے۔

لفظ سؤی حالت اور مقدار کی برابری کیلئے آتا ہے اور یہ وسیع المفہوم لفظ ہے جس میں درست اور ٹھیک ٹھاک کرنا سب کچھ آ جاتا ہے، قرآن میں ہے کہ

الذی خلقک فسواک فعد لک (الانفطار آیت ۷)

جس نے تجھے پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا پھر ہموار فرمایا۔ (احمد رضا خاں بریلوی)

اس آیت کا مقصود تو یہ ہے کہ انسان کو ایسا پیدا کیا جس کے اعضاء اور قد و قامت میں مناسبت پیدا فرمائی اور یہی اس حدیث کا مفہوم ہے کہ دیگر قبور سے اس کی موافقت و مناسبت پیدا کر دی جائے اور اونچے اونچے بنے ہوئے مزارات کو گرا کر انہیں عام قبروں کے برابر کر دیا جائے تاکہ امتیاز نہ رہے۔

چنانچہ علامہ مار دینی حنفی المتونی ۴۵ھ اس کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

الاسویۃ بالقبور المعتادة: الجوهر النقی علی البیہقی ص ۳ ج ۲.

برابر کرنے کا یہ معنی ہے کہ ان کو ان قبروں کے ساتھ برابر کر دیا جائے جن کا شریعت کی عادت سے ثبوت ہو چکا ہے۔

جب آپ نے تسویہ قبور کا معنی معلوم کر لیا تو اب آئیے ہم آپ کو نیش قبور کا معنی بھی لغت عرب کے مسلم آئمہ سے دکھا دیں تاکہ حق واضح ہو جائے۔ واللہ یہدی من یشاء۔

علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں

نبش استخراجہ بعد الدفن نبش الموتی استخراجہم، (لسان العرب ص ۳۵۰ ج ۶)

یہی معنی علامہ محمد مرتضی زبیدی نے کیا ہے ان کے الفاظ ہیں۔

إذا استخراجہ بعد الدفن نبش الموتی استخراجہم، (تاج العروس ص ۳۵۳ ج ۴)

ان دونوں عبارتوں کا مفہوم یہ ہے کہ، نبش، کہتے ہیں کسی مدفون چیز کو (زمین کھود کر) باہر نکالنا اور نبش الموتی، کا معنی ہے کہ مردے کو باہر نکالنا۔

یہ دونوں کتب عربی لغات میں اصحات الکتب شہادتیں ہیں اور ان کے بیان کردہ معنی کو آج تک چیلنج نہیں کیا گیا کیونکہ یہ لوگ لغات عرب کی فصاحت و بلاغت سے کما حقہ واقف ہیں وہ اس زبان کی باریکیاں اور حقیقی و مجازی معنی جاننے کی وجہ سے اپنے فن میں امام تسلیم کیے گئے ہیں، ان سے بھی بڑھکر لغت عرب کے مُسلّم امام جناب علامہ زبیدی حنفی (المتوفی ۱۲۵۸ھ) جو کہ بلا کے ادیب اور انشاء پرداز تھے جن کے اقوال کو آئمہ لغت بھی بطور حجت پیش کرتے ہیں وہ نبش کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

نبش الارض عما تحتها نبشا و منه نبش القبر۔

یعنی، نبش الارض، کا معنی زمین کھود کر اس کے نیچے جو چیز (مدفون) ہے اسے باہر نکالنا اور اسی سے ہی محاورہ، نبش القبر، ہے۔ اساس البلاغہ ص ۴۴۳۔

اسی کے قریب قریب ہی علامہ فیومی نے، المصباح الممیر ص ۵۹۰ ج ۲۔ میں معنی کیا ہے۔

جب آپ نے نبش القبور، کے معنی کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب ٹھنڈے دل سے ہماری گزارشات کو ملاحظہ کریں، حضرت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری شریف ص ۶۱ ج ۱ میں ایک باب باندھا ہے کہ

باب هل تنبش قبور مشرکی الجاهلیة و يتخذ مكا نھا مساجد الخ۔

اس باب کے تحت حضرت امام متعدد احادیث لائے ہیں، اور مشرکین کی قبروں کو اکھاڑ کر

وہاں مسجد نبوی کی تعمیر کا واقعہ بھی انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئے تو وہاں چند دن گزارنے کے بعد مسجد نبوی بنانے کا ارادہ فرمایا تو

فارسل الی ملاء من بنی النجار فقال یا بنی النجار ثامنونی بحا ئطکم هذا قالوا واللہ لانطلب ثمنہ الا الی اللہ عز وجل فقال انس فکان فیہ ما اقول لکم قبور المشرکین و فیہ خرب و فیہ نخل فامر النبی ﷺ بقبور المشرکین فنبشت ثم بالخرب فسویت و بالنخل فقطع النخل. الحدیث.

یہی حدیث امام مسلم نے اپنی صحیح ص ۲۰۰ ج ۱ میں روایت کی ہے، آئیے اس کا ترجمہ ایک بریلوی مترجم مولوی غلام رسول سعیدی صاحب کے قلم سے ملاحظہ کریں۔

اور بنو نجار کے سرداروں کو بلایا جب وہ آئے تو فرمایا، تم اپنا باغ مجھے فروخت کر دو انہوں نے عرض کیا بخدا ہم آپ سے باغ کی قیمت نہیں لیں گے، ہم اس کا معاوضہ خدا سے چاہتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس باغ میں جو چیزیں تھیں انہیں میں بتاتا ہوں اس میں کھجوروں کے درخت مشرکین کی قبریں اور کھنڈرات تھے رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے درخت کاٹنے کا حکم دیا، وہ کاٹ دیئے گئے، مشرکین کی قبریں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں اور کھنڈرات ہموار کر دیئے گئے۔ الحدیث شرح صحیح مسلم ص ۲۳ ج ۲، طبع فرید بک سنال ۱۹۹۴ء۔

اس حدیث نے تمام عقدے حل کر دیئے کہ نبش القبور کہتے ہیں قبروں کو اکھاڑ کر پھینک دینا، جب مشرکین کی قبروں کو اکھاڑ دیا گیا تو انکی ہڈیوں کو بقول بریلوی مفسر قرآن پیر کرم شاہ صاحب بھیروی کے کہ ایک گڑھے میں پھینک دیا گیا اور ان پر مٹی ڈال دی گئی۔ ضیاء النبی ص ۱۵۰ ج ۳ طبع ضیاء القرآن پبلی کیشنز ۱۴۱۵ھ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تسویہ قبور کا حکم الگ ہے اور نبش القبور کا واقعہ مشرکین کی قبروں کے ساتھ ایک خاص ضرورت کے تحت پیش آیا اور مفتی صاحب کا ان دونوں کو ایک باور کرانا اور نبش القبور کو تسویہ قبور کی تفسیر قرار دینا۔

(جاء الباطل ص ۲۹۴ ج ۱)

ان کی جہالت محض ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم دیا گیا ہے وہ تو قبروں کو گرانے کا ہے اور نیش القبور میں کفار کی قبروں کو اکھاڑ کر پھینک دینے کا بیان ہے، انہیں ایک باور کرانا مفتی صاحب کا خالص شیطانی وسوسا ہے، جس کی سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں، معلوم نہیں کہ اس طرح کی ہیرا پھیریاں اور انکار حدیث کیلئے اسی طرح کی عیاریاں انہیں شیطان کی طرف سے القا ہوتی تھیں۔

ثالثاً۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث کے انکار کیلئے مفتی صاحب نے مذکورہ مکاری سے بھی بدتر ایک عذر یہ بھی کر رکھا ہے کہ اس میں فوٹو کا بھی ذکر ہے حالانکہ مسلمان کی قبر پر فوٹو نہیں ہوتا، بلکہ کفار کی قبروں پر میت کا فوٹو ہوتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اول تو ہم مفتی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ حدیث میں اس کا کب ذکر ہوا ہے، جو قبر پر تصویر ہوا سے مٹا دینا، یہ آپ کی زیادتی ہے اور بات کو گڈ مڈ کرنے کی سعی لاحاصل ہے، ان دونوں کا حکم الگ الگ ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ

ولا صورة فی بیت

کسی گھر میں کوئی تصویر نہ چھوڑنا، سنن نسائی ج ۲۳۱، ونبھتی ص ۳۳ ج ۴، والسنن الکبریٰ للنسائی ص ۶۵۳ ج ۱۔

ان الفاظ سے حدیث کا معنی متعین ہو گیا کہ گھروں میں کوئی تصویر مٹائے بغیر نہ چھوڑنا اور قبرستان میں کوئی بھی اونچی قبر گرائے بغیر نہ رہنا۔

یہ بات ہم مبتدعین کی صواب دید پر چھوڑتے ہیں کہ اس دور میں بالعموم اور آج کل بالخصوص مسلمانوں کے گھروں میں تصاویر ہوتی ہیں یا نہیں۔

کیا یہ حکم کفار کی قبروں کے متعلق تھا؟

دوم۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بالغرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص کفار کی اونچی قبریں گرانے کا حکم دیا تھا تو تب بھی یہ بات مبتدعین کو مفید نہیں کیونکہ ایک اور طریق میں اسی حدیث علی رضی اللہ عنہ میں ہی رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ان افعال سے منع

فرمایا ہے اور اس کے قائل کو اسلام سے خارج قرار دیا ہے
چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

كان رسول الله ﷺ في جنازة فقال ايكم ينطلق الى المدينة فلا يدع بها وثنا
الاكسره ولا قبراً الا سواه ولا صورة الا لطحها؟ فقال انا يا رسول الله ﷺ فانطلق
فهاب اهل المدينة فرجع فقال على رضی اللہ عنہ انا انطلق يا رسول الله ﷺ، قال
فانطلق فانطلق ثم رجع فقال يا رسول الله ﷺ لم ادع بها وثنا الا كسرتة ولا قبراً
الا سويته ولا صورة الا لطحها، ثم قال رسول الله ﷺ من عاد لصنعه شئى من هذا
فقد كفر بما انزل على محمد ﷺ، الحديث.

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے آپ علیہ
السلام نے فرمایا، تم میں سے کون ہے جو مدینے میں جا کر کوئی بت توڑے بغیر نہ رہے اور کوئی اونچی
قبر کو (عام قبروں) کے برابر کرے بغیر نہ رہے اور ہر تصویر کو مٹا دے، چنانچہ ایک شخص نے کہا اے
اللہ کے رسول ﷺ میں اس کام کیلئے تیار ہوں چنانچہ وہ گیا اور اہل مدینہ سے ڈر کر بھاگ آیا، اس
پر حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں جا کر یہ کام کرتا
ہوں چنانچہ وہ گئے پھر واپس آ کر کہا میں نے ہر بت کو توڑ ڈالا، ہر اونچی قبر کو عام قبروں کے برابر
کر دیا اور ہر تصویر کو مٹا ڈالا ہے اس رپورٹ کے بعد اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کہا
آئندہ جو شخص بھی ان چیزوں میں سے کسی ایک کی طرف پلٹا کہ اسے کیا تو اس شخص نے دین سے
کفر کیا جو محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کیا گیا۔ الحدیث مسند امام احمد ص ۸۷ و ۱۳۸ ج ۱، و مسند طحاوی (۹۶)
علامہ منذری نے اس کی سند کو جید کہا ہے، (الترغیب ص ۴۵ ج ۴)۔

کیوں جناب کیا آنحضرت ﷺ کے اس آخری فقرے کا تعلق بھی کفار سے ہے؟ اگر نہیں یقیناً
نہیں! تو پھر آپ اس حکم کو کفار کی قبروں کے ساتھ خاص کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں! جسے اللہ کے
پیارے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ اپنی امت کے متعلق کہہ رہے ہوں اور اس فرمان کا انکار کر کے دوبارہ
قبروں کو اونچی تعمیر کرنے والے کو دین اسلام کا باغی قرار دے رہے ہوں، افسوس مفتی صاحب حکیم
الامت اور مفسر قرآن ہو کر علل حدیث میں اس قدر کمزور کیوں تھے؟ یا جان بوجھ کر پیٹ کی خاطر

ایسی تاویل کر کے اپنی آخرت برباد کرتے رہے۔ اللہ ہدایت اور سمجھ کی توفیق دے آمین۔

دوسرا عذر

اونچی قبر کو زمین کے برابر کر دو، اور مسلمان کی قبر کیلئے سنت ہے کہ زمین سے ایک ہاتھ اونچی رہے اسکو بالکل پیوند زمین کرنا خلاف سنت ہے، ماننا پڑے گا کہ یہ قبور کفار کی تھیں ورنہ تعجب ہے کہ سیدنا علیؑ تو اونچی قبریں اکھڑوائیں اور ان کے فرزند محمد ابن حنفیہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قبر پر قبہ بنائیں، اگر کسی مسلمان کی قبر اونچی بن بھی گئی تب بھی اس کو نہیں اکھیڑ سکتے کیونکہ اس میں مسلمان کی توہین ہے۔

اولاً۔ اونچی نہ بناؤ مگر جب بن گئی تو نہ مٹاؤ، قرآن پاک چھوٹا سا زچھا پنا منع ہے، دیکھو شامی کتاب الکراہیت، مگر جب چھپ گیا تو اس کو پھینکو نہ جلاؤ کیونکہ اس میں قرآن کی بے ادبی ہے احادیث میں وارد ہے کہ مسلمان کی قبر پر بیٹھنا وہاں پاخانہ کرنا، وہاں جوتے سے چلنا ویسے بھی اس پر چلنا پھرنا منع ہے مگر افسوس ہے کہ نجدی نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مزارات گرائے اور معلوم ہوا ہے کہ اب جدہ میں انگریز عیسائیوں کی اونچی اونچی قبریں برابر بن رہی ہیں۔

صدق رسول اللہ ﷺ یقتلون اهل الاسلام و یتروکون اهل الاصنام .

ہر ایک کو اپنی جنس سے محبت ہوتی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۵ ج ۱۔

الجواب: اولاً۔ بجا فرمایا جناب نے کہ ہر ایک کو اپنی جنس الخ غالباً اس محبت و پیار اور آپس میں رشتہ شرک کی وجہ سے ہی آپ حضرات عیسائیوں کی تقلید میں مزارات تعمیر کرتے ہیں، مبارک ہو۔

ثانیاً۔ جدہ میں کفار کی اونچی اونچی قبور بننے کی خبر پر ہم، لعنت اللہ علی الکاذبین، ہی کافی سمجھتے ہیں۔

ثالثاً۔ قبر کو قرآن کے چھوٹے سا زچھا پنے کی ممانعت پر قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ فتاویٰ شامی نبی ﷺ کی لکھی ہوئی نہیں جس کا ہر حکم و فیصلہ حجت اور دلیل شرعی ہو۔ یہ علامہ ابن عابدین کا اپنا قیاس ہے، جب کہ قبور کو اونچا کرنے کی ممانعت کا قول امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ہے، جو حضور علیہ السلام کی بات کو دلیل شرعی نہ جانے اور آپ علیہ السلام کے فرمان کو فتاویٰ شامی کے قول و اقوال کے برابر جانے۔ ایسے آدمی کا دین اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

رابعاً۔ یہ قرآن ہے یا حدیث کہ جب قبر اونچی بن جائے تو اسے گرایا نہ جائے کہ اس میں مسلمان کی توہین ہے، جب یہ باتیں قرآن و سنت ہی نہیں بلکہ گجرات کے بقلم خود مفتی اعظم کی قیاسات فاسدہ ہیں تو انہیں کون مانتا ہے۔

کمال ہے کہ حضور علیہ السلام تو اونچی قبروں کو گرانے کا حکم دیں، مگر مفتی صاحب کہتے ہیں کہ جب بن جائیں تو گرانا جائز نہیں، میں پوچھتا ہوں کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا تو آنحضرت ﷺ کو یہ بات نہ سوجھی کہ یہ بن گئی ہیں انہیں رہنے دو اور آئندہ نہ بنانا۔

خامساً۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ۔

قال الشافعی فی الام ورايت الاثمة بمكة يامرون بهدم ما بينی.

یعنی حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام ص ۷۷ ج ۱ باب ما یكون بعد الدفن، میں تحریر کیا ہے کہ میں نے مکہ مکرمہ میں اماموں کو قبروں پر عمارات ڈھانے کا حکم کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (شرح صحیح مسلم ص ۳۱۲ ج ۱)۔

ہم مبتدعین سے پوچھتے ہیں کہ کہیں یہ آئمہ بھی نجد یوں اور وہابیوں کے تھے جو حضرت امام شافعی کے زمانہ میں قبروں سے قبوں کو گرا رہے تھے۔

سادساً۔ قبر کی اونچائی ایک ہاتھ ہونے پر کوئی حدیث موجود نہیں، اسے مفتی صاحب کا سنت قرار دینا آنحضرت ﷺ پر افتراء ہے۔

نبی ﷺ نے اپنے بیٹے ابراہیم کی قبر ایک بالشت رکھی تھی، دیکھئے الفتح الربانی ص ۷۵ ج ۷، سنن بیہقی کی ایک حسن حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک بھی زمین سے تقریباً ایک بالشت اونچی بنائی گئی تھی۔ السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۳۱۰ ج ۳۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ

ويسنم القبر قدر الشبر. عالمگیری ص ۷۶ ج ۱.

یعنی قبر کو کوہان کی طرح بنایا جائے اور وہ بھی صرف ایک بالشت۔

مگر سنت خیر الانام ﷺ اور فقہاء احناف کی تصریحات کے برعکس مفتی صاحب کی تحقیق ہی نزالی

ہے کہ قبر ایک ہاتھ اونچی ہونی سنت ہے۔

سابقاً۔ تسویہ قبور کا معنی و مفہوم تفصیل سے گزر چکا ہے نیز آگے بھی آرہا ہے، لہذا اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔

ثامناً۔ رہی یہ حدیث کہ یقتلون اہل الاسلام الخ تو اس کی مکمل بحث اپنے مقام پر موجود ہے اسے وہاں سے ہی دیکھ لیا جائے، ہاں البتہ اس چیز کا شکوہ کیئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے کہ نجدیوں کے رد میں اس طرح کی احادیث مبتدعین ساری زندگی منبر پر بڑے ترنم سے گنگناتے رہا کرتے ہیں مگر الفاظ حدیث انہیں یاد نہیں ہوتے اور یہ خدا کی طرف سے لعنت کی پھٹکار ہے، آئیے حدیث کے اصل الفاظ ملاحظہ کریں۔

یقتلون الاسلام ویدعون اہل الاوثان۔ (صحیح بخاری ص ۷۲، ج ۱)

تیسری حدیث

معروف تابعی حضرت ثمامہ بن شفیؒ بیان کریتے ہیں کہ

کنامع فضالة بن عبید بارض الروم برودس فتوفی صاحب لنا فامر فضالة بقرہ فسوی ثم قال سمعت رسول اللہ ﷺ یا مر بتسویتھا۔

یعنی ہم (صحابی رسول) حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے ساتھ روم کی سرزمین کے مقام رودس پر تھے، تو ہمارے ایک ساتھی کا انتقال ہو گیا حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ نے ان کی قبر کو عام قبروں کے ساتھ برابر کرنے کا حکم فرمایا، پھر کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ علیہ السلام قبر کو (عام مقابر کے ساتھ) برابر کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

صحیح مسلم ص ۳۱۲، ج ۱، و البوداؤد ص ۱۰۵، ج ۱، و نسائی (مجتبیٰ) ص ۲۳۱، ج ۱، و بیہقی ص ۳۰۳، ج ۴، و السنن الکبریٰ للنسائی ص ۶۵۳، ج ۱۔

فائدہ جلیلہ

اس صحیح و صریح حدیث سے مفتی صاحب کے اس زعم باطل کا رد بخوبی ہو گیا کہ تسویہ قبور کا حکم کفار کی قبروں سے ہے، علاوہ ازیں یہی روایت امام المغازی محمد بن اسحاقؒ کے طریق سے بھی مروی ہے جس کے الفاظ ہیں کہ۔

فلما دفناه قال خففوا عنه التراب فان رسول الله ﷺ كان يامرنا بتسوية القبور.
جب ہم انہیں دفن کر چکے تو حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، قبر پر سے مٹی تھوڑی اور ہلکی
کرو کیونکہ آنحضرت ﷺ ہمیں قبروں کو برابر کرنے کا حکم فرماتے تھے، اسنن الکبریٰ للبیہقی
ص ۳۱۱ ج ۳۔

اس حدیث کے الفاظ نے، تسویہ قبور، کا معنی و مطلب بھی واضح کر دیا کہ زمین کے ساتھ برابر
کرنا نہیں (جیسا کہ مفتی صاحب کا زعم باطل ہے، جاء الباطل ص ۲۹۴ ج ۱)
بلکہ قبر پر تھوڑی مٹی ڈالنا اور عام قبروں کے برابر کرنا مقصود و مطلوب ہے، یہی معنی فقہاء
احناف نے کیا ہے، چنانچہ علامہ حلبی حنفی شرح منیہ میں فرماتے ہیں کہ

فالمراد ما كانوا يفعلونه من تعلية القبور بالبناء الحسن الرفيع.
یعنی تسویہ سے مراد اونچی قبروں اور اس پر بلند و بالیٰ اور عالی شان بنائی گئی عمارت کو گرانا ہے۔
حلبی کبیر ص ۵۹۹۔

یہی بات علامہ ابن ہمام الحنفی (المتوفی ۶۸۱) نے ہدایہ کی شرح میں تحریر کی ہے ان کے الفاظ ہیں
فهو على ما كانوا يفعلونه من تعلية القبور بالبناء الحسن العالي و ليس مرادنا
ذلك القدر بل قدر ما يبدو من الارض و يتميز عنها.

یعنی یہ حدیث اونچی قبروں اور اس پر بلند و بالیٰ اور عالی شان بنائی گئی عمارت کو گرانے کے
متعلق ہے ناکہ قبر مسمن (کوہان نما) کی مقدار کو گرانا ہے بلکہ ایسی مقدار ہے جو زمین سے اتنی اونچی
ہو جو کہ عام قبروں سے ممتاز ہو۔ فتح القدیر ص ۱۰۱ ج ۲۔

علامہ ابن نجیم حنفی (المتوفی ۹۷۰) کنز الدقائق کی شرح میں فرماتے ہیں کہ
ويسنم قدر شبر و قيل قدر اربع اصابع و ما ورد في الصحيح من حديث علي
ان لا ادع قبر امشرفا الا سويته فمحمول على ما زاد على التسنيم، البحر الرائق
ص ۱۹۲ ج ۲۔

یعنی قبر کو کوہان نما باشت کی مقدار میں بلند کرے اور کہا گیا کہ چار انگلیوں کی مقدار جتنی بلند ہو اور
جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث میں بلند قبر کو برابر کرنا آیا ہے وہ مقدار سے زائد پر محمول ہے۔

چوتھی حدیث

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

نہی نبی اللہ ﷺ ان بینی علی القبور او یقعد علیہا او یصلی علیہا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قبروں پر عمارت بنانے اور ان پر بیٹھنے اور ان پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔

مسند ابویعلی الموصلی ص ۶ ج ۲ رقم الحدیث ۱۰۱۶، وسنن ابن ماجہ ص ۱۱۳،

واللفظ لہ، علامہ ہشتمی حنفی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں، (مجمع الزوائد ص ۶۱ ج ۳)۔

پانچویں حدیث

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ

نہی رسول اللہ ﷺ ان بینی علی القبر او یجصص۔

رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر عمارات بنانے اور انہیں پختہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل ص ۲۹۹ ج ۶۔

گویہ روایت سند کے اعتبار سے صحیح نہیں مگر راقم نے اسے دیگر صحیح احادیث سے موافقت کی وجہ سے بطور شاہد پیش کیا ہے

اتباع رسول ﷺ کا تقاضا

اتباع رسول کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے قیاسات کو ترک کر کے آپ علیہ السلام کے اسوہ حسنہ اور اقوال کو زندگی کا محور بنائے اور انہیں کے نقش قدم پر چلے، سنت خیر الانام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے جس فعل سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے منع فرمایا ہے اس سے رک جائے کہ، یہی ہدایت اور راہ استقامت ہے اور اسی کا ہی خالق ارض و سماء نے حکم فرمایا ہے کہ

و ما اتکم الرسول فخذوه وما نہکم عنہ فانتهوا و اتقوا اللہ ان اللہ

شدید العقاب. (الحشر ۷)

سو جو تم کو رسول اللہ ﷺ دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ عذاب دینے میں سخت ہے (۵۹-۷)

آج مبتدعین جس قدر مزارات کے شرعی فوائد اور دینی مصلحتیں بیان کرتے ہیں اگر ان میں کوئی معقولیت ہوتی تو رحمۃ للعالمین ﷺ ہرگز اس سے منع نہ فرماتے، کیا یہ لوگ آنحضرت ﷺ سے بڑھکر دینی مصلحتیں اور فوائد شرعی جانتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ تمام فوائد و مصالح خود تراشیدہ اور ایجاد بندہ ہیں جو ارشاد نبوی کے مخالف ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہیں اور یہ اس قابل ہیں کہ انہیں اٹھا کر حدود شریعت سے باہر پھینک دیا جائے۔ تاکہ یہ مصطفوی شریعت کو مکدر نہ کر دیں۔

انہیں حقائق کے پیش نظر، خیر القرون میں، اور آئمہ اربعہ میں سے بلکہ تمام آئمہ کرام میں سے کسی فقیہ و محدث نے قبر پر مزارات کی تعمیر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا، چنانچہ علامہ ابن عابدین حنفی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) جو متاخرین احناف میں وسیع النظر اور درمختار کے شارح ہیں فرماتے ہیں کہ

اما البناء فلم أر من اختار جوازه، فتاویٰ شامی ص ۲۳۷ ج ۲.

مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے (قبر) پر عمارت بنانے کے جواز کو پسند کیا ہو۔

مزارات اور امام ابو حنیفہؒ

حضرت امام کے شاگرد خاص اور فقہ حنفیہ کی روٹیاں پکانے والے بزرگ امام محمد فرماتے ہیں کہ۔

ولا نرى ان يزاد على ما خرج منه و نكره ان يعص او يطين او يجعل عنده مسجد الى ان قال ان النبي ﷺ نهى عن تربع القبور و تجصيصها قال محمد و به نأخذ و هو قول ابى حنيفة.

ہم اس بات کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلی ہے اس سے زیادہ اس پر ڈالی جائے اور ہم مکروہ سمجھتے ہیں کہ قبر پختہ بنائی جائے یا اس پر لپائی کی جائے کیونکہ نبی ﷺ نے قبر کو مرلج بنانے سے منع فرمایا ہے یہی میرا اور میرے استاذ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ کتاب الاثمار ص ۴۹ طبع کتب

خانہ مجید یہ۔

قارئین کرام کیا کسی حنفی مقلد کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے امام ابو حنیفہ کا قول و فتویٰ رد کر دے بالخصوص جب اس فتویٰ کی بنیاد احادیث صحیحہ پر ہو۔ اور لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے وہ پھر بھی حنفی کا حنفی ہی کہلاتا رہے، پھر لطف کی بات تو یہ کہ خود کچے حنفی کہلاتے ہوں اور دیگر کو گلابی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہوں، خیر سے اس مسئلہ میں تو بریلوی مبتدعین ہی ثابت ہوئے مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ۔

غیر مقلد مردودوں کا راستہ ہے۔ جاء الباطل ص ۲۵۴ ج ۲۔

لہذا تقلید سیدھا جنت کا راستہ ہے اور غیر مقلدیت ٹیڑھا راستہ ہے جو دوزخ تک پہنچائے گا۔

جاء الباطل ص ۲۵۵ ج ۲۔

ان ارشادات کی روشنی میں مبتدعین اپنا اخروی ٹھکانا سوچ لیں کیونکہ ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

اس مورچہ کو مفتی صاحب نے دسویں صدی ہجری کے ایک صوفی کی بے سند نقل کو درج کر کے فتح حاصل کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے کہ

اب تو رجسٹری ہوگئی کہ خود امام مذہب ابو حنیفہ کا فرمان مل گیا ہے کہ قبر پر قبہ وغیرہ بنانا جائز

ہے۔ جاء الباطل ص ۲۸۷ ج ۱۔

اللہ اکبر، امام صاحب کے شاگرد خاص امام محمد کی نقل سے تو قبوں کے مکروہ ہونے کی رجسٹری نہ ہوئی اور بے سند قول سے ہوگئی، ہم پوچھتے ہیں کہ جس قول سے آپ حضرات رجسٹری کروا رہے ہیں اس کی سند تو پیش کیجئے ورنہ ناحق اپنے امام کو اپنی بدعات میں ملوث نہ کیجئے

اکابر احناف کی تصریحات

فقہاء احناف نے کتب فقہ میں اس بات کو کھول کر اور صاف آئینہ کی طرح پیش کیا ہے کہ قبر پر عمارت و قبہ بنانا اسکو پختہ کرنا مکروہ ہے بلکہ انہوں نے اس معاملہ میں اس قدر احتیاط کیا ہے کہ قبر پر زیادہ مٹی ڈالنے اس کی لپائی کرنے سے بھی روکا کہ یہ چیزیں بھی، بناء علی القبر، کے مشابہ ہیں اگر

کسی بد بخت نے ایسا کام کیا تو اسے گرانا واجب ہے۔ ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں

ويجب الهدم و ان كان مسجد،

گرانا واجب ہے خواہ مسجد ہی کیونکہ نہ ہو۔ مرقاة ص ۶۹ ج ۳۔ یعنی اگر کسی عیار اور ہوشیار نے قبور کے آس پاس مسجد کے نام سے ہی قبے اور گنبد بنوائے ہوں تو ان کو بھی مسمار کر دینا واجب ہے کہ منافقین کی تعمیر کردہ مسجد بھی تو آخر مسجد ہی تھی جسے اللہ رب العزت نے قرآن میں مسجد ضار کے نام سے موسوم کیا اور رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے اسے گرا دیا، اس بات کو یہیں پہ ختم کر کے آپ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ اور چلیں اور حنفی اکابر کی تصریحات کو ملاحظہ کریں۔

حضرت علامہ ابراہیم حلبیؒ منیۃ المصلیٰ کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

ويكره تجصيص القبر و تطينه و به قالت الائمة الثلاثة وعن ابی

حنيفة انه يكره ان يبنى عليه بناء من بيت اوقبة او نحو ذلك لما مر من الحديث انفا.

قبور کو پختہ بنانا اور ان کی لپائی کرنا مکروہ ہے اور یہی تینوں اماموں کا قول ہے اور حضرت امام ابو حنیفہ سے روایت ہے کہ قبر پر مکان یا قبہ یا اسی طرح کی کوئی اور عمارت تعمیر کرنا مکروہ ہے اور مذکورہ حدیث جو ابھی گزری ہے اس کی دلیل ہے۔ حلبی کبیر ص ۵۹۹ طبع لاہور سہیل ایڈمی ۱۹۸۷ء۔

علامہ جلال الدین الخوارزمی فرماتے ہیں کہ

و كره ابو حنيفة البناء على القبر وان لم يعلم بعلامة .

اور امام ابو حنیفہؒ قبر پر عمارت بنانے کو مکروہ جانتے ہیں خواہ اس سے نشانی کرنا ہی کیوں نہ مقصود ہو۔ الکفایۃ شرح ہدایہ ص ۱۰۰ ج ۲۔

علامہ ابن عابدین، در مختار کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

وعن ابی حنيفة يكره ان يبنى عليه بناء من بيت اوقبة او نحو ذلك لما روى

جابر رضى الله عنه، نهى رسول الله ﷺ عن تجصيص القبور، و ان يكتب عليها وان يبنى عليها، رواه مسلم وغيره.

یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے وہ قبر پر عمارت بنانے کو مکروہ جانتے تھے خواہ مکان

ہو یا گنبد یا اسی طرح کی کوئی اور چیز کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے اس پر لکھنے اور عمارت بنانے سے منع فرمایا، اسے روایت کیا ہے امام مسلم وغیرہ نے، فتاویٰ شامی ص ۲۳۷ ج ۲۔

علامہ سراج الدین اودی حنفی اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ
ویکرو البناء علی القبور۔

قبروں پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔ فتاویٰ سراجیہ ص ۲۴۔
علامہ ابن نجیم حنفی فرماتے ہیں کہ

ویکرو ان یزاد علی التراب الذی اخرج من القبر لان الزیادة علیہ بمنزلة البناء الی ان قال ولا یجصص بحدیث جابر نہی رسول اللہ ﷺ ان یجصص القبر وان یقعد علیہ وان ینبی علیہ۔

اور قبر سے نکالی گئی مٹی سے زیادہ ڈالنا مکروہ ہے کیونکہ یہ بناء (عمارت) کے مشابہ ہے (پھر آگے فرمایا) اور قبر کو پختہ نہ کیا جائے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے اس پر عمارت تعمیر کرنے اور بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (البحر الرائق ص ۱۹۴ ج ۲)

امام قاضی خاں حنفی (المتوفی ۵۹۲) فرماتے ہیں کہ

ولا یجصص القبر لما روی عن النبی ﷺ انه نہی عن التجصیص والتفصیص وعن البناء فوق القبر الی عن قال، لما روی عن ابو حنیفة انه قال ولا یجصص القبر ولا یطین ولا یرفع علیہ بناء۔

قبر کو پختہ نہ بنایا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے قبر کو پختہ کرنے اور چاندی کے پانی سے مرصع کرنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا (پھر آگے فرمایا) اس لئے بھی کہ امام ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ قبر کو پختہ نہ کیا جائے نہ ہی اس کی لپائی کی جائے اور نہ ہی اس پر عمارت بنائی جائے۔

فتاویٰ قاضی خان بر حاشیہ عالمگیری ص ۱۹۴ ج ۱۔

فتاویٰ عالمگیری جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے پانچ سوفقہاء و علماء نے مرتب کیا تھا اور آج کل کے حنفی علماء عموماً اور بریلوی علماء خصوصاً پاکستان میں اس کے نفاذ کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں، دیکھئے علمی محاسبہ صفحہ ۲ حصہ اول مولفہ حافظ احسان الحق بریلوی طبع عاشق مدینہ اکیڈمی فیصل آباد، ۱۴۱۰ھ۔

فقہ حنفی کی اس معتبر و مستند کتاب میں ہے کہ

ويسنم القبر قدر الشبر ولا يربع ولا يجصص ويكره ان يبنى على القبر، فتاویٰ عالم گیری ص ۱۶۶ ج ۱ طبع حافظ کتب خانہ کوئٹہ ۱۹۸۴ء۔
قبر ایک بالشت اونٹ کی کوہان نما بنائی جائے، اور قبر کو مربع اور پختہ نہ بنایا جائے اور اس پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔

کتب فقہ حنفیہ سے اس طرح کی مزید بیسیوں عبارات پیش کی جاسکتی ہیں مگر پہلے ہی مضمون بہت لمبا ہو گیا ہے ویسے بھی یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ ہم فقہاء احناف کی عبارات کو جمع کریں ایک دیانتدار حنفی کیلئے تو یہی عبارات کافی ہیں متعصب و جاہل کیلئے دلائل کا انبار بھی بے سود ہے۔

مکروہ کا مفہوم آئمہ احناف کے نزدیک

حضرت مفتی صاحب نے عبارات فقہاء کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا، حالانکہ انکا یہ اخلاقی فرض تھا کہ وہ مقلد ہونے کی وجہ سے ان عبارات کا جواب بھی عنایت کرتے اور ان کو قبول نہ کرنے کی معقول وجوہات بیان کرتے۔ گمان غالب یہی ہے کہ مفتی صاحب نے عدم ذکر ہی مناسب جانا اور اس جان کے وبال کو ہاتھ نہ لگانے میں ہی عافیت جانی خیر جو بھی ہو ہماری بلا جانے۔

ممکن ہے کہ مفتی صاحب کا کوئی معتقد اور مبتدعین کے اکابرین فقہاء کی عبارات کو مکروہ تنزیہیہ پر محمول کر کے انہیں کو جواز کا لبادہ پہنا دیں لہذا اس مقام پر مکروہ کے مفہوم کو بھی واضح کر دینا ہم مناسب خیال کرتے ہیں تاکہ متبعین سنت خیر الانام ﷺ، مبتدعین کے فریب سے محفوظ ہو جائیں،

علامہ ابن نجیم حنفی (التونی ۹۷۰ھ) جن کے متعلق حنفی علماء الامام، نحریر الفہامۃ، فقیہ عصرہ، وحید دھرہ، محرر مذہب نعمانی، ابو حنیفہ ثانی وغیرہ القاب سے یاد کرتے ہیں، کنز الدقائق، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں۔

واعلم ان المكروه اذا اطلق في كلامهم فالمراد منه التحريم الا ان ينص على كراهة التنزيه فقد قال المصنف في المستصفي لفظ الكراهة عند الاطلاق يرا د بها التحريم قال ابو يوسف قلت لابي حنيفة اذا قلت في شيء اكره فما رأيك فيه قال التحريم.

یعنی معلوم ہونا چاہیے کہ جب فقہاء کرام مطلق مکروہ کا لفظ اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں تو اس سے انکی مراد تحریم (حرام) ہوتا ہے، مگر یہ کہ وہ کراہت تنزیہ کی صراحت کر دیں، تحقیق مصنف نے المتصفی، میں کہا ہے کہ کراہت کا لفظ جب مطلق بولا جائے تو اس سے ان کی مراد تحریم (حرام ہونا ہے) قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام ابو حنیفہؒ سے کہا کہ جب آپ کسی چیز کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ میں اسے مکروہ جانتا ہوں تو اس سے آپ کا کیا مقصود ہوتا ہے تو انہوں نے کہا تحریم (حرام) ہوتا ہے۔ البحر الرائق ص ۱۳۱ ج ۱ طبع المکتبہ الماجدیہ کوئٹہ۔

یہی عبارت علامہ ابن عابدین نے درمختار کی شرح میں مکروہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے، البحر، سے نقل کر کے سکوت کیا ہے۔

فتاویٰ شامی ص ۲۲۴ ج ۱، طبع ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۱۴۰۶ھ۔

علامہ جلال الدین الخوارزمی حنفی (التونی) ہدایہ کی شرح میں فرماتے ہیں

و ذكر محمد في المبسوط ان ابا يوسف قال لابي حنيفة رحمة الله اذا قلت

في شيء اكرهه فما رأيك فيه قال التحريم.

یعنی امام محمد نے (اپنی تصنیف کردہ کتاب) المبسوط میں بیان کیا ہے کہ قاضی ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ سے کہا کہ جب آپ کسی چیز کے متعلق مکروہ کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے آپ کی کیا مراد ہوتی ہے، تو انہوں نے کہا کہ تحریم (حرام) ہوتا ہے، الکفایہ ص ۴۴۰ ج ۸ طبع المکتبہ الرشیدیہ کوئٹہ۔

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ فقہاء احناف کی کتابوں میں مکروہ کا جو لفظ لکھا جاتا ہے اس سے ان کا مقصود کراہت تحریمی ہوتا ہے، خاص کر جب امام ابو حنیفہ یہ لفظ بولتے ہیں تو بقول ان کے اس سے میری مراد تحریم ہوتی ہے۔

آئیے اس ضابطہ و دستور کی تصدیق ہم بریلویت کے سرخیل اور اعلیٰ حضرت بلکہ مجدد بدعات مولوی احمد رضا خاں سے کرا دیں، چنانچہ لکھتا ہے

ان الکراہۃ فی کلام الامام للتحريم.
یعنی امام ابو حنیفہ کے کلام میں مکروہ کا لفظ تحریم (حرام) کیلئے آتا ہے،
فتاویٰ رضویہ ص ۴۴۵ ج ۱۔

اقول مطلق الکراہۃ للتحريم.

میں کہتا ہوں کہ مطلق کراہت تحریم کیلئے ہے فتاویٰ رضویہ ص ۴۰۸ ج ۱۔

ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ جب مطلق کراہت کہا جائے تو ہمارے مذہب میں اصل یہی ہے کہ اس سے کراہت تحریمی ہے اور تنزیہی پر اسے محمول کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، اصل الفاظ خاں صاحب کے یہ ہیں، بے قیام دلیل ہمارے مذہب میں اصل وہی کراہت تحریم ہے۔

كما مر عن نص المحقق على الاطلاق و كتب المذهب طافحة بذلك.
تو کراہت تنزیہ کی طرف پھیرنا محتاج دلیل ہے، فتاویٰ رضویہ ص ۷۸ ج ۱ طبع مکتبہ رضویہ آرام باغ روڈ کراچی ۱۴۰۹ھ الموافق ۱۹۸۹۔

امید ہے کہ علماء بریلی اپنے اعلیٰ حضرت کی گواہی سے مطمئن ہو جائیں گے

توہمات بریلویہ

یہ بات بالکل صحیح و درست ہے کہ بریلوی عوام میں دین کا شعور کم ہے، اور یہ لوگ ادھام باطلہ کو احکام سمجھ کر ان پر سختی سے عمل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بدعات اس گروہ کے امتیازی مسائل ہیں! کیوں نہ ہوں جب ان کے خطیب و پیشوا ہی دین اسلام کے علم سے ناواقف ہیں میں نہیں کہتا کہ ان میں صاحب علم نہیں ہیں یقیناً ہیں مگر اکثریت ان پڑھ کی ہے یقین جانئے کہ ہمارے قریب ایک

گاؤں میں ایک بریلوی مکتب فکر کا پر جوش اور رد و ہابیت میں سرگرم ایک شخص امامت کراتا اور جمعہ پڑھاتا ہے اور آئے دن اہل حدیث کے خلاف کوئی نہ کوئی من گھڑت مسئلہ بیان کرتا رہتا ہے۔

مگر اس بچارے کا مبلغ علم یہ ہے کہ ناظرہ قرآن تک نہیں پڑھا، وکنی باللہ شہید، اس طرح کا ہی ایک وہم مفتی صاحب نے بھی قطع و برید کر کے پیش کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں مجھ سے ایک بار کسی نے کہا کہ اگر اولیاء اللہ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ میں کچھ طاقت تھی تو نجدی وہابیوں سے اپنی قبروں کو کیوں نہ بچایا؟ معلوم ہوا کہ یہ محض مردے ہیں پھر ان کی تعظیم و توقیر کیسی؟ میں نے کہا حضور علیہ السلام سے پہلے کعبہ معظمہ میں تین سو ساٹھ بت تھے اور احادیث میں ہے کہ قریب قیامت ایک شخص کعبہ کو گرا دے گا، آج لاہور میں مسجد شہید گنج سکھوں کا گردوارہ بن گئی، بہت سی مساجد ہیں جو کہ برباد کر دی گئیں تو اگر ہندو کہیں کہ اگر خدا میں طاقت تھی تو اس نے اپنا گھر ہمارے ہاتھوں سے کیوں نہ بچالیا، اولیاء اللہ یا ان کی مقابر کی تعظیم ان کی محبوبیت کی وجہ سے ہے نہ کہ محض قدرت سے جیسے کہ مساجد اور کعبہ معظمہ کی تعظیم، ابن سعود نے بہت سی مسجدیں بھی گرا دیں جیسے کہ مسجد سیدنا بلال کوہ صفا پر وغیرہ۔ جاء الباطل ص ۲۹۶ ج ۱۔

الجواب: اولاً۔ مفتی صاحب کا فرمانا کہ شاہ ابن سعود نے بہت سی مساجد گرا دیں ہیں ان کا زبردست مغالطہ اور صریح بھتان ہے جو لوگ حج کر کے آئے ہیں وہ بخوبی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ خاندان سعود نے مساجد کو کتنا شاندار اور عمدہ بنا رکھا ہے اور نمازی حضرات کی سہولتوں کو کس قدر مد نظر رکھا گیا ہے۔

ثانیاً۔ قبر کی توہین سے اعراض مسلم! اے جی مزارات کی تعمیر پر بھی کوئی دلیل پیش کیجئے تاکہ اصل اختلافی مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے مگر معلوم یوں ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے الٹا چلنے اور حقائق کے برعکس تحریرات لکھنے کی قسم اٹھا رکھی تھی، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر مزارات کی تعمیر جائز ہوتی تو نبی ﷺ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کے گرانے کیلئے نہ بھیجتے۔

ثالثاً۔ مساجد کے متعلق یہ کسی کا عقیدہ ہے اور نہ ہی شرعی مسئلہ کہ ان کی توہین کرنے والے کو ضرور بالضرور دنیا میں ہی سزا ملے گی اور اس پر عذاب الہی نازل ہوگا۔

رابعاً۔ رہا کعبہ میں بتوں کا معاملہ تو گزارش ہے کہ وہاں بت انہوں نے کعبہ کی توہین کیلئے نہیں

رکھے تھے بلکہ ان کے عقیدے کے مطابق بیت اللہ رب تعالیٰ کا گھر تھا اور بت خالق کائنات کے اپنی اور اس تک رسائی کا ذریعہ تھے۔ مانعہ دم الالہی بونا الی اللہ زلیٰ (الزمر آیت: ۳) ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیتے ہیں۔ جس سے واضح ہے کہ ان کا ان بتوں کو نصب کرنے سے مقصد تو ہین نہیں بلکہ تعظیم تھا۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جس نے کعبہ کو گرانے کیلئے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا تھا اس کا حشر کیا ہوا تھا، مفتی صاحب ویسے تو بریلوی مکتب فکر میں مفسر قرآن کے نام سے مشہور ہیں مگر معلوم نہیں انہیں قرآن پاک میں سورۃ الفیل میں ابرہہ کا حال کیوں نظر نہیں آیا؟ کہ جس نے کعبہ اللہ کی توہین کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ہی تباہ و برباد کر دیا اور اسے پیچھے آنے والوں کے لیے نشانہ عبرت بنایا۔ ہم آج بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور خداداد فراست، اپنے دین و ایمان کی محکم سے یہ کہتے ہیں کہ بالفرض کوئی بے ایمان اگر آج بھی بیت اللہ کی توہین کرے وہ اس دنیا میں ہی عذاب الہی سے بچ نہیں سکتا اور کوئی کافر اس کو گرا نہیں سکتا۔

قرب قیامت کعبہ کے گرائے جانے کی حدیث کا مفتی صاحب نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اگر مفتی صاحب کا اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی پنڈلیوں والا حبشی کعبہ کو گرا دے گا، بخاری رقم الحدیث ۱۵۹۱ و مسلم رقم الحدیث ۲۳۰۵ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ علامات قیامت سے ہے اور یہ انتہائی قرب قیامت کے وقت ہوگا جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے کہ پھر کعبہ کی دوبارہ تعمیر نہ ہوگی، مسند احمد ۲/۴۵۲ اور یہ کہ قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ بیت اللہ کا حج نہ کیا جائے گا، (بخاری رقم الحدیث ۱۵۹۳)۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ کعبہ کو گرائے جانے کا حادثہ اس وقت پیش آئے گا جب دنیا میں اللہ کی عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا، جسے حدیث میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ قیامت بدترین مخلوق پر قائم ہوگی، (مسلم شریف رقم الحدیث ۴۹۵۷)

خلاصہ کلام یہ کہ کعبہ کو گرایا جانا علامات قیامت سے ہے، اے جی کسی حدیث میں مزار کو گرانا بھی علامات قیامت میں شمار کیا گیا ہے تو بیان کیجئے ورنہ اللہ کا خوف کیجئے۔

خاصاً۔ مزارات کے متعلق مبتدعین کے عوام اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر فلاں بزرگ کی قبر

اور مزارات سے غلاف اتار کر دکھا دو بلکہ اس کی قبر کے آس پاس لگائے گئے درختوں سے مسواک ہی توڑ دو تو ہم مانتے ہیں کہ واقعی وہابیوں کی باتیں درست ہیں، مجھے یقین کامل ہے کہ اسی طرح کی ہی کرامت مفتی صاحب نے بھی کسی مزار کے متعلق بیان کی ہوگی تو کسی پاس کھڑے موحد نے ان کی تردید کر دی ہوگی مگر افسوس کہ مفتی صاحب نے اپنا بیان تو نقل نہیں کیا اور بچارے موحد کی بات کو دھریا ہے۔

بیان کیا مجھ سے محبی وافی محمد رفیق صاحب (آف بھاگو ڈیال من مضافات نارنگ منڈی) نے کہ یہاں کے مبتدعین نے ہم سے شرط لگائی کہ فلاں گاؤں (مرید کے، نزدیک) میں ایک ولی کی قبر ہے، اگر آپ وہاں کے مزار کے قریب لگائے گئے درخت سے فقط ایک شاخ توڑ کر زندہ پلٹ آئیں تو تب ہم مان جائیں کہ اولیاء کرام مشکل کشاء حاجت روا اور تصرف فی الامور نہیں ہوتے، ان کا کہنا ہے کہ مغرب کے قریب یہ شرط لگائی گئی تھی، میں اسی وقت ہی ایک ساتھی کو لیکر چل پڑا اور راتوں رات ہم نے ستر کلومیٹر کا سفر طے کیا (جس میں تقریباً پندرہ کلومیٹر پیدل بھی چلنا تھا) اور علی الصبح ہم شاخ توڑ کر واپس پہنچ گئے، مبتدعین اہل توحید کو زندہ دیکھ کر، فہمت الذی کفر، کا مصداق بن گئے۔

قبر پر مزارات کے تعمیر کرنے کے دلائل اور ان کی حقیقت

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

مشکوٰۃ کتاب الجنائز باب الدفن میں بروایت ابو داؤد ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت عثمان ابن مظعون کو دفن فرمایا تو ان کی قبر کے سرہانے ایک پتھر نصب فرمایا اور فرمایا

اعلم بها قبر اخي وادفن اليه، من مات من اهلي.

ہم اس سے اپنے بھائی کی قبر کا نشان لگائیں گے اور اس جگہ اپنے اہل بیت کے مردوں کو دفن کریں گے۔

بخاری کتاب الجنائز باب الجريد علی القبر میں تعلیقاً (بلا سند) ہے حضرت خارجہ فرماتے ہیں ہم زمانہ عثمان میں تھے۔

ان اشدنا وثبة الذی یشب قبر عثمان بن مظعون حتی یجاوزه.

ہم میں بڑا کودنے والا وہ تھا جو کہ عثمان ابن مظعون کی قبر کو پھلانگ جاتا۔

مشکوٰۃ کی روایت سے معلوم ہوا کہ عثمان ابن مظعون کی قبر کے سرہانے پتھر تھا اور بخاری کی روایت سے معلوم ہوا کہ خود قبر عثمان کا تعویذ اس پتھر سے تھا اور دونوں روایات اس طرح جمع ہو سکتی ہیں کہ مشکوٰۃ میں جو آیا کہ قبر کے سرہانے پر پتھر لگایا اس کے معنی یہ نہیں کہ قبر سے علیحدہ سر کے قریب کھڑا کر دیا بلکہ یہ کہ خود قبر میں ہی سر کی طرف سے لگایا یا مطلب یہ کہ قبر ساری اس پتھر کی تھی مگر سرہانے کا ذکر کیا ان دونوں احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی خاص قبر کا نشان قائم رکھنے کیلئے کچھ اونچی کر دی جائے یا پتھر وغیرہ سے پختہ کر دی جائے تاکہ معلوم ہو کہ یہ کسی بزرگ کی قبر ہے، جاء الباطل ص ۲۸۳۔

کیا حضرت عثمان کی قبر کو پختہ کیا گیا تھا؟

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے روایت کا جو نتیجہ نکالا ہے وہ متن روایت کے صریحاً خلاف ہے کیونکہ روایت میں تو فقط اتنا ہی بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دفن کرنے کے بعد نبی ﷺ نے نشانی کی غرض سے قبر کے سرہانے کی طرف ایک بھاری پتھر رکھ دیا مگر مفتی صاحب اس سے قبر کو پختہ اور اونچی بنانے کا استدلال کر رہے ہیں جو کہ غلط بیانی ہی نہیں بلکہ معنوی تحریف کا آئینہ دار ہے آئیے پہلے مکمل متن حدیث ملا حظہ کیجئے۔

معروف تابعی حضرت مطلب بن عبد اللہ مخزومیؒ بیان کرتے ہیں

لما مات عثمان بن مظعون اخرج بجنائزته فدفن فامر النبي ﷺ رجلا ان ياتيه بحجر فلم يستطع حمله فقام اليها رسول الله ﷺ وحسر عن ذراعيه قال كثير قال المطلب قال الذي يخبرني ذلك عن رسول الله ﷺ قال كاني انظر الى بياض ذراعي رسول الله ﷺ حين حسر عنهما ثم حملها فوضعها عند راسه و قال اتعلم بها قبر اخي وادفن اليه من مات من اهلي.

یعنی جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور ان کا جنازہ نکالا گیا اور دفن کیا گیا تو نبی ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا جو آپ علیہ السلام کے پاس پتھر لائے (تاکہ علامت کیلئے رکھا جائے) تو وہ شخص اس پتھر کو اٹھا نہ سکا پھر رسول ﷺ خود اس پتھر کی طرف (اٹھانے کیلئے) کھڑے ہوئے اور نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی آستین چڑھائیں (یعنی پتھر اٹھانے کیلئے بازو اقدس سے قمیض کے کپڑے کو تہہ کیا) مطلب بیان کرتے ہیں جس شخص نے مجھے خبر دی تھی اس نے کہا گویا میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں کی سفیدی کو دیکھ رہا ہوں جس وقت آپ علیہ السلام نے دونوں ہاتھوں کو کھولا اور اس پتھر کو اٹھا کر حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر کے سرہانے کی طرف رکھا اور فرمایا اس پتھر سے ہم اپنے بھائی کی قبر کو شناخت کریں گے اور میرے اہل بیت سے جو وفات پائے گا اس کو اس (کی قبر کے) پاس دفن کریں گے۔ سنن ابوداؤد مع عون

ص ۲۰۳ ج ۳، والسنن الکبری للبیہقی ص ۴۱۲ ج ۳۔

قارئین دیکھئے حدیث سے واضح ہے کہ دفن کے بعد آپ علیہ السلام نے قبر کے سرہانے پتھر رکھا یہی روایت ابن عدی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے الفاظ ہیں

لما دفن النبی ﷺ عثمان بن مظعون احتمل صخرة عظيمة فجعلها الى جنب قبره۔

نبی ﷺ نے جب حضرت عثمان بن مظعون کو دفن کر لیا تو آپ علیہ السلام ایک بھاری پتھر اٹھا کر لائے اور اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اکامل فی الضعفاء الرجال ص ۲۰۸ ج ۵۔

یہی روایت قدرے الفاظ کے اختلاف سے سنن ابن ماجہ میں ہے کہ

ان رسول الله ﷺ اعلم قبر عثمان بن مظعون بصخرة۔

بے شک رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر کا نشان ایک پتھر کے ساتھ کیا۔ سنن ابن ماجہ ص ۱۱۳۔

گو پہلی روایت بھی کسی تشریح و توضیح اور حاشیہ آرائی کی محتاج نہ تھی لیکن ابن عدی اور ابن ماجہ کی روایات نے مفتی صاحب کی کلی فقاہت کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا ہے کہ پتھر کو نصب فقط نشانی کی غرض سے کیا گیا تھا نہ کہ قبر کو پختہ کرنے کیلئے اور اس کی عظمت کے چرچا کیلئے۔

ثانیاً۔ رہا بخاری شریف کا حوالہ تو یہ ہمارے مخالف نہیں اور مفتی صاحب کے موافق نہیں کیونکہ مبتدعین کے اکابر کی قبور کو پھلانگنا آج ناممکنات سے ہے اسی خصم کی دلیل سے ان پر ڈگری ہے کہ ان کے مزادات شریعت حقہ کی تعلیم سے انحراف ہے۔

ثالثاً۔ آج بھی کسی نوجوان کی قبر کو پھلانگنا ہر کسی سے ممکن نہیں کیونکہ قبر تیار ہونے کے بعد تقریباً آٹھ فٹ کے لگ بھگ ہو جاتی ہے اور ڈیڑھ فٹ کے قریب اونچی بھی ہوتی ہے اور پھلانگنے کیلئے تقریباً دس فٹ کا ایسا جمپ درکار ہے جس کی اونچائی آٹھ فٹ تک ۲۲ انچ ہو، ایسی جست لگانا ہر کس و ناکس کا فعل نہیں ہو سکتا، اگر مبتدعین کو اس حقیقت سے انکار ہے تو وہ ایک ایسی مجلس منعقد کریں جس میں وہ عام آدمی سے اس طرح کی چھلانگ لگوا دیں، تو ہم اپنے دعویٰ کو واپس لے لیں

گے۔

رابعاً۔ مفتی صاحب اختلاف قبر کی لمبائی میں نہیں حسب ضرورت بنائی جاتی ہے اور اس کا بنانا اور کشادہ تیار کرنا شریعت حقہ کا حکم ہے۔

سردست اختلاف تو قبر پر مزارات تعمیر کرنے میں ہے جس کی دلیل دینے کی بجائے آپ ادھر ادھر سے لا تعلق روایات پیش کر رہے ہیں آپ کے اس کردار سے معلوم ہوا کہ مزار کی تعمیر کی دلیل دینے سے آپ قاصر ہیں۔

خامساً۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی فرمایا ہے اور یہ بات مبتدعین کے عقیدہ کے موافق سخت قسم کی توہین اور گستاخی ہے۔ تفصیل، دین الحق، کے حصہ سوم میں آئے گی۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

مشائخ کرام اولیاء عظام علماء کرام کی مزارات کے ارد گرد یا اس کے قریب میں کوئی عمارت بنانا جائز ہے اس کا ثبوت قرآن کریم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و عامۃ المسلمین کے عمل اور علماء کے اقوال سے ہے قرآن کریم نے اصحاب کھف کا قصہ بیان فرماتے ہوئے کہا

قال الذین غلبوا علی امرهم لنتخذن علیہم مسجداً.

”وہ بولے جو اس کام میں غالب رہے کہ ہم تو ان اصحاب کھف پر مسجد بنائیں گے۔“

قرآن کریم نے ان لوگوں کی دو باتوں کا ذکر فرمایا ایک اصحاب کھف کے گرد قبہ اور مقبرہ بنانے کا مشورہ کرنا دوسرے ان کے قریب مسجد بنانا اور کسی بات کا انکار نہ فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ دونوں فعل جب بھی جائز تھے اور اب بھی جائز ہیں جیسا کتب اصول سے ثابت ہے کہ، شرائع قبلنا یلزمنا۔ جاء الباطل ص ۲۸۳ و ۲۸۴ ج ۱۔

کیا اہل کتاب کا عمل دین میں حجت ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کی تعریف نہیں کی حالانکہ ان کا یہ عمل اگر نیکی اور عمل حسنہ کے زمرہ میں تھا تو اس کی تحسین کا یہی موقع تھا مگر قرآن نے ان کے مشورہ کی حکایت

بیان کر کے خاموشی اختیار کر لی ہے مگر مفتی صاحب ان کی تحسین کر رہے ہیں جنہی تو ان کے عمل کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب کی تصدیق و تکذیب سے منع فرمایا ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم، الحديث.

یعنی اہل کتاب کی تصدیق و تکذیب نہ کرو۔ صحیح بخاری ص ۱۰۹۴ ج ۲۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اسلام نے ان کے فعل کی تردید نہیں کی، غلط بیانی ہے اور یہ ان کی جہالت کا کرشمہ ہے ورنہ صحیح حدیث میں ان کے اس عمل کی وجہ سے نبی ﷺ نے لعنت فرمائی ہے ام المؤمنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے حبشہ کے ان گرجوں کا ذکر کیا جو انہوں نے وہاں دیکھے تھے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا

اولئک قوم اذا مات فیہم العبد الصالح او الرجل الصالح بنوا علی قبرہ مسجداً و صور وافیہ تلک الصور اولئک شرار الخلق عند اللہ.

یعنی وہ ایک ایسی قوم ہے جب ان میں کوئی نیک بندہ (یا فرمایا نیک انسان) وفات پاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں ان کی تصاویر آویزاں کرتے یہ لوگ (اسی وجہ سے) اللہ تعالیٰ کے ہاں بدترین مخلوق ہیں۔ صحیح بخاری ص ۶۲ ج ۱، صحیح مسلم ص ۲۰۱ ج ۱، و نسائی ص ۸۲ ج ۱۔

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی ولی و بزرگ اور مشائخ کی قبور پر مسجد بنانے پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے اور اسی وجہ سے ہی یہود و نصاریٰ قیامت کے روز (کمانی روایت) المسلم والبخاری والنسائی اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہونگے۔

مگر مفتی صاحب الٹی گنگا بہاتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے عمل کی سرے سے تردید ہی نہیں کی گئی، اے جی تردید کس بلا کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کے رسول برحق ﷺ تو ان کے بدترین مخلوق ہونے کی خبر دے رہے ہیں اگر آپ کو بھی بدتر بننے کا شوق ہے تو جی بھر کر اس فعل شنیع کا پرچار کیجئے۔

ثالثاً، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ شرائع قبلنا یلزمنا، جاء الباطل ص ۲۸۴ ج ۱ یعنی ہم سے پہلی

شریعتیں ہم پر بھی لاگوں ہیں، غلط بیانی ہے کیونکہ کتب اصول میں یہ بات متعدد دلائل سے لکھی ہوئی ہے کہ اسلام سے قبل کی شرائع ہمارے لئے شریعت نہیں امام ابن حزمؒ نے اس پر قرآن و سنت سے نصف صد کے قریب دلائل بیان کیے ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے۔ الاحکام فی اصول الاحکام ص-۱۶ ج ۵، یہی وجہ ہے کہ متعدد حنفی اہل علم نے بھی مذکورہ آیت سے مزارات کے تعمیر کے استدلال کو فاسد کہا ہے۔ چنانچہ علامہ محمود آلوسی حنفی التوفیٰ ۱۲۷۰ھ فرماتے ہیں کہ

واستدلال بالایة علی جواز البناء علی قبور الصلحاء و اتخاذ مسجد علیها و جواز الصلاة فی ذلک..... وهو قول باطل عاطل فاسد کاسد فقد روی احمد ابو داؤد و الترمذی والنسائی و ابن ماجہ عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ لعن اللہ تعالیٰ زائرات القبور و المتخذین علیها المساجد و السرج.

یعنی اس آیت سے (بعض لوگوں نے) نیک لوگوں کی قبروں پر عمارت تعمیر کرنے اور ان پر مساجد بنانے اور ان میں نماز پڑھنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ (ان کا یہ استدلال) باطل، عاطل، فاسد، کاسد ہے اس لئے کہ امام احمد، امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر، قبروں پر مساجد بنانے والوں پر اور ان پر چراغ جلانے والوں پر، روح المعانی ص ۲۳۷ ج ۱۵۔ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان،

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

اس دلیل کے تحت حضرت مفتی صاحب لمبی چوڑی تحریر رقم فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کو حجرے میں دفن کیا گیا اگر یہ ناجائز تھا تو صحابہ پہلے اس کو گرا دیتے پھر دفن کرتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کے گرد کچی اینٹوں کی دیوار کھینچ دی گئی پھر ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں تمام صحابہ کرام کی موجودگی میں اس عمارت کو پتھروں سے مضبوط کیا گیا، ۵۵۷ھ میں آس پاس پانی تک بنیاد رکھ کر سیسہ لگا کر اس کو بھر دیا، ۶۷۸ھ میں سلطان قلاؤں صالح نے یہ گنبد سبز جو اب تک موجود ہے بنوایا، پھر وجہ استدلال میں فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ

روزہ مطہر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بنوایا تھا۔ جاء الباطل ص ۲۸۵ ج ۱۔

کیا آنحضرت ﷺ کا روضہ صحابہؓ نے تعمیر کیا تھا؟

الجواب اولاً۔ روضہ اقدس پر دیگر قبور کو قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں اس وجہ سے دفن کیا گیا کہ

قال ناس يدفن عند المنبر و قال آخرون يدفن بالبقيع فجاء ابو بكر الصديق رضي الله عنه فقال سمعت رسول الله ﷺ يقول مادفن نبی قط الا في مكانه الذي توفي فيه فحفر له فيه.

یعنی لوگوں نے کہا کہ آپ علیہ السلام کو منبر کے پاس دفن کیا جائے اور دوسروں نے کہا کہ آپ علیہ السلام کو البقیع کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جائے اسی دوران حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ نبی صرف اسی جگہ دفن ہوتا ہے جہاں اس کی وفات ہوتی ہے سو اسی مقام پر آپ ﷺ کی قبر کو کھودا گیا۔ موطا امام مالک ص ۲۱۲۔

اسی کے ہم معنی روایات امام ترمذی نے السنن مع تحفہ ص ۳۹ ج ۲ میں امام ابن عبد البر نے، التمهيد ص ۳۹۹ ج ۲۴ میں، امام بیہقی نے دلائل النبوة ص ۲۶۱ ج ۷ میں نقل کی ہیں۔

اس حدیث کی رو سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتفاق سے آپ ﷺ کی قبر کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں بنوایا گیا، رہا مفتی صاحب کا اس پر یہ معارضہ بلکہ ڈھکوسلا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حجرے کو گرا کیوں نہیں دیا تھا، اس کے جواب میں ہم مبتدعین سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ آنکھوں سے ضد کی پٹی اتار کر حقیقت کی دنیا میں آکر اس کی وجوہات ملاحظہ کریں (۱) اسی حجرے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رہائش بھی تھی۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ نبی ﷺ کا مسکن ہونے کی وجہ سے آثار متبرکہ تھا اسے گرانے کی کون جسارت کر سکتا تھا، ۸۸ھ میں ولید بن عبد الملک کے زمانہ امارت میں جب حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے تمام حجرے (بجز حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا) توڑ کر مسجد نبوی میں شامل کئے تو

تمام مدینہ طیبہ میں کھرام مچا ہوا تھا کہ حضور انور ﷺ کی ایک اور یادگار مٹ گئی، ابن سعد بحوالہ سیرۃ النبی ص ۱۱۹ ج ۲۔

(۳) آنحضرت ﷺ کو گھر میں ہی دفن کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں لوگ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ نہ بنالیں چنانچہ ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ علیہ السلام کو کسی میدان میں اس لئے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرط عقیدت میں میری قبر کو بھی عبادت گاہ نہ بنالیں، میدان میں اس کی داروگیر مشکل تھی (اس لئے حجرے میں دفن کیا گیا)۔ بخاری باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ وابی بکر وعمر الخ ص ۱۸۶ ج ۱۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا بخاری شریف سے یہ نقل کرنا کہ ولید بن عبد الملک کے زمانہ امارت میں دیوار گر گئی تو صحابہ کرام نے اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ تو یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ عروہ صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں، تھذیب ص ۱۸۲ ج ۷، علاوہ ازیں یہ واقعہ ۸۸ھ کا ہے تاریخ ابن کثیر ص ۱۳۲ ج ۹ مترجم، مدینہ منورہ میں تمام صحابہ کرام کے بعد فوت ہونے والے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ تھے جو ۷۸ھ میں فوت ہوئے، چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

وهو آخر من مات من الصحابة بالمدينة وقال عمرو بن علي و يحيى بن بكير وغيرهما مات سنة ۷۸۔

جن صحابہ کرام نے مدینہ طیبہ میں وفات پائی ان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سب سے آخری ہیں اور امام عمرو بن علی اور یحییٰ بن بکیر وغیرہ فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۷۸ھ میں ہوئی، تھذیب ص ۳۸ ج ۲۔

الغرض انکی وفات کے تقریباً دس سال بعد ولید نے ازواج مطہرات کے حجرے خرید کر مسجد میں شامل کئے اس کے اس فعل کو اس دور کے جید فقہاء مدینہ نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا اعیان بنی ہاشم وغیرہ نے چیخا چلانا شروع کیا اور اسی طرح آہ و بکا لوگوں نے شروع کر دی جیسی رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت کی گئی تھی، البدایہ والنہایہ مترجم ص ۱۳۲ ج ۹۔

مگر مفتی صاحب اس کے برعکس اسے صحابہ کا فعل باور کراتے ہیں، لعنت اللہ علی الکاذبین۔

ثالثاً۔ قبر نبوی ﷺ میں ایسا نہیں ہوا کہ قبر مبارک پہلے بنی ہو اور اس پر عمارت بعد میں تعمیر

ہوئی ہو بلکہ آپ کی وفات حجرہ میں ہوئی تھی اور سابقہ احادیث کے پیش نظر آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا پھر حسب تحقیق شاہ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ ایک المناک سانحہ کی وجہ سے آپ کی قبر اقدس کے ارد گرد نہایت گہری دیوار سیسہ اور لنگ گلا کر اس کو بھردیا اور مضبوط دیوار قائم کی۔

جذب القلوب ص ۸۶ بحوالہ راہ سنت ص ۱۹۱۔

پھر بقول مفتی صاحب سلطان قلاؤں صالحی نے ۶۷۸ھ میں سبز گنبد تعمیر کروایا جواب تک موجود ہے۔ جاء الباطل ص ۲۸۵ ج ۱۔

بتائیے تعمیر مزار اقدس میں کون کون صحابی شامل تھا۔

کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے آخر میں وفات پانے والے حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں

مات سنة عشرة ومائة على الصحيح وهو آخر من مات من الصحابة.

یعنی صحیح تحقیق یہی ہے کہ ان کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی اور وہ صحابہ میں سے سب سے آخر میں وفات پانے والے تھے۔ تقریب ص ۱۲۰۔

یہی بات امام مسلمؒ نے بھی کہی، کذا فی التہذیب ص ۸۲ ج ۵۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرام کا دور تو ایک سو دس ہجری میں ختم ہو جاتا ہے اور گنبد کی تعمیر بقول مفتی صاحب ۶۷۸ھ میں ہوئی ہے اس کے باوجود مفتی صاحب شرم و حیاء کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دیدہ دلیری سے لکھتے ہیں، روزہ مطہرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بنوایا تھا۔ جاء الباطل ص ۲۸۵ ج ۱۔

سوال یہ ہے کہ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چھ سو سال بعد دوبارہ روضہ اقدس کی تعمیر کے لئے دنیا میں آئے تھے، نہیں قطعاً نہیں یہ مفتی صاحب کی غلط بیانی اور تاریخ سے ناواقفی ہے۔

مفتی جی قرآن و حدیث بلکہ فقہ و تاریخ سے تو ناواقف تھے ہی مگر اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اردو بھی صحت سے لکھنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اسی تحریر میں بریلویت کا حکیم الامت لفظ روضہ کو حرف، ز، سے لکھ رہا ہے۔

لطف پر لطف ہے املا میں میرے یار کے یار
حاء ہطی سے گدح لکھتا ہے ہوز سے ہمار

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

بخاری جلد اول کتاب الجنائز اور مشکوٰۃ باب البكاء علی لمیت میں ہے کہ حضرت حسن ابن حسن ابن علی رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔

ضربت امراته القبة علی قبره سنة .

تو ان کی بیوی نے ان کی قبر پر ایک سال تک قبہ ڈالے رکھا۔

یہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں سب کی موجودگی میں ہوا کسی نے انکار نہ کیا، نیز حسن کی بیوی ایک سال تک وہاں رہیں، پھر گھر واپس آئیں اس سے بزرگوں کی قبر پر مجاوروں کا بیٹھنا بھی ثابت ہوا۔ جاء الباطل ص ۲۸۵ ج ۱۔

کیا صحابہؓ کے دور میں قبروں پر قبہ بنائے گئے

الجواب - اولاً۔ مفتی صاحب نے روایت کے پورے الفاظ ہی درج نہیں کئے ورنہ انکے اس دعوے کی قلعی کھل جاتی کہ کسی نے انکار نہ کیا۔ آگے جانے سے پہلے آئیے متن روایت ملاحظہ کریں۔

لما مات الحسن بن الحسن بن علی ضربت امراته القبة علی قبره سنة ثم رفعت فسمعوا صائحا يقول الاهل وجدوا ما فقدوا فاجابه اخربل ينسوا فانقلبوا .

یعنی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پوتے حسن کی وفات ہوئی تو ان کی بیوی نے سال بھر اس کی قبر پر خیمہ لگایا پھر اسے اٹھالیا اس نے سنا کہ ایک کہنے والا کہہ رہا ہے کہ کیا تو نے اس چیز کو پالیا ہے جس کو گم کیا تھا، دوسرے نے جواب دیا نہیں بلکہ بے نیل و مرام واپس لوٹ آئی ہے، صحیح بخاری ص ۱۷۷ ج ۱، و مشکوٰۃ ص ۱۵۲۔

غور کیجئے اس میں قبر پر مزار تعمیر کرنے کا ثبوت کہیں بھی نظر نہیں آ رہا پھر اس دور کے لوگ اس عورت کے اس عمل پر تہقیر اڑا رہے ہیں، اسی وجہ سے امام بخاری نے اسے باب

ما یکره من اتخاذ المسجد علی القبور،

کے زیر عنوان درج کیا ہے، مگر مفتی صاحب الٹی گنگا بہا رہے ہیں۔

ثانیاً۔ امام بخاری نے اسے تعلیقاً (بلا سند) بیان کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اسکی سند کو درج کیا ہے جس میں خیر سے ایک راوی، محمد بن حمید رازی تلمیذی ہے۔

تعلیق التعلیق علی صحیح بخاری ص ۲۸۲ ج ۲، اس کے متعلق امام یعقوب فرماتے ہیں کثیر المناکیر ہے، امام بخاری کا کہنا ہے، فی حدیث نظر (اس کی حدیث میں نظر ہے) امام نسائی کا فیصلہ ہے ثقہ نہیں، امام جوزجانی فرماتے ہیں کہ غیر ثقہ ہونے کے علاوہ بد مذہب بھی تھا۔

امام صالح جزره کہتے ہیں میں نے شاذ کو فی اور ابن حمید سے بڑھ کر کسی کو جھوٹ پر دلیر نہیں پایا، امام ابو زرعہ فرماتے ہیں جھوٹا ہے، امام ابو نعیم کا کہنا ہے محدث ابو حاتم کے گھر ابن خراش اور فقہاء کی ایک جماعت جمع تھی تو ابن حمید کا تذکرہ ہوا تو تمام اس بات پر متفق ہوئے کہ ابن حمید حدیث میں سخت ضعیف ہے اور وہ ایسے لوگوں سے روایت بیان کرتا ہے جس سے اس کا سماع نہیں ہوا، امام ابن خراش کا کہنا ہے واللہ وہ جھوٹ بولتا تھا، امام ابو حاتم فرماتے ہیں کذاب ہے، امام حمزہ کنانی فرماتے ہیں بیچ محض ہے دوسری بار کہا کذاب ہے امام ابن حبان کا کہنا ہے ثقاہت سے مقلوب روایات بیان کرنے میں منفرد ہے۔

تھذیب ص ۱۳۱ ج ۹، و میزان ص ۵۳۰ ج ۳۔

جس روایت میں راوی اتنا بڑا کذاب ہو، اس کی روایت کا کیا اعتبار ہے؟ اور اس کے باطل و موضوع ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

ثالثاً۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے حسن کی وفات ۵۰ سال کی عمر میں ۹۷ھ میں ہوئی (تقریب، و تھذیب) حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ انہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی، البدایہ و النہایہ ص ۲۵۳ ج ۹ مترجم، پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مدینہ طیبہ میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ تھے جو کہ ۷۸ھ میں فوت ہوئے، لیکن بایں ہمہ مفتی صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں سب کی موجودگی میں ہوا کسی نے انکار نہ کیا، جاء الباطل ص ۲۸۵، اے جی مدینہ میں حسن کی وفات کے وقت کوئی صحابی نہ تھا، یہ آپ کی زیادتی ہے۔

مفتی صاحب کا اصل موضوع سے انحراف

جب مفتی صاحب کا مذکورہ حیرا پھیریوں سے کیسہ دلائل خالی ہو گیا تو انہوں نے ادھر ادھر کی کتابوں سے عبارات نکال کر فتح حاصل کرنے کی سعی لا حاصل شروع کر دی آخر میں امام شعرانی کی کتاب میزان سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قبر پر عمارت بنانا جائز ہے پھر فرماتے ہیں اب تو رجسٹری ہو گئی کہ خود امام مذہب ابو حنیفہ کا فرمان مل گیا، جاء الباطل ص ۲۸۷، اللہ، اکبر، دسویں صدی ہجری کے ایک صوفی کی بے سند نقل سے مفتی صاحب قبوں کے جواز پر رجسٹری کروا رہے ہیں اور حضرت امام محمدؒ کی نقل جو امام صاحب کے شاگرد خاص اور محرر مذہب حنفیہ ہیں ان کی روایت سے قبوں کی عدم تعمیر پر رجسٹری ماننے سے انکاری ہیں۔

خیر مفتی صاحب اس طرح کی بے مقصد عبارات نقل کرتے کرتے آخر میں پھر پلٹا کھا کر قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے متنفی اجتہاد کو بروئے کار لا کر فرماتے ہیں، حضور علیہ السلام کے زمانہ میں خود زندہ لوگوں کو پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی، ایک صحابی نے پختہ مکان بنایا تو حضور علیہ السلام ناراض ہوئے یہاں تک کہ اس کے سلام کا جواب نہ دیا جب اس کو گرا دیا تب جواب سلام دیا، دیکھو مشکوٰۃ کتاب الرقاق فصل ثانی، اسی مشکوٰۃ کی کتاب الرقاق میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا بندے کے مال میں بے برکتی ہوتی ہے تو اسے اس کو اینٹ گارے میں خرچ کرتا ہے لیکن ان احکام کے باوجود عام مسلمانوں نے بعد میں پختہ مکان بھی بنائے اور مسجدیں بھی، تعجب ہے کہ جو حضرات اولیاء اللہ کی قبروں کے پختہ کرنے یا ان پر قبہ بنانے کو حرام کہتے ہیں وہ اپنے مکان کیوں عمدہ اور پختہ بناتے ہیں جاء الباطل ص ۲۸۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدر نے مفتی جی کی زندگی میں ہی ان سے پختہ مکان بنانے کی ممانعت والی حدیث کا حوالہ مانگا تھا، راہ سنت ص ۲۰۳۔

مگر مفتی صاحب اور ان کی جماعت نے دم نہیں مارا الغرض یہ ابھی تک ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

ثانیاً۔ البتہ جس روایت کا مفتی صاحب نے حوالہ دیا ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ اس کے الفاظ بھی

نقل کر دیتے تاکہ ساری حقیقت قارئین کرام کے سامنے کھل کر آجاتی، اے جی پختہ مکان کی وجہ سے ترک سلام نہ ہوا تھا بلکہ اس لئے ہوا تھا کہ گنبد اور قبہ بنایا تھا، آئیے مکمل متن روایت ملاحظہ کریں

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ خرج فرآی قبة مشرفة فقال ما هذه قال له اصحابه هذه لفلان رجل من الانصار قال فسكت و حملها في نفسه حتى اذا جاء صاحبها رسول الله ﷺ يسلم عليه في الناس اعرض عنه صنع ذلك مراراً حتى عرف الرجل الغضب فيه والا عراض عنه فشكا ذلك الى اصحابه فقال والله اني لانكر رسول الله ﷺ قالوا خرج فرآى قبتك فرجع الرجل الى قبتة فهدمها حتى سواها بالارض فخرج رسول الله ﷺ ذات يوم فلم يرها فقال ما فعلت القبة قالوا اشكا الينا صاحبها اعراضك عنه فاخبرناه فهدمها فقال اما ان كل بناء وبال على صاحبه الا مالا الا ماله يعنى مالا بدمنه.

یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (باہر کو) نکلے تو آپ علیہ السلام نے ایک گنبد اونچا دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا فلاں انصاری کا مکان ہے یہ سن کر آپ خاموش رہے اور اس بات کو اپنے دل میں ہی رکھا جب وہ آپ کے پاس آیا اور مجلس عام میں آپ کو سلام کیا تو آپ نے اس سے اعراض کیا اور چند بار ایسا ہی کیا یہاں تک کہ اسے آپ علیہ السلام کی ناراضگی معلوم ہوگئی، اس نے اس کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شکوہ کیا اور کہا اللہ تعالیٰ کی قسم میں رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ ایسا نہیں پاتا جیسا کہ پہلے آپ میرے ساتھ محبت کرتے تھے لوگوں نے کہا آپ ایک بار باہر نکلے تھے تو تیرا گنبد دیکھا تھا (شاید اسی وجہ سے ناراضگی ہو) یہ سن کر وہ انصاری اپنے گنبد کی طرف آیا اور اس کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا، پھر ایک روز آپ علیہ السلام باہر کو نکلے اور اس گنبد کو نہ دیکھا آپ نے فرمایا اس گنبد کے ساتھ کیا کیا گیا، لوگوں نے عرض کی اس نے ہم سے شکایت کی تھی آپ کی بے التفاتی کی تو ہم نے اسے بتایا تو اس نے اس کو منہدم کر دیا تو آپ نے فرمایا ہر مکان اس کے مالک مکان پر وبال ہے مگر وہ جس کے بغیر گزارہ نہ ہو۔

سنن ابی داود مع عون ص ۵۳۰ ج ۴، و مسند امام احمد ص ۲۲۰ ج ۳، و مشکل الآثار ص ۴۱۶ ج ۱۔
غور کیجئے اس میں تو گنبد کی وجہ سے ناراضگی بتائی گئی ہے مگر مفتی صاحب اسے پختہ مکان پر
محمول کر رہے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثالث۔ روایت مذکورہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان
کرنے والے ابو طلحہ الاسدی ہیں اس کی کسی محدث سے توثیق منقول نہیں، جہذیب ص ۱۳۸ ج ۱۲۔
حافظ ابن حجر نے تقریب ص ۳۰۲ میں اسے مقبول کہا ہے، یعنی متابعت کے وقت ورنہ لین
الحدیث ہے، محدث البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر نہایت نفیس بحث کی ہے بازوق حضرات
مراجعت کریں

سلسلة الاحادیث الضعيفة والموضوعة و اثرها الیسنی فی الامۃ
ص ۲۱۲ ج ۱ رقم ۱۷۶

اسی طرح مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت امام الخ (جب بندے کے مال میں بے برکتی
ہوتی ہے تو اس کو اینٹ گارے میں خرچ کرتا ہے۔ جاء الباطل ص ۲۸۸) بھی سند کے اعتبار سے
ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں عبد الاعلیٰ بن ابی الساور، راوی ہے شعب الایمان للبیہقی
ص ۳۹۴ ج ۷، رقم الحدیث (۱۰۷۱۹) امام یحییٰ، ابو داؤد فرماتے ہیں بیچ محض ہے، ابن نمیر اور نسائی
متروک کہتے ہیں دارقطنی نے ضعیف کہا ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ اسے محدثین نے ضعیف قرار
دیا ہے، میزان الاعتدال ص ۵۳۱ ج ۲، الغرض یہ روایت ضعیف ہے، تنقیح الرواة فی تخریج احادیث
المشکوۃ ص ۷۷ ج ۴۔

علاوہ ازیں روایت کا مفہوم یہ ہے کہ دین سے منہ پھیر کر دنیاوی شان و شوکت کیلئے خرچ
کرے، دیکھئے مرقاة ص ۳۸۳ ج ۹، اور اس میں کیا شک ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا
ہو اور وہ راہ اللہ کچھ خرچ نہ کرے اور اپنی ساکھ کیلئے بے دریغ دولت بہائے تو واقعی اس کے مال میں
بے برکتی ہے۔ آمنا و صدقا

کیا تکمیل شریعت کے بعد کوئی حکم منسوخ ہو سکتا ہے

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

اول زمانہ میں تعلیم قرآن و اذان و اقامت پر اجرت لینا حرام تھا حدیث و فقہ میں موجود ہے مگر بعد کو ضرورتاً جائز کیا گیا۔ جاء الباطل ص ۲۸۸۔

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب کی اول زمانہ سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی مبارکہ میں ہی پہلے یہ حرام تھا بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی تو پھر اعتراض کیسا، کیونکہ اجازت تو اللہ اور اس کے رسول نے دی، مفتی صاحب اور ان کے فقہاء کون ہیں جو اس کی ممانعت کا فتویٰ صادر کریں۔

ثانیاً۔ اگر مفتی صاحب کی مراد یہ ہے کہ شریعت میں اس کی ممانعت ہی ہے مگر مرور زمانہ کی وجہ سے اس کے جواز کا فتویٰ دیا گیا، تو ہم اس کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ شریعت کا کوئی حکم و فیصلہ منسوخ کرنے کا کسی امتی کو قطعاً حق نہیں ہے کیونکہ نسخ امت کے فعل سے نہیں بلکہ وحی سے ہوتا ہے، اس لئے کہ نسخ کی تعریف ہی یہ ہے کہ پہلے حکم کو باطل کر کے دوسرے حکم کو اس کا قائم مقام کرنا، دیکھئے مجمع بحار الانوار ص ۳۵۲ ج ۳، و تاج العروس ص ۲۸۲ ج ۲، و لسان العرب ص ۵۸ ج ۳) نسخ کی تعریف بیان کرتے ہوئے علامہ فیومی فرماتے ہیں، النسخ الشرعی ازالة ما كان ثابتاً بنص شرعی،

یعنی نسخ شرعی اسے کہتے ہیں کہ ایسے حکم کو زائل کرنا جو اس سے پہلے کتاب و سنت کی نص سے ثابت تھا، المصباح المنیر ص ۶۰۳ ج ۲۔

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ شریعت کے کسی حکم کو زائل اور کالعدم کرنا ہی نسخ ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام کے احکام کو معدوم کرنے کا کسی امتی کو اللہ تعالیٰ نے حق نہیں دیا کیونکہ امتی تو پیروی کرنے کا مکلف ہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں۔

لا يحل لمسلم يومن بالله واليوم الآخر أن يقول في شيء من القرآن و السنة، هذا منسوخ الابقين، لان الله عزو جل يقول، وما ارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله، و قال تعالى، اتبعوا ما انزل اليكم من ربكم، فكل ما انزل الله تعالى في القران أو على لسان نبيه ففرض اتباعه فمن قال في شيء من ذلك، انه منسوخ فقد أوجب

الایطاع ذلک الأمر، وأسقط لزوم اتباعه، و هذه، معصية الله تعالى مجردة، و خلاف مکشوف، الا أن يقوم برهان علی صحة قوله، والا فهو مفتر مبطل.

یعنی کسی مسلمان کیلئے حلال نہیں جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے روز پر ایمان رکھتا ہو وہ قرآن و حدیث کے کسی حکم کے بارہ میں کہے کہ یہ منسوخ ہے، مگر یقین کے ساتھ (یعنی نص کے ساتھ) اس لئے اللہ عزوجل کہتے ہیں کہ میں نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اللہ کے حکم سے پیروی کی جائے، اور کہا اللہ تعالیٰ نے، پیروی کرو اس چیز کی جو تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی، الغرض ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمائی ہے یا اپنے نبی کی زبان پر (خبر دی) اسکی اتباع فرض ہے پس جو شخص ان میں سے کسی کے متعلق کہتا ہے کہ یہ منسوخ ہے جب کہ اللہ نے اس کی اطاعت فرض کی ہے، اور وہ اس فرض کی اتباع کو ساقط (گراتا) کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی معصیت محض اور ثابت شدہ نص کے خلاف ہے، الا یہ کہ وہ اپنے قول پر کوئی دلیل لائے ورنہ مفتری اور باطل پرست ہے۔

الاحکام فی اصول الاحکام ص ۸۳ و ۸۴ ج ۴۔

ثالثاً۔ باقی رہا تعلیم قرآن و سنت پر اجرت کا مسئلہ تو اس کے متعلق راقم آخر میں ان شاء الرحمن مقالہ سپرد قلم کرے گا جس میں فریقین کے دلائل کا محاکمہ کر کے مفتی صاحب کے شبہات دور کر دیئے جائیں گے، یہاں فقط راقم اپنی تحقیق کا خلاصہ ہی درج کر دیتا ہے۔

اجرت معاوضہ کو کہتے ہیں اور تبلیغ دین کا معاوضہ اللہ ہی دے گا اور اسی کی طرف ہی دھیان رکھنا چاہیے، ہاں البتہ اگر انسان دینی اشغال کی وجہ سے کوئی کاروبار نہ کر سکتا ہو اور اس کی مالی حالت بھی کمزور ہو تو وہ گزارہ لے سکتا ہے کہ اجرت حقیقت میں مال کی خاطر کی جاتی ہے نہ یہ کہ کام اصل مقصود ہوتا ہے اور جو کچھ لیا جائے وہ صرف ضرورت کی بنا پر لیا جائے پس (اس میں یہ پابندی ہے) توسع اور فراخی سے کام نہ لینا چاہیے مثلاً اس ذریعہ سے جائداد جمع کی جائے یا بہت امیرانہ خرچ اختیار کیا جائے یا اپنے اہل قربت یا متعلقین کے ساتھ ضروری سلوک سے زیادہ کیا جائے یہ صورتیں غیر مناسب ہیں اس طرح کام کا اندازہ کرے اگر واقعی شغل زیادہ ہے جس کی وجہ سے یہ اپنا کوئی مستقل کام نہیں کر سکتا تو گزارہ لے ورنہ بچے، غرض اس معاملہ میں جتنی احتیاط ہو تھوڑی ہے۔ دیکھئے فتاویٰ اہل حدیث ص ۳۰۰ ج ۲۔

باب قبروں پر پھول ڈالنا چادریں چڑھانا

اور چراغاں کرنے کا بیان

کیا یہ اسلام کی تعلیم ہے یا زمانہ جاہلیت کی؟

اسلام نے انسان کو زندگی گزارنے کے طور طریقے بتائے ہیں اور اپنا ایک کامل معاشرہ دیا ہے اس کے مرنے کے بعد بھی دین نے اس کے ساتھ حسن سلوک کا درس دیا ہے اس کی میت کو غسل، کفن دفن اور دعا (جنازہ) کا طریقہ بتایا ہے۔

ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اس کی مزید تشریح و توضیح کرتے ہوئے ان امور کی اپنی زندگی مبارکہ میں عملی تفسیر کر دی ہے، جب اسلام کے احکام ہر لحاظ سے پورے کر دیئے گئے تو اللہ رب العزت نے تکمیل دین کی نعمت کی خوش خبری دی، سورة المائدة آیت ۳

بانی اسلام نے دین اسلام میں حک و اضافہ سے منع فرمایا اور اسے بدعت سے تعبیر کیا اور اس کے قائل و فاعل کو جہنم کی دردناک آگ کی وعید شدید سنائی۔

جس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں دین کی تعلیم محیط ہے اسی طرح انسان کی اخروی زندگی کے متعلق بھی شریعت نے قواعد و ضوابط بیان فرمائے ہیں۔

ان قوانین کی پابندی ہی اصل دین ہے اور ان سے انحراف اور حک و اضافہ دراصل دین سے کھلی بغاوت ہے، انسان کی یہ بغاوت اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنی مذموم اور گھناؤنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کی وعید رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ صحیح بخاری ص ۱۲۵۱ ج ۱، و مسلم ص ۴۴۱ ج ۱۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر قبروں پر چراغاں کرنے میں کوئی دینی مصلحت ہوتی، پھول اور چادر چڑھانے سے میت کو کچھ اخروی فائدہ ہوتا تو رسول کریم ﷺ ضرور چڑھاتے، کیونکہ آپ مومنوں کیلئے رؤف و رحیم تھے، ارشاد ہوتا ہے۔

لقد جاءكم رسول من انفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمومنين

رءوف رحیم ☆ توبہ ۱۲۸۔

(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔ ۱۲۸-۹

الغرض اگر چادر اور پھول وغیرہ سے میت کو اخروی فائدہ ہوتا تو آپ ﷺ کی شفقت اور مہربانی کا تقاضا تھا کہ آپ علیہ السلام اسے بیان فرماتے، قارئین آپ قرآن کو الحمد سے لیکر والناس کی سین تک پڑھ جائیے، اور پورے ذخیرہ احادیث کو وسیع النظری سے دیکھ لیجئے کہیں بھی آپ کو ایسا کوئی ارشاد نہیں ملے گا۔

ہم اپنی خداداد فراست اور اپنے دین و ایمان کی محکمی سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان رسوم کی شریعت حقہ میں کوئی اصل نہیں ان کی ایجاد دین اسلام کی تکمیل کے صدہا سال بعد بدعتی صوفیاء کے ذریعہ سے ہوئی اس کا رشتہ اسلام کی بجائے زمانہ جاہلیت کی مذموم رسوم سے ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاویٰ عالمگیری، میں ہے

وايقاد النار على القبور فمن رسوم الجاهلية.

یعنی قبروں پر آگ جلانا جاہلیت کی رسوم میں سے ہے۔ فتاویٰ عالمگیری ص ۱۶۷ ج ۱۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے

اللہ تعالیٰ کے ہاں بدترین وہ شخص ہے جو اسلام میں جاہلیت کی رسمیں تلاش کرے، بخاری

کتاب الدیات باب من طلب دم امری بغیر حق، ص ۱۰۱۶ ج ۲۔

اس صاف و شفاف تعلیم کے برعکس مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ علماء، اولیاء اور صالحین کی قبروں

پر عمارت بنانا اور ان پر غلاف اور عمامہ اور کپڑے چڑھانا جائز کام ہیں، جاء الباطل ص ۳۰۰ ج ۱۔

مگر اس جواز کی دلیل **مضار**، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس کی دلیل تو کجا شریعت میں ان

عبث کاموں کی ممانعت موبود ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا

ان الله لم يامرنا ان نكسو الحجارة والطين، الحديث.

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا کہ ہم مٹی اور پتھر کو کپڑے پہنائیں۔ صحیح مسلم ص ۲۰۰ ج ۲۔

سنن ابوداؤد کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

ان الله لم يامرنا فيما رزقنا ان نكسوا الحجاره واللين.

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں رزق دیا ہے اس سے پتھر اور اینٹ کو کپڑے پہنانے کا حکم نہیں دیا۔ سنن ابوداؤد مع عون المعبود ص ۱۲۲ ج ۳۔

اس حدیث کا یہی مقصود ہے کہ یہ چیزیں کپڑے وغیرہ کی محتاج نہیں، ظاہر ہے کہ اولیاء اور مزارات بھی اس میں شامل ہیں کیونکہ قبر پر چادر ڈالنا درحقیقت اینٹ گارے اور پتھر کو ہی کپڑا پہنانا ہے، جو اسراف کے زمرے میں آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق کو بے جا خرچ کرنا اس قدر برا فعل ہے کہ خالق ارض و سماء نے فضول خرچ کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے *

وَاْتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٖ وَ الْمَسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تَبْذِرْ تَبْذِيْرًا ۚ
الْمُبْذِرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانِ الشَّيْطٰنِ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۚ بَنِيْ اِسْرٰٓئِيْلَ ۚ وَ ۲۷۔ ۲۷۔

اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو، اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا کفر کرنے والا ہے۔ ۱۷-۲۶ و ۲۷۔

ایک روایت میں نبی رحمت رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قبروں پر چراغاں کرنے پر لعنت فرمائی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

لعن رسول الله ﷺ زائرات القبور والمتخذين عليها المساجد والسرج.
یعنی رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی خواتین اور ان کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔

ابو داؤد ص ۱۰۵ ج ۲، و نسائی ص ۲۳۳ ج ۱، و طیبالعی ص ۳۵۷، و

ترمذی مع تحفه ص ۲۶۵ ج ۱، و مسند امام احمد ص ۲۲۹ و ۲۸۷ ج ۱، و ابن حبان ص ۷۲ ج ۶ رقم الحدیث ۳۱۶۹، و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۴۵ ج ۳، و مستدرک حاکم ص ۳۷۴ ج ۱، و السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۷۸ ج ۴، و طبرانی کبیر ص ۱۴۸ ج ۱۲۔ و سندہ ضعیف، الضعیفہ، ۲۲۵۔

اس حدیث میں اس قدر سختی کی وجہ یہی ہے کہ مزارات پر چادر و پھول چڑھانا اور پُراغاں کرنا دین میں بدعت کے علاوہ اسراف اور فضول خرچی بھی ہے اور بے مقصد دولت کو اجاڑنے والا بھگم قرآنی اخوان الشیطان اور کفرانِ نعمت کا مرتکب ہے یہی معنی شارحین نے بیان فرمایا ہے، چنانچہ ملا علی القاری حنفی مشکوٰۃ کی شرح میں اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

و النهی اتخاذ السرج لما فيه من تضييع المال لانه لا نفع لاحد من السراج ولانها من آثار جهنم واما للاحتراز عن تعظيم القبور كما لنهى عن اتخاذ القبور مساجد۔

یعنی قبر پر چراغ جلانے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مال کا زیاں ہے اس لئے کہ چراغ جلانے سے کسی ایک (جلانے والا اور صاحب قبر) کو بھی فائدہ نہیں پہنچتا، اور اس لئے بھی کہ یہ (آگ) جہنم کے آثار سے ہے اور اس لئے بھی کہ قبر کی تعظیم سے اجتناب (کرنے کا حکم ہے) جیسا کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت ہے۔ مرقاة ص ۲۱۹ ج ۲ طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔

شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ (جن کی عبارات کو فریق ثانی چن چن کر بدعات کے جواز پر پیش کرتا ہے) شرح مشکوٰۃ میں تحریر فرماتے ہیں

جراغها را بر قبور بقصد تعظیم و نذد بعض حرام است اگرچه نہ بقصد تعظیم باشد اوجہت اسراف و تضييع مال و بعض گویند کہ اگر آن جاء ہگزرد مردم باشد یادہ سایہ چراغ کاری میکردہ باشد جائز است و درینصورت چراغ گرفتن بجہت قبر نیست بلکہ بجہت کاری دیگرست کہ قبر دران منظور نیست:

یعنی قبروں پر تعظیم کے قصد سے چراغ جلانا بعض کے نزدیک حرام ہے، اور اگر تعظیم کے قصد سے نہ ہو تب بھی اسراف اور مال کے زیاں کی وجہ سے حرام ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ اگر قبر راستے پر ہے یا اس جگہ کوئی سایہ وغیرہ ہو تو تب چراغ جلانا جائز ہے مگر اس صورت میں چراغ جلانا قبر کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسرے کاموں کی وجہ سے ہے نہ کہ قبر پر چراغ جلانا منظور ہے۔ اشعۃ اللمعات ص ۳۶۳ ج ۱، طبع نورانی کتب خانہ پشاور، وطبع نول کشور ۱۸۹۳ء۔

فائدہ جلیلہ

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی قبور پر مزار کی عظمت شان کے اظہار کیلئے بھی جائز ہے، ضرورتیں تین ہیں یا تو رات میں مردے کو دفن کرنا ہے روشنی کی ضرورت ہے، جائز ہے، قبر راستے کے کنارے پر ہے تو اس پر اس لئے چراغ جلانا دینا کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے وغیرہ مزارات اولیاء اللہ پر اگر ان میں سے کوئی ضرورت بھی نہ ہو تب بھی تعظیم ولی کیلئے جائز ہے، جاء الباطل ص ۲۹۶ ج ۱۔

حضرت شاہ عبدالحق صاحب کی مذکورہ عبارت سے مفتی صاحب کی ان باتوں کی پر زور تردید ہوتی ہے، وہ صاف کہتے ہیں کہ قبر کی تعظیم کیلئے چراغ جلانا بحکم حدیث حرام ہے اور اگر تعظیم مقصود نہ بھی ہو تب بھی اسراف اور فضول خرچی کی وجہ سے حرام ہے اور مبتدعین کے اس بہانے کو وہ رد کر رہے ہیں کہ اگر راستے میں الخ، کیونکہ اس سے مقصود قبر پر چراغ جلانا ہی نہیں بلکہ ضرورت کی وجہ سے ہے جس کا قبر سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

اسی طرح رات کے وقت دفن کرتے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے چراغ جلایا جاتا ہے نہ کہ کسی قبر کی تعظیم کیلئے اور یہ چیزیں محل نزاع سے خارج ہیں۔

(۲) مفتی صاحب فرماتے ہیں ملا علی القاری اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی و دیگر شارحین اسی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ خود قبر پر مسجد بنانا کہ قبر کی طرف سجدہ ہو یا قبر فرش مسجد میں آجائے یہ منع ہے لیکن اگر قبر کے پاس مسجد ہو برکت کیلئے تو جائز ہے یعنی اس جگہ انہوں نے ”علیٰ“ کو حقیقی معنی پر رکھا ہے جس سے لازم آیا کہ اگر خود تعویذ قبر پر چراغ جلانا منع ہے لیکن اگر قبر کے ارد گرد ہو تو وہ قبر پر نہیں، لہذا جائز ہے، جاء الباطل ص ۳۰۴ ج ۱۔

ان اکابر کی عبارات کو ہم نے بحوالہ عرض کر دیا ہے، وہ تو صاف کہہ رہے ہیں کہ قبروں پر چراغ روشن کرنا مال کے زیاں، قبر کی تعظیم اور آثارِ جہنم کی وجہ سے حرام ہے، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ قبر کے آس پاس اگر چراغ جلایا جائے تو تب جائز ہے، حالانکہ انکی عبارات میں سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں، بلکہ ان کا تو یہ کہنا ہے کہ اگر ارد گرد کسی بشری ضرورت کیلئے چراغ جلایا جائے، تو وہ چونکہ قبر کی تعظیم کیلئے نہیں لہذا جائز ہے، اگر آس پاس بھی قبر کی تعظیم کیلئے جلایا جائے تو تب بھی ناجائز ہے کیونکہ دونوں میں نیت ایک ہی ہے کہ دین میں اعتبار نیت کا ہوتا ہے علاوہ ازیں خود مفتی صاحب جاء الباطل میں عنوان تو مزارات پر پھول ڈالنا چادریں چڑھانا چراغاں کرنا، ص ۲۹۶) کا قائم کرتے ہیں، حرف، پر، کا عربی میں ٹھیک معنی، علی، ہوتا ہے، گویا مفتی صاحب کا بھی دلی عقیدہ یہی ہے کہ قبروں کے اوپر چراغ جلایا جائے، اور مبتدعین کی قبروں کے اوپر ہی چراغ جلایا جاتا ہے۔

مگر یہاں پہلے چھڑانے کیلئے اس سے صاف انکار کر رہے ہیں حالانکہ حرف ”علی“ میں دونوں مفہوم داخل ہیں قرآن میں ہے

(۱) اوکا لذی مر علی قریۃ . البقرہ . ۲۵۹)

یا اس کی طرح جو گزرا ایک بستی پر۔ (احمد رضا)

تو کیا مفتی صاحب اس کا یہ معنی کریں گے کہ حضرت عزیر علیہ السلام اس بستی کے لوگوں کی چھتوں پر چڑھتے ہوئے گزرے۔

(۲) ولا تصل علی احد منهم مات ابدًا ولا تقم علی قبرہ . (توبہ ۸۳)

اور ان میں سے کسی کی میت پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔

(احمد رضا)

تو کیا مفتی صاحب اس آیت کا یہ معنی کریں گے کہ کسی منافق کی میت کے اوپر چڑھ کر نماز جنازہ نہ پڑھنا آس پاس پڑھ لینا، اور قبر کے اوپر کھڑے ہو کر دعا نہ کرنا البتہ اس کے قرب و جوار میں اس کے حق میں مغفرت کی دعا کر لینا۔

اگر آپ حضرات ان آیات میں تین بار حرف علی کے معنی میں وسعت تسلیم کرتے ہیں تو حدیث میں ماننے سے کوئی چیز مانع ہے، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اس صورت میں حقیقت و مجاز کا اجتماع لازم ہوگا، جاء الباطل ص ۳۰۲ ج ۱۔

تو ان کی نری جہالت ہے کیونکہ یہ جمع بین الحقیقۃ و المجاز، نہیں بلکہ عموم مجاز ہے جو کہ جائز ہے۔

مفتی صاحب کا حقائق سے انکار

سہلا عذر

اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیوار پر غلاف ڈالا تھا، اسے پھاڑ کر یہ فرمایا، قبور اولیاء کی چادر کو اس سے کوئی تعلق نہیں، کعبہ معظمہ پر قیمتی سیاہ غلاف ہے اور روضہ رسول علیہ السلام پر سبز (غلاف ہے) کعبہ زمانہ نبوی میں تھا، بتاؤ وہ جائز، تو قبور کی چادر بھی جائز، جاء الباطل ص ۳۰۲ ج ۱۔

کیا اعتبار خصوص سبب کا ہوتا ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے، خصوص سبب کا نہیں مثلاً قرآن کریم میں ہے
ان الذين ير مون المحصنت الغفلت المؤمنت لعنوا في الدنيا و الآخرة و لهم عذاب عظیم۔ النور ۲۳

جو لوگ پرہیزگار اور برے کاموں سے بے خبر اور ایمان دار عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کو سخت عذاب ہوگا (۲۳-۲۴)

اس آیت کا شان نزول تو حضرت صدیقہ کائنات رضی اللہ عنہا کا واقعہ افق ہے مگر اس کے عموم الفاظ میں دیگر امہات المؤمنین اور قیامت تک آنے والی پاک طینت خواتین شامل ہیں اسی طرح گو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا سبب تو دیوار پر پردہ کا ہے مگر آنحضرت ﷺ کے الفاظ میں عموم ہے۔

ان الله لم يامرنا ان نكسو الحجارة والطين، الحديث.

اللہ تعالیٰ نے ہمیں مٹی اور پتھر کو کپڑے پہنانے کا حکم نہیں دیا۔ صحیح مسلم ص ۲۰۰ ج ۲۔

اگر بقول مفتی صاحب ان الفاظ کا تعلق خاص پردہ لٹکانے سے ہی ہوتا تو الفاظ حدیث اس طرح ہوتے ۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیوار پر پردہ لٹکانے کا حکم نہیں فرمایا۔ لیکن الفاظ نبوی عام ہیں خواہ کوئی پتھر اور مٹی ہو۔ اور اس میں قبر کا پتھر اور مٹی شامل ہے، اور اس سے انکار محض ضد ہے اور اس مرض کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا کعبہ کے غلاف کا بہانہ تو یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ کعبہ کا غلاف تو آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں چڑھایا جاتا تھا، جس میں آپ علیہ السلام نے تغیر نہیں کیا لہذا وہ عین سنت خیر الانام ہے، دیکھئے بخاری ص ۶۱۳ ج ۲۔

اگر کسی قبر کے متعلق یہ ثابت کر دیا جائے کہ زمانہ نبوی میں مسلمان اسکی تعظیم کیلئے چراغ جلاتے اور پھول ڈالتے تھے، تو ہم اعلان کرتے ہیں کہ اسے سنت تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی پس و پیش نہ ہوگا اور ہم بغیر حیل و حجت اور تامل اسے قبول کر لیں گے، مگر پوری دنیا کے منکرین سنت اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، خواہ مرے ہوئے مبتدعین بھی دوبارہ زندہ ہو کر آجائیں۔ واضح رہے کہ غلاف چڑھانا کعبہ سے خاص ہے جیسے طواف صرف کعبہ کا ہی کیا جاسکتا ہے، اور اس پر قیاس کر کے کسی مسجد یا قبر کا طواف کرنا جائز نہیں،

ثالثاً۔ اسی طرح اگر کسی معتبر دلیل سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ خیر القرون کے سنہری دور میں کسی صحابی و تابعی نے رسول اللہ ﷺ کی قبر اطہر پر غلاف چڑھایا تھا اور اس پر بلا تکثیر عمل بھی ہوتا رہا تو ہم تب بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں۔

محض مفتی صاحب کا بلا دلیل لکھ دینا کہ غلاف چڑھایا جاتا ہے سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

دوسرا عذر

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

اسراف کے معنی ہیں بے فائدہ مال خرچ کرنا، چونکہ ان پھولوں اور چراغوں اور چادروں میں وہ فوائد ہیں جو کہ ہم پہلے باب میں عرض کر چکے ہیں، لہذا یہ اسراف نہیں، رہا کام چلنے کا عذر اس کے متعلق عرض ہے کہ ہم کرتے اس پر واسکٹ اس پر اچکن پہنتے ہیں پھر وہ بھی قیمتی کپڑے کی حالانکہ کام تو صرف ایک کرتے میں چل سکتا ہے، بتاؤ یہ اسراف ہوا یا کہ نہیں، اسی طرح عمارت اور لذیذ خوراک، سواریاں اور دیگر دنیاوی آرائشی سامان کہ ان سب میں خوب وسعت کرتے ہیں حالانکہ ان سے کم اور ان سے ادنی چیزوں سے بھی کام چل سکتا ہے لیکن اسراف نہیں جس کو شریعت نے حلال کیا ہے وہ مطلقاً ہی حلال ہے۔ جاء الباطل ص ۳۰۲ ج ۱۔

کیا خوش لباسی اور تمام اکل حلال، اسراف ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ آپ کے بیان کردہ فوائد کی حقیقت تو آگے انشاء الرحمن آرہی ہے، کہ ان میں سے کوئی شرعی فائدہ ہی نہیں، کیونکہ شریعت نے ان فوائد کو بیان ہی نہیں کیا۔

ثانیاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قبروں پر پھول و چادر چڑھانے اور چراغ جلانے میں کچھ فائدہ بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ کسی چیز میں چند فوائد ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ چیز اصل میں جائز و مباح ہے اور اس کو دستور العمل بنانا درست ہے،

شراب کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے حرام قرار دیا ہے، مگر اس کے باوجود یہ بات کھل کر بیان فرمائی ہے، و منافع للناس، البقرہ ۲۱۹،

اور لوگوں کیلئے (اس میں) کچھ فائدے بھی ہیں، (۲-۲۱۹)

تو کیا ان فوائد کی وجہ سے شراب کو حلال و طیب کہا جاسکتا ہے، اور اس کے پینے کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے چراغ جلانے پر لعنت فرمائی ہے، تو گو امر

واقعہ میں بھی اس میں ہزاروں فوائد ہوں تب بھی یہ رسول اللہ ﷺ کی لعنت کے نیچے دب کر رہ جائیں گے۔

ثالث۔ مفتی جی انسان لباس تو اپنا تن ڈھانپنے اور زیب و زینت کیلئے پہنتا ہے، اسی طرح مکان و سواری وغیرہ کا اہتمام تو انسان اپنی سہولت کیلئے کرتا ہے، تاکہ اپنی زندگی کو بہتر طور و طریقہ سے گزار سکے، اور ان چیزوں سے شریعت نے قطعاً منع نہیں کیا بلکہ اس کے متعلق تو صاف کہا ہے

قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده و الطيبات من الرزق قل هي للذين امنوا في الحياة الدنيا خالصة يوم القيمة. (الاعراف ۳۲)

پوچھو کہ زینت (و آرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کی ہیں انکو حرام کس نے کیا ہے؟ کہہ دو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کیلئے ہیں اور قیامت کے دن خالص انہی کا حصہ ہوگی (۷-۳۲)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اگر رزق دیا ہو تو اس کا استعمال کرنا تاکہ زندگی سکھ چین اور آسودگی سے گزرے تو یہ حرام نہیں ہے۔

قبروں کو چادر چڑھانے پھول ڈالنے اور چراغ جلانے سے قطعاً یہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ یہ بدعات تو قبر کی تعظیم کیلئے مبتدعین نے ایجاد کر رکھی ہیں جیسا کہ خود مفتی صاحب کو اس کا اقرار ہے۔
جاء الباطل ص ۲۹۶۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب دعویٰ کچھ اور دلیل کچھ اور عنایت کر رہے ہیں، غالباً مفتی صاحب تعظیم اور زینت کے فرق اور ان کے معنی و مفہوم سے ہی ناواقف تھے یا اس طرح سطحی باتیں وہ جان بوجھ کر بیان کر کے اپنے قارئین کو ادھر ادھر کی ابحاث میں الجھا کر داد تحسین حاصل کرنا چاہتے تھے، تاکہ مبتدعین کے عوام جانے کہ حضرت نے آخر جواب تو لکھ ہی دیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس میں جان ہو یا نہ ہو

علاوہ ازیں یہ چیزیں تو شریعت میں حلال و طیب ہیں جن کی حلت کا خود مفتی صاحب نے اقرار کیا ہے جبکہ ان کے برعکس قبروں پر چراغ جلانے کی ممانعت موجود ہے لہذا ان پر قیاس کرنا

باطل ہے۔

اسی طرح اگر کوئی بکری پر خنزیر کو قیاس کرے اور اس کے فوائد پر لاکھ دلائل قائم کرے اور کہے کہ دیکھنے میں دونوں ہی برابر ہیں اگر بکری چوپایا ہے تو خنزیر کی بھی چار ٹانگیں ہیں مگر ایسے اجتہاد کو کوئی مسلمان تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ ہوگا، بلکہ تعوذ پڑھ کر ایسے خرافات سے اللہ رب العزت کی پناہ مانگے گا۔

تیسرا عذر

مشکوٰۃ باب الدفن میں ہے

ان النبی ﷺ دخل لیلاً فاسرج له بسراج.

نبی کریم ایک شب دفن میت کیلئے قبرستان میں تشریف لے گئے تو آپ کیلئے چراغ جلایا گیا۔
جاء الباطل ص ۳۰۴ ج ۱۔

کیا رات کو دفن کے وقت لائٹ کا انتظام کیا جاسکتا ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ کیا یہ چراغ میت کی تعظیم کیلئے جلایا گیا تھا، قطعاً نہیں بلکہ چراغ جلانے کا مقصود تورات کے اندھیرے میں روشنی کر کے، آنحضرت ﷺ کیلئے سہولت مہیا کرنا تھی، جیسا کہ آج بھی اگر مردے کو رات کے وقت دفن کیا جائے تو روشنی کی غرض سے لائٹ کا انتظام کیا جاتا ہے، اور اس سے مقصود میت کی تعظیم نہیں ہوتی بلکہ اپنے لئے سہولت کا انتظام کیا جاتا ہے تاکہ میت کو دفن احسن طریقے سے کیا جائے، اور یہ چیزیں محل نزاع سے خارج ہیں، نہ ہی ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

ثانیاً۔ یہ روایت سند کے لحاظ سے سخت ضعیف ہے اس میں دو راوی ضعیف ہیں، پہلا راوی ابو قدامہ منہال بن خلیفہ کوئی ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۱۵۷ ج ۲، اسے امام یحییٰ بن معین اور نسائی نے ضعیف کہا ہے امام بخاری فرماتے ہیں اس کی احادیث منکر ہیں،

امام ابن حبان فرماتے ہیں مشاہیر سے منکر روایات بیان کرنے میں منفرد ہے اس سے احتجاج

کرنا جائز نہیں، تھذیب ص ۳۱۹ ج ۱۰، و میزان ص ۱۹۱ ج ۳، حافظ ابن حجر کا کہنا ہے ساتویں طبقہ کے ضعیف راویوں سے ہے، تقریب ص ۲۵۵۔

دوسرا راوی اس میں حجاج بن ارطاة قاضی کوفہ ہے، اس کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ صدوق کثیر الخطاء والتدلیس، یعنی سچا تو ہے (لیکن) کثرت سے غلطیاں اور تدلیس کرتا ہے، تقریب ص ۵۰، اسے امام ابن عدیؒ، امام ساجیؒ، امام بزارؒ، علامہ ذہبیؒ، امام محمد بن نصر، امام نسائی، امام یحییٰ بن قتان، امام احمد، اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے، تھذیب ص ۱۷۷ ج ۲، و طبقات المدلسین ص ۴۹، و میزان ص ۴۵۸ ج ۱۔

اور زیر بحث روایت میں سماع کی صراحت نہیں بلکہ معنعن ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۱۵۷ ج ۲، اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ مدلس راوی کی وہ روایت جس میں وہ تحدیث کی صراحت نہ کرے، ضعیف ہوتی ہے۔

چنانچہ علامہ زبلی حنفی تخریج ہدایہ، میں فرماتے ہیں کہ

روی الترمذی قال حدیث حسن وأ نکر علیہ لان مدارہ علی الحجاج بن ارطاة، وهو مدلس ولم یدکر سماعا، قال ابن قطاء، ومنہال بن خلیفہ ضعفہ ابن معین وقال البخاری فیہ نظر۔

یعنی اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے (لیکن امام ترمذی کی تحسین سے انکار کیا گیا ہے کیونکہ (اس روایت کا) دارودمدار حجاج بن ارطاة پر ہے اور وہ مدلس ہے اور اس نے سماع بھی ذکر نہیں کیا، امام ابن قتان فرماتے ہیں کہ (اس روایت کے دوسرے راوی) منہال بن خلیفہ کو امام ابن معین نے ضعیف کہا ہے اور امام بخاری نے، فیہ نظر، کہا ہے۔

نصب الراية لاحادیث الھدایہ ص ۳۰۰ ج ۲۔

الغرض یہ روایت سنداً ضعیف ہے جس کا حنفی اکابرین نے بھی اقرار کر رکھا ہے۔

چوتھا عذر

بہت سی باتیں زمانہ صحابہ کرام میں منع تھیں مگر اب مستحب ہیں، روح البیان پارہ

۱۰ سورۃ توبہ زیر آیت

انما یعمر مسجد اللہ من آمن باللہ۔ ہے

و فی الاحیاء اکثر مصروفات ہذہ الاثار منکرات فی عصر الصحابہ۔
یعنی احیاء العلوم میں امام غزالی نے فرمایا کہ اس زمانہ کے بہت سے مستحبات صحابہ کرام کے
زمانہ میں ناجائز تھے۔

مشکوٰۃ کتاب الامارۃ باب ما علی الولاء، میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ کوئی
مسلمان حاکم خنجر پر سوار نہ ہو اور چپاتی روٹی نہ کھائے اور باریک کپڑا نہ پہنے دروازہ کو اہل حاجت
سے بند نہ کرے اور فرماتے تھے۔

فان فعلتم شینا من ذلک فقد حلت بکم العقوبۃ

اگر تم نے ان میں سے کچھ بھی کیا تو تم کو سزا دی جائے گی۔

اسی مشکوٰۃ باب المساجد میں ہے کہ، ما امرت بتشیید المسجلہ مجھ کو مسجدیں اونچی بنانے کا
حکم نہیں دیا گیا۔

اس کے حاشیہ میں ہے، ای باعلاء بناء ها وتزینها، یعنی مسجدیں اونچی بنانے اور ان کو آراستہ
کرنے کا حکم نہیں۔

اسی مشکوٰۃ میں ہے

لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ، عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو۔

قرآن میں زکوٰۃ کے مصرف آٹھ ہیں یعنی مولفۃ القلوب بھی زکوٰۃ کا مصرف ہے لیکن عہد
فاروقی سے صرف سات مصرف رہ گئے مولفۃ القلوب کو علیحدہ کر دیا گیا (دیکھو ہدایہ) کہیں اب بھی
ان پر عمل ہے، یہ احکام کیوں بدلے؟ اس لئے کہ ان کی علتیں بدل گئی اس وقت بغیر ظاہری زیب و
زینت کے مسلمانوں کے دلوں میں اولیاء اللہ اور مقابر کی عزت و حرمت تھی لہذا زندگی موت ہر کام
میں سادگی تھی اب دنیا کی آنکھیں ظاہری ٹیپ ٹاپ دیکھتیں ہیں لہذا اس کو جائز قرار دیا گیا ہے
چنانچہ پہلے حکم تھا کہ مزارات پر روشنی نہ کرو اب جائز قرار پایا، انتہی ملخصاً، جاء الباطل ص ۳۰۵ ج ۱۔

کیا مرور زمانہ سے حکم شرعی بدل جاتا ہے؟

الجواب - اولاً۔ ان عذرات میں مفتی صاحب کو یہ تو تسلیم کرنا پڑا کہ قرآن و سنت اور اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قبروں پر چادریں چڑھانا پھول ڈالنے اور چراغ روشن کرنے کی ممانعت ہے اور ان بدعات پر وعید شدید موجود ہے، مفتی صاحب کے اس عذر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مبتدعین قرآن و سنت سے ہیر پھیر کر کے ان بدعات کے جواز و مستحب پر بدعہ خود جو دلائل نقل کرتے ہیں، وہ حقیقت میں دلائل نہیں بلکہ ان کے حقیقی و اصل معنی اور مطلب و مفہوم کو بگاڑ کر تحریفات سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ یہ حقیقت صاف اور شفاف ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اختلاف قطعاً نہیں، جیسا کہ قرآن پاک کی سورۃ النساء آیت ۸۲، میں بیان ہوا ہے۔

اس واضح ارشاد ربانی کے برعکس یہ ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ شریعت میں ان کی ممانعت اور اجازت بھی ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ ان دونوں میں سے حکم شرع محمدی فقط ایک ہی ہے، اور وہ ہے، ان فضول و عبث کاموں کی ممانعت کا۔

ثانیاً۔ دین اسلام کی تکمیل کے بعد کسی دینی و شرعی حکم کا منسوخ ہونا قطعی طور پر غلط ہے، کیونکہ نسخ کا تعلق وحی سے ہے۔

دین کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قول و حکم کسی بڑے سے بڑے امتی کے قول و اقوال سے بھی منسوخ نہیں ہو سکتا ہے۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں کئی ناجائز چیزیں اب مستحبات میں داخل ہیں، تو یہ ان کی غلط بیانی ہے، ہماری طرف سے پوری دنیا کے منکرین سنت کو چیلنج ہے کہ وہ کسی امر شرعی کی مثال ثابت کریں کہ صحابہ کرام کے دور میں فلاں نے حکم شرعی کی ممانعت تھی مگر اب وہ مستحبات میں شامل ہے، کائنات کے خالق و مالک کی قسم ہے کہ جملہ مبتدعین اس کی ایک مثال بھی ثابت نہیں کر سکتے۔

اگر ہم اس قاعدہ و اصول کو تسلیم کر لیں تو دین اسلام کے ایک حصے بلکہ بیشتر دین سے آج لوگ ہوائے نفس کی پیروی سے ترک کر دیں گے، اور اس ہوائے نفس کے دور میں عیاش لوگ یہ کہنا

شروع کر دیں گے کہ شریعت حقہ کے حسب ذیل احکام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے ناجائز تھے مگر اب مستحبات میں داخل ہیں۔

- (۱) اکل حرام ناجائز تھا
- (۲) بتوں کے نام جانور ذبح کرنے ناجائز تھے
- (۳) سود ناجائز تھا
- (۴) شراب کا استعمال ناجائز تھا
- (۵) جوا ناجائز تھا
- (۶) زنا ناجائز تھا
- (۷) والدین پر لعنت ناجائز تھی
- (۸) ترک نماز کفر تھا
- (۹) تصویر اتروانی ناجائز تھی
- (۱۰) زمین کی حدود کو مٹانا حرام تھا

اس طرح کے صدہا مسائل عوام نفسی خواہش کے تحت جائز و مباح قرار دے لیں گے، تو مبتدعین اسکے جواب میں یہی کہیں گے کہ نہیں بھائی جو چیز شریعت حقہ میں اس وقت حرام و ناجائز تھی وہ آج بھی حرام و ناجائز ہی ہے، کیوں کہ دین اسلام کا کوئی حکم کسی امتی کے کہنے سے منسوخ ہو سکتا ہے نہ ہی حرام چیز حلت میں بدل سکتی ہے، یہی بات ہم مزارات کی تعمیر کے متعلق کہتے ہیں۔ اب ترتیب وار مفتی صاحب کی غیر متعلقہ امثلہ کا جواب ملاحظہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت

دے۔

عمال حکومت اور سیاست فاروقی

اسلام جب دیار عرب سے نکل کر عجم میں آیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس پر سخت اصرار تھا کہ امراء اور عمال عیش و عشرت میں مبتلا نہ ہونے پائیں، حاکم و محکوم میں مساوات قائم رہے، غیر قوموں کی عادتیں ان میں سرایت نہ کرنے پائیں، حاکم تک ہر شخص کی رسائی ہو اور وہ خلیفہ وقت

کے پاس بلا روک و ٹوک پہنچ سکے، چنانچہ حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

وایاکم والتنعم و زی اهل الشرک و لبوس الحریر۔
یعنی عیش و عشرت اور مشرکین کی وضع و قطع اور ریشم سے اجتناب کرو، مسند احمد ص ۱۶ ج ۱، صحیح مسلم ص ۱۹۱ ج ۲۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ میں ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ سے ان تک فریادوں کی آواز نہیں پہنچ سکتی تو محمد بن مسلمہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوا دی، مسند امام احمد ص ۱۵۴ ج ۱۔

ان کو اس پر اس قدر اصرار تھا کہ حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز بھیجی تو انہوں نے پوچھا کیا کل مسلمان یہی کھاتے ہیں؟ بولے نہیں، اسی وقت ان کو لکھا کہ یہ تمھاری یا تمھارے باپ کی کمائی نہیں جو خود کھاؤ وہی تمام مسلمانوں کو کھلاؤ، اور عیش سے بچو، صحیح مسلم ص ۱۹۱ ج ۲۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا کہ
انی لم ابعث عمالی لیضرہوا ابشارکم ولالیأخذوا اموالکم فمن فعل به
ذلک فلیرفعه الی اقصہ منہ، الحدیث۔

یعنی میں نے اپنے عاملوں کو اس غرض سے نہیں بھیجا کہ وہ آپ کے جسموں کو ماریں یا تمھارے اموال کو لے لیں! اگر کوئی ایسا کرے تو میرے پاس استغاثہ کرے میں اس کو قصاص دلاؤں گا، ابو داؤد مع عون ص ۳۰۶ ج ۴۔

بلکہ ایک روایت میں مزید الفاظ یہ ہیں کہ
ولکن بعثتہم لیعلموکم دینکم و سنتکم فمن فعل به غیر ذلک فلیرفعه
فاقصہ منہ۔

یعنی عمال کو مقرر تو اس لیے کرتا ہوں کہ وہ تمھیں دین اور سنت نبوی علیہ التحیۃ والسلام سکھائیں، جو افسر اس کے خلاف کرے اسکی میرے پاس شکایت کی جائے میں اس سے قصاص لیکر دوں گا،

السنن الكبرى للبيهقي ص ۲۹ ج ۹ و مستدرک حاکم ص ۴۳۹ ج ۴۔
ظاہر ہے کہ یہ عین اسلام کی تعلیم مساوات ہے، اسی تعلیم اسلامی کی وجہ سے ہی آپ عمال کو مقرر کرتے ہوئے ان سے یہ عہد لیا کرتے تھے کہ تم میں سے کوئی ترکی گھوڑوں پر سوار نہ ہو، میدہ کی روٹی نہ کھائے، باریک کپڑا نہ پہنے، اور لوگوں کے حوائج پر دروازے بند نہ کریں۔ (شعب الایمان ۲۴/۶ رقم الحدیث ۳۹۴ و مصنف عبدالرزاق ۳۲۴/۱۱، رقم الحدیث ۲۰۶۶۲)۔

مشکوٰۃ باب ما علی الولاۃ من التیسر،

مسلم شریف کی مذکورہ حدیث نے فرمان فاروقی کا مقصد واضح کر دیا کہ چونکہ عوام کو ایسی سہولتیں میسر نہیں لہذا اعمال بھی ان عیش و عشرت کی چیزوں سے اجتناب کریں مگر کمال ہے کہ حضرت مفتی صاحب اسکا مفہوم الٹ بیان کرتے ہیں کہ اس دور میں یہ چیزیں ناجائز تھیں، مگر اب مرور زمانہ کی وجہ سے جائز ہو گئی ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب یہ چیزیں اس وقت بھی مساوات کی وجہ سے ناجائز تھیں اور اب بھی مساوات کی وجہ سے ناجائز ہی ہیں، جو چیز عوام کو میسر نہیں وہ حکمران پارٹی پر آج بھی ناجائز ہے، اسلام کی یہ تعلیم کہیں بھی ثابت نہیں کہ رعایا تو بھوکوں رہے اور حکمران ملکی دولت پر سانپ بن کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں، عوام ضروریات زندگی کی بنیادی چیزوں سے محروم ہو، اور ارباب حکومت مزے سے زندگی بسر کریں۔

مبتدعین کے حکیم الامت کا عوام اور حکمران پارٹی کے درمیان خط نسخ کھینچ دینا، انکی کم آگاہی کا نتیجہ تو کہا جاسکتا، مگر اسے اسلامی تعلیم باور نہیں کیا جاسکتا۔

کیا مساجد کو پختہ کرنیکی اجازت ہے؟

حضرت مفتی صاحب غلط بحث کے ماسٹر ہیں، ادھر ادھر کی اجاث میں الجھا کر دامن بچا جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا،

اس بحث میں دیگر غیر متعلقہ اجاث لانا دراصل ان کے موقف کی کمزوری کی دلیل ہے، اور ان اجاث میں بھی وہ بات کا بتکڑ بنا دیتے ہیں، فرماتے ہیں

مشکوٰۃ باب المساجد میں ہے کہ مجھ کو مسجدیں اونچی بنانے کا حکم نہ دیا گیا،
جاء الباطل ص ۳۰۵۔

اس الجھی ہوئی تحریر سے ان کا مقصود یہ ہے کہ مساجد کو پختہ بنانے کی ممانعت کے باوجود اسلام
میں مساجد کو پختہ بنایا جاتا ہے اور یہ مرور زمانہ کی وجہ سے جائز ہے، اسی طرح قبور اولیاء پر مزارات
تعمیر کرنے کی ممانعت ہے مگر حالات کے تقاضا کی وجہ سے جائز ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔
حالانکہ حکم نہ ہونے سے ممانعت ثابت نہیں ہوتی، یہ مفتی صاحب کی زیادتی ہے، حضرت مولانا
عبید اللہ رحمانی محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

والحدیث قد استدلل به بعضهم علی منع تشیید المساجد، و فیہ نظر لان نفی
کون التشیید مأمورابه، لا یقتضی الکراهة والمنع بل یدل علی عدم الوجوب،
ونفی الوجوب قد یتحقق بجواز الفعل ایضاً فلا یستوجب الکراهة و المنع.
یعنی اس حدیث سے بعض نے مساجد کو اونچا اور پختہ بنانے کی ممانعت پر استدلال کیا ہے
لیکن اس استدلال میں خامی ہے، اس لئے کہ اس میں تشیید مساجد کے مأمور (حکم) کی نفی ہے جو
کہ کراہت اور منع کو مقتضی نہیں، بلکہ اس حدیث میں مساجد کی تشیید کے عدم وجوب کی نفی ہے، اور
وجوب کی نفی اس کے جواز کو ثابت کرتی ہے لہذا اس سے کراہت اور ممانعت لازم نہیں آتی۔

مرعاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲۸ ج ۲۔

اس طرح کے فقرات ہم روزمرہ کی زندگی میں بولتے ہیں، جس سے مقصود حکم کی نفی ہوتی ہے،
نہ کہ ممانعت مثلاً زید کا کہنا

(۱) میرے باپ نے مجھے لاہور جانے تو کیا زید کو لاہور جانے سے منع کیا گیا ہے۔

کیلئے مأمور نہیں فرمایا

(۲) رسول اللہ ﷺ نے چار عورتوں تو کیا اس سے چار سے نکاح کی حرمت ثابت ہوگئی۔

سے نکاح کرنے کا حکم نہیں فرمایا

(۳) نبی ﷺ نے ایم بی بی ایس کی تو کیا اس سے ڈاکٹر بننے کی کراہت ثابت ہوگئی

ڈگری حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا

(۴) آنحضرت ﷺ نے ایٹم بم تو کیا اس سے ان کی ایجاد اور استعمال کی حرمت بندوق وغیرہ کے استعمال اور بنانے کا ثابت ہوگئی حکم نہیں دیا

(۵) رسول اللہ ﷺ نے ہوائی جہاز اور تو اس فقرے سے ان پر سفر کرنا حرام ثابت ہو جائے ریل پر سفر کرنے کا حکم نہیں دیا گا

اس طرح کی بیسیوں امثلہ ہم دے سکتے ہیں مگر عقل و خرد والے کیلئے یہ کافی ہیں، تو کیا ان محاورات کو بول کر ہم حکم کی نفی کرتے ہیں یا کہ کسی فعل کو کرنے سے منع پر بولتے ہیں، قطعاً نہیں بلکہ اس سے مقصود ہمارا حکم کی نفی ہوتا ہے۔

خاص حدیث رسول اللہ ﷺ میں اسکی مثالیں دی جاسکتی ہیں،

مثلاً آپ علیہ السلام سے گوہ کھانے کے متعلق سوال کیا گیا تو، فرمایا، فما امر باكلها ولا نهى، یعنی مجھے اس کے کھانے کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ ہی منع کیا گیا ہے، سنن نسائی ص ۱۹۱ ج ۲۔
تو اس ارشاد کا کیا مقصد ہے، یہی کہ کھانے کے حکم کی نفی ہے، نہ یہ کہ کھانے سے روکا گیا ہے، اگر مبتدعین یہی معنی کریں تو اگلے الفاظ، ولا نهى، کا معنی کیا کریں گے۔

اس طرح حدیث میں مساجد کو پختہ اور اونچا بنانے کے حکم کی نفی ہے، نہ کہ مساجد کو آراستہ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ فرماتے ہیں

پختہ مسجد (نبوی) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بمشورہ اصحاب کرام بنی تھی، اس وقت بھی چہ میگوئیاں ہونئیں تھیں، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا تھا کہ میں نے پختہ مسجد اس لئے بنوائی کہ حدیث میں آیا ہے، من بنی مسجدا لله بنی الله له بيتا في الجنة، (یعنی جو کوئی اللہ کیلئے مسجد بنائے گا خدا اس کیلئے بہشت میں گھر بنائے گا) اس حدیث کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلئے پیش کیا کہ اس کے معنی میں عموم جانا، یعنی یہ سمجھا کہ کوئی مسجد بناوے ویسا ہی اس کا گھر بنے گا، خام بنائے تو خام پختہ بنائے تو پختہ، اس دلیل کو سب حاضرین

نے سنا اور خاموش رہے، ثابت ہوا کہ پختہ مسجد اسی حدیث سے ثابت ہے۔

فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۸۷ ج ۱، و فتاویٰ علیائے حدیث ص ۵۱ ج ۳۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے جس قول کو فاتح مذاہب باطلہ نے نقل کیا ہے وہ، صحیح بخاری و مسلم کتاب المساجد، کے باب فضل بناء المسجد، میں موجود ہے۔

کیا مسجد میں عورت کا نماز پڑھنا ناجائز ہے

حضرت مفتی صاحب نے ایک ڈھکوسلہ یہ بھی پیش کیا ہے کہ مرور زمانہ کی وجہ سے عورتوں کیلئے مساجد میں جانا صدمات کا باعث ہے۔

اس فضول اور الجھی ہوئی بحث سے ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث میں یہ موجود ہے کہ
لَا تَمْنَعُوا نِسَاءَ كُمِ الْمَسَاجِدَ إِذَا اسْتَأْذَنَكُمْ إِلَيْهَا۔

یعنی تمہاری عورتیں جب تم سے مساجد کی طرف جانے کی اجازت طلب کریں تو انہیں منع نہ کرو، صحیح مسلم ص ۱۸۳ ج ۱، و ابو عوانہ ص ۷۵ ج ۲۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ شریعت مفتی صاحب کے گھر کی نہیں کہ وہ جس حکم کو منسوخ کہہ دیں وہ منسوخ ہو جائے، یا اسلام میں مفتی صاحب کے قول و اقوال اور ردی قسم کے اجتہادات کی وجہ سے ہم فرمان نبوی کو چھوڑ دیں اور ان کے پیچھے چل کر اپنی آخرت برباد کر لیں۔

جب مفتی صاحب کو اس فرمان کا اقرار ہے تو پھر بھی عورتوں کو روکنے کا فتویٰ صادر کرنا، یقیناً بغض رسول ﷺ کی پیداوار ہے، ہم بریلویت کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اس کی اجازت کے ساتھ ہی امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے یہ بھی کہہ رکھا ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

قال رسول الله ﷺ لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ وَ لِيُخْرِجَنَّ إِذَا خَرَجَنَّ

تَفَلَّاتِ۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتیں جب باپردہ ہو کر مساجد کی طرف نکلیں تو انہیں منع نہ کرو،

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۸۳ ج ۲، و ابو داود (۱۵۶۵) و اللفظہ اس شرط نبوی کے ساتھ آپ کا یہ

فرمان بھی شامل کر لیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول اللہ ﷺ لا تمنعوا نساءكم المساجد و بیوتہن خیر لہن .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنی عورتوں کو مساجد میں آنے سے مت روکو (ہاں البتہ) ان کے گھر ان کیلئے بہتر ہیں، سنن ابی داؤد مع عون ص ۲۲۲ ج ۱۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے صحیح ہے علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سلسلہ احادیث صحیحہ رقم الحدیث ۱۳۹۶ میں درج کیا ہے۔

ان ارشادات عالیہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوئی کہ مساجد میں جمعہ و جماعت کے ساتھ حاضری عورت پر لازم و ضروری نہیں، اور ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ مساجد میں جمعہ و جماعت میں شامل ہونے کی بجائے گھر میں ہی ٹک کر رہیں، ہاں البتہ اگر کوئی نماز کے لیے مسجد کا رخ کرے تو اسے روکنے سے اللہ کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

اس صاف و شفاف تعلیم ربانی پر مبتدعین کو کیا اعتراض ہے

جب کہ خود شارع علیہ السلام اسکی حدود و قیود بیان کرتے ہوئے، عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے کو بہتری سے تعبیر کر رہے ہیں۔

کیا مولفۃ القلوب کا حکم منسوخ ہے؟

اس کے نسخ کی مفتی صاحب نے کوئی دلیل شرعی درج نہیں کی، اگر کرتے تو یقیناً ہم اس پر قرآن و سنت کی روشنی میں تبصرہ کرتے، مگر افسوس کہ مفتی صاحب نے اس قلعہ کو بھی صاحب ہدایہ کے ایک فضول قول سے منہدم کرنے کی کوشش کی ہے۔

حالانکہ مولفۃ القلوب کی مدد کرنا حکم قرآنی ہے، جیسا کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۵۹ میں مذکور ہے، اس ارشاد ربانی کو منسوخ کرنے کیلئے نص قطعی یا حدیث متواتر کی ضرورت ہے،

جسے پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام ثابت نہیں کر سکتے، اور جو صاحب ہدایہ نے دلیل درج کی ہے، اسے آپ بھی پڑھ لیں فرماتے ہیں

قرآن نے صدقات کے مصارف آٹھ بیان فرمائے ہیں، اور ان میں سے، مولفۃ القلوب، کا

استحقاق ساقط ہو چکا ہے، کیونکہ اب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو عزت دے دی ہے، لہذا اب اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمیں مستغنی کر دیا اور اس پر اجماع (صحابہ) منعقد ہو چکا ہے۔

ہدایہ مع فتح القدیر ص ۲۰۱ ج ۲،

حالانکہ قرآنی آیات کے خلاف نہ اجماع ہو سکتا ہے نہ قیاس، پھر اس اجماع کی دلیل بھی مت پوچھئے، خیر سے علامہ زلیعی حنفیؒ بڑی دور سے اس کیلئے ایک کوڑی تلاش کر کے لائے ہیں کہ عامر بن شعبی کہتے ہیں

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ حکم منقطع ہو گیا تھا، اللہ اکبر۔

یہ مت پوچھئے گا کہ عامر بن شرجیل اشعریؒ کو اس اجماع کی خبر کہاں سے ملی، کیونکہ ان کی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاقات و سماع ثابت نہیں، محدثین کرام نے صراحت کی ہے، ان کی وفات ۱۰۴ھ میں بیاسی (۸۲) برس کی عمر میں ہوئی تھی، تاریخ صغیر للبخاری ص ۲۷۸ ج ۱، گویا موصوف کی ولادت ۲۲ھ کو خلافت صدیقی کے تقریباً دس سال بعد ہوئی۔

آئمہ جرح و تعدیل کا تو بیان ہے، ان کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ، حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت مرسل ہے دیکھئے مرا سیل ابن ابی حاتم ص ۱۶۰۔

مرسل ہونے کے علاوہ اس کی سند میں ایک راوی جابر بن یزید الجعفی ہے، نصب الراية ص ۳۹۲ ج ۲، و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۲۳ ج ۳، جو خیر سے خبیث العقیدہ ہونے کے علاوہ پرلے درجے کا کذاب ضعیف و متروک راوی ہے، جس کی ضروری تفصیل، دین الحق صفحہ ۶۳ ج ۱ میں راقم نے عرض دی ہے، قارئین کرام وہاں سے ایک بار پھر پڑھ لیں۔

ہاں البتہ اس مقام پر ہم حضرت امام ابو حنیفہ کا ایک قول نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں فرماتے ہیں،

ما رايت فيمن رايت افضل من عطاء ولا اكدب من جابر الجعفي ما اتيته بشي الا جاءني فيه بحديث، وزعم ان عنده كذا وكذا الف حديث لم يظهرها .

یعنی جنہیں میں نے دیکھا ہے، ان میں سے حضرت عطاء بن ابی رباح سے بڑھکر کسی کو عظمت والا نہیں دیکھا، اور جابر بن یزید الجعفی سے بڑھکر زیادہ کسی کو جھوٹا نہیں دیکھا، میں جب بھی کوئی چیز (فقہی طور پر) لاتا تو وہ اس کے متعلق حدیث (گھڑ) کر لے آتا، اور وہ یہ گمان کرتا تھا کہ اسی طرح کی من گھڑت روایات اس کے پاس ایک لاکھ ہیں جنہیں اس نے ابھی تک ظاہر نہیں کیا۔

میزان الاعتدال ص ۳۸۰ ج ۱، واللفظ له و تہذیب التہذیب ص ۴۲ ج ۲، و الضعفاء الکبیر ص ۱۹۶ ج ۱، و کتاب القراءة للبیہقی ص ۱۳۴، و فتاویٰ رضویہ ص ۵۲۲ ج ۲۔

الغرض مؤلفہ القلوب کا حکم اب بھی ہے اور اس کا کوئی ناخ نہیں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی المتونی ۱۲۲۵ فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ مؤلفہ القلوب کو زکوٰۃ دینے کا جواز منسوخ نہیں اور کوئی نسخ کا قائل نہیں اور نسخ کا امکان بھی کیسے ہے جب کہ کوئی ناخ موجود نہیں، تفسیر مظہری ص ۲۱۰ ج ۵ مترجم، طبع دارالاشاعت کراچی ۱۹۹۹ء۔

باب مزارات پر غلاف چڑھانا اور چراغاں کرنے کے دلائل اور ان کی حقیقت

مفتی کی پہلی دلیل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اولیاء اللہ اور ان کے مزارات شعائر اللہ ہیں اور شعائر اللہ یعنی اللہ کے دین کی نشانیوں کی تعظیم کرنے کا قرآنی حکم ہے

ومن يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب۔

اس تعظیم میں کوئی قید نہیں ہر ملکہ ہر رے جس ملک میں اور جس زمانہ میں جو بھی جائز تعظیم مروج ہے وہ کرنا جائز ہے ان کی قبروں پر پھول ڈالنا چادریں چڑھانا چراغاں کرنا، سب میں ان کی تعظیم ہے لہذا جائز ہے جاء الباطل ص ۲۹۷ ج ۱۔

کیا قبریں شعائر اللہ میں داخل ہیں؟

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب کی یہ دلیل دو چیزوں پر مبنی ہے

(۱) اولیاء اور ان کے مزارات شعائر اللہ ہیں (۲) اور شعائر اللہ کی تعظیم ملکی رسوم کے مطابق

کرنی جائز ہے۔

ثانیاً۔ ان باتوں کے جواب میں ہم فقط اتنا ہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شعائر اللہ کی تعظیم کرنا تو ہمیں من وعن قبول ہے نہ ہی اس میں اختلاف ہے، اور نہ ہی یہ باعث نزاع ہے، اختلاف تو حد تعظیم اور اولیاء اور ان کے مزارات کے شعائر اللہ ہونے میں ہے

لہذا مفتی صاحب کا یہ حق تھا کہ وہ اولیاء اور ان کی قبور کو پہلے دلائل سے شعائر اللہ ثابت کرتے پھر انکی تعظیم کی حدود شریعت حقہ سے ثابت کرتے اور قبروں پر اوچھاڑ چڑھانے اور چراغاں کرنے کا ثبوت دیتے، تو یہ ایک بات تھی، مگر یہ کام چونکہ دلائل شرعیہ سے ثابت ہونے تھے، جو خیر سے مفتی صاحب کے پاس نہ تھے، لہذا انہوں نے ان کا عدم ذکر ہی مناسب جانا، اور اصل بحث سے ہٹ کر ادھر ادھر کی ابحاث میں اپنے حواریوں کو الجھا کر اپنے خصوصی مکر و فریب کا نمونہ دکھا گئے ہیں، اور اولیاء اور ان کے مزارات کو شعائر اللہ ثابت کرنے پر ایک بھی دلیل شرعی نہ دی۔

ہماری طرف سے پوری دنیا کے مبتدعین اور قبوری شریعت کے عاشقوں کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی کسی واضح نص سے اولیاء اور ان کی قبروں کو شعائر اللہ ثابت کریں۔

مجھے میری زندگی کے مالک کی قسم ہے کہ مبتدعین کے جملہ اکابرین مل کر سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود کسی دلیل شرعی سے اس کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ رہا مبتدعین کا یہ عذر کے آخر اولیاء کی قبریں۔ شعائر، کیوں نہیں، ضیاء القرآن مج تو سنئے کہ شعائر، شیعرة کی جمع ہے جس کا معنی علامت اور نشانی کے ہیں، المفردات القرآن ص ۲۶۲، ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کی شعائر کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت کا کام دیتی ہے، سرکاری جھنڈی، پولیس و فوج کے یونیفارم وغیرہ حکومت کے شعائر ہیں، صلیب عیسائیت کا شعائر ہے، کسی وکڑا اور کرپان سکھ مذہب کا شعائر ہیں یہ سب مسلک اپنے اپنے شعائر کا اپنے پیروں سے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لغوی معنی کو ملحوظ رکھا جائے تو اس اعتبار سے شعائر اللہ وہ ہیں جو اعلام دین یعنی اسلام کے نمایاں

امتیازی احکام ہے۔ جن سے ایک مسلمان کا امتیاز اور تشخص قائم ہوتا ہے۔ اور وہ دوسرے مذاہب سے الگ پہچان لیا جاتا ہے۔ صفا و مروہ پہاڑیوں کو بھی اسی وجہ سے شعائر اللہ کہا گیا ہے کہ مسلمان حج و عمرے میں ان کے درمیان سعی کرتے ہیں۔

منقول از کتب تفسیر، ظاہر ہے کہ مزارات شعائر اللہ میں داخل نہیں کیونکہ مزارات تو غیر مسلم بھی بناتے ہیں، لہذا ان کو اسلام کی علامت اور امتیازی حکم نہیں کہہ سکتے، پھر قرآن پر غور کیجئے کہ اللہ شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم دے رہا ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اونچی قبریں گرانے کا حکم دیا اور آئندہ بنانے والے کو دین اسلام اور تعلیم محمدی علیہ التحیۃ والسلام سے بغاوت قرار دیا، اگر مزارات شعائر اللہ ہوتے تو آنحضرت ﷺ ان کو گرانے کا حکم نہ فرماتے، اور ان کے بنانے والے پر سخت نکیر بلکہ انہیں بدترین مخلوق قرار نہ دیتے۔

ثالث۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ملکی رسوم کے مطابق ہر طرح کی تعظیم جائز ہے تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کسی ماں نے آج تک کوئی رضوی علامہ فہامہ جنم نہیں دیا جو اس کا ثبوت دے۔

حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حیرہ شہر گیا تو وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے امیر کو سجدہ کرتے ہیں تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ارایت لومررت بقبری اکنت تسجد له؟ قال فقلت لا، قال فلا لاتفعلا لو کنت آمر احدا ان یسجد لاحد لامرت النساء ان یسجدن لازواجهن لما جعل اللہ لہم علیہن من الحق۔

یعنی تیرا کیا خیال ہے اگر تو میری قبر کے پاس سے گزرے تو کیا اسے سجدہ کرے گا؟، میں نے کہا نہیں، فرمایا ایسا نہ کرو، اگر میں کسی ایک کو حکم دیتا کہ وہ دوسرے کو سجدہ کرے تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خاوندوں کا ان کی بیویوں پر (بڑا) حق بنایا ہے۔

ابوداؤد ص ۲۹۱ ج ۱، باب حق الزوج علی المرأة۔ و مستدرک حاکم ص ۱۸۷ ج ۲ و بیہقی

اس صحیح حدیث کا واضح مفاد یہ ہے کہ کسی شخص کیلئے جائز نہیں کہ وہ کسی زندہ و مردہ کو سجدہ تعظیمی کرے، مسجود خواہ نبی کی ذات ہی کیوں نہ ہو۔

مگر مفتی صاحب ہمیں اس راہ کی طرف لیجانا چاہتے ہیں جس پر چل کر تعظیم کے پردہ میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے، یہ راستہ مبتدعین کو ہی مبارک ہو ہم تو اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔

اگر مبتدعین کہہ دیں کہ مفتی صاحب کی مراد ایسی تعظیم تھی، جس کو شریعت حقہ نے جائز و مباح کہا ہے، تو اس کے جواب میں راقم عرض کرتا ہے کہ اسی کی تو دلیل چاہیے کہ قبروں پر چراغاں کرنا، اوچھاڑ چڑھانا، اور پھول وغیرہ ڈالنا اسلام میں جائز ہیں۔

رباعاً۔ شریعت حقہ میں کسی واضح نص سے اس کا ثبوت بھی دیجئے کہ شعائر اللہ کی تعظیم، چراغاں کرنے میں، پھول ڈالنے میں ہے، یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اپنے لاؤ لشکر سمیت مل کر بھی اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، جب اس کا ثبوت ہی نہیں تو پھر اللہ کا خوف کیجئے اور اپنی آخرت برباد نہ کریں اور ان بدعات قبیحہ سے اعراض کر کے سنت خیر الانام کی محفوظ شارع پر چل کر اپنی آخرت کو سنوار لیجئے کہ قیامت کے روز پچھتانا نہ پڑے گا۔

خامساً۔ علماء عقائد نے یہ بات بیان کی ہے کہ جس کے خاتمہ بالخیر کی خبر اللہ تعالیٰ اور جناب رسول اللہ ﷺ نے نہ دی ہو، اس کے بارے قطعیت کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا، فقط ظاہری اعمال کی وجہ سے اسکے متعلق حسن ظن ہی رکھ سکتے ہیں۔

خالق ارض و سماء کہتا ہے کہ

فلا تزكوا انفسكم هو اعلم بمن اتقى. النجم ۳۲.

تم اپنے نفسوں کو پاک صاف نہ جانو وہی زیادہ جانتا ہے کہ تم میں کون اللہ سے ڈرنے والا ہے (۳۲-۵۳)

جب ہم کسی کو قطعی طور پر ولی اللہ ہی نہیں کہہ سکتے تو اس کی قبر کو شعائر اللہ میں کیسے تسلیم کر لیا جائے۔

سادساً۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کیا شعائر اللہ کی تفسیر سے صحابہ کرام معاذ اللہ نابلد تھے کہ ان

میں سے کسی ایک نے بھی مزارات کو شعائر اللہ میں داخل نہیں سمجھا اور نہ ہی انہوں نے مزارات بنا کر ان پر چادریں اور پھول چڑھائے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

مشکوٰۃ باب آداب الخلاء فصل اول میں ہے کہ ایک بار حضور علیہ السلام کا دو قبروں پر سے گزر ہوا فرمایا کہ دونوں میتوں کو عذاب ہو رہا ہے ان میں ایک تو پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا۔ اور دوسرا چغلی کیا کرتا تھا، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ کیوں کیا؟ فرمایا جب تک یہ خشک نہ ہوں تب تک ان کے عذاب میں کمی رہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۷ ج ۱، بلفظہ۔

عذاب قبر میں تخفیف کا سبب رسول اللہ ﷺ کی شفاعت تھی یا ٹہنی کی تسبیح

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب سے سہواً حدیث کے ان الفاظ

ثم اخذ جريدة رطبة فشقها بنصفين، ثم غرز في كل قبر واحدة.

کا ترجمہ رہ گیا ہے، اللہ اکبر، مفتی صاحب کا انہیں الفاظ سے ہی استدلال تھا اور انہیں کا معنی ترک کر دیا، یہ ان کے دل کی اندرونی کیفیت ظاہر کر رہا ہے کہ انہیں خود بھی اس دلیل پر اعتماد و بھروسہ نہیں تھا اور حق کے رعب نے انہیں ایسا مرعوب کیا ہے کہ وہ اپنی دلیل کا معنی بھی نہیں کر پائے، واللہ اعلم بالصواب۔

ثانیاً۔ ان قبروں سے تخفیف عذاب کی وجہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت تھی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ

انی مررت بقبرین يعذبان فاحببت بشفاعتي ان يرفه ذاك عنهما مادام

الغصنان رطبين.

یعنی میرا گزر دو قبروں کے پاس سے ہوا جب کہ انکو عذاب ہو رہا تھا، میں نے اپنی شفاعت کے ذریعہ یہ پسند کیا کہ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں ان سے عذاب اٹھالیا جائے، صحیح مسلم

ص ۲۴۱۸ ج ۲۔

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ ٹہنیاں تو فقط علامت کیلئے رکھی گئی تھیں، تخفیف عذاب کا سبب تو فخر الاولین والاخرین جناب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شفاعت تھی۔

مفتی صاحب نے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے بلاوجہ اور بغیر کسی دلیل کے لکھا ہے کہ عذاب قبر کی کمی سبزے کی تسبیح کی برکت سے ہے نہ کہ محض حضور علیہ السلام کی دعا سے اگر محض دعا سے کمی ہوتی، تو حدیث میں خشک نہ ہونے کی کیوں قید لگائی جاتی، جاء الباطل ص ۲۹۸۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی دعا و شفاعت کے آپ حضرات منکر ہیں کہ شاخ کی تسبیح پر تو بے دلیل ہی اصرار کر رہے ہو اور آپ علیہ السلام کی بادل شفاعت سے انکار کر رہے ہو ہم اس الدخنام پارٹی کے علماء سے پوچھتے ہیں کہ منبروں پر بیٹھ کر تو آپ لوگ عظمت مصطفیٰ ﷺ کی ٹھیکے داری کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر افسوس کہ یہاں آپ علیہ السلام کی شفاعت کی برکت کی بجائے ٹہنیوں کی برکت پر اصرار کر رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ اس طرح کے تمام دعووں میں آپ حضرات جھوٹے ہیں، اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تسبیح تو ہر چیز بیان کرتی ہے، قرآن کی نص قطعی سے یہ بات ثابت ہے ارشاد ہوتا ہے

وان من شئ الا یسبح بحمدہ و لکن لا تفقہون تسبیحہم (بنی اسرائیل

(۴۴)

اور کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں

سمجھتے (۱۷-۴۴)

اس قرآنی نص کے بالمقابل فریق ثانی پر لازم ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ سبز شاخ تو تسبیح بیان کرتی ہے مگر خشک نہیں کرتی۔

مگر یاد رہے کہ جملہ مبتدعین کسی دلیل شرعی سے اس کا ثبوت قطعاً نہیں دے سکتے۔

معلوم ہوا کہ عذاب کی کمی ٹہنی کی تسبیح کی برکت کی وجہ سے نہ تھی (کیونکہ وہ تو خشک ٹہنی بھی کرتی ہے) بلکہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے تھی۔

علاوہ ازیں راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ تسبیح تو قبر کی مٹی بلکہ مردے کا کفن بھی کرتا ہے

کیونکہ، ان من شیء، میں یہ بھی شامل ہے، خود مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ خود کفن اور قبر کی مٹی بھی تسبیح پڑھ رہی ہے، نور العرفان ص ۵۶۔

سوال یہ ہے کہ قبر کی مٹی اور مردے کا کفن جو تسبیح پڑھ رہا ہے اس کی برکت سے عذاب قبر میں کمی کیوں واقع نہیں ہوتی۔

معلوم ہوا کہ تسبیح کی برکت کا بہانہ مبتدعین کی ایجاد ہے، اور رہنی و مٹی کی تسبیح مردے کو کچھ فائدہ نہیں دیتی اور (ان کی قبروں پر) تخفیف عذاب کا سبب آنحضرت ﷺ کی شفاعت و دعا تھی، و بس۔

ثالثاً۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے واضح ہے کہ ان دونوں قبروں والوں کو عذاب ہو رہا تھا جو شاخیں گاڑنے کی وجہ سے وقتی طور پر ہلکا پڑ گیا تھا گویا کہ شاخیں لگانے کی علت عذاب تھی لہذا معلوم ہوا کہ جس کی قبر پر پھول وغیرہ چڑھائے جائیں اس کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اسے قبر میں عذاب ہو رہا ہے اس کی قبر پر پھول چڑھانے سے اس کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی، تو اس کا مطلب واضح ہے کہ تم جنہیں اولیاء سمجھ کر ان کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہو دراصل انہیں عذاب میں مبتلا اور گرفتار سمجھتے ہو۔ ورنہ پھول چڑھانے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے یا پھر تمہارا اس حدیث سے استدلال ہی غلط ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت رسول اکرم ﷺ کا عظیم معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی وجہ سے ان قبروں والوں سے عذاب ہلکا کر دیا۔

رابعاً۔ اگر اس حدیث کو عام سمجھ کر ہر ایک کی قبر پر پھول چڑھائے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عام لوگوں کے فعل اور حضرت نبی اکرم ﷺ کے معجزہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فی الحقیقت یہی بات ہے کہ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو عام متدل بنا کر فعل رسول اور فعل عوام میں جو امتیازی اور معجزاتی فرق تھا اسے ختم کر دیا ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کے ایک خاص فعل سے عام استدلال کیسے درست ہو سکتا ہے۔ (گوندلوی)

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

اولیاء اللہ کی قبروں پر چادریں ڈالنا جائز ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے عام زائرین کی نگاہ میں صاحب قبر کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۹۔

کیا اسلام میں قبر کی عظمت کا پرچار جائز ہے،

الجواب۔ اولاً مفتی صاحب نے پہلی دلیل میں ان افعال کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ اس سے ان کی تعظیم مقصود ہوتی ہے، پھر دوسری میں اس کے برعکس یہ دعویٰ کر دیا کہ تسبیح کی برکت سے عذاب قبر میں تخفیف ہوتی ہے اور اولیاء کے لئے بلندی درجات کا سبب بنتی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۹۔ مگر اس دلیل میں پہلی دونوں دلیلوں کے الٹ یہ دلیل دی ہے کہ اس سے مقصود صاحب قبر کی عظمت محسوس کروانا ہے۔

اے جی آپ ایک بات پر ہی کیوں نہیں رہتے، شاید مبتدعین یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیں، انہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

ثانیاً۔ حقیقت یہ ہے کہ مبتدعین کی اصل دلیل یہی ہے اور اسی سے ہی وہ اپنے عوام کو مطمئن کرتے ہیں کہ قبروں پر پھول ڈالنا اور چادریں چڑھانا، چراغاں کرنا جائز ہے، مگر اس پر کوئی شرعی دلیل تو وہ نداد۔

افسوس مبتدعین جب دعویٰ کرتے ہیں تو آسمان پر جا ٹھہرتے ہیں، مگر جب دلیل دیتے ہیں تو تحت الثریٰ سے بھی نیچے جا گرتے ہیں۔

ہر مسلمان کی قبر کی توہین سے اعراض کرنا تو عین اسلام کی تعلیم ہے، اس میں ولی کی قبر کی بھلا تخصیص ہی کیا ہے، سنن ابوداؤد اور متعدد کتب میں یہ حدیث بسند صحیح مروی ہے کہ آپ علیہ السلام نے قبر پر بیٹھنے اور اس پر جوتی سمیت چلنے سے منع فرمایا، سنن ابوداؤد مع عون ص ۲۱۰ ج ۳۔

مگر مفتی صاحب کہتے ہیں کہ چراغاں کرنا اور چادریں وغیرہ سے لوگ صاحب قبر کی عظمت سے مرعوب ہو کر اس کی تعظیم کریں۔

تعظیم کروانے کا یہ نرالا ڈھنگ نہ رسول اللہ ﷺ کو سوجھا اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور

خیر القرون کے سنہری دور میں اس پر عمل ہوا، دین اسلام کی تکمیل کے صدہا سال بعد مبتدعین نے اسے دریافت کر لیا، جس سے معلوم ہوا کہ یہ سینہ گزٹ ہونے کے علاوہ تعظیم کے پردہ میں شرک و بدعت کی ترویج ہے۔

ثالثاً۔ مبتدعین اس تعظیم سے کیا مراد لیتے ہیں، اگر تو ان کا مقصد یہ ہے کہ عوام الناس ایک ولی کی قبر جان کر اس سے فیض حاصل کریں اور اس سے مرادیں مانگیں اسے حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اس کی قبر پر نذر و نیاز چڑھائیں۔

ایسی نیت سے مزارات کی تعمیر اور ان پر چراغاں، وغیرہ تمام بدعتیں صریحاً شرک کے زمرے میں آتی ہیں، ایسا عمل اسلام کے خلاف ایک خوف ناک سازش اور شرک کی طرف دعوت دینا ہے، کیونکہ کسی فرد بشر کی قبر سے فیض حاصل کرنے کی شریعت میں کوئی دلیل موجود نہیں، یہ تمام شیطان لعین کی راہیں ہیں جن پر چل کر انسان سیدھا جہنم کی طرف جاتا ہے۔

رابعاً۔ اگر مبتدعین یہ جھوٹا بہانہ تراش لیں کہ نہیں، ان افعال سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے، تو یہ قول ان کے عمل کے صریحاً مخالف ہے، کیونکہ یہ لوگ تو مزارات کی تعمیر کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کرتے ہیں، علماء و مشائخ کی قبور عام لوگوں سے ممتاز رہیں تاکہ لوگ پہچان کر ان سے فیض لیں۔ جاء الباطل ص ۲۸۔

بلکہ مولوی احمد رضا خاں نے تو خاص قبور پر چراغاں کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی ہے، تاکہ لوگ ولی کی قبر جان کر اس سے فیض حاصل کریں اس کے الفاظ ہیں

مزار کسی ولی اللہ یا محققین علماء میں سے کسی عالم کا ہے وہاں شمعیں روشن کریں ان کی روح کی تعظیم کیلئے جو اپنے بدن کی خاک پر ایسی تجلی ڈال رہی ہے، جیسے آفتاب زمین پر تاکہ اس روشنی کرنے سے لوگ جانیں کہ یہ ولی کا مزار پاک ہے تاکہ اس سے تبرک کریں اور وہاں اللہ عزوجل سے دعا مانگیں کہ ان کی دعا مقبول ہو۔ فتاویٰ رضویہ ص ۱۴۵ ج ۴۔

دیکھئے اس عبارت میں مولوی احمد رضا خاں نے بدعت کی ترویج و اشاعت کیلئے کیسا فارمولا ایجاد کیا ہے کہ عوام الناس کو معلوم ہو جائے کہ قبر ولی اور محققین علماء میں سے کسی ایک کی ہے۔ تاکہ وہ اس سے فیض اٹھا سکیں۔

گزارش یہ ہے کہ کیا خیر القرون میں اولیاء اور محققین علماء موجود نہ تھے اگر تھے؟ یقیناً تھے، تو کیا انہوں نے بھی ولایت کے پرچار کیلئے ایسے ہتھکنڈے استعمال کیئے تھے، نہیں قطعاً نہیں، پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

پھر بریلویت کے باوا آدم نے اسی پر ہی بس نہیں کیا کہ چراغاں کا عمل فقط پہچان کیلئے ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھکر اس نے یہ تاکید بھی کر دی تاکہ لوگ اس کی قبر سے فیض حاصل کریں اور وہاں جا کر دعائیں کریں۔

مزارات کی تعمیر اور ان پر چراغاں وغیرہ کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ ولایت کی آڑ میں اپنی دوکان کو چمکایا جائے تاکہ انکم کا لامحدود ذریعہ بن جائے۔

اسکیننگ : محمد شاہ
اسراء، تجاویز، رائے کیلئے رابطہ
کیسے

txuemaslak@inbox.com

باب میت دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا

دفن کرنے کے بعد مسنون عمل

جنازہ کے بعد مسلمان کو دفن کرنا اور مٹی ڈال کر رب قدیر جو کہ غفور و رحیم ہے سے فوت شدہ کے حق میں اثبات قدمی کی دعا کرنا سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔

سنن ابوداؤد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

كان النبي ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف عليه فقال استغفروا لاهيكم واسالوا له بالتثبيت فانه الآن يستل.

یعنی نبی ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو قبر پر ٹھہرتے اور فرماتے اس کیلئے (اپنے مولیٰ کریم و حلیم سے) ثابت قدم رہنے کا سوال کرو کیونکہ اس وقت اس سے سوال ہوگا۔

سنن ابوداؤد مع عون المعبود باب الاستغفار عند القبر للمیت فی وقت الانصراف، ص ۲۰۹ ج ۳، و مستدرک حاکم ص ۳۷۰ ج ۱، و شرح السنة ص ۲۱۸ ج ۵، و مشکوٰۃ رقم الحدیث ۱۳۳، و بیہقی ص ۵۶ ج ۴، و التمهید ص ۲۷۰ ج ۲۳.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ دفن کے بعد میت کیلئے دعا فرماتے، چنانچہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ دفن کے بعد اپنے مولیٰ حقیقی سے مرنے والے کیلئے تثبیت کا سوال اور دعا خیر کی جائے۔

الحمد للہ۔ علم نبوی کی امین جماعت اس پر عمل پیرا ہے، لیکن اس کے برعکس اذان کا ثبوت قرآن و سنت سے کہیں بھی نہیں ملتا۔

امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت اور تابعین عظامؒ کا امین گروہ بھی اپنے مردوں کو دفنایا کرتے تھے، اذان بھی تھی، موزن بھی موجود ہوا کرتے تھے، مگر کسی

ایک نے بھی دفن کے بعد اذان نہیں دی، بلکہ تمام دفن کے بعد میت کیلئے دعا فرماتے تھے۔
علاوہ ازیں جو شخص دفن کے بعد قبر پر اذان دیتا ہے، وہ درحقیقت دعا کی سنت کو مٹاتا ہے
کیونکہ دفن کے بعد مسنون طریقہ تو میت کیلئے ثابت قدمی کی دعا کرنا ہے، جو عمل سنت کو مٹائے اس
کے بدعت ہونے میں کسی کلمہ گو کو انکار نہیں ہونا چاہیے۔

فقہائے احناف کی صراحت

فقہائے احناف نے تو اس بات کی صراحت کی ہے کہ جو چیز سنت سے ثابت نہیں اس کا قبر
کے آس پاس کرنا مکروہ (حرام) ہے۔

علامہ ابن ہمام الحنفی المتوفی ۶۸۱ھ، ہدایہ، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

ويكره النوم عند القبر و قضاء الحاجة بل اولى و كل مالم يعهد من السنة
المعهود منها ليس الازيارتها والدعاء عندها قائما كما كان يفعل صلی اللہ علیہ وسلم في الخروج
البقيع.

یعنی قبروں کے پاس سونا اور قضاء حاجت کرنا بالاولیٰ، اور ہر وہ چیز جو سنت سے ثابت نہ ہو،
وہ مکروہ (حرام) ہے اور سنت سے ثابت فقط۔ قبروں کی زیارت اور انکے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنا
ہے۔ جیسا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع میں جا کر کرتے تھے۔

فتح القدیر ص ۱۰۲ ج ۲، آخر، فصل الدفن، طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

علامہ زین الدین المعروف ابن نجیم حنفی، کنز الدقائق کی شرح میں فرماتے ہیں۔

ويكره عند القبر كلما لم يعهد من السنة و المعهود منها ليس الازيارتها
والدعاء عندها قائما كما كان يفعل صلی اللہ علیہ وسلم في الخروج الى البقيع.

یعنی قبر کے پاس وہ تمام چیزیں (کرنا) مکروہ ہیں جن کا ثبوت سنت سے ثابت نہیں، اور سنت
سے ثابت محض قبر کی زیارت اور اس کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنا ہے جیسا کہ آپ علیہ السلام بھی
ایسا ہی کرتے تھے جب بقیع (مدینہ کے قبرستان) میں جاتے تھے۔ البحر الرائق ص ۱۹۶ ج ۲، طبع ایضاً۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے

ویکرو عند القبر مالم یعهد من السنة والمعهود منها لیس الا زیارتہ والدعاء عنده قائما۔

یعنی جو چیز سنت سے ثابت نہیں اس کا قبر کے پاس کرنا مکروہ (حرام) ہے اور سنت سے فقط قبر کی زیارت اور اس کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنا ہے،
فتاویٰ عالمگیری ص ۱۶۶ ج ۱، طبع حافظ کتب خانہ کوئٹہ۔

علامہ محمد امین المعروف ابن عابدین در مختار کی شرح میں فرماتے ہیں

فی الاقتصار علی ما ذکر من الوارد اشارۃ الی انہ لایسن الاذان عند ادخال المیت فی قبرہ کما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر فی فتاویہ بانہ بدعة، و قال، و من ظن انہ سنة قیاس علی ندبہما للمولود الحاقا لخاتمة الامر بابتدائه فلم یصب۔

یعنی (زیارت اور دعا پر) اقتصار کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ میت کو قبر میں دفن کرتے وقت اذان کہنا سنت (سے ثابت) نہیں، جیسا کہ آج کل عادت ہو گئی ہے، اور ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں اس کے بدعت ہونے کی صراحت کی ہے، انہوں نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ جس نے اسے سنت خیال کیا ہے اس نے بچہ کی پیدائش پر اسے قیاس کرتے ہوئے خاتمہ پر بھی اذان کو الحاق کیا ہے مگر ان لوگوں کا یہ قیاس درست نہیں، فتاویٰ شامی ص ۲۳۵ ج ۲، مطلب فی دفن المیت۔
فقہ حنفی کے معروف کتاب در البحار میں ہے

من البدع التي شاعت في بلاد الهند الاذان على القبر بعد الدفن۔

جو بدعتیں کہ ہندوستان میں شائع ہو گئیں ان میں سے دفن کے بعد قبر پر اذان دینا ہے۔

تو شیخ شرح تنقیح میں محمود رحمہ اللہ فرماتے ہیں

الاذان علی القبر لیس بشی، قبر پر اذان دینا کچھ (بھی) نہیں، بحوالہ جاء الباطل

ص ۳۱۸ ج ۱۔

مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی، شرح صحیح مسلم، میں لکھتا ہے۔

دفن کے بعد اذان..... کو تدفین کا ایک رکن قرار دینا باطل اور بدعت سیئہ ہے، شرح صحیح

مسلم ص ۱۹۰ ج ۲۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر اذان قبر دلیل شرعی سے ثابت ہے تو پھر اس کو دفن کا جزو کہنا بھی درست ہوگا، اور اگر اس کی کوئی دلیل ہی نہیں تو پھر یہ جزو کے اعتقاد کے بغیر بھی بدعت سیئہ ہی رہے گی۔

حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی اپنے ایک تصدیقی فتویٰ میں فرماتے ہیں کہ اذان قبر پر دینا مکروہ اور بدعت قبیحہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اور تابعین اور تبع تابعین اور مجتہدین سے ثابت نہیں۔ فتاویٰ نذیریہ ص ۶۸۹ ج ۱۔

علمائے اہل حدیث کا اتنا بڑا دعویٰ آج تک کسی رضوی علامہ فہامہ نے توڑا نہیں، وہ کسی صحیح و معتبر دلیل سے قبر پر اذان دینا قرآن و سنت اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں کر سکے، جو چیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ ہو، اس کے بدعت ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

بدعت کے متعلق ایک اصول اور علمائے بریلویہ کا اعتراف حق

حضرت شیخ میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے مذکورہ فتویٰ کو جب آج تک چیلنج نہیں کیا گیا۔ تو پھر غور کیجئے کہ جس چیز کا رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارکہ میں سبب موجود تھا، اور کوئی چیز مانع بھی نہ تھی پھر بھی آنحضرت ﷺ نے ترک فرمایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کرنے کا حکم نہ فرمایا، بلکہ پورے خیر القرون میں اس پر عمل نہ تھا تو اس کے بدعت سیئہ ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ آئیے اس ضابطے اور کلیہ کا ہم آپ کو بریلوی علماء سے اعتراف دکھائیں جو تمام بدعات کے رد میں انشاء الرحمن کام دے گا۔

چنانچہ خاں صاحب نے ایک رسالہ، الہادی الحاجب عن جنازة الغائب، کے عنوان سے تحریر کیا ہے جس میں ادھر ادھر کی فضول امیثات لاکر بذم خود خاں صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، پھر کسی چیز کا آنحضرت ﷺ سے عدم منقول کے بارے میں بطور اصول کے تحریر کرتے ہیں کہ

اور جس امر سے مصطفیٰ ﷺ بے عذر مانع بالقصد احتراز فرمائیں وہ ضرور (یقیناً) امر شرعی و

مشروع نہیں ہو سکتا ہے۔ فتاویٰ رضویہ ص ۶۹ ج ۴۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ خاں صاحب کے نزدیک کسی کام کے محرک اور سبب کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کو ترک کیا ہو وہ یقیناً دین کا حصہ و جزو قطعاً نہیں ہو سکتا، بلکہ انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر ایک بات یہ کہی ہے کہ جس چیز پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں عمل نہ ہوا ہو وہ کم از کم مکروہ ہے۔

اس کے الفاظ ہیں

زمانہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بحمد اللہ ہزار ہا بلا دینم فتح ہوئے ہزاروں عجمی حاضر ہوئے مگر کبھی منقول نہیں کہ انہوں نے ان کی غرض سے خطبہ غیر عربی میں پڑھایا ہو، اس میں دوسری زبان کو خلط کیا ہو

وکل ما وجد مقتضیہ عینا مع عدم المانع ثم ترکوه دل علی انہم کفوا عنه
فکان ادناہ الکراہۃ، فتاویٰ رضویہ ص ۶۸۴ ج ۳۔ باب الجمعة.

افسوس کہ بریلویت کے اعلیٰ حضرت نے اردو فتویٰ میں جو اصول درج کیا ہے وہ عربی زبان میں لکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے تاکہ لوگ اس بات سے واقف ہو کر بریلوی مذہب کو خیر باد کہہ کر جمع سنت نہ ہو جائیں، خیر ہماری بلا جانے، اب مذکورہ عبارت کا معنی معلوم ہو۔

ہر وہ کام بالخصوص جس کا سبب پایا جائے اور اس کے کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو قصد نہ کریں تو یہ اس بات کے عدم جواز پر دلالت کرتا ہے اور اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مکروہ ہو (انقصی)

خیر اب تو معنی ہو گیا اور خاں صاحب نے کھل کر اس چیز پر دستخط کر دیئے کہ جس چیز کا سبب ہونے کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قصد ترک کیا ہو وہ کم از کم مکروہ ہے۔

انہوں نے تو یہاں تک صراحت کی ہے کہ جس چیز کا قرآن و سنت سے ثبوت نہیں وہ بدعت سیئہ ہے چنانچہ خاں صاحب سے ایک سوال کیمبل پور سے کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں اور بعض مواضع پشاور میں میت کو دفن کرنے کے بعد امام مسجد قبر کھودنے کے آلات و اوزار کو قبر کے اوپر پھلا کر رکھواتا ہے، اور (مبتدعین) کے پیش امام کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے میت کو راحت و سکون پہنچتا

ہے اور وہ عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے، بریلویت کے پیرو مرشد مولوی احمد رضا خاں نے اس کا تفصیلی رد تحریر کیا ہے، اس میں فرماتے ہیں

پھر اس عبث مبغوض کو دین میں نافع اور میت سے عذاب کا دافع سمجھ کر کرتے ہیں، یہ قطعاً شرع میں زیادت و اختراع و شنیع ابتداء (بری بدعت) ہے۔

فتاویٰ رضویہ ص ۱۲۲ ج ۴۔

اس عبارت میں خاں صاحب نے اس کے بدعت سیدہ ہونے کی یہ دلیل قائم کی ہے کہ یہ شریعت میں زیادت ہے جو من گھڑت ہونے کی وجہ سے بدعت قبیحہ ہے، یہی بات ہم تمام بدعات کے بارے میں بالعموم اور اذان قبر کے متعلق بالخصوص کہتے ہیں کہ چونکہ یہ شریعت میں زیادت ہے کیونکہ باوجود سبب ہونے کے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی مانع کے نہ ہوتے ہوئے بھی نہیں کیا لہذا ان کا ارتکاب بدعت سیدہ ہے۔

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

ہم پہلے باب میں ثابت کر چکے ہیں کہ بعد دفن ذکر اللہ تسبیح و تکبیر حضور علیہ السلام سے ثابت ہے اور جس کی اصل ثابت ہو وہ سنت ہے۔

اس پر زیادتی کرنا منع نہیں، فقہاء فرماتے ہیں کہ حج میں تلبیہ کے جو الفاظ احادیث سے منقول ہیں ان میں کمی نہ کرے اگر کچھ بڑھائے تو جائز ہے۔ (ہدایہ وغیرہ) اذان میں تکبیر بھی ہے اور کچھ زیادہ بھی لہذا یہ سنت سے ثابت ہے اور اگر بدعت بھی ہو تو حسنہ ہے جیسے کہ ہم بحث بدعات میں عرض کر چکے ہیں۔

جاء الباطل ص ۳۱۶ ج ۱۔

جس کی اصل ثابت ہو اس پر لاحقہ

اضافہ کرنا جائز ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ قبر پر تسبیح وغیرہ کی روایت کی بحث آگے ان شاء الرحمن تفصیل سے آرہی ہے کہ

روایت ضعیف ہونے کے علاوہ مفتی صاحب کی دلیل قطعاً نہیں۔

ثانیاً۔ مسنون تلبیہ کے الفاظ پڑھنے کے بعد اگر کوئی شخص ایسا کلمہ کہتا ہے جو رب قدیر کی بزرگی کبریائی اور عظمت پر مشتمل ہو تو جائز ہے اور اس کے جواز پر حدیث صحیح موجود ہے۔ سنن ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

والناس یزیدون ذا المعارج و نحوه من الکلام و النبی ﷺ یسمع فلا یقول لهم شیئاً۔

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے، لیک ذالمعارج، وغیرہ اور اس طرح کا اور کلام، تلبیہ میں زیادہ کیا اور نبی کریم ﷺ نے ان کلمات کو سنا اور کچھ نہ کہا، ابوداؤد مع عون، باب کیف التلبیۃ ص ۹۹ ج ۲۔

یہ تقریری حدیث ہے جس میں آپ علیہ السلام نے تلبیہ میں زائد کلمات سن کر خاموشی اختیار فرمائی ہے، اس سے بڑھکر اس کے جواز کی اور کیا دلیل چاہیے، اگر اس طرح کاثبوت اذان قبر کے متعلق بھی ملتا ہے تو دیجئے۔

راقم پوری ذمہ داری سے یہ بات عرض کرتا ہے کہ اگر یہ بات ثابت کر دی جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قبر پر اذان دی اور رسول اللہ ﷺ نے سن کر خاموشی اختیار کر لی، تو چشم ماروش دل ماشاد، ہم جماعتی طور پر اس کے مسنون ہونے کا اعلان کر دیں گے، مگر ہمیں یقین ہے کہ یہ ثابت نہ کر سکیں گے، نیز تلبیہ کے زائد کلمات کو اذان قبر سے کیا نسبت ہے، واضح رہے کہ حج میں افضل تلبیہ، رسول اللہ ﷺ سے مروی الفاظ میں ہی کہنا ہے، محدث مبارک پوریؒ نے اس پر نہایت عمدہ بحث کی ہے باذوق حضرات مراجعت فرمائیں، مرعاة المفاتیح ص ۴۲۶ ج ۸، حضرت مولانا محمد شمس الحق محدث عظیم آبادی فرماتے ہیں

والحاصل ان الاقتصار علی التلبیۃ المرفوعة افضل۔

یعنی خلاصہ بحث یہ ہے کہ مرفوع تلبیہ (رسول اللہ کے تلبیہ) پر اقتصار افضل ہے۔ عون العبود ص ۹۹ ج ۲۔

رہا مفتی صاحب کا یہ عذر کہ جس کی اصل سنت سے ثابت ہو اس پر زیادتی کرنا منع نہیں، تو یہ

ان کا جھوٹا بہانہ ہے جس سے وہ بدعات قبیحہ کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں، ورنہ اصل سے زائد کرنا درحقیقت بدعت ہے، جس کی ضروری امثلہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) رکوع میں، سبحان ربی العظیم، اور سجدہ میں، سبحان ربی الاعلیٰ، سے زائد اگر کوئی شخص سورۃ یٰسین، یا قرآن کا کوئی اور حصہ تلاوت کرے تو کیا آپ حضرات ایسے شخص کے عمل کی تائید کریں گے، قطعاً نہیں۔

حالانکہ دونوں کلمے قرآن ہی کے ہیں مگر ان سے زائد رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے کو آپ بھی بدعت سیئہ ہی کہیں گے، گو کبھی کبھار ہی پڑھے۔ اور یہ جھوٹا بہانہ بھی پیش کرے کہ میں نے قرأت کی نیت سے نہیں بلکہ دعا کی نیت سے پڑھا ہے، اور دعا آنحضرت ﷺ سے رکوع و سجود میں ثابت ہے، لہذا اس اصل پر یہ زیادت جائز ہے مگر کوئی دہائی و نجدی کی رٹ لگانے والا اسے جائز نہیں کہے گا۔

(۲) اپنی عورت سے وطی کرنے کی اصل سنت سے ثابت ہے مگر اس پر زیادت لونڈے بازی، منع ہے، آخر کیوں؟ کیا دبر عورت کے جسم کا حصہ نہیں۔ ہم تو کیا بدعت پسند بھی اس اجتہاد کو خرافات سے تعبیر کریں گے۔

(۳) رسول اللہ ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو ایک دعا سکھائی جس میں یہ الفاظ تھے، و نیک الذی ارسلت، حضرت براء رضی اللہ عنہ نے جب یہ دعا دہرا کر آپ کو سنائی تو یوں پڑھا

و رسولک الذی ارسلت، آپ علیہ السلام نے فرمایا

لا و نیک الذی ارسلت، نہیں (وہی الفاظ دہراؤ جو میں نے سکھائے ہیں)

بخاری ص ۳۸ ج ۱، و ابوداؤد مع عون ص ۴۷۱ ج ۴، و ترمذی مع تحفة

ص ۲۳۰ ج ۴۔

(۴) سنن ترمذی میں ہے کہ امام نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں ایک شخص نے چھینک ماری تو اس نے کہا، الحمد لله والسلام علی رسول اللہ ﷺ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ (عام حالات میں) میں بھی یہی کہتا ہوں،

الحمد لله والاسلام على رسول الله، مگر چھینک کے وقت ہمیں رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہم، الحمد لله على كل حال، کہیں۔ ترمذی مع تحفة ص ۴۲، مشکوٰۃ ص ۴۰۶ و سندہ حسن۔

اس حدیث کو درج کر کے مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی بطور نتیجہ لکھتا ہے کہ اس شخص نے جو چھینک کے بعد، الحمد لله والاسلام على رسول الله، کہا تو اس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتا تھا اور نہ یہ بات تھی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بغض کی بناء پر اس کو چھینک کے بعد درود شریف پڑھنے سے منع کر رہے تھے، ان کا مطلب صرف اتنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو عبادات جس طرح مشروع اور مقرر فرمائی ہیں ان کو کسی ترمیم اور اضافہ کے بغیر ادا کرنا اتباع رسول اور جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ وابستگی ہے، اور اپنی رائے سے ان میں کسی سابقہ اور لاحقہ کا اضافہ کرنا بہر حال لائق ستائش نہیں ہے۔ شرح صحیح مسلم ص ۱۰۹۵ ج ۱، طبع فرید بک سٹال ۱۴۱۵ھ۔

(۵) نفلی روزے اور رات کو قیام کرنے کی اصل شریعت اسلامیہ میں موجود ہے مگر ساری رات قیام کرنا، ہمیشہ روزے رکھنے سے اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

تین آدمی امھات المؤمنین کے پاس آئے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھ رہے تھے جب انہیں آنحضرت ﷺ کی عبادت کے بارے میں خبر دی گئی تو کہنے لگے کہ کہاں ہم اور کہاں اللہ کے پیارے رسول ﷺ، رب کائنات نے تو انہیں معاف کر دیا ہوا ہے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری زندگی رات بھر قیام کیا کروں گا، دوسرے نے کہا میں ساری زندگی روزے رکھوں گا اور کبھی روزہ ترک نہ کروں گا، تیسرے نے کہا کہ میں شادی نہ کروں گا، یہ باتیں رسول اللہ ﷺ سن رہے تھے، آپ علیہ السلام باہر تشریف لائے اور فرمایا

انتم الذين قلتم كذا وكذا اما والله اني لاخشاكم لله و اتقاكم له لكني اصوم و افطر و اصلی و ارقد و اتزوج النساء فمن رغب عن سنتي فليس مني۔
یعنی تم لوگوں نے ایسی باتیں کہیں ہیں (سن لو) مجھے رب کی قسم ہے کہ میں تم سب سے

زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں رات کو قیام بھی کرتا ہوں سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریق (عمل) سے منہ پھیرتا ہے وہ میری (امت) سے نہیں۔ بخاری شریف ص ۵۷ ج ۲۔ و مسلم ص ۴۴۹ ج ۱ واللفظ لہ۔

دیکھئے رات کو نوافل پڑھنا سنت مصطفوی سے ثابت ہے، مگر ان پر زیادتی کہ ساری رات ہی پڑھا کروں گا، اسی طرح نفلی روزے کی بھی شریعت میں اصل ہے، مگر اس پر زیادتی یہ کہ کبھی بھی افطار نہ کروں گا، آنحضرت ﷺ نے ناپسند فرمایا۔

گو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نیت یہی تھی کہ ان اعمال سے اپنے رب قدیر کی رضا حاصل کی جائے، مگر اللہ کے رسول ﷺ نے اس طریق عمل کو پسند نہیں کیا، بلکہ ایسی عبادت کو اپنی سنت سے بغاوت قرار دیا۔

اب مسلمان فیصلہ کر لیں کہ انہوں نے مفتی صاحب کی بات کو ماننا ہے یا امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت پر چل کر آپ کے اسوہ حسنہ کو اپنا کر دین میں من گھڑت بدعات اور زیادتیوں کو رد کر دینا ہے۔

علمائے بریلویہ کا اعتراف حق

آئیے اس ضابطہ و اصول کی بریلوی علماء سے تصدیق بھی ملاحظہ کیجئے۔

چنانچہ مولوی غلام رسول سعیدی صاحب حنفی بریلوی فرماتے ہیں

اس سلسلہ میں صحیح قاعدہ یہ ہے کہ جس خاص عبادت کے کرنا محرک ہو اور اس کے کرنے سے کوئی مانع نہ ہو اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے وہ کام قصداً ترک کیا ہو وہ کام کرنا یقیناً ناجائز اور بدعت ہے۔ شرح صحیح مسلم ص ۵۴۵ ج ۲۔

سعیدی صاحب نے اس ضابطے کو فقط عبادات میں تسلیم کیا ہے، ہم تو اسے بھی غنیمت جانتے ہیں، اگر وہ اس کا بھی اقرار نہ کرتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے، شاید سعیدی صاحب کے نزدیک سورۃ الحجرات کی حسب ذیل آیت کا تعلق فقط عبادات سے ہی ہے ارشاد ہوتا ہے

يا ايها الذين امنوا لاتقدموا بين يدي الله ورسوله. (الحجرات ۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو (احمد رضا) ۴۹-۱۔

جب کہ سعیدی صاحب کے حکیم الامت اور مولف جاء الباطل نے بھی مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

کسی چیز میں بھی حضور علیہ السلام سے آگے بڑھنا منع ہے کیونکہ، لا تقدّموا، مطلق ہے۔ نور العرفان ص ۸۲۲۔

بریلویت کا معروف عالم مولوی نعیم الدین مراد آبادی لکھتا ہے
یعنی تمہیں لازم ہے کہ اصلاً تم سے تقدیم واقع نہ ہو نہ قول میں نہ فعل میں، حاشیہ بر ترجمہ مولوی احمد رضا خاں ص ۷۵۔

علمائے بریلویہ کی ان عبارات سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھنے کی ممانعت عام ہے، خواہ عبادات ہوں یا معاملات یا دین کا کوئی اور مسئلہ، اس میں سنت سے زیادہ کام کرنا بدعت سیدہ ہے، خود سعیدی صاحب بھی اس بارے میں مطمئن نہیں انکی اٹھی ہوئی بحث میں یہ عبارت بھی موجود ہے کہ

بے خطر اور سلامتی کا طریقہ یہی ہے کہ سنت رسول اور طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دانتوں سے پکڑ لیا جائے اور اس میں سرمو کی بیشی نہ کی جائے، اعلیٰ حضرت سے سوال کیا گیا کہ کفن مسنون سے کچھ زیادہ چیزیں کفن میں رکھنا جائز ہیں اس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا

مرد کیلئے کفن کے تین کپڑے اور عورت کیلئے پانچ انکے سوا کفن میں کوئی اور تہبند یا رومال دینا بدعت و ممنوع ہے، سرمہ کنگھی اگر فقیر کو بطور صدقہ دیں تو حرج نہیں اور کفن میں رکھنا حرام ہے۔

اس عبارت سے آفتاب سے زیادہ روشن طریقہ سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن امور کو منضبط کر دیا ہے ان میں کسی قسم کی زیادتی اور سابقہ و لاحقہ کا اضافہ کرنا ناجائز اور بدعت ہے۔ شرح صحیح مسلم ص ۵۶۲ ج ۲۔

اس عبارت میں سعیدی صاحب کو اقرار ہے کہ کسی مسنون فعل میں زیادتی کرنا بدعت و ممنوع ہے، خواہ اس کا تعلق کسی چیز سے بھی ہو۔

کاش علمائے بریلویہ غور کرتے اور یہ سوچنے کی زحمت گوارہ کرتے کہ کفن کا تعلق عبادات سے نہیں بلکہ حقوق العباد سے ہے۔

پھر سعیدی صاحب نے ایک اور ستم ڈھایا ہے، خاں صاحب کی عبارت نقل کرنے میں بریلوی ہاتھ کی صنائی دکھائی ہے، حالانکہ مکمل عبارت اس طرح تھی

مرد کیلئے کفن کے تین کپڑے سنت ہیں اور عورت کیلئے پانچ، ان کے سوا کفن میں کوئی اور تہبند یا رومال دینا بدعت و ممنوع ہے۔ فتاویٰ رضویہ ص ۲۱۳ ج ۴۔

لیجئے جناب مولوی احمد رضا خاں کہہ رہا ہے کہ کفن میں زائد کپڑے دینے بدعت و ممنوع ہیں، اس کی دلیل خاں صاحب نے یہ قائم کی ہے کہ یہ مسنون کفن سے زائد ہیں۔

اس اصول کو بریلوی علماء یہاں کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ دفن کے بعد میت کیلئے دعا کرنی مسنون ہے اور اذان دینا زائد ہے لہذا بدعت و ممنوع ہے۔

مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض

اولاً۔ ابن حجر شافعی ہیں تو بتاؤ حنفیوں کو مسئلہ جھور پر عمل کرنا ہوگا کہ قول شافعی پر، دوم، امام ابن حجر نے بھی اذان قبر کو منع نہیں کیا بلکہ اسکے سنت ہونے کا انکار کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر مان لیا جائے ابن حجر نے خود اذان کی تردید کی تو کسی عالم کے تردید کرنے سے کراہت یا حرمت ثابت ہو سکتی ہے، مفہوم جاء الباطل ص ۳۱۶ تا ۳۱۷۔

الجواب

مفتی صاحب نے جو کچھ تحریر کیا ہے، محض دفع الوقتی ہے، اب ترتیب وار ان خرافات کا جواب ملاحظہ کریں۔

اولاً۔ یہ مانا کہ ابن حجر شافعی المذہب تھا مگر حضرت جی یہ تو بتاؤ کہ آنجناب نے جو اسی بحث میں فتاویٰ شامی سے، جاء الباطل ص ۳۱۲ ج ۱، میں عبارت نقل کی ہے وہ کس حنفی کی ہے، وہ بھی تو عالی جاہ شافعی المذہب علماء کی ہے، چنانچہ ابن عابدین لکھتے ہیں کہ

وفي حاشية البحر للخير الرملي. رایت فی کتب الشافعية انه یسن الاذان

لغير الصلوة.

یعنی رملی نے بحر کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ میں نے بعض کتب شافعیہ میں دیکھا ہے کہ نماز کے علاوہ چند جگہ پر اذان دینا سنت ہے۔ فتاویٰ شامی ص ۳۸۵ ج ۱۔

اس کے بعد علامہ شامی نے ابن حجر کا انکار درج کیا ہے۔

مفتی جی کی عیاری دیکھئے کہ خود تو شافعی علماء کی عبارت کو بطور حجت پیش کرتے ہیں مگر اس کی تردید جو علماء شافعی کرتے ہیں اس کا انکار کرتے ہیں، پھر اس کیلئے یہ جھوٹا بہانا پیش کرتے ہیں کہ ابن حجر شافعی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حقیقت یہ ہے کہ بدعت ایک ایسی بری اور منحوس چیز ہے جو انسان سے عقل و خرد چھین کر بڑے بڑے مفتیان کرام کو خبطی بنا دیتی ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے آمین۔

ثانیاً۔ ابن حجر نے محض اس کے سنت ہونے سے انکار نہیں کیا بلکہ اسے بدعت بھی کہا ہے، قارئین کرام ورق الٹ کر بحوالہ شامی ص ۲۳۵ ج ۲، ابن حجر کی عبارت کو ایک بار پھر سے دیکھ لیں بلکہ خود مفتی صاحب نے شامی سے نقل کیا ہے کہ

وقد صرح ابن حجر بانہ بدعة. اور ابن حجر نے تصریح فرمادی کہ یہ بدعت ہے۔ جاء الباطل ص ۳۱۸۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب کو جھوٹ بولنے (اور وہ بھی تحریر میں) ذرا بھر شرم نہیں آئی، پھر اس پر انہیں ندامت و شرمندگی کی بجائے فخر و گھمنڈ ہے چنانچہ شیخی بگھاڑتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ شامی سمجھنے کیلئے عقل و ایمان کی ضرورت ہے، جاء الباطل ص ۳۱۷ ج ۲۔ جس کی خیر سے مفتی صاحب کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ثالثاً۔ شکر ہے کہ مفتی صاحب نے ایک حق بات تو زبان سے نکالی اور اس کا صاف لفظوں میں اقرار کیا کہ بزرگ سے بزرگ امتی کی بھی دین میں کوئی حیثیت نہیں، یہی ہمارا اور اہل بدعت کا بنیادی اختلاف ہے کہ قرآن و حدیث اور اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی شرعی دلیل کے بالمقابل کسی کی ذات کو بطور حجت پیش نہیں کیا جاسکتا، کاش مبتدعین دیانت کے ساتھ اس اصول پر کار بند ہوں۔

رہا ہم نے فقہاء کی عبارتوں کو کیوں پیش کیا؟ تو جواباً عرض ہے کہ جناب پر اتمام حجت کیلئے جنہوں نے جاء الباطل کے شروع میں لکھا ہے کہ

ہدایات۔ اس کتاب میں حسب ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۱) اپنے دعوے کی وضاحت (۲) اس کے دلائل قرآن و حدیث اور بزرگان دین محدثین و مفسرین کے اقوال سے، جاء الباطل ص ۸ ج ۱۔

آپ کے اس دعوے کو توڑنے کیلئے کہ قرآن و سنت اور فقہ حنفیہ سے ان کا ثبوت ہے، مگر حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، کہ مبتدعین کے بدعتی عقائد و اعمال کا قرآن و حدیث اور فقہاء کرام کے اقوال سے قطعاً ثبوت نہیں ملتا، ثبوت تو کجا النافقہاء عظام انکے مخصوص عقائد و اعمال کو بدعت کہتے ہیں، باقی مفتی اعظم کا یہ کہنا کہ کسی کے کہنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

یہ بات قابل غور ہے، واقعی کسی کے قول سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، لیکن جب اس پر دلیل شرعی موجود ہو، تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے، اور یہاں دلیل شرعی، کل بدعتہ ضلالہ، (ہر بدعت گمراہی) موجود ہے، اور سنت پر (زیادتی) ہونے کی وجہ سے بھی مردود ہے، مزید تفصیل مولوی احمد رضا خاں کے فتویٰ کے حوالے سے گزر چکی ہے۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

بحر الرائق کا یہ فرمانا کہ قبر پر جا کر بجز زیارت و دعا اور کچھ کرنا مکروہ ہے، بالکل درست ہے، وہ زیارت قبور کے وقت فرماتے ہیں یعنی جب وہاں زیارت کی نیت سے جاوے تو قبر کو چومنا یا سجدہ کرنا وغیرہ ناجائز کام نہ کرے اور یہاں گفتگو ہے دفن کے وقت، یہ زیارت کا وقت نہیں ہے اگر دفن بھی اس میں شامل ہے پھر لازم ہوگا کہ میت کو قبر میں اتارنا، تختہ دینا، مٹی ڈالنا اور بعد دفن تلقین کرنا جس کو فتاویٰ رشیدیہ میں بھی جائز کہا ہے سب منع ہے اس میں مردے کو جنگل میں رکھ کر فاتحہ پڑھ کر بھاگ آنا چاہیے، جاء الباطل ص ۳۱۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ البحر الرائق کی عبارت دراصل، فتح القدر کی ہے جسے انہوں نے وہاں سے نقل کیا ہے،

اور فتح القدر کی عبارت یوں ہے

ويكره النوم عند القبر و قضاء الحاجة و كل مالم يعهد من السنة المعهود
منها ليس الازيارتها والدعاء عندها قائما.

یعنی قبروں کے پاس سونا اور قضائے حاجت (پاخانہ کرنا) اور ہر وہ چیز جو سنت سے ثابت نہیں
وہ مکروہ (حرام) ہے اور (قبر کے پاس) سنت سے ثابت فقط ان کی زیارت کرنا اور پاس کھڑے ہو
کردعا کرنا ہے۔ فتح القدر ص ۱۰۲ ج ۲

اب اگر مفتی صاحب کے مفہوم کو لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ صرف زیارت کے وقت قبر کے
پاس سونا اور قضائے حاجت کرنا منع ہے، اگر دفن کے وقت سویا جائے یا قضائے حاجت کی جائے، تو
جائز ہے، کیونکہ اس عبارت کا تعلق زیارت کے وقت سے ہے نہ کہ دفن کے وقت، انا للہ وانا الیہ
راجعون۔

اگر علماء بریلویہ اس کو تسلیم کرتے ہیں تو مبارک ہو، اگر نہیں کرتے، یقیناً نہیں کرتے، تو پھر
مبتدعین نے کس دلیل سے پہلی بات کو دونوں وقتوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور دوسری کو فقط زیارت
کے وقت، جبکہ الفاظ، قضاء الحاجۃ، کے بعد واو عاطفہ بھی موجود ہے جو اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ
ان کا آپس میں بھی تعلق ہے۔

ثانیاً۔ کتب فقہ کی عبارات کو ایک بار مکرر دیکھ لیجئے، ان کے الفاظ، عند القبر (قبر کے پاس) کے
ہیں، فی القبر (قبر میں) کے نہیں، جب کہ مٹی ڈالنا وغیرہ، فی القبر، ہے، عند القبر، نہیں، اور فقہاء
نے عند القبر (قبر کے پاس) دعا و زیارت کو مسنون قرار دیا ہے، باقی کو مکروہ (حرام) سے تعبیر کیا
ہے، خیر سے مفتی صاحب کی اذان، عند القبر، (قبر کے پاس) ہے، فی القبر (قبر کے اندر) کی مد
سے نہیں، لہذا ثابت ہوا کہ قبر پر اذان دینا مکروہ ہے۔

ثالثاً۔ رہا فتاویٰ رشیدیہ کی عبارت کا جواب تو وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے کیونکہ مولانا
رشید احمد صاحب گنگوہی دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، جو بریلویت کے چند مخصوص عقائد و
اعمال کے سوا مفتی صاحب کے ہم عقیدہ تھے، باقی دفن کے بعد تلقین ہمارے نزدیک بدعت ہے،
تفصیل کیلئے دیکھئے، فتاویٰ اہل حدیث ص ۱۰۷ ج ۲۔ طبع ادارہ احیاء السنۃ النبویہ سرگودھا ۱۹۹۴ء۔

مفتی صاحب کا چوتھا اعتراض

تو شیخ کا فرمانا لیس بشی اسکے معنی یہ نہیں کہ حرام ہے مراد یہ ہے کہ نہ فرض نہ واجب نہ سنت محض جائز اور مستحب ہے اور اس کو سنت یا واجب سمجھنا محض غلط ہے جو فقہاء اس کو بدعت فرماتے ہیں وہ بدعت جائز یا بدعت مستحب فرماتے ہیں نہ کہ بدعت مکروہہ کیونکہ بلا دلیل کراہت ثابت نہیں ہوتی۔ جاء الباطل ص ۳۱۹ ج ۱۔

الجواب۔ اولاً۔ کسی واضح دلیل سے ثابت کیجئے کہ فقہاء نے اسے بدعت مستحب قرار دیا ہے، محض لکھ دینا دلیل نہیں بلکہ اس کیلئے نقل ضروری ہے پھر یہ بھی یاد رہے کہ وہ نقل بھی بادلہ ہو۔
ثانیاً۔ لیس بشی، کا یہ اچھوتا معنی کہ، مستحب ہے، لغت کی کس کتاب میں لکھا ہے اہل زبان جانتے ہیں کہ جب، لیس بشی، بولا جاتا ہے تو اس سے کسی چیز کی نفی مراد ہوتی ہے، چنانچہ آئمہ لغت فرماتے ہیں

و لیس، کلمۃ نفی، یعنی، لیس، نفی کا کلمہ ہے۔

لسان العرب ص ۲۱۲ ج ۶، وتاج العروس ص ۲۴۴ ج ۴۔

علامہ قیومی فرماتے ہیں

لیس، و معناه نفی الخبر فقولک لیس زید قائم۔

یعنی اس سے مراد کسی خبر کی نفی ہوتی ہے جیسا کہ زید کھڑا نہیں،

المصباح المنیر ص ۵۶۱ طبع موسسۃ دار الحجۃ ۱۴۱۲ھ۔

مگر مفتی صاحب کلمہ، لیس بشی، سے اثبات کر رہے ہیں پھر صریحاً جھوٹ بولا کہ شامی کے باب مطلب فی تکبیر التثریق، میں لیس بشی، کا یہ معنی لکھا ہوا ہے کہ

وهو نكرة فی موضع النفی فتعم انواع العبادۃ من فرض و واجب و مستحب

فبقیت الا باحة قیل یتستحب۔ جاء الباطل ص ۳۱۹ ج ۱۔

حالانکہ فتاویٰ شامی میں کوئی ایسی عبارت نہیں، دیکھئے فتاویٰ شامی ص ۷۷ ج ۲، ہاں البتہ درمختار میں یہ عبارت ہے، مگر فتاویٰ شامی والا تو اس کی تردید کرتا ہے چنانچہ علامہ ابن عابدین لکھتے

والحاصل ان الصحيح الكراهة كما في الدرر وبل في البحران ظاهر مافی غاية البيان انها تحريمية و فی النهر ان عباراتهم ناطقة بترجيح الكراهة. خلاصہ کلام یہ کہ صحیح وحق بات یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے جیسا کہ، دررالبحار، میں ہے بلکہ بحر میں ہے کہ غایۃ البیان کے ظاہر (کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ) یہ مکروہ تحریمی ہے اور فتاویٰ النہر میں ہے کہ فقہاء کی عبارات اس کو مکروہ قرار دینے میں ناطق ہیں۔ فتاویٰ شامی ص ۷۷ ج ۲۔

عرفہ کے روز باہر نکل کر عبادت وغیرہ کرنی

مفتی صاحب نے، لیس بشئی، کی تعریف کہاں سے دریافت کی ہے اس کی پوری حقیقت پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بعض لوگ عرفہ کے روز باہر نکل کر اہل عرفہ کی مشابہت میں، ذکر و عبادت کرتے تھے ان کی اس بدعت سیئہ پر روشنی ڈالتے ہوئے امام محمدؒ نے لکھا تھا کہ

والتعريف الذي يصنع الناس ليس بشئ.

یعنی عرفہ کے روز باہر نکل کر جو عوام الناس کرتے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ جامع الصغیر ص ۱۱۵ طبع ادارة القرآن و العلوم الاسلامیہ کراچی ۱۴۱۱ھ۔

امام محمدؒ نے اپنے اس بیان میں عوام الناس کے عمل کی تردید کرتے ہوئے اسے بے اصل قرار دیا ہے، اور شریعت میں اسکی دلیل کی نفی کی ہے، حضرات فقہاء احناف نے امام محمد کے اس قول کی بنیاد پر پورے جزم و یقین کے ساتھ اس بدعت سیئہ کی تردید کی ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے

والتعريف الذي يصنعه الناس ليس بشئ، و هو ان يجتمع الناس يوم عرفة في بعض المواضع تشبيها بالوافقين بعرفة لان الوقوف عرف عبادة مختصة بمكان مخصوص فلا يكون عبادة دونہ كسائر المناسك.

یعنی تعریف جو لوگ کرتے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ (تعریف) یہ ہے کہ لوگ عرفہ

کے دن بعض مقامات پر جمع ہو کر (عبادت کریں) عرفہ میں ٹھہرنے والے لوگوں کی مشابہت میں، (اسکے مردود ہونے کی وجہ یہ ہے کہ) عرفہ میں ٹھہرنا ایک مخصوص عبادت ہے مخصوص مقام کے ساتھ اس کے علاوہ کسی جگہ کوئی عبادت مشروع نہیں جیسا کہ حج کے دیگر ارکان حج کے ساتھ ہی خاص ہیں۔

ہدایہ مع فتح القدیر ص ۴۷ ج ۲

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں

ظاہر مثل هذا اللفظ انه مطلوب الاجتناب.

یعنی ان جیسے الفاظ (لیس بشئ) کا ظاہر مقصود یہ ہے کہ (ان بدعات سے) اجتناب کیا جائے (انھیں) امام ابن ہمام نے آگے چل کر ان لوگوں کی پر زور مذمت کی ہے جو اسے جواز کا لبادہ اوڑھاتے ہیں۔

دیکھئے فتح القدیر ص ۴۷ ج ۲ باب صلاة العیدین۔

علامہ ابن نجیم حنفی کنز الدقائق کی شرح میں فرماتے ہیں

لان الوقوف لما كان عبادة مخصوصة بمكان لم يحز فعله الا في ذلك

المكان كالطواف، وغيره، الا ترى انه لا يجوز الطواف حول سائر البيوت

تشبها بالطواف حول الكعبة، و ظاهره ان الكراهة تحريمية و في الذخيرة من

كتاب الحظر والا باحة التضحية بالديك او بالدجاج في ايام الاضحية ممن

لاضحية عليه لعسرته بطريق التشبيه بالمضحين مكروه لان هذا من رسوم

المجوس.

یعنی عرفہ میں ٹھہرنا ایک مخصوص جگہ کے ساتھ مخصوص عبادت ہے، اس کا کرنا جائز نہیں مگر وہاں

ہی مخصوص مقام پر جیسا کہ طواف کعبہ ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ طواف کرنا جائز نہیں کسی بھی گھر کا

کعبہ کے ساتھ مشابہت کرتے ہوئے، اور ظاہر اس کا یہ ہے کہ (تعریف) مکروہ تحریمی ہے، اور ذخیرہ

میں ہے جسے قربانی دینے کی طاقت نہیں وہ اگر قربانی کرنے والوں کی مشابہت اختیار کر کے مرغی یا

مرغا کی قربانی کرے تو مکروہ ہے کیونکہ یہ مجوسیوں کی رسم ہے، البحر الرائق ص ۱۶۴ ج ۲۔

علامہ جلال الدین الخوارزمی حنفی نے ہدایہ کی شرح میں اس کے مکروہ ہونے پر قاضی ابو یوسف کا قول بھی نقل کیا ہے، الکفایہ ص ۴۸ ج ۲۔
 علامہ حلبی، منیہ، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

وعن مالک انه سئل عنه فقال ليس هذا من امر الناس و انما مفاتيح هذه الاشياء البدع انتهى و مراده بالناس اصحاب رسول الله ﷺ و مالم يكن من امر هم فهو بدعة و البدعة اذا لم تستلزم سنة فهي ضلالة.

حضرت امام مالکؒ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ لوگوں کو حکم نہیں دیا گیا، اور اس جیسی چیزیں بدعات کی چابیاں ہیں (علامہ حلبی فرماتے ہیں کہ) امام مالک کے قول میں لوگوں سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، اور وہ جو حکم دیئے گئے تھے جو اس میں نہیں وہ بدعت ہے اور بدعت جب سنت سے ثابت نہ ہو وہ بدعت سیئہ ہے۔ غنیۃ المستملی ص ۵۷۳۔

فقہاء کرام کی ان عبارات سے ثابت ہوا کہ انہوں نے حضرت امام محمدؒ کے قول، لیس بشئ، سے تعریف کو مکروہ تحریمی اور بدعت سیئہ کہا ہے مگر افسوس کہ مفتی صاحب اس لفظ سے استحباب ثابت کر رہے ہیں۔

باب قبر پر اذان دینے کے دلائل کا تجزیہ مفتی صاحب کی پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ

مشکوٰۃ شریف کتاب الجنائز باب ما ینقل عند من حضر الموت، میں ہے۔

لقنوا موتکم لا الہ الا اللہ

اپنے مردوں کو سکھاؤ، لا الہ الا اللہ، اس حدیث کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ جو مر رہا ہو اس کو کلمہ سکھاؤ، دوسرا یہ کہ جو مر چکا ہو اس کو کلمہ سکھاؤ، پہلے معنی مجازی ہیں اور دوسرے حقیقی اور بلا ضرورت معنی مجازی لینا ٹھیک نہیں، لہذا حدیث کا یہ ہی ترجمہ ہوا کہ اپنے مردوں کو کلمہ سکھاؤ اور یہ وقت دفن کے بعد کا ہے۔ جاء الباطل ص ۳۱۱ ج ۱۔

میت کو تلقین کب کی جائے؟

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب جب کسی شرعی قرینہ سے مجازی معنی متعین ہو جائیں تو انہیں حقیقت کی طرف پھیرنا جائز نہیں، چنانچہ قرآن کریم میں عموماً، اصحاب النار، سے مراد کافر ہیں لیکن یہی الفاظ سورۃ مدثر (آیت ۳۱) میں دوزخ کے داروغہ ملائکہ پر بولا گیا ہے، اب دیکھئے کہ اصحاب النار سے جہنم کا داروغہ مراد لینا مجاز ہے، لیکن چونکہ آگے لفظ، الاملئکۃ، کے موجود ہیں جو اس مجازی معنی کو متعین کر رہے ہیں اس لئے اس کا معنی جہنم میں رہنے والے کافر کرنا غلط ہوگا، گو یہ اس کے حقیقی معنی ہیں مگر اس قرینہ کی وجہ سے جہنم میں رہنے والے کافر مراد لینا غلط ہے۔

بعینہ اس طرح حدیث، لقنوا موتکم، میں جو مر رہا ہے اس کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو، گو مجازی معنی ہے مگر اس پر دلائل شرعی موجود ہونے کی وجہ سے، مرنے کے بعد، پر محمول نہیں کر سکتے، کہ شریعت سے اس کے خلاف دلائل موجود ہیں، اس سلسلہ کی مزید امثلہ ذیل میں ملاحظہ کریں

(۲) اذی، کے لفظ کا لغوی معنی تکلیف ہے لیکن سورۃ بقرہ (آیت ۲۲۲) میں اس کا استعمال

نجاست غلاظت، گندگی، پر ہوا ہے، حالانکہ لغت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

(۳) جرم، قرآن میں اجرام کا لفظ گناہ، قصور، جرم کے معنوں میں آیا ہے، اس کی تو ایک حد

تک لغت سے تائید ہوتی ہے لیکن قرآن نے جرم (ثلاثی مجرد) کو گناہ پر ابھارنا، یا، گناہ میں مبتلا کر دینا، کے معنوں میں استعمال کیا ہے، المائدہ آیت ۲- وھود آیت ۸۹)

(۴) سوء، سوء، بمعنی برائی، سیئہ، برا کام، ساء برا ہونا، اور، اساء، بمعنی برا بنانا، بگاڑنا، اور سوء بمعنی، وہ چیز جو دیکھنے میں بری لگے، کنایہ، اس کا معنی مرد یا عورت کا مقام ستر یا شرمگاہ بھی ہے کہ اس کا کھلنا برا معلوم ہوتا ہے، اور سوء بمعنی لاش، اس کا کنائی معنی بھی نہیں، نہ ہی لغت سے اس کی تائید ہوتی ہے مگر سورۃ المائدہ آیت ۳۱ میں دو بار یہ لفظ لاش کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور مشکل یہ کہ کوئی اور معنی فٹ بھی نہیں بیٹھتا۔

(۵) قطف، چنے ہوئے پھل، اور خصوصاً، انگور کا گچھا، پر بولا جاتا ہے جب کہ وہ چٹا جائے اور اس کی جمع قطف اور قطوف آتی ہے مگر قرآن نے یہ لفظ ایسے کچھوں یا خوشوں کیلئے بولا ہے جو پک تو چکے ہوں مگر ابھی درخت پر ہی لگے ہوں۔ الحاقہ - آیت ۲۳) و الدھر آیت ۱۲۔

(۶) نخلۃ کا معنی کسی کو کچھ دینا، مگر قرآن میں بمعنی، دل کی خوشی آیا ہے (النساء آیت ۴) حالانکہ لغت میں اس کا معنی دینا یا عطیہ دینا تو ہو سکتا ہے لیکن دل کی خوشی سے کرنا لغت میں موجود نہیں۔ منقول از مترادفات القرآن ص ۹۹۸۔

اس طرح کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر اختصار کی وجہ سے انہی چند امثلہ پر اکتفا کر رہا ہوں۔

اب ان الفاظ کے معنوں کیلئے لغت لیکر بیٹھ جانا دیانت داری نہیں بلکہ پرلے درجے کی حماقت ہے، کیونکہ شرعی طور پر ان کے معنی متعین ہو چکے ہیں اس مختصر تمہید کے بعد ہم عرض کرتے ہیں کہ حقیقت کی تین قسمیں ہیں، حقیقت وصفی، حقیقت عربی، حقیقت شرعی، دیکھئے نور الانوار ص ۹۵۔

اور زیر بحث روایت کا معنی جو مر رہا ہے اسے کلمہ شہادت کی تلقین کرو، حقیقت شرعی ہے، مجاز قطعاً نہیں، چنانچہ یہی روایت صحیح ابن حبان میں مروی ہے، جس کے راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں فرماتے ہیں۔

قال رسول ﷺ لقنوا موتاكم لا اله الا الله فانه من كان آخر كلمته لا اله الا

اللہ عند الموت دخل الجنة. الحديث.

یعنی رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ اپنے مرنے والے کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو کیونکہ جس کا آخری کلمہ وفات کے وقت لا الہ الا اللہ ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔

صحیح ابن حبان ص ۴۶ ج ۲ رقم الحدیث ۲۹۹۳۔ (وموارد الظمان رقم الحدیث ۷۱۹)

یہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن درجہ سے کم نہیں

حافظ ابن حجرؒ نے، التلخیص ص ۱۰۲ ج ۲ میں اس روایت پر سکوت اختیار کیا ہے اور احناف کو مسلم ہے کہ جس روایت پر حافظ ابن حجر تلخیص، میں سکوت اختیار کریں وہ کم از کم حسن درجے کی ہوتی ہے، دیکھئے دین الحق ص ۵۲۳۔

اس حدیث نے لفظ الموتکم کے معنی متعین کر دیئے کہ، من قرب منکم الموت، یعنی جو تم سے موت کے قریب ہو، اس پر مزید روایات بھی مروی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

قال رسول اللہ ﷺ من لقن لا الہ الا اللہ عند الموت دخل الجنة.

یعنی جس نے موت کے قریب لا الہ الا اللہ کی تلقین قبول کی وہ جنت میں جائے گا، معجم طبرانی اوسط ص ۴۹۶ ج ۴۔

یہی روایت مسند امام احمد ص ۴۷۴ ج ۴ میں مرسل مروی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں

قال رسول اللہ ﷺ من لقن لا الہ الا اللہ فمات قالہا عند موته

و جبت لہ الجنة. الحديث

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے مردوں کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو کیونکہ جس نے وفات

وقت کلمہ شہادت کہا اس کیلئے جنت واجب ہوگئی۔

طبرانی کبیر ص ۱۹۷ ج ۱۲، و مجمع الزوائد ص ۳۲۶ ج ۲۔

گو ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت عطاء کے اختلاط اور ابن عباس کی انقطاع کی وجہ سے ضعیف

ہے مگر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث سے شواہد کیلئے کوئی مضائقہ نہیں کہ ابن حبان کی روایت

نے اس کے معنی کو متعین کر دیا ہے۔

ثانیاً۔ تلقین سے مقصود تو مرنے والے کو لقمہ دینا ہے کہ وہ اپنی زبان سے جو آخری بات کرے وہ کلمہ شہادت پڑھ رہا ہو، اور بموجب فیصلہ نبوی جس کا آخری کلمہ یہ ہوگا وہ جنت میں داخل کیا جائے گا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ راوی ہیں

قال رسول الله ﷺ من كان آخر كلامه لا اله الا الله دخل الجنة.

یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا آخری کلام کلمہ شہادت ہوگا وہ جنت میں جائے گا، سنن ابوداؤد مع عون ص ۱۵۹ ج ۳، و مسند امام احمد ص ۲۳۳ ج ۵، و مستدرک حاکم ص ۳۵۱ ج ۱۔
اس فیصلہ الہی کی وجہ سے اللہ رب العزت کے محبوب پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی امت کو از راہ شفقت یہ تعلیم دی کہ مرنے والے کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو تا کہ جب وہ اس دنیا سے جائے تو رب العالمین کی توحید اور اس کے نبی کی رسالت کی گواہی پر جائے مگر یار لوگوں نے اسے بعد از دفن کی تلقین بدعت پر نمود کر لیا ہے، یہ ہیں فقہ کے ٹھیکے دار۔

اکابرین احناف سے حدیث کا معنی

ضرورت تو نہ تھی مگر ہم مبتدعین پر اتمام حجت اور عوام کی تفہیم کیلئے اکابرین احناف سے اس روایت کا معنی دکھاتے ہیں تاکہ حضرت مفتی صاحب اور ان کے چیلوں چاسوں کا مکرو فریب پوری طرح آشکارا ہو کر دم توڑ جائے۔

(۱) ملا علی القاری حنفی مشکوٰۃ کی شرح میں فرماتے ہیں

لقنوا موتا کم لا اله الا الله، ای ذکر وا من حضره الموت منکم بکلمۃ التوحید.

یعنی، لقنوا موتا کم، کا معنی ہے، جب تم میں سے کسی کی موت حاضر ہو، تو اسے کلمہ توحید یاد کراؤ،
مرقاۃ ص ۱۲ ج ۴۔

(۲) شیخ عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں

لقنوا موتا کم لا الہ الا اللہ، تلقین کنید مردہ ہمارے خود را یعنی آنها کہ نزدیک بمردن رسیدہ اند کلمہ طیبہ را۔

یعنی حدیث، لقنوا موتا کم، کا معنی اپنے مردوں کو کلمہ طیبہ کی تلقین کرو جب وہ مرنے لگے۔ اشعۃ الدمعات ص ۷۰۴ ج ۱۔

(۳) مولوی قطب الدین حنفی ترجمہ مشکوٰۃ میں اس حدیث کا معنی کرتے ہیں کہ تلقین کرو ان شخصوں کو کہ قریب مرنے کے ہیں، کلمہ لا الہ الا اللہ، کی، مظاہر حق ص ۲۹ ج ۲ طبع نول کشور، ۱۹۳۴ء، (۴) صاحب ہدایہ فرماتے ہیں

و لقن الشہادتین لقولہ ﷺ لقنوا موتا کم شہادۃ أن لا الہ الا اللہ والمراد الذی قرب من الموت۔

یعنی مرنے والے کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ اپنے مردوں کو کلمہ شہادت سکھاؤ، سو اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی موت قریب آچکی ہو۔ ہدایہ مع فتح القدیر ص ۲۸ ج ۲۔

(۵) علامہ ابن نجیم حنفی فرماتے ہیں

و لقن الشہادۃ بان یقال عنہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ولا یومر بہا للحديث الصحيح من كان آخر كلامه لا الہ الا اللہ دخل الجنة وهو تحريض علی التلقین بہا عند الموت۔

اور کلمہ شہادت کی تلقین (کا طریقہ یہ ہے کہ) اس (مرنے والے) کے پاس لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا جائے اور اسے پڑھنے کو نہ کہا جائے، کیونکہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جس کا مرتے وقت آخری کلمہ لا الہ الا اللہ ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور تلقین کی ترغیب موت کے وقت دلائی گئی ہے۔ البحر الرائق ۷۰ ج ۲۔

(۶) علامہ حلبی، منیۃ المصلیٰ کی شرح میں فرماتے ہیں

و یلقن الشہادۃ لما روی الجماعۃ الا البخاری انه علیہ السلام قال لقنوا موتا کم شہادۃ ان لا الہ الا اللہ والمراد من قرب من الموت۔

یعنی مرنے والے کو کلمہ شہادت کی تلقین کی جائے کیونکہ ایک جماعت محدثین نے امام بخاری کے سوا یہ حدیث روایت کی ہے کہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے، اپنے مردوں کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو، سو، موتا کم، کا معنی ہے جس کی اجل قریب ہو، اسے تلقین کرو۔، حلبی کبیر ص ۵۷۶ طبع سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۰۸۔

(۷) مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی جو ماضی قریب میں خفیت کے نامور وکیل گزرے ہیں فرماتے

ہیں

والمراد بالمیت من قرب من الموت.

یعنی حدیث کے الفاظ، موتا کم، سے مراد ہے جس کی اجل قریب ہو۔ عمدۃ الرعایۃ ص ۲۰۵ ج ۱ حاشیہ ۱۲، طبع ایچ ایم سعید۔

(۸) علامہ کاسانی فرماتے ہیں کہ

و یلقن کلمۃ الشہادۃ لقول النبی ﷺ لقنوا موتا کم لا الہ الا اللہ والمراد من المیت المحتضر لانہ قرب موتہ فسمی میتا لقربہ من الموت قال اللہ تعالیٰ انک میت وانہم میتون.

یعنی نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق کلمہ شہادت کی تلقین کرنی چاہیے، اور موتا کم، سے مراد مختضر (موت میں مبتلا شخص) ہے کیونکہ اس کی اجل قریب ہے اور اسے میت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی موت قریب ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد، انک میت وانہم میتون، ہے، بدائع الصنائع ص ۲۹۹ ج ۱،

محدثین کرام سے حدیث کا معنی

فن حدیث سے تھوڑا بہت مس رکھنے والا جانتا ہے کہ محدثین کرام نے حدیث رسول کی حفاظت اور اس کی تدوین و ترتیب میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں، حقیقت میں یہی لوگ اس فن کے وارث تھے

اس مقدس گروہ نے جس طرح اقوال الرسول کے الفاظ کی صحت کا خیال رکھا اسی طرح معنی و

مفہوم کو بگاڑنے سے بچایا اور بدعت پسند حضرات کی تحریفات کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سپرد خاک کر دیا، آئیے انہیں سے ہی معنی معلوم کر لیں کہ، موتاکم، کا کیا معنی و مفہوم ہے۔

(۱) امام ترمذی فرماتے ہیں

ان یلقن المريض عند الموت قول لا اله الا الله.

یعنی مریض کو موت کے وقت کلمہ کی تلقین کی جائے،

ترمذی مع تحفہ ص ۱۲۸ ج ۲۔

(۲) امام ابن حبان اپنی صحیح میں اسی حدیث کو روایت کر کے پھر اس کا معنی بیان کرتے ہوئے

تحریر کرتے ہیں

عن معقل بن یسار قال قال رسول الله ﷺ اقروا علی موتاکم ینس، قال ابو

حاتم رحمۃ اللہ، قوله اقروا علی موتاکم ینس، اراد به من حضرته المنیۃ لان

المیت یقرا علیہ، و کذا لک قوله ﷺ لقنوا موتاکم لا اله الا الله.

یعنی حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے مردوں پر

یس پڑھو۔

امام ابو حاتم فرماتے ہیں اس سے مراد، جس کی موت حاضر ہو اس پر نزع کے وقت پڑھو، اسی

طرح لقنوا موتاکم، میں بھی نزع کے وقت تلقین کرنا مراد۔

صحیح ابن حبان ص ۳۶۲ زیر رقم الحدیث ۲۹۹۱۔

(۳) امام ابن حزم فرماتے ہیں

و یجب تلقین المیت الذی یموت فی ذہنہ و لسانہ منطلق او غیر منطلق، لما

روینا لقنوا موتاکم. ملخصاً

یعنی مردے کو تلقین کرنا واجب ہے نزع کے وقت جب اس کی آنکھیں پھٹ چکی ہوں اور

زبان صاف ہو یا نہ ہو جیسا کہ حدیث میں ہے کہ، لقنوا موتاکم،

الحلی بالآثار ص ۳۸۴ ج ۳۔

جن محدثین کرام نے اسے روایت کیا ہے انہوں نے بھی اس کا یہی معنی بیان کیا ہے کہ قریب

المرگ انسان کو کلمہ کی تلقین کرو، کسی ایک نے بھی اس پر ذن کے بعد تلقین کا باب نہیں باندھا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اس حدیث کا مفہوم قریب المرگ انسان ہے نہ کہ جو فوت ہو کر ذن کیا جا چکا ہو۔

برصغیر کے علماء اہل حدیث سے معنی

یہی معنی علماء حدیث نے اس کا بیان کیا ہے چنانچہ علامہ سندھی مرحوم (جو ماضی قریب میں ایک علمی شخصیت گئے گئے ہیں) فرماتے ہیں

(۱) لقنوا موتا کم المراد من حضره الموت لامن مات.

یعنی لقنوا موتا کم، سے مراد ہے جس کی موت حاضر ہو اسے تلقین کرو، نہ کہ جو مر چکا ہو۔ حاشیہ سندھی علی التسانی ص ۲۱۱ ج ۱ سلفیہ۔

(۲) مولانا شمس الحق محدث عظیم آبادی فرماتے ہیں۔

ای ذکر و ا من حضره الموت منکم بکلمۃ التوحید او بکلمتی الشہادۃ.

یعنی جب تم میں سے کسی کی موت قریب ہو تو کلمہ شہادت یاد دلاؤ، عون المعبود شرح سنن ابی داؤد ص ۵۹ ج ۳۔

(۳) مولانا محمد عبد الرحمان محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

اعلم ان المراد من الموتی فی ہذا الحدیث من حضره الموت لا المیت

یعنی معلوم ہونا چاہیے کہ اس حدیث میں، موتی، سے مراد جس کی اجل قریب ہو نہ کہ جو فوت ہو چکا ہو۔ حنفیۃ الاحوذی شرح ترمذی ص ۱۲۷ ج ۲۔

(۴) نواب صدیق حسن خاں محدث قنوجی فرماتے ہیں

ای من حضره الموت، یعنی جس کی اجل قریب ہو اسے تلقین کرو،

السراج الوہاج شرح صحیح مسلم ص ۲۸۸ ج ۱۔

(۵) مولانا عبید اللہ رحمانی محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

ای الذین ہم فی سیاق الموت، یعنی انہیں کلمہ کی تلقین کرو جو موت کی کش مکش میں مبتلا

ہیں، مرعۃ شرح مشکوٰۃ ص ۳۰ ج ۵۔

بریلوی مکتب فکر کے علماء کرام سے معنی

مبتدعین کے امتیازی مسائل چونکہ بدعات ہیں، اس لئے ان کے علماء نے انہیں کے دلائل و براہین کو جمع کرنے میں علمی زور صرف کیا ہے، انہیں قرآن و سنت کی تشریح و توضیح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اس وجہ سے ماضی قریب میں بریلوی مکتب فکر کی کوئی قابل ذکر حدیثی خدمت نظر سے نہیں گزری، جس کی وجہ سے گزرے ہوئے مبتدعین سے اس حدیث کے معنی کے متعلق کوئی قول لانا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

علمائے اہل حدیث کی دیکھا دیکھی موجودہ دور کے مبتدعین کے دل میں تراجم صحاح ستہ کا جذبہ ابھرا ہے اور انہوں نے بڑے ولولہ کے ساتھ ان تراجم کو شائع کیا ہے جس میں انہوں نے اس حدیث کا معنی حسب ذیل کیا ہے۔

(۱) مولانا غلام رسول سعیدی صاحب، ان کے حلقہ میں ایک علمی شخصیت سمجھے جاتے ہیں خیر سے دارالعلوم نعیمہ کراچی کے شیخ الحدیث اور شارح صحیح مسلم ہیں، سعیدی صاحب اس حدیث کا معنی کرتے ہیں

قال رسول الله ﷺ لقنوا موتاكم لا اله الا الله.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے مرنے والوں کو، لا اله الا الله کی تلقین کرو۔ شرح صحیح مسلم ص ۴۱ ج ۲۔

سعیدی صاحب آگے چل کر اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام نووی کے حوالے سے فرماتے ہیں

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ تلقین مستحب ہے البتہ اس کی کثرت اور اس پر اصرار مکروہ ہے کیونکہ جو شخص مرض الموت میں مبتلا ہو وہ تکلیف اور کرب میں ہوتا ہے، بار بار تلقین کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ اس کے دل میں کلمہ سے کوئی تنگی آجائے یا وہ زبان سے انکار کر دے اور جب مرنے

والا ایک بار کلمہ پڑھ لے تو اس سے دوبارہ پڑھنے کیلئے اصرار نہ کیا جائے الا یہ کہ وہ کلمہ پڑھنے کے بعد کوئی اور بات کرے کیونکہ حدیث کے مطابق اس کا آخری کلام، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ہونا چاہیئے، شرح صحیح مسلم ص ۷۸۳ ج ۲، طبع فرید بک شال ۱۹۹۴ء۔

(۲) مولوی محمد صدیق ہزاروی بریلوی اس حدیث کا معنی کرتے ہیں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اپنے قریب المرگ لوگوں کو کلمہ توحید کی تلقین کرو، مترجم ترمذی ص ۵۰۶ ج ۱ طبع فرید بک شال لاہور ۱۹۸۴ء۔

(۳) مولوی عبد الحکیم خاں اختر شاہ جہانپوری (بریلوی) اس حدیث کا معنی کرتے ہیں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے مرنے والوں کو اس بات کی تلقین کرو کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ۔

مترجم ابو داؤد ص ۵۲۲ ج ۲ طبع فرید بک شال ۱۹۸۴ء، و مترجم ابن ماجہ ص ۴۱۵ ج ۱، طبع ایضاً۔

مفتی صاحب کی ایک نئی دریافت:

قارئین کرام جب آپ نے حدیث کے معنی و مفہوم کو بخوبی جان لیا، تو اب غور کیجئے کہ اس

حدیث کو اذان قبر سے کیا نسبت ہے، کیا اذان اور تلقین ایک چیز ہیں؟

افسوس پہلے تو مفتی صاحب نے حدیث کے مفہوم کو بگاڑا، پھر اس الٹے مفہوم پر یہ عمارت تعمیر

کر لی کہ چونکہ اذان میں کلمہ بھی ہے اس لئے یہ اذان بھی تلقین میت ہے، جاء الباطل ص ۳۱۲ ج ۱۔

اگر اذان بھی تلقین ہے تو کیا مبتدعین نے کبھی مرنے والے کو اذان بھی سکھائی ہے، نہیں قطعاً

نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ اذان تلقین ہی نہیں۔

مفتی صاحب کا استدلال بالکل، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا، کا مصداق

ہے۔

اگر آج کوئی یہ استدلال کرے کہ لغت میں صلوٰۃ دعا اور نماز کو کہتے ہیں، اور فتن کے بعد قبر

پر آپ علیہ السلام سے صلوٰۃ بمعنی دعا ثابت ہے، لہذا قبروں پر کھڑے ہو کر فرض نماز ادا کرنی چاہیے

کیونکہ صلوٰۃ بمعنی نماز بھی آیا ہے، یا نماز کی بجائے دعا ہی کر لی جائے کہ اے اللہ مجھے معاف فرما،

تو اس سے نماز ادا ہو جاتی ہے اور دعا مانگنے والے سے فرض ساقط ہو کر اللہ کے ہاں اس کی نماز قبول

ہو جاتی ہے۔

ایسے مجتہد کو علماء بریلوی بھی دماغی آپریشن کا مشورہ دیں گے اس لئے کہ اس کا یہ اجتہاد امر واقعہ میں غلط ہے، اور شارع علیہ السلام کے تعامل کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

مشکوٰۃ باب فضل الاذان میں ہے کہ

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بلال کی اذان سے رمضان کی سحری ختم نہ کرو، وہ لوگوں کو جگانے کیلئے اذان دیتے ہیں معلوم ہوا کہ زمانہ نبوی میں سحری کے وقت بجائے نوبت یا گولے کے اذان دی جاتی تھی لہذا سوئے کو جگانے کیلئے اذان دینا سنت سے ثابت ہے، جاء الباطل ص ۳۱۳ ج ۱۔

کیا سحری کی اذان سے قبر کی اذان ثابت ہوتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان رمضان المبارک میں لوگوں کو سحری کھانے کی طرف متوجہ کرنے کیلئے ہوتی تھی، جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں

عن النبی ﷺ قال لا یمنعن احدکم او احد امنکم اذان بلال من سحورہ فانہ یوذن اوینا دی بلیل لیرجع قائمکم و لینیہ نائمکم۔ الحدیث۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلال کی اذان کے سبب تم میں سے کوئی شخص سحری کھانے سے نہ رکے، اس لئے کہ وہ رات کو اذان دیتے ہیں تاکہ نماز میں مشغول شخص سحری کھانے کیلئے گھر لوٹ جائے (اور گھر میں) سویا ہوا شخص بیدار ہو جائے۔ بخاری ص ۸۷ ج ۱، و مسلم ص ۳۵۰ ج ۱۔

اس حدیث سے اگر کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ کہ رمضان المبارک میں سحری کیلئے اذان دی جائے تاکہ لوگ سہولت سے روزہ رکھ لیں، الحمد للہ جماعت اہل حدیث اس پر عامل ہے مگر مبتدعین کا گروہ اس سنت کا عملی طور پر منکر ہے، یہ حضرات سحری کی اذان سے چڑکھاتے ہیں اور اذان کی بجائے شرکیہ شعرو شاعری سے کام چلاتے ہیں، جو کہ فبیح ترین بدعت ہے۔

ثانی۔ عقل کے ناخن لو اس حدیث میں اذان قبر کا کیا ثبوت ہے یہ تو زندوں کے لئے اذان کہی جاتی تھی مگر مفتی صاحب اسے مردوں کیلئے باور کراتے ہیں کیا مبتدعین کے نزدیک زندہ اور مردہ برابر ہیں، اگر نہیں یقیناً نہیں، تو پھر اس حدیث سے مردوں کیلئے اذان ثابت کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

اذان کی آواز سے شیطان بھاگتا ہے، مشکوٰۃ باب الاذان میں ہے کہ

اذا نودی للصلوة ادبر الشيطان له ضراط حتى لا يسمع التأذين.

جب نماز کی اذان ہوتی ہے تو شیطان گوز لگاتا ہوا بھاگتا ہے یہاں تک کہ اذان نہیں سنتا۔

اور جس طرح کہ بوقت موت شیطان مرنے والے کو ورغلاتا ہے تاکہ ایمان چھین لے اسی طرح قبر میں بھی پہنچتا ہے اور بہکاتا ہے کہ تو مجھے خدا کہہ دے تاکہ میت اس آخری امتحان میں فیل ہو جاوے۔

چنانچہ نوادر الاصول میں امام محمد علی ترمذی فرماتے ہیں

ان الميت اذا سئل من ربك يري له الشيطان فيشير الى نفسه انى انا ربك

فلهذا ورد سوال التثبت له حين سئل.

یعنی جبکہ میت سے سوال ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے تو شیطان اپنی طرف اشارہ کر کے کہتا

ہے کہ میں تیرا رب ہوں اسی لئے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نے میت کے سوالات کے وقت اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعا فرمائی ہے۔

اب اذان کی برکت سے شیطان دفع ہو گیا میت کو امن مل گئی اور بہکانے والا گیا، جاء الباطل

ص ۳۱۳ ج ۱۔

کیا شیطان کو بہکانے کے لئے اذان دی جاسکتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ حدیث کے الفاظ ہمارے پیش نظر ہیں، اذا نودی للصلوة الخ یعنی جب نماز

کیلئے اذان کہی جاتی ہے تو شیطان..... یہ نہیں فرمایا، اذان اودی للمیت، الخ یعنی جب میت کیلئے اذان دی جاتی ہے تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ شیطان کا بھاگنا فقط نماز کی اذان سے ہے نہ کہ میت کیلئے اذان کہنے سے شیطان بھاگتا ہے۔

ثانیاً۔ اگر بالفرض مبتدعین کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ جب بھی اذان کہی جائے تو شیطان بھاگتا ہے (حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ حدیث میں عموم نہیں بلکہ خصوص ہے) تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ قبر میں شیطان مومن کو بہکاتا ہے اور اذان کہنے سے بھاگ جاتا ہے اور قبر میں شیطان کے بہکانے کی جو دلیل مفتی صاحب نے رقم فرمائی ہے وہ تو خود دلیل کی محتاج ہے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں بلکہ ایک تابعی کا قول ہے جس سے عقیدہ ثابت نہیں ہو سکتا، اس کیلئے تو نص قطعی اور حدیث صحیح درکار ہے جو خیر سے مبتدعین کے پاس قطعاً نہیں۔

شرعی اصول کا یہ تقاضا ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے اور اسی میں اغوائے شیطان کا خطرہ رہتا ہے، قبر تو دار الجزا کی ایک کڑی ہے جس میں اغوائے شیطان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں

ان القبر اول من منازل الآخرة، الحدیث عن عثمان رضی اللہ عنہ.

یعنی قبر قیامت کی منازل سے پہلی منزل ہے، الحدیث، ترمذی مع تحفہ ص ۲۵۸ ج ۳، وابن ماجہ ص ۳۲۵، و مستدرک حاکم ص ۱۳۷ ج ۱، و بیہقی ص ۵۶ ج ۴، و مسند امام احمد ص ۶۳ ج ۱۔

تو کیا فریق ثانی قیامت کے روز بھی اغوائے شیطان کا قائل ہے۔

ثالثاً۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور امر بالمعروف صدقہ و خیرات اور لوگوں سے حسن سلوک وغیرہ اعمال صالحہ سے قبر میں میت مکر نکیر سے محفوظ رہتی ہے اور بندے کے یہ اعمال اس کی حفاظت کرتے ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب میت کو اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو وہ پلٹنے والوں کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے پھر اگر وہ مومن ہے تو نماز اس کے سر کے پاس آجاتی ہے اور روزے اس کی دائیں جانب اور زکوٰۃ بائیں جانب اور بقیہ نیکی کے کام صدقہ و خیرات (نفلی) نماز امر بالمعروف اور لوگوں سے احسان و مروت کیا ہوا اس کے پاؤں کی

طرف آجاتا ہے، پھر جب فرشتے اس کے سر کی طرف سے آتے ہیں تو نماز کہتی ہے کہ میری طرف سے تمہیں آنے کا راستہ نہیں،

پھر وہ اس کی دائیں طرف سے آتے ہیں تو روزے (انہیں روکتے ہیں) اور کہتے ہیں کہ ہماری طرف سے تمہارے لئے کوئی راستہ نہیں، پھر وہ اس کی بائیں طرف سے آتے ہیں تو زکوٰۃ (منع کرتی ہے) اور کہتی ہے میری جانب سے تمہارے لئے راستہ نہیں، پھر وہ اس کے پاؤں کی طرف سے آتے ہیں تو اس وقت اس کے اعمال صالحہ صدقات وغیرہ انہیں روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری طرف سے تمہیں کوئی راستہ نہیں۔ الحدیث۔

صحیح ابن حبان رقم الحدیث ۳۱۰۳، ص ۴۵ ج ۶ طبع مکتبۃ الاثریہ سانگلہ ہل، و المعجم الاوسط للطبرانی ص ۳۰۱ ج ۳، و مستدرک حاکم ص ۳۸۰ ج ۱، و ابن ابی شیبہ، و بیہقی، و ابن مردویہ کذا فی در المنثور ص ۸۰ ج ۴.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ میت کے اعمال صالحہ اس کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ منکر و نکیر کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے مگر مبتدعین کا باوا آدم ہی نرالا ہے وہ اس کے برعکس اغوائے شیطان کے قائل نظر آرہے ہیں، پھر اس پر یہ عمارت قائم کر لی ہے کہ شیطان کو دور کرنے کیلئے اذان دی جاتی ہے۔

رابعاً۔ شیطان مردود تو انسان کی زندگی کے ہر لمحہ ساتھ رہتا ہے، حدیث صحیح میں موجود ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں

قال رسول الله ﷺ مامنكم من احد الا وقد و كل به قرينه من الجن. الحدیث.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک (بھی ایسا) نہیں مگر یہ کہ اس کے ساتھ ایک شیطان مقرر کیا گیا ہے۔

مسند احمد ص ۴۶۰ ج ۱، و ص ۳۸۵ ج ۱، و ص ۲۰۱ ج ۱، و صحیح مسلم ص ۳۷۶ ج ۲، و نصب الراية ص ۴۳۲ ج ۱.

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ان الشیطان یجرى من الانسان مجرى الدم. الحدیث.

یعنی شیطان انسان میں خون کی طرح گردش کرتا ہے،

بخاری ص ۲۷۳ ج ۱، و مسلم ص ۲۱۶ ج ۲۔

یہ حدیث اس چیز کی برہان قاطع ہے کہ انسان کے ساتھ ہر وقت شیطان لعین رہتا ہے جو اسے برائی پر انگیکھتہ کرتا ہے۔

تو کیا فریق ثانی شیطان کو دور کرنے کیلئے ہر دم اذان کہنے کیلئے تیار ہے، علاوہ ازیں احادیث صحیحہ سے کئی مقامات پر بالخصوص شیطان لعین کا آنا ثابت ہوتا ہے جس کی امثلہ حسب ذیل ہیں

(۱) ان رسول اللہ ﷺ قال یعقد الشیطان علی قافیۃ راس احد کم اذا هونام

ثلث عقد. الحدیث.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے سر کی گدی پر شیطان مردود تین گرہیں لگاتا ہے، جب وہ سوتا ہے۔

بخاری ص ۱۵۳ ج ۱، و مسلم ص ۲۶۵ ج ۱، و ابو داؤد، رقم الحدیث

۱۳۰۶، و ابن ماجہ رقم ۱۳۲۹، و صحیح ابن خزیمہ رقم ۱۱۳۱، و مسند

حمیدی رقم ۹۶۰، و مسند احمد ص ۲۴۳ ج ۲، و بیہقی ص ۵۰۱ ج ۲، وغیرہ۔

بلکہ اس سے بڑھکر ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ سے سوال ہوا کہ ایک ایسا شخص جو ساری

رات سویا اور سورج طلوع ہونے کے بعد بیدار ہوا اور نماز نہ پڑھ سکا، فرمایا

بال الشیطان فی اذنه، اس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا تھا۔ بخاری

ص ۱۵۳ ج ۱، و مسلم ص ۲۶۴ ج ۱، و مسند احمد ص ۲۶۰ ج ۲۔

کیا فرماتے ہیں مبتدیین کے مفتیان کرام کہ کبھی انہوں نے یہاں بھی اذان کہنے کو مستحب یا

پھر سنت کہا ہے؟ اور کبھی اس پر عمل کیا ہے کہ مولوی پیر مفتی اعظم حکیم الامت، تو بستر پر استراحت

فرمانے لگے ہوں اور باوفا مرید اور شاگرد اذان دیکر شیطان کو بھگانے کی فکر میں ہوں، کہ کہیں

ہمارے شیخ کی گدی پر شیطان گرہ و گانٹھ نہ لگا دے بلکہ عزت مآب کے کان میں پیشاب نہ کر دے۔

اگر مبتدعین ایسا کرتے ہیں تو مبارک ہو، اگر نہیں! تو وجہ فرق بیان کیجئے؟۔

(۲) اب مبتدعین کے مولوی صاحب پیر صاحب مفتی اعظم وغیرہ صاحب بیدار ہو کر مسجد کی طرف چلے جا رہے ہیں صبح کے وقت عموماً قضاے حاجت کی ضرورت ہوتی ہے، اب بالفرض وہ قضاے حاجت کیلئے جاتے ہیں، تو اب بھی اذان کی ضرورت پیش آئیگی، کیونکہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ان هذه الحشوش محتضرة

یعنی قضاے حاجت کے مقامات پر شیاطین موجود رہتے ہیں۔ الحدیث

ابوداؤد مع عون ص ۶ ج ۱، و ابن ماجہ ص ۲۶، و مسند احمد ص ۳۶۹ ج ۴، و بیہقی ص ۹۶ ج ۱، و مستدرک حاکم ص ۱۸۷ ج ۱، و ابن خزیمہ رقم ۹۹، و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۱۰، ۲۵۳ ج ۱، و طبرانی کبیر ص ۲۳۲ ج ۵۔

یہی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، المعجم الاوسط للطبرانی ص ۳۸۲ ج ۳، و ص ۳۶۰ ج ۷۔

مجدد بریلویت مولوی احمد رضا خاں اور اس کا پوتا شاگرد مولوی و مفتی احمد یار خاں نے کبھی اسے بھی مستحب و مباح قرار دیا تھا؟ اور اس پر کبھی انہوں نے عمل بھی کرایا تھا کہ خود تو قضاے حاجت میں مصروف ہوں اور چیلے ان سے شیطان بھگانے کی نیت سے اذان کہہ رہے ہوں، اگر نہیں قطعاً نہیں، تو وجہ فرق بیان کیجئے؟۔

(۳) مبتدعین کے اکابرین جب وضو سے فارغ ہو کر مسجد کی طرف آئیں گے راستہ میں اذان کہنی پڑے گی کیونکہ نماز ادا کرنے کیلئے جانا ایک عظیم الشان اسلامی فرض کو ادا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا شمار بہترین اعمال صالحہ میں ہوتا ہے اور نیک کام سے روکنا اور جاتی دفعہ وسوساں ڈالنا شیطان کا مشغلہ ہے، حدیث صحیح میں آتا ہے کہ حضرت سبرۃ بن ابی فاکہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

سمعت رسول الله ﷺ يقول ان الشيطان قعد لابن آدم باطرقه۔

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ابن آدم کیلئے (نیکی کے) راستوں پر شیطان (بھکانے کیلئے) بیٹھتا ہے۔ الحدیث

سنن نسائی ص ۵۰ ج ۲، ومسند احمد ص ۲۸۳ ج ۳، وطبرانی کبیر ص ۱۳۸ ج ۷، ومصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۹۳ ج ۵، وتاریخ کبیر للبخاری ص ۷۸ ج ۴، وکنز العمال رقم ۱۰۵۶۹۔

(۴) جب نماز کیلئے اقامت ہو جائے گی تو مبتدعین کے اکابرین حسب عادت صف بندی کرتے ہوئے درمیان میں بالشت بھر جگہ چھوڑ چھوڑ کر کھڑے ہونگے، اور ان مقامات پر مبتدعین کے اکابرین کے درمیان پہلو بہ پہلو شیطان بھی کھڑا ہو جائے گا کیونکہ ایسے مقامات پر آنے کی صراحت امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے دی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ رصوا صفو فكم وقار بوا بينها وحاذوا بالا عناق فوالذي نفسي بيده اني لارى الشيطان يدخل من خلل الصف كانها الحذف.

یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنی صفوں کو ملا کر رکھو اور نزدیکی کرو صفوں کے درمیان اور برابر رکھو گردنیں مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے بیشک میں دیکھتا ہوں شیطان کو کہ داخل ہوتا ہے صفوں کے شکافوں میں، گویا کہ وہ سیاہ بچہ ہے، بکری کا۔

سنن ابی داؤد مع عون ص ۲۰۵ ج ۱ و نسائی (مجتبى) ص ۹۳ ج ۱، و صحیح ابن خزيمة ص ۲۲ ج ۳، و بیہقی ص ۳۰۰ ج ۳۔

یہاں شیطان کو دور کرنے کیلئے مبتدعین کو اذان کہنی پڑھے گی اور اذان کہنے کیلئے ایک شخص کو مقرر کرنا پڑے گا۔

(۵) پھر عین ممکن ہے کہ صبح کی نماز ہو اور مقتدیوں میں سے کسی ایک کو انگڑائی آجائے اور وہ منہ کھول کر جمائی لے اور منہ پر ہاتھ رکھنا بھول جائے، تو اب بھی اذان کہنی پڑے گی کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ تب شیطان منہ میں داخل ہو جاتا ہے چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ اذا تثنأوب احدكم فى الصلوة فليكظم ما استطاع فان

الشیطان یدخل .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کو نماز میں جمائی آئے تو وہ اسے حتی المقدور روکے کیونکہ شیطان (منہ میں) داخل ہو جاتا ہے۔ صحیح مسلم ص ۲۴۱۳ ج ۲، و بیہقی ص ۲۹۸ ج ۲۔

نماز میں جمائی کا آنا شیطان کے آنے کی علامت ہے لہذا مبتدعین کو نماز (منفرداً) میں عموماً اور جماعت کے وقت خصوصاً ایک موزن مقرر کرنا چاہئے کہ جو نہی کسی نمازی کو جمائی آئے تو وہ شیطان کو بھگانے کیلئے اذان کہنی شروع کر دے۔

اگر علماء بریلویہ اس پر عمل کرتے ہیں تو بہت خوب! اگر نہیں کرتے تو وجہ فرق بیان کریں۔ (۶) اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے صبح کی نماز جمعۃ المبارک کے روز کی ہو، اور پیش امام مسنون قرات کرتے ہوئے سورۃ السجدہ، کی تلاوت کرے اور سجدہ تلاوت پر آکر سجدہ تلاوت بھی کرے، تو اب بھی مبتدعین کو اذان کہنی پڑے گی کیونکہ سجدہ تلاوت سے قبل شیطان کا موجود ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ اذا قرأ ابن آدم السجدة فسجد اعتزل الشيطان يسكى يقول يا ويلتى امر ابن آدم بالسجود فسجد فله الجنة وامرت بالسجود فابتلى فلى النار .

یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب آدم کا بیٹا سجدہ کی آیت کو پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس کہ ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا، اس نے سجدہ کیا تو اس کیلئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا، تو میں نے انکار کر دیا اور میرے لئے جہنم۔ مشکوٰۃ ص ۸۴، صحیح مسلم ص ۶۱ ج ۱، وابن ماجہ (رقم الحدیث ۱۰۵۲)، و مسند احمد ص ۴۴۰ ج ۲، و بیہقی ص ۳۱۲ ج ۲، وابن خزیمہ رقم ۵۴۹۔

(۷) عین ممکن ہے کہ نماز پڑھتے پڑھتے کوئی مسائل سے ناواقف مقتدی حالت نماز میں التفات (ادھر ادھر دیکھنا) کر لے، تب بھی مبتدعین کو اذان کہنی پڑے گی کیونکہ التفات شیطان

کی طرف سے ہے۔

چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ
سالت رسول اللہ ﷺ عن الالتفات فی الصلوٰۃ فقال هو اختلاس یختلسه
الشیطان من صلاۃ العبد۔

یعنی رسول اللہ ﷺ سے میں نے نماز میں التفات کے متعلق سوال کیا، تو آپ علیہ السلام نے
فرمایا التفات اچکنا ہے شیطان کی طرف سے بندے کی نماز سے۔ بخاری ص ۱۰۴ ج ۱، و نسائی
ص ۱۴۰ ج ۱، و ابوداؤد مع عون ص ۳۴۲ ج ۱، و مسند احمد ص ۷۰ ج ۶۔

(۸) کبھی کبھار ایسا بھی ممکن ہے کہ مبتدعین کا موزن ابھی مذکورہ اذان سے فارغ ہوا ہو، تو
ادھر کیا دیکھتا ہے کہ اسی شخص نے لمبے لمبے سر پر بال رکھے ہوئے ہیں مگر سنت کے برعکس بالوں کو
باندھ رکھا ہے، تو موزن کو اذان کہنی پڑے گی کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نماز کی حالت میں
باندھے ہوئے بالوں پر شیطان بیٹھتا ہے چنانچہ حضرت ابورافع مولیٰ رسول اللہ ﷺ راوی ہیں کہ

سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ذلک کفل الشیطان۔ الحدیث

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ یہ شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ ابوداؤد مع عون
ص ۲۴۶ ج ۱، و ترمذی مع تحفہ ص ۲۹۸ ج ۱، و فتح الباری ص ۱۳۸ ج ۲۔

(۹) اس اذان سے موزن فارغ ہی ہوا، تو فرض کیجئے کوئی دیوانہ نمازیوں کے آگے سے
گزرے تو اب بھی اذان کی ضرورت پیش آئے گی کیونکہ صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ
نمازیوں کے آگے سے گزرنے والے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی
اللہ عنہ راوی ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

فانه معه القرین، یعنی آگے سے گزرنے والے کے ساتھ شیطان ہے،

صحیح مسلم ص ۱۹۷ ج ۱، و ابن خزیمہ ص ۱۷۷ ج ۲۔ الحدیث

(۱۰) مذکورہ اذان کہہ کر موزن ایک لمحہ بھر کیلئے ٹھہرا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ پیش امام تشہد بیٹھ
چکا ہے اور وہ بمع مقتدیوں کے انگلی سے اشارہ (یعنی رفع سبابہ) کر رہا ہے تو اب بھی مبتدعین کو

اذان کی ضرورت پیش آئے گی، کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ

لہی اشد علی الشیطان من الحديد .

یعنی یہ شیطان پر لوہے کے (تھوڑے) سے زیادہ سخت ہے،

مسند امام احمد ص ۱۱۹ ج ۲، و مجمع الزوائد ص ۱۳۳ ج ۲، و بیہقی ۱۳۲ ج ۲۔

گو اس روایت کی سند میں کلام ہے مگر حسن درجہ سے کم نہیں، بلکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس سے شیطان زخمی ہوتا ہے، مسند ابویعلیٰ بحوالہ نماز نبوی ص ۱۶۶ مولفہ علامہ البانی رحمۃ اللہ۔

اس حدیث سے رفع سبابہ کے وقت شیطان کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اسے دور کرنے کیلئے مبتدعین کو اذان کہنے کی ضرورت ہے

تلك عشرة كاملة

یہ دس مقامات ایسے ہیں کہ اگر مبتدعین مفتی صاحب کے نسخہ پر عمل کریں تو جمعۃ المبارک کی صبح کی نماز سے فارغ ہونے تک دس بار انہیں اذان کہنی پڑھے گی، اگر وہ اس پر عمل کرتے ہیں تو مبارک ہو، اگر نہیں کرتے اور یقیناً نہیں کرتے! تو اس کی وجہ کیا ہے؟ بیٹو! تو جروا۔

اذان قبر کے متعلق مفتی صاحب کے بیان کردہ جملہ فوائد سے کہیں بڑھ کر بندہ ناچیز ان دس اذانوں کے فوائد بیان کر سکتا ہے۔

اگر مبتدعین کہیں کہ یہ عمل بدعت ہونے کی وجہ سے سنت خیر الانام کے مخالف ہے، تو یہی ہم اذان قبر کے متعلق کہتے ہیں چونکہ یہ سنت سے ثابت نہیں لہذا بدعت ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

تیسرے یہ کہ اذان دل کی وحشت کو دور کرتی ہے ابو نعیم اور ابن عساکر نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی ہے

نزل آدم بالہند واستوحش فنزل جبریل فنادی بالاذان .

حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں اترے اور ان کو سخت وحشت ہوئی پھر جبریل آئے اور

اذان دی۔

مفتی صاحب وجہ استدلال میں مدارج النبوت کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اور میت بھی اس وقت عزیز و اقارب سے چھوٹ کر تیرہ و تاریک مکان (قبر) میں اکیلا پہنچتا ہے، سخت وحشت ہے اور وحشت میں حواس باختہ ہو کر امتحان میں ناکامی کا خطرہ ہے، اذان سے دل کو اطمینان ہوگا جوابات درست دے گا۔ جاء الباطل ص ۳۱۲ ج ۱۔

کیا قبر میں میت پر وحشت آتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ سلسلہ سند میں ایک راوی محمد بن عبد اللہ بن سلیمان کوفی ہے، ابن عساکر بحوالہ سلسلہ الاحادیث الضعیفہ ص ۳۹۶ ج ۱۔ اسے امام ابن مندہؒ نے مجھول کہا ہے میزان ص ۶۰۲ ج ۳، اس کی عدالت و ثقاہت بیان کرنی فریق ثانی پر آج تک ادھار ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے روایت کا پورا متن درج نہیں کیا کیونکہ آخری الفاظ مفتی صاحب کے بدعی مسلک کے خلاف تھے، چنانچہ آخری الفاظ ہیں جب جبریل علیہ السلام اذان کہہ چکے تو قال آدم من محمد؟ قال آخر ولدک من الانبیاء۔

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا محمد (ﷺ) کون ہیں؟ تو جبریل علیہ السلام نے کہا تیری اولاد سے آخری نبی۔ الضعیفہ ص ۳۹۶ ج ۱۔ وکنز العمال ص ۲۰۶ ج ۱۱ (۳۲۱۳۶)

ان الفاظ کا یہ تقاضا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین پر نازل ہوئے تب تک رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس سے ناواقف تھے، جب کہ مبتدعین کا یہ موقف ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب حضرت آدم سے خطا ہو گئی تو انہوں نے کہا اے میرے رب میں تجھ سے بہ حق محمد (ﷺ) سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے الخ۔

شرح صحیح مسلم ص ۵۹ ج ۷، للمولوی غلام رسول سعیدی بریلوی۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مبتدعین کے نزدیک زمین پر نزول سے قبل حضرت آدم علیہ

السلام رسول اللہ ﷺ کو جانتے تھے، مگر روایت مذکورہ میں اس موقف کی تردید ہوتی ہے
افسوس کہ مفتی صاحب نے متن روایت میں تصرف کر کے مخالف ٹکڑے کو ہضم کر دیا ہے، مزید
افسوس یہ کہ کوئی ایسا لفظ ”الحديث“ وغیرہ بھی تحریر نہیں کیا جس سے قاری یہ معلوم کر لے کہ مفتی
صاحب نے روایت کا مکمل متن درج نہیں کیا۔

بلکہ انہوں نے اسے فل متن باور کرانے کی کوشش کی ہے، جو کہ علمی طور پر بدترین فعل ہے لیکن
اس طرح کی عیاریوں کے باوجود احمد یار صاحب کو مبتدعین حکیم الامت وغیرہ القاب سے نوازتے
ہیں۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب بدعات کی ترویج و اشاعت کیلئے ایسی ایسی تاویلیں گھڑتے تھے جنہیں عوام
الناس دلائل سمجھ لیتے ہیں، ہم پوچھتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ مومن پر قبر میں سخت وحشت
طاری ہوتی ہے۔

ہمیں تو رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر دلاسا دیا ہے کہ

عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال ان الميت یصیر الی القبر
فیجلس الرجل الصالح فی قبرہ غیر فزع ولا مشغوف الحدیث۔

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا

جب مردہ قبر میں جاتا ہے تو جو شخص بھی نیک ہوتا ہے اسے قبر میں بٹھایا جاتا ہے اس پر نہ
وحشت ہوتی ہے نہ دل پریشان، الحدیث، سنن ابن ماجہ ص ۳۲۵۔

یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے، اس حدیث کا یہ مفاد ہے کہ نیک شخص پر وفات کے بعد
قبر میں خوف و ہراس نہیں ہوتا، اس کی تائید حسب ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال کان النبی ﷺ یقول اذا وضعت الجنائزۃ
واحتملھا الرجال علی اعناقھم فان كانت صالحۃ قالت قدمونی، وان كانت غیر
صالحۃ قالت لا ہلھا یا ویلھا این تذهبون بها یسمع صوتھا کل شئ الا الانسان
ولو سمع الا نسان لصعق۔

یعنی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ فرمایا کرتے تھے، جب جنازہ

تیار کیا جاتا ہے اور لوگ اپنی گردنوں پر اسے اٹھاتے ہیں، اگر نیک ہوتا ہے تو کہتا ہے مجھے جلدی لے چلو (قبر میں) اگر نیک نہیں ہوتا تو اپنے لوگوں کو کہتا ہے ہائے افسوس تم مجھے کہاں لے چلے ہو، اس کی آواز انسان کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے، اگر انسان سن لے تو بے ہوش ہو جائے۔ صحیح بخاری ص ۷۶ ج ۱، ومسند احمد ص ۵۸ ج ۳، دیہقی ص ۲۱ ج ۴، ونسائی ص ۲۱۹ ج ۱۔

یہ احادیث اس بات کی برہان قاطع ہیں کہ مرد صالح وفات کے بعد خوف و ہراس میں مبتلا نہیں ہوتا، مگر مفتی صاحب اس کے برعکس یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میت پر خوف چھا جاتا ہے۔

اب مسلمان دیکھ لیں کہ انہوں نے سید العرب والعجم امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بات پر اعتبار کرنا ہے یا مفتی احمد یار صاحب پر۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

معلوم ہوا کہ مرد مومن پر مرنے کے بعد خوف آتا ہی نہیں، لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ خوف کو دور کرنے کیلئے اذان کہنی چاہئے، مردود و باطل ہے۔

کیا حضرت آدم علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی ذات کے وسیلہ سے دعا کی تھی؟

اوپر، ثانیاً کے تحت راقم نے جو مولوی غلام رسول سعیدی صاحب بریلوی کی کتاب، شرح صحیح مسلم، کے حوالے سے روایت فاروقی درج کی ہے، وہ محض الزامی طور پر نقل کر دی گئی ہے، ورنہ وہ روایت سند کے اعتبار سے سخت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند کا دار و مدار، عبد الرحمان بن زید بن اسلم، راوی پر ہے۔

المعجم الاوسط للطبرانی ص ۲۵۹ ج ۷ رقم ۶۳۹۸، و مستدرک حاکم ص ۶۱۵ ج ۲، و دلائل النبوة ص ۳۸۹ ج ۵۔

اس کے متعلق محدثین کا فیصلہ کچھ اس طرح ہے، امام احمد فرماتے ہیں اس کی حدیث منکر اور یہ خود ضعیف ہے، امام ابن معین فرماتے ہیں کہ اس کی مرویات ہیچ محض ہیں، امام علی بن مدینی نے اسے سخت ضعیف کہا ہے، امام ابوداؤد کا فیصلہ ہے کہ زید کی کل اولاد ضعیف ہے، امام نسائی اور ابو زرہ اسے ضعیف کہتے ہیں، امام ابو حاتم کہتے ہیں حدیث میں پختہ نہیں اور اس کی مرویات واہی ہیں، امام ابن حبان کا کہنا ہے اخبار کو بے علمی کی وجہ سے الٹ پلٹ کر دیتا تھا مرسل کو مرفوع اور موقوف کو مسند بنا دیتا تھا، امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ سخت ضعیف ہے، امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اہل علم اسے خراب حافظے کی وجہ سے احتجاج نہیں کرتے، امام ساجی فرماتے ہیں منکر الحدیث ہے، امام طحاوی حنفی کا کہنا ہے حدیث کا علم رکھنے والوں کے ہاں یہ نہایت درجہ کا ضعیف ہے، امام جوز جانی کہتے ہیں زید کی پوری اولاد ہی ضعیف ہے، امام حاکم اور امام ابونعیم فرماتے ہیں کہ اپنے باپ سے موضوع (من گھڑت) روایات روایت کرتا ہے، امام ابن جوزی فرماتے ہیں کہ اس کے ضعف پر محدثین کرام متفق ہیں۔ تہذیب ص ۶۲ ج ۶۔

الغرض یہ متہم بالوضع ہے، علامہ ذہبی نے اس روایت کو باطل قرار دیا ہے، میزان ص ۵۰۴ ج ۲۔

یہی بات حافظ ابن حجر نے کہی ہے، لسان المیزان ص ۳۶۰ ج ۳۔

امام حاکم (صاحب المستدرک) فرماتے ہیں

روى عن ابيه احاديث موضوعة لا يخفى على من تأملها من أهل الصنعة ان الحمل فيها عليه.

یعنی عبد الرحمن اپنے باپ سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے چنانچہ اہل صنعت میں سے جو غور کرے اس پر یہ بات مخفی نہ رہے گی کہ اس سند میں دارودار اس پر ہے۔

المدخل الى الصحيح ص ۵۴ ۱ رقم الترجمة ۹۷ طبع مؤسسة الرسالة.

الغرض یہ روایت عبد الرحمن کے ضعیف اور متہم بالوضع ہونے کی وجہ سے باطل و موضوع ہے، مزید تفصیل کیلئے علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف التوسل ص ۱۱۶، کا مطالعہ کریں۔

ہمارے معاصر مولانا غلام رسول سعیدی صاحب کا یہ لکھنا کہ یہ روایت گویا ضعیف ہے مگر فضائل

میں ضعیف معتبر ہوتی ہے، شرح مسلم ص ۵۹ ج ۷، غلط ہے جس کی ضروری تفصیل، دین الحق ص ۵۳ ج ۱، میں کردی گئی۔

علاوہ ازیں اس روایت کا تعلق عقائد سے ہے اور عقائد میں ضعیف حدیث بالاطلاق قابل حجت نہیں، واضح رہے کہ سعیدی صاحب کا اسے فضائل کے بارے میں باور کرنا غلط بیانی ہے۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

مسند فردوس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رانی النبی ﷺ حزیناً، فقال یا ابن ابی طالب انی اراک حزیناً فمر بعض اہلک یؤذن فی اذنک فانہ دواء الہم۔

مجھ کو حضور علیہ السلام نے رنجیدہ دیکھا تو فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ تم کو رنجیدہ پاتا ہوں تم کسی کو حکم دو کہ تمہارے کان میں اذان دے کیونکہ اذان غم کو دور کرنے والی ہے۔ جاء الباطل ص ۳۱۲ ج ۱۔

کیا مردے کے غم کو دور کرنے کے لئے اذان کہی جاسکتی ہے؟

اولاً۔ یہ روایت من گھڑت اور باطل ہے، کنز العمال، میں اسے، مسند فردوس سے نقل کرتے ہوئے جو سند درج کی گئی ہے۔ وہ منقطع ہے، اس کے بعد انہوں نے علامہ جذری کی کتاب، اُسنی المطالب، سے ایک دوسری سند بھی نقل کی ہے، گو جذری کی سند میں وہ انقطاع نہیں جو مسند فردوس کی ایک سند میں ہے، لیکن جذری اور، مسند فردوس کی دوسری سند کے علاوہ بھی متعدد ایسے راوی ہیں جو دجال و کذاب اور خمیث العقیدہ ہونے کے علاوہ وضع احادیث میں معروف ہیں، چنانچہ اس کی سند میں پہلا راوی، ابو عبد الرحمن محمد حسین السلمی ہے، کنز العمال ص ۲۷۸ ج ۲ طبع نشر النملتان، و اُسنی المطالب فی مناقب سیدنا علی بن ابی طالب ص ۹۳ طبع مکتبہ الامام امیر المؤمنین، اصفہان، ایران، سلمی کے ہم وطن امام محمد بن یوسف قطان نیشاپوری فرماتے ہیں، یہ صوفیاء کے لئے احادیث وضع (گھڑا) کرتا تھا، میزان (ص ۵۲۳ ج ۳ و تاریخ بغداد ص ۲۴۳ ج ۲، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ

اسکی کتب میں من گھڑت احادیث و حکایات ہیں اور ائمہ نے اسے زندیق اور باطنی قرار دیا ہے،
تھذیب سیر اعلام النبلاء ص ۲۷۷ ج ۲ طبع موسسة الرسالة ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۲ء۔

سلمی نے یہ روایت عبداللہ بن موسیٰ سلمیٰ سے روایت کی ہے اور یہ بھی کذاب ہے، تفصیل کے
لئے دیکھئے، میزان الاعتدال ص ۵۰۹ ج ۲،

الغرض یہ روایت من گھڑت اور موضوع ہے، ہمارے شیخ نے اپنی ایک تحریر میں اس روایت کو
ضعیف کہا ہے۔

ثانیاً۔ روایت کے الفاظ ہمارے سامنے ہیں کہ

فمر بعض اهلک یوذن فی اذنک فانہ دواء للہم۔

یعنی گھر والوں میں سے کسی ایک کو کہئے، جو آپ کے کان میں اذان دے کیونکہ یہ اس (غم)
کیلئے دوا ہے، کنز العمال ص ۶۵۷ ج ۲ رقم ۵۰۰۰، طبع موسسة الرسالة ۱۴۰۹ھ۔ و اُسنی المطالب
ص ۹۳۔

تو کیا فریق ثانی مردے کو دفن کرنے کے بعد اس کے کان میں اذان کہتا ہے، اگر نہیں یقیناً
نہیں، تو پھر یہ آپ کی دلیل کیسے بن گئی، جس کے ایک حصے پر جناب کا خود بھی عمل نہیں۔

ثالثاً۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ مردے تھے کہ ان کے حزن کو دور کرنے کیلئے، اذان کا حکم دیا
تھا، نہیں قطعاً نہیں، تو پھر اس سے مردے کیلئے اذان کیسے ثابت ہوئی اور وہ بھی دفن میت کے بعد۔

رابعاً۔ پہلے صحیح احادیث سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مومن وفات کے بعد خوف و ہراس میں
بتلا نہیں ہوتا، مومن کو مرنے کے بعد ہراساں تسلیم کرنا نص قرآنی کے خلاف ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکة الا تخافوا ولا

تحزنوا و ابشروا بالجنة التي کنتم توعدون ☆ ۰ حم السجدة

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر وہ اسی پر جم گئے ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ
ڈرو اور نہ غم کرو اور جس بہشت کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا آج اس کی خوشی مناؤ۔ (ثنائی) ۳۱-۳۰۔

اس فرمان ربانی کے برعکس مفتی صاحب ہمیں یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ مومن کو مرنے کے بعد
خوف و ہراس اور وحشت گھیر لیتی ہے۔

افسوس مفتی صاحب بدعت کے جواز کیلئے پہلے تو اسلامی تعلیم کو مسخ کرتے ہیں پھر اس پر بدعت کی بنیاد رکھتے ہیں۔

خامساً۔ روایت مذکورہ سنت نبی ﷺ کے بھی خلاف ہے کیونکہ ایک حسن حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ دعوات المكروب اللهم رحمتك ارجو فلا तकلمني الى نفسي طرفة عين واصلح لي شأني كله لا اله الا انت.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غمگین یہ دعا پڑھے، الہی میں آپ کی رحمت کا امیدوار ہوں مجھے ایک لچلے کیلئے بھی میرے نفس کے سپرد نہ کر (یعنی اپنی دست گیری کا ہاتھ میرے سر سے نہ اٹھا) اور میری حالت بالکل درست کر دے کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔

سنن ابو داود مع عون ص ۴۸۵ ج ۴، و مسند احمد ص ۴۲ ج ۵، و ادب المفرد للبخاری ص ۱۸۲ رقم ۷۰۱، و السنن الكبرى للنسائی ص ۱۶۷ ج ۶، و ابن جبان ص ۱۰۴ ج ۳، رقم الحديث ۹۶۶، و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۹۶ ج ۱۰، و فتح الباری ص ۱۲۳ ج ۱۱.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

كان النبي ﷺ يدعو عند الكرب لا اله الا الله العظيم الحليم لا اله الا الله رب السموات والارض ورب العرش العظيم.

یعنی نبی کریم ﷺ جب غمگین ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے

لا اله الا الله العظيم الحليم لا اله الا الله رب السموات والارض ورب

العرش العظيم.

کوئی الہ نہیں مگر وہی جو عظیم و حلیم ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی الہ نہیں جو زمین و آسمان اور عرش عظیم کا رب ہے،

بخاری ص ۹۳۹ ج ۲، و مسلم ص ۳۵۱ ج ۲، و مسند احمد ص ۲۲۸ ج ۱،

و ۲۵۹، ۲۸۰، ۲۸۳، ۳۳۹۔

یہ احادیث صحیحہ اس بات کی واضح برہان ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رنجیدہ و اداس ہوتے تو اپنے غمگسار پروردگار کو پکار کر مذکورہ دعا کرتے تھے، مگر مبتدعین کا مفتی مغموم کو اذان کا درس دے رہا ہے، ظاہر ہے کہ اگر مغموم غم کو دور کرنے کیلئے اذان کہے گا تو وہ مذکورہ سنت مصطفویٰ کو مٹانے کی جسارت کرے گا، اور جو عمل سنت کو مٹائے وہ مبتدعین کے نزدیک بھی قبیح ترین بدعت میں شمار ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

اذان کی برکت سے لگی ہوئی آگ بجھتی ہے، ابو یعلیٰ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا یطفوا الحریق بالتکبیر و اذراء یتیم الحریق فکبروا فانہ یطفی النار۔ لگی ہوئی آگ کو تکبیر سے بجھاؤ اور جب کہ تم آگ لگی ہوئی دیکھو تو تکبیر کہو کیونکہ یہ آگ کو بجھاتی ہے۔

وجہ استدلال میں حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں اذان میں تکبیر تو ہے، اللہ اکبر، لہذا اگر قبر میت میں آگ لگی ہو تو امید ہے کہ خدائے پاک اسکی برکت سے بجھا دے، جاء الباطل ص ۳۱۴ ج ۱۔

کیا اذان دینے سے قبر کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ کیا مبتدعین سچ منہ اپنے مردوں کو آگ لگی دیکھ کر اذان کہتے ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو پھر انہیں اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنی چاہیے، ہم انہیں تو خید کو اپنانے، سنت کی پیروی اور ترک بدعات کی دعوت دیتے ہیں کہ بدعی راستہ کو چھوڑ کر اس پر چل پڑیں کہ کل قبر میں بفضلہ تعالیٰ آگ قطعاً نہیں لگے گی انشاء اللہ۔

واضح رہے کہ مذکورہ روایت مبتدعین کی دلیل (اور وہ بھی ادھوری) تب ہی بن سکتی ہے، جب یہ قبر میں میت کو جلتے دیکھ لیں، کیونکہ متن روایت کا تو خود مفتی صاحب نے یہ معنی کیا ہے کہ آگ لگی ہوئی دیکھو تو تکبیر کہو الخ

ثانیاً۔ روایت مذکورہ ابو یعلیٰ میں ہمیں تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکی، ہاں، المعجم الاوسط للطبرانی، میں یہ روایت موجود ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں، اطفؤا الحریق بالتکبیر۔
یعنی آگ تکبیر کے ساتھ بجھاؤ، طبرانی اوسط ص ۲۵۹ ج ۹، وجمع الزوائد ص ۱۴۱ ج ۱۰۔
معلوم نہیں کہ حضرت مفتی صاحب نے کس رسالہ سے مذکورہ روایت کو نقل کیا ہے کہ نہ الفاظ درست ہیں اور نہ حوالہ صحیح ہے،

ان الفاظ کا مقصود فقط اس قدر ہے کہ مومن کی زندگی میں اسلامی تعلیم کی جھلک نظر آئے اور وہ کام کی ابتدا اللہ رب العزت کے بابرکت نام سے کرے، جیسے نماز کی ابتدا میں بھی تکبیر کہی جاتی ہے، کسی بلند مقام پر چڑھتے وقت تکبیر کہنا مسنون ہے، اسی طرح مذکورہ روایت میں آگ بجھاتے وقت تکبیر کہنے کا ذکر ہے، نہ کہ جب آگ لگ جائے تو اس کے ارد گرد کھڑے ہو کر تکبیر کہنے کا حکم ہے تاکہ اس تکبیر کی برکت سے آگ بجھ جائے۔

اگر مبتدعین اس روایت کا یہی مفہوم لیتے ہیں تو انہیں حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ فائر بریگیڈ ختم کر دو! کیونکہ اس کا کوئی فائدہ ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں سستا و ارزاں ایک حکمی نسخہ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے، جب کہیں آگ لگ جائے تو اسے تکبیر کہہ کر ختم کیا جاسکتا ہے، گویا کم خرچ بالانشین، والا معاملہ ہوگا، یوں جہاں ملکی دولت کروڑوں کی ضائع ہونے سے بچ جائے گی، وہاں بچارے عوام کا بھی خوب بھلا ہوگا کہ، فائر بریگیڈ، کو خطیر رقم دینے کی بجائے فقط، اللہ اکبر، کہنے سے کارخانہ وغیرہ میں لگی آگ بجھ جائے گی۔

اگر مبتدعین ایسا مطالبہ نہ کریں، تو ثابت ہوگا کہ انہیں خود بھی مفتی جی کے بیان کردہ معنی و مفہوم پر اعتماد نہیں، بلکہ انہوں نے عوام کی دل لگی اور بدعت کے جواز کیلئے حدیث کو بگاڑا تھا۔

ثالثاً۔ روایت میں تو تکبیر کا بیان ہے، مگر مفتی صاحب اس سے اذان کا ثبوت دے رہے ہیں، حالانکہ اذان اور تکبیر ایک چیز قطعاً نہیں، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ، اذان میں تکبیر تو ہے، اللہ اکبر، جاء الباطل ص ۳۱۴۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مبتدعین میں یہ شخص حکیم الامت وغیرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے مگر پیادے کی علمی لیاقت اس قدر ہے کہ جزو سے کل ثابت کر رہا ہے، ہم ارباب عقل و خرد کو

دعوت فکر دیتے ہیں کہ فیصلہ کریں کہ اس فلسفہ اور سائنس کے دور میں ایک نام نہاد مفسر قرآن، حکیم الامت، مفتی اعظم، کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ جزو ہونے سے کل ہونا لازم آتا ہے، اللہ اکبر، جس کا مطلب یہ ہوا کہ، تکبیر، کو پوری نماز، وضو کے ایک جزو مثلاً ہاتھ دھونے کو مکمل وضو کہا جائے، ایک اینٹ کو پورا مکان کہنا بھی درست ہوگا، کھانے کے اجزا میں سے ایک جزو نمک بھی ہے تو نمک کو کھانا کہنا بھی درست ہوگا، نمک کو پلاؤ اور پلاؤ کو نمک کہا جائے تو کوئی غلطی نہ ہوگی، ناخن انسان کا ایک جزو ہے لہذا انگلی کے ناخن کو انسان قرار دینا جائز ہے، ایک رسی کو چار پائی بھی کہا جاسکتا ہے، میخ کو کواڑ بھی، کیا خوب، مفتی ہوں تو ایسے جو سب کو ہی بدل ڈالیں۔

رابعاً۔ روایت مذکورہ جہاں مفتی صاحب کی عدم دلیل ہے، وہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ سند میں ابن عجلان ہے، طبرانی اوسط ص ۲۵۹ ج ۹۔

اس کے بارے میں محدثین کرام کا فیصلہ ہے کہ اس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات مختلط ہو گئیں تھیں، تھذیب ص ۳۴۲ ج ۹، و تقریب ص ۲۲۸۔

اسکے نیچے، نوح مطوعی، اور اس کا بیٹا ایوب محمول ہیں، علامہ ہیثمیؒ کا کہنا ہے اس میں کئی ایسے راوی ہیں جنہیں میں نہیں جانتا، مجمع الزوائد ص ۱۴۱ ج ۱۰۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

امام احمد و طبرانی و بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ کے دفن کا واقعہ نقل کر کے روایت کی ہے

سبح النبی ﷺ ثم کبر و کبر الناس قالوا یا رسول اللہ لم سبحت قال لقد تضائق علی هذا الرجل الصالح قبره حتی فرج اللہ تعالیٰ عنه۔

بعد دفن حضور علیہ السلام نے، سبحان اللہ، فرمایا پھر، اللہ اکبر، حضور علیہ السلام نے فرمایا اور دیگر حضرات نے بھی! لوگوں نے عرض کی کہ یا حبیب اللہ تسبیح و تکبیر کیوں پڑھی ارشاد فرمایا کہ اس صالح بندے پر قبر تنگ ہو گئی تھی، اللہ نے قبر کو کشادہ فرمایا۔

اس کی شرح میں علامہ طیبی فرماتے ہیں یعنی ہم اور تمام لوگ تسبیح و تکبیر کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے قبر کو کشادہ فرمایا۔ جاء الباطل ص ۳۱۴ ج ۱۔

کیا واقعہ سعدؓ سے اذان قبر ثابت ہوتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ کہاں تسبیح و تکبیر اور کہاں اذان قبر، ان کا کوئی تعلق ہی سرے سے نہیں، کیونکہ تسبیح اور تکبیر سے مراد کبھی بھی اذان نہیں لی جاتی، اگر مفتی صاحب کی اصلاح میں تکبیر اور تسبیح کا معنی اذان ہے تو پھر اس حدیث کا کیا معنی ہوگا کہ جو شخص نماز کے بعد تیس بار اللہ اکبر، ایتیس بار سبحان اللہ کہتا ہے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں مسلم ص ۲۱۹ ج ۱ و ابوعوانہ ص ۲۴۷ ج ۲ و مسند احمد ص ۲۳۷ ج ۲، عن ابی ہریرہؓ۔ تو مفتی صاحب کے نزدیک معنی یہ ہوگا کہ نمازی نماز سے فارغ ہو کر تینیس جمع تینیس یعنی چھیانوہ بار اذان کہے کیا اس معنی پر مفتی صاحب کا یا اس کی پارٹی میں سے کسی ایک کا عمل ہے۔ یقیناً نہیں تو ثابت ہوا تکبیر اور تسبیح کا معنی اذان لینا بالکل غلط ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا مذکورہ روایت سے بایں معنی استدلال کہ، اذان ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ کی برکت سے عذاب قبر دور ہوتا ہے، جاء الباطل ص ۳۱۲ ج ۱۔

حالانکہ عرف میں یہ دونوں الگ چیزیں ہیں دعا میں طلب اور سوال ہوتا ہے جب کہ ذکر اس سے خالی ہوتا ہے، مفتی صاحب کا دادا استاذ مولوی احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے کہ۔

اذان تو خالص ذکر بھی نہیں جیسا کہ، البنایۃ شرح ہدایہ، علامہ عینی میں ہے۔ فتاویٰ رضویہ ص ۴۱۵ ج ۲، طبع دارالعلوم امجدیہ مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۱ء۔

ثالثاً۔ روایت مذکورہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے، کیونکہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا محمود بن عبد الرحمن الجموح ہے،

مسند احمد ص ۳۷۷ ج ۳ و ۳۶۰۔

یہ بھول ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے، التعلیل، میں صراحت کی ہے (مرعاة) علامہ ھیشمی حنفی کا کہنا ہے کہ محمود کو، الحسینی، نے فیہ نظر کہا ہے، اور مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ اس کے علاوہ بھی کسی نے ذکر کیا ہے،

مجمع الزوائد ص ۴۹ ج ۳۔

امام العصر علامہ ناصر الدین محدث البانی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے تحقیق مشکوٰۃ ص ۴۹ ج ۱، و مرعاة ص ۲۳۱ ج ۱۔

نماز کے بعد مصافحہ و معافہ کرنا

حضرت مفتی صاحب جب اذان قبر پر مزید بحث سے عاجز آگئے تو غصہ جانے انہیں کیا خیال آیا کہ اذان قبر کی بحث کے آخر میں نماز کے بعد مصافحہ کی بدعت کو گھسیٹ لائے، چنانچہ انہوں نے اسے لطیفہ کے زیر عنوان بیان کر کے آخر میں لکھا کہ اسی طرح یہ مسئلہ اذان ہے۔ جاء الباطل ص ۳۲۱ ج ۱۔

راقم الحروف نے متعدد بار غور کیا کہ علمی طور پر اس کا اذان قبر سے کیا تعلق ہے جو مفتی صاحب نے پیدا کرنے کی فضول کوشش کی ہے، مگر خاکسار کی سمجھ میں نہ آیا، ہاں اگر ان میں کوئی رشتہ واسطہ ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں دین میں زیادتی، من گھڑت اور بدعت سیئہ ہیں! ممکن ہے کہ مفتی صاحب کے نزدیک ان دونوں کا کوئی اور تعلق ہو، جسے انہوں نے بیان کرنا مناسب نہ جانا ہو، خیر جو بھی ہو ہماری بلا سے۔

نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیا کیا کرتے تھے اس کے متعلق کتب حدیث میں مسنون ذکر و دعائیں تو منقول ہیں مگر نماز کے بعد مصافحہ کا ذکر کسی حدیث میں مروی نہیں، جو اس کا روشن پہلو ہے کہ نماز کے بعد مصافحہ کرنا مسنون نہیں، بلکہ سنت ذکر و اذکار اور نوافل وغیرہ ادا کرنے ہیں، اب جو شخص نماز کے بعد مصافحہ کرتا ہے وہ مسنون عمل کو ترک کر کے اپنی طرف سے ایک نئی چیز پیدا کر رہا ہے، کیونکہ نماز سے فارغ ہوتے ہی، اللہ کے رسول ﷺ، اللہ اکبر، کہتے تھے۔ بخاری ص ۱۱۶ ج ۱، و مسلم ص ۲۱۷ ج ۱۔

حضرت مغیر بن شعبہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد یہ کلمات کہتے تھے۔

لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطى لما منعت ولا ينفع ذا الجند منك الجد.

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ وحدہ لا شریک ہے، اس کی بادشاہی ہے، اور اسی کیلئے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ، جسے تو عطاء کرے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جس

سے تو روک لے اسے کوئی دینے والا نہیں، اور کسی کا بخت تیرے سامنے کوئی فائدہ نہیں دیتا، بخاری ص ۱۱۷ ج ۱، و مسلم ص ۲۱۸ ج ۱۔

ان کے علاوہ بھی کئی مسنون اذکار کتب حدیث میں مروی ہیں، جن کو آنحضرت ﷺ ہمیشہ فرماتے، بعض کو کبھی کبھار پڑھتے تھے۔

معلوم ہوا کہ نماز کے بعد ذکر و اذکار مسنون طریقہ ہے، اب جو شخص نماز کے بعد مصافحہ و معافتہ کرتا ہے وہ عملی طور پر ان مسنون اعمال کو رد کر رہا ہے جو سنت نبوی علیہ السلام، کو محو کرنے کے مترادف ہے، جس عمل سے سنت نبوی ختم ہو، اس کے بدعت سیئہ ہونے کا فریق مخالف کو بھی اقرار ہے، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں

خلاف سنت کام جو رافع سنت ہو بدعت سیئہ ہی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۱۳ ج ۱۔

اور سلام کے بعد ذکر و اذکار مسنون ہیں نہ کہ مصافحہ کرنا، مگر مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ نماز کی حالت میں اگر چہ بظاہر تمام مقتدی اور امام ایک جگہ ہی رہے مگر حکمی لحاظ سے سب ایک دوسرے سے غائب تھے کہ نہ کسی سے کلام کر سکیں نہ ایک دوسرے کی مدد، بلکہ تمام لوگ دنیا ہی سے غائب ہیں کہ کھانا پینا، چلنا پھرنا تمام دنیاوی کام حرام ہیں اور، الصلوۃ معراج المؤمنین، کا نقشہ نظر آ رہا ہے دنیا سے تعلق منقطع اور واصل الی اللہ ہیں، جب سلام پھیرا اب دنیا میں آگئے تمام دنیاوی کام حلال ہو گئے یہ وقت غائب ہونے کے بعد ملنے کا ہے لہذا مصافحہ سنت ہے۔ جاء الباطل ص ۳۲۱ ج ۱۔

(۱) مفتی صاحب نے سلام کے بعد مصافحہ کو سنت قرار دیا ہے، اگر وہ فرض بھی کہہ دیتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

(۲) یہ عبارت اس بات کی گواہ ہے کہ مفتی صاحب سلام کے فوراً بعد مصافحہ کو لازمی اور ضروری خیال کرتے تھے، بلکہ انہوں نے اسے سنت کہہ کر نماز کا ایک جزو باور کرایا ہے۔

مگر اس پر کوئی دلیل شرعی تو وہ نادرند، بلکہ جو بھی زیب رقم فرمایا ہے وہ مفتی صاحب کا ذاتی من گھڑت ہے، جو قیاس فاسد پر مبنی ہے اور بوجہ سنت مصطفوی کے مخالف ہونے کے مردود ہے۔

(۳) مفتی صاحب کا حقیقی اور حکمی کو جمع کرنا حقیقت اور مجاز کو جمع کرنا ہے، جو احتاف کے نزدیک ناجائز ہے، دیکھئے دین الحق ص ۲۵۵ ج ۱۔

اختصار کے پیش نظر یہاں مفتی صاحب کا ایک حوالہ پیش خدمت ہے، فرماتے ہیں، حقیقت اور مجاز کا اجتماع منع ہے، جاء الباطل ص ۳۰۴ ج ۱۔

مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے

جمع بین الحقیقہ والمجاز باطل ہے۔ فتاویٰ رضویہ ص ۱۵۸ ج ۴۔

مبتدعین کے اس اصول سے ثابت ہوا کہ سلام و مصافحہ میں فقط ایک ہی ملاقات مراد لی جاسکتی ہے، حقیقی یا حکمی، ظاہر ہے کہ حکمی ملاقات نہیں، کیونکہ سنت متواترہ اس کا رد کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بھی قابل ذکر عالم نے سلام و مصافحہ کو حکمی ملاقات سے خاص نہیں کیا، باقی رہ گئی حقیقی، اور وہی مراد ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

فا ذا دخلتم بيوتا فسلموا على انفسكم تحية من عند الله مباركة طيبة.

(النور. ۶۱)

اور جب گھر میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں کو) سلام کیا کرو (یہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے۔ (۶۱-۲۴)

يا ايها الذين امنوا لا تدخلوا بيوتا غير بيوتكم حتى تستانسوا و تسلموا على

اهلها. (النور. ۲۷)

مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے (لوگوں کے) گھروں میں گھر والوں کی اجازت لئے اور

ان کو سلام کئے بغیر داخل نہ ہوا کرو۔ (۲۷-۲۴)

ان آیات میں حقیقی ملاقات مراد ہے، مفتی صاحب کی وضع کردہ حکمی ملاقات کا کوئی سرے سے

وجود ہی نہیں، نماز میں پہلے نمازیوں کے وجود کو غائب کیا اور ان پر اپنی بدعت چسپاں کر دی کہ

چونکہ نماز میں نمازی غائب تھے لہذا مصافحہ درست ہوا، کیسی عمدہ فقہانہ ہے حضرت مفتی صاحب

کی، لہذا ثابت ہوا کہ سلام و مصافحہ حقیقی ملاقات پر ہی ہے، معلوم نہیں کہ مولف جاء الباطل مفسر

قرآن ہو کر بھی علوم قرآن سے اس قدر ناواقف کیوں تھا۔

(۴) حنفی علماء نے بعد از نماز مصافحہ کو بدعت سیدہ کہا ہے چنانچہ ابن عابدین، درمختار، کی شرح

میں تحریر کرتے ہیں کہ

لكن قد يقال ان المواظبة عليها بعد الصلوات خاصة قد يودى الجهلة الى اعتقاد سنتها في خصوص هذه المواضع وان لها خصوصية زائدة على غيرها مع ان ظاهر كلامهم انه لم يفعلها احد من السلف في هذه المواضع و نقل في تبين المحارم عن الملتقط انه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال لان الصحابة رضی اللہ عنہم ما صافحوا بعد أداء الصلاة ولا نها من سنن الروافض، ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية انها بدعة مكروهة لا اصل لها في الشرع، و انه ينه فاعلها اولاً و يعزر ثانياً.

ثم قال، وقال ابن الحاج من المالكية في المدخل انها من البدع و موضع المصافحة في الشرع انما هو عند لقاء المسلم لاختيه لأففى ادبار الصلوات فحيث وضعها الشرع يضعها فينهي عن ذلك و يزجر فاعله لما اتى به خلاف السنة.

یعنی البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نماز کے بعد ہمیشہ مصافحہ کرنے سے جاہل لوگ اسے سنت اعتقاد کریں گے کہ مصافحہ کرنے کی اس وقت کوئی خاص خصوصیت ہے جو دوسرے اوقات میں نہیں، اس کے ساتھ ساتھ انکی عبارات (امام نووی اور ابو الحسن بکری) کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلف صالحین سے اس وقت مصافحہ کرنے کی کوئی خصوصیت منقول نہیں، تبیین میں (فقہ حنفی کی کتاب) ملتقط، سے نقل کیا ہے کہ نماز کے بعد مصافحہ کرنا ہر حال میں مکروہ ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز کے بعد مصافحہ نہ کرتے تھے اور اس لئے بھی کہ یہ رافضیوں کا طریقہ ہے،

پھر ابن حجر سے نقل کیا ہے کہ یہ بدعت مکروہہ ہے کیونکہ شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں اور مصافحہ کرنے والے کو پہلے تنبیہ کی جائے (اگر اس پر اصرار کرے) تو دوسری بار تعزیر لگائی جائے۔

پھر ابن الحاج کی مدخل سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ بدعت ہے اور شریعت میں مصافحہ کرنے کا وقت ملاقات ہے جب ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان بھائی سے ملاقات ہو، اس وقت مصافحہ کرے نہ کہ نمازوں کے بعد، پس شارع علیہ السلام نے جس کام کیلئے جو وقت مقرر کیا ہے وہ کام اسی وقت کیا جائے اور دوسرے اوقات میں منع کیا جائے اور کرنے والے کو ڈانٹا

جائے کیونکہ وہ خلاف سنت کر رہا ہے۔

فتاویٰ شامی ص ۳۸۱ ج ۶، کتاب الخطر والا باحتہ باب الاستبرا وغیرہ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی فرماتے ہیں کہ

آنکہ بعضے مردم مصافحہ می کنند بعد از نماز می کنند یا بعد از جمعہ کنند

چیزی نیست و بدعت است از جهت تخصیص وقت .

یعنی بعض لوگ نماز کے بعد یا جمعہ کے بعد جو مصافحہ کرتے ہیں یہ کچھ بھی نہیں، اور وقت کی

تخصیص کی وجہ سے بدعت ہے،

اشعۃ اللمعات ص ۲۲ ج ۲ طبع پشاور۔

رہا مفتی صاحب کا امام نووی سے، لا باس بہ، نقل کرنا۔

جاء الباطل ص ۳۲۰ ج ۱۔

تو یہ انہیں سود مند نہیں کیونکہ نووی شافعی ہیں اور مفتی صاحب نے اس سے قبل ایک شافعی عالم

کے قول سے انکار کر دیا تھا کہ شافعیہ کا قول حنفیہ پر حجت نہیں (مفہوم) جاء الباطل ص ۳۱۶ ج ۱۔

مگر یہاں ایک شافعی عالم کے قول سے ہی استدلال کر رہے ہیں، جو ان کی دورخی ثابت کرتا

ہے، خاص کر جب حنفیہ کے نامور علماء نے نووی کی تردید بھی کی ہے، چنانچہ ملا علی القاری حنفی

التونی ۱۰۱۲ھ، مشکوٰۃ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

ولا يخفى ان في كلام الامام نوع تناقض لان اتيان السنة في بعض الاوقات

لا يسمى بدعة مع ان عمل الناس في الوقتين المذكورين ليس على وجه الا

ستحباب المشروع فان محل المصافحة المشروعة اول الملاقاة و قد يكون

جماعة يتلاقون من غير مصافحة و يتصاحبون بالكلام و مذاكرة العلم وغيره مدة

مديدة ثم اذا صلوا يتصافحون فاين هذا من السنة المشروعة و لهذا صرح بعض

علماء نا بانها مكروهة حينئذ و انها من البدع المذمومة .

یعنی مخفی نہیں کہ امام نوویؒ کے کلام میں تناقض کی نوع ہے، کیونکہ بعض اوقات میں سنت کا آنا

(یعنی سنت پر عمل کرنا) بدعت سے موسوم نہیں کر سکتے جبکہ عوام الناس کا عمل ان دنوں وقتوں (صبح

اور عصر کی نماز کے بعد) میں شرعی استہاب کے درجہ میں نہیں، کیونکہ مشروع مصافحہ کا مکمل تو ملاقات کی ابتدا میں ہے اس کے برعکس جب لوگ مصافحہ کے بغیر ملکر گفت و شنید کرتے رہے اور علمی مسائل پر مذاکرہ کرتے رہے ایک اچھی خاصی مدت تک۔

پھر جب وہ نماز پڑھ لیتے ہیں تو مصافحہ کرتے ہیں، پس یہ مشروع سنت کہاں سے ہوئی، اس لئے ہمارے بعض علماء کرام نے تصریح کی ہے کہ نماز کے بعد مصافحہ مکروہ اور بدترین بدعت ہے، مرقاۃ المفاتیح ص ۴ ج ۹ کتاب الادب باب المصافحة و المعانقة طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔

مولانا قطب الدین خنی ترجمہ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ بعض آدمی جو مصافحہ کرتے ہیں بعد از نماز عصر کے یا جمعہ کے کچھ نہیں ہے اور بدعت ہے بسبب تخصیص وقت کے اور تصریح کی ہے، بعض علماء ہمارے نے کہ مصافحہ مذکورہ مکروہ ہے اور بدعت مذمومہ، مظاہر حق ص ۵۹ ج ۴۔

تنبیہ

حضرت مفتی صاحب نے عید کے معانقہ پر مشکوٰۃ کتاب الادب باب المصافحة، کے حوالے سے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بھی درج کی ہے،

جاء الباطل ص ۳۲۰ ج ۱۔

راقم نے اس روایت کی پوری تفصیل کے ساتھ صراحت کر دی ہے کہ یہ سند کے اعتبار سے ضعیف اور متن کے لحاظ سے عظمت مصطفیٰ ﷺ کے منافی ہے، دیکھئے دین الحق ص ۱۳۹ ج ۲، ذکر ولادت پر کھڑے ہونے پر، مفتی صاحب کی پانچویں دلیل کا جواب۔

علاوہ ازیں یہ روایت ملاقات کے وقت معانقہ کی دلیل ہے، نہ کہ نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ کی، یہ یاد رہے کہ ہم نہ تو مصافحہ کے منکر ہیں نہ معانقہ سے انکار ہے، انکار تو اس کی خاص کیفیت اور تخصیص سے ہے، اس پر مبتدعین کے پاس کوئی دلیل قرآن و سنت اور تعامل صحابہ سے موجود ہے تو عنایت کیجئے۔

باب اولیاء کرام کا عرس منانا

عرس کا پس منظر اور وجہ تسمیہ

بات آگے لے جانے سے پہلے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عرس کرنے اور منانے کا جو اسلوب پاک و ہند کے مبتدعین کے حلقوں میں رائج ہے، خیر القرون اور اس کے بعد کئی صدیوں تک اسلامی معاشرہ میں اس کا وجود نہ تھا صدیوں بعد جب مسلمان دین اسلام سے نا آشنا ہو گئے اور مشرک اقوام سے ان کا میل ملاپ بڑھ گیا تو ان کے اندر کئی مشرکانہ رسوم و عقائد اور اعمال آئے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں شرک و بدعت کی مختلف شکلیں اور تصورات رائج رہے ہیں ایک تصور مشرک اقوام میں یہ بھی رہا کہ خالق کائنات اور مخلوق کے مابین محبت کی نوعیت اس طرح ہے جس طرح ایک ماں اور اولاد کے مابین محبت ہوتی ہے اس تصور کے تحت خالق کائنات کی مظہر دیویاں قرار پائیں اور مختلف دیویوں کو پوجا جاتا رہا جیسے آج ہندوستان میں درگادیوی، پاربتی دیوی، سرسوتی اور لکشمی دیوی وغیرہ کی پرستش ہوتی ہے۔

ایک تصور یہ رہا کہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان محبت کا تعلق ایسا ہے جیسے باپ اور بیٹوں کے درمیان ہوتا ہے، اس تصور کے تحت خدا رسیدہ بزرگوں کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور پھر انہیں خدائی اختیارات کا حامل باور کرا کے دیوتا کے درجے پر فائز کر دیا گیا اور ان کی پوجا پاٹ شروع کر دی گئی ایک تیسرا تصور یہ رہا کہ اللہ اور انسانوں کے درمیان اس طرح کا رشتہ محبت ہے جس طرح دولہا دولہن یا میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔

اس تصور کے تحت کنواری عورتوں کو عبادت گاہوں میں وقف کیا جانے لگا وہ ساری زندگی شادی نہیں کراتیں جس طرح ہندوؤں کے مندروں میں دیو داسیاں اور گرجوں میں عیسائی راہبائیں ہوتی ہیں، اس کنوار پن نے انہیں بتدریج خدا کی محبوبائیں یا بیویاں بنادیا اور یوں انہیں بھی خدائی تقدس اور الوہی صفات کا حامل سمجھا جانے لگا۔

یہی تیسرا گروہ جاہل مسلمانوں میں آیا اور ملٹلوں کا ایک طبقہ معرض وجود میں آ گیا، جو عورتوں

کی طرح رنگ برنگ کے کپڑے پہنتا ہے، ہاتھوں اور پیروں میں کڑے اور چوڑیاں پہنے رہتا ہے عورتوں کی طرح ناچ گا کر اپنے میاں یعنی اللہ تعالیٰ کو مناتا ہے، اسی تصور نے مزید پھیلتے پھیلتے بزرگوں کے یوم وفات کو عرس (شادی کا دن) یا یوم وصال بنادیا یعنی وفات پا کر یہ بزرگ اپنے خواجہ (اللہ میاں) کی حرم سرا میں پہنچ گئے اس اعتبار سے یہ ان کی شادی کا دن ہے یا وصال یار (محبوب کی ملاقات) کا دن ہے اسی وجہ سے بزرگوں کیلئے اس حلقے میں وفات کا لفظ نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے اور وفات کو، وصال، سے تعبیر کیا جاتا ہے اسلئے ان کی وفات کے دن عرس (شادی) کے نام سے سب کچھ اسی لئے کیا جاتا ہے جو شادی کے موقع پر کیا جاتا ہے قبر کو غسل دیا جاتا ہے، ریشمی چادریں اس پر ڈالی جاتی ہیں، حتیٰ کہ رسم مہندی بھی ادا کی جاتی ہے پھر تبرک کے نام پر شرینی تقسیم ہوتی ہے اور لکڑی تقسیم اور ہانٹا جاتا ہے سلامی کے طور پر نذرانے چڑھائے جاتے ہیں، مزاروں کے بوسے لئے جاتے ہیں اور پھولوں کے ہاروں کا اہتمام ہوتا ہے،

یہ ہے عرب کی وہ حقیقت جس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں، فاعاذنا اللہ منہ، منقول از قبر پرستی ایک حقیقت پسندانہ جائزہ ص ۱۰۰ طبع مکتبہ ضیاء الحدیث رجب ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء۔

اولیاء کرام کا تہوار منانا

اولیاء کرام کا ادب و احترام کرنا ضروری ہے، انکی صحیح بات کو تسلیم کرنا باعث سعادت ہے اور ان کو بلاوجہ دکھ پہنچانا موجب خسران ہے، ارشاد ربانی ہے کہ

إِنَّ الدِّينَ فَتْنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ، (سورة البروج آیت ۱۰)

جو لوگ ایمان دار مردوں اور عورتوں کو محض ایمان کی وجہ سے تکلیف دیا کرتے ہیں پھر وہ توبہ بھی نہیں کرتے، ان کیلئے جہنم کا عذاب اور جلانے والی تکلیف ہے۔ (ثانی) ۸۵-۱۰

حدیث قدسی میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے

ہیں

من عادی لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب. الحدیث.

یعنی جو شخص میرے دوست کو تکلیف پہنچائے میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں، صحیح بخاری

ص ۹۶۳ ج ۲، ونبھتی ص ۳۳۶ ج ۳، و کتاب الاسماء والصفات ص ۲۵۱ ج ۲۔

ارشاد الہی اور اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اولیاء کرام سے عداوت کی بجائے محبت ہونی چاہیے اور جب وفات پا جائیں تو ان کیلئے رفع درجات اور مغفرت کی دعا کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے لیکن اس سے زائد انکی قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، فیض حاصل کرنا، ان کے نام کی نذر ماننا، ان کی قبر پر قرآن پڑھنا، یہ خیال کرنا کہ ان کی قبر پر دعا جلدی قبول ہوتی ہے، وہ رب کریم کے ایلچی ہیں ان کے وسیلہ سے بیڑا پار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو کائنات کا نظام سونپ دیا ہے وہ جو چاہے کر سکتے ہیں وغیرہ یہ تمام بدعات قبیحہ ہیں، اسی طرح ان کی وفات کے روز، دن کا تعین کر کے اجتماع کرنا جس کو عرس کہتے ہیں اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لا تجعلوا بیوتکم قبوراً ولا تجعلوا قبری عیداً و صلوا علی فان صلوتکم تبلغنی حیث کنتم۔

یعنی اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ اور نہ میری قبر کو عید بنانا، اور مجھ پر درود (وسلام) بھیجو جہاں کہیں بھی تم ہو (کیونکہ) تمہارا درود مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

سنن ابو داؤد مع عون ص ۱۷۱ ج ۲، و مسند احمد ص ۳۶۷ ج ۳۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سفر کر کے آنحضرت ﷺ کی قبر پر جانا کہ وہاں اجتماع ہو جائز نہیں کیونکہ زیارت قبر نبوی کا مقصود تو وہاں جا کر آپ علیہ السلام پر درود و سلام بھیجنا ہے، جب کہ درود و سلام اور دعا تو آپ علیہ السلام کو دور و نزدیک سے پہنچائی جاتی ہے، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا درود و سلام مجھے پہنچ جایا کرے گا، خواہ تم میری قبر سے قریب رہو یا دور، لہذا میری قبر کو زیارت گاہ بنانے کی ضرورت نہیں، بحوالہ ہدایۃ المستقید ص ۷۰ ج ۱ اس کے برعکس جب ایک شخص سفر طے کر کے جائے اور دیگر لوگ بھی اس کے ساتھ شامل ہوں تو یہ اجتماع عید کہلائے گا جسے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کیونکہ عربی زبان میں عید کا لفظ کسی اجتماع پر بولا جاتا ہے خواہ وہ اجتماع خوشی کا ہو یا غمی کا، لغت عرب کی امہات الکتاب میں یہی

معنی لکھا ہے چنانچہ علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں
والعید کل یوم فیہ جمع۔

اور عید کہتے ہیں کسی بھی دن کے اجتماع کو۔ لسان العرب ص ۳۱۹ ج ۳۔

یہی معنی علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی نے کیا ہے۔ تاج العروس من جواهر القاموس ص ۴۳۸ ج ۲۔

اسی کے قریب قریب ہی معنی صاحب، منجہد، نے کیا ہے۔ ص ۷۲۳،

علامہ وحید الزمان فرماتے ہیں کہ، عید، مجمع کا دن، لغات الحدیث ص ۲۱۹ ج ۳ کتاب، ع، مادہ، عود، مولانا غلام رسول سعیدی حنفی شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ فرماتے ہیں کہ جس دن لوگوں کا اجتماع ہو اس کو عید کہتے ہیں۔ شرح صحیح مسلم ص ۶۵۵ ج ۲۔

آئمہ لغت اور سعیدی صاحب کی صراحت سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ گئی کہ عربی زبان میں، عید، کا لفظ کسی اجتماع پر بولا جاتا ہے، ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ حدیث نبوی کا یہ معنی ہے کہ میری قبر پر اجتماع نہ کرنا، اور اجتماع کو مقرر کر کے کرنا ہی دراصل عرس ہے اور اس کی شریعت نے ممانعت فرمائی ہے، جب آپ ﷺ کی قبر انور پر عرس کرنا جائز نہیں تو کسی اور کی قبر پر کیسے جائز ہو گیا۔

مفتی صاحب کا معنی حدیث سے انکار

فرماتے ہیں کہ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ عید سے مراد لوگوں کا جمع ہونا ہے اور حدیث کے معنی ہیں کہ میری قبر پر جمع نہ ہو، تنہا تنہا آیا کرو،

عید کے دن خوشیاں منائی جاتی ہیں مکانات کی زینت و آرائشی ہوتی ہے کھیل کود بھی ہوتے ہیں یہی اس جگہ مراد ہے یعنی ہماری قبر انور پر حاضر ہو تو باادب آؤ یہاں آکر شور نہ مچاؤ کھیل کود نہ کرو، اگر قبر پر جمع ہونا منع ہے تو آج مدینہ منورہ کی طرف قافلے بھی جاتے ہیں بعد نماز پنج گانہ لوگ جمع ہو کر سلام عرض کرتے ہیں۔ جاء الباطل ص ۳۲۶ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ عید کا معنی، لوگوں کا جمع ہونا، ہمیں لغت عرب سے معلوم ہوا ہے، جیسا کہ پہلے باحوالہ

عرض کیا جا چکا ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ زیارت قبر نبوی کی طرف جانا بھی ناجائز ہوگا، تو اس میں تفصیل ہے کہ جانے والا اگر فقط قبر نبوی کی زیارت کیلئے سفر کرے تو ناجائز ہے، لیکن اگر مسجد نبوی کی زیارت اور وہاں نماز پڑھنے کیلئے سفر کرے تو تب قبر نبوی کی زیارت مستحب ہے۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

جس طرح عام قبروں کی زیارت مستحب ہے اسی طرح حضرت نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت بھی مستحب ہے ہاں صرف قبر مبارک کی زیارت کی نیت اور حصول ثواب کی امید کے لیے سفر کرنا اس کے لیے دلیل اور نص چاہیے جو یقیناً ذخیرہ اسلام میں سے نہیں مل سکے گی۔ (محمد حنفی گوندلوی)

ہماری طرف سے دنیا بھر کے مبتدعین کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی صحیح و معتبر دلیل سے یہ ثابت کر دیں کہ محض قبر نبوی کی زیارت کیلئے سفر کرنا جائز ہے (یہ ملحوظ رہے کہ زیارت قبر انور ہمارے نزدیک مشروع اور مستحب امر ہے) انکار فقط زیارت کی نیت سے سفر کرنے سے ہے، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

نہ کسی معتبر دلیل سے اس کا ثبوت دیا جاسکتا ہے کہ خیر القرون میں لوگ نماز پنج گانہ ادا کر کے اکٹھے ہو کر قبر انور کے ارد گرد کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھا کرتے تھے، یہ تمام باتیں مفتی صاحب کی خانہ ساز ہیں جو کہ سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

مفتی صاحب کی سوچ کی غلط کروٹ

مفتی صاحب نے مذکورہ حدیث کا مفہوم بگاڑتے ہوئے لکھا ہے کہ غید کے دن خوشیاں منائی جاتی ہیں مکانات کی زینت و آراستگی ہوتی ہے کھیل کود بھی ہوتے ہیں یہ ہی اس جگہ مراد ہے۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا قبور اولیاء پر عرس کے موقع پر یہ تمام کام ہوتے ہیں کہ نہیں؟ اگر ہوتے ہیں یقیناً ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے تو آج تک یہی کچھ دیکھا ہے کہ میلہ کے موقع پر کھیل کود کے علاوہ رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں، ڈھول کی دہل پر ملنگ

ناچتے ہیں، کنواری لڑکیوں کو حال پڑتے ہیں، نوجوان جوڑے جھولے پر بیٹھ کر اپنی فرینڈ کے ساتھ پیئنگ لیتے ہیں، بلکہ اگر یہ سمجھا جائے کہ اکثریت بھونڈی کرنے والوں کی ہوتی ہے، تو غلط نہ ہوگا، علاوہ ازیں قبر کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے اس پر چراغ و اوچھاڑ اور گلاب کے عرق سے غسل کا انتظام کیا جاتا ہے، معلوم نہیں کہ زینت و آرائشی اور کس بلا کا نام ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم عرض یہ کرنا چاہتے ہیں کہ لفظ، عید، میں کھیل کود کا مفہوم داخل نہیں، اس کا معنی فقط لوگوں کا جمع ہونا ہے، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ مفہوم سے مفتی صاحب کا دل بھی مطمئن نہ تھا تو ساتھ ہی یہ توجیہ بھی گھڑ دی کہ یا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم ہماری قبر پر جلد جلد آیا کرو مثل عید کے سال بھر بعد ہی نہ آیا کرو۔

اس معارضہ کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا عرس سال بھر کے بعد ہی نہیں آتا، کیا وہ سال میں صرف ایک ہی دفعہ نہیں کیا جاتا۔ بالفرض اگر مفتی صاحب کے اس مفہوم کو مان بھی لیا جائے تب بھی عرس اس حدیث کے خلاف ہی رہے گا، مگر مفتی صاحب ایسے معارضات کو پیش کر کے عرس کا جواز ثابت کرنے کے درپے ہیں۔

غالباً مفتی صاحب کتاب تحریر کرتے وقت محض چند حروف کے لکھنے کو ہی جواب تصور کرتے تھے۔ یہ سوچنے کی تکلیف نہیں کرتے تھے کہ یہ جواب ہمارے موافق ہے کہ نہیں، اے جی ہم نے آپ کا کلمہ نہیں پڑھا کہ آپ کی ہر بات (بے دلیل) کو آنکھیں بند کر کے قبول کرتے جائیں۔ آپ کی اس بات کو حدیث مذکورہ میں یہ الفاظ، تبلیغی حیث کنتم، رد کر رہے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو فرما رہے ہیں، لا تجعلوا قبری عیدا، مگر افسوس کہ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ جلد جلد آیا کرو عید کی طرح سال کے بعد ہی نہ آیا کرو،

لفظ، عید، کے یہ اچھوتے معنی لغت کی کس کتاب میں لکھے ہیں بحوالہ اس کی صراحت کیجئے، یہاں پر خلط بحث نہ کرنا، کہ فلاں کتاب میں ایسا لکھا، فلاں علامہ صاحب نے یہ مفہوم بیان فرمایا ہے، بلکہ صریحاً لغت کا حوالہ پیش کیجئے کہ عید کا معنی ہے جلد جلد آیا کرو، ورنہ، لعنت اللہ علی الکاذبین، کی وعید شدید سے ڈر جائیے،

مفتی صاحب کا اصل بحث سے فرار

شرعی اصول کا تقاضا ہے کہ جس کے ایمان کی گواہی خالق ارض و سماء نے نہیں دی، اس کے ظاہری اعمال حسنة کی وجہ سے حسن ظن رکھا جائے کہ وہ مسلمان اور مومن ہو کوفوت ہوا، مگر ہم کسی کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ولی اللہ تھا، چنانچہ ملا علی القاری حنفی المتوفی ۱۰۱۲ھ الفقیہ الاکبر، کی شرح میں فرماتے ہیں

واما غیرہ من الاولیاء والعلماء والاصفیاء بالاعیان فلانجزم بموتہم علی الایمان وان ظہر منہم خوارق العادات وکمال الحالات وجمال انواع الطاعات فان مبنی امرہ علی العیان وهو مستور عن افراد الانسان،

انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ اولیاء علماء اور صلحاء کے بارے متعین طور پر ہم بالجزم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی موت ایمان پر ہو ہے اگرچہ ان سے خوارق عادات کمال حالات اور جمال انواع طاعات ظہور پذیر ہوئے ہوں کیونکہ یقینی خبر کی بنیاد مشاہدہ (دیکھنے) پر ہے اور یہ مشاہدہ ہی افراد انسانی سے مستور ہے۔

شرح فقہ اکبر ص ۱۳۱ طبع مجتہائی دہلی، ص ۱۰۸ طبع قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی۔
اس عبارت سے ثابت ہوا کہ ہم کسی شخص کو یقینی طور پر ولی اللہ نہیں کہہ سکتے ہیں، جب کسی کی ولایت کا ہمارے پاس کوئی شرعی ثبوت ہی نہیں تو ہم کسی کا عرس کس طرح منائیں؟
اس حقیقت سے مفتی صاحب نے جس طرح جان چھڑائی ہے وہ قابل دید ہے فرماتے ہیں کہ زندگی کے ظاہری احکام بعد موت جاری ہوتے ہیں اور جو زندگی میں مسلمان تھا بعد موت بھی اس کو مسلمان سمجھ کر اس کی نماز جنازہ، کفن، دفن، میراث، کی تقسیم وغیرہ کی جاوے گی، اور جو زندگی میں کافر تھا بعد موت نہ اس کی نماز جنازہ ہوگی نہ کفن نہ گور نہ تقسیم میراث شریعت کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے فقط احتمال معتبر نہیں اسی طرح جو زندگی میں ولی ہو وہ بعد وفات بھی ولی ہے اگر محض احتمال پر احکام جاری ہوں تو کفار کی نماز جنازہ پڑھ لیا کرو شاید مسلمان ہو کر مرا ہو، اور مسلمان کو بے جنازہ پڑھے آگ میں جلا دیا کرو کہ شاید کافر ہو کر مرا ہو،

جاء الباطل ص ۳۲۴ ج ۱۔

یہ مانا کہ شریعت کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے لیکن اسکی صراحت تو کیجئے کہ اگر ظاہری حیثیت کے مطابق علم کافی ہے تو پھر ہر پابند شریعت مسلمان کا عرس کیوں نہیں منایا جاتا؟ اس لئے کہ قرآن کی رو سے ہر متقی مسلمان، ولی اللہ ہے، (سورۃ الانفال آیت ۳۴)

مگر آپ حضرات عرس فقط، پیر، کسی مسند یا درگاہ کا سجادہ نشین وغیرہ کا ہی مناتے ہیں، عوام الناس کا نہیں، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ فقط احتمال معتبر نہیں، تو یہ مفتی صاحب کی غلط بیانی ہے کیونکہ احتمال دلیل کو کمزور کر دیتا ہے چنانچہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے۔

اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، یعنی جب احتمال آجائے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے۔ فتاویٰ رضویہ ص ۲۹ ج ۴۔ لکھتا ہے کہ عقل ونقل کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، الامن والعلی ص ۱۶۸ طبع شبیر برادرز ۱۳۹۶ھ، دیکھئے مفتی صاحب احتمال کو معتبر نہیں مانتے مگر ان کا دادا استاذ اور مجدد بریلویت کہتا ہے کہ احتمال سے استدلال باطل ہو جاتا ہے۔ اور یہ عقل ونقل کا مسلمہ قاعدہ ہے۔

باقی رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ پھر مسلمانوں کو بے گور و کفن آگ میں جلا دیا کرو کہ ممکن ہے کہ وہ کافر ہو کر مرے ہوں، سرے سے قابل التفات ہی نہیں کیونکہ انکی ظاہری حیثیت کے مطابق ہم انہیں مسلمان جانتے ہیں، لہذا ان کی نمازہ جنازہ اور کفن اور دفن عین اسلامی تعلیم کے موافق ہے، جبکہ آپ حضرات بالجزم قبور میں مدفون حضرات کو ولی اللہ کہتے ہیں جو کہ رجیم بالغیب ہے۔ پھر انتہائی جذباتی انداز میں یہ کہنا کہ انہیں آگ میں جلا دیا کرو۔

اے جی ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے آگ میں جلانے سے منع فرمایا ہے، بخاری شریف باب حکم المرتد والمرتدة۔

جلانے والا مشورہ بریلویوں کو دیں جو خیر سے پہلے سے ہی ہندوؤں کی رسوم سے متاثر ہو کر عرس کا انعقاد کرتے ہیں ہم تو فرمان مصطفیٰ ﷺ کے سامنے آپ کی بات کو جوتی کی نوک پر بھی نہیں رکھتے۔

شریعت کی ظاہری پابندی مسلمان کو دنیا میں باز پرس سے نجات دلاتی ہے مگر اخروی کا تعلق رب تعالیٰ کی ذات سے وابستہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

امرت ان اقاتل الناس حتی يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله و
يقيموا الصلوة و يؤتوا الزكوة فاذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم و اموالهم الا
بحق الاسلام و حسابهم على الله.

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد و قتال کروں یہاں تک کہ وہ یہ گواہی دیں کہ اللہ
تعالیٰ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ اس کے رسول ہیں، اور نماز کو قائم کریں زکوٰۃ ادا
کریں پس جب وہ یہ کام کریں تو انہوں نے مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا، مگر یہ کہ حق اسلام
(یعنی قصاص اور حدود) میں، اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر۔

بخاری ص ۸ ج ۱، و مسلم ص ۷ ج ۱، مشکوٰۃ ص ۱۲ واللفظ لہ۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ایک کلمہ گو موحّد مسلمان جو شریعت کے ظاہر پر عمل کرتا ہے
اس سے معاملات مسلمانوں جیسے کئے جائیں گے، مگر اس کے اخروی معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا
جائے گا، بندہ جانے اور اس کا رب،

مگر مبتدعین اخروی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور قبر میں مدفون شخص کا عرس اس نیت سے
مناتے ہیں کہ یہ رب کا مقرب (ولی کا یہی معنی) ہے اور یہ عذاب قبر سے محفوظ ہو کر اپنے پروردگار
سے مل گیا ہے جسے یہ حضرات وصال سے تعبیر کرتے ہیں اگلے قدم میں یہ لوگ اسے رب قدیر کا
انپلجی اور دنیا میں تصرف فی الامور کا عہدہ سونپتے ہیں، تب اس کی قبر پر نذر و نیاز اور میلے ٹھیلے کا
انفقا د کیا جاتا ہے، جب کہ یہ تمام چیزیں رجماً بالغیب ہیں، اس کے ثبوت کیلئے انکے پاس کوئی قطعی
نص موجود نہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب غلط بحث کے شہسوار تھے کہ اسکے جواب کیلئے دنیا کے
معاملہ کو گھسیٹ لائے ہیں، پھر اس پر جو دلیل عنایت فرمائی ہے، اسے پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے
کہ۔

مشکوٰۃ کتاب الجنائز باب الممشی بالجنائزۃ میں بروایت مسلم و بخاری ہے کہ حضور علیہ السلام کے
سامنے ایک جنازہ گزرا جس کی لوگوں نے تعریف کی، فرمایا، وجبت، واجب ہو گئی، دوسرا جنازہ گزرا،
جس کی لوگوں نے برائی کی، فرمایا، وجبت، واجب ہو گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا

واجب ہوئی؟

فرمایا، انتم شهداء اللہ فی الارض، تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔
جس سے معلوم ہوا کہ عامۃ المسلمین جس کو ولی سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی ولی ہے،
مسلمانوں کے منہ سے وہی بات نکلتی ہے جو اللہ کے یہاں ہوتی ہے، اسی طرح جس کو مسلمان ثواب
جائیں حلال جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی باعث ثواب اور حلال ہے کیونکہ مسلمان اللہ کے گواہ
ہیں۔ جاء الباطل ص ۳۲۲ ج ۱۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک کی تعریف کی تو دوسرے کی مذمت بیان کی۔
ظاہر ہے کہ مدح سے نہ تو جنت واجب ہوتی ہے نہ جہنم میں دخول ہوتا ہے، آئیے ہم آپ کو
حدیث کا مفہوم سمجھا دیتے ہیں، وہ یہ کہ ان کلمات کو سن کر آنحضرت ﷺ ان کے اخروی ٹھکانے کے
متعلق خبر دی، پہلے کے بارے میں جنت کی بشارت سنائی تو دوسرے کے حق میں جہنم کا اعلان فرمایا،
یہ ملحوظ رہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فقط تعریف و مذمت بیان فرمائی اخروی ٹھکانے کے متعلق
لب کشائی نہیں کی، اخروی ٹھکانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بیان جاری فرمایا ہے، اور امام
الانبياء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان اور بیان ان دونوں کے اخروی مقام کے بارے میں ایک یقینی
علم ہے، جبکہ اس دور میں وفات پانے والوں کی تعریف و توصیف اور مذمت تو کی جاتی ہے مگر اس
مدح و قدح کی کوئی تصدیق کرنے والا ہمارے پاس موجود ہی نہیں، تو پھر ہم کیسے باور کر لیں کہ فقط
تعریف سے ہی جنت واجب ہوگئی۔

علاوہ ازیں ہم نے تو کئی بے دین جو زندگی میں علی الاعلان اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور
شعائر اسلام کی تضحیک کا سامان بہم پہنچاتے تھے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تو کجا حقوق العباد تک کا بھی
خیال نہیں رکھتے تھے بلکہ ظالم و جابر اور نہایت درجے کے عیاش اور بد معاش لوگ بھی جب وفات
پا جاتے ہیں، تو عامۃ المسلمین جب اس کے پسماندگان کے پاس تعزیت کیلئے جاتے ہیں تو کہتے ہیں
بہشتی میں بڑیاں خوبیاں تھیں، اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے اس پر رحمت کرے، اسکے دل میں ملک و
قوم کی بڑی ہمدردی تھی، حالانکہ ہوتا سب جھوٹ ہے۔

تو کیا مفتی صاحب اور ان کے متبعین ایسے شخص کو ولی اللہ ماننے کے لئے تیار ہیں، اگر ہیں تو

مبارک ہو۔

الغرض لوگوں کی مدح و قدح سے نہ کسی کی ولایت ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کو جہنم کا حق دار قرار دیا جاسکتا ہے، یہ پروردگار اور اس کے بندہ کا معاملہ ہے، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس شخص کی بھی تعریف کی تھی۔

جس نے غزوہ خیبر کے روز مال غنیمت سے ایک عدد چادر چوری کر لی تھی جب آنحضرت ﷺ واپس پلے تو راستے میں اسے ایک تیر لگا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا
ھنیا لہ الجنة، اسے جنت مبارک ہو، مگر آنحضرت ﷺ نے اسکی تردید کرتے ہوئے فرمایا

والذی نفسی بیدہ ان الشملة التي اخذها يوم خيبر من المغانم لم تصبها المقاسم لتشتعل عليه ناراً۔

یعنی اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ چادر جو اس نے خیبر کے روز مال غنیمت سے تقسیم سے پہلے لے لی تھی اس پر آگ بن کر شعلہ مار رہی ہے۔ بخاری ص ۹۹۲ ج ۲ و مسلم ص ۷۷۱ ج ۱۔ الحدیث

اس طرح کے واقعات کتب حدیث میں متعدد پائے جاتے ہیں۔

قارئین کرام دیکھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس شخص کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا اور جنت کے مبارک ہونے کے الفاظ کہے، بلکہ مسلم کے الفاظ ہیں کہ اسے شہادت مبارک ہو، مگر صحابہ کرام کے ان کلمات سے اس شخص کی ولایت ثابت ہونا تو کجا اس کا مال غنیمت سے چادر چوری کرنے کا جرم بھی معاف نہ ہوا، اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں آگ کی وعید شدید سنائی۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب یہ کہتے ہیں کہ جسے لوگ ولی اللہ کہہ دیں وہ حقیقت میں ولی ہی ہوتا ہے، لیکن امت اسلام کے سب سے بزرگ اور صاحب عظمت لوگوں (صحابہ کرام) کے کہنے سے وہ شخص نہ شہید ثابت ہوتا ہے نہ جنتی۔

مفتی جی عامۃ الناس کا کیا کہنا ہے، عوام تو ان لوگوں کو بھی ولی اللہ کہہ دیتی ہے جو ساری زندگی کبھی مسجد میں نہ گیا ہو، بلکہ بالکل ننگا پھرتا رہا ہو، بازار میں کھڑے ہو کر گزرنے والوں پر

گالیوں کی بوچھاڑ کرتا رہا ہو، مگر یہی شخص جب فوت ہو جاتا ہے تو مبتدعین کے عوام اسے مجذوب کہہ کر دفن کرتے ہیں اور اس پر عالی شان عمارت تعمیر کر کے، دربار فلاں بزرگ چشتی قادری وغیرہ کے القاب لکھواتے ہے، راقم الحروف نے یہ خبر متواتر سنی ہے کہ علماء و صلحاء اور عامۃ الناس کا چشم دید واقعہ ہے کہ گوجرانوالہ میں، جی ٹی ایس کے اڈہ کے قریب جو مزار تعمیر ہوا ہے وہ اسی قماش کا شخص تھا۔ شہر گوجرانوالہ میں اس پر ہزاروں شہادتیں مل سکتی ہیں، اگر آپ کو یقین نہ آئے، تو مولوی ابودود محمد صادق صاحب رضوی سے حلفاً پوچھ لیں، مجھے یقین کامل ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

میں نے اسے خود دیکھا تھا کہ وہ بالکل برہنہ تھا جسم میں صفائی نام کی کوئی شئی نہیں تھی غیر ضروری بال انتہا درجہ بڑھے ہوئے تھے اور وہاں سے بدبو کے فوارے پھوٹ رہے تھے مگر جب وہ رگیا تو اب وہاں اس کا بڑا خوبصورت اور منقش مزار تعمیر ہو چکا ہے اور وہاں باقاعدہ سالانہ عرس ہوتا ہے اور بڑے بڑے بریلوی علماء وہاں شرکت کرتے ہیں اور برہنہ اور شرم و حیا سے عاری بے غیرت شخص کے مناقب بیان کرتے ہیں اور اس کے لیے بڑے خوبصورت اشتہار اور اسکرز چھپتے ہیں۔ (گوندلوی)

الغرض اس طرح کی بیسیوں امثلہ پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہمارا منشور ان کا شمار کروانا نہیں، لہذا اس پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔

عرس اور فقہاء احناف

حضرت قاضی ثناء اللہ مرحوم پانی پتی حنفی فرماتے ہیں کہ

لايجوز ما يفعله الجهال بقبور الاولياء والشهداء من السجود والطواف حولها واتخاذ السرج والمساجد اليها ومن الا اجتماع بعد الحول كا لاعياد ويسمونہ عرسا۔

جاہل لوگ حضرات اولیاء و شہداء کے مزارات کے ساتھ جو معاملات کرتے ہیں وہ سب کے سب ناجائز ہیں مثلاً ان کو سجدہ کرنا، ان کے ارد گرد طواف کرنا، ان کی قبر پر چراغاں کرنا، ان کی

طرف سجدہ کرنا، ہر سال بعد ان کی قبر پر میلوں کا منعقد کرنا جس کا نام عرس ہے، تفسیر مظہری ص ۶۵ ج ۲۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں

لا تجعلوا زيارة قبري عيداً اقول هذا اشارة الى سد مدخل التحريف كما فعل اليهود والنصارى بقبور انبياءهم وجعلوها عيداً و موسماً بمنزلة الحج. یعنی آپ علیہ السلام نے (جو یہ فرمایا کہ) میری قبر کو عید نہ بناؤ، میں (شاہ ولی اللہ) کہتا ہوں اس میں اشارہ ہے کہ تحریف کا دروازہ بند کر دیا جائے، کیونکہ یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کو حج کی طرح عید اور موسم بنا دیا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۷۷ ج ۲، طبع المکتبۃ السلفیہ۔

نیز فرماتے ہیں

ومن اعظم البدع ما اخترعوا في امر القبور فاتخذوها عيداً. یعنی بڑی بدعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قبروں کے بارے میں بہت سی باتیں از خود گھڑی ہیں اور قبروں کو میلے کی حیثیت دے دی ہے، التفہیمات الہیہ ص ۶۴ ج ۲۔ مزید فرماتے ہیں کہ

عادت آتش پرستان وہم عادت بت پرستان ہند کہ روزے از روز ہائے معین در ہر سال عید می کنند و مجمع عام می نمایند، پیر پرستان نیز عید غدیر خم و عرس ہائے قبور بزرگان مقرر کردہ اند کہ چو تعیش آنہادر آن ایام داد عیش و طرب و لہو و لعب می دہند و ارواح خبیثہ شیاطین را خودسند ساختہ. یعنی آتش پرستوں اور بہتوں کی یہ عادت ہے کہ ایک دن مقرر کر کے (کسی تھان وغیرہ پر) جمع ہو کر عید مناتے ہیں، پیر پرست فرقتے نے بھی ان کے قدم بہ قدم کئی عیدیں بنا رکھی ہیں اور آئے دن کسی نہ کسی بزرگ کے ”مزار“ پر عرس رچاتے ہیں اور انہی کی طرح عیش و عشرت کر کے شیطان کو خوش کرتے ہیں۔ البلاغ المبین ص ۳۱۔

عرس کے دلائل اور ان کا تجزیہ مفتی صاحب کی پہلی دلیل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ عرس کے لغوی معنی ہیں شادی، اسی لئے دولہا اور دلہن کو عروس کہتے ہیں، بزرگان دین کی تاریخ وفات کو اس لیے عرس کہتے ہیں کہ مشکوٰۃ باب اثبات عذاب القبر میں ہے کہ جب نکیرین میت کا امتحان لیتے ہیں اور وہ کامیاب ہوتا ہے، تو کہتے ہیں

نم کنومة العروس التي لا يوقظه الا احب اهله اليه.

تم اس دلہن کی طرح سو جاؤ جس کو سوائے اس کے پیارے کے کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ چونکہ اس دن نکیرین نے ان کو عروس کہا اس لئے وہ دن روز عرس کہلایا، یا اس لئے کہ وہ جمال مصطفیٰ ﷺ کے دیکھنے کا دن ہے کہ نکیرین دکھا کر پوچھتے ہیں کہ تو ان کو کیا کہتا ہے؟ اور وہ خلقت کے دولہا ہیں تمام عالم ان ہی کے دم کی بہار ہے، اور وصال محبوب کا دن عرس کا دن ہے، لہذا یہ دن عرس کہلایا عرس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ ہر سال تاریخ وفات پر قبر کی زیارت کرنا اور قرآن خوانی و صدقات کا ثواب پہنچانا، اس اصل عرس کا ثبوت حدیث پاک اور اقوال فقہاء سے ہے، جاء الباطل ص ۳۲۲ ج ۱۔

مومن کے آرام قبر سے عرس کا اثبات

الجواب۔ اولاً۔ حضرت مفتی صاحب نے، عرس کے لغوی معنی، شادی تسلیم کرنے کے بعد یہ ثابت نہیں کیا کہ مرنیوالے کی کس سے شادی ہوتی ہے کہ اس کی وفات کے دن کو شادی (عرس) سے تعبیر کرتے ہیں۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا دفن کے بعد منکر و نکیر کے کہنے سے استدلال تو یہ صرف مبتدعین کا

وہم ہے، کیونکہ ملائکہ تو اسے، نم کنوۃ العروس، (دلہن کی طرح سو جا) کہتے ہیں عربی زبان کے جاننے والے طلباء اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ حرف، ک، سے فقط تشبیہ دی جاتی ہے جیسا کہ عربی کی ضرب المثل ہے، زید کا لاسد، یعنی زید شیر کی طرح ہے، اس کا یہ معنی نہیں کہ زید شیر ہے بلکہ زید کو شیر سے مشابہت دی گئی ہے۔

اسی طرح ملائکہ نے دفن ہونے والے کے آرام و راحت کو دلہن کی نیند سے تشبیہ دی ہے، چنانچہ ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں کہ

وانما شبه نومہ بنومۃ العروس، یعنی دفن ہونے والے کی نیند کو دلہن کی نیند سے مشابہت دی ہے۔ مرقاۃ ص ۲۰۴ ج ۱۔

مگر اس حقیقت کے برعکس مفتی صاحب کہتے ہیں کہ مرنے والے کو عروس (دلہن) کہا ہے، کاش حضرت مفتی صاحب نے کسی فاضل سے، شرح مللۃ عامل، ہی پڑھی ہوتی۔

ثالث۔ مفتی صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ اولیاء کا عرس منانا ضروری ہے، مگر جس حدیث سے استدلال کر رہے ہیں وہ ہر مومن کے بارے میں ہے، نہ کہ محض اولیاء کرام کیلئے اگر اس روایت سے استدلال صحیح ہے اور فی الواقع، عرس، کا اثبات ہوتا ہے تو پھر ہر مسلمان کا عرس منانا ضروری ہے مفتی صاحب کے دعوے اور دلیل میں سرے سے کوئی موافقت ہی نہیں، کیونکہ دعویٰ خاص اور دلیل عام دے رہے ہیں جو کہ ہر کلمہ گو کو اس کی قبر میں پیش آنے والے حالات کے بارے میں خبر دی گئی ہے۔

رابعاً۔ مفتی صاحب کی یہ پچر کہ وہ جمال مصطفیٰ علیہ السلام کے دیکھنے کا دن ہے..... اور وصال محبوب کا دن عرس کا دن ہے، الخ۔

تو یہ بھی مفتی صاحب کو سود مند نہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ سے زبردست عقیدت و محبت رکھتے تھے، مگر کسی ایک نے بھی ملاقات کے دن کو عرس منانے سے تعبیر نہیں کیا کیونکہ وہ عربی زبان سے کما حقہ واقف تھے وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ وصال محبوب کو عرس نہیں کہتے، مگر مفتی صاحب وصال محبوب کو عرس کہتے ہیں، جو غلط بیانی ہی نہیں پرلے درجے کی جہالت ہے، لغت کی کسی کتاب میں، عرس، کا معنی وصال محبوب، یا، وصال محبوب کا معنی، عرس، نہیں

لکھا یہ فقط مبتدعین کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

خامساً۔ مفتی صاحب کی تحریر کا انداز بتاتا ہے کہ انہوں نے مذکورہ روایت سے عرس کا جواز ثابت نہیں کیا بلکہ وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالی ہے جس میں انہوں نے غلطی کھائی ہے عرس کی وجہ تسمیہ پر پہلے عرض کیا جا چکا ہے لہذا اعادہ کی ضرورت نہیں۔

ملاحظہ

حضرت مفتی صاحب نے منکر و نکیر کے سوال، هذا الرجل، سے رسول اللہ ﷺ کا مومن کی قبر میں حاضر ہونے کا استدلال کیا ہے جس کے بارے میں مفصل بحث تو دین الحق کی جلد سوم میں رب قدیر کی رحمت سے تفصیل سے آ رہی ہے انشاء اللہ، مگر یہاں بھی اس کی قدرے وضاحت کر دینی خالی از فائدہ نہیں ہے۔

لفظ، هذا، بعض دفعہ ذہن میں موجود چیز کے استعمال پر بھی آتا ہے کیونکہ ذہن میں موجود چیز کی حیثیت موجود جیسی ہوتی ہے، گو اس کا استعمال کم ہے، مگر ہے ضرور۔ حدیث میں آتا ہے کہ مقام حدیبیہ پر مشرکین مکہ کی طرف سے شرائط صلح طے کرنے کی غرض سے بدیل بن ورقا سفارت پر آیا، نبی رحمت رسول مکرّم ﷺ سے گفت و شنید کر کے واپس آیا۔

فانطلق حتى اتى قريشاً قال انا قد جئناكم من عند هذا الرجل

جب قریش مکہ کے پاس گیا تو کہنے لگا ہم تمہارے پاس اس شخص کے پاس سے آئے۔ بخاری ص ۸۷۳ ج ۱۔

دیکھئے رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے کئی کلومیٹر دور حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے اور بدیل کفار مکہ کو، هذا الرجل، سے آنحضرت ﷺ کو تعبیر کرتا ہے۔ اسی طرح قبر کے سوال میں، هذا الرجل، ہے یہ بات نہیں کہ آپ علیہ السلام ہر قبر میں بہ نفس نفیس حاضر ہوتے ہیں، اگر ایسا ہوتا تو مومن کا جواب یہ ہوتا ہے، هذا رسول اللہ ﷺ (یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں) مگر مومن جواب میں یہ الفاظ نہیں کہتا بلکہ مومن غائب کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔

انہ عبد اللہ ورسولہ، وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، بخاری ص ۸۷۳ ج ۱ و ص ۱۸۳ ج ۱۔ اس کی مزید وضاحت حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب

ملائکہ مومن سے پوچھتے ہیں کہ

ما تقول فی هذا الرجل .

اس شخص کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے، تو مومن ملائکہ سے سوال کرتا ہے کہ، من؟ کون شخص؟

قال محمد ﷺ، فرشتے کہتے ہیں کہ محمد ﷺ، تو تب مومن کہتا ہے، انہ رسول اللہ ﷺ، یعنی وہ اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں۔ مسند امام احمد ص ۳۵۳ ج ۶، ودرمنثور ص ۸۳ ج ۴۔

علامہ ہیثمی فرماتے ہیں اس کے راوی صحیحین کے ہیں۔ مجمع الزوائد ص ۵۴ ج ۳۔ حدیث کے ان الفاظ سے ثابت ہوا کہ قبر میں رسول اللہ ﷺ بہ نفس نفیس نہیں ہوتے، ورنہ مومن کا سوال، من، بے مقصد ثابت ہوگا، اور یہ باطل ہے۔

پھر عہد رسالت میں ایک عورت مسجد کی صفائی کیا کرتی تھی، جب اس کا انتقال ہو گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ علیہ السلام کو اطلاع دیے بغیر دفن دیا، آنحضرت ﷺ کے سوال کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی وفات کی خبر دی، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا مجھے کیوں نہیں بتلایا گیا؟

عرض کی گئی کہ وہ کوئی خاص اہمیت کی حامل تھی، تب آپ علیہ السلام نے فرمایا، مجھے اس کی قبر بتلاؤ! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی راہنمائی سے آپ علیہ السلام اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کی قبر پر کھڑے ہو کر، فصلی علیہ، اس پر نماز جنازہ پڑھی۔ صحیح بخاری ص ۷۸ ج ۱۔

اگر رسول اللہ ﷺ قبروں میں خود تشریف فرما ہوتے تو ظاہر ہے کہ اس مرنے والی عورت کی قبر میں بھی حاضر ہوتے اور آپ علیہ السلام کو علم ہوتا کہ یہ تو وہی عورت ہے جو مسجد کی صفائی کرتی تھی لہذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، ثابت ہوا کہ منکر و نکیر کے سوال کے وقت آپ علیہ السلام قبر میں موجود نہیں ہوتے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

شامی جلد اول باب زیارت القبور میں ہے

وروی ابن ابی شیبہ ان النبی ﷺ کان یاتی قبور الشهداء باحد علی راس کل حول۔

ابن ابی شیبہ نے روایت کیا کہ حضور علیہ السلام ہر سال شہداء احد کی قبروں پر تشریف لے جاتے تھے۔ جاء الباطل ص ۳۲۲ ج ۱۔

یہی روایت مفتی صاحب نے تفسیر کبیر اور درمنثور کے حوالے سے مکرر نقل فرمائی ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ شہداء احد کی قبروں پر ہر سال جایا کرتے تھے؟

الجواب۔ اولاً۔ یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں قطعاً نہیں

علامہ شامی کا وہم اور مفتی صاحب کی اندھی تقلید ہے، حافظ ابن حجرؒ نے، الکافی الشاف فی تخریج احادیث الکشاف ص ۵۲۷ ج ۲، میں اسے تفسیر ابن جریر اور مصنف عبد الرزاق کی طرف منسوب کیا ہے مگر مصنف ابن ابی شیبہ کی طرف اس کی نسبت نہیں کی، راقم نے خود بھی گہری نظر سے، مصنف ابن ابی شیبہ، کو دیکھا ہے مگر اس میں یہ روایت خاکسار کو نہیں ملی،

علامہ سیوطی نے درمنثور ص ۵۸ ج ۴، میں اسے ابن جریر کے حوالے سے ہی نقل کیا ہے، باقی مفتی صاحب کا تفسیر کبیر سے نقل کرنا مصنف میں ہونے کی دلیل نہیں کیونکہ تفسیر کبیر ص ۴۵ ج ۱۹ طبع مصر ۱۹۳۸ء میں یہ روایت بغیر حوالے کے درج ہے۔

ثانیاً۔ مصنف عبد الرزاق میں مذکورہ روایت حسب ذیل سند سے مروی ہے

عبد الرزاق عن رجل من اهل المدينة عن سهيل بن ابي صالح عن محمد بن ابراهيم التيمي قال كان النبي الخ. ص ۵۷۳ ج ۳ رقم الحديث ۶۷۱۶ طبع المجلس العلمي ۱۹۷۱ء۔

امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں، سورة الرعد، کی آیت ۲۳ و ۲۴، کے تحت اس کو حسب ذیل سند سے نقل کیا ہے۔

حدثني المثنى قال حدثنا سويد قال اخبرنا ابن المبارك عن ابراهيم بن

محمد عن سهیل بن ابی صالح عن محمد بن ابراہیم قال کان النبی الخ۔

تفسیر ابن جریر ص ۴۲۷ ج ۱۶، بہ تحقیق محمود محمد شاہ طبع مصر ۱۹۶۹ء

(۱) ابن جریر کے قدیم نسخہ میں، سہل بن ابی صالح، ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

(۲) گو مصنف عبدالرزاق کی سند میں، عن رجل من اهل المدينة، راوی مبہم ہے مگر ابن

جریر کی سند میں اس کا متابع ابراہیم بن محمد موجود ہے۔

(۳) لیکن اس کے باوجود یہ روایت قابل حجت اور لائق استدلال نہیں ہے کیونکہ یہ ایک صغیر

تابعی محمد بن ابراہیم کی مرسل ہے اور مرسل روایت ضعیف ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل راقم نے، دین الحق ص ۶۵ ج ۱ میں عرض کر دی ہے۔

چلٹ۔ روایت مذکورہ میں اجتماع، قرآن خوانی، مجلس وعظ کرنے اور قبر کو گلاب کے عرق سے غسل دینے کا کہیں ذکر ہی نہیں جو کہ عرس کے لوازمات سے ہیں۔

رابعاً۔ پھر مفتی صاحب نے متن روایت میں لفظ، راس، کا معنی چھوڑ دیا ہے، جو کہ ان کے استدلال کی خامی واضح کرتا تھا، عربی زبان میں لفظ، راس، کسی بلندی کی چوٹی کو کہتے ہیں، اور اسی بنا پر انسانی جسم میں سر کو راس کہا جاتا ہے کیونکہ یہ انسانی باڈی و تن میں جسم کا آخری حصہ ہوتا ہے اور جب یہ کسی وقت و زمانہ کی طرف مضاف ہو تو اس سے پہلایا آخری وقت یا دن مراد لیا جاتا ہے۔ حدیث نبوی علیہ التحیۃ والسلام میں ہے کہ۔

ان الله يبعث لهذه الامة على رأس كل مائة سنة، من يجدد لها دينها۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آخر میں اس امت (کی اصلاح) کیلئے ایک شخص مبعوث کرے گا جو دین کی تجدید کریگا۔

سنن ابو داؤد مع عون ص ۸۷ ج ۴، و مستدرک حاکم ص ۵۲۲ ج ۴، و المعجم الاوسط للطبرانی

ص ۷۲ ج ۷۔

جمہور محدثین و فقہاء اور آئمہ لغت کے نزدیک مذکورہ حدیث میں صدی کا آخر مراد ہے، جس کی ضروری تفصیل، عون المعبود ص ۱۷۸ تا ۱۸۲ ج ۴ میں دیکھی جاسکتی ہے، اس معنی کو ہی شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے، احصاء المعانی ص ۱۸۲ ج ۱، میں اختیار کیا ہے۔

الغرض لفظ، راس، کا معنی، آخرہ، عربی میں مستعمل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد، الطرف (کنارہ) ہوتا ہے خواہ ابتدا میں ہو یا آخر میں چنانچہ ملا علی قاری حنفی فرماتے ہیں

ای انتھائہ او ابتدائہ، یعنی کسی چیز کا اول یا آخر، مرقاۃ ص ۳۰۱ ج ۱۔

اگر اس کے معنی میں وسعت تسلیم کرتے ہوئے کسی چیز کا کنارہ تسلیم بھی کر لیا جائے، تو تب بھی یہ روایت مفتی صاحب کے مخالف ہی رہے گی، کیونکہ غزوہ احد ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں ہوا تھا، ضیاء النبی ص ۴۶۱ ج ۳ مؤلفہ پیر کرم شاہ بھروی بریلوی، اگر آنحضرت ﷺ کا شہدا احد کی قبور کی طرف سفر عرس کیلئے ہوتا تو ماہ شوال میں ہوتا کیونکہ بقول مفتی صاحب عرس تو کہتے ہیں ہر سال تاریخ وفات پر قبر کی زیارت کرنا اور قرآن خوانی و صدقات کا ثواب پہنچانا۔ جاء الباطل ص ۳۲۲۔

مگر آنحضرت ﷺ شوال کی بجائے سال کے ابتدا میں یا آخر میں مقام احد پر تشریف لے جاتے تھے جس میں نہ قرآن خوانی ہوتی تھی نہ ایصال ثواب نہ مجلس وعظ کا بیان ہے، نہ ڈھول کی دہل کا۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب اس سے عرس کا جواز ثابت کر رہے ہیں، لیکن جو لفظ ان کے استدلال باطل کو رد کرتا تھا اس کا معنی ہی چھوڑ دیا ہے، اس طرح کی بے ایمانیوں سے ان کی کتاب بھری پڑی ہے مگر مبتدعین انہیں حکیم الامت کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

عرس زیارت قبور اور صدقہ خیرات کا مجموعہ ہے، زیارت قبور بھی سنت، صدقہ بھی سنت تو دو سنتوں کا مجموعہ حرام کیونکر ہو سکتا ہے؟

مشکوٰۃ باب زیارة القور میں ہے کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ضرور زیارت کیا کرو اس سے ہر طرح کی زیارت قبور کا جواز معلوم ہوا خواہ روزانہ ہو یا سال کے بعد اور خواہ تنہا زیارت کی جائے یا کہ جمع ہو کر اب اپنی طرف سے اس میں قیود لگانا کہ مجمع کے ساتھ زیارت کرنا منع ہے سال کے بعد مقرر کر کے زیارت کرنا منع ہے محض لغو ہے معین کر کے ہو یا بغیر معین کئے ہر طرح جائز

ہے۔ جاء الباطل ص ۳۲۳ ج ۱۔

کیا جب کیفیت بدل جائے تو حکم شرعی میں تبدیلی آ جاتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب کا عرس کو زیارت اور صدقہ کا مجموعہ قرار دینا غلط بیانی ہی نہیں، ہٹ دھرمی اور کھلا ہوا تعصب ہے، ہم ارباب عقل و خرد کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے کسی بھی مزار پر جا کر عرس کا مشاہدہ کریں تو وہ اس حقیقت کو بخوبی معلوم کر لیں گے کہ عرس کے کئی دیگر بھی لوازمات ہیں جنہیں مفتی صاحب نے ذکر نہیں کیا، مثلاً موسیقی، ڈھول کی تھاپ پر مملنگوں کا رقص، رنڈیوں کے مجرا پر اوباش قسم کے لوگوں کا تہقبہ لگا کر روپے نچھاور کرنا، لچوں کا عورتوں سے اختلاط پر اشارہ بازی، لوگوں کا قبروں پر سجدہ کرنا، کئی اور چیزیں بھی آپ کو دیکھنے میں ملیں گی، اہل بصیرت کئی اور باتوں کو اخذ کر کے مفتی صاحب کی بات کی پر زور مذمت کریں گے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ استدلال کہ دو سنتوں کا مجموعہ بھی سنت ہی رہے گا، اصول کی کس کتاب میں ایسا لکھا ہے، ذرا بحوالہ اس کی صراحت تو کیجئے، تھوڑی سی عقل و خرد کا مالک شخص بھی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا، ہم مبتدعین کو دعوت فکر دیتے ہوئے چند چیزوں کی نشان دہی کرتے ہیں

(۱) اللہ تعالیٰ کو رکوع و سجود کرنا حکم شرعی ہے، قرآن پڑھنا بھی حکم شرعی ہے، کیا ان دونوں کا مجموعہ جائز ہوگا، یعنی رکوع و سجود میں قرآن پڑھنا جائز ہے؟

(۲) نوافل پڑھنا جائز و مستحب اور سنت خیر الانام سے ثابت ہیں ان کا جماعت کے ساتھ پڑھنا بھی سنت ہے اس طرح جماعت کے لیے اذان کہنی بھی سنت ہے تو کیا نفلی نماز کے لئے اذان کہنی سنت ہوگی؟ مگر ان دونوں کے مجموعہ کو بریلوی بھی بدعت سنہی ہی کہتے ہیں اور تداعی سے نوافل کی جماعت کو ناجائز کہتے ہیں۔

(۳) انگور اور پانی دونوں حلال و طیب ہیں مگر ان کے مجموعہ میں جب جوش آجائے تو بریلوی بھی اسے شراب سے تعبیر کر کے حرمت کا فتویٰ لگاتے ہیں۔

(۴) قضاے حاجت کے وقت بیت اللہ کی طرف منہ نہ کرنا سنت ہے، اور اذان کا جواب دینا بھی سنت ہے اب اگر کوئی شخص ان دونوں سنتوں کو بیک وقت جمع کرے تو بقول مفتی صاحب وہ جائز ہی ہیں، انا للہ انا الیہ راجعون۔

خلاصہ یہ کہ یہ اصول ہی سرے سے درست نہیں کہ دو مباح و مستحب اور سنت کے مل جانے سے ان کا مجموعہ بھی سنت ہی رہے گا، کیونکہ دو چیزوں کے ملاپ سے ان کی ہیئت بدل جاتی ہے اور کیفیت بدلنے سے حکم بھی بدل جاتا ہے۔

مثال کے طور پر چند چیزوں کی ہم نشان دہی کرتے ہیں

(۱) بیوی کی بہن سے شادی کرنا حرام ہے (سورۃ النساء ۲۳) مگر جب مرد کی بیوی فوت ہو جائے یا طلاق دے دی جائے تو اب سالی سے شادی کی جاسکتی ہے کیونکہ ہیئت بدلنے سے حکم بدل گیا۔

(۲) رمضان المبارک کے مہینہ میں رات کو بیوی سے مباشرت کرنی جائز ہے مگر معتکف کیلئے ناجائز ہے کیونکہ کیفیت بدل جانے سے حکم شرعی بھی بدل گیا۔

(۳) کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن بھول کر کھاپی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ دونوں کے کھانے کی کیفیت جدا جدا ہے۔

(۴) صحیح حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لینے کے متعلق دریافت کیا تو آپ علیہ السلام نے اجازت دے دی، پھر دوسرا آیا تو اس نے بھی یہی پوچھا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا، حدیث کے آخری الفاظ ہیں،
الذی رخص له شیخ والذی نہاہ شاب۔

یعنی جسے اجازت دی وہ بوڑھا تھا جسے منع فرمایا وہ نوجوان تھا،

سنن ابو داود مع عون ص ۲۸۵ ج ۲، و بیہقی ص ۲۳۱ ج ۲۔

اب دیکھنے میں تو دونوں ہی مسلمان کلمہ گو تھے مگر ایک کو اجازت عنایت فرمائی، دوسرے کو روک دیا، کیوں؟ اس لئے کہ دونوں کی کیفیت ایک نہ تھی۔

(۵) ایک مسلمان خاتون نے رات کو رمضان المبارک کا روزہ رکھنے کی نیت کی مگر جب سحری کھانے کیلئے بیدار ہوئی تو ماہواری کا خون جاری ہو چکا تھا، لیکن اب روزہ نہیں رکھ سکتی (گو اس نے نیت کر رکھی تھی) کیوں؟ اس لئے کہ اس کی کیفیت بدلنے سے حکم بدل گیا۔

(۶) ایک شخص جو صبح کے وقت دیوانہ تھا تو شرعی طور پر مرفوع القلم تھا مگر وہی شخص ظہر کے

وقت دیوانہ رہا تو اب وہ مرفوع القلم نہ رہا، نماز ظہر اور دیگر شرعی احکام اس پر جاری ہو جائیں گے، کیوں؟ اس واسطے کہ اس کی ہیت بدلنے سے شرعی حکم میں تبدیلی آگئی۔

اس طرح کی میسوں امثلہ دی جاسکتی ہیں مگر انہیں پر اکتفا کر رہا ہوں، الغرض یہ بنیادی اصول اور ضابطہ ہے کہ کسی چیز کی ہیت بدل جانے سے اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے مگر افسوس کہ مفتی صاحب ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس پر بضد ہیں کہ دو چیزوں کے مجموعہ سے بھی وہی حکم رہتا ہے جو کہ ان کے جدا جدا میں تھا۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

عرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے اور لوگ جمع ہو کر قرآن خوانی، کلمہ طیبہ، درود پاک وغیرہ پڑھتے ہیں بہت سی برکات جمع ہو جاتی ہیں، ایک پیر کے مریدین اس تاریخ میں اپنے پیر بھائیوں سے بلا تکلف مل لیتے ہیں جس سے ایک دوسرے کے حلاوت سے واقفیت ہوتی ہے اور آپس میں محبت بڑھتی ہے طالبان کو پیر تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے اگر عرس میں پہنچے تو وہاں مختلف بزرگان دین جمع ہوتے ہیں علماء صوفیاء کا مجمع ہوتا ہے سب کو دیکھ کر جس سے عقیدت ہو اس سے بیعت کر لے، حج اور زیارت مدینہ منورہ بھی تاریخ مقررہ میں ہی ہوتے ہیں اس میں بھی گزشتہ فوائد ملحوظ ہیں۔ جاء الباطل ص ۳۲۲ ج ۱۔

کیا عرس میں حج جیسے فوائد ہیں؟

الجواب - اولاً۔ حج تو ایک مخصوص شرعی عبادت ہے جس کی شریعت حقہ نے حدود و قیود بیان فرمائیں ہیں جبکہ عرس کی کسی شق کو دین اسلام نے بیان ہی نہیں فرمایا، یہ یار لوگوں کی ایجاد ہے جو شعائر اسلامی (حج) کے بالمقابل وضع کیا گیا ہے جس کا اعتراف خود مفتی صاحب نے کر لیا ہے، جب مبتدعین کے حکیم الامت کو اقرار ہے کہ عرس میں وہی فوائد ہیں جو بیت اللہ میں ہیں تو گویا دوسرے لفظوں میں انہوں نے یہ مان لیا کہ عرس میں وہی برکات ہیں جو حج بیت اللہ میں ہیں اور حج

کی برکات کو عرس میں شامل ہونے سے حاصل کیا جاسکتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، جب بریلوی مکتب فکر کا جید عالم عرس کو حج بیت اللہ کے مساوی قرار دیتا ہے تو اس کے شرک و بدعت ہونے میں کیا کلام ہے۔

یہی مرزائی کہتے ہیں کہ، ہمارا جلسہ بھی حج کی طرح ہے، حج خدا تعالیٰ نے مومنوں کی ترقی کیلئے مقرر کیا تھا آج احمدیوں کیلئے دینی لحاظ سے تو حج مفید ہے مگر اس سے جو اصل غرض یعنی قوم کی ترقی تھی وہ انہیں حاصل نہیں ہو سکتی..... اس لئے خدا تعالیٰ نے قادیان کو اس کام کیلئے مقرر کیا ہے۔ مرزے محمود کا خطبہ جمعہ مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۱۴ء مندرجہ (مرزائی) اخبار الفضل مورخہ ۳ جنوری ۱۹۱۵ء بحوالہ خطبات محمود ص ۲۳۶ ج ۴، طبع فضل عمر فاؤنڈیشن ربوہ بدون تاریخ۔

متنبی قادیان مرزا غلام احمد قادیانی کالخت جگر اور جانشین ثانی، اپنے سالانہ جلسہ کی برکات کو حج بیت اللہ کی برکات جیسی کہتا ہے اور مفتی صاحب عرس کی برکات کو حج بیت اللہ کی برکات جیسی باور کراتے ہیں۔

بت کرے آرزو خدائی کی شان ہے تیری کبریائی کی،

خیر مفتی صاحب جو بھی کہیں انکا منہ تو بند نہیں کیا جاسکتا، لیکن اتنا تو ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ عرس کے باطل و مردود ہونے کیلئے بس یہی کافی ہے کہ یہ حج جیسے شعائر اللہ کی طرح منایا جاتا ہے اور حج کی طرح اس سے برکات حاصل کرنے کا زعم باطل اور عقیدہ رکھا جاتا ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ دن مقرر کرنے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے، لیکن زیارت قبور کیلئے جمع ہونے کی کوئی دلیل شرعی تو وہ ندارد مفتی صاحب کی یہ بات تو تب قابل غور تھی جب وہ زیارت قبور کیلئے جمع ہونے کی دلیل عنایت فرماتے، اور تاریخ کو مقرر کرنے میں سہولت کا بہانا پیش کرتے، مگر افسوس کہ مفتی صاحب بنیاد تو ثابت نہیں کرتے لیکن چھت کے فوائد گنوانے بیٹھ گئے ہیں۔

ثالثاً۔ پیر بھائیوں سے ملاقات اور پیر کی تلاش میں آسانی کا ڈھکوسلہ سرے سے قابل التفات ہی نہیں، ایک مسلمان کلمہ گو اور مومن کو بھلا پیر کی تلاش کی سرے سے ضرورت ہی کیا ہے، ان کا ہادی و رہنما تو فقط ایک ہی ہے اور وہ جناب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات مقدسہ و طاہرہ ہے، پھر

پیر کی تلاش کیلئے عرس کی کوئی عقلی و نقلی دلیل تو وہ سرے سے ہی مفقود ہے۔

پھر قابل غور بات تو یہ ہے کہ عرس تو منایا جا رہا ہے قبر میں مدفون شخص کا اور فوائد بیان کیے جا رہے ہیں زائرین کے، کہ یہاں آنے والوں کی بہم ملاقات ہوگی، اور لوگ پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ دعویٰ اور دلیل میں کونسی مناسبت ہے، دعویٰ تو عرس منانے کا، مگر اس کی دلیل دینے کے بجائے اس کے فوائد کو بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔

اگر بالفرض مفتی صاحب کے بیان کردہ فوائد کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ جس چیز میں کوئی فائدہ ہو تو وہ چیز حلال و طیب اور مباح ہے قرآن حکیم نے شراب کو حرام کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے

و منافع للناس۔ اور (اس میں) لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں۔ (البقرہ ۲۱۹)

اب اگر کوئی شخص شراب کے فوائد بیان کر کے اس کی حلت ثابت کرے تو مبتدعین بھی ایسے مجتہد کو دماغی اپریشن کا مشورہ دیں گے۔

یہی ہم عرس کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ عرس منانے کی کوئی دلیل شرعی عنایت کیجئے، اپنے قیاس فاسد سے اس کے فوائد بیان نہ کیجئے۔

کیا قبر پر قرآن پڑھنا جائز ہے

حضرت مفتی صاحب نے عرس کے جواز کیلئے ایک دھکوسلہ یہ بھی پیش فرمایا ہے کہ عرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے اور لوگ جمع ہو کر قرآن خوانی، کلمہ طیبہ، درود پاک وغیرہ پڑھتے ہیں، بہت سی برکات جمع ہو جاتی ہیں۔ جاء الباطل ص ۳۲۳ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قبر پر جمع ہو کر یا انفرادی طور پر تلاوت قرآن اور کلمہ و درود کے ورد کی کوئی دلیل مفتی صاحب نے درج نہیں کی، حالانکہ مفتی صاحب کا حق تھا کہ اس کی کوئی دلیل درج کرتے، سنت خیر الانام (ﷺ) سے اس کا ثبوت دیتے، چونکہ اس کی کوئی دلیل شریعت میں نہ تھی لہذا مفتی صاحب نے اس سے خاموشی سادھ لی۔ جب یہ اجتماع ہی بدعت قبیحہ ہے تو لوگوں کا تلاوت قرآن وغیرہ کے

لئے جمع ہونے کا کیا معنی ہے۔

ثانیاً۔ فقہاء احناف کی عبارات پہلے ذکر کردی گئی ہیں، جو چیز سنت سے ثابت نہیں اس کا قبرستان میں کرنا مکروہ تحریمی ہے، جب کہ تلاوت قرآن اور کلمہ طیبہ، درود کا ورد، قبر پر کرنا سنت سے ثابت نہیں لہذا بدعت قبیحہ اور مکروہ تحریمی ہے، جو اس کے جواز کا قائل ہے وہ کسی واضح دلیل سے اس کا ثبوت دے۔

ثالثاً۔ بلکہ سنت سے یہ ثابت ہے کہ قبر کی زیارت کے وقت مدفون کے لئے دعا کرے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں قبرستان والوں کیلئے کیا کہوں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا تم کہا کرو۔

السلام علی اهل الدیار من المومنین و المسلمین و یرحمہ اللہ المستقدمین منا و المستأخرون و انا ان شاء اللہ بکم للاحقون۔ صحیح مسلم ص ۳۱۲ ج ۱۔
اسی کے قریب قریب ہی الفاظ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ جب نبی ﷺ قبرستان کی طرف جاتے تو ہمیں یہ کلمات سکھاتے تھے۔ دیکھئے مشکوٰۃ ص ۱۵۴ ج ۱، و مسلم ص ۳۱۲ ج ۱۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ قبرستان جا کر صرف سلام اور دعا مانگنے کی رسول اللہ ﷺ نے ﷺ فرمائی ہے، قرآن کی قراۃ اور دیگر ذکر و اذکار کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے نہیں دی، اگر وہاں تلاوت قرآن اور کلمہ وغیرہ کا ورد کرنا جائز ہوتا تو آنحضرت ﷺ کبھی بھی نہ چھپاتے بلکہ ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان کے پڑھنے کی تاکید کرتے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا اس کی امت کو اطلاع فرماتیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اس کا خوب چرچا ہوتا، لیکن سنت سے قطعاً ثابت نہیں، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روضہ اقدس پر اس کا خوب انعقاد کرتے اور اپنے والدین اور عزیز و اقارب کی قبروں پر جوق در جوق جا کر تلاوت قرآن اور درود و کلمہ کا ورد کرتے، مگر انہیں معلوم تھا کہ اس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، لہذا انہوں نے سنت صحیحہ کو لازم پکڑا اور جب بھی قبرستان جاتے تو مسنون طریقہ سے دعا و سلام کر کے واپس آجاتے۔

بلکہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبرستان تلاوت قرآن کا محل نہیں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ

رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لا تجعلوا بيوتكم مقابران الشيطان ينفر من البيت الذي تقرأ فيه سورة البقرة.

یعنی اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ بیشک شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے۔ صحیح مسلم ص ۲۶۵ ج ۱، و مسند احمد ص ۳۷۸ ج ۲۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قبرستان قرآن پڑھنے کی جگہ نہیں، یہ حدیث اسی طرح جس طرح حسب ذیل فرمان نبوی ہے

صلوا فی بیوتکم ولا تتخذوها قبوراً.

یعنی اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور انہیں قبریں نہ بناؤ۔

صحیح مسلم ص ۲۶۵ ج ۱، و ابوداؤد ص ۲۰۲ ج ۱، و نسائی

ص ۱۹۰ ج ۱، و ترمذی مع تحفہ ص، و مسند احمد ص ۱۲۳ ج ۳، و طبرانی کبیر ص ۲۵۸ ج ۵، و ابن ابی شیبہ ص ۲۵۵ ج ۲، و التمهید ص ۲۲۹ ج ۵۔

اس سے ثابت ہوا کہ قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح قبرستان میں قرآن کی تلاوت بھی درست نہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے استاذ شیخ علی متقی فرماتے ہیں

الا ول الاجتماع للقراءة بالقران على الميت بالتخصيص في المقبرة او المسجد او البيت بدعة مذمومة.

یعنی تخصیص کے ساتھ قبرستان یا مسجد میں یا گھر میں میت کے لئے قرآن کیلئے جمع ہونا بدعت مذمومہ ہے۔

رسالہ رد بدعات بحوالہ فتاویٰ نذیریہ ص ۱۷۷ ج ۱۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں

وعادت نبود کہ برائے میت جمع شوند و قرآن خوانند و ختمات خوانند نہ بر سر گور نہ غیر آن این

بدعت است۔ مدارج النبوة بحوالہ ایضاً ص ۱۷۷ ج ۱۔

اس کے بدعت مذمومہ اور حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تلاوت قرآن فی نفسہ عبادت ہے اور قبریں محل عبادت نہیں۔

شیخ الاسلام امام تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں،

وأما جعل المصاحف عند القبور لمن يقصد قراءة القرآن هناك، و تلاوة فبدعة منكرة، لم يفعلها أحد من السلف، بل هي تدخل في معنى، اتخاذ المساجد على القبور، وقد استفاضت السنن عن النبي ﷺ في النهي عن ذلك، حتى قال، لعن الله اليهود والنصار، اتخذوا قبورا نبياهم مساجداً، يحذر ما صنعوا. قالت عائشة، و لولا ذلك لأبرز قبره، ولكن كره أن يتخذ مسجداً، و قال إن من كان قبلكم كانوا يتخذون القبور مساجد، ألا فلا تتخذوا القبور مساجد، فاني انهاكم عن ذلك، ولا نزاع بين السلف والائمة في النهي عن اتخاذ القبور مساجد، و معلوم انالمساجد بنيت للصلاة و الذكر و قراءة القرآن، فاذا اتخذ القبر لبعض ذلك كان داخلا في النهي. ولو كان الميت ينتفع بمثل ذلك لفعله السلف، فانهم كانوا اعلم بما يحبه الله و يرضاه، واسرع الى فعل ذلك و تحريره،

یعنی قبر کے پاس قرآن کو اس مقصد کے لئے رکھنا کہ اس کی وہاں تلاوت کی جائے، بدترین بدعت ہے، سلف صالحین میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کیا، بلکہ یہ قبروں کو مساجد بنانے کے معنی میں داخل ہے، اور نبی کریم ﷺ کی سنت سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، حتیٰ کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی قبروں کو مساجد بنالیا، اس فرمان میں آپ علیہ السلام نے (اپنی امت کو) ڈرایا ہے جو یہود و نصاریٰ نے کیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمائی ہیں کہ اگر اس کا خوف نہ ہوتا تو آپ علیہ السلام کی قبر اطہر کو باہر کھلی جگہ پر بنایا جاتا لیکن آپ علیہ السلام کو یہ ناپسند تھا کہ اسے مسجد بنالیا جائے، اور آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلی اقوام (اپنے انبیاء) کی قبروں پر مسجد بنا لیتی تھیں۔ آگاہ رہو کہ قبروں کو مسجد نہ

بنانا، میں اس چیز سے اپنی امت کو منع کرتا ہوں،

آئمہ سلف صالحین میں اسکی ممانعت میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ معلوم ہے کہ مساجد کو نماز پڑھنے ذکر اور قرآء قرآن کے لئے بنایا جاتا ہے، اور قبر کو جب ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی لازم و مخصوص کر لیا تو یہ بھی میں داخل ہوا، اگر میت ان چیزوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکتی تو آئمہ سلف اس کو ضرور کرتے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی راہوں کو زیادہ جانتے تھے، اور نیک عمل کرنے اور اس پر رغبت دینے میں بھی جاری کرنے والے تھے۔ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۳۰۲ ج ۲۴۔ ملا علی القاری حنفی شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں کہ۔

ثم القراءة عند القبور مكروهة عند أبي حنيفة و مالك و احمد و رحمهم الله في رواية لانه محدث لم ترد به السنة،

یعنی امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام احمدؒ کے نزدیک قبروں کے پس قرآن کی تلاوت کرنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ (عمل) من گھڑت ہونے کے علاوہ سنت سے ثابت نہیں ہے، شرح فقہ اکبر ص ۱۳۱ طبع قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی بدون تاریخ۔

باب بحث سفر عرس

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ عرس بدعتِ سیئہ ہے تو اس کیلئے سفر بھی بدعت ہی ہوگا، کیونکہ جو کام برا ہے اس کیلئے سفر بھی جائز نہیں۔

عرس بری بدعت ہے تو اس کیلئے سفر بھی ناجائز ہی ہوگا، پھر خاص طور پر کہ جب اس سفر سے مقصود یہ ہوگا کہ وہاں تقرب حاصل ہوگا، وہاں دعا جلدی قبول ہوتی ہے الغرض کسی ولی کی قبر یا اس کے محل عبادت کو مخصوص کر کے سفر کرنا کہ وہاں اعتکاف کروں گا یا نوافل ادا کروں گا، وغیرہ تو یہ تمام امور بدعتِ قبیحہ اور ناجائز ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ قبروں کی زیارت مستحبِ عمل ہے لیکن اس کیلئے سفر کرنا ناجائز ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فقط زیارت کی نیت سے سفر حرام ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

(۱) عن النبی ﷺ قال لا تشد الرحال الا الى ثلاثة مساجد المسجد الحرام و مسجد الرسول و مسجد اقصیٰ .

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ نہ سفر کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف مسجد حرام (کعبہ) مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی طرف۔

بخاری ص ۱۵۸ ج ۱، واللفظ لہ و مسلم ص ۴۷ ج ۱ .

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

(۲) قال رسول اللہ ﷺ لا تشد الرحال الا ثلاثة مساجد المسجد الحرام و

مسجدی هذا و مسجد اقصیٰ .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کجاوے اور زین باندھے نہ جائیں (یعنی سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف، ایک مسجد حرام اور میری یہ مسجد، اور مسجد اقصیٰ۔

ترمذی مع تحفه ص ۲۷۰ ج ۱، و اللفظ لہ، و بخاری ص ۱۵۹ ج ۱، و

مسلم ص ۴۳۳ ج ۱ .

یہ احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ کی طرف تقرب کی نیت سے سفر کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں

كان اهل الجاهلية يقصدون مواضع معظمة بزعمهم يزورونها ويتبركون بها وفيه من التحريف والفساد ما لا يخفى فسد النبي ﷺ الفساد لئلا يلتحق غير الشعائر بالشعائر ولئلا يصير ذريعة لعبادة غير الله والحق عندى ان القبر و محل عبادة ولى من اولياء الله والطور كل ذلك سوا فى النهى.

زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنے مذمومہ متبرک مقامات کی زیارت کیلئے جاتے تھے اس میں چونکہ غیر اللہ کی عبادت کا دروازہ کھلتا ہے جو کسی سے بھی مخفی نہیں، اس لئے تحریف اور فساد کے اس راستے کو نبی ﷺ نے اپنے فرمان ”لا تشد الرحال الا الى ثلاثة“ کے ذریعے سے بند فرما دیا، تاکہ غیر شعائر، شعائر سے نہ مل جائیں اور یہ چیزیں غیر اللہ کی پرستش کا ذریعہ نہ بنیں اور میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ قبر کسی ولی کی یا اس کا محل عبادت اور کوہ طور یہ تمام کی تمام اس میں داخل ہیں اور (ان کا قصد کر کے سفر اختیار کر نیکی) ممانعت میں شامل ہیں،

حجة الله ص ۱۹۲ ج ۱، طبع مکتبہ سلفیہ.

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ

كل من ذهب الى بلدة اجمير او قبر سالار مسعود او ماضاها لاجل حاجة يطلبها فانه اثم اثما اكبر من القتل و الزنا اليس مثله الا مثل من كان يعبد المصنوعات او مثل من كان يدعوا الآلات والعزى.

ہر وہ شخص جو شہر اجمیر یا سالار مسعود کی قبر یا ان جیسی دیگر قبروں اور جگہوں پر طلب حاجات کیلئے جاتا ہے وہ قتل اور زنا سے بھی زیادہ برے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، ایسا شخص بالکل اس شخص کی طرح ہے جو خود ساختہ چیزوں کی عبادت کرتا ہے یا اس شخص کی طرح ہے جو لات و عزی کو پکارتا ہے، التفہیمات الالہیہ ص ۴۵ ج ۲ طبع قدیم۔

مفتی صاحب کا پہلا عذر

اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ ان تین مسجدوں میں نماز کا ثواب زیادہ ملتا ہے لہذا ان مساجد میں یہ نیت کر کے دور سے آنا چونکہ فائدہ مند ہے جائز ہے لیکن کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنا یہ سمجھ کر کہ وہاں ثواب زیادہ ملتا ہے محض لغو ہے اور ناجائز کیونکہ ہر جگہ کی مسجد میں ثواب یکساں ہے جیسے بعض لوگ دہلی کی جامع مسجد میں جمعۃ الوداع پڑھنے کیلئے سفر کر کے جاتے ہیں، یہ سمجھ کر کہ وہاں ثواب زیادہ ہوتا ہے یہ ناجائز ہے تو سفر کرنا کسی مسجد کی طرف اور پھر زیادتی ثواب کی نیت سے منع ہوا۔ جاء الباطل ص ۳۳۳ ج ۱۔

کیا، لاتشد الرحال، کی ممانعت صرف مساجد کے ساتھ خاص ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ اگر بالفرض اس توجیہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو تب بھی یہ مبتدعین کے خلاف ہے، کیونکہ یہ لوگ قبر ولی کے جوار میں بنی ہوئی مسجد میں حصول برکت کیلئے نوافل ادا کرتے ہیں، نماز پڑھتے اور اعتکاف بیٹھتے ہیں، مثلاً علی ہجویری کے مزار پر بنی ہوئی مسجد میں اعتکاف کرنے کیلئے یہ حضرات ایک سال قبل درخواست دیتے ہیں، پھر ان میں قرعہ اندازی ہوتی ہے، پھر جس کا نام نکل آئے اسے جگہ ملتی ہے۔

تو کیا مبتدعین کا یہ عمل جو کہ حد تو اتر تک پہنچ چکا ہے، زیادتی ثواب کیلئے ہی نہیں ہوتا؟ اگر زیادتی ثواب کی نیت نہیں ہوتی تو اس کے لئے تو کسی بھی مسجد میں اعتکاف کیا جاسکتا ہے، علی ہجویری کی قبر کے جوار میں بنی ہوئی مسجد کی تخصیص ہی کیوں ہے؟، مگر فرقہ بریلویہ اس کے ترک کے لئے قطعاً تیار نہیں، معلوم ہوا کہ مفتی صاحب نے مذکورہ حدیث سے جان چھڑانے کیلئے یہ عذر بنایا ہے ورنہ عملی طور پر یہ حضرات اسے بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔

ثانیاً۔ اس حدیث کے راوی حضرت بصرہ بن ابی بصرہ الغفاری رضی اللہ عنہ نے اسی حدیث سے طور کا سفر اختیار کر نیکی ممانعت ثابت کی ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ طور سے واپس آئے تو حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہو گئی تو

فقال من اين جنت؟ قلت من الطور، قال لو لقيتك من قبل ان تاتيہ لم تاتہ
قلت له و لم؟ قال انی سمعت رسول اللہ ﷺ يقول لا تعمل المطی الا الی ثلثة
مساجد المسجد الحرام و مسجدی و مسجد بیت المقدس. الحدیث.

انہوں نے پوچھا تم (ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا طور سے انہوں
نے کہا کہ اگر تم مجھ سے طور پر جانے سے پہلے ملتے تو وہاں نہ جاتے، میں (ابوہریرہ رضی اللہ عنہ)
نے کہا کیوں؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ سفر نہ کیا جائے مگر تین
مساجد کی طرف مسجد حرام، میری مسجد، اور مسجد اقصیٰ۔ الحدیث۔

سنن نسائی ص ۱۶۸ ج ۱، و موطا امام مالک ص ۹۲ و السنن الکبریٰ
للنسائی ص ۵۴۰ ج ۱ (رقم الحدیث ۱۷۵۳) و مسند امام احمد ص ۷ ج ۲
مشکل الآثار ص ۲۲۲ ج ۱ و مسند طیالسی (۱۳۴۸ و ۲۵۰۶) و طبرانی کبیر
ص ۲۷۲ ج ۲ و طبرانی الاوسط ص ۳۷۸ ج ۳ و التمهید ص ۳۶ ج ۲۳.

اس روایت سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس حدیث کو عام جان کر اس سے
کسی جگہ پر تقرب کی نیت سے سفر کرنے کو ممنوع جانا ہے، تب ہی حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ طور کے
سفر کی ممانعت ثابت کرتے ہیں، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان کے استدلال پر سکوت کر کے
تصدیق کرتے ہیں، اگر حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ کا استدلال غلط ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
بالعموم اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بالخصوص اس کی تردید کرتے مگر انہوں نے اس استدلال کی
تردید کرنے کی بجائے خاموشی سے اس استدلال کے درست ہونے کی تصدیق کر دی۔

حافظ ابن حجر (جو زیر بحث مسئلہ میں ہمارے قدرے مخالف بھی ہیں) کو بھی اس حقیقت کا
اقرار کرنا پڑا کہ

فقال الشيخ ابو محمد الجويني يحرم شد الرحال الى غيرها عملا بظاهر هذا
الحدیث و اشار القاضي حسين الى اختياره و به قال عياض و طائفة و يدل عليه ما

رواہ اصحاب السنن من انکار بصرة الغفاری علی ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ
خروجه الى الطور و قال له لو ادرکتک قبل ان تخرج ماخرجت و استدل بهذا
الحديث فدل علی انه یری حمل الحديث علی عمومہ و وافقہ ابو ہریرہ۔

یعنی شیخ ابو محمد جوینی نے کہا کہ ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ (تقرب) کیلئے سفر کرنا
حرام ہے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے اور قاضی حسینؒ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے
اختیار کرنے میں اور قاضی عیاض اور ایک گروہ اہل علم نے بھی یہی کہا ہے اور اس پر دلالت کرتی
ہے وہ حدیث جو اصحاب سنن نے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر بصرہ غفاری
رضی اللہ عنہ نے انکار کیا ان کے سفر طور پر اور کہا کہ اگر تم مجھے جانے سے پہلے ملتے تو کبھی بھی نہ
جاتے، اور اسی حدیث (لاتشدد الرجال) سے انہوں نے استدلال کیا تو یہ دلیل ہے کہ انہوں نے
اس حدیث کو عام جانا ہے اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے انکی موافقت کی، فتح الباری
ص ۵۰ ج ۳۔

ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

اس طرح معروف تابعی قزعہ فرماتے ہیں میں نے ابن عمر سے پوچھا۔ کیا میں کوہ طور پر جاسکتا
ہو؟ انہوں نے فرمایا د ع الطور ولا تاتہ وقال لاتشد الرجال الا الی ثلاثہ مساجد، مصنف
ابن ابی شیبہ ص ۶۵ ج ۲ ق ۲ کتاب الحج باب فیما تشد الیہ الرجال۔

کوہ طور کو چھوڑو اور وہاں نہ جاؤ اور فرمایا تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ کی طرف رخصت
سفر نہ باندھا جائے جس سے واضح ہے کہ حضرت ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن
عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے تین مساجد کے لیے مطلقاً بطور تقرب کے سفر کو عام سمجھا ہے اور
حدیث کے ظاہری الفاظ سے بھی یہی واضح ہے کہ جو ان صحابہ کرام نے سمجھا ہے اور یہی درست
ہے۔ (محمد تحسینی گوندلوی)

الغرض یہ حدیث عام ہے اور اس سے ہر مقام پر جانے کی نفی ثابت ہوتی ہے جس میں تقرب

کی نیت سے سفر کیا جائے ایک مسلمان بیت اللہ، بیت المقدس، اور مسجد نبوی کی طرف تقرب کی نیت سے سفر کرتا ہے ہم اس جگہ مبتدعین کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سفر عرس تو کجا محض زیارت کی نیت سے قبروں کے سفر کا جواز کسی صحابی و تابعی بلکہ دوسری صدی تک ثابت کر دو تو انعام حاصل کرو!

جب کہ ہم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فتویٰ دکھا دیا ہے اور کسی صحابی سے ان کی مخالفت ثابت نہیں، لہذا آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ سفر عرس کے ثبوت کیلئے کوئی نص یا صحابی و تابعی کا قول دکھائیں یہاں متاخرین کے اقوال کو پیش کر کے اپنے فہم معکوس کا ثبوت نہ دیجئے گا، آپ سے ثبوت مانگا ہے تو خیر القرون سے جو ان شاء الرحمن آپ کبھی بھی نہیں دے سکتے۔

مفتی صاحب کا دوسرا عذر

اسی مشکوٰۃ کتاب الجہاد میں ہے

لا ترک البحر الا حاجاً او متعمداً او غازیاً فان تحت البحر نار او تحت النار بحراً۔

دریا میں سوار نہ ہو مگر حاجی یا غازی یا عمرہ کرنے والا۔

کہنے کیا سوائے ان تینوں کے اورں کو سفر دریا حرام ہے، عرضیکہ حدیث کا وہی مطلب ہے جو کہ ہم نے عرض کر دیا ہے ورنہ دنیا کی زندگی مشکل ہو جاوے گی۔ جاء الباطل ص ۳۵ ج ۱۔

کیا حاجی و غازی کے علاوہ کوئی اور دریائی سفر کر سکتا ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب نے آدمی روایت کا معنی تو کر دیا ہے مگر آدمی کا شرم کے مارے

ترک کر دیا ہے کہ کہیں عوام مذاق نہ اڑائیں اب پورا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

دو یا میں (کشتی پر) سوار نہ ہو مگر حاجی یا غازی یا عمرہ کرنے والا کیونکہ دریا کے نیچے آگ ہے

یا آگ کے نیچے دریا ہے۔ مشکوٰۃ ص ۳۳۳، روایت کے اس آخری حصہ کا معنی ترک کرنے کی دوہی
وجہیں ہو سکتی ہیں

(۱) کشتی کے دوسرے حصہ میں سوار نہ ہونے کی وجہ بیان کی گئی تھی۔

(۲) اس میں بیان تھا کہ دریا کے اوپر آگ ہے یا نیچے۔

چونکہ اس کے معنی کرنے سے مفتی کے استدلال میں خامی کے علاوہ اس بات کا خدشہ تھا کہ
لوگ اس روایت کی تکذیب نہ کریں کہ حضرت جی دریا کے اوپر نیچے آگ کہاں ہوتی ہے۔
اس لئے مفتی صاحب نے اس کے معنی چھوڑ دینے میں ہی عافیت جانی اور پہلے چھڑانے کیلئے
مفتی صاحب نے جو بہانہ تلاش کیا وہ صریحاً بے ایمانی ہے۔

ثانیاً۔ روایت مذکورہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اس پر دو وجہ سے کلام ہے (۱) اس کی سند
میں بشرابی عبداللہ اور بشیر بن مسلم دو راوی ہیں، ابو داؤد (۲۴۷۹) اور یہ دونوں ہی مجہول ہیں، جیسا
کہ تقریب ص ۳۵، اور، میزان ص ۳۲۷ ج ۱ میں ہے۔

(۲) روایت مضطرب ہے کیونکہ مطرب بن طریف کبھی تو بشرابی عبداللہ کے واسطے سے بشیر
سے بیان کرتا ہے، ابو داؤد مع عون ص ۳۱۴ ج ۲، اور کبھی بغیر واسطے سے بشیر سے بیان کرتا ہے،
نیبھتی ص ۳۳۴ ج ۴، جب کہ بشیر بن مسلم کبھی تو ابن عمر سے روایت بیان کرتا ہے، ابو داؤد، ونبھتی،
اور کبھی عن رجل عن ابن عمر، کہتا ہے، میزان الاعتدال ص ۳۲۹ ج ۱، اسی وجہ سے محدثین کرام نے اس
روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، چنانچہ امام بخاری علامہ خطابی، امام ابو داؤد، امام احمد، اور عبدالحق وغیرہ
نے اس روایت کو مجروح قرار دیا ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے سلسلہ ضعیفہ ص ۴۹۰ ج ۱۔

الغرض یہ روایت سند کے اعتبار سے مردود ہے جب کہ حدیث، لائشہ الرحال، کی سند متواتر
ہے لہذا مفتی صاحب کا صحیح کے بالمقابل ضعیف روایت پیش کر کے، لائشہ، کا مفہوم بگاڑنا زیادتی
ا ہے، جو سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔ مولوی احمد رضا خان بریلوی لکھتا ہے کہ

بعض جہال بدست یا نیم ملا شہوت پرست یا جھوٹے صوفی بادبدست کہ احادیث صحاح

مرفوعہ محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصے یا محتمل واقعے یا متشابہ پیش کرتے ہیں، انہیں اتنی عقل نہیں یا قصداً بے عقل بنتے ہیں کہ صحیح کے سامنے ضعیف واجب الترتک ہے۔ احکام شریعت ص ۶۲ حصہ اول، و فتاویٰ رضویہ ص ۱۹۹ ج ۱۰ جزو اول۔

اسوہ فاروقی اور اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

ابن سعد میں بسند صحیح امام نافعؒ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو علم ہوا کہ کچھ لوگوں نے اس درخت کے پاس برکت حاصل کرنے اور متبرک جگہ جان کر نماز پڑھنی شروع کر دی ہے جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو کٹوا دیا، بحوالہ فتح الباری ص ۳۶۱ ج ۷ باب غزوہ المدینہ

دیکھئے یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے آنحضرت ﷺ نے قیام فرمایا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی، رب قدیر کی طرف سے اسی مقام پر سکینت نازل ہوئی اور ایک تاریخ ساز دستاویز تیار ہوئی جس نے آگے چل کر فتوحات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا لوگوں نے اس مقام کو بابرکت جان کر یہاں نوافل وغیرہ ادا کرنے شروع کر دیئے تھے، جس کی روک کیلئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو سرے سے ہی کٹوا دیا کہ کہیں یہ درخت فتنہ کا باعث نہ بن جائے اور آنے والی نسلیں اس کو بھی شعائر میں داخل نہ کر لیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی جگہ امر واقعہ میں بھی بابرکت ہو تو اس کو منتخب کر کے عبادت و تقرب کیلئے خاص نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں فتنہ کا اندیشہ اور ایجاد بدعت کی وجہ سے اس کو تقرب کیلئے خاص کرنا غلط ہے اور اس غلطی کو دور کرنے کیلئے حکم فاروقی سے وہ درخت کاٹ دیا گیا اور اس درخت کو کاٹنے پر کسی نے مخالفت نہیں کی لہذا ثابت ہوا کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع سکوتی ہے جو کہ بلاشبہ حجت قاطع اور برہان واضح ہے۔

مفتی صاحب کا ڈھکوسلہ

فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو ہرگز نہیں کٹوایا بلکہ اصل

درخت قدرتی طور پر لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو گیا تھا اور لوگوں نے اس کے دھوکے میں دوسرے درخت کی زیارت شروع کر دی تھی اس غلطی سے بچانے کیلئے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس دوسرے درخت کو کٹوایا اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تبرکات کی زیارت کے مخالف ہوتے تو حضور علیہ السلام کے بال مبارک تہبند شریف اور قبر انور سب ہی زیارت گاہ بنی ہوئی تھیں ان کو کیوں باقی رہنے دیا۔

مسلم جلد دوم کتاب الامارات باب بیعت الرضوان، بخاری جلد دوم باب غزوہ المدینہ میں ابن مسیب سے روایت ہے کہ میرے والد بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے حضور علیہ السلام سے درخت کے پاس بیعت کی تھی انہوں نے فرمایا کہ ہم سال آئندہ حج کیلئے گئے تو اس کی جگہ ہم پر مخفی ہو گئی، پھر یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اصل درخت کٹوا دیا۔ جاء الباطل ص ۳۳۶ ج ۱۔

کیا تمام صحابہؓ ہی بیعت رضوان والے درخت کو بھول گئے تھے؟

الجواب - اولاً۔ مفتی صاحب اور ان کے مکتب فکر کے علماء پر لازم ہے کہ وہ سند معتبر سے ثابت کریں کہ لوگوں نے دھوکے سے دوسرے درخت کے پاس نوافل ادا کئے تھے اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس مصنوعی زیارت گاہ کو ختم کرنے کی غرض سے اس (دوسرے درخت) کو کٹوایا تھا۔ یقین جانیے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس بات کو کسی معتبر دلیل سے ثابت نہیں کر سکتے، فقط مفتی صاحب کی ایجاد ہے، جنہوں نے اللہ کا خوف کیے بغیر اس کو گھڑ لیا ہے۔

ثانیاً۔ بخاری میں محمود بن رافع کی سند سے حضرت مسیب رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں، ثم انسیتہا بعد، اس کے بعد میں اس درخت کو بھول گیا۔ بخاری شریف ص ۵۹۹ ج ۲۔

اور حضرت مسیب رضی اللہ عنہ کے بھول جانے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی بیعت رضوان کا مقام بھول گئے تھے۔

اے جی اسی بخاری کے اسی باب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

ولو كنت ابصر اليوم لاريتكم مكان الشجرة.

یعنی اگر میری آنکھیں ہوتیں (حضرت جابر رضی اللہ عنہ آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے) تو میں

آپ کو اس درخت کی جگہ دکھا دیتا۔ بخاری ص ۵۹۸ ج ۲۔

حافظ ابن حجر نے صراحت کی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بصارت زندگی کے آخری دور

میں ختم ہوئی تھی، فتح الباری ص ۳۵۷ ج ۷۔ اور ان کی وفات راجح قول میں ۸۷ھ میں ہوئی تھی

تھذیب ص ۳۸ ج ۲۔

شہادت فاروقی کا المناک سانحہ ۲۳ھ کے ابتدا میں پیش آیا تھا اگر حضرت جابر رضی اللہ عنہ

کے نابینا ہونے کو وفات سے دو تین سال قبل تسلیم کر لیا جائے تو خلافت فاروقی اور ان کے نابینا

ہونے کے درمیان (۵۳) سال بنتے ہیں گویا وہ درخت کاٹنے والے کی وفات سے نصف صدی بعد

بھی کہتے ہیں کہ میں اس درخت کی جگہ جانتا ہوں اور اگر میں نابینا نہ ہوتا تو بیعت رضوان کی جگہ کی

نشان دہی کروا دیتا، مگر مفتی صاحب صریحاً جھوٹ بولتے ہیں کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس

درخت کو بھول گئے تھے، پھر اس جھوٹ پر انہیں نہ شرم ہے نہ حیاء اور ہیں ماشاء اللہ مفتی اعظم اور

حکیم الامت وغیرہ۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا بال مبارک، تہبند شریف اور قبر انور کی زیارت کا عذر پیش کرنا تو

مبتدعین کسی معتبر دلیل سے ثابت کریں کہ دور فاروقی میں لوگ ان کے پاس تقرب کیلئے سفر کر کے

آیا کرتے تھے اور ان کے پاس نماز بھی پڑھا کرتے تھے، ورنہ، لعنت اللہ علی الکاذبین، کی وعید شدید

سے ڈریں واضح رہے کہ تبرکات (جسدیہ) نبویہ سے ہمیں انکار نہیں ہم ان تبرکات کو بسر و چشم قبول

کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے آثار کے ساتھ تبرک جائز سمجھتے ہیں اور اس کا انکار نہیں کرتے، مگر

آپ علیہ السلام کے کپڑوں، بالوں، ناخن وغیرہ یا اسی طرح کی دیگر اشیاء میں سے کچھ بھی باقی نہیں

رہا، اور جن کے متعلق اب مشہور ہے کہ یہ تبرکات نبویہ ہیں ان کی صحت مشکوک ہے لہذا ان مصنوعی

تبرکات کے بارے میں وہی عقیدہ رکھنا جو رسول اللہ ﷺ کے تبرکات کے بارے میں ہے غلط ہے

کیونکہ یہ آنحضرت ﷺ کے تبرکات ہیں ہی نہیں۔

سفر عرس کے دلائل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

سفر کا حکم اس کے مقصد کی طرح ہے یعنی حرام کیلئے سفر کرنا حرام، جائز کیلئے سفر کرنا جائز اور سنت کیلئے سنت، فرض کیلئے فرض، حج فرض کیلئے سفر بھی فرض، کبھی جہاد و تجارت کیلئے سفر سنت ہے، کیونکہ یہ کام خود سنت ہیں، روضہ مصطفیٰ علیہ السلام کی زیارت کیلئے سفر واجب ہے، کیونکہ یہ زیارت واجب دوستوں کی ملاقات شادی ختنہ میں اہل قرابت کی شرکت، اطباء سے علاج کرانے کیلئے سفر جائز کیونکہ یہ چیزیں خود جائز ہیں، چوری ڈکیتی کیلئے سفر حرام، کیونکہ یہ کام خود حرام ہیں، غرضکہ سفر کا حکم معلوم کرنا ہو تو اس کے مقصد کا حکم دیکھ لو عرس خاص زیارت قبر کا نام ہے اور زیارت قبر تو سنت ہے لہذا اس کیلئے سفر بھی سنت ہی میں شمار ہوگا۔

قرآن کریم میں بہت سفر ثابت ہیں (مثلاً) سفر، ہجرت، سفر تجارت، حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے ملنے کیلئے گئے، مشائخ کی ملاقات کیلئے سفر کرنا ثابت ہوا۔ یعقوب علیہ السلام نے فرزندوں کو تلاش یوسف کیلئے حکم دیا، تلاش محبوب کیلئے سفر ثابت ہوا، روزی کیلئے سفر ثابت ہوا، تبلیغ کیلئے سفر ثابت ہوا۔

من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل اللہ۔

جو شخص تلاش علم میں نکلا وہ اللہ کی راہ میں ہے، حدیث میں ہے

اطلبوا العلم لو کان بالصین،

علم طلب کرو اگرچہ چین میں ہو۔

سیر کیلئے سفر ثابت ہے، جن ملکوں پر عذاب الہی آیا انکو عبرت پکڑنے کیلئے سفر ثابت۔

جب اس قدر سفر ثابت ہوئے تو مزارات اولیاء کی زیارت کیلئے سفر کرنا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوا، یہ حضرات طبیب روحانی ہیں، اور ان کے فیوض مختلف، ان کے مزارات پر پہنچنے سے شان الہی نظر آتی ہے کہ اللہ والے بعد وفات بھی دنیا پر راج کرتے ہیں اس سے ذوق عبادت پیدا ہوتا ہے ان کے مزارات پر دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

شامی جلد اول بحث زیارت قبور میں ہے اور آیا زیارت قبور کیلئے سفر کرنا مستحب ہے، جیسے کہ آج کل خلیل الرحمن علیہ السلام اور سید بدوی علیہ رحمۃ کی زیارت کیلئے سفر کرنے کا رواج ہے، میں نے اپنے آئمہ میں سے کسی کی تصریح نہیں دیکھی، بعض شافعی علماء نے منع کیا ہے مسجدوں کے کیلئے سفر پر قیاس کر کے لیکن امام غزالی نے اس کی تردید کر دی ہے فرق واضح فرمادیا لیکن اولیاء اللہ تقرب الی اللہ و زائرین کو نفع پہنچانے میں مختلف ہیں بقدر اپنے معروف و اسرار کے۔

مقدمہ شامی میں امام ابو حنیفہؒ کے مناقب میں امام شافعی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔
میں امام ابو حنیفہؒ سے برکت حاصل کرتا ہوں اور ان کی قبر پر آتا ہوں اگر مجھے کوئی حاجت درپیش ہوتی ہے تو دو رکعتیں پڑھتا ہوں اور ان کی قبر کے پاس جا کر اللہ سے دعا کرتا ہوں تو بہت جلد حاجت پوری ہوتی ہے،

اس سے چند امور ثابت ہوئے، زیارت قبور کیلئے سفر کرنا کیونکہ امام شافعی اپنے وطن فلسطین سے بغداد آتے تھے، امام ابو حنیفہؒ کی قبر کی زیارت کیلئے صاحب قبر سے برکت لینا ان کی قبروں کے پاس جا کر دعا کرنا صاحب قبر کو ذریعہ حاجت روائی جاننا۔ انتھی ملخصاً کلامہ، جاء الباطل ص ۳۳۲-۳۳۳۔

کیا عام سفروں سے عرس کا سفر ثابت ہوتا ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ پہلے دلائل سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ عرس بدعت سیئہ ہے اور اس کی حدیث نبوی ﷺ میں ممانعت موجود ہے، جب یہ بدعت ہے تو اس کیلئے سفر کیسے جائز ہوا، جب کہ خود مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ حرام کیلئے سفر بھی حرام ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا دعویٰ تو عرس کیلئے سفر کرنے کا ہے، مگر دلیل عنایت فرماتے ہیں سفر ہجرت اور تجارت وغیرہ کی، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ دعوے اور دلیل میں کوئی مناسبت ہے، عالی جاہ عرس کیلئے سفر کرنا تو بقول آپ کے اس مقصد کے تحت ہوتا ہے کہ

صاحب قبر سے برکت حاصل کی جائے ان کی قبر کے پاس دعا جلدی قبول ہوتی ہے قبر والا حاجت روائی کرتا ہے اور اولیاء کرام زائرین کو نفع پہنچاتے ہیں ملخصاً جاء الباطل ص ۳۳۲ ج ۱۔

مگر افسوس ان بدعات و خرافات کی دلیل، سفر تجارت، سفر ہجرت، سفر تبلیغ، بیٹے کی ملاقات کیلئے سفر، وغیرہ کی دیتے ہیں ایمان سے کہنا کہ کیا ان اسفار سے بھی یہی مقصود ہوتا ہے؟ جو سفر عرس میں مطلوب ہوتا ہے، اگر نہیں یقیناً نہیں تو ان اسفار سے آپ کا سفر عرس کیسے ثابت ہو گیا، اے جی اس کیلئے کوئی واضح نص پیش کریں، جو آپ کے پاس قطعاً نہیں، اور پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اور عاشقان بدعات، سر توڑ کوشش کے بعد بھی عرس کیلئے سفر کا ثبوت کسی واضح نص سے نہیں دے سکتے جب عرس ہی بدعت قبیحہ ہے تو اس کا سفر کیسے سنت ثابت ہو گیا، عقل کے ناخن لو کیا کہہ رہے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے تھے لہذا عرس کا سفر ثابت ہو گیا۔

کیا موسیٰ علیہ السلام فرعون کا عرس منانے کے لیے گئے تھے؟ نہیں! بلکہ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی طرف سفر تو اسے دعوت توحید دینے کیلئے تھا کیونکہ فرعون ایک سرکش کافر تھا۔

کیا مبتدعین بھی مقابر اولیاء کی طرف اسی نیت سے جاتے ہیں کہ وہ سرکش کافر ہیں لہذا انہیں دین حق کی طرف بلایا جائے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں، تو اس دلیل سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں ذرا اس کی وضاحت تو کیجئے، آخر عقل تو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو دی ہے اس دلیل کو نقل کرتے ہوئے آپ کے دل میں کیا تھا۔

موسوی سفر اور سفر عرس میں کیا مناسبت تھی کہ جس کے اشتراک کی وجہ سے آپ نے اس کو درج کیا تھا، یا فقط لفظ سفر کو ہی دیکھ کر آپ نے اس کو نقل کر دیا، اور محض لفظ سفر کے مشترک ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ دونوں ہی جائز ہیں، کیا ہم نے سفر کرنے سے ہی انکار کیا تھا کہ اس دلیل سے آپ ہم پر حجت قائم کر رہے ہیں۔

اس طرح تو ایک بت پرست بھی کہہ سکتا ہے کہ چونکہ مسلمان بیت اللہ کی طرف سفر کر کے جاتے ہیں لہذا سومنات کی طرف جانا بھی ثابت ہوا، ایک مرزائی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ امت محمدیہ چونکہ مسجد نبوی کی طرف سفر کر کے جاتی ہے لہذا قادیان میں مرزے قادیانی کی عبادت گاہ کی طرف جانا بھی ثابت ہوا، ایک شیعہ کو بھی حق ہوگا کہ چونکہ اہل سنت صفاء و مردہ اور مزدلفہ و عرفات میں جاتے ہیں لہذا کربلا کی طرف جانا ثابت ہوا۔

تو جس دلیل سے ایک بت پرست اور مرزائی و شیعہ کو بریلوی علماء مطمئن کریں گے وہی دلیل

ہماری طرف سے مفتی صاحب کے مذکورہ اسفار کی تصور کر لیجئے گا۔

ثالثاً۔ عرس کے لئے سفر کرنا ایک خاص عمل ہے اور اس کیلئے دلیل بھی خاص چاہئے کیونکہ عام سے خاص ثابت نہیں ہوتا، مثلاً بکر کا یہ کہنا کہ زید گھر میں موجود نہیں، اس سے زید کا مسجد میں موجود ہونا ثابت نہیں ہوگا۔

یا عبد اللہ کا یہ کہنا کہ عبد الرحمن گھر سے لاہور چلا گیا ہے، اس سے عبد الرحمن کا ہیرا منڈی جانا ثابت نہ ہوگا، یا علی کا یہ کہنا کہ ایوب آج صبح سے غائب ہے اس سے ایوب کا سفر پر جانا ثابت نہ ہوگا۔

یا محبوب کا یہ کہنا کہ عدنان شہر گیا ہے (یا بازار) تو اس سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ عدنان کسی حکیم کے پاس گیا ہے،

علیٰ هذا القیاس اس طرح کے بیسیوں محاورات ہم روزمرہ کی زندگی میں بولتے ہیں مگر اس عام سے کوئی کم عقل اور اناڑی بھی خاص مراد نہیں لیتا کیونکہ ہر صاحب عقل اور صاحب دماغ جانتا ہے کہ عام سے خاص مراد لینے سے انسانی زندگی معطل ہو کر رہ جائے گی۔ مگر افسوس کہ مبتدعین نے دین کو ہی اس قدر لاوارث سمجھ رکھا ہے کہ جو چاہیں اس کی تعبیر کریں عام سے خاص مراد لیں یا بعض سے کل یا مجاز سے حقیقت تو انہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس کہ اسلام کی قوت جاتی رہی ارباب حکومت کو اپنی اپنی کرسی کی پڑی ہوئی ہے، اور گمراہ فرقے دین کی بنیادی تعلیم کو مسخ کر رہے ہیں۔

اے اللہ تو نے ہی دین اسلام کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہوا ہے کوئی مرد مومن پیدا فرما جو تیرے دین کو غالب کر دے، کفر و شرک اور بدعات کے گھپ اندھیرے کو ختم کر کے تیرے دین کا بول بالا کرے اور ان کی جگہ دین حق کو قائم کرے، کفر و شرک کو مٹا کر تیری توحید کو قائم کرے بدعات کا قلع قمع کر کے تیرے پیارے نبی ﷺ کی سنت کو جاری کرے، دین عربی کے خلاف تمام سازشوں کی تیغ کٹی کر دے اور کفار کے عقائد و نظریات کو مسمار کر دے، آمین یا الہ العلمین۔

ہم تو تیرے عاجز و ناتواں بندے ہیں تیری توفیق سے یہی کر سکے ہیں تو ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں برکت ڈال دے آمین یا رب العلمین۔

ہاں تو بات چل رہی تھی کہ عموم سے خصوص ثابت نہیں ہوتا
ارشاد ربانی ہے کہ

و جعلنا من الماء كل شيء حي . الانبياء (۳۰)

اور تمام جان دار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں (۲۱-۳۰)

اس علم دلیل سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ جن اور ملائکہ کی پیدائش بھی پانی سے ہوئی ہے۔ ایک
اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج . (الدھر ۲)

ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا (۷۶-۲)

اس دستور عام سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ آدم علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی مخلوط
نطفہ سے ہوئی تھی۔ خلاصہ کلام یہ کہ عام سے حکم خاص ثابت نہیں ہوتا اس کیلئے ایک مستقل اور
علیحدہ دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن مفتی صاحب عام اسفار سے خاص سفر عرس کا ثبوت دینا چاہتے ہیں جو کہ ان کی اصول
شکنی اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کی فضول کوشش ہے، اللہ ہدایت اور سمجھ عطا کرے۔ آمین

مفتی صاحب کا حضرت امام شافعیؒ پر افترا

مفتی صاحب نے مقدمہ شامی سے نقل کیا ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام ابو حنیفہؒ
کی قبر پر برکت حاصل کرنے کیلئے آیا کرتے تھے اور جب کبھی انہیں کوئی حاجت ہوتی تو دو رکعتیں
پڑھ کر دعا کرتے تو حاجت پوری ہو جاتی، پھر اس پر چربہ چڑھاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں
اس سے چند امور ثابت ہوئے، زیارت قبور کیلئے سفر کرنا،

کیونکہ امام شافعی اپنے وطن فلسطین سے بغداد آتے تھے امام ابو حنیفہ کی قبر کی زیارت کیلئے
صاحب قبر سے برکت لینا ان کی قبروں کے پاس جا کر دعا کرنا صاحب قبر کو ذریعہ حاجت روائی جاننا
- جاء الباطل ص ۳۳۲ ج ۱ -

الجواب

اولاً۔ واقعی اگر مذکورہ حکایت ثابت ہو تو مبتدعین کا موقف حضرت امام شافعیؒ سے ثابت ہوتا ہے لیکن یہ صریحاً جھوٹ اور حضرت امام پر افترا ہے تفصیل آگے آرہی ہے ان شاء الرحمن لیکن ہم یہاں ایک چیز بیان کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق مفتی صاحب کی ہیرا پھیریوں سے ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خود مولف جاب الباطل نے اذان قبر کے سلسلہ میں کہا تھا کہ قول شافعی ہم پر حجت نہیں، مفہوم، جاب الباطل ص ۳۱۶ ج ۱۔

مگر یہاں بنیادی استدلال ہی حضرت امام شافعیؒ کے (بے بنیاد) عمل سے کر رہے ہیں جو کہ خود ان کے اپنے لکھے ہوئے کے خلاف ہے، شاید مبتدعین یہ کہہ کر پلہ چھڑالیں کہ انہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

الغرض مفتی صاحب کو اپنے ضابطہ اور دستور العمل کی وجہ سے یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ حضرت امام ابو حنیفہ فلاں صحابی و تابعی کی قبر پر جا کر ایسا کرتے تھے تو ایک بات تھی، لیکن مفتی صاحب کو اپنے گھر سے تو کوئی ایسی دلیل میسر نہ ہوئی، لہذا انہوں نے امام شافعیؒ کو درمیان میں گھسیٹ لیا۔ ثانیاً۔ بلاشبہ یہ قول فتاویٰ شامی ص ۵۵ ج ۱، میں موجود ہے مگر علامہ ابن عابدین التوفی ۱۲۵۲ھ نے اس قول کو بلا سند اور بلا حوالہ نقل کیا ہے حضرت امام شافعیؒ نے ۲۰۴ھ میں وفات پائی، تقریب ص ۲۱۴، امام شافعیؒ اور ابن عابدین کے درمیان تقریباً دس صدیوں کا ایک طویل زمانہ حائل ہے لہذا ہم ان کی بے دلیل بات کو کیسے مان لیں۔

ثالثاً۔ ہمارے وسائل کی حد تک ہمیں یہ روایت تاریخ بغداد ص ۱۲۳ ج ۱، اور اخبار ابی حنیفہ و اصحابہ للامام الصیرمی ص ۸۹ میں ملی ہے۔ جو بمع سند و متن حسب ذیل ہے۔

اخیر نا عمر بن ابراہیم قال ثنا مکرم قال ثنا عمر بن اسحاق بن ابراہیم قال ثنا علی بن میمون قال سمعت الشافعی یقول انی لا تبرک بابی حنیفہ و أجنی الی قبرہ فی کل یوم، یعنی زائراً، فاذا عرضت لی حاجة صلیت رکعتین و جئت الی قبرہ و سألت اللہ الحاجہ فما تبعد عنی حتی تقضی. انتھی بلفظہ.

مگر یہ سند باطل و مردود ہے کیونکہ عمر بن اسحاق غیر معروف ہے، کتب رجال میں اس کا کہیں

بھی ذکر نہیں پایا جاتا علامہ البانی رحمۃ اللہ کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ عمرو بن اسحاق ہو، جس کا ذکر خطیب نے تاریخ ۱۲/۲۲۶ میں کیا ہے لیکن کوئی جرح و تعدیل بیان نہیں فرمائی لہذا یہ مجہول الحال ہے، پھر فرماتے ہیں (عمرو بن اسحاق ہونا) بعید ہے کیونکہ خطیب بغدادی نے بیان کیا ہے کہ عمرو بغدادی ۳۴۱ھ میں آیا تھا جبکہ جس سے یہ بیان کر رہا ہے (یعنی علی بن میمون) اس کی وفات ۲۴۴ھ میں ہو چکی تھی، اس لئے یہ ناممکن ہے اسے عمرو نے پایا ہو،

سلسلہ احادیث ضعیفہ ص ۳۱ ج ۱۔

علامہ کوثری کا یہ کہنا کہ اس کی سند کے تمام راوی خطیب بغدادی کے نزدیک ثقہ ہیں (تانیب الخطیب ص ۲۵)۔

غلط بیانی ہے علامہ عبدالرحمن المعلمی نے کوثری کی زندگی میں ہی اس کی پر زور تردید کر دی تھی، جس کا پوری زندگی کوثری سے جواب نہ بن پڑا تھا حالانکہ علامہ عبدالرحمن کی کتاب کوثری کو مل گئی تھی، بلکہ انہوں نے چند صفحات کا رسالہ، التریب بقدر التانیب، کے نام سے ان کے جواب میں بھی لکھا تھا، مگر ان کے معارضات پر کوثری نے دم نہیں مارا، جب کہ علامہ عبدالرحمن المعلمی نے مذکورہ حقائق سے مزید ایک معارضہ یہ بھی پیش کیا تھا کہ علی بن میمون کی حضرت امام شافعی سے روایت ہی ثابت نہیں، آخر میں فرماتے ہیں۔

ولا يخفى على ذي معرفة انه لا يثبت بمثله شئ، و يؤكد ذلك حال القصة فان زيارته قبر أبي حنيفة كل يوم بعيد في العادة، و تحريه قصده للدعاء عنده بعيد ايضاً، انما يعرف تحرى القبور لسؤال الحوائج عندها بعد عصر الشافعي بمدة فاما تحرى الصلوة عنده فابعد و ابعد.

یعنی اہل علم پر مخفی نہیں کہ ان جیسی اسناد سے کوئی چیز بھی ثابت نہیں ہوتی، اور یہی حال اس قصہ کا ہے، کیونکہ ہر روز امام ابوحنیفہ کی قبر کی زیارت کرنا عادتاً ناممکن ہے (کیونکہ امام شافعی کا وطن کوفہ نہ تھا) اور امام ابوحنیفہ کی قبر کو منتخب کر کے اس پر دعا کیلئے قصداً جانا امام شافعی سے بعید ہے کیونکہ قبروں کا انتخاب کر کے ان پر سوال حوائج کیلئے جانا حضرت امام شافعیؒ کے زمانہ کے بعد رائج ہوا ہے اور ان کی قبر کو نماز کیلئے منتخب کرنا تو حضرت امام شافعیؒ سے اور بھی بہت زیادہ بعید ہے، طلیحہ

التکلیل بما فی تانیب الکوثری من الاباطیل ص ۶۵، طبع المکتبة السلفية لاہور ۱۹۸۱ء۔

حضرت امام ابن تیمیہؒ نے مذکورہ حکایت پر خاصی پر مغز گفتگو کرتے ہوئے آخر میں تحریر کیا

ہے

ثم تقدم عند الشافعي ما هو ثابت في كتابه من كراهة تعظيم قبور المخلوقين خشية الفتنة بها، وانما يضع مثل هذه الحكايات من يقل علمه و دينه، واما ان يكون المنقول من هذه الحكايات عن مجهول لا يعرف.

پھر نقل کیا جا چکا ہے حضرت امام شافعی سے کہ مخلوق کی قبروں کی تعظیم کی کراہت ثابت ہے، فتنہ (شرک) کے خوف سے اور اس طرح کی حکایات اس شخص نے گھڑی ہیں جس کا علم و دین ناقص ہے، اور یہ حکایات منقول بھی مجہول (اسناد) سے ہیں جو معلوم نہیں، اقتضاء الصراط المستقیم ص ۶۸۶ ج ۲، طبع ۱۴۰۲ھ۔

حضرت امام ابن تیمیہؒ نے امام شافعیؒ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ ان کی تالیف، کتاب الام ص ۲۷۸ ج ۱ باب ما یكون بعد الدفن، میں موجود ہے۔

ان دلائل و براہین سے مذکورہ حکایت کا مکذوبہ اور من گھڑت ہونا ثابت ہو گیا، مگر مفتی صاحب اس کو دلیل بناتے ہوئے ذرا بھر شرم و حیا نہیں کرتے، اور کوثری اس کی تصحیح کرتے ہوئے صریحاً جھوٹ تحریر کرتا ہے کہ اس کے راوی تمام ثقہ ہیں۔

کیا زیارت قبور سے عرس کا سفر ثابت ہوتا ہے

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں

سفر کا مقصد تو ہے زیارت قبر اور یہ منع نہیں کیونکہ زیارت قبر کی اجازت مطلقاً ہے، الا ضرور وھا،

تو سفر کیوں حرام ہوگا۔ جاء الباطل ص ۳۳۳ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ جو شخص زیارت قبور کیلئے سفر کرتا ہے، کیا اس کے وطن میں قبرستان نہیں ہوتا، یا وہاں

مسلمان فوت نہیں ہوتے، یا ان کو مسنون طریقہ سے دفن نہیں کیا جاتا، مثلاً ایک شخص کراچی سے

لاہور آتا ہے حضرت علی ہجویری کی قبر پر، یا ایک شخص لاہور سے بغداد جاتا ہے زیارت قبور کیلئے تو کیا اس کے اپنے وطن میں قبریں نہیں ہوتیں جو لاہور اور بغداد میں زیارت قبور کیلئے جاتا ہے، معلوم ہوا کہ اس کا مقصد محض زیارت قبور ہے ہی نہیں، کیونکہ یہ تو اس کے اپنے وطن میں موجود تھیں، لہذا اس تخصیص پر کوئی دلیل عنایت کیجئے کہ کسی ولی کی قبر کو منتخب کر کے اس کی طرف سفر کرنا اور وہ بھی اس نیت سے کہ صاحب قبر سے برکت اور حوائج کے طلب کرنے کی غرض وغیرہ سے مگر مفتی صاحب اس تخصیص اور نیت کی دلیل دینے کی بجائے زیارت قبور کو درمیان میں گھسیٹ لائے ہیں۔

ثانیاً۔ زیارت قبور کا مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ وہاں جا کر ان کے حق میں مغفرت کی دعا کی جائے اور ان کی قبروں کو دیکھ کر عبرت حاصل ہو کہ جس طرح ان لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر ایک دن مٹی میں ڈیرا ڈال لیا ہے اسی طرح ہم نے بھی فوت ہو کر اس مٹی میں دفن ہونا ہے، چنانچہ یہ چیزیں سنت خیر الانام ﷺ سے ثابت ہیں۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

(۱) کان رسول اللہ ﷺ يعلمهم اذا خرجوا الى المقابر السلام عليكم اهل الديار من المومنين و المسلمين و انا ان شاء الله بكم للاحقون اسال الله لنا ولكم العافية.

یعنی رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ تعلیم دیتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو کہیں السلام الخ یعنی اے مسلمانوں کے گھر والوں! تم پر سلامتی ہو ان شاء اللہ ہم تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لئے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ صحیح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

(۲) ان رسول الله ﷺ اتى المقبرة فقال السلام عليكم دار قوم مومنين و انا انشاء الله بكم للاحقون. الحديث.

یعنی رسول اللہ قبرستان آئے اور کہا اے مومنین کے گھر والو! تم پر سلامتی ہو اور انشاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں۔ صحیح مسلم ص ۱۲۶ ج ۱۔

(۳) اسی طرح کتب حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آٹھ سال بعد شہداء احد کی

قبروں پر جا کر ان کی قبروں پر نماز جنازہ پڑھا۔

(۴) اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو فرماتے ہیں کہ اپنے بھائی کیلئے دعا کرو کیونکہ اب اس سے سوال ہوگا، یہ تمام احادیث پہلے با حوالہ گزر چکی ہیں۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کرتے اور دفن کرتے ہوئے سلام و دعا کرنے کا حکم فرماتے جیسا کہ میت کو دفن کرنے سے پہلے نماز جنازہ میں اپنے لئے مرنے والے کے واسطے اور تمام زندہ و مردہ مومنین کے حق میں دعا کی جاتی ہے، اور اسی طرح کی جو چیز سنت مصطفیٰ اور خیر القرون کے، السابقون الاولون، سے ثابت ہے وہ مشروع اور جائز ہے الغرض زیارت قبور تو سنن صحیحہ سے ثابت ہے حتیٰ کہ کفار کی قبروں پر جانا بھی ثابت ہے، جس کی دلیل، یہ حدیث ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

فروروا القبور فانها تذكركم الموت. الحديث.

یعنی قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔

صحیح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱۔

اس حدیث میں زیارات قبور کی بقول مفتی صاحب مطلقاً اجازت ہے لہذا یہ کفار کی قبروں کو بھی شامل رہے گی علاوہ ازیں ان کی قبریں بھی موت اور آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

الغرض اگر زیارت قبور ہی مقصود ہے تو اس کیلئے اپنے شہر کا قبرستان ہی کافی ہے، دور دراز کا سفر کر کے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

مگر مبتدعین کا زیارت سے مقصود مسنون طریقہ نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے یہ حضرات نذر مانتے ہیں کہ میرا کام ہوگا تو میں فلاں بزرگ کی قبر پر اس قدر روپیہ خرچ کروں گا، یا اس نیت سے سفر کیا جاتا ہے کہ اس کی قبر سے برکت حاصل کی جائے یا حوائج کیلئے، تب ہی یہ لوگ عوام الناس کی قبروں پر جانے کی بجائے اولیاء کرام کی قبروں کا رخ کرتے ہیں۔

پھر اس کیلئے بھی انہوں نے بعض کو مخصوص کر رکھا ہے کہ بعض مقابر پر جانے سے لڑکا ملتا ہے

بعض سے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے اور بعض سے مصیبت و غم دور ہو کر رزق میں برکت ڈالی جاتی ہے وغیرہ مگر اس کی کوئی دلیل شرعی تو وہ نادار، بلکہ نہایت عیاری سے مفتی صاحب نے زیارت قبور کا مخلص تلاش کیا ہے۔

مگر سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اگر زیارت قبور ہی مقصود ہے تو سال بعد عرس کیلئے سفر کرنے کا عنوان کیوں قائم کیا ہے؟ کیا زیارت قبور فقط سال بعد مرنے والے کے روز وفات ہی کرنی مشروع ہے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں تو یہ مفتی صاحب کی دلیل کیسے بن گئی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عرس کے سفر، بار شہوت ابھی تک مبتدعین پر ادھار ہے، جسے کبھی بھی چکا نہیں سکتے۔

تنبیہ

حضرت مفتی صاحب نے علم حاصل کرنے کے لئے ایک روایت ان الفاظ سے نقل کی ہے کہ

اطلبوا العلم ولو كان بالصين .

علم طلب کرو اگرچہ چین میں ہی ہو۔ جاء الباطل ص ۳۳۱ ج ۱۔

واضح رہے کہ اس حدیث سے اگر مفتی صاحب کا مقصود سفر عرس ثابت کرنا ہے تو یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے کیونکہ علم کسی قبر سے حاصل نہیں کیا جاسکتا کہ مفتی صاحب کی دلیل ہو بلکہ علم تو کسی معلم سے حاصل کیا جاسکتا ہے جو زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ قال اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلاث صدقة

جارية، او علم ينتفع به، او ولد صالح يدعوله.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں مگر تین، صدقہ جاریہ، یا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، یا اس کی نیک اولاد جو اس کیلئے دعا کرے۔

صحیح مسلم ص ۴۱ ج ۲، و ابوداؤد ص ۴۲ ج ۲، و نسائی ص ۱۲۲ ج ۲،

و ترمذی مع تحفه ص ۲۹۸ ج ۲، و بیہقی ص ۲۷۸ ج ۶، و مسند احمد ص ۳۷۲ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرنے والے کے علم سے فائدہ تو حاصل کیا جاسکتا ہے (جیسے ہم محدثین اور فقہاء کے علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں) مگر ان سے علم سیکھا اور پڑھا نہیں جاسکتا ہے۔

ثانیاً۔ الطلبوا العلم ولو کان بالصین، کی یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ اس کا راوی طریف بن سلمان، متروک الحدیث ہے اسے امام ابو حاتم نے، ذاہب الحدیث، امام بخاری نے، منکر الحدیث، امام دارقطنی نے، ضعیف، اور امام نسائی نے، غیر ثقہ، کہا ہے، میزان ص ۳۳۵ ج ۲، و عقیلی ص ۲۳۰ ج ۲، و ابن عدی ص ۱۴۳۸ ج ۴۔

مزید تفصیل کیلئے علامہ البانی رحمۃ اللہ کی تالیف سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ ص ۴۱۳ ج ۱ اور حضرت استاذی المکرم کی تالیف، ضعیف اور موضوع روایات ص ۹۴ کی مراجعت فرمائیے۔

اسکیننگ : محمد شاہد
اکبر خاں
کیلئے رابطہ کیجئے
txuemaslak@inbox.com

باب قوالی کی بحث

اسلام میں عبادت کا طریقہ

اکثر مزارات پر دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ وہاں سماع کی محفل کا انعقاد کیا جاتا ہے، جس میں ملک کے نامور قوالوں کو دعوت دی جاتی ہے اور وہ بمع اپنے ساز و سامان قدم رنجہ ہوتے ہیں۔ پہلے ہا، ہو، پھر تالی و بانسری بجائی جاتی ہے ہارمونیم کا باجا بجنے لگتا ہے تو دوسری طرف بیٹھا ہوا ایک شخص ڈھولکی پر ہاتھ مارنا شروع کر دیتا ہے پھر طبلہ و گھڑا بھی آواز نکالنے لگتا ہے اور سارنگیا جو بن میں سارنگی کی تار پر ساز بجاتا ہے۔

ان خرافات کے ساتھ ساتھ ہی قوال تالی بجاتا ہوا کوئی مشرکانہ گیت گانے لگتا ہے جس میں صاحب قبر کی منقبت بیان ہوتی ہے، یوں اس تقریب سے عرس کی ابتدا کی جاتی ہے جسے سننے اور سنانے والے بلکہ محفل رچانے والے اس کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں، عوام الناس اس کی ریکارڈنگ کو علی الصبح کار ثواب اور بطور برکت گھروں دوکانوں بسوں میں لگاتے ہیں اگر کوئی سلفی منع کرے تو اسے کہتے ہیں کہ بھائی یہ تو قوالی ہے گانے تھوڑے ہیں جو کہ آپ منع کر رہے ہیں۔

عبادت کا یہ طریقہ بالکل کفار مکہ کا تھا، رب قدیر فرماتے ہیں

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مَكَاءً وَتَصْدِيَةً. (الانفال ۳۵)

یعنی نہیں تھی ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں اور تالیاں بجانا (۸-۳۵)

یہی کچھ قوالی میں ہوتا ہے جسے یہ لوگ کفار کی طرح عبادت جانتے ہیں مگر آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی عبادت ایسی نہ تھی ان کی عبادت وہی تھی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یعنی نماز، قراۃ قرآن، ذکر اور شرعی مجالس، نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی گانے کی محفل میں شرکت نہیں کی نہ ہی ہاتھوں سے تالیاں بجائیں نہ ہی سیٹیاں ماریں، نہ آپ علیہ السلام کو کبھی وجد آیا، نہ آنحضرت ﷺ کی چادر گری، محدثین کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب اکٹھے ہوتے تو ایک کو قرآن پڑھنے پر

مامور فرماتے تو باقی سنا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ، میں نے عرض کیا کہ آپ کو پڑھ کر سناؤں، حالانکہ قرآن تو آپ پر نازل ہوا ہے، ارشاد فرمایا میں دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو سورۃ نساء سنائی جب اس آیت پر پہنچا۔

فکیف اذا جئنا من کل امة بشہید و جننا بک علی ہولاء شہیداً۔
بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بیانے کو) طلب کریں گے (۴-۳۱)
تو آپ نے فرمایا

امسک فاذا عیناہ تذرفان۔

بس کرو اور اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

بخاری ص ۶۵۹ ج ۲، واللفظ لہ، و مسلم ص ۲۷۰ ج ۱۔
اس طرح کا سماع انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے پیروؤں کا سماع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے

اولئک الذین انعم اللہ علیہم من النبین من ذریۃ ادم و ممن حملنا مع نوح و من ذریۃ ابراہیم و اسرائیل و ممن ہدینا و اجتبینا اذا تتلی علیہم آیت الرحمن خروا سجداً و بکیاً (مریم ۵۸)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے پیغمبروں میں سے فضل کیا (یعنی) اولاد آدم میں سے نبی ہیں، اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کو نوح کے ساتھ سوار کیا تھا، اور یہ لوگ ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے ہیں اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی اور برگزیدہ کیا جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو سجدہ میں گر پڑتے تھے اور روتے رہتے تھے (۱۹-۵۸)

اہل معرفت کے بارے میں فرمایا

و اذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینہم تفیض من الدمع مما عرفوا من

الحق يقولون ربنا انا فا كتبنا مع الشہدین . (المائدة ۸۳)

اور جب اس (کتاب) کو سنتے ہیں جو (سب سے پیچھے) پیغمبر (ﷺ) پر نازل ہوئی تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسوں جاری ہو جاتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے حق بات پہچان لی ہے اور وہ (اللہ کی جناب میں) عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم ایمان لے آئے تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ لے۔ (۵-۸۳)

لیکن اس کے برعکس اہل بدعت کا سماع تالیاں و سارنگی اور طبلہ و طنبور کا ہوتا ہے، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین اور آئمہ کرام میں سے کسی نے اس طرح کے سماع کو اللہ تبارک و تعالیٰ تک پہنچنے کا طریق قرار نہیں دیا، وہ اسے قرب الی اللہ اور عبادت میں نہیں بلکہ بدعت مذمومہ میں شمار کرتے ہیں۔

(الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطن ص ۱۷۹ مترجم)

موسیقی رسول اللہ ﷺ کی نظر میں

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

سمع النبی ﷺ يقول لیکونن من امتی اقوام یستحلون الحر و الحریر و الخمر و المعازف و لینزلن اقوام الی جنب علم تروح علیہم بسارحة لهم یاتیہم یعنی الفقیر لحاجة فیقولون ارجع الینا غداً فیبیتہم اللہ و یضع العلم و یمسخ آخرین قردة و خنازیر الی یوم القیمة . (بخاری رقم الحدیث ۵۵۹۰ کتاب الاشربة باب ما جاء فیمن یستحل الحمد.....)

یعنی نبی ﷺ سے میں نے سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ میری امت میں ایسے لوگ (پیدا) ہونگے جو زنا اور حریر اور شراب اور باجوں (آلات موسیقی) کو حلال قرار دیں گے اور ایسا ہوگا کہ چند لوگ ایک پہاڑ کے دامن میں اتریں گے شام کو ان کا چرواہا ان کے جانور لے کر ان کے پاس آئے گا تو اس سے کہیں گے کہ ارے فقیر کل آنا لیکن رات کو اللہ تعالیٰ ان پر پہاڑ گرا کر ان کا کام تمام کر دے

گا (اور جو پہاڑ گرنے سے بچ جائیں گے) بندر اور سور بنا دے گا قیامت تک اسی صورت میں رہیں گے۔

بخاری ص ۸۳۷ ج ۲، و ابو داود مع عون ص ۸۱ ج ۴، و طبرانی کبیر ص ۳۱۹ ج ۳، و بیہقی ص ۲۲۱ ج ۱۰۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

ان النبی ﷺ نہی عن الخمر و المیسر و الکوبۃ و الغیراء و قال کل مسکر حرام۔

نبی ﷺ نے شراب، جوا، اور آلات موسیقی سے منع فرمایا ہے اور کہا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

سنن ابی داؤد ص ۱۶۳ ج ۲، یہی روایت مسند احمد ص ۲۸۹ ج ۱، اور بیہقی ص ۲۲۱ ج ۱۰ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور ابی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے بیہقی ص ۲۲۲ ج ۱۰ میں آتی ہے، جن کے ابتدائی الفاظ، ان اللہ حرم (یعنی اللہ نے حرام قرار دیا ہے) کے ہیں۔

محدثین رحم اللہ عنہم میں، الکوبۃ، کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے اس کا معنی، طبلہ، بعض نے ڈگڈگی، اور بعض نے بربط، بعض نے بانسری کیا ہے۔

آئمہ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کا استعمال آلات موسیقی پر ہوتا ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ موسیقی شراب کی طرح حرام ہے۔

حضرت قیس بن سعد راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال ان ربی تبارک و تعالیٰ حرم علی الخمر و الکوبۃ و القنین و یا کم و الغیراء فانھا ثلث خمر العالم۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے رب تبارک و تعالیٰ نے مجھ پر شراب، آلات موسیقی کو حرام کیا ہے اور جوار کی شراب سے بچو کیونکہ وہ تمام جہانوں کی شراب کا ثلث ہے۔ مسند احمد ص ۲۲۲ ج ۳ رقم ۱۵۰۵۵، و بیہقی ص ۲۲۲ ج ۱۰ واللفظ لہ۔

فقہاء احناف کی تصریحات

علامہ ابن ہمام الحنفی، ہدایہ، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

نعم اذا قيل ذلك على الملاهی امتنع و ان كان مواعظ و حکما للالات
نفسها لا لذلك التغنی.

ہاں جب نظم، آلات موسیقی کے ساتھ گائی جائے تو منع ہے خواہ نظم میں نصیحت اور حکمت کی باتیں ہوں، یہ ممانعت آلات موسیقی کی وجہ سے ہے نظم کی وجہ سے نہیں۔ فتح القدیر ص ۴۸۲ ج ۶، باب من تقبل شهادته ومن لا تقبل۔

علامہ فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی حنفی المتوفی ۲۹۵ھ فرماتے

اما استماع صوت الملاهی کا لضرب بالقضیب و غیر ذلك حرام و معصية
لقوله عليه الصلاة والسلام استماع الملاهی معصية و الجلوس عليها فسوق و
التلذذ بها من الكفر انما قال ذلك على وجه التشديد و ان سمع بغتة فلا اثم عليه
و يجب عليه ان يجتهد كل الجهد حتى لا يسمع لما روى ان رسول الله ﷺ
ادخل اصبعيه في اذنيه.

آلات موسیقی مثلاً لکڑی سے کوئی چیز بجانا اور اس کے علاوہ ایسی دوسری چیزیں سننا حرام اور
(اللہ و رسول ﷺ کی) نافرمانی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آلات موسیقی کو سننا گناہ
ہے وہاں بیٹھنا فسق اور لذت لینا کفر سے ہے، آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان بطور سختی کے ہے، (ہاں)
اگر (کسی شخص نے) اچانک آواز سن لی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور اس پر واجب ہے کہ پوری کوشش
کرے کہ اس کے کان میں آواز نہ آئے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام نے
(بانسری کی آواز سن کر) اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لی تھیں۔

فتاویٰ قاضی خاں علی حاشیہ ص ۴۰۶ ج ۳، کتاب الخطر والا باحة طبع حافظ کتب خانہ
کوئٹہ۔

شمس الامۃ عبد العزیز بن احمد حلوائی الحنفی المتوفی ۴۴۸ھ فرماتے ہیں

السماع والقول والرقص الذى يفعله المتصوفة فى زماننا حرام لا يجوز
القصده اليه والجلوس عليه وهو والغنا والمزامير سواء.

یعنی گانا سننا اور ناچنا جیسا کہ ہمارے زمانہ میں صوفیاء کرتے ہیں حرام ہے، اور جائز نہیں اس
کا قصد کرنا اور وہاں بیٹھنا۔ گانا اور آلات موسیقی کا ایک ہی حکم ہے، بحوالہ فتاویٰ عالمگیری
ص ۳۵۲ ج ۵، طبع کوئٹہ۔

علامہ ابن عابدین درمختار کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

واستماعه، كالرقص و السخرية و التصفيق و ضرب الاوتار من الطنبور و
البربط و الرباب و القانون و المزمارة و الصنج و البوق فانها كلها مكروهة
لأنها زى الكفار و استماع ضرب الدف و المزمارة و غير ذلك حرام و ان سمع
بغته يكون معذورا و يجب ان يجتهد ان لا يسمع، قهستانی.

اور (ہر قسم کا لہو) سننا (حرام ہے جیسا کہ) ناچنا، مذاق اڑانا، تالی بجانا، ستار کے تار بجانا،
بربط، سارنگی، رباب، قانون، بانسری، جھانجر، بگل بجانا مکروہ (تحریمی) ہے کیونکہ یہ کفار کا شعار ہیں
اور دف بانسری اور دیگر آلات موسیقی کا سننا حرام ہے۔

اگرچہ اچانک سن لیا تو معذور ہے اور اس پر لازم ہے کہ پوری کوشش کرے کہ نہ سنے،
تہستانی، فتاویٰ شامی ص ۳۹۵ ج ۶ (باب) فصل فی البیع طبع ایچ ایم سعید کراچی۔

فتاویٰ رضویہ

مولوی احمد رضا خاں صاحب کی شخصیت، مبتدعین میں امتیازی ہے ان کی تحقیقات پر انہیں پورا
وثوق اور کامل یقین ہے ان سے سوال کیا جاتا ہے

بغالی خدمت امام اہل سنت مجدد دین و ملت معروض کہ آج میں جس وقت آپ سے رخصت
ہوا اور واسطے نماز مغرب کے مسجد میں گیا، بعد از نماز مغرب کے ایک میرے دوست نے کہا چلو ایک
جگہ عرس ہے، میں چلا گیا وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں بہت سے لوگ جمع ہیں اور قوالی اس طریقہ سے
بوری ہے کہ ایک ڈھول دو سارنگی بج رہی ہیں اور چند قوال پیران پیر دنگیر کی شان میں اشعار کہہ

رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی نعت کے اشعار اور اولیاء اللہ کی شان میں اشعار گارہے ہیں اور ڈھول سارنگیاں بج رہی ہیں، یہ باجے شریعت میں قطعی حرام ہیں کیا اس فعل سے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ خوش ہوتے ہو گئے؟ اور یہ حاضرین جلسہ گنہگار ہوئے یا نہیں؟ اور ایسی قوالی جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو کس طرح کی؟

الجواب

ایسی قوالی حرام ہے، حاضرین سب گنہگار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر، بغیر اس کے کہ عرس کرنے والے کے ماتھے، قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر سے گناہ کی کچھ کمی آئے، یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ میں کچھ تخفیف ہو، نہیں بلکہ حاضرین میں ہر ایک پر اپنا پورا گناہ اور قوالوں پر اپنا گناہ الگ اور سب حاضرین کے برابر جدا اور ایسا عرس کرنے والے پر اپنا گناہ الگ اور قوالوں کے برابر جدا اور سب حاضرین کے برابر علیحدہ، وجہ یہ کہ حاضرین کو عرس کرنے والے نے بلایا ان کیلئے اس گناہ کا سامان پھیلایا اور قوالوں نے انہیں سنایا اگر وہ سامان نہ کرتا یہ ڈھول سارنگی نہ سناتے تو حاضرین اس گناہ میں کیوں پڑتے اس لئے ان سب کا گناہ ان دونوں پر ہوا، پھر قوالوں کے اس گناہ کا باعث وہ عرس کرنے والا ہوا وہ نہ کرتا نہ بلاتا تو یہ کیونکر آتے بجاتے لہذا قوالوں کا بھی گناہ اس بلانے والے پر ہوا۔

كما قالوا في سائل قوي ذي مرة سوى ان الأخذ والمعطى اثمان لانهم لولم يعطوا لما فعلوا فكان العطاء هو الباعث لهم على الاسترسال في التكدى والسئوال وهذا كله ظاهر على من عرف القواعد الكريمة الشرعية وبالله التوفيق.

جیسے کہ فقہاء نے اس سائل کے بارہ میں جو طاق تورتدرست ہو کہ ایسا خیرات لینے والا اور ایسے کو دینے والا دونوں گنہگار ہیں کیونکہ دینے والے اگر نہ دیں تو بھی گداگری کا مذموم کاروبار نہ کریں پس ان کی عطا ان کی گداگری کا باعث بنی اور یہ سب قواعد شرعیہ جاننے والے پر ظاہر ہے اور اللہ تعالیٰ کیساتھ ہی توفیق ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرماتے ہیں

من دعا الى هدى كان له من الاجر مثل اجور من تبعه لا ينقص ذلك من اجورهم شيئا و من دعا الى ضلالة كان عليه من الاثم مثل اثام من تبعه لا ينقص ذلك من اثامهم شيئا.

جو کسی امر ہدایت کی طرف بلائے جتنے اس کا اتباع کریں ان سب کے برابر ثواب پائے اور اس سے ان کے ثوابوں میں کچھ کمی نہ آئے اور جو کسی امر ضلالت کی طرف بلائے جتنے اس کے بلانے پر چلیں ان سب کے برابر اسیر گناہ ہو اور اس سے انکے گناہوں میں کچھ تخفیف راہ نہ پائے۔

رواہ الائمة احمد و مسلم والا ربعة عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ .

باجوں کی حرمت میں احادیث کثیرہ وارد ہیں ازاں جملہ اجل واعلیٰ حدیث صحیح بخاری شریف ہے، کہ حضور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ

ليكونن في امتي اقوام يستحلون الحر و الحرير و الخمر و المعازف .

ضرور میری امت میں وہ لوگ ہونے والے ہیں جو حلال ٹھہرائیں گے عورتوں کی شرمگاہ یعنی زنا اور ریشمی کپڑوں اور شراب اور باجوں کو۔

حدیث صحیح جلیل متصل و قد اخرجہ ایضا احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ والا سمعیلی و ابو نعیم باسانید صحیحہ لا مطعن فیہا و صححہ جماعة اخرون من الائمة کما قالہ بعض الحفاظ قالہ الامام ابن حجر فی کف الرعاع .

بعض جہال بدمست یا نیم ملاشہوت پرست یا جھوٹے صوفی باد بدست کہ احادیث صحاح مرفوعہ محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصے یا محتمل واقعے یا متشابہ پیش کرتے ہیں، انہیں اتنی عقل نہیں یا قصداً بے عقل بنتے ہیں کہ صحیح کے سامنے ضعیف متعین کے آگے محتمل محکم کے حضور متشابہ واجب التکرار ہے، پھر کہاں قول کہاں حکایت فعل، پھر کجا میج ہر طرح یہی واجب العمل، اسی کو ترجیح مگر ہوس پرستی کا علاج کس کے پاس ہے، کاش گناہ کرتے اور گناہ جانتے اقرار لاتے، یہ ڈھٹائی اور بھی سخت ہے کہ ہوس بھی پالیں اور الزام بھی ٹالیں اپنے لئے حرام کو حلال بنالیں، پھر اس پر بس نہیں بلکہ

معاذ اللہ اس کی تہمت محبوبان خدا اکابر سلسلہ عالیہ چشت قدست اسرار ہم کے سر دھرتے ہیں، نہ خدا سے خوف نہ بندوں سے شرم کرتے ہیں حالانکہ خود حضور محبوب الہی سیدی و مولائی نظام الحق والدین سلطان الاولیاء رضی اللہ عنہ و عنہم، فوائد الفوائد شریف میں فرماتے ہیں

مزامیر حرام است

مولانا فخر الدین زراذی خلیفہ حضور سیدنا محبوب الہی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور کے زمانہ مبارکہ میں خود حضور کے حکم احکم سے مسئلہ سماع میں رسالہ، کشف قناع عن اصول السماع، تحریر فرمایا، اس میں صاف ارشاد فرمادیا کہ

اما سماع مشائخنا رضی اللہ عنہ فبرئ عن هذه التهمة وهو مجرد صوت القوال مع الاشعار المشعرة من کمال صنعة اللہ تعالیٰ.

ہمارے مشائخ کرام رضی اللہ عنہ کا سماع اس مزامیر کے بہتان سے بری ہے وہ صرف قوال کی آواز ہے ان شعار کے ساتھ جو کمال صنعت الہی سے خبر دیتے ہیں۔

لہ انصاف! اس امام جلیل خاندان عالی چشت کا یہ ارشاد مقبول ہو گا یا آج کل کے مدعیان خامکار کی تہمت بے بنیاد، ظاہرۃ الفساد۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم۔

سیدی مولانا محمد بن مبارک بن محمد علوی کرمانی مرید حضور پر نور شیخ العالم فرید الحق الدین گنج شکر و خلیفہ حضور سیدنا محبوب الہی رضی اللہ عنہ کتاب مستطاب، سیر الاولیاء میں فرماتے ہیں۔

حضرت سلطان المشائخ قدس اللہ سرہ العزیز می فرمود کہ چند این چیز می باید تا سماع مباح می شود، مسمع و مستمع و مسموع و آلہ سماع مسمع یعنی گونندہ مرد تمام باشد، کودک نباشد و عورت نباشد مستمع آنکہ می شنود از یاد حق خالی نباشد و مسموع آنچہ بگویند فحش و مسخرگی نباشد و آلہ سماع مزامیر ست چون چنگ و رباب و مثل آن می باید کہ در میان نباشد این جنین سماع حلاست.

حضرت سلطان المشائخ قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز فرماتے تھے کہ چند شرائط ہوں تو سماع مباح ہوگا کچھ شرطیں سننے والے میں کچھ سننے والے میں کچھ اس کلام میں بوسنائی جائے کچھ آلہ سماع

یعنی سنانے والا کامل مرد ہو چھوٹا لڑکا ہو عورت سننے والا یاد خدا سے غافل نہ ہو اور جو کلام پڑھی جائے فحش اور تمسخرانہ انداز کی نہ ہو، اور آلات سماع یعنی مزامیر جیسے سارنگی اور رباب وغیرہ، چاہیے کہ ان چیزوں میں سے کوئی موجود نہ ہو، اس طرح کا سماع حلال ہے۔

مسلمانو! یہ فتویٰ ہے سرور و سردار سلسلہ عالیہ چشت حضرت سلطان اولیاء رضی اللہ عنہ کا کیا اس کے بعد بھی مفتریوں کو منہ دکھانے کی گنجائش ہے؟

نیز۔ سیر الاولیاء شریف میں ہے

یکے بخدمت حضرت سلطان المشائخ عرض داشت کہ دریں روز ہا بعضے از درویشان آستانہ دار در مجمعی کہ چنگ و رباب و مزامیر بود رقص کردند فرمود نیکو نکرده اند آنچه نا مشروع ست ناپسندیدہ است، بعد ازاں یکے گفت چون این طائفہ ازاں مقام بیرون آمدند بایشان گفتند کہ شما چہ کردید، در آن مجمع مزامیر بود سماع چگو نہ شنیدید و رقص کر دید ایشان جواب دادند کہ ما چنان مستغرق سماع بودیم کہ ندا نستیم کہ اینجا مزامیر است یا نہ، حضرت سلطان المشائخ فرمود این جواب ہم چیزے نیست این سخن درہمہ معصیتہا بیاید۔

ایک آدمی نے حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کی کہ ان ایام میں بعض آستانہ دار درویشوں نے ایسے مجمع میں جہاں چنگ و رباب اور دیگر مزامیر تھے رقص کیا، فرمایا انہوں نے اچھا کام نہیں کیا جو چیز شرح میں ناجائز ہے ناپسندیدہ ہے، اس کے بعد ایک نے کہا جب یہ جماعت اس مقام سے باہر آئی، لوگوں نے ان سے کہا تم نے یہ کیا کیا وہاں تو مزامیر تھے تم نے سماع کس طرح سنا اور رقص کیا، انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس طرح سماع میں مستغرق تھے کہ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ یہاں مزامیر ہیں یا نہیں، سلطان المشائخ نے فرمایا یہ جواب کچھ نہیں اس طرح تو تمام گناہوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔

مسلمانو! کیسا صاف ارشاد ہے کہ مزامیر ناجائز ہیں، اور اس عذر کا کہ ہمیں استغراق کے باعث مزامیر کی خبر نہ ہوئی کیا مسکت جواب عطا فرمایا کہ ایسا حیلہ ہر گناہ میں چل سکتا ہے، شراب

پینے اور کہہ دے شدت استغراق کے باعث ہمیں خبر نہ ہوئی کہ شراب ہے یا پانی، زنا کرے اور کہہ دے غلبہ حال کے سبب ہمیں تمیز نہ ہوئی کہ جروا (بیوی) ہے یا بیگانی۔ اسی میں ہے

حضرت سلطان المشائخ فرمود من منع کرده ام کہ مزامیر و محرمات درمیان نباشد و درین باب بسیار غلو کردتا بحدیکہ گفت اگر امام راسہو افتد مرد تسبیح اعلام کند وزن سبحان اللہ نگوید زیر اکہ نشاید آوازاں شنو دن پس پشت دست بر کف دست زند و کف دست بر کف دست زند کہ آن بلہومی مانندا این غایت از ملاہمی و امثال آن پرهیز آمدہ است، پس درسماع بطریق اولیٰ کہ ازیں بابت نباشد یعنی در منع دستک چندی احتیاط آمدہ است پس درسماع مزامیر بطریق اولیٰ منع است (اھ باختصار)

حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا میں نے منع کر رکھا ہے کہ مزامیر اور دیگر محرمات درمیان نہ ہوں اور اس بات میں آپ نے بہت مبالغہ کیا، یہاں تک کہ فرمایا اگر امام نماز میں بھول جائے مرد تو سبحان اللہ کہہ کر امام کو مطلع کرے اور عورت سبحان اللہ نہ کہے کیونکہ اس کو اپنی آواز سنانا نہ چاہیے پس ایک ہاتھ ہتھیلی دوسرے ہاتھ (کی) ہتھیلی پر نہ مارے کہ اس طرح یہ کھیل ہوگا بلکہ ہاتھ کی پشت دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی کی (پشت) پر مارے جب یہاں تک لہو و لعب کی چیزوں اور ان کی طرح چیزوں سے پرہیز آئی ہے تو سماع میں مزامیر بطریق اولیٰ منع ہیں۔

مسلمانو! جو آئمہ طریقت اس درجہ احتیاط فرمائیں کہ تالی کی صورت کو ممنوع بتائیں وہ اور معاذ اللہ مزامیر کی تہمت، لہذا انصاف کیسا خطبے ربط ہے اللہ اتباع شیطان سے بچائے اور ان سچے محبوبان خدا کا سچا اتباع عطا فرمائے آمین الہ الحق آمین۔

بجاہم عندک آمین، و الحمد للہ رب العالمین۔ کلام یہاں طویل ہے اور انصاف دوست کو اسی قدر کافی ہے۔ واللہ الہادی واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ، عبدہ المذنب احمد رضا عفی عنہ۔

محمد بن المصطفیٰ علیہ السلام

احکام شریعت ص ۶۵، و فتاویٰ رضویہ ص ۲۰۰ ج ۱۰ حصہ اول۔

خاں صاحب نے اسی طرح کا ایک اور فتویٰ رمضان المبارک ۱۳۲۰ھ میں تحریر کیا تھا جو خاصاً لبا ہے، بڑے سائز کے تقریباً پانچ صفحات پر مشتمل ہے، فتاویٰ رضویہ ص ۲۱۲ ج ۱۰ جزو اول، اور ص ۵۴ ج ۱۰ جزو اول، میں دو صفحات پر مشتمل خاں صاحب کا مزامیر کے رد میں فتویٰ درج ہے اسی جلد کے ص ۲۵۷ (حصہ دوم) میں قوالی کو جائز کہنے والے کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کی خاں صاحب نصیحت کرتے ہیں۔

مزید فرماتے ہیں قوالی مع مزامیر کے کسی کو سننا جائز نہیں ص ۲۷۴ ج ۱۰ حصہ دوم۔

خاں صاحب سے قوالی و مزامیر کے رد پر تقریباً بیس کے لگ بھگ فتاویٰ ہیں جو ان کے فتاویٰ کی جلد دس کتاب الخطر و لا باحتہ میں موجود ہیں باذوق حضرات مراجعت فرمائیں۔
اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قوالی کی حرمت میں بریلویوں کا پیر بھی ہمارے ساتھ ہے۔

قوالی کے دلائل اور ان کی حقیقت

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

قوالی جو آج کل عام طور پر مروج ہے، جس میں گندے مضامین کے اشعار گائے جاتے ہیں اور فاسق اور مردوں کا اجتماع ہوتا ہے اور محض آواز پر رقص ہوتا ہے یہ واقعی حرام ہے لیکن اگر کسی جگہ تمام شرائط سے قوالی ہو گانے والے اور سننے والے اہل ہوں تو اس کو حرام نہیں کہہ سکتے بڑے بڑے صوفیاء کرام نے خاص قوالی کو اہل کیلئے جائز فرمایا اور نا اہل کو حرام، اس کی اصل وہ حدیث ہے جو مشکوٰۃ کتاب المناقب باب مناقب عمر میں ہے کہ

کہ حضور علیہ السلام کے سامنے ایک لونڈی دف بجا رہی تھی، حضرت صدیق اکبر آئے تو وہ بجاتی رہی حضرت عثمان غنی آئے تو بجاتی رہی مگر جب فاروق اعظم آئے تو دف کو اپنے نیچے ڈال کر بیٹھ گئی، حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اے عمر تم سے شیطان خوف کرتا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ دف بجانا شیطانی کام تھا یا کہ نہیں؟ اگر تھا تو کیا حضور علیہ السلام اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ و عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے شیطان نے خوف نہ کیا اور اس میں خود حضور علیہ السلام اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کیوں کی؟ اور اگر شیطانی کام نہ تھا تو حضور کے اس فرمان کے کیا معنی ہیں؟

جواب وہی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آنے سے قبل یہ ہی کام شیطانی نہ تھا ہوتا رہا اور فاروق اعظم کے آتے ہی شیطانی بن گیا، بند ہو گیا اسی لئے صوفیاء کرام نے اس پر چھ شرطیں لگائیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جاء الباطل ص ۳۲۷ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس تحریر سے ثابت ہوا کہ آج کل کی قوالیاں مفتی صاحب کے نزدیک بھی حرام ہیں، لیکن ان کے ناجائز و حرام ہونے کی وجہ طبلہ و سارنگی اور دیگر آلات موسیقی نہیں بلکہ گندے اشعار، فاسق لوگوں کا اجتماع اور آواز پر رقص کی وجہ ہے، لیکن اگر محض آواز کی بجائے کسی اور وجہ سے رقص کریں اور گندے مضامین اور فاسق لوگ نہ ہوں تو تب موسیقی کے ساتھ قوالی جائز ہے جس کی خیر سے نام نہاد مفتی اور مفسر قرآن نے حدیث نبوی سے بزع خود دلیل بھی درج کی ہے۔

ثانیاً۔ حدیث کے الفاظ ہمارے سامنے ہیں کہ

ان الشیطان لیخاف منک یا عمر۔

بے شک شیطان اے عمر تجھ سے ڈرتا ہے۔

مشکوٰۃ ص ۵۵۸، وترندی مع تحفہ ص ۳۱۷ ج ۳۔

لیکن مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آنے کے بعد یہ کام شیطانی ہوا، پہلے نہ تھا حالانکہ متن روایت سے اس کی تردید ہوتی ہے کہ جب حضرت عمر آئے تو شیطانی بن گیا، کیونکہ شیطان کا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے خائف ہونے کی آنحضرت ﷺ اسی حدیث میں خبر دے رہے ہیں لیکن آپ رضی اللہ عنہ کے آنے کے ساتھ ہی شیطان کی آمد کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو کلام نبوی کی تکذیب ہوتی ہے مگر مفتی صاحب کی بلا جانے انہیں تو فقط قوالی کی دلیل درکار ہے۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ حضور علیہ السلام اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شیطان نے خوف کیوں نہ کیا۔

تو جواباً عرض ہے کہ حنفیہ کے مسلم بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ چور و بد معاش ہمیشہ وزیراعظم اور صدر کی بجائے پولیس سے ڈرتے ہیں کیونکہ انہوں نے جوتے مارنے اور پٹائی کرنی ہوتی ہے صدر اور وزیراعظم سے برے لوگوں کا نہ ڈرنا اس سے ان کی توہین

لازم نہیں آتی اور نہ ہی پولیس کی ان پر عظمت و بزرگی ثابت ہوتی ہے اسی طرح روایت میں نہ عظمت مصطفیٰ ﷺ پر کوئی حرف ہے اور نہ ہی نبی کریم ﷺ اور دیگر صحابہ پر شان فاروقی ثابت ہوتی ہے۔ مفہوماً، از تحفۃ اثنا عشریہ، صفحہ ۱۶۸ طبع میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی۔

رابعاً۔ رہا مفتی صاحب کا دف سے دور حاضر کی موسیقی کا جواز ثابت کرنا تو یہ ان کی زیادتی ہے کیونکہ دف کی آواز ہی ایسی ڈھپ ڈھپ کی سی ہوتی ہے کہ اسے کوئی موسیقی کہہ ہی نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ ہندی میں دف کو ڈھپ کہتے ہیں جو غالباً آواز کی مناسبت سے نام رکھا گیا ہے اس لئے اگر دف نکاح، عید، وغیرہ کے موقع پر بجایا جائے تو جائز ہے مگر اس میں بھی لہو و لعب کی نیت کو دخل نہ ہو۔

علامہ سر حسی حنفی فرماتے ہیں۔

انما المکروه طبول اللہو بمنزلۃ الدفوف لابس بضر بہا فی اعلان النکاح و انکرہ ذلک للہو۔

دف اور طبل کا بجانا مکروہ ہے، نکاح کے اعلان کیلئے دف بجانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور لہو کیلئے دف بجانا مکروہ ہے۔

شرح سیر کبیر ص ۴۵۸ ج ۴، طبع المکتب الثورۃ الاسلامیہ۔

لیکن دف سے آج کل کی موسیقی پر استدلال کرنا درست نہیں کیونکہ ایک تو دف کی آواز ہی ایسی ہے جسے ہم موسیقی میں داخل نہیں کر سکتے، دوسرا یہ کہ دف کی اس مخصوص اجازت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی عام نہیں بلکہ خاص ہی جانا ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ وہ جب دف کی آواز سنتے تو معلوم کروا تے کہ یہ دف کس لئے بجائی گئی ہے اگر نکاح وغیرہ کا موقع ہوتا تو خاموش ہو جاتے،

مصنف عبدالرزاق ص ۵۵ ج ۱۱۔

لیکن اس مخصوص آلہ (دف) کو مفتی صاحب کا آج کل کے آلات موسیقی پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ رخصت اسی کے ساتھ خاص ہے۔

خامساً۔ روایت میں محض دف بجانے کا ذکر ہے گانا گانے، رقص اور وجد کا بیان نہیں ہے جب

کہ قوالی میں گانا اور رقص بھی ہوتا ہے تو اس سے قوالی کس طرح ثابت ہوئی، مفتی صاحب کا استدلال بالکل اس شخص کی طرح ہے جو علم کلام کے محمود و مذموم ہونے کی بحث میں نفس کلام پر گفتگو کرتا ہے اسے، اسم، فعل، حرف پر تقسیم کرتا ہے، یا خاموشی کی فضیلت ثابت کر کے علم کلام کی مذمت کرتا ہے یا گفتگو کے جائز و مباح ہونے سے علم کلام کی تائید کرتا ہے، حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ بحثیں اصل موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتیں بلکہ سراسر جدل و مناظرہ کی پیداوار ہیں۔

سادساً۔ روایت میں فقط بچی نابالغہ کا بیان ہے، جاءت جاریۃ، یعنی ایک بچی آئی۔ ترمذی مع تحفہ ص ۳۱۶ ج ۴۔

تو اس سے بالغ عورت اور مرد کا دف بجانا کیسے ثابت ہوا اور وہ بھی دیگر آلات موسیقی اور تالی و رقص اور وجد اور دیگر خرافات کے ساتھ جب کہ قوالی کیلئے مفتی صاحب بالغ ہونا شرط لگاتے ہیں ان کے الفاظ ہیں مجلس میں کوئی بے داڑھی کے لڑکا نہ ہو۔ جاء الباطل ص ۳۲۸ ج ۱۔

الغرض مفتی صاحب نے پہلے تو نابالغ کی بات کو بالغ پر قیاس کیا ہی تھا غضب یہ ڈھایا کہ بچی سے مرد بنالیا، حالانکہ مرد کو دف بجانے کی ممانعت کا فتویٰ ان کی فقہ میں موجود تھا۔ علامہ ابن نجیم حنفی کنز الدقائق، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

مباح وهو الدف فی النکاح و فی معناه ماکان من حادث سرور ویکره فی غیرہ لما روی عن عمر رضی اللہ عنہ انہ لما سمع صوت الدف بعث فنظر فان کان فی ولیمۃ سکت و ان کان فی غیرہ عمدہ بالدرة و هو مکروه للرجال علی کل حال للتشبه بالنساء.

یعنی دوسری قسم کا آلہ جو نکاح اور دیگر (شرعی) خوشی کے موقع پر مباح ہے وہ دف ہے اور ان کے علاوہ دیگر مواقع پر دف بجانا مکروہ ہے کیونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب دف کی آواز سنتے تو کسی کو دیکھنے کیلئے بھیجتے اگر ولیمہ کا موقع ہوتا تو خاموش رہتے اور اگر کوئی اور موقع ہوتا تو درہ سے سزا دینے کا قصد کرتے اور مردوں کیلئے ہر حال میں دف بجانا مکروہ ہے کیونکہ اس میں عورتوں سے مشابہت ہے، البحر الرائق ص ۸۸ ج ۷۔

خلاصہ کلام

قارئین کرام مفتی صاحب نے قوالی کے اثبات کیلئے حدیث کے مفہوم میں حسب ذیل بے ایمانیاں کی ہیں۔

- (۱) بیان فقط دف کا تھا، مفتی صاحب نے تمام آلات موسیقی کو شامل کر لیا۔
- (۲) روایت میں گانے کا ذکر نہ تھا مفتی صاحب نے خود متن میں داخل کر لیا۔
- (۳) ذکر نابالغ کا تھا جس سے مفتی صاحب نے بالغ کا فعل ثابت کر لیا۔
- (۴) مونث سے مذکر بنا لیا۔
- (۵) خوشی کے موقع کو عام باور کرا کر قوالی کا اثبات کر لیا۔

علامہ شامی کی ادھوری عبارت

مفتی صاحب نے فتاویٰ شامی سے قوالی کے جواز پر ایک عبارت نقل کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ

آلات لہو و لعب حرام نہیں ہیں بلکہ آلات لہو و لعب (آلات موسیقی) کو بجانے والا یا سننے والا لہو کا قصد کرے تب حرام ہیں بزرگان دین جو سماع کرتے رہے ہیں اس پر معترض کو انکار نہیں کرنا چاہیے تاکہ ان کی برکات سے محروم نہ ہو،
جاء الباطل ص ۳۲۸ ج ۱۔

اولاً۔ واضح رہے کہ مفتی صاحب نے فقط عربی عبارت نقل کی ہے معنی نہیں کیا، ترجمہ نہ کرنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مفتی صاحب کا دل بھی اس پر مطمئن نہ تھا ورنہ اپنی دلیل کا معنی ضرور کرتے اور اپنے استدلال کو بھی واضح کرتے۔

ثانیاً۔ علامہ شامی کے کلام میں تناقض ہے کیونکہ پہلے فتاویٰ شامی ص ۳۹۵ ج ۱ کے حوالے سے ان کی عبارت گزر چکی ہے کہ آلات موسیقی فی نفسہ حرام ہیں اور ان کا سننا مکروہ تحریمی ہے اور اگر اچانک سن لیا تو پوری کوشش کرے کہ نہ سنے۔

ثالثاً۔ جب علامہ شامی کو ان کے حرام ہونے کا اعتراف بھی ہے تو حرمت ان کے مکروہ ہونے

کی وجہ سے ہی ہے نہ کہ بطور لہو و لعب کے، علاوہ ازیں یہ عذر تو ہر حرام اور گناہ میں کیا جاسکتا ہے کہ

شراب کو بطور لہو و لعب کے پینا حرام ہے۔

زنا کو بطور لہو و لعب کرنا حرام ہے۔

چوری کو بطور لہو و لعب کرنا حرام ہے۔

الغرض یہ بہانے سرے سے قابل التفات ہی نہیں کہ کسی فعل حرام کو بطور لہو و لعب کرنا حرام ہے، کسی دوسری وجہ سے کرنا جائز ہے۔

رابعاً۔ خود علامہ شامی نے مفتی صاحب کی درج کردہ عبارت سے قبل تحریر کیا ہے کہ
وفی الملتقى و عن النبی ﷺ انه کره رفع الصوت عند قرآءة القرآن و
الجنائز و الزحف و التذکیر، فما ظنک به عند الغناء الذی یسمونه و جدا و محبة
فانه مکروه لا یرى له فی الدین قال الشارح زاد فی الجوهرة و ما یفعله متصوفة
زماننا حرام لا یجوز القصد و الجلوس الیه و من قبلهم یفعل کذا لک الی أن قال و
ان کان سماع غناء فهو حرام باجماع العلماء و من اباحه من الصوفیة فلمن تحلی
عن اللہو، و تحلی بالتقوی، الی قوله والحاصل انه لا رخصة فی السماع فی زماننا
لان الجنید رحمہ اللہ تعالیٰ تاب عن السماع فی زمانہ.

یعنی ملتقی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تلاوت قرآن، جنازہ، جہاد اور وعظ و نصیحت کے وقت
آواز کو بلند کرنے کو پسند نہیں فرمایا، تو تمہارا کیا خیال ہے اس گانے کے متعلق جس کو یہ حضرات وجد
اور محبت کہتے ہیں کیونکہ یہ مکروہ ہے اور دین اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، شارح کہتے ہیں
کہ جو ہرہ نیرہ، میں ہے کہ آج کل کے زمانہ میں صوفیوں کی مجلس میں بیٹھنا اور انکا ارادہ کرنا ناجائز
ہے کیونکہ پہلے لوگ ایسا نہ کرتے تھے، الغرض اگر سماع گانے کے ساتھ ہو تو اس کے حرام ہونے پر
علماء کا اجماع ہے اور صوفیاء سے جو اس کی اباحت کے قائل ہیں وہ اسے بطور لہو کے حلال نہیں جانتے
بلکہ بطور تقویٰ جانتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس زمانہ میں سماع سننا جائز نہیں کیونکہ جنیدؒ نے اپنی زندگی میں ہی اس

سے توبہ کر لی تھی۔ ملخصاً فتاویٰ شامی ص ۳۳۹ ج ۶۔

الغرض علامہ شامی بھی اس دور میں سماع و قوالی کے حرام کہنے میں ہمارے ساتھ متفق ہیں۔ واضح رہے کہ اس عبارت کو ہم نے مفتی صاحب کی تردید کی غرض سے نقل کیا ہے، ورنہ ہماری تحقیق اور دین و ایمان یہی ہے کہ قوالی نہ پہلے حلال تھی اور نہ اب ہے، الغرض موسیقی زمانہ رسالت سے ہی حرام تھی، اور اب بھی اس کی حرمت باقی ہے۔

باب کفنی والفی تحریر کرنیکی بحث

دنیا آخرت کی کھیتی ہے اس میں رہ کر جو بویا جائے گا وہ مرنے کے بعد انسان کیلئے پک کر تیار ہو جائے گا، گویا دنیا دار العمل ہے اور اگلی زندگی دار الجزا ہے، جس میں انسان کو اس کے کئے کا پھل مل جائیگا۔

جس نے دنیا کی چار دن کی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق گزارا وہ آخرت کی پہلی گھڑی قبر میں بھی کامیاب و کامران رہے گا، اسے کسی کفنی والفی کی ضرورت نہیں، اور نہ ہی وہ منکر و نکیر کے جوابات دینے کیلئے ہماری کفنی والفی کا محتاج ہوگا جیسا کہ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ کا نام لکھا ہوا دیکھ کر بھی مردے کو جواب نکیرین یاد آنے کی امید ہے یہ بھی ایک قسم کی تلقین ہے، جاء الباطل ص ۳۴۰ ج ۱۔

رب تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہے فرماتا ہے

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ . وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ . (ابراہیم ۲۷)

اللہ تعالیٰ مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور) پکی بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے اور آخرت میں بھی (رکھے گا) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے

(۱۴-۲۷)

اس آیت میں، فی الآخرة، کے الفاظ کا تعلق قبر میں مدفون مومن کے ساتھ ہے جیسا کہ صحیح

حدیث میں اس کی صراحت ہے

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

عن النبی ﷺ قال اذا أقعد المؤمن فی قبره اتی ثم شهد ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله فذلك قوله یثبت الله الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة.

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا جب مومن کو قبر میں بیٹھایا جاتا ہے تو اس کے پاس (فرشتے) آتے ہیں پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی الہ نہیں اور بے شک محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔

بالقول الثابت فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة.

کی آیت سے یہی مراد ہے۔ بخاری ص ۱۸۳ ج ۱، و مسلم ص ۳۸۶ ج ۲، واللفظ لہ۔

ہمارے مہربان مفتی صاحب کو بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے، چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

یعنی مومن دنیا میں بہ ہر حال ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور مرتے وقت کلمہ طیبہ پڑھ کر گناہوں سے توبہ کر کے مرتا ہے حساب قبر پر اس کا دل مطمئن رہتا ہے جس سے بہ آسانی جواب دے لیتا ہے، نور العرفان ص ۴۱۲۔

مولوی نعیم الدین مراد آبادی (استاذ محترم، مفتی صاحب) مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے، فی الآخرة، کے الفاظ کی تفسیر میں فرماتے ہیں

یعنی قبر میں کہ اول منازل آخرت ہے جب منکر و نکیر آکر ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا دین کیا ہے اور سید عالم ﷺ کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں ان کی نسبت کیا کہتا ہے تو مومن اس منزل میں بفضل الہی ثابت رہتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور دین اسلام اور یہ میرے نبی محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول (ہیں) خزائن العرفان ص ۳۷۴ حاشیہ نمبر ۷۰۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مومن کو جس طرح دنیا کی زندگی میں اسلام، بانی اسلام اور رب قدیر کی ذات کا علم اور معرفت ہوتی ہے اسی طرح اسے اخروی اور برزخی زندگی میں بھی علم و معرفت ہوتی ہے اور جس طرح وہ دنیا کی زندگی میں اسلام پر استقامت اختیار کرتا ہے اسی طرح وہ برزخی زندگی میں استقامت رکھتا ہے، وہ قبر کی دہشت اور منکر و نکیر سے خوف زدہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ جزم و یقین اور اطمینان سے انہیں جوابات دیتا ہے اور اس کے دل میں ذرا بھر بھی بے قراری نہیں آتی، لہذا اسے کفی والفی سے تلقین کرنا بے سود اور بے کار ہے اور اگر کافر و منافق ہے تب بھی اس کیلئے کفنی والفی عبث ہے کیونکہ کافر و منافق ہماری کفنی والفی کی تلقین کے باوجود اس سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتا۔

الغرض کفنی والفی کی تلقین اصول اسلام اور شریعت حقہ کی تعلیم کے ہی منافی ہے یہی وجہ ہے کہ کسی معتبر اور سند صحیح سے اس کا رسول اللہ ﷺ سے ثبوت نہیں ہے اور نہ ہی صحابہ کرام کے مقدس گروہ میں اس کا وجود پایا جاتا تھا بلکہ خیر القرون کے سنہری دور میں ان خرافات کا نام و نشان ہی نہ تھا کیونکہ وہ حضرات بخوبی جانتے تھے کہ تلقین کا یہ محل ہی سرے سے نہیں کیونکہ سکھایا پڑھایا تو اسے جاتا ہے جو جانتا نہ ہو، جب کہ قبر میں مدفون مومن تو ان تینوں سوالوں کا جواب بخوبی جانتا ہے وہ تو ساری زندگی ان کیلئے تیاری کرتا ہے اور دن رات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں بسر کرتا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دفن کرنے کے بعد تلقین کی بجائے اس کیلئے استقامت کی دعا فرماتے تھے۔

جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

كان النبي ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف عليه فقال استغفروا لا خيكم وا

سالوا له بالتثبيت فانه الان يستل.

یعنی نبی ﷺ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو اس (قبر) پر ٹھہرتے اور فرماتے

اپنے بھائی کیلئے استغفار کرو اور اس کیلئے استقامت کی دعا کرو کیونکہ وہ اب سوال کیا جائے گا۔

سنن ابی داود مع عون ص ۲۰۹ ج ۳، و مستدرک حاکم ص ۳۷۰ ج ۱۔
 دیکھئے آنحضرت ﷺ نے استقامت کی دعا فرمائی اور دعا مانگنے کا حکم بھی فرمایا، مگر جو سوالات
 کیئے جانے تھے، ان کے جواب کی تلقین نہیں فرمائی اگر کفنی وغیرہ سے میت کو فائدہ ہوتا ہے تو آپ
 علیہ السلام ضرور بھر ضرور دعا کی طرح کفنی و الفی کی تحریر لکھنے کا حکم بھی فرماتے، مگر ایسا کسی حدیث
 سے ثابت نہیں اور آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے جس فعل کو کرنے کا میں نے حکم و ارشاد نہیں فرمایا،
 وہ مردود و بدعت ہے، چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد۔

یعنی بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس (شخص) نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہماری
 طرف سے کوئی حکم (ثبوت) نہیں ہے تو وہ کام مردود ہے۔

بخاری ص ۱۰۷۲ ج ۲، و مسلم ص ۷۷۷ ج ۲، و مسند احمد
 ص ۱۲۶ و ۱۸۰ و ۲۵۶ ج ۶، و سنن دار قطنی ص ۲۲۷ ج ۴۔

یہ حدیث بدعات کے رد میں اصول کا درجہ رکھتی ہے کہ جن بدعات کو مبتدعین کرتے ہیں ان
 میں اگر کوئی خیر و برکت ہوتی ہے تو ہادی برحق ﷺ ان کے کرنے کا ارشاد فرماتے اور خیر و برکت کی
 خبر بھی دیتے مگر زبان نبوی علیہ التحیۃ والسلام اس سلسلہ میں خاموش ہے کہ مرنے والے کے کفن
 میں الفی وغیرہ تحریر کی جائے۔

ثابت ہوا کہ کفنی و الفی کی شرع میں وضاحت نہیں لہذا بدعت سیئہ اور فرمان مصطفیٰ ﷺ کے
 مخالف ہے، چنانچہ علماء اہل حدیث نے اس کے بدعت قبیحہ ہونے کی دھڑلے سے صراحت کی ہے۔

چنانچہ الحاج میاں محمد نذیر حسین محدث دہلویؒ فرماتے ہیں

اسی طرح جو کفن پر لکھنے کی روایت نقل کی ہے محض بے اصل اور اس کا کچھ پتا اور نشان کتب
 آئمہ اربعہ بروایت صحیحہ اور محدثین محققین کی کتابوں میں نہیں پایا جاتا اور ظاہر ہے کہ کفن پر آیات و
 دعا لکھنا سرا سر بے ادبی ہے کہ پیپ اور خون میں ملوث ہوں گے، اس لئے ابن عابدین شامی نے

حاشیہ درمختار میں کفن پر آیت و حدیث کے لکھنے سے منع کیا ہے

وقد اُفتی ابن الصلاح بانہ لا يجوز ان يكتب علی الكفن سورة يس او الكهف و نحوهما خوفا من صديد الميت، فلا يجوز تعريضهما للنجاسة، والقول بانہ يطلب فعله مردود لان مثل ذلك لا يحتج به الا اذا صحح عن النبي ﷺ طلب ذلك و ليس كذلك اه و قد منّا قبيل باب المياہ عن الفتح انه تکره كتابة القران واسماء الله تعالى علی الدراهم و المتحاريب و الجدران و ما يفرش، وما ذاک إلا لا احترامه و خشيمه و طئه و نحوه مما فيه إهانة فالمنع هنا بالأولی مالَم يثبت عن المجتهد او ينقل فيه حديث ثابت فتأمل، ملخصاً، فتاوی شامی ص ۲۴۶ ج ۲، کتاب الجنائز (باب الشهيد) مطلب فيما يكتب علی کفن الميت.

یعنی ابن صلاح نے کفن پر سورۃ کھف اور یس لکھنے کی ممانعت کا فتویٰ دیا ہے، کیونکہ میت کی پیپ سے کفن ناپاک ہو جائیگا اور قرآن مجید کی توہین ہوگی اور یہ کہتے ہیں (مبتدعین) کر لینا چاہیے، یہ بات مردود ہے کیونکہ نبی ﷺ سے منقول نہیں ہے اور ہم پہلے باب المياہ میں فتح القدیر سے بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے (ابن ہمام حنفی) دراهم، محرابوں، دیواروں پر قرآن پاک کی کتابت اور اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھنے سے منع کیا ہے اور یہ ان کا فتویٰ نہیں مگر اس خوف و خطرہ کی وجہ سے کہ اس سے ان کی اہانت (توہین) ہوگی اور یہاں (کفن پر کفنی) پر تو بالاولیٰ منع ہونا چاہئے، یہاں تک کہ اس سلسلہ میں کسی مجتہد کا فتویٰ یا حدیث ثابت نہ کی جائے.....

الراقم العاجز سید محمد نذیر حسین عفی عنہ، فتاویٰ، نذیریہ ص ۶۹۱ ج ۱۔

مفتی اہل حدیث، شارح سنن ابو داؤد حضرت علامہ محمد شمس الحق محدث عظیم آبادی فرماتے ہیں۔

میت کی پیشانی پر انگلی سے بسم اللہ لکھنا کتاب الہی و سنت رسول و اجماع صحابہ و قیاس مجتہدین سے ہرگز ثابت نہیں ہے اور جو ان چار دلیلوں میں سے کسی سے بھی ثابت نہ ہو وہ کام کرنا منع ہے

اور اسی طرح کفن پر کوئی چیز لکھنا یا کسی متبرک چیز کا رکھنا بھی جائز نہیں ہے، اگر سوال کیا جائے کہ فقہ کی بعض کتابوں سے لکھنا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ محمد بن محمد بزازی نے فتاویٰ بزازیہ میں لکھا ہے کہ، صفار نے کہا ہے کہ اگر میت کی پیشانی یا پگڑی یا کفن پر عہد نامہ لکھا جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے اور، تاتار خانیہ، میں ہے کہ کسی نے اپنے بیٹے کو وصیت کی جب میں مر جاؤں اور غسل دے دیا جائے تو میری پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم، لکھ دینا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا خواب میں باپ کو دیکھا تو اس کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ جب مجھے قبر میں رکھا گیا تو عذاب کے فرشتے آئے جب انہوں نے میری پیشانی اور سینہ پر بسم اللہ لکھی دیکھی تو کہنے لگے تو عذاب سے بچ گیا اور ابراہیم نے صغیری شرح منیہ، میں اور علاؤ الدین حصفکی نے درمختار میں اور ابن عابدین نے رد المحتار، میں فتاویٰ بزازیہ کے حوالے سے اس عبارت کو لکھا ہے اور جواز کا فتویٰ دیا ہے اور ابن عجل پہلے اسی کا فتویٰ دیتے تھے بعد ازاں صدقہ کے اونٹوں پر جو لفظ، اللہ، لکھا جاتا تھا اس پر قیاس کر کے لکھنے کا فتویٰ بھی دینے لگے اور اسی طرح شرجی کے حوالے سے بعض محشین نے سینہ پر انگلی سے بسم اللہ اور کلمہ لکھنا نقل کیا ہے، یہی فتویٰ محمد اسحاق دہلوی نے مائتہ المسائل، میں اور، مفتاح الجنان، و، کفایہ، شععی میں درج ہے، تو اس سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں، میں کہتا ہوں اولہ اربعہ میں سے کوئی دلیل بھی مذکورہ کتابوں میں نقل نہیں کی گئی اور اس کی بنا قیاس فاسد پر ہے یا پھر خواب پر، قیاس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اذکار اور ادعیہ اور ان کی ہیئت کزائی سب توقیفی (جن پر قیاس کو دخل نہ ہو) ہیں ان کو از خود تجویز کرنے اور ان پر اجر و ثواب مرتب کرنا کسی کو بھی حق نہیں ہے، یہ حق صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا ہے بعض چیزیں بظاہر دیکھنے میں اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن چونکہ وہ منقول نہیں ہیں لہذا منع میں، دیکھنے صبح طلوع ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ سے صرف دو رکعت سنت ثابت ہیں اب اگر کوئی زیادہ پڑھے تو ناجائز ہوگا، حالانکہ نماز فی نفسہ بہت اچھی چیز ہے، عید گاہ میں نفل چونکہ آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں ہیں اگر وہاں نفل پڑھے ناجائز ہوگا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ سورۃ قل یا ایہا الکفرون سے لیکر آخر تک ایک ہی رکعت میں نہ پڑھے کیونکہ یہ بدعت ہے، ثابت نہیں، اور صدقہ کے اونٹوں پر قیاس کر کے لکھنا قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ اونٹوں پر جو لکھا جاتا تھا وہ علامت کیلئے لکھا جاتا تھا اور یہاں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ تبرک اور نجات کیلئے لکھا جاتا ہے اور پھر وہاں بے ادبی کا امکان نہیں اور یہاں پیپ وغیرہ میں ملوث ہونے کا یقین ہے۔

باقی رہا خواب کا معاملہ تو نبی کی خواب کے سوا کسی کی خواب حجت شرعی نہیں ہے۔

العبد الفقیر ابو الطیب محمد المدعو بشمس الحق عفا عنہ ذنوبہ رب الفلق۔
نوٹ۔ اصل فتویٰ فارسی زبان میں ہے، جن میں عربی عبارات بھی بکثرت ہیں، راقم نے عوام کی تفہیم کیلئے، فقط مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کا ترجمہ اختصار سے نقل کیا ہے، فتاویٰ نذیریہ ص ۵۰۰ تا ۵۰۷ ج ۱۔

شارح سنن ترمذی علامہ محمد عبدالرحمن محدث مبارک پوری فرماتے ہیں
ڈھیلوں پر سورۃ اخلاص وغیرہ پڑھ کر قبر میں رکھنا یا قرآن مجید کی کوئی آیت یا کوئی دعا لکھ کر قبر میں رکھنا یا کعبہ شریف کا غلاف یا کسی بزرگ کا کوئی کپڑا یا اس کی کوئی اور چیز تبرکات میں رکھنا جائز نہیں ہے یہ کام ناواقف لوگوں کا ہے، ایسے کاموں سے احتراز واجباً لازم ہے۔ کتاب الجنائز ص ۷۳۔

شیخ الاسلام امام المناظرین حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں کہ ایسے افعال حدیثوں سے ثابت نہیں ہیں، اگر کچھ ہے تو بدعت ہے۔

فتاویٰ ثنائیہ ص ۲۹ ج ۲۔

الغرض یہ بدعت سمیٹ ہے، اس کو کرنے اور لازم قرار دینے والے حضرات پر اس کی دلیل شرعی دینی ادھار ہے جو کہ یہ کبھی ثابت نہیں کر سکتے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کفنی یا الفی لکھنے کے دلائل اور ان کا تجزیہ مفتی صاحب کی پہلی دلیل

قبر میں بزرگان دین کے تبرکات اور غلاف کعبہ و شجرہ یا عہد نامہ رکھنا مردہ کی بخشش کا وسیلہ ہے قرآن فرماتا ہے کہ

وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ. يوسف عليه السلام نے بھائیوں سے فرمایا تھا،

اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَاَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ ابْنِي يَاتَ بِصَبْرًا.

میری قمیض لے جا کر والد ماجد کے منہ پر ڈال دو وہ اٹھیا رہے ہو جائیں گے، معلوم ہوا کہ بزرگوں کا لباس شفا بخشا ہے، کیونکہ یہ ابرہیم علیہ السلام کی قمیض تھی تو امید ہے کہ بزرگوں کا نام مردے کی عقل کھول دے اور جوابات یاد آجائیں،
جاء الباطل ص ۳۳۶ ج ۱۔

کیا توسل سے تبرک اور تبرک سے کفنی و الفی ثابت ہوتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان آیات کا تعلق کفنی و الفی لکھنے سے ہے، قطعاً نہیں، تو پھر مبتدعین کا موقف کیسے ثابت ہوا۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا تبرک اور وسیلہ کو ایک ہی زمرہ میں گنونا، غلط بیانی ہے، کیونکہ وسیلہ تو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا کسی چیز سے تقرب حاصل کرنے کو، اسکی تین صورتیں مشروع ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے کسی اسم پاک یا کسی صفت حمیدہ کے ساتھ وسیلہ۔

(۲) دعا کرنے والا اپنے عمل کو وسیلہ کے طور پر پیش کرے۔

(۳) کسی زندہ مرد صالح کی دعا کے ساتھ وسیلہ۔

ان کے علاوہ باقی صورتیں وسیلہ کی اختلافی ہیں، جب کہ اس میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ ناجائز اور غیر مشروع ہیں کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس کے ساتھ حجت پکڑی

جائے۔

جب کہ مبتدعین کا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب اعمال و عبادات اور انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کی ذات کے توسل سے بھی جائز ہے۔

مولانا غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی فرماتے ہیں کہ

ائمہ لغت کی ان تصریحات سے واضح ہوا کہ جس چیز سے غیر کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے، اللہ تعالیٰ کا تقرب اعمال صالحہ اور عبادات سے حاصل ہوتا ہے، تاہم انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو عزت اور وجاہت حاصل ہے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت دعا کیلئے اس عزت اور وجاہت کو پیش کرنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا بھی جائز ہے، زندگی میں اور وفات کے بعد بھی۔ شرح صحیح مسلم ص ۵۶ ج ۷۔

لیکن اس کے برعکس تبرک یہ ہے کہ کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے آثار سے جب کسی اثر کو پالے تو وہ اس کے ساتھ حصول خیر و برکت کا متمنی ہو، تو گویا تبرک و توسل میں دو طرح سے فرق ہے۔

(۱) تبرک کے ساتھ کسی دینی خیر و برکت ہی کی امید ہوتی ہے، لیکن توسل میں دنیا و آخرت میں کسی بھی خیر و برکت کی امید کی جاسکتی ہے۔

(۲) تبرک سے جلد حاصل ہو جانے والی خیر و برکت کا حصول مقصود ہوتا ہے جب کہ وسیلہ صرف دعا ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔

مگر افسوس کہ تبرک و توسل کو مفتی صاحب ایک بار و کرار ہے ہیں پھر بات کو خلط ملط کر کے توسل سے تبرک اور تبرک سے کفنی و الفی بنائی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، جس کی دلیل پر ابھی تک ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

ثالثاً۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے والد محترم علیہ السلام کو اپنی قمیض بھیجنا اور ان کی اس سے بینائی لوٹ آنے کو کفنی و الفی سے کیا واسطہ ہے، حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی حنفی فرماتے ہیں آنکھیں گئی تھیں ایک شخص کے فراق میں، اسی کے بدن کی چیز ملنے سے چنگی ہوئیں، یہ کرامت تھی حضرت یوسف علیہ السلام کی، موضح القرآن بحوالہ تفسیر عثمانی ص ۳۲۶۔

الغرض یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ تھا، اور معجزہ سے قبر میں کفنی والفی کا ثبوت کس طرح ثابت ہو گیا۔

اس طرح تو ایک شخص یہ بھی دعویٰ کر سکتا ہے کہ قرآن رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور بابرکت بھی ہے لہذا قبر میں قرآن کریم بھی رکھنا چاہیے، دوسرا آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور معجزہ ملا تھا لہذا قبر میں عصا رکھنا چاہئے، تیسرا شخص یہ اجتہاد بھی کر سکتا ہے کہ جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو تلوار عنایت کی تھی جو بابرکت تھی لہذا قبر میں تلوار کو رکھا جائے، چوتھا آدمی یہ دعویٰ کر دے کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے فضائل (پیشاب و پاخانہ وغیرہ) ظاہر ہیں اور ان سے پیٹ کی بیماری دور ہو گئی تھی۔

شرح صحیح مسلم ص ۸۱ و ۸۹ ج ۶، مولفہ غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی۔

لہذا قبر میں کسی ولی و بزرگ سے پیشاب و پاخانہ کروا کر میت کو دفن کرنا چاہیے۔
تو ایسے مدعی کو علماء بریلویہ بھی دماغی اپریشن کا مشورہ دیں کہ جب کہ اہل علم اور ارباب عقل و خرد کے نزدیک ان جیسے دلائل کی حیثیت پرکاہ کی بھی نہیں۔

رابعاً۔ قرآن کریم کی یہ آیات رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کو پڑھا تابعین عظام ان سے بخوبی واقف تھے خیر القرون میں ان کی خوب شہرت تھی، لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی پتہ نہ چلا کہ ان آیات سے کفنی والفی ثابت ہوتی ہے، اسکی دریافت کا سہرا مبتدعین کے حکیم الامت اور مفسر قرآن کے سر پر ہے کہ جو اپنے استدلال باطل میں کوئی دلیل سنت خیر الانام اور تعامل صحابہ کرام اور اقوال تابعین سے پیش نہیں فرما رہے، معلوم ہوا کہ ان آیات سے کفنی والفی کا مفہوم مفتی صاحب کا کشید کردہ ہے، جو تفسیر بالرائے ہونے کی وجہ سے اس لائق ہے کہ، اٹھا کر پھینک دو اسے باہر لگی میں۔

جب کہ خود مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

تفسیر قرآن کے چند مرتبے ہیں، تفسیر بالقرآن یہ سب سے مقدم ہے، اس کے بعد تفسیر قرآن بالاحادیث، کیونکہ حضور علیہ السلام صاحب قرآن ہیں، ان کی تفسیر قرآن نہایت ہی اعلیٰ، پھر قرآن کی تفسیر صحابہ کرام کے قول سے خصوصاً فقہاء صحابہ اور خلفاء الراشدین، رہی تفسیر قرآن تابعین یا تبع

تابعین کے قول سے، یہ اگر روایت سے ہے تو معتبر ورنہ غیر معتبر، ماخوذ از اعلاء کلمۃ اللہ للعلامہ گولڑوی قدس سرہ۔ جاء الباطل ص ۱۱۱۔

مگر آنحضرت ﷺ اور امت مرحومہ کا تعامل ہمارے پیش نظر ہے کسی ایک نے بھی مذکورہ آیات کو کفنی والفی پر محمول نہیں کیا، جس سے ثابت ہوا کہ مفتی صاحب کی تفسیر ایجاد بندہ ہے جو من گھڑت ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہے۔

اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو سنت صحیحہ آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اقوال تابعین سے اس کا ثبوت دیں، جو ان شاء الرحمن کبھی بھی اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، یہ صبح ازل تک ان پر ادھار رہے گا۔ ان شاء الرحمن۔

خامیہ قرآن تو بیان کرتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اذهبوا بقمیصی، سورہ یوسف آیت ۹۳ میرا یہ کرتا لے جاؤ (ترجمہ مولوی احمد رضا) اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کرتا بھائیوں کو دیا تھا، وہ ان کا اپنا تھا، مگر مفتی صاحب قرآن کے اس بیان پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قمیص تھی، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

علاوہ ازیں مفسرین نے یہ بات بیان کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وحی کی تھی کہ قمیص ڈالنے سے ان کی بصارت لوٹ آئے گی،

خازن ص ۳۱۴ ج ۳، وجوہ القرآن ص ۵۳۸ ج ۲۔

سوال یہ ہے کہ کیا مبتدعین پر بھی الفی لکھنے کی وحی نازل ہوئی ہے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں، تو پھر ہم حکم الہی اور آپ کی ایجاد و اختراع کو ایک کیسے سمجھ لیں۔

مفتی صاحب کی دسری دلیل

مشکوٰۃ باب غسل میت میں ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ہم زینب بنت رسول اللہ ﷺ کو غسل دیکر فارغ ہوئے تو نبی کریم علیہ السلام کو خبر دی، ہم کو حضور علیہ السلام نے اپنا تہبند شریف دیا اور فرمایا کہ تم کفن کے اندر جسم میت سے متصل رکھ دو۔

اس کے تحت فلاں نے یہ لکھا فلاں نے یہ تحریر کیا ہے وغیرہ۔ جاء الباطل ص ۳۳۶ ج ۱۔

کیا حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے کفن میں کوئی علیحدہ کفنی
والفی رکھی گئی تھی؟

الجواب۔ اولاً۔ حدیث کے الفاظ (اشعرنھا ایاہ) بخاری ص ۱۶۷ ج ۱، و مسلم ص ۳۰۴ ج ۱، ہمارے پیش نظر ہیں، اور لفظ شعار کا معنی ہوتا ہے، وہ کپڑا جو بدن سے لگا ہوا ہو، اس لغوی معنی کو ملحوظ رکھ کر ہم بنیان کو شعار تو کہہ سکتے ہیں جب کہ اوپر پہنی ہوئی قمیض کو ہم، شعار، نہیں بلکہ دثار کہیں گے، شارحین حدیث نے اس کا حسب ذیل معنی کیا ہے، علامہ نووی فرماتے ہیں۔

وهو الثوب الذي يلي الجسد سمي شعارا لانه يلي شعر الجسد.

یعنی شعار، اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم سے ملا ہوا ہو، اور اس کا نام شعار اس لئے بولا جاتا ہے کہ یہ جسم انسانی کے بالوں سے ملا ہوتا ہے۔

شرح صحیح مسلم ص ۳۰۴ ج ۱۔

ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں کہ۔

والشعار الثوب الذي يلي الجسد لانه يلي شعره قال الطيبي اى اجعلن هذا
الحقو تحت الاكفان بحيث يلاصق بشرتها.

یعنی شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو انسانی جسم سے ملا ہوا ہو کیونکہ یہ میت کے شعر (بالوں) سے ملا ہوتا ہے، علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ (نبی ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ) اس تہبند کو کفن کے دوسرے کپڑوں کے نیچے پہنانا کہ یہ اس کی ظاہری جلد کے ساتھ ملا ہوا ہو، مرقاة شرح مشکوٰۃ ص ۳۳ ج ۳۔

علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ

اجعلنه يلي جسد هاقبل سائر اكفانها.

یعنی کفن کے دیگر کپڑوں سے قبل اسے جسم کے ساتھ ملا کر پہنانا۔

التمهيد لمافی الموطا من المعانی والا سانید ص ۷۹ ج ۱۔

علامہ ابن منظور افریقی پہلے اس کا معنی بتاتے ہیں کہ شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اوپر والے (دثار) کے نیچے انسان نے پہن رکھا ہو، پھر بعدہ اسی حدیث کا معنی بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں، الذی یلی جسدها، لسان العرب ص ۴۱۳ ج ۴۔

یہی معنی علامہ محمد مرتضیٰ الحسینی حنفی نے، تاج العروس ص ۳۰۳ ج ۳، میں اور، علامہ فیومی نے، المصباح المنیر ص ۳۱۵۔ میں کیا ہے،

شارحین حدیث اور ائمہ لغت کی ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنا تہبند کفن پہنانے کیلئے عطا فرمایا تھا اور برکت کیلئے یہ حکم فرمایا کہ اسے سب سے پہلے پہنانا۔ چنانچہ مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ، اس روایت کا حسب ذیل ترجمہ کرتے ہیں۔

آپ نے ہماری طرف چادر پھینکی اور فرمایا اسکو سب کپڑوں کے نیچے پہنانا۔ شرح صحیح مسلم ص ۵۶ ج ۱، رقم ۲۰۶۳۔

مجدد بریلویت مولوی احمد رضا خاں بھی اس سے یہی سمجھا ہے کہ تہبند شریف کفن پہنانے کیلئے عنایت فرمایا تھا، ان کے الفاظ ہیں

حضور پر نور صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ نے اپنی صاحبزادی حضرت زینب یا حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے کفن میں اپنا تہبند اقدس عطا کیا، فتاویٰ رضویہ ص ۱۳۰ ج ۴۔ خاں صاحب کی اس عبارت سے بھی ثابت ہوا کہ تہبند کفن کیلئے عنایت فرمایا تھا۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آگئی کہ تہبند کو کفن کے اندر ہی محض نہیں رکھا گیا تھا بلکہ اس چادر مبارک کو کفن کا ایک جزو بنایا گیا تھا، مگر مفتی احمد یار خاں نہایت دیدہ دلیری سے متن حدیث میں معنوی تحریف کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ

تم کفن کے اندر جسم میت سے متصل رکھ دو۔ جاء الباطل ص ۳۳۶ ج ۱،

اس تحریف کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ کفنی والفی کفن کا جزو وحصہ نہیں ہوتی بلکہ کفن سے زائد کسی کپڑے وغیرہ پر لکھ کر کفن میں رکھی جاتی ہے جیسا کہ مفتی صاحب تحریر کرتے ہیں جو شخص اس دعا کو لکھے اور میت کے سینے اور کفن کے درمیان کسی کاغذ میں لکھ کر رکھے تو اس کو

عذاب قبر نہ ہوگا اور نہ منکر و نکیر کو دیکھے گا،

جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱۔

جب کہ روایت مذکورہ میں کفن کیلئے تہبند عنایت کرنے کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ کفن سے الفی کا ثبوت نہ بنتا تھا، مفتی صاحب نے دلیل کے سقم کو دور کرنے کیلئے معنی حدیث ہی بدل دیا ہے۔
ثانیاً۔ اس ہیرا پھیری کے باوجود مفتی صاحب کی کفنی و الفی ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ تہبند میں کوئی تحریر نہ لکھی گئی تھی۔

ثالثاً۔ تہبند تو آنحضرت ﷺ کے آثار میں سے ہے، تو کیا کفنی و الفی بھی حضور علیہ السلام کے آثار سے ہے؟ قطعاً نہیں تو پھر یہ مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی۔

رابعاً۔ مفتی صاحب کا نبی کریم ﷺ کے آثار پر اولیاء کرام اور بزرگان دین کے آثار کو قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ نبی اور امتی قطعاً برابر نہیں، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو خیر القرون میں علوم نبویہ کی امین جماعت تھی اپنے مرنے والوں کو اپنے آثار کے ساتھ دفن کرتی، مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا، اور مبتدعین ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود کسی صحابی و تابعی سے اس کا ثبوت نہیں دے سکتے کہ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کی موت پر اپنے آثار کو ان کے ساتھ برکت کیلئے دفن کیا ہو، دیدہ باید۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

مشکوٰۃ باب غسل لمیت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام عبد اللہ بن ابی کی قبر پر تشریف لائے جب کہ وہ قبر میں رکھا جا چکا تھا، اس کو نکلوایا، اس پر اپنا لعب دہن ڈالا اور اپنی قمیض مبارک اس کو پہنائی۔

جاء الباطل ص ۳۳۷ ج ۱۔

کیا منافقین کے لیڈر کے کفن میں حضور ﷺ نے کفنی و الفی رکھی تھی؟

الجواب۔ اولاً۔ اس روایت میں بھی قمیض میں کفن دینے کا ذکر ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جب عبد اللہ بن ابی مر گیا تو

جاء ابنه عبد الله بن عبد الله الى رسول الله ﷺ فاعطاه، قميصه وامره ان يكفنه فيه، الحديث.

یعنی اس کا بیٹا عبد اللہ رضی اللہ عنہ (جو کہ ایک بچے مسلمان تھے) رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ علیہ السلام نے اسے اپنی قمیض عنایت فرمائی اور حکم دیا کہ اس قمیض میں اسے کفن دیا جائے۔ صحیح بخاری ص ۶۷۷ ج ۲۔

بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ اس کے بیٹے نے کفن کیلئے قمیض مانگی تھی جس پر آپ علیہ السلام نے یہ قمیض عنایت فرمائی تھی،

و بخاری ص ۱۶۹ ج ۱، مسلم ص ۳۶۸ ج ۲۔

الغرض اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کی قمیض میں کفن دینے کا بیان ہے نہ کہ کفنی والفی لکھنے کا ذکر، مگر مفتی صاحب کفن سے الفی وغیرہ ثابت کرنے کے درپہ ہیں، یہ ہیں فقہ کے ٹھیکے دار۔

ثانیاً۔ کیا قمیض پر آنحضرت ﷺ نے کوئی تحریر لکھوا کر دی تھی؟ نہیں، تو پھر آپ حضرات کی کفنی والفی کیسے ثابت ہو گئی۔

ثالثاً۔ حدیث میں تو یہ الفاظ بھی ہیں کہ

فنفت فی من ریقہ، اس پر اپنا لعاب مبارک (بھی) ڈالا۔

بخاری ص ۱۶۹ ج ۱، و، مسلم ص ۳۶۸ ج ۲۔

ظاہر ہے کہ جس مقصد کیلئے آپ نے قمیض عنایت فرمائی تھی اسی نیت سے دہن اقدس کا لعاب بھی ڈالا تھا، تو کیا مبتدعین اپنے مرنے والوں پر تھوک اور رال بھی برکت کیلئے ڈالتے ہیں؟ اگر نہیں ڈالتے یقیناً نہیں ڈالتے تو وجہ فرق بیان کریں۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

بخاری کتاب الجنائز باب من اعد الکفن، میں ہے کہ ایک دن حضور علیہ السلام تہبند شریف پہنے ہوئے باہر تشریف لائے کسی نے وہ تہبند شریف حضور علیہ السلام سے مانگ لیا، صحابہ کرام نے اس سے کہا کہ حضور علیہ السلام کو اس تہبند کی ضرورت تھی اور سائل کو رد کرنا عادت کریمہ نہیں، تم نے

کیوں مانگ لیا انہوں نے کہا کہ

والله ما سئلته لالبسها انما سئلته لتكون كفني قال سهل فكانت كفنه.

اللہ کی قسم میں نے پہننے کیلئے نہیں لیا میں نے تو اس لئے لیا ہے کہ یہ میرا کفن ہو، سہل فرماتے ہیں کہ وہی اس کا کفن ہوا۔ جاء الباطل ص ۳۳۷ ج ۱۔

کیا زندگی میں کفن تیار کرنے سے کفنی والفی ثابت ہوتی ہے؟

جواب اولاً۔ اس عنوان کا باب بخاری میں قطعاً نہیں یہ مفتی صاحب کا وہم اور، رسائل سے کتاب تحریر کرنے کا نتیجہ ہے، ہاں یہ روایت بخاری ص ۷۰ ج ۱ میں باب من استعد الکفن فی زمن النبی ﷺ، فلم ینکر علیہ کے تحت موجود ہے۔

ثانیاً۔ مگر اس روایت کو کفنی والفی سے کیا تعلق، بالخصوص جب خود مفتی صاحب اس کا یہ معنی کرتے ہیں کہ میں نے اس لئے لیا ہے کہ یہ میرا کفن ہو۔ الخ ظاہر ہے کہ کفن پہنانا ایک مسنون عمل ہے اس سے کفنی والفی کی بدعت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ کفن میں شمار نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق بدعت سے ہے جو مسنون کفن و دفن میں ایک زائد چیز ہے، افسوس کہ مفتی صاحب کا دعویٰ کچھ اور دلیل کچھ اور دیتے ہیں اور دعوے و دلیل کی موافقت کے بغیر احادیث نقل کرتے جانا اور عوام الناس کو مغالطہ دینا مبتدعین کے باتیں ہاتھ کا کرتب ہے، پھر مزید یہ کہ اس گھناؤنے جرم پر شرم و حیاء کی بجائے یہ لوگ مرتکب کو حکیم الامت وغیرہ القاب سے نوازتے ہیں۔

ثالثاً۔ کیا نبی ﷺ نے تہبند پر عہد نامہ اور شجرہ لکھوا کر دیا تھا، نہیں ہرگز نہیں، تو پھر اس سے کفنی والفی کس طرح ثابت ہوئی۔

الغرض بحث نزاع مسئلہ تو کفنی وغیرہ کا ہے جس کی دلیل صحیح مفتی صاحب ابھی تک ادھار کھائے بیٹھے ہیں، اور ادھر ادھر کی غیر متعلقہ احادیث کو نقل کر کے مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے الجھائے بیٹھے ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ مفتی صاحب یہ تو کہتے ہیں کہ

میت کے لئے کفن وغیرہ پر ضرور عہد نامہ لکھا جائے، جاء الباطل ص ۳۴۱ ج ۱۔

مگر اس کی دلیل دینے کی بجائے، کفن کے دلائل نقل کرتے ہیں، اے جی کفن سے کس نے

انکار کیا ہے اور کون آثار نبوی علیہ الخیۃ والسلام کی برکت کا منکر ہے کہ آپ ان کے دلائل نقل کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

ابونعیم نے معرفۃ الصحابہ میں اور دیلمی نے مسند الفردوس میں بسند حسن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ سیدنا علی کی والدہ ماجدہ فاطمہ بنت اسد کو حضور علیہ السلام نے اپنی قمیض میں کفن دیا اور کچھ دیر ان کی قبر میں خود لیٹے، پھر ان کو دفن کیا، لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا انی البستھا لتلبس من ثباب الجنة واضطجعت معها فی قبرھا لا خفف عنها ضغطہ القبر۔

قمیض تو اس لئے پہنائی کہ ان کو جنت کا لباس ملے اور ان کی قبر میں آرام اسلئے فرمایا کہ ان سے تنگی قبر دور ہو، جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱۔

کیا رسول اللہ ﷺ والدہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ قبر میں لیٹے تھے؟

الجواب۔ اولاً۔ مسند فردوس الاخبار، للحافظ شیروہ بن شہر دار بن شہیر وہ الدیلمی، طبع دار الکتب العربی بیروت ۱۹۸۷ء کو راقم نے گہری نظر سے دیکھا ہے، اس کی پانچوں جلدوں کے ایک ایک صفحہ کو بغور پڑھا ہے مگر اس میں یہ روایت راقم کو نہیں ملی، ہاں البتہ ہمیں یہ روایت امام طبرانی کی، المعجم الاوسط ص ۴۷۲ ج ۷ (۶۹۳۱) سے ملی ہے اور علامہ علی متقی نے کنز العمال ۳۴۴۱۹ ۳۷۶۰۷، میں دیلمی کے حوالے سے بیان کیا ہے، لیکن سند ذکر نہیں کی البتہ حسن قرار دیا ہے، لیکن یہ بات غلط ہے کیونکہ سند میں ایک راوی سعدان بن ولید صاحب السابری، ہے امام طبرانی نے اسے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسے بیان کرنے میں سعدان بن ولید منفرد ہے، (ص ۴۷۲ ج ۷) علامہ ڈھمی نے بھی سعدان کی سند کی طرف اشارہ کر کے لکھا ہے، هذا غریب، یعنی سنداً یہ روایت غریب ہے، سیر اعلام النبلاء ص ۱۰۸ ج ۲، اس سے ثابت ہوا

کہ اس روایت کا دارود اسعدان بن ولید السابری پر ہے، اور یہ مجھول الحال ہے، راقم نے رجال کی تقریباً تمام متداول کتب کو دیکھا ہے کسی محدث نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

لہذا مولوی احمد رضا خاں کا اس کی سند کو حسن کہنا (فتاویٰ رضویہ ص ۱۳۰ ج ۴) اور مفتی صاحب کا ان کی تقلید میں بسند حسن لکھنا غلط بیانی ہے۔

کیونکہ مجھول راوی کی وجہ سے یہ روایت درجہ صحت سے گر گئی ہے، مگر مبتدعین کا اصول ہی نرا لا ہے کہ مجھول شخص کی روایت کو حسن کہہ رہے ہیں، حالانکہ علامہ بیہمی نے اسے، معجم الاوسط، سے نقل کر کے لکھا ہے

و فیہ سعدان بن الولید ولم اعرفہ.

یعنی اس کی سند میں سعدان ہے جسے میں نہیں جانتا۔

(مجمع الزوائد ص ۲۶۰ ج ۹)۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے الفاظ روایت بھی درست درج نہیں کئے، اصل الفاظ یوں ہیں

البستھا قمیصی لتلبس من ثیاب الجنة، الخ طبرانی الاوسط ص ۴۷۳ ج ۷، و

مجمع الزوائد ص ۲۶۰ ج ۹، و فتاویٰ رضویہ ص ۱۳۰ ج ۴.

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے متن روایت کا معنی بھی غلط کیا ہے، اور ان کی قبر میں آرام، اسلئے فرمایا کہ ان سے تنگی قبر دور ہو۔ جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱۔

حالانکہ روایت کے الفاظ اس طرح ہیں

واضطجعت معها فی قبرھا لیخفف عنها من ضغطة القبر.

یعنی میں اس کے ساتھ اس کی قبر میں اس لئے لیٹا کہ اس کی قبر کی تنگی اس پر ہلکی ہو۔ المعجم الاوسط ص ۴۷۳ ج ۷۔

یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ یہ عظمت مصطفیٰ ﷺ کے خلاف ہے کہ آنحضرت ﷺ کسی غیر محرمہ کی قبر میں اس کے ساتھ لیٹے۔ رب محمد ﷺ کی قسم ہے یہ آپ پر افترا ہے، مسلمانو! آپ کے پیرومرشد رحمت للعالمین امام الانبیاء سید دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے تو عورتوں سے بیعت لیتے وقت بھی ان سے مصافحہ نہیں کیا۔ موطا امام مالک باب

اجاء فی البیعة، عن امیمة رضی اللہ عنہا بنت رقیقہ۔

اگر مبتدعین کو ہماری اس بات سے اختلاف ہے تو کیا وہ اس پر عمل کرنے کیلئے تیار ہیں کہ جب کوئی غیر محرّمہ خاتون فوت ہو تو یہ کسی پیر بزرگ اور اپنے مولوی صاحب کو قبر میں اس خاتون کے ساتھ تبرک حاصل کرنے کی نیت سے لٹائیں؟ اگر نہیں یقیناً نہیں! تو یہ بات ہم اپنے پیر و مرشد امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں کیسے مان لیں جو تمام دنیا سے زیادہ پاکیزہ اور عظمت والے ہیں، الغرض یہ روایت عظمت مصطفیٰ کے منافی ہونے کی وجہ سے سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

رابعا۔ لفظی ومعنوی تحریف کے باوجود یہ روایت مبتدعین کی قطعاً دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ اس میں کفنی والفی لکھنے کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں۔

ملحوظہ

مجمع الزوائد، میں کتابت کی غلطی سے متن روایت کے الفاظ ہیں کہ، لما ماتت فاطمة بنت علی بن ابی طالب، ص ۲۶۰ ج ۹۔

غلطی کی دلیل یہ ہے کہ علامہ ہیثمی نے اسے طبرانی اوسط سے نقل کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں کہ، لما ماتت فاطمة ام علی بن ابی طالب، ص ۴۷۳ ج ۷، الغرض کتابت کی غلطی سے لفظ، ام، بنت، میں بدل گیا ہے، اس پر دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی بیٹی فاطمہؓ کی وفات ۱۱ھ میں ہوئی تھی، تھذیب ص ۴۴۳ ج ۱۲۔

ظاہر ہے کہ ان کی تو پیدائش اور وفات ہی آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی تھی، لہذا ان کے جنازہ میں شرکت اور تہبند عنایت کرنے کے کیا معنی۔

دیگر روایات

حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا کو آنحضرت ﷺ کا تہبند عنایت کرنے اور ان کی قبر میں ساتھ لیٹنے کی روایت متعدد طرق سے مروی ہے، جو کہ تمام مجروح اور ناقابل اعتبار ہیں، جن کی ضروری تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) یہ روایت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مستدرک حاکم، ص ۱۰۸ ج ۳، میں آتی ہے مگر یہ سند نہایت درجہ کی کمزور ہے کیونکہ سند میں عبدالرحمن بن عمرو بن جبلة راوی ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں

قال ابو حاتم كان يكذب، فضربت على حديثه، وقال الدارقطني، متروك يضع الحديث.

یعنی امام ابو حاتم کہتے ہیں کہ جھوٹ بولتا تھا، میں نے اس کی روایات پر نشان لگادیا ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ متروک اور احادیث وضع کرتا تھا۔

میزان الاعتدال ص ۵۸۰ ج ۲۔

اس کے علاوہ بھی اس سند میں خامیاں ہیں جنہیں ہم سرے دست نظر انداز کرتے ہیں الغرض یہ روایت عبدالرحمن کی وجہ سے قریب الموضوع ہے۔

(۲) دوسری روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آتی ہے، جس کی سند میں ایک راوی، روح بن صلاح، ہے۔ طبرانی الاوسط ص ۱۵۲ ج ۱، ومجمع الزوائد ص ۲۶۰ ج ۹، وحلیۃ الاولیاء ص ۱۲۱ ج ۳۔

امام طبرانی اور ابو نعیم نے صراحت کی ہے کہ، روح بن صلاح، اسے بیان کرنے میں منفرد ہے، علامہ البانی فرماتے ہیں کہ روح کو ابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے، ابن یونس کہتے ہیں کہ اس سے مناکیر مروی ہیں امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف فی الحدیث ہے ابن ماکولا فرماتے ہیں کہ محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، ابن عدی نے اس کی دو حدیثیں ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی بہت سی احادیث ہیں جن میں سے بعض میں نکارت ہے، گویا محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ ضعیف ہے اس کی یہ حدیث اسکے تفرد کے باعث منکر ہے۔ التوسل انواعه واحکامه، مترجم ص ۱۳۳، وسلسلہ احادیث الضعیفہ ص ۳۲ ج ۱۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت کی ایک سند شیرازی نے، الالقاب، میں بیان کی ہے جس میں ایک راوی احمد بن محمد بن عمرو بن مصعب ہے، کنز العمال (۳۷۶۰۵) ص ۲۷۳ ج ۱۳۔

اس کے متعلق علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ

امام ابن حبان کا کہنا ہے کہ متن روایت کو گھڑ لیا کرتا تھا اور سند کو الٹ پلٹ دیتا تھا جس کی وجہ سے ترک مستحق قرار پایا، امام دارقطنی کا فیصلہ ہے کہ احادیث کو وضع کرتا تھا، میزان الاعتدال ص ۱۴۹ ج ۱۔

علاوہ ازیں اس کی سند و متن میں کئی اور بھی علٹیں ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، روایت کے ضعف کے لئے یہی کافی ہے کہ سند میں ایک کذاب راوی ہے، لہذا طول کلام سے اعراض کرتے ہوئے، اسی پر اکتفا کرتے ہیں، ہاں اگر ضرورت پڑی اور ہم مجبور کر دیئے گئے تو ان کی تفصیل ہم بحوالہ عرض کر دیں گے۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

حاکم نے مستدرک میں حمید ابن عبدالرحمن روای سے نقل کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ مشک تھا، وصیت فرمائی مجھ کو اس سے خوشبو دینا اور فرمایا کہ یہ حضور علیہ السلام کی خوشبو کا بچا ہوا ہے۔ جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱۔

کیا کفن کی خوشبو سے کفنی والفی ثابت ہوتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے حمید بن عبدالرحمن روای نہیں بلکہ ابی وائل (شقیق بن بکیر کوفی) ہیں، السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۳۰۵ ج ۳، و مستدرک حاکم ص ۳۶۱ ج ۱۔

مفتی صاحب نے مولوی احمد رضا خاں صاحب کی تالیف، الحرف الحسن فی الکتابۃ علی الکفن، سے اپنی کم علمی کی وجہ سے مغالطہ کھایا ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خاں صاحب بریلی نے لکھا تھا کہ حاکم نے مستدرک میں بطریق حمید بن عبدالرحمن روای سے روایت کی قال حدثنا الحسن بن صالح عن ہارون بن سعید عن ابی وائل، فتاویٰ رضویہ ص ۱۳۱ ج ۴۔

ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ خاں صاحب کا مقصود یہ ہے کہ حمید بن عبدالرحمن کے طریق سے یہ روایت مروی ہے، پھر بعدہ انہوں نے حمید سے آگے سند بھی لکھ دی، مگر ہمارے مفتی صاحب کو فن حدیث کی ہوا بھی نہ لگی تھی، اس لئے انہوں نے اس تحریر کا یہ مفہوم بیان کر دیا کہ حاکم نے

مستدرک میں حمید بن عبد الرحمن روای سے نقل کیا، جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱، ان للہ وانا الیہ راجعون۔
اسے کہتے ہیں، لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔

اگر مبتدعین کہہ دیں کہ مفتی صاحب کی تحریر کا مقصد یہ ہے کہ حاکم نے حمید سے روایت لی ہے تو یہ اس سے بھی بڑھکر جہالت ہے کیونکہ امام حاکم نے یہ روایت اپنے استاذ ابو بکر بن اسحاق سے لی ہے، مستدرک حاکم ص ۳۶۱ ج ۱۔

ثانیاً۔ بلاشبہ سنداً یہ روایت حسن درجہ سے کم نہیں، اسی طرح حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنی قبر میں آنحضرت ﷺ کے ناخن و بال رکھنے بھی اگر صحیح سند سے ثابت ہوں تو انکو ماننے میں ہمیں ذرا بھی تاہل نہیں کیونکہ یہ چیزیں آثار نبوی کی وجہ سے بابرکت تھیں اور ان سے تبرک حاصل کرنے کے ہم قطعاً منکر نہیں، مگر ان سے کفنی والفی کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے آثار (بالخصوص جسم اطہر کے ناخن وغیرہ) کوئی تحریر یا کلمہ کی املا نہ تھے جس سے کفنی والفی کی تحریر ثابت کی جائے۔

ثالثاً۔ میت کو غسل دینے کے بعد کفن و میت کو خوشبو لگانا سنت سے ثابت ہے، اور آنحضرت ﷺ کی بچی ہوئی خوشبو کو لگانے کی وصیت سے کوئی زائد چیز ثابت نہیں ہوتی بلکہ مسنون کفن و دفن ہی ثابت ہوتا ہے، جو بدعت کو مستلذ نہیں۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

امام ترمذی حکیم ابن علی نوادر الاصول میں روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا

من کتب هذا لدعاء و جعله بین صدر المیت و کفنه فی رقعة لم ینلہ عذاب القبر ولا یری منکرا و نکیرا۔

جو شخص اس دعا کو لکھے اور میت کے سینے اور کفن کے درمیان کسی کاغذ میں لکھ کر رکھے تو اس کو عذاب قبر نہ ہوگا اور نہ منکر و نکیر کو دیکھے گا۔ وہ دعا یہ ہے

لا الہ الا اللہ واللہ اکبر لا الہ الا اللہ وحده لا شریک له، لا الہ الا اللہ له الملك وله الحمد، لا الہ الا اللہ ولا حول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم۔ جاء الباطل

ص ۳۳۸ و ۳۳۹

الجواب

اولاً۔ یہ رسول اللہ ﷺ پر صریحاً افتراء ہے، کیونکہ یہ روایت فقط حکیم ترمذی کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے، دیگر کتب حدیث میں اس کا نام و نشان تک موجود نہیں، اور حکیم ترمذی کی تالیف نوادر الاصول، میں فقط متون ہیں، اسناد قطعاً نہیں، راقم الحروف نے متعدد کتب خانوں، سے حکیم ترمذی کی کتاب کو تلاش کیا ہے مگر کہیں بھی اس کا وجود راقم کو نہیں ملا، آخر پریشان ہو کر حضرت مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کو لیٹر لکھا جس کے جواب میں انہوں نے حسب ذیل خط تحریر کیا۔

محترم مولانا داؤد ارشد صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

یاد فرمائی کا شکریہ، آئینہ میں ہونے والی فردگزاشت کے سلسلے میں وضاحت پر مزید شکر گزار ہوں۔

نوادر الاصول، ادارہ میں بھی نہیں، اشاعت العلوم، ایک دیوبندی مدرسہ میں اس کا نسخہ ہے مگر اس میں کسی حدیث یا قول کی سند نہیں، غالباً بعد کے کسی ناشر نے اسانید حذف کر دیں ہیں افسوس آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا.....

والسلام

دعا جو

ارشاد الحق اثری عفی اللہ عنہ

(۳۴ / اکتوبر ۱۹۹۷ء)

اس کے بعد راقم اپنے فاضل بھائی جناب محمد منشاء صاحب کو جب، راولپنڈی، میں کتاب کا مسودہ کمپوزنگ کیلئے دینے گیا، تو ان سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ یہاں ایک اہلحدیث عالم جناب محترم دکتور صدیق الحسن حفظہ اللہ کی علم حدیث پر بہترین لائبریری ہے ان سے پتہ کر لیتے ہیں، بہر حال ان کی لائبریری میں کتاب، نوادر الاصول مل گئی، مگر ہم نے گہری نظر سے دیکھا، لیکن مذکورہ روایت نہ مل سکی، الغرض یہ کذب و افتراء ہے۔

ثانیاً۔ نوادر الاصول کے مؤلف کی کسی محدث نے توثیق نہیں کی، بلکہ یہ شخص گستاخ مقام نبوت تھا، کیونکہ اس کے نزدیک ولایت نبوت سے بڑھ کر تھی، علامہ ڈھمی عبدالرحمن سلمیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ

اخرجوا الحکیم من ترمز، و شهدوا علیہ بالکفر و ذلک بسبب تصنیفہ کتاب ختم الولاية، و کتاب علل الشریعة، و قالوا انه یقول، ان للاولیاء خاتم کالانبیاء لهم خاتم و انه یفضل الولاية علی النبوة۔

یعنی حکیم ترمزی کو ترمز سے نکال دیا گیا تھا اور علماء نے اس کے کفر کی گواہی دی تھی، ختم الولاية، اور، علل الشریعة، کی تصنیف کی وجہ سے اور علماء نے کہا تھا کہ یہ کہتا ہے کہ جیسے انبیاء کرام کو ختم کرنے والے (محمد مصطفیٰ ﷺ) ہیں اسی طرح اولیاء کو بھی ختم کرنے والا (ایک ولی) ہے اور وہ ولایت کو نبوت پر تفضیل دیتا تھا۔ سیر اعلام النبلاء ۱۳/۴۴۱ (رقم الترجمہ ۲۱۶)

حافظ ابن حجر نے بھی، لسان المیزان ص ۳۰۸ ج ۵، میں اسے نقل کیا ہے بلکہ قاضی کمال الدین نے تاریخ حلب (المسک فی الرد علی ابی طلحہ) میں لکھا ہے کہ یہ محدثین سے نہ تھا اور بُرے عقائد کی وجہ سے فقہاء کے دائرہ سے نکل کر مستحق طعن ہو گیا، بحوالہ لسان المیزان ۵/۳۰۹۔ شیخ الصوفیاء فرید الدین عطار لکھتے ہیں کہ فرمایا (حکیم ترمذی نے) مجذوب کے بھی کئی مدارج ہیں پہلے درجہ میں تہائی نبوت حاصل ہوتی ہے، دوسرے میں نصف اور تیسرے میں نصف سے کچھ زیادہ اور جب وہ مدارج نبوت طے کر کے تمام مجذوبین پر سبقت لے جاتا ہے تو خاتم الاولیاء ہو جاتا ہے، تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۱ مترجم، اس سے ثابت ہوا کہ حکیم ترمذی بدترین بدعتی تھا، جس کی جیب میں سو ۱۰۰ مرزا غلام احمد قادیانی تھا، جیسے اس نے اپنے منکرین پر کفر کا فتویٰ لگایا، تذکرہ (یعنی مجموعہ الھامات مرزا) ص ۳۳۶ و ۶۰۷، اسی طرح حکیم ترمذی کہتا ہے کہ زاہدین اور علماء کا منکر قطعاً کافر ہے،

تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۱۔

دیکھئے حکیم ترمذی فتویٰ تکفیر کی آڑ میں عابدین اور مولویوں پر بھی ایمان لانے کو جزو ایمان کہہ رہا ہے، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

الغرض اس کتاب کا مؤلف ہی ایسا بدعتی ہے جس کے عقائد کفریہ ہیں لہذا اس کی بیان کردہ روایت کسی طرح بھی حجت نہیں، جتنی دیر تک اصول حدیث کے مطابق اس کی صحت ثابت نہ کی

جائے، دور حاضر کے محدث عظیم جناب علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے باطل و موضوع قرار دیا ہے۔ سلسلہ ضعیفہ ۱/۴۱۷۔

کفنی کے ثبوت پر عقلی دلائل اور ان کا رد

پہلی عقلی دلیل

عقل بھی چاہتی ہے کہ یہ عہد نامہ وغیرہ لکھنا یا قبر میں رکھنا جائز ہو چند وجوہ سے، اولاً۔ تو یہ کہ جب قبر کے اوپر سبز گھاس و پھول کی تسبیح سے میت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو قبر کے اندر جو تسبیح وغیرہ لکھی ہوئی ہو اس سے فائدہ کیوں نہ پہنچے گا۔ جاء الباطل ص ۳۴۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس کی شرعی دلیل کہ قبر پر گھاس و پھول کی تسبیح سے عذاب قبر میں تخفیف ہو کر میت کو فائدہ پہنچتا ہے؟ تو وہ نادار، یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، الغرض یہ مفتی صاحب کا شریعت حقہ پر افترا ہے،

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا تسبیح و تحمید پر کفنی والفی کو قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ تسبیح و تقدیس لسانی ذکر ہے جبکہ کفنی والفی تحریر ہے جو کہ انسان کے ہاتھ کا فعل ہے، ظاہر ہے کہ عبادت اور املا ایک نہیں ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص نماز کی ترتیب کو ہاتھ سے لکھتا ہے، تو اس سے اس کی نماز ادا نہ ہوگی اور فریضہ اس کے ذمہ رہے گا، جب آپ نے اس فرق کو سمجھ لیا، تو اب غور کیجئے کہ مفتی صاحب کس کماش کے مفتی تھے کہ پہلے تو بلا دلیل یہ لکھا کہ گھاس و پھول کی تسبیح سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے، پھر اس پر کفنی والفی کو قیاس کر لیا، یہ ہیں فقہ کے ٹھیکے دار۔

دوسری عقلی دلیل

اس لئے کہ قبر کے باہر سے میت کو تلقین کرنا حکم ہے کہ اللہ کا نام اس کے کان میں پہنچ جائے تاکہ اس امتحان میں کامیاب ہو تو وہ ہی اللہ کا نام لکھا ہوا دیکھ کر بھی مردے کو جواب نکیر یاد آنے کی امید ہے یہ بھی ایک قسم کی تلقین ہے۔

جاء الباطل ص ۳۴۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قبر کے باہر سے میت کو تلقین کرنے کا حکم کہاں لکھا ہے، اس کا ثبوت درکار ہے جو مبتدعین صبح ازل تک نہیں دے سکتے۔

باقی رہی حدیث، بقنوا موتکم، تو اس کا تفصیل کے ساتھ جواب پہلے عرض کر دیا گیا کہ فرمان نبوی کا منشا مرگ الموت میں مبتلا کو تلقین کرنے کا ہے۔

ثانیاً۔ یہ بھی غلط ہے کہ فقط اللہ تعالیٰ کا نام کان میں پڑنے سے مدفون امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نام تو منکر و نکر بھی لیتے ہیں، جب وہ سوال کرتے ہیں، تیرا رب اور رسول کون ہیں، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا نام فقط کان میں پڑنے سے کامیابی قطعاً نہیں۔

تیسری عقلی دلیل

تیسرے اس لئے کہ اللہ والوں کے نام کی برکت سے مصیبت ٹلتی ہے، جلی ہوئی آگ بجھتی ہے، گھبرایا ہوا دل قرار پاتا ہے، رب فرماتا ہے، الابد کرا اللہ تطمنن القلوب، اللہ کے ذکر سے دل چین میں آتے ہیں، تفسیر نیشاپوری و روح البیان، سورة کہف زیر آیت ما یعلم الاقلیل، اور تفسیر صادی شریف میں اسی آیت کے ماتحت ہے کہ اصحاب کہف کے نام اتنے جگہ کام آتے ہیں، (آگے مفتی صاحب نے ان ۱۳ مقامات کی نشان دہی مولوی احمد رضا خاں کی تالیف، الحرف الحسن، کے حوالے سے کی ہے) محدثین کبھی اسناد صحیح نقل کر کے فرمادیتے ہیں، لوقر، ت هذا الاسناد علی معجون لبرء من جنتہ، اگر یہ اسناد کسی دیوانے پر پڑھی جائے تو اس کو آرام ہو جائے، اسناد کیا ہے بزرگان دین راویان حدیث کے نام ہی تو ہیں، اصحاب بدر کے نام کے وظیفے پڑھے جاتے ہیں، تو زندگی میں تو ان بزرگوں کے نام فائدہ مند ہوں، اور بعد موت بیکار ہوں، یہ نہیں ہو سکتا ضرور ان سے فائدہ ہوگا لہذا میت کیلئے کفن وغیرہ پر ضرور عہد نامہ لکھا جائے۔ جاء الباطل ص ۳۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اللہ والوں کے نام کی برکت، اصحاب کہف، سلسلہ اسناد، اور اصحاب بدر کے اسماء کے وظائف کرنے سے حصول برکت کا فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے، مفتی صاحب کی یہ تحریر نہ قرآن ہے اور نہ

ہی حدیث ہے جو فی نفسہ دلیل شرعی ہو، کہ اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے۔

ثانیاً۔ پوری دنیا کے اگلے پچھلے لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ والے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات بابرکات ہے، اور انکا نام نامی اسم گرامی قبر میں منکر نکیر ہر مدفون شخص پر لیتے ہیں جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر گواہ ہیں،

دیکھئے بخاری ص ۱۸۴ ج ۱ و مشکوٰۃ ص ۲۴۔

مگر اس کے باوجود کافر و منافق کہتا ہے، لا ادری کنت اقول مایقول الناس، یعنی میں نہیں جانتا میں تو وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے، بخاری باب ماجاء فی عذاب القبر ص ۱۸۴ ج ۱، اس سے معلوم ہوا کہ کسی بابرکت اور اللہ والے کا نام، مستحق عذاب قبر کو منکر و نکیر سے نہیں بچا سکتا۔

ثالثاً۔ رہی آیت قرآنی، بذکر اللہ، تو اس کا تعلق قبر سے نہیں بلکہ دنیا کی زندگی سے ہے جیسا کہ اس کے ساتھ ہی آگے ارشاد فرمایا

الذین امنوا و عملوا الصلحت طوبیٰ لہم و حسن مآب۔ (الرعد ۲۹)

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے ان کیلئے خوشحالی اور عمدہ ٹھکانا ہے (۱۳-۲۹)۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص ایمان لا کر عمل صالحہ کرتا رہا اور دنیا کی زندگی میں اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تسکین حاصل کرتا رہا ہو، اور اسے ذکر الہی سے چین ملتا ہو، اس کا اخروی ٹھکانا بہتر ہوگا،

مگر مفتی صاحب آیت کا تعلق قبر کے پاس ذکر سے جوڑ رہے ہیں، پھر قابل غور بات تو یہ ہے کہ ذکر اور کفنی میں کیا تعلق ہے۔

رابعاً۔ اصول حدیث کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ محدثین کرام کبھی سند صحیح نقل کر کے کہہ دیتے ہیں کہ اگر مجنون پر بھی پڑھا جائے، تو اسے آرام آجائے گا، یقیناً جانیں کہ پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، ہاں البتہ خاں صاحب بریلی نے، ابن حجر مکی، سے ایک سند نقل کی ہے کہ

عن علی الرضاء حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیہ جعفر الصادق عن ابیہ

محمد الباقر عن ابیہ زین العابدین عن ابیہ الحسین عن ابیہ علی الخ۔

پھر فرماتے ہیں کہ اس سند کے متعلق امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ یہ مبارک سند اگر مجنون

پر پڑھو تو ضرور اسے جنون سے شفا ہو،

فتاویٰ رضویہ ص ۱۳۷ ج ۴۔

دیکھئے مولوی احمد رضا خاں تو خاص امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب کرتا ہے مگر مفتی صاحب علی الاطلاق محدثین کی طرف نسبت کرتے ہیں۔

شم اقول

اس کی امام احمد بن حنبل کی طرف نسبت بھی درست نہیں، کیونکہ یہ کسی معتبر سند سے ان سے ثابت ہی نہیں، علاوہ ازیں یہ سند بھی کوئی اس درجہ کی نہیں جس کے متعلق اتنا بڑا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے، یہ محض اشتہاری حکیموں کی طرح خانہ ساز فوائد ہیں جن کا حقیقت کے ساتھ ذرا بھی تعلق نہیں، اگر علماء بریلویہ ان فوائد پر بضد ہیں تو اس کا آج بھی تجربہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی دیوانے پر اسے پڑھ کر دیکھ لیا جائے کہ وہ انشاء اللہ قطعاً بیماری سے شفا یاب نہ ہوگا، آخر کیا وجہ ہے کہ علماء بریلویہ کے ہاتھ اتنا اکسیر بہدف نسخہ شفا موجود ہے، لیکن ملک میں پھر بھی دیوانے موجود ہیں بلکہ حکومت لاکھوں روپے خرچ کر کے قوم کی فلاح و بہبود کیلئے اس بیماری پر خرچ کر رہی ہے علماء بریلویہ کو دعوت فکر ہے کہ وہ اس رضا خانی نسخہ کو استعمال کر کے میڈل حاصل کریں اور ہزاروں والدین سے ڈھیروں دعائیں وصول کریں، اسکے ساتھ ساتھ آپ کو تردید و ہایت کا بھی ایک عمدہ اور موثر ذریعہ تبلیغ مل جائے گا۔

آخر آپ حضرات خاموش کیوں ہیں، کچھ تو ہے جس کی پردہ دری ہے۔

رابعاً۔ اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کے مقدس اسماء کے وظیفہ کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، مبتدعین پر لازم ہے کہ وہ ثابت کریں کہ اصحاب بدر کے ناموں کا وظیفہ کرنا، قرآن و سنت میں پایا جاتا ہے، مگر یاد رہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہو کر مشرق میں غروب تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کا ثبوت نہیں دیا جاسکتا، یہ سب باتیں خانہ ساز اور مبتدعین کی عیاریاں ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ سے جس قدر وظائف مروی ہیں وہ تمام کے تمام اللہ کی حمد و تعریف، تقدیس و کبریائی وغیرہ پر مبنی ہیں، جس سے ثابت ہوا کہ وظیفہ شرعی دراصل اللہ تعالیٰ کی لسانی عبادت ہے، اور بندوں میں سے کسی کا وظیفہ کرنا حقیقت میں ان کی عبادت کرنا ہے، لہذا ثابت ہوا کہ اصحاب بدر کے ناموں کا وظیفہ کرنا بدترین بدعت ہے۔

باب نماز کے بعد بلند آواز سے دور

شریف پڑھنے کی بحث

کیا بلند آواز سے ذکر کرنا جائز ہے؟

اصل بحث کی طرف جانے سے پہلے چند باتیں عرض کرنا ضروری ہیں تاکہ فریقین کے موقف کو سمجھنے میں آسانی رہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل حدیث کے نزدیک جہاں رسول اللہ ﷺ سے ذکر بلند آواز سے ثابت ہے وہاں اونچی آواز سے ذکر کرنا مسنون ہے اور جہاں آہستہ یا خفی ثابت ہے وہاں اس مسنون طریقہ کو ہی ملحوظ رکھنا عین تعلیم اسلامی کا تقاضا اور راہ ہدایت ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ رحمانی محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

قلت ماذهب إليه بعض السلف و ابن حزم من المتأخرين من استحباب رفع الصوت بالتكبير و الذكر أثر كل صلاة مكتوبة هو القول الراجع عندى وإن لم يقل به الاثمة الأربعة و مقلدوهم لأن حديث ابن عباس باللفظين نص فى ذلك، ويدل على ذلك أيضاً حديث عبدالله بن الزبير الأتى، والحق يدور مع الدليل لامع الادعاء أو الرجال، نعم لايبالغ فى رفع الصوت، ولا يجهر جهرًا مفرطًا لقوله ﷺ اربعوا على أنفسكم فانكم لاتدعون أصم ولا غائبًا، الحديث، ولا دليل لمن حمل حديث ابن عباس على أن الجهر كان أحياناً أو وقتاً يسيراً لأجل تعليم المأمومين صفة الذكر والتكبير..... ولا يثبت شئى بالادعاء والتحکم، والراوى وهو ابن عباس لم يقيد رفع الصوت بوقت دون وقت، بل اطلقه و عممه، وفيه أيضاً لفظة، كان، وهى تشعر بالمواظبة، فدل ذلك على أن اكثر عمل النبى ﷺ و اصحابه قد كان على رفع الصوت بالتكبير، فالحق ان رفع الصوت بذلك اثر كل صلاة مكتوبة حسن كما صرح به ابن حزم فى المحلى.

یعنی میرے نزدیک رائج بات وہ ہے جس کی طرف بعض سلف اور متاخرین میں سے امام ابن

حزم گئے ہیں کہ ہر فرض نماز کے بعد تکبیر کے ذکر کو بلند آواز سے کرنا مستحب ہے، اگرچہ ائمہ اربعہ اور ان کے مقلدین یہ بات نہیں کہتے، لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت دونوں لفظوں سے (بلند پڑھنے) پر نص ہے۔

اور اس پر دلالت کرتی ہے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو آگے آتی ہے اور حق دلائل کے ساتھ گھومتا ہے ناکہ دعوؤں اور شخصیتوں کے ساتھ، ہاں (یہ ملحوظ رہے کہ) بلند آواز مبالغہ سے نہ ہو اور جہر مفطر نہ ہو، کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے، اپنی جانوں پر نرمی کرو کہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں بلا رہے، الحدیث، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو احیاناً اور مقتدیوں کی تعلیم پر محمول کرنے کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ کوئی چیز محض دعویٰ اور تحکم سے ثابت نہیں ہوتی، اور اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں کیا بلکہ انہوں نے اسے عموم پر رکھا، اور اس میں لفظ، کان، بھی آیا ہے اور یہ مواظبت (ہیشگی) پر دلالت کرتا ہے، کہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اکثر و پیشتر عمل (نماز کے بعد) تکبیر کو بلند آواز سے کہنے کا تھا، اس لئے خالص حق بات یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیر کہنا اچھا عمل ہے جیسا کہ ابن حزم نے محلی میں صراحت کی ہے۔

مرعاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ ص ۳۱۵ تا ۳۱۶ ج ۳۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے حضرت مولانا عطاء اللہ حنیفؒ فرماتے ہیں کہ

والحق مع ابن حزم قال الفنجابی ثبت الجهر فی مواضع كثيرة فيجهر فيما يجهر ﷺ و يسر فيما اسرو يخير فيما لم ينقل عنه ﷺ الجهر والسر والا فضل فيه السر نعم لا يجوز الجهر المفطر لماورد انكم لاتدعون اصم، الحديث والله اعلم.

اور حق امام ابن حزم کے ساتھ ہے، امام ابو عبد الرحمنؒ پنجابی المتوفی ۱۳۱۵ھ شارح سنن نسائی نے کہا ہے کہ کثیر مقامات پر نبی ﷺ سے بلند آواز سے ذکر ثابت ہے، لہذا جن مقامات پر آپ سے ذکر جہری ثابت ہے وہاں جہری کیا جائے اور جہاں سری (آہستہ) ثابت ہے وہاں سری کیا

جائے اور جہاں جہری و سری ثابت نہیں وہاں انسان کو اختیار ہے خواہ جہری کرے یا سری کرے، اور افضل سری ہے، ہاں افراط سے جہر جائز نہیں، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ سے یہ حدیث مروی ہے کہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے۔ التعلیقات السلفیہ علی التہذیب ص ۱۵۶ ج ۱۔

حضرت نواب صدیق حسن خاں صاحب محدث قنوجی، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی شرح میں فرماتے ہیں:-

وفیه دلیل لما قاله بعض السلف انه يستحب رفع الصوت بالتكبير والذكر عقب المكتوبة و ممن استحبه من المتأخرین ابن حزم الظاہری رضی اللہ عنہ و نقل ابن بطلال و آخرون ان اصحاب المذاهب المتبوعة و غیرهم متفقون علی عدم استحباب رفع الصوت بالتكبير والذكر و حملہ الشافعی علی انه جہر وقتاً یسیراً حتی یعلمہم صفة الذكر لانہم جہروا دائماً قال فاختر للامام والمأموم ان یخفیان ذلک و هذا الحدیث الصحیح یرد علیہم اجمعین رداً واضحاً ولا ملجی الی التاویل و صرف الظاہر الحقیقی الی المعنی المجازی، واللہ اعلم۔

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے جسے بعض سلف نے کہا ہے کہ فرض نماز کے عقب میں بلند آواز سے تکبیر اور ذکر کرنا مستحب ہے اور متاخرین میں سے جنہوں نے اسے مستحب کہا ہے امام ابن حزم رضی اللہ عنہ ہیں اور ابن بطلال اور دوسروں نے اصحاب مذاہب متبوع وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ وہ بلند آواز سے ذکر و تکبیر کے عدم استحباب پر متفق ہیں، امام شافعیؒ نے جہر کو تھوڑے وقت پر محمول کیا ہے یہاں تک انہیں ذکر کی صفت کا علم ہو جائے، نہ کہ جہری ہمیشہ تھا، مزید فرماتے ہیں کہ امام اور مقتدیوں کیلئے مختار یہ ہے کہ (نماز کے بعد ذکر) مخفی کریں، (نواب صاحب فرماتے ہیں) اور یہ حدیث صحیح ان تمام کا واضح رد کرتی ہے، لہذا تاویل کی ضرورت نہیں اور حقیقی معنی کو معنی مجازی کی طرف پلٹنا درست نہیں،

السراج الوہاج ص ۲۱۲ ج ۱۔

خلاصہ ان عبارات علمائے اہل حدیث کا یہ ہے کہ جن مقامات پر جہر سے ذکر ثابت ہے وہاں ذکر جہری ہی کرنا عین سنت کا تقاضا ہے اور جہاں آنحضرت ﷺ نے اخفا سے ذکر و اذکار فرمایا ہے،

صلی اللہ علیہ وسلم

وہاں اخفا ہی مناسب اور اسوہ رسول کا منشا و مقصود اور راہ ہدایت اور تقاضا اتباع رسول ہے، مثلاً۔
نماز میں التحیات کا سری پڑھنا سنت متواترہ ہے تو اخفا ہی درست ہے، اور جن نمازوں میں قرات کو جہری پڑھنا ثابت ہے اور امام و مقتدی کا آمین جہر سے کہنا سنت سے ثابت ہے وہاں جہر ہی کرنا چاہئے۔

نماز کے بعد آنحضرت ﷺ سے تکبیر و ذکر بلند آواز سے (غیر مفرط جہر) ہی کرنا سنت نبوی کی پیروی ہے، یہاں تک مبتدعین اصولی طور پر ہمارے ساتھ متفق ہیں، اس لئے اس بات کی ضرورت تو نہیں کہ سری و جہری ذکر و اذکار کے دلائل نقل کئے جائیں۔
لیکن ہم اپنے موحد قارئین کرام کی تسلی و تشفی اور بات کو مدلل کرنے کی غرض سے ان کے دلائل نقل کر دیتے ہیں، واللہ یھدی من یشاء۔

سری اور جہری ذکر کی دلیل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں

قال رسول اللہ ﷺ یقول اللہ انا عند ظن عبدی بی وانا معہ اذا ذکرنی فان ذکرنی فی نفسہ ذکرته فی نفسی و ان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منهم وان تقرب الی بشبر تقربت الیہ ذراعاً وان تقرب الی ذراعاً تقربت الیہ باعاً و من اتانی یمشی اتیتہ ہرولۃ۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں (جو اس کو میرے ساتھ گمان ہے) جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوں اپنے علم و فضل سے، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرے تو میں اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرے تو میں اسے اسے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں، اور اگر ایک ہاتھ نزدیک ہو تو میں ایک بام (دو ہاتھ کے برابر) نزدیک ہوتا ہوں اور اگر میرے پاس چلتا ہوا آئے تو میں دوڑتا ہوا اس کی طرف جاتا ہوں۔

یہ حدیث ذکر سری و جہری دونوں کی دلیل ہے۔

چنانچہ مولانا عبید اللہ رحمانی محدث مبارک پوری مشکوٰۃ کی شرح میں اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

(فی نفسہ) ای سرا و خفیۃ وهو یحتمل أن یکون ذکر قلبیاً اولسانیا اخفائیا ای ذکر شفاہیاء، علی جهة السردون الجهر، قال الشوکانی، ویدل علی هذا الاحتمال الثانی قوله وان ذکر نی فی ملاً ذکر ته فی ملاً خیر منه فانه یدل علی أن العبد قد جهر بذکره سبحانه و تعالیٰ بین ذلك الملاً الذی هو فیهم فیقابله الاسرار بالذکر باللسان لامجرد الذکر القلبی فانه لا یقابل الذکر الجہری بل یقابل مطلق الذکر اللسانی أعم من یکون سراً او جہراً۔

(اپنے دل میں) یعنی سری و مخفی یعنی احتمال رکھتی ہے، یہ حدیث قلبی یا زبان سے مخفی کا، یعنی ذکر قلبی پوشیدہ کی جہت سے، آواز کے بغیر۔

امام شوکانی فرماتے ہیں احتمال ثانی (جہر) پر دلالت کرتے ہیں آپ علیہ السلام کے یہ الفاظ کہ اگر (مومن) مجلس میں ذکر کرے تو میں اسے اس سے بہتر مجلس میں ذکر کرتا ہوں، تو یہ دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بندے نے جہری کیا ہے اپنی محفل کے درمیان جن میں وہ (بیٹھا ہوا) تھا تو یہ سری کے مقابل واقع ہوا زبان کے ساتھ ذکر کرنا نہ کہ فقط ذکر قلبی کیونکہ ذکر قلبی جہری کے مقابل نہیں آتا، بلکہ مطلق زبان کے ذکر کے بالمقابل آتا ہے خواہ وہ سری ہو یا جہری۔

مرعاة المفاتیح ص ۳۸۴ ج ۷، باب ذکر اللہ عزوجل والتقرب الیہ۔

الغرض اس حدیث سے ذکر سری و جہری دونوں ثابت ہوتے ہیں اب شریعت میں جہاں ذکر سری مروی ہے وہاں سری کیا جائیگا۔ اور جہاں جہری مروی ہے وہاں جہری کیا جائے گا۔ اور جہاں شریعت میں کوئی صراحت نہیں تو وہاں مومن اجتہاد سے کام لیکر جو سہ طریقہ وقت کے مناسب ہو، اسے لائحہ عمل بنا کر ذکر کرے اس طریقہ عمل سے کافی حد تک اختلافات کی خلیج کم ہوگی اور امت میں اتحاد و اتفاق کا پہلو غالب رہے گا اور عوام میں نفرت و تعصب کی بجائے پیار و محبت پیدا ہوگا۔

العود الی المقصود۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں وہ یہ کہ حضرت مفتی صاحب نے ذکر بالجہر کا مسئلہ چھیڑ کر اپنا اصل مدعا ہی چھوڑ دیا ہے، کیونکہ مفتی صاحب ثابت تو یہ کرنا چاہتے تھے کہ نماز فجر اور عشاء کے بعد بلند آواز سے درود شریف پڑھنا چاہیے، مگر انہوں نے بلند آواز سے درود شریف پڑھنے کی بجائے مطلق ذکر بالجہر کی بحث کو لکھنا شروع کر دیا چنانچہ فرماتے ہیں

پنجاب وغیرہ میں قاعدہ ہے کہ بعد نماز فجر و عشاء بلند آواز سے درود شریف پڑھتے ہیں، مخالفین اس کو حرام کہتے ہیں، اور طرح طرح کے حیلوں سے اس کو روکنا چاہتے ہیں، ایک حیلہ یہ ہے کہ ذکر بالجہر بدعت ہے اصول حنفیہ کخلاف ہے، اس سے نمازی لوگ نماز میں بھول جاتے ہیں، لہذا یہ حرام ہے۔

جاء الباطل ص ۳۴۴ ج ۱۔

اس کے بعد انہوں نے ذکر بالجہر کے دلائل دینے شروع کر دیئے ہیں، جو ص ۳۵۰ تک پھیلے ہوئے ہیں (جن میں سے دو آیات قرآنیہ اور متعدد احادیث ہیں جن میں سے بعض صحیح اور بعض ضعیف اور بعض میں الفاظ کی زیادتی ہے، تفصیل آگے آرہی ہے)

حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ پہلے نماز کے بعد بلند آواز سے درود شریف پڑھنے کے دلائل نقل کرتے، بعد میں ان پر اعتراضات نقل کر کے تسلی بخش جوابات دیتے، لیکن چونکہ نماز کے بعد درود شریف پڑھنے کا ذکر شریعت سے ثابت نہ تھا، لہذا مفتی صاحب اصل بحث کی بجائے ذکر بالجہر کی بحث درمیان میں گھسیٹ لائے ہیں اس کھینچا تانی سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اصل بحث پردہ حجاب میں رہے اور عوام یہ باور کر لیں کہ نماز کے بعد بلند آواز سے درود شریف کا وظیفہ ثابت ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حالانکہ اصولی طور پر ذکر بالجہر کی بحث اعتراضات کے ضمن میں لاتے کہ اس کے ناجائز ہونے پر مخالفین ایک دلیل عدم بالجہر کی بھی دیتے ہیں، چونکہ اس طرح اصولی بحث ہونی تھی اور مفتی صاحب کا بھانڈا پھوٹ جانا تھا، کہ نماز کے بعد درود شریف کے بلند آواز سے پڑھنے کا وظیفہ قرآن و سنت سے ثابت ہی نہیں۔

جب کہ مفتی صاحب اپنی اس کمزوری سے بخوبی واقف تھے، اس لئے انہوں نے اصل موضوع پر لکھنے کی بجائے ایک فرضی اعتراض پر عمارت قائم کر لی تاکہ مریدین میں واہ واہ ہو جائے کہ مفتی صاحب تیس مار خاں ہیں۔

نماز کے بعد مسنون وظائف

(۱) عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

كنت اعرّف انقضاء صلوة النبی ﷺ بالتکبیر.

یعنی میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کا تمام ہونا تکبیر کہنے کے ساتھ پہچان لیتا تھا۔ بخاری ص ۱۱۶ ج ۱، و مسلم ص ۲۱۷ ج ۱ واللفظ لہ۔

یعنی میں آنحضرت ﷺ کی نماز کے اختتام کو، اللہ اکبر، کہنے کی آواز سے معلوم کر لیتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ کلمہ بلند آواز سے کہا جائے تب ہی علم ہو سکتا ہے، اور دوسری روایت میں اس کی صراحت بھی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رفع الصوت بالذکر حين ينصرف الناس من المكتوبة كان علی عهد النبی

ﷺ.

یعنی بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا جب فرض نماز سے فارغ ہوں، نبی ﷺ کے زمانہ میں معمول تھا، بخاری ص ۱۱۶ ج ۱، و مسلم ص ۲۱۷ ج ۱۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ نماز سے فارغ ہوتے ہی امام اور مقتدیوں کو بلند آواز سے، اللہ اکبر، کہنا چاہئے، اس سے معلوم ہوا کہ نماز سے فارغ ہو کر درود شریف کی بجائے، اللہ اکبر، کہنا مسنون طریقہ ہے، اور جو چیز سنت کو مٹاتی ہو اسکے بدعت سیئہ ہونے کا علمائے بریلویہ کو بھی اعتراف ہے۔

چنانچہ مجدد ملت بریلویہ مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے کہ

بدعت سیئہ وہ ہے کہ رد سنت کرے، احکام شریعت ص ۱۹۰۔

مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی لکھتا ہے

رسول اللہ ﷺ نے جن امور کو منضبط کر دیا ہے ان میں سے کسی قسم کی زیادتی اور سابقہ ولاحقہ کا اضافہ کرنا ناجائز اور بدعت ہے۔ شرح صحیح مسلم ص ۵۶۲ ج ۲۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے محبوب طریقہ و عمل سے نماز سے فارغ ہو کر بلند آواز سے، اللہ اکبر، تو کہا ہے، مگر بلند آواز سے درود کا ورد نہیں کیا، اور درود کا بلند آواز سے نماز کے بعد پڑھنا چونکہ آپ علیہ السلام کے منضبط کئے ہوئے طریقہ پر زیادتی ہے لہذا اصول بریلویہ کے مطابق یہ بدعت سیئہ ہے۔

علاوہ ازیں نماز کے بعد دیگر کئی وظائف آنحضرت ﷺ سے ثابت ہیں مگر کسی ایک میں درود کا وظیفہ ثابت نہیں، اگر کوئی اس کا ثبوت دے دے تو ہم اسے قبول کرنے کیلئے تیار ہیں، ان شاء الرحمن۔

مگر یاد رہے کہ یہ کسی معتبر دلیل سے ہو، چونکہ چنانچہ کی ہیرا پھیریاں اور مکاریاں نہ ہوں، صریحاً دلیل درکار ہے کہ آنحضرت ﷺ فجر اور عشا کی نماز سے فارغ ہو کر بلند آواز سے درود شریف پڑھا کرتے تھے، یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، تجربہ کر دیکھئے قیامت تک مہلت ہے۔

کیا اہل حدیث درود کے منکر ہیں؟

الہدایت کے نزدیک درود کا منکر کافر و بے ایمان اور پکا خبیث بلکہ پرلے درجہ کا لعنتی ہے، ہمارے نزدیک آنحضرت ﷺ کا نام نامی اسم گرامی سن کر درود پڑھنا واجب ہے، اور اس کا وظیفہ کرنا بھی درست ہے، لیکن جہاں اور جس مقام پر آنحضرت ﷺ نے درود کی بجائے کوئی اور کلمات پڑھے ہیں، ان مقامات پر انہیں کلمات کو پڑھنا ہی راہ ہدایت اور مسنون طریقہ اور سنت خیر الانام کی پیروی کا تقاضا ہے۔

مثلاً اگر کوئی شخص نماز میں رکوع و سجود میں تسبیحات کی بجائے درود پڑھے، یا نماز میں قراۃ قرآن کی بجائے درود پڑھے، تو بالاتفاق ایسے شخص کی نماز نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے مسنون طریقہ کو ترک کر کے از خود عبادت میں کیفیت اور ہیئت متعین کی ہے جو تعامل مصطفوی کے خلاف ہونیکی وجہ سے مردود و باطل ہے، اسی طرح ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کے

محبوب و پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے درود کی بجائے، اللہ اکبر، کو بلند آواز سے پڑھا ہے، لہذا اسے ہی پڑھنا درست اور حق ہے اور درود کو پڑھنا چونکہ سنت کو مٹاتا ہے لہذا بریلویت کے اصول سے یہ بدعت سیئہ ہے۔

حضرت امام نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کو چھینک آئی تو اس نے کہا، الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں بھی (عام حالات میں) کہتا ہوں،

الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں چھینک کا جواب اس طرح نہیں سکھایا بلکہ انہوں نے، الحمد للہ علی کل حال، کہنے کی تعلیم دی ہے ترمذی مع تحفہ ص ۲ ج ۴۔

اس حدیث کا یہ قطعاً معنی نہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ درود کے منکر یا بغض نبوی کی وجہ سے درود سے منع کر رہے تھے (جیسا کہ اہل بدعت اہل حق پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ درود کے منکر ہیں) بلکہ ان کا مقصود یہ تھا کہ چونکہ آنحضرت ﷺ کی دی ہوئی تعلیم پر اضافہ ہے جس کی وجہ سے ناجائز ہے، چنانچہ بریلویت کے شیخ الحدیث مولوی غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں

اس شخص نے جو چھینک کے بعد، الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ، کہا تھا تو اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتا تھا اور نہ یہ بات تھی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بغض کی بنا پر اس کو چھینک کے بعد درود شریف پڑھنے سے منع کر رہے تھے، ان کا مطلب صرف اتنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو عبادات جس طرح مشروع اور مقرر فرمائی ہیں ان کو اسی طرح ترمیم اور اضافہ کے بغیر ادا کرنا اتباع رسول اور جماعت صحابہ کے ساتھ وابستگی ہے اور اپنی رائے سے ان میں کسی سابقہ اور لاحقہ کا اضافہ کرنا بہر حال لائق ستائش نہیں ہے۔ شرح صحیح مسلم ص ۱۰۹۵ ج ۱۔

اور یہی کچھ ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ نماز کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے جس طریقہ سے ذکر فرمایا ہے اس میں کسی ترمیم و اضافہ کے بغیر بلند آواز سے اللہ اکبر اور دیگر مشروع وظائف

کیئے جائیں، اور درود کی رسم کو ختم کیا جائے، مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ اہل بدعت ان جیسے مسائل میں افہام و تفہیم کی بجائے نہایت بودے اور جزباتی انداز میں عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل حدیث درود کے منکر ہیں حالانکہ یہ اہل بدعت کا صریحاً جھوٹ اور ایک مسلمانانہ بھائی پر افترا ہے جس کا حقیقت سے ذرا بھی تعلق نہیں ہے۔

اللہ ہدایت اور سمجھ کی توفیق عنایت فرمائے۔

اس کے برعکس حنفیہ کے آقا و مقتدا امام ابو حنیفہ کی مجلس میں رسول کریم ﷺ پر درود نہیں پڑھا جاتا تھا۔ کتاب السنہ ص ۲۱۲ ج ۱ ابن امام احمد بن حنبل۔

اسی طرح درمیانی تشہد میں اگر اللھم صل علی محمد ﷺ پڑھا لیا جائے تو ان کے نزدیک سجدہ سجدہ واجب ہے، بہار شریعت ص ۵۰ حصہ چہارم و فتاویٰ رضویہ ص ۶۳۶ ج ۳، وحلی کبیر ص ۶۰ و البحر الرائق ص ۲۹۷ ج ۲ و فتح القدیر ص ۴۳۸ ج ۱، و فتاویٰ عالمگیری ص ۱۲۷ ج ۱، و فتاویٰ قاضی خاں ص ۱۲۱ ج ۱، و حاشیہ امداد الفتاویٰ ص ۳۵۳ ج ۱، و احسن الفتاویٰ ص ۳۰ ج ۴، وغیرہ کتب فقہ و فتاویٰ میں بریلوی و دیوبندی علماء نے اس کے مفتی بہ ہونے کا فتویٰ دے رکھا ہے، حالانکہ درمیانی تشہد میں درود پڑھنا آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے، نسائی ص ۲۰۲ ج ۱، و ابوعوانہ ص ۳۲۲ ج ۲، معلوم ہوا کہ درود کے منکر حنفی ہیں،

مفتی صاحب کے دلائل میں سقم کی صراحت

مقام کی مناسبت سے ہم یہ بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ، ذکر بالجبر، پر مفتی صاحب نے جن دلائل کو ذکر کیا ہے، ان میں مفتی صاحب کی فاش غلطیوں کو واضح کر دیا جائے تاکہ کہیں علماء بریلویہ یہ نہ کہہ دیں کہ حضرت کی لاجواب علمی تحریر سے متاثر ہو کر، مؤلف، دین الحق، نے ذکر بالجبر جواز کا موقف اپنایا ہے بلکہ ہمارا یہ موقف قرآن و سنت کی روشنی میں بفضلہ تعالیٰ پہلے سے ہی تھا، مفتی صاحب کے بودے اور بے مغز استدلال کی ہمیں چنداں ضرورت بھی نہیں۔

بہر حال ہم یہاں مفتی صاحب کے تسامحات کو، الدین النصیحة (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے تحت درج کر رہے ہیں تاکہ مبتدین کو بھی صحیح و درست بات تسلیم کرنے کی رب تعالیٰ

عادت صالحہ ڈال دے۔

الفاظ حدیث میں اضافہ

حضرت مفتی صاحب نے، مشکوٰۃ کے باب الذکر بعد الصلوٰۃ، سے ایک روایت نقل کی ہے کہ

نبی ﷺ

إذا سلم من صلوٰۃ يقول بصوته لا اله الا الله وحده لا شريك له.

جب اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے فرماتے تھے، لا اله الا الله وحده لا شريك له. جاء الباطل ص ۳۴۵ ج ۱۔

الجواب۔ اولاً۔ حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ سے یہ روایت قطعاً مروی نہیں صاحب مشکوٰۃ یا کسی نسخ و کاتب کا ذہول ہے، کیونکہ یہ روایت انہوں نے صحیح مسلم سے نقل کی ہے اور مسلم شریف میں، بصوتہ الاعلیٰ، (بلند آواز سے) کے الفاظ نہیں ہیں، مسلم ص ۱۱۸ ج ۱۔

محدث عبید اللہ مبارک پوری فرماتے ہیں

حدیث عبد اللہ بن الزبیر هذا اخرجه مسلم من طرق ولكن ليس في طريق منها قوله، بصوتہ الاعلیٰ.

یعنی اس حدیث عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو امام مسلم نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے مگر کسی طریق میں، بصوتہ الاعلیٰ، کے الفاظ مروی نہیں جو (صاحب مشکوٰۃ نے) نقل کیئے ہیں، مرعاة المفاہج ص ۳۱۸ ج ۳۔

انہوں نے مزید صراحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ روایت مسند احمد ص ۴، ۵، ج ۴، و سنن ابو داؤد ص (۱۵۰۲)، اور نسائی (۱۳۴۰)، وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے مگر اس میں بصوتہ الاعلیٰ، کے الفاظ نہیں ہیں، ایضاً۔

معنی حدیث کی غلط تاویل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

جامع الصغیر میں ہے

عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ اکثرُوا فی الجنَازَةِ قولَ لا اِلهَ الا اللہ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جنازہ میں لا اِلهَ الا اللہ زیادہ کہا کرو۔

مفتی صاحب اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

اس سے معلوم ہوا کہ جنازے کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنا یا کوئی اور ذکر کرنا ہر طرح جائز ہے، بلند آواز سے ہو یا خفیہ۔ جاء الباطل ص ۳۴۶ ج ۱۔

الجواب۔ اولاً۔ سند کے اعتبار سے یہ روایت مجروح ہے، حاشیہ دلیلی ص ۱۰۳ ج ۱، (مزید تفصیل آگے جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے کلمہ پڑھنے کی بحث میں آرہی ہے)۔

ثانیاً۔ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے، فی الجنَازَةِ، کے معنی، جنازہ کیساتھ، کس اصول و ضابطہ اور لغت کی رو سے کیا ہے، ورنہ اس کا صحیح معنی تو یہ ہے کہ، جنازہ میں، مگر علماء بریلویہ جب بدعات کو ثابت کرنے پہ آتے ہیں تو تمام اصول و قواعد کو بھول جاتے ہیں اور تقویٰ ~~عشیت~~ الہی کا ذرا بھی پاس و لحاظ نہیں کرتے مزید افسوس یہ کہ دین کے واحد ٹھیکے دار ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی انہیں اس طرح کی ہیرا پھیریاں کرتے ہوئے ذرا بھر حیا نہیں آتا۔

مفتی صاحب کی علل الحدیث سے کم آگاہی

فرماتے ہیں کہ تفسیر خازن و روح البیان پارہ ۶ میں زیر آیت و اتینا داؤد زبوراً، ایک روایت نقل کی کہ حضور علیہ السلام نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آج رات ہم نے تمہاری قرات قرآن سنی تم کو داؤدی آواز دی گئی ہے، ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں

فقلت اما واللہ لو علمت انک تسمع لحبرته حبیرا التحبیر حسن الصوت۔ میں نے عرض کیا کہ رب کی قسم اگر مجھے خبر ہوتی کہ میرا قرآن صاحب قرآن سن رہے

ہیں ﷺ تو میں اور بھی آواز بنا کر پڑھتا۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ اولاً، یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ باہر آواز آتی تھی، دوسرے یہ کہ ذکر اللہ تلاوت قرآن عبادت الہی ہے اور عین عبادت میں حضور علیہ السلام کو خوش کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تمنا تھی۔ جاء الباطل ص ۳۴۶ ج ۱۔

تبصرہ

اولاً۔ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے یہاں خازن و روح البیان کا حوالہ کس مقصد کیلئے نقل کیا ہے، حالانکہ یہ روایت مختصر طور پر، بخاری ص ۵۵۷ ج ۲، اور مسلم ص ۲۶۸ ج ۱، میں موجود تھی، اور حدیث کے آخری الفاظ،

بھٹی ص ۱۲ ج ۳، ص ۲۳۶ ج ۱۰، و مسند ابویعلیٰ ص ۴۰۱ ج ۶، و طبرانی (مجمع الزوائد ص ۳۶۳ ج ۹) میں مروی ہیں، لیکن مفتی صاحب کی جہالت کہنے یا مطالعہ کی کمی سے تعبیر کریں کہ (کتب حدیث کی بجائے)، معروف حدیث کیلئے تفاسیر کا حوالہ نقل کر رہے ہیں، یہ ہیں علم نبوی کے ٹھیکیدار اور فقاہت کے علمبردار،

ثانیاً۔ الفاظ نقل کرنے میں بھی نہایت غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے، اصل الفاظ یہ ہیں فقال لو علمت لحبرته لک تحبیرا۔

البتہ طبرانی کی روایت میں، لو علمت، کے بعد، بمکانک، کے الفاظ زائد ہیں اور ابن سعد کی روایت میں، لک، کی بجائے، لھن، کے الفاظ آتے ہیں، بحوالہ فتح الباری ص ۶۷ ج ۹۔

لیکن جو الفاظ مفتی صاحب نے درج کیئے ہیں، ان الفاظ کا مجموعہ کسی حدیث کی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

معنی حدیث میں تحریف

فرماتے ہیں، مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ باب صلوٰۃ اللیل، میں روایت ہے کہ ایک شب حضور علیہ

السلام اپنے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتحان لینے کیلئے تشریف لے گئے کہ ان کے رات کے مشاغل کو ملاحظہ فرمائیں۔ (اس کے بعد مفتی صاحب نے پوری حدیث نقل کی ہے) جاء الباطل ص ۳۴۶ ج ۱۔

تبصرہ

اولاً۔ ان الفاظ سے ایسی کوئی روایت مشکوٰۃ کے مذکورہ باب میں نہیں، بات یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ ہیں

ان رسول اللہ ﷺ خرج ليلة فاذا هو بابي بكر يصلی، الحديث.

یعنی رسول اللہ ﷺ ایک رات کو باہر نکلے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر گزر ہوا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے، مشکوٰۃ ص ۱۰۷، و ابو داؤد ص ۵۰۹ ج ۱۔

لیکن مفتی صاحب کو تحریر میں جھوٹ لکھنے کا ایسا چسکا پڑا ہوا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر غلط بیابیاں کرتے تھے ہم عربی کے طلبہ کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ الفاظ میں کن الفاظ کا یہ معنی ہے کہ آپ علیہ السلام امتحان کی غرض سے باہر نکلے تھے، بلکہ حدیث کے الفاظ اس بات کو رد کرتے ہیں، کیونکہ، فاذا هو بابي بكر، کے الفاظ کا یہ مفاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس قصداً نہیں بلکہ اچانک و اتفاقی طور پر گزرے، چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی ان الفاظ کا معنی بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

پس ناگاہ کہ وے و ملا بس و ملا قے ست بابو بکر کہ نماز میگزارد. اشعة

اللمعات ص ۵۵۰ ج ۱۔

مگر حضرت حکیم الامت اور مفسر قرآن علم حدیث سے اس قدر بے خبر اور جاہل تھا کہ متن روایت کے بالکل خلاف معنی کر دیا۔

اس سلسلہ میں مزید چیزیں بھی قابل گرفت ہیں مگر ہم نے، اختصار کی وجہ سے عمداً ترک کر دی ہیں، کہ کتاب پہلے ہی ہمارے اندازے سے زیادہ ضخیم ہوتی جا رہی ہے۔

باب انسان کے ہاتھ پاؤں چومنے کی شرعی حیثیت

جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا، تو انہیں ہدایت کامل دیکر بھیجا جس میں بنی آدم کو آداب و تعظیم کا طریقہ بھی بتایا گیا، آنحضرت ﷺ کی زندگی مبارکہ میں متبرک مقامات کے علاوہ صاحب فضل و کمال لوگ بھی موجود تھے، ان کی تعظیم کی آپ نے اپنے اسوہ حسنہ سے تلقین فرمائی، مگر کسی معتبر دلیل سے ثابت نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی بیت اللہ کا بوسہ لیا ہو یا مقام ابراہیم کو چوما ہو یا قرآن مجید کے مقدس اوراق کو آنکھوں پر لگایا ہو، یا کسی صاحب عظمت اور باوقار شخصیت کی قدم بوسی کی ہو۔

ہم ارباب عقل و خرد اور اہل علم کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پورے ذخیرہ احادیث میں کسی چیز کا تعظیم کی غرض سے بوسہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، ہاں البتہ حجر اسود کا بوسہ آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے، مگر یہ بھی کوئی واجب و فرض نہیں اگر کوئی شخص جان بوجھ کر عمداً حجر اسود کا بوسہ نہیں لیتا تو اس کے حج میں ذرا برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔

لیکن حجر اسود کے بوسہ سے کسی دوسری باعظمت چیز کا بوسہ ثابت کرنا درست نہیں، کیونکہ جیسے کعبہ کا طواف کعبہ سے ہی خاص ہے، اسی طرح حجر اسود کا بوسہ بھی اسی سے ہی خاص ہے، بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو ایک بار حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے صاف الفاظ میں یہ بات کہی تھی

انی لا اعلم انک حجر لاتضر ولا تنفع ولولانی رایت النبی ﷺ یقبلک
ما قبلتک۔

یعنی مجھے بخوبی معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے، جو کسی کو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے کبھی بھی نہ چومتا، صحیح بخاری ص ۱۷۲ ج ۱، و صحیح مسلم ص ۴۱۳ ج ۱۔

حافظ ابن حجر اس اثر کی شرح کرتے ہوئے امام طبرانی کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس لئے کہا تھا کہ بتوں کی عبادت کا زمانہ قریب تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں جاہل لوگ حجر اسود کو چومنے سے یہ خیال نہ کر لیں کہ اسلام میں بھی بعض پتھروں کی تعظیم ہے، جیسا کہ عربی لوگ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے، اس لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس بات کا ارادہ فرمایا کہ لوگ جان لیں کہ حجر اسود کو چومنا اتباع رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ حجر اسود ذاتی طور پر کوئی نفع و نقصان پہنچاتا ہے۔

جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ بتوں کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے محدث مہلب فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول سے اس شخص کا رد ہوتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا یمن (دایاں ہاتھ) ہے جو اپنے بندوں سے اس کے ساتھ مصافحہ کرتا ہے، معاذ اللہ، (پھر فرماتے ہیں) کہ اس کے چومنے کا مقصد یہ ہے کہ اطاعت کا مشاہدہ کیا جائے کہ کون اطاعت کرتا ہے اور یہ ابلیس کے قصہ کے مشابہ ہے کہ جہاں فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو (نہ یہ کہ آدم معبود تھے) فتح الباری ص ۳۶۳ ج ۳۔

الغرض کچھ بھی ہو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بہر حال حجر اسود کو مخاطب کر کے یہ بات کہی کہ تیری تعظیم کی غرض سے نہیں اتباع رسول ﷺ کی پیروی میں تجھے چوم رہا ہوں، ہمارا بھی دعویٰ ہے کہ کسی متبرک و با عظمت چیز کا بوسہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت کر دیا جائے تو ہم بھی اتباع رسول میں اس کو ضرور بھر ضرور بوسہ دیا کریں گے اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیں گے، کتنی سیدھی اور صاف بات ہے کہ ثبوت لاؤ، تو ہم عمل کرنے کیلئے تیار ہیں، باقی رہا مفتی صاحب کا روایات نقل کرنا کہ فلاں شخص نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ یا پاؤں چومے تو یہ مفتی صاحب کے مذہب و عقیدہ اور عمل کی رو سے ان کی دلیل نہیں (تفصیل آگے آرہی ہے)

پھر اگر ہاتھ پاؤں چومنے آداب میں شامل ہوتے اور کسی باوقار اور صاحب عظمت شخصیت کی تعظیم ہی مقصود ہوتی تو اللہ کے پیارے رسول ﷺ کسی ناکسی کی تعظیم میں ضرور بھر ضرور اس کے ہاتھ پاؤں چومتے، آخر آنحضرت ﷺ کی زندگی مبارکہ میں آپ کی رضائی ماں اور بہن بھائی موجود تھے، آپ کا محسن چچا اور جلیل القدر صحابی بلکہ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہی کبھی تعظیم میں ہاتھ چوم لیا کرتے یا کسی صحابی کو ہی حکم فرماتے کہ اپنے فلاں کے ہاتھ پاؤں چوما کرو کہ یہ آداب میں شامل ہے، مگر پورے ذخیرہ حدیث کو آپ پوری کوشش اور جستجو سے پڑھ لیجئے آپ کو کوئی ایسی صحیح صریح ایک حدیث بھی نہ ملے گی، جو زمانہ حال کے مبتدعین کی کھلی دلیل بن سکتی ہو، یہی وجہ ہے کہ فقہاء احناف نے بھی اس کی پر زور تردید کی ہے۔

چنانچہ درمختار میں ہے کہ

تقبیل ید بنفسہ اذا لقی غیرہ فہو مکروہ فلا رخصۃ فیہ واما تقبیل ید صاحبہ عند اللقاء فمکروہ بالاجماع و کذا ما یفعلونہ من تقبیل الارض بین یدی العماء و العظماء فحرام والفاعل والراضی بہ آثم لانہ یشبہ عبادۃ الوثن و ہل یکفر ان علی وجہ العبادۃ والتعظیم کفر وان علی وجہ التحیۃ لا و صار آثما مرتکبا للکبیرۃ..

یعنی دوسرے سے ملاقات کے وقت اپنے ہاتھ کو چومنا، مکروہ ہے اس (عمل میں) رخصت نہیں اور اپنے دوست سے ملاقات کے وقت اس کا ہاتھ چومنا بالا جماع مکروہ ہے اور اسی طرح (یہ بھی مکروہ ہے) جو علماء اور معظم لوگوں کے سامنے سے زمین کو بوسہ دیتے ہیں ایسا کرنے والا اور اس کے فعل پر راضی ہونے والا دونوں ہی گناہگار ہیں، کیونکہ یہ بتوں کی عبادت کے مشابہ ہے، اور اگر عبادت و تعظیم کی نیت سے کرے تو کفر ہے اور اگر تحسین کے ارادہ سے کرے تو کفر نہ ہوگا ہاں البتہ گناہگار ہو گیا اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔ درمختار مع فتاویٰ شامی ص ۶۳۸۳ ج ۱۔ کتاب الخطر و

والا باحتہ باب الاستبراء وغیرہ۔

مفتی صاحب کا اعتراض

فرماتے ہیں، مولوی عبدالحی صاحب نے مقدمہ ہدایہ میں حجر اسود کے ماتحت اس حدیث کو نقل فرمایا کہ حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ اے امیر المومنین حجر اسود نافع بھی ہے اور مضر بھی، کاش آپ نے قرآن کی اس آیت کی تفسیر پر توجہ فرمائی ہوتی،

و اذ اخذ ربک من بنی آدم من ظهورہم ذریعتہم۔

جب میثاق کے دن رب تعالیٰ نے عہد و پیمان لیا تو وہ عہد نامہ ایک ورق میں لکھ کر اس حجر اسود میں رکھا اور یہ سنگ اسود قیامت کے دن آویگا کہ اس کی آنکھیں اور زبان اور لب ہوں گے اور مومنین کی گواہی دے گا، لہذا یہ اللہ کا امین اور مسلمانوں کا گواہ ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے علی جہاں تم ہو خدا مجھے وہاں نہ رکھے اصل حدیث ترمذی ص ۱۱۵ میں بھی ہے۔ جاء الباطل ص ۵۷۳ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے صریحاً جھوٹ بولا ہے کہ یہ روایت ترمذی میں ہے، حالانکہ یہ روایت ترمذی میں نہیں پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اور عاشقین بدعات اس کا وجود ترمذی سے ثابت نہیں کر سکتے۔

ثانیاً۔ یہ داستان مذبذبہ ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی ابی ہارون العبدی (عمارة بن جوبن) ہے، مستدرک حاکم ص ۴۵۷ ج ۱۔ وشعب الایمان للبیہقی ص ۴۵۱ ج ۳ (رقم الحدیث ۴۰۴۰)۔

جو کہ پرلے درجہ کا ضعیف و متروک ہے، اسے عماد بن زید، امام جوزجانی، امام ابن معین، امام عثمان بن ابی شیبہ، وغیرہ نے کذاب قرار دیا ہے، امام شعبہ اسے ضعیف کہتے ہیں، امام احمد نے، لیس بشی (پچ محض) کہا ہے، امام ابو زرعہ نے ضعیف الحدیث قرار دیا ہے، امام ابو حاتم فرماتے ہیں بشر بن حرب سے بھی زیادہ ضعیف ہے، امام نسائی، امام حاکم نے متروک قرار دیا ہے

امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ ابی سعید سے وہ روایات بیان کرتا ہے جو ان کی احادیث میں

نہیں (یعنی ان کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتا ہے خیر سے یہ روایت بھی انہی سے بیان کی ہے، ابو صہیب) اس کی روایات کو لکھنا جائز نہیں مگر تعجب کی نظر سے، امام ابن سعد نے احادیث میں ضعیف قرار دیا ہے، امام شعبہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس سے روایت کرنے سے گردن کٹوانا زیادہ پسند ہے،

امام ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر محدثین کرام کا اجماع ہے۔

تہذیب التہذیب ص ۴۱۳ ج ۷، و میزان الاعتدال ص ۷۳ ج ۳۔

کوئی ادنیٰ کلمہ توثیق بھی راقم کو کتب رجال سے اس کے متعلق نہیں ملا، حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص ۳۶۳ ج ۳، میں اور امام بیہقی نے، شعب الایمان، میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور امام احمد ~~رحمہ اللہ~~ اس روایت کا ضعف نقل کیا ہے، علامہ سیوطی نے امام بیہقی کا حکم ذکر کر کے سکوت کیا ہے، درمنثور ص ۱۴۴ ج ۳۔

اسکیننگ : محمد شاہد

truemaslak@inbox.com

کراچی، پاکستان

بزرگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے کے دلائل کا تجزیہ مفتی صاحب کی پہلی دلیل

تبرکات کا چومنا جائز ہے، قرآن کریم فرماتا ہے کہ

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ

یعنی بنی اسرائیل تم بیت اللہ کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو، اور کہو ہمارے گناہ

معاف ہوں۔

اس آیت سے پتہ لگا کہ بیت المقدس جو انبیاء کرام کی آرام گاہ ہے اس کی تعظیم اس طرح کرائی گئی کہ وہاں بنی اسرائیل کو سجدہ کرتے ہوئے جانے کا حکم دیا، یہ بھی معلوم ہوا کہ متبرک مقامات پر توبہ جلد قبول ہوتی ہے۔ جاء الباطل ص ۶۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مبتدعین پر لازم ہے کہ وہ کسی معتبر دلیل شرعی سے ثابت کریں کہ بنی اسرائیل کو سجدہ کرنا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ یہ انبیاء کرام کی آرام گاہ ہے، لہذا سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا، یقین جانے پوری دنیا کے مبتدعین اکٹھے ہو کر سرتوڑ کوشش کرنے کے باوجود اس کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتے، بلکہ یہ بھی ثابت نہیں کر سکتے کہ بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے پہلے کوئی نبی بستی بیت المقدس میں گیا ہو اور اس نے وہاں آرام کیا ہو یا وہاں اس کی فرودگاہ یا قبر ہو، یہ فقط مفتی جی کی سینہ گزٹ بات ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم یہود (بنی اسرائیل) اس وجہ سے ملعون ہو گئی کہ انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی آرام گاہوں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا۔

ام المؤمنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لعنة الله على اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد، الحديث

یعنی یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ

گاہ بنالیا تھا۔ بخاری ص ۶۲ ج ۱، و مسلم ص ۲۰۱ ج ۱۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ یہود کے اس فعل کی وجہ سے ان پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، مگر افسوس کہ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ انہیں انبیاء کرام کی آرام گاہوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اے جی اگر حکم دیا گیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے لعنت کیوں فرمائی، کیا رسول اللہ ﷺ ایسے شخص پر لعنت فرمایا کرتے تھے جو حکم الہی پر عمل کرتا ہو۔

ثانیاً۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے حکم الہی کو بدل دیا اور سجدہ نہیں کیا، بلکہ نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ انہیں جس سجدے کا حکم دیا گیا تھا، وہ انہوں نے نہیں کیا جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

عن النبی ﷺ قال قيل لبنى اسرائيل ادخلوا الباب سجداً و قولوا حطة فدخلوا يزحفون على استاهم فبدلوا وقالوا حطة حبة في شعرة.

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور زبان سے یہ کہتے ہوئے الہی ہمیں معاف کر دے، داخل ہونا، مگر انہوں نے اس حکم کو بدل دیا اور چوڑوں کے بل داخل ہوئے اور حطہ (معاف کر دے) کی جگہ حبة فی شعرة (دانہ بالی کے اندر) کہنے لگے۔ بخاری ص ۶۳۳ ج ۲۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس سجدہ کا انہیں حکم دیا گیا تھا، وہ اسے بجا نہ لائے جس کی وجہ سے وہ مستحق عذاب قرار پائے، ارشاد ہوتا ہے

فبدل الذين ظلموا قولاً غير الذي قيل لهم فانزلنا على الذين ظلموا رجزاً من السماء بما كانوا يفسقون. (البقرہ ۵۹)

تو جو ظالم تھے انہوں نے اس لفظ کو جس کا انکو حکم دیا تھا بدل کر اس کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا پس ہم نے (ان) ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ نافرمانیاں کئے جاتے تھے (۲-۵۹) اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ حکم کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہوا تھا، اب اگر مفتی صاحب کی بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ انہیں انبیاء کرام کی آرام گاہوں کی تعظیم کیلئے یہ حکم ہوا تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان پر عذاب الہی کیوں نازل ہوا، کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی

قبروں کو تو انہوں نے سجدہ گاہ بنا رکھا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی روایت اس پر گواہ ہے، معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کا مطلب کشید کردہ ہے، جو غلط ہونے کی وجہ سے مردود و باطل ہے۔

ثالثاً۔ صحیح و درست اور خالص حق بات یہ ہے کہ انہیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بجا لانے کا حکم دیا گیا تھا، (جس کی انہوں نے نافرمانی کی تھی)

جیسا کہ، طے، کے الفاظ اس بات کا قرینہ ہیں کیونکہ مغفرت کی دعا فقط خالق سے ہی کی جاتی ہے، پھر آگے فرمایا کہ

نغفر لکم خطیکم (البقرہ، ۵۸)

ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے (احمد رضا خاں)

ثابت ہوا کہ انہیں اس بات کی تعلیم دی گئی تھی کہ مجھ (رب) سے مغفرت طلب کرنا تو میں معاف کر دوں گا، اس ساری تقریر سے، طے، کا تعلق خالق ارض و سماء رب تعالیٰ سے ثابت ہو گیا، تو، سجدہ، کا تعلق بھی اسی ذات سے رہا جس سے، طے، کا ہے خود مفتی صاحب کو اس حقیقت کا اقرار ہے فرماتے ہیں

اے اسرائیلیوں صرف بدنی عبادت (سجدہ) کرنے پر ہی کفایت نہ کرنا بلکہ وہاں داخل ہوتے وقت اپنی زبان سے کہنا خدا یا ہمارے گناہ معاف کر دے،
تفسیر نعیمی ص ۳۸۳ ج ۱۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب جاء الباطل میں اس کا تعلق انبیاء کرام کی آرام گاہوں سے جوڑ رہے ہیں، پھر اس یہودانہ تحریف پر انہیں نہ شرم ہے نہ حیا بلکہ اس بے ایمانی اور ہیرا پھیری کو بنیاد بنا کر اس سے اولیاء کرام کے ہاتھ پاؤں چومنے کا اثبات کر رہے ہیں۔

رابعاً۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ سجدہ کا تعلق رب تعالیٰ سے ہے، لیکن اگر بالفرض مفتی صاحب کی بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ سجدہ انبیاء کرام کی آرام گاہوں کی وجہ سے تھا، (نعوذ باللہ تعالیٰ) تو تب بھی مفتی صاحب کی بات ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ سجدہ سے ہاتھ پاؤں چومنے کا ثبوت کس دلیل سے ثابت ہوا۔

الغرض مفتی صاحب کی بات سے بھی غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کرنا ہی ثابت ہوا، جو خیر سے خود

مفتی صاحب کے نزدیک بھی ناجائز ہے۔ جاء الباطل ص ۳۸ ج ۲۔

فما کان جوابکم فھو جوابنا

دوسری دلیل

مشکوٰۃ باب المصافحہ والمعانقہ فصل ثانی میں ہے کہ

وعن ذراع وکان فی وفد عبدالقیس قال لما قدمنا المدینة فجعلنا نتبادر من رواحلنا فنقبل ید رسول اللہ ﷺ ورجلہ.

حضرت ذراع سے مروی ہے اور یہ وفد عبدالقیس میں تھے فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ منورہ آئے تو اپنی سواریوں سے اترنے میں جلدی کرنے لگے پس ہم حضور علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے۔ جاء الباطل ص ۳۶۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ اولیاء اللہ کے ہاتھ پاؤں چومنا اور ان کے بعد ان کے تبرکات بال و لباس وغیرہ کو بوسہ دینا، ان کی تعظیم کرنا مستحب ہے، جاء الباطل ص ۳۶۸ ج ۱۔ مگر اس کی دلیل یہ عنایت فرماتے ہیں وفد عبدالقیس نے ملاقات کے وقت آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پاؤں چومے تھے، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اس روایت سے امتی کے تبرکات (لباس و بال) کو چومنا اور ان کی غلو کی حد تک تعظیم کرنا کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے، رہا مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند مولویوں کا اس سے بزرگوں کے ہاتھ چومنے کا استدلال تو محل نظر ہے کیونکہ نبی اور امتی کا جسم ایک نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے جسم اطہر پر کسی پیر و فقیر اور مبتدعین کے اکابرین کو قیاس کر لیا جائے۔

ثانیاً۔ سند کے اعتبار سے یہ روایت اس قابل نہیں کہ اس پر بنیاد بنائی جاسکے کیونکہ سند میں ایک راویہ ام ابان بنت الوزاع بن زارع ہیں، ابوداؤد ص ۳۵۳ ج ۲۔

ان کی کسی محدث سے توثیق منقول نہیں، دیکھئے تھذیب ص ۲۵۸ ج ۱۲، ہاں البتہ حافظ ابن حجر نے تقریب ص ۳۴۳ میں، مقبولۃ، کہا ہے، اور یہ کلمہ اس بات کی صراحت ہے کہ ان کی کوئی متابعت کرے تب مقبول ورنہ لین الحمد للہ ہوتی ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے، مقدمہ تقریب، میں

صراحت کی ہے الغرض جب تک ام ابان کی توثیق یا کم از کم اس کا کوئی متابع ثابت نہ کیا جائے تب تک اس کی صحت کا دعویٰ قابل التفات نہیں۔

تیسری دلیل

مشکوٰۃ باب الکبار و علامات المنفاق میں حضرت صفوان ابن عسال سے روایت ہے، فقبل یدیه ورجله، پس انہوں نے حضور علیہ السلام کے ہاتھ اور پاؤں چومے تھے۔ جاء الباطل ص ۳۶۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس میں کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اولیاء کرام کے ہاتھوں اور پاؤں کو تبرکات کی نیت سے چومنا جائز ہے، الغرض مبتدعین کو کوئی ایسی دلیل پیش کرنی چاہیے جس میں اولیاء کرام کے ہاتھ اور پاؤں چومنے کی اجازت ہو۔

ثانیاً۔ اصول کی کتابوں میں سنت تقریری کی یہ تعریف لکھی ہوئی ہے کہ جو کام آنحضرت ﷺ کے سامنے مسلمان کریں، وہ تقریری سنت ہے،

جب کہ روایت مذکورہ میں ہاتھ پاؤں چومنے والے یہودی تھے، مسلمان نہ تھے، اگر مبتدعین غور کرتے تو اسی حدیث میں ہی اس اصول کا ذکر موجود ہے،

چنانچہ حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہودیوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، جس پر آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ، فما يمنعکم ان تبعونی، پھر تمہیں میری پیروی سے کوئی سی چیز روکتی ہے، اس پر یہودیوں نے کہا کہ

ان داود دعا بان لا یزال من ذریئہ نبی وانا نخاف ان اتبعناک ان تقتلنا یہود،

نسائی ص ۱۶۵ ج ۲۔

داؤد علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ نبوت ہمیشہ ان کی اولاد میں رہے، اور تحقیق ہم ڈرتے ہیں اگر ہم نے آپ کی پیروی کی، تو یہودی ہم کو مار ڈالیں گے۔

مسند احمد ص ۳۳۹ ج ۴، و مستدرک حاکم ص ۹ ج ۱، و بیہقی ص ۱۶۶ ج ۸، و ابن ماجہ ۳۷۰۵ د

ترمذی مع تحفہ ص ۱۳۹ ج ۳، وص ۳۹۹ ج ۴۔

حالانکہ یہ یہود کا کذب اور داؤد علیہ السلام پر افتراء تھا، کیونکہ انہوں نے ایسی کوئی دعا نہ کی تھی، بلکہ یہود تورات میں آپ علیہ السلام کے خاتم النبیین ہونے کا تذکرہ پڑھ چکے تھے، یہود کے اس جھوٹ کو تمام شارحین حدیث بیان کرتے ہیں، دیکھئے مرقاة ص ۱۳۰ ج ۱، و اشعة الممعات ص ۸۳ ج ۱۔

الغرض کسی کافر کے قول و فعل پر نبی کی خاموشی سنت کے زمرہ میں نہیں آتی ورنہ آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہودیوں کی بات کی آنحضرت ﷺ نے تصدیق کر دی تھی کہ داؤد علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی، جو رب نے منظور کر لی، کہ نبوت آل داؤد میں رہے، کیونکہ آپ علیہ السلام نے ہاتھوں کے چومنے کی طرح اس پر بھی خاموشی اختیار کی ہے،

ثالثاً شارحین حدیث نے ایک مزید بہت بھی کہی ہے کہ یہود کے وفد نے جو گفتگو آنحضرت ﷺ سے کی تھی، ان میں تناقض ہے، انہوں نے آپ ﷺ کے نبی ہونے کی تصدیق کی، آپ علیہ السلام نے جب پوچھا کہ پھر ایمان کیوں نہیں لاتے، اس کے جواب میں یہود نے دعا داؤدی کو عذر بنایا، ظاہر ہے کہ یہ کھلا ہوا تناقض ہے، اور یہود اپنی دونوں باتوں میں سے، ایک میں کاذب ہیں، اور روں کو جانے دیجئے خود مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

یہ ان کا خالص افتراء تھا، سارے نبیوں نے ہمارے حضور (ﷺ) کی پیش گوئی کی، داؤد علیہ السلام یہ دعا کیسے مانگ سکتے تھے، تعجب ہے کہ یہ دونوں ابھی حضور کی تصدیق کر چکے اور اب یہ بہتان باندھ رہے ہیں،..... تورات و زبور میں خبر تھی کہ محمد مصطفیٰ (ﷺ) سارے عالم کے نبی ہوں گے، تمام شریعتوں کے ناخ۔

مرآة المناجیح ص ۷۷ ج ۱، طبع نعیمی کتب خانہ گجرات بدون تاریخ۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہود نے اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کذب و افتراء سے کام لیا ہے اور ان کے کلام میں کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے مگر رسول اللہ ﷺ نے ان کے جھوٹ پر کوئی گرفت نہیں کی بلکہ سکوت اختیار کیا ہے۔

اب اگر کوئی مجتہد یہ دعویٰ کر دے کہ چونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو اس افتراء سے منع

نہیں کیا اور نہ ہی کوئی نکیر کی ہے لہذا ثابت ہوا کہ جھوٹ بولنا اور انبیاء علیہم السلام کے مقدس و مطہرہ گروہ پر افترا کرنا جائز ہے، تو ایسے مدعی کو مبتدعین کیا جواب دیں گے، نما کاں جواب کم فہو جوابنا۔

اس کے جواب میں ہم تو اسے بڑے پیار سے کہیں گے کہ نہیں بھائی کسی کافر کے قول و فعل پر نبی کی خاموشی سنت کے زمرہ میں نہیں آتی کیونکہ کفار کے قول و فعل لغو ہوا کرتے ہیں، جہلا کے سامنے خاموشی تعلیم قرآن ہے، ارشاد ہے۔

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا، (الفرقان آیت ۶۳)

اور جب جاہل لوگ ان سے گفتگو کرتے ہیں، تو سلام کہتے ہیں۔ (۶۳-۲۵)

الغرض کافر کے قول و فعل پر نبی کی خاموشی دین میں حجت نہیں ہوتی مگر افسوس کہ مبتدعین کے حکیم الامت کو یہ باتیں کون سمجھائے کہ وہ ہاتھ پاؤں چومنے کو سنت قرار دے رہے ہیں۔

بھائیو! اگر یہ سنت ہے تو پھر مبتدعین کے نزدیک جھوٹ بولنا اور انبیاء کرام علیہم السلام پر افترا کرنا بھی شاید سنت ہی ہو، غالباً اسی سنت یہود پر عمل کرتے ہوئے مفتی صاحب نے، جاء الباطل، میں تقریباً ایک صد کے قریب اپنی طرف سے احادیث وضع کی ہیں، اللہ ہدایت اور سمجھ عطا کرے، آمین۔

چوتھی دلیل

مشکوٰۃ شریف باب يقال عند من حضر الموت بروایت ترمذی و ابوداؤد مروی ہے کہ
عن عائشة قالت قبل رسول الله ﷺ عثمان ابن مظعون و هو ميت .
حضور علیہ السلام نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا حالانکہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔
حاء الباطل ص ۱۳۶۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ بوسہ تو فاضل نے مفضول کا لیا ہے تو یہ حدیث آپ کی دلیل کس طرح بن گئی کیونکہ آپ
کا عمل اور دعویٰ تو ہے مفضول کا فاضل کو بوسہ دینا اور ہاتھ پاؤں چومنا۔
ثانیاً۔ یہ بوسہ زندہ نے مردہ کا لیا ہے تو کیا آپ کے اولیاء جن کی قدم اور دست بوسی کرتے
ہو حالانکہ وہ زندہ ہوتے ہیں کیا وہ اپنی زندگی ہی میں مردہ ہوتے ہیں کہ اس روایت سے استدلال
کر رہے ہو۔

ثالثاً۔ یہ بوسہ تو منہ سے لیا گیا تھا، جیسا کہ الفاظ قبل اس کا قرینہ ہیں کیونکہ عربی زبان میں
مطلق قبل (من التقبل) بولا جائے تو اس سے منہ کا بوسہ لینا مراد ہوتا ہے اور اس معنی کو حدیث کے
الفاظ بھی متعین کرتے ہیں کہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا فرمیں کہ

وهو يبكي حتى سال دموع النبي ﷺ على وجه عثمان، الحديث مشكوة
ص ۱۴۱ ج ۱۔

اس کا معنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں
وآنحضرت گریہ میکرد تا آنکہ روان شد اشکهای پیغمبر ﷺ را بر روی
عثمان۔

یعنی (جب بنی ﷺ نے ان کا بوسہ لیا تو) آپ رونے لگے یہاں تک کہ آپ کے آنسو ٹپک
کر عثمان بن مظعون کے چہرے پر گرے، اشعة الممعات ص ۷۰۶ ج ۱،
منہ پر آنسو تب ہی گر سکتے ہیں جب بوسہ بھی منہ سے لیا ہو۔

قارئین کرام جب آپ نے اس بات کو بخوبی جان لیا کہ آنحضرت ﷺ نے عثمان بن مظعون کا بوسہ منہ سے لیا تھا! سوال یہ ہے کہ آیا مبتدعین بھی اپنے اولیاء اور گدی نشین حضرات کا منہ چومتے ہیں اگر چومتے ہیں (جن میں اکثریت عورتوں کی ہوتی ہے) تو یہ انہیں مبارک ہو۔

اگر منہ کو بوسہ نہیں دیتے تو یہ حدیث انکی دلیل کس طرح بن گئی۔

رابعاً۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد مومن کی میت پاک ہوتی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کسی پلید و نجس چیز کا بوسہ قطعاً نہ لیتے تھے، بلکہ پاکیزہ چیز کو ہی استعمال کرتے تھے اور پاک و طاہر کو ہی مس کرتے تھے، مگر افسوس کہ مبتدعین میت کے نجس و پلید ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

خامساً۔ اس کی سند میں عاصم بن عبید اللہ، راوی ہے، ابوداؤد مع عون ص ۳۷۱ ج ۳، و ترمذی مع تحفہ ص ۱۳۰ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۱۰۶، و مستدرک حاکم ص ۳۶۱ ج ۱، و بیہقی ص ۴۰۷ ج ۳، و ابن عدی ص ۱۸۶۷ ج ۵۔

اور یہ شدید قسم کا ضعیف راوی ہے امام مالک پہلے اس سے روایت کرتے تھے پھر اسے ضعیف قرار دے دیا، امام یحییٰ فرماتے ہیں ضعیف ہے اس سے احتجاج نہ کیا جائے، امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ کثیر الوہم اور فاش خطائیں کرتا ہے، امام ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ شیوخ اس کی روایت سے بچتے تھے امام نسائی اور امام ابن عدی نے ضعیف کہا ہے، امام ابوزرہ اور ابوحاتم نے منکر الحدیث اور دارقطنی نے متروک کہا ہے، میزان الاعتدال ص ۳۵۴ ج ۲۔

کوئی کلمہ توثیق راقم کی نظر سے نہیں گزرا بلکہ امام هشام فرماتے ہیں

لا ینخرج الدجال و واحد من ہولاء حی۔

یعنی دجال کا خروج ممکن نہیں جب کہ اس ٹیم سے ایک (عاصم) زندہ موجود ہے، تہذیب

ص ۴۹ ج ۵۔

الفرض یہ روایت ضعیف ہونے کے علاوہ مفتی صاحب کی دلیل بھی نہیں، تفصیل پہلے عرض کر

دی گئی ہے۔

پانچویں دلیل

شفا شریف میں ہے جس منبر پر حضور علیہ السلام خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ لگا کر منہ پر رکھتے تھے (چومتے تھے) جاء الباطل ص ۳۶۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی آنحضرت ﷺ سے والہانہ محبت و عقیدت تھی، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان میں محبت رسول اور اتباع کا جذبہ ڈال دے، مگر اس سے مفتی صاحب کا استدلال چند وجوہ سے باطل ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ثانیاً۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ منبر پر ہاتھ پھیر کر منہ پر رکھتے تھے، آگے جو مفتی صاحب نے بریکٹ میں اس کی تفصیل، چومتے تھے، بیان فرمائی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ اثر کے الفاظ ہیں، ثم يضعها علی وجهه، جاء الباطل ص ۳۶۹ ج ۱۔

اور، وضع، کا معنی رکھنا ہوتا ہے چومنے کیلئے عربی زبان میں، قبل، ثم، استسلم، وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمر منبر سے آثار نبوی کی وجہ سے تبرک حاصل کرتے تھے، مبتدعین کی طرح چومتے چانتے نہ تھے۔

ثالثاً۔ منبر تو آثار نبوی میں سے تھا، اور آثار نبوی سے تبرک کے ہم بھی قائل ہیں، اس سے ہمیں انکار نہیں، لیکن اس سے کسی بڑے یا پیر یا ولی یا استاذ وغیرہ کے ہاتھ چومنے کا استدلال غلط ہے کیونکہ منبر بہر حال لکڑی کا تھا، جو ایک بے جان چیز ہے مگر آپ کا دعویٰ جاندار لوگوں کے ہاتھ چومنے کا ہے، لہذا دلیل بھی جاندار چیز کی بالخصوص انسان کی دیجئے کہ اللہ کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اولیاء کرام کے ہاتھ پاؤں چومنے کی اجازت یا حکم فرمایا ہو۔

افسوس کہ مفتی صاحب اصل موضوع کی طرف تو آتے ہی نہیں ادھر ادھر کی غیر متعلقہ بھرتی کر کے داد تحسین حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ عوام یہ خیال کریں کہ لوجی ہمارے حکیم الامت اور مفتی صاحب نے اس قدر دلائل عنایت فرمائے ہیں، لہذا اپنے اکابرین کے ہاتھ پاؤں چومنے چاہئیں ان کے آگے عاجزی و انکساری سے پیش آنا چاہیے کون پوچھنے والا ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔

بس مفتی صاحب نے کوئی عربی عبارت نقل کر کے کہہ دیا کہ اس سے ہمارا فلاں مسئلہ ثابت ہوتا ہے، بدعت پسند پارٹی نے اسے پلے باندھ لیا اور اسے اہل سنت کی علامت قرار دیکر منکرین کو وہابی کا لقب دیا اور ساتھ یہ مشہور کر دیا کہ یہ لوگ تو گستاخ ہیں ان کا کہنا نہ ماننا، انا للہ۔ اس طرح کے مفتی صاحب نے جس قدر دلائل نقل کیئے ہیں ان کا تعلق زیر بحث مسئلہ کی بجائے آثار نبوی کے تبرکات سے ہے، ان کا اصولی جواب تو ہم نے دے دیا ہے کہ ہم آثار نبوی سے تبرکات کے قائل ہیں لیکن پھر بھی ہم آگے، مفتی صاحب کا اصل موضوع سے فرار، کے زیر عنوان انہیں نقل کر کے ان پر تبصرہ کیئے دیتے ہیں، واللہ علی کل شئی قدير، وهو یهدی الی السبیل۔

رابعاً۔ مذکورہ تمام جوابات بصورت تسلیم ہم نے عرض کیئے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ قاضی عیاض کی تالیف، شفا شریف، میں اسناد نہیں ہیں، لہذا ان کے مجرد لکھنے سے بات ثابت نہیں ہو سکتی، الغرض اس کی صحیح سند پیش کرنا مبتدعین پر ادھار ہے، امام محمد بن عاصم الاصبھانی المتوفی ۲۶۲ھ نے صحیح سند سے ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ امام نافع فرماتے ہیں کہ،
ان ابن عمر کان یکرہ مس قبر النبی ﷺ۔

یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ قبر نبوی (ﷺ) کو مس کرنے کو مکروہ جانتے تھے، جزء محمد بن عاصم صفحہ ۱۰۶، رقم الحدیث ۲۷، طبع دارلعاصمہ الریاض۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام دارالہجرت فقیہ امت حضرت امام مالکؒ نے منبر کو چومنا بھی بدعت قرار دیا ہے، مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۷۹ ج ۲۔

مفتی صاحب کا اصل موضوع سے فرار

راقم کو جہاں تک معلوم ہے اہل سنت میں کسی نے بھی تبرکات نبوی سے حصول برکت کا انکار نہیں کیا، جس کی پوری تفصیل، کفنی والفی، کی بحث میں پہلے عرض کر دی گئی ہے، پھر نامعلوم کہ مفتی صاحب تبرکات نبوی کی روایات کو درمیان میں کیوں گھسیٹ لائے ہیں، اگر ان روایات سے مفتی صاحب کا مقصود اہل حدیث کا رد کرنا ہے کہ یہ لوگ تبرکات نبوی سے حصول برکت کے منکر ہیں تو یہ

ان کا افترا ہے یا کم از کم اسے ہم وہم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

کیونکہ ہمارا دامن اس افترا سے پاک ہے، ہم الحمد للہ تبرکات نبوی سے حصول برکت کے قائل ہیں، دور حاضر کے محدث اور سلفی جماعت میں چوٹی کے محقق علامہ ناصر الدین محدث البانی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

نبی کریم ﷺ کے آثار کے ساتھ تبرک مشروع ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس تبرک کو آپ کی حیات مبارکہ میں حاصل کیا اور آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہ فرمایا، التوسل انواعہ و احکامہ ص ۱۷۸ مترجم۔

اگر مفتی صاحب کا ان روایات کو نقل کرنے سے اولیاء کرام کے آثار سے تبرک حاصل کرنے کا جواز پیدا کرنا ہے، تو یہ محل نظر ہے، کیونکہ یہ بے دلیل دعویٰ ہے، جو قابل قبول نہیں اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو وہ کسی آیت قرآنی یا حدیث نبوی سے اپنے دعویٰ کو ثابت کریں یا کم از کم جن کے یہ مقلد ہیں ان (ابو حنیفہ) سے ہی اس کا ثبوت دیں کہ آثار نبوی پر اولیاء کرام کے آثار کو قیاس کر کے ان سے تبرکات حاصل کیئے جاسکتے ہیں، یقین جانئے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اور مبتدعین کے اکابر سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس پر کوئی دلیل نہیں لاسکتے، فان لم تفعلوا و لن تفعلوا۔

امام احمد بن حنبلؒ پر افترا

باقی رہا مفتی صاحب کا امام احمد بن حنبلؒ سے یہ نقل کرنا کہ انہوں نے قبر نبوی کو چومنے کا فتویٰ دیا ہے، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

شرح بخاری لابن حجر پارہ ششم ص ۱۵ میں لکھا ہے کہ ارکان کعبہ کے چومنے سے بعض علماء نے بزرگان دین وغیرہم کے تبرکات کا چومنا ثابت کیا ہے، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ حضور علیہ السلام کا منبر یا قبر انور چومنا کیسا ہے؟ فرمایا کوئی حرج نہیں، جاء الباطل ص ۳۶۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس حکایت کو نقل کر کے حافظ ابن حجر نے لکھا تھا کہ

واستبعد بعض اتباعه صحة ذلك.

یعنی امام احمد بن حنبلؒ کے بعض پیروکاروں نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔ فتح الباری ص ۳۷۳ ج ۳، باب من لم يستلم الالركنين اليمانيين.

اس سے ثابت ہوا کہ ان کے مقلدین نے اس نقل کی صحت کو مشکوک قرار دیا ہے، مگر مفتی صاحب نے مطلب کی عبارت تو نقل کر دی مگر آگے اس کی تردید کو بغیر ذکر کے ہضم کر گئے۔

ثانیاً۔ حافظ ابن حجرؒ چھٹی صدی ہجری کے ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ کی وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی تھی، تھذیب ص ۶۵ ج ۱، درمیان میں تقریباً اڑھائی صدیوں کا ایک طویل زمانہ محیط ہے، تو ہم حافظ صاحب کی نقل پر کیسے یقین کر لیں جب کہ وہ خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے مقلدین نے اس قول کی صحت کو مشکوک قرار دیا ہے۔

ثالثاً۔ خود حافظ ابن حجرؒ نے اسے صیغہ تریض سے نقل کیا ہے کہ، فنقل عن الامام احمد، یعنی امام احمدؒ سے یہ نقل کیا گیا ہے، (فتح الباری) یہ نقل کرنے والا کون ہے، ثقہ ہے یا غیر ثقہ، تفصیل نادارند۔ رابعاً۔ اس روایت کے معتبر ہونے کی اگر حافظ ابن حجرؒ کے پاس بھی کوئی دلیل ہوتی تو وہ اسے ضرور نقل کر کے امام احمد بن حنبلؒ کے مقلدین کی تردید کرتے اور بالجزم اس قول کو امام احمد بن حنبلؒ کی طرف منسوب کرتے، مگر ایسا انہوں نے بھی نہیں کیا، معلوم ہوا کہ خود حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک بھی اس قول کی صحت مشکوک ہے۔

خامساً۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ قبر نبویؐ کو چھونا مکروہ سمجھتے تھے۔ اور امام احمد بن حنبلؒ جو مجتہد اور آثار صحابہ کرام سے واقف ہیں یہ ویسے ہی بعید ہے کہ وہ عمل صحابہ کے برعکس کوئی فتویٰ دیں

سادساً۔ مگر ان تمام حقائق کے برعکس مفتی صاحب پھر بھی اس قول کو نقل کر کے خصم کو حجت باور کراتے ہیں، لیکن اس کے ضعف والی عبارت کو جان بوجھ کر چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ روضہ اقدس چومنا بریلوی مذہب میں بھی جائز نہیں مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے کہ زیارت روضہ انور سید اطہر

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا تفاسیر کے حوالے سے یہ لکھنا کہ بنی اسرائیل کیلئے اس میں یہ یہ تھا اور وہ اس کے ساتھ ایسا ویسا کرتے تھے، تو یہ سرے سے قابل التفات ہی نہیں کیونکہ یہ تمام چیزیں اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو اس کا ثبوت کسی مرفوع حدیث سے دیں، مجھے میری زندگی کے مالک کی قسم ہے، پوری دنیا کے منکرین سنت اس پر گھٹنے ٹیک جائیں گے، مگر ثبوت فراہم نہیں کر سکیں گے ان شاء اللہ۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ حکایت ہے قرآن کے کسی لفظ کا معنی نہیں ہے کہ مفسرین کے اقوال حجت ہوں، الغرض یہاں نقل معتبر کی ضرورت ہے، چنانچہ خود مفتی صاحب فرماتے ہیں

اب تفسیر قرآن کے چند مرتبے ہیں، تفسیر بالقرآن یہ سب سے مقدم ہے اس کے بعد تفسیر قرآن بالا حدیث، کیونکہ حضور علیہ السلام صاحب قرآن ہیں، ان کی تفسیر نہایت ہی اعلیٰ، پھر قرآن کی تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول سے خصوصاً فقہاء صحابہ اور خلفائے راشدین کی تفسیر، رہی تفسیر قرآن تابعین یا تبع تابعین کے قول سے، یہ اگر روایت سے ہے تو معتبر ورنہ غیر معتبر۔ جاء الباطل ص ۱۱۰ ج ۱۔

ثالثاً۔ قرآن سے فقط یہی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے طالوت کی بادشاہی کیلئے ایک صندوق بطور نشانی مقرر کیا جس میں ال موسیٰ و ہارون علیہ السلام کا ترکہ تھا، چنانچہ مجدد ملت بریلوی مولوی احمد رضا خاں ان آیات کا معنی کرتے ہیں۔

اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے تمہارے پاس تابوت جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کو چین ہے، اور کچھ بچی ہوئی چیزیں معزز موسیٰ اور معزز ہارون علیہ السلام کے ترکہ کی اٹھائے لائیں گے اسے فرشتے، بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر ایمان رکھتے ہو، کنز الایمان ص ۶۰، طبع محمود اینڈ کمپنی بمبئی۔

اب دیکھئے اس میں صندوق کے آنے اور اس کو طالوت کی بادشاہی کی نشانی تو قرآن نے قرار دیا ہے لیکن اس سے اگلے مضمون سے قرآن خاموش ہے، لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ وہ اس سے مصائب و لڑائی کے وقت امداد طلب کرتے تھے، صریحاً قرآن پر افتراء ہے۔

پھر اس طلب امداد سے اولیاء کرام کے تبرکات کی تعظیم ثابت کرنا اور بال و لباس کو اس میں

شامل کرنا، پہلے سے بھی بڑھکر جھوٹ اور قرآن پر بہتان ہے۔

کاش مبتدعین قرآن میں ہیرا پھیری کے رویہ کو ترک کر کے حسب ذیل آیت کی وعید شدید کو نگاہ میں رکھیں

فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا ليضل الناس بغير علم ان الله لا يهدي القوم الظالمين. الانعام آیت ۱۴۴۔

تو اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے تاکہ از راہ بے دانشی لوگوں کو گمراہ کرے کچھ شک نہیں کہ خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۶-۱۴۴)

فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا او كذب بايثه. (الاعراف آیت ۳۷)
تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔
(۷-۳۷)

فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا او كذب بايثه انه لا يفلح المجرمون.
(یونس ۷۷)

تو اس سے بڑھکر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے اور اس کی آیتوں کو جھٹلائے بے شک (ایسے) مجرم فلاح نہ پائیں گے۔ (۱۰-۱۷)

اس مضمون کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے، الکھف آیت ۱۵، الانعام آیت ۳۹ و ۲۱، ہود آیت ۱۸، العنکبوت آیت ۶۸، اور سورة الصف آیت ۷، وغیرہ میں بھی بیان فرمایا ہے، لیکن ان آیات بینات کے باوجود مفتی صاحب ایسے دلیر و جری واقع ہوئے کہ وہ رطب و یابس تفاسیر کے اقوال کو بھی حکم قرآنی اور فرمان الہی کہنے میں کوئی عار اور ننگ محسوس نہیں کرتے تھے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھنے سے ہی عاری تھے، ورنہ مسلمان کی شان سے ہی ان کا صدور بعید ہے۔

رابعاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقعی بنی اسرائیل ایسا ہی کرتے تھے جیسا کہ مفتی صاحب فرماتے ہیں، تو تب بھی قوم یہود کا کوئی فعل ہم پر حجت نہیں کیونکہ یہ پہلی شرائع کا مسئلہ ہے، اور شریعت محمدیہ میں ایسا ثابت نہیں۔

اس اصول کا مبتدعین کو بھی اعتراف ہے، مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی فرماتے ہیں کہ

یہ شریعت سابقہ ہے ہم پر حجت نہیں، تبیان القرآن ص ۱۴۷ ج ۲ بعض لوگ عورت کی سربراہی کے جواز پر ملکہ بلقیس کے واقع سے استدلال کرتے ہیں، ان کو جواب دیتے ہوئے سعیدی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ شریعت سابقہ ہے، ہم پر حجت نہیں ہے، تبیان القرآن ص ۶۵۸ ج ۲۔

خلط بحث کی ایک اور مثال

فرماتے ہیں کہ تفسیر خازن مدارک و روح البیان و کبیر سورة یوسف پارہ ۱۲
زیر آیت، فلما ذهبوا به۔

کہ جب یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کے ساتھ بھیجا تو ان کے گلے میں ابراہیم علیہ السلام کی قمیض تعویذ بنا کر ڈال دی تاکہ محفوظ رہیں۔ جاء الباطل ص ۳۷۰ ج ۱۔
الجواب

اولاً۔ تفاسیر میں یہ واقعہ، وروی، کے الفاظ سے منقول ہے دیکھئے مدارک ص ۳۵۷ ج ۲، و کشف ص ۴۵۰ ج ۲۔

اس حکایت کو بیان کرنے والا کون ہے، کتب تفاسیر میں اس کا کوئی اتنا پتا نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں مجھول لوگوں سے دین لینے کا مکلف نہیں ٹھہرایا، بات اگر قرآن اور حدیث صحیحہ سے ثابت ہوتی تو ہم ضرور قبول کر لیتے، مگر مذکورہ دلیل جو مفتی صاحب نے خصم کو حجت باور کرائی ہے وہ قرآن و حدیث تو کجا کسی صحابی و تابعی کا قول بھی نہیں بلکہ اسے بیان کرنے والا اور خبر دینے والا ہی غیر معلوم ہے تو ہم اسے عقیدہ کے معاملہ میں کیسے تسلیم و قبول کر لیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قمیض کو حضرت یوسف علیہ السلام کے گلے میں تعویذ بنا کر ڈالی تھی جب کہ ہمارے پیارے اور محبوب رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے تو فرمایا ہے کہ جس نے تعویذ لٹکایا اس نے (اللہ تعالیٰ کے ساتھ) شرک کیا۔

حضرت عقبہ بن عامر الجعفی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ اقبل إلیه رهط فبايع تسعة و امسک عن واحد فقالوا، یا رسول اللہ ﷺ بايعت تسعة و ترکت هذا؟ قال ان علیہ تمیمة فادخل یدہ فقطعها

فبايعه، وقال من علق تميمة فقد اشرك.

یعنی ایک وفد دس افراد پر مشتمل رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ علیہ السلام نے نو سے تو بیعت لے لی اور ایک کی بیعت سے ہاتھ روک لیا، تو ان (نو) نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے نو سے تو بیعت لے لی ہے اور اس شخص کو چھوڑ دیا ہے، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا اس کی (گردن) پر تعویذ ہے، چنانچہ اس شخص نے اپنا ہاتھ (گریبان) میں داخل کیا اور تعویذ کو کاٹ کر (پھینک دیا) تو آپ نے بیعت لی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے تعویذ ڈالا اس نے شرک کیا۔

مسند امام احمد ص ۱۵۶ ج ۴، و مستدرک حاکم ص ۲۱۹ ج ۴، واللفظ لہ۔

علامہ حیشی فرماتے ہیں اس کو طبرانی نے بھی روایت کیا ہے اور مسند احمد کی روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ مجمع الذوائد ص ۱۰۶ ج ۵۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ

عن عقبة بن عامر الجهني عن النبي ﷺ قال من تعلق تميمة فلا اتم الله عليه
و من تعلق ودعة فلا ودع الله له.

جو شخص تعویذ لٹکاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کو پورا نہ کرے اور جو شخص پیسی (کا گڈ) لٹکائے اللہ اسے آرام نہ دے۔

مسند ابو یعلیٰ ص ۳۱۱ ج ۲، و مسند احمد ص ۱۵۴ ج ۴، و مستدرک حاکم

ص ۴۱۷ ج ۴ و ص ۲۱۶ ج ۴، و بیہقی ص ۳۵۰ ج ۹، و ابن حبان (رقم الحديث

۶۰۵۴) و طبرانی کبیر ص ۲۹۷ ج ۱ (۸۲۰) و ابن عدی ص ۲۴۶۰ ج ۶۔

اس صحیح حدیث کے بالمقابل مفتی صاحب کا ایک من گھڑت قصہ (جو افسانہ سے زیادہ وقعت

نہیں رکھتا)، سے تعویذ کا اثبات کرنا، پھر تعویذ سے تبرکات کا استدلال کرنا شاید مبتدعین میں کوئی

اہمیت رکھتا ہو، جو خیر سے انہیں جیسے خرافات کے مجموعہ کا نام بریلویت ہے، لیکن اہل علم میں ایسے

بیانات پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔

ثانیاً۔ اس مجھول اور بے سند قصہ کے کس لفظ کا معنی ہے کہ اولیاء کرام اور بزرگان دین کے

ہاتھ پاؤں چومنے چاہیئے اور ان کے لباس وغیرہ کو سنبھال کر رکھنا چاہیئے اور مصیبت و دکھ کے وقت ان سے امداد طلب کرنا چاہیئے، اگر یہ چیزیں ثابت ہی نہیں تو مبتدعین بریلویہ کی یہ دلیل کیسے بن گئی۔

ثالث۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ پہلی شرائع کا کوئی حکم و عمل بدون تائید شریعت محمدیہ علیہ التحیۃ والسلام قابل قبول نہیں۔ علاوہ ازیں بے سند واقعہ ناقابل حجت ہوتا ہے، جیسا کہ آگے اذان میں انگوٹھے چومنے کی بحث، میں علمائے بریلویہ کا اعتراف، کے زیر عنوان مبتدعین کے اکابرین کی ہم نے عبارات نقل کی ہیں۔

آب زم زم سے استدلال

فرماتے ہیں سارے پانی رب نے پیدا کیئے ہیں مگر آب زم زم کی تعظیم اس لئے ہے کہ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قدم شریف سے پیدا ہوا۔ جاء الباطل ص ۷۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ تعظیم سے مفتی صاحب کی کیا مراد ہے؟ اگر اس کا مقصود یہ ہے کہ اس سے حاجات کو طلب کیا جائے، اور مصیبت و دکھ کے وقت اس کو مشکل کشا جان کر میدان جنگ میں لایا جائے، تو اس تعظیم سے اسلام کا دامن صاف ہے، شاید فرقہ رضا خانی اس کا قائل ہو، اور اگر تعظیم سے مطلب یہ ہے کہ ایک نبی کا معجزہ جان کر اور بابرکت و پاکیزہ یقین کر کے استعمال کرنا چاہیئے تو اس پر الحمد للہ ہمارا عمل ہے۔

ثانیاً۔ معلوم نہیں کہ اس سے تبرکات اولیاء کو کیا نسبت ہے، اور انکی قدم بوسی کو کیا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ آب زم زم تو ایک پینے کی چیز ہے، جب کہ اولیاء کرام کھانے پینے کی چیزیں نہیں کہ پانی پر انہیں قیاس کر لیا جائے۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ آب زم زم حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قدم شریف سے پیدا ہوا الخ، یہ عبارت فرقہ بریلویہ کے حکیم الامت مفتی اعظم اور مفسر قرآن وغیرہ کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آب زم زم جبرائیل علیہ

السلام نے اپنا پر یا پاؤں زمین پر مار کر نکالا تھا، حدیث کے الفاظ ہیں
 فاذا هی بالملک عند موضع زم زم فبحث بعقبه او قال بجناحه الحدیث عن
 ابن عباس رضی اللہ عنہ، بخاری شریف کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی
 المشی. ص ۷۵ ج ۱.

رابعاً۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مفتی صاحب نے جبرائیل علیہ السلام کی بجائے حضرت اسماعیل علیہ
 السلام کا نام جان بوجھ کر لکھ دیا ہو کیونکہ بقول مفتی صاحب انہوں نے بخاری کی شرح بھی تحریر کی
 ہے۔ جاء الباطل ص ۲۵۸ ج ۲۔

واضح رہے کہ شرح تحریر کرتے وقت اس حدیث کو بھی پڑھا ہوگا، جس کی شرح بھی کی ہوگی
 لیکن اس کے باوجود مفتی صاحب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاؤں سے پانی کو جاری ہونے کا
 فرما رہے ہیں، بلکہ تفسیر میں تو فرماتے ہیں وہ (اسماعیل) روتے میں اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑ رہے
 ہیں جس سے شیریں پانی کا چشمہ جاری ہے، بہت خوش ہوئیں اور اس کے گرد مٹی جمع کر کے فرمانے
 لگی اے پانی ٹھہر ٹھہر، تفسیر نعیمی ص ۶۹۲ ج ۱۔

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب صحیح حدیث سے انکار کسی ذاتی عقیدہ کے اثبات کیلئے کر
 رہے ہیں اور وہ عقیدہ ہے انبیاء کرام کا، تصرف فی الامور، کا، اور یہ بھی کہ اسے آثار انبیاء کہہ کر اس
 کی تعظیم سے اولیاء کے تبرکات سے حصول برکت کا عقیدہ ثابت کیا جائے، مگر تاڑنے والے بھی
 قیامت کی نظر رکھتے ہیں ان کی ہیرا پھیریاں کون پلے باندھتا ہے۔

مقام ابراہیم علیہ السلام کو مصلیٰ بنانے سے استدلال

فرماتے ہیں، مقام ابراہیم پتھر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت ہوئی تو اس کی عزت
 یہاں تک بڑھ گئی کہ رب تعالیٰ نے فرمایا

واتخذوا من مقام ابراہیم مصلیٰ.

سب کے سرادھر جھکا دیئے۔ جاء الباطل ص ۷۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ کسی جگہ کو عبادت کیلئے مخصوص کرنے سے تبرکات کو کیا نسبت ہے، کیونکہ عبادت تو رب تعالیٰ کی ہوتی ہے اور جگہ کی تعظیم بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعظیم ہوتی ہے جیسے مسلمان قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان کعبہ کی عبادت کرتے ہیں اسی طرح مقام ابراہیم پر نماز کو ادا کرنا اس کی عبادت و تعظیم نہیں بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہی عبادت و تعظیم ہے کیونکہ مقام ابراہیم تو ایک پتھر ہے اور مسلمان کسی پتھر کی عبادت نہیں کرتے۔

ثانیاً۔ اولیاء کے ہاتھ پاؤں اور ان کے تبرکات کو تعظیم کیلئے چوما جاتا ہے اس لئے مقام ابراہیم پر اس کا قیاس درست نہیں۔

ثالثاً۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں، بعض نے مواقف حج، بعض نے عرفات و مزدلفہ، بعض نے سارا حرم، بعض نے خانہ کعبہ مراد لیا ہے۔

دیکھئے تفسیر ابن کثیر ص ۱۶۸ ج ۱۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنائیں، تب یہ آیت اتری، بخاری ص ۶۴۲ ج ۲، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مقام ابراہیم کو جائے نماز بنانے کا حکم ربانی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے بھی حجۃ الوداع میں طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز نفل ادا فرمائے تھے۔ بخاری ص ۵۷ ج ۱، معلوم ہوا کہ یہاں دو رکعت نماز نوافل ادا کرنا سنت خیر الانام ﷺ ہیں، تفصیل کیلئے مرعاۃ ۹۰ ج ۹ دیکھئے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک تو یہ دو رکعت واجب ہیں، بہار شریعت ص ۱۷ حصہ ششم جلد اول، و مبسوط للسرحدی ص ۱۲ ج ۴ و البحر الرائق ص ۳۳۱ ج ۲ و فتاویٰ عالمگیری ص ۳۳۶ ج ۱، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز ادا کرنی حج کے افعال سے ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ یہ مقام ابراہیم کے ساتھ ہی خاص ہے جیسا کہ حج میں طواف کیا جاتا ہے اور یہ بیت اللہ کے ساتھ ہی خاص ہے، کعبہ کے طواف پر کسی چیز کو قیاس کر کے اس کا طواف کرنا درست نہیں، ایسے ہی مقام ابراہیم پر کسی کو قیاس نہیں کر سکتے،

مکرر جلوت و خلوت میں غور کیجئے اور مفتی صاحب کی دلیل کو قرآن سے نکال کر دیکھئے کہ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۲۵ میں جہاں مقام ابراہیم کو جائے نماز بنانے کا حکم ہے اسی مقام پر ہی بیت اللہ کا طواف کرنے کا بھی حکم موجود ہے، اگر مقام ابراہیم پر مفتی صاحب کا قیاس درست تسلیم کر لیا جائے، تو لازم آئے گا کہ تمام مساجد بلکہ قبور اولیاء کا بھی طواف کر لیا جائے، حالانکہ مبتدعین بھی یہ بات تسلیم کرنے کو قطعاً تیار نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ طواف کعبہ، بیت اللہ سے خاص ہے، اسی طرح مقام ابراہیم کا معاملہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قسم سے استدلال

فرماتے ہیں۔ مکہ معظمہ کو حضور علیہ السلام سے نسبت ہوئی تو رب تعالیٰ نے اس کی قسم فرمائی لا اقسم بهذا البلد و انت حل بهذا البلد۔ نیز فرمایا، وهذا البلد الامین، جاء الباطل ص ۱۳۷ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قسم کو اولیاء کرام کے تبرکات سے کیا نسبت ہے؟ ذرا اس کی وضاحت تو کیجئے۔

ثانیاً۔ اگر یہ قسم مکہ کی تعظیم کیلئے ہے تو آگے ہی تمام بنی آدم کی قسم کھائی ہے

و والد وما ولد (البلد آیت ۳)

یعنی قسم ہے تیرے والد (آدم) اور اس کی اولاد کی (۹۰-۳)

ثالثاً۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے فعل سے بنی آدم کا فعل ثابت کرنے کی فضول کوشش کی ہے،

کیونکہ وہ تو مختار کل ہے، جو چاہے کر لے، اسے کون پوچھنے والا ہے، لایسل و ہم یسلون۔ جب کہ انسان شریعت کا مکلف و پابند ہے، لہذا بندوں کے فعل کیلئے اللہ تعالیٰ کے فعل سے اثبات کرنا غلط ہے، دیکھئے اسی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی قسم کھائی ہے، حالانکہ انسان کی قسم اٹھانے کی شریعت نے ممانعت کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال ألا ان الله ينهاكم ان تحلفوا بأبائكم من كان حالفا

فلیحلف باللہ او لیصمت۔

بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آگاہ رہو اللہ تعالیٰ نے اس چیز سے منع فرمایا ہے کہ تم اپنے آباء کی قسمیں اٹھاؤ اور جو شخص تم میں سے قسم اٹھانے والا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔ بخاری ص ۹۸۳ ج ۲ و مسلم ص ۴۶ ج ۲ و مشکوٰۃ ص ۲۹۶۔

اب اگر کوئی مجھوں یہ کہہ دے کہ چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے آباء کی قسمیں اٹھاؤ ہیں تو ہمیں اٹھانے میں کیا مذاقہ ہے، تو ایسے مدعی کو ہر صاحب علم پاگل کہے گا، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم سے اولیاء کرام کے تبرکات کو چومنے کا استدلال غلط ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال

فرماتے ہیں۔ ایوب علیہ السلام سے فرمایا

ارکض برجلک هذا مغتسل بارد و شراب۔

ایوب علیہ السلام کے پاؤں سے جو پانی پیدا ہوا وہ شفا بنا معلوم ہوا کہ نبی کے پاؤں کا دھون عظمت والا اور شفا ہے۔ جاء الباطل ص ۷۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ بات کو آگے لے جانے سے قبل آئیے پہلے قرآن سے اس آیت کو ملاحظہ کریں، رب قدیر فرماتا ہے

واذ کر عبدنا ایوب اذ نادى ربه انى مسنى الشيطان بنصب و عذاب۔ ارکض برجلک هذا مغتسل بارد و شراب۔ (ص آیت ۴۱ و ۴۲)

اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ (بارالہا) شیطان نے مجھ کو ایذا اور تکلیف دے رکھی ہے (ہم نے کہا کہ زمین پر) لات مارو (دیکھو) یہ (چشمہ نکل آیا) نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو (شیریں) (۳۸-۴۱-۴۲)

معلوم ہوا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو بیماری نے گھیر رکھا تھا جس پر انہوں نے اپنے مولیٰ حقیقی سے دعا و التجا کی کہ میرا یہ دکھ اور تکلیف دور کر دے تب مولیٰ کریم جو رحیم و حلیم ہے کی طرف

سے یہ حکم ملا اپنی لات کو زمین پر مار، تب زمین سے چشمہ پھوٹ پڑا جس میں غسل کرنے سے آپ کی ساری بیماری جاتی رہی، اب ایمان سے کہنا کہ اس بات کو مبتدعین کے عمل ہاتھ و پاؤں چومنے کا جواز کیسے ثابت ہو گیا۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ نبی کے پاؤں کا دھوون عظمت والا شفا ہے الخ، اس آیت سے ان کا استدلال غلط ہے کیونکہ وہ پانی پاؤں کا دھوون بنا ہی نہیں تھا، بلکہ فقط پیر مارنے سے، چشمہ ابل پڑا تھا۔

ثالثاً۔ یہ حضرت ایوب علیہ السلام کا معجزہ تھا اور معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے جسکی پوری تفصیل شرح و بست کے ساتھ دین الحق میں عقائد کے حصہ میں راقم نے کر دی ہے، لیکن حضرت ایوب علیہ السلام کا تو نام لیکر رب قدیر نے شفا کو اپنی جانب منسوب کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَيُّوبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهُ اِنِّىْ مُسْنٰى الضَّرِّ وَ اِنَّتَ اَرْحَمُ الرَّحِمِیْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَاَتَيْنَاهُ اَهْلَهُ وَ مَثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرًا لِّلْعٰبِدِیْنَ۔ الْاَنْبِیَآءِ ۸۳ و ۸۴۔

اور ایوب کا ذکر بھی سناؤ جب اس نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں سخت مصیبت میں ہوں اور تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے پس اس کی دعا کو ہم نے قبول کیا اور جو اس کو تکلیف تھی سب دور کر دی اور اس کو اس کا عیال دیا اور محض اپنی مہربانی سے اور عابد لوگوں کو نصیحت کیلئے ان کے ساتھ اور بھی دیا۔ (ثنائی) ۲۱-۸۳ و ۸۴)

دیکھئے اس آیت کریم میں صحت اور مال و اولاد و کی فراوانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، مگر مفتی صاحب اس بیان پر عدم اعتماد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی کے پاؤں کا دھوون (وہ پانی جس میں کوئی چیز دھوئی گئی ہو) عظمت والا اور شفا ہے۔

اس بیان سے وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو ایسے پانی سے شفا ملی تھی جس میں انہوں نے اپنے پاؤں کو دھویا تھا، اس بیان کو وہ بنیاد بنا کر عوام کو پیر پرستی کا درس دے رہے ہیں کہ ان لوگوں کے تبرکات سے شفا حاصل کرو، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ مگر کوئی پوچھنے والا

نہیں کہ حضرت جی اگر ایوب علیہ السلام کے اختیار میں شفا اور پاؤں کے دھوون میں بیماری کا علاج تھا تو بار بار اپنے رب سے دعا و التجا کی ضرورت پیش کیوں آئی؟

افسوس تو اس بات کا ہے کہ مبتدعین کے اکابرین اپنے دینی حلقہ میں سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں، یہ جو بیان بھی جاری کریں اسے عوام آنکھیں بند کر کے قبول کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔
 رابعاً۔ بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ پاؤں کے دھوون سے ہی شفا ہوئی تھی، تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ شفا اللہ نے نہیں دی بلکہ پاؤں کے دھوون سے ہوئی تھی، ہر روز لوگ حکیموں سے دوا لیتے ہیں، تو کیا شفا دوا دیتی ہے، یا من جانب اللہ ہوتی ہے، یقیناً من جانب اللہ ہوتی ہے کیونکہ دوا میں شفا ڈالنے والا مالک حقیقی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب دوا مریض کے مرض کو پہنچ جاتی ہے، تو اللہ کے حکم سے مریض اچھا ہوتا ہے، صحیح مسلم ص ۲۲۵ ج ۲ مشکوٰۃ ص ۳۸۷۔

باب عبدالنبی اور عبدالرسول وغیرہ نام رکھنے کی بحث

اسلام ایک مکمل و اکمل دین ہے جس نے انسان کو ہر بات کی تمیز اور سلیقہ سیکھایا ہے، اولاد کے نام رکھنے اور ان کے معنی و مفہوم کو ملحوظ رکھنا بھی اسلام نے سکھلایا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن وغیرہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول اللہ ﷺ ان احب اسمائکم الی اللہ عبداللہ و عبدالرحمن .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارے ناموں سے سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔

صحیح مسلم ص ۲۰۶ ج ۲، و ابو داؤد مع عون ص ۴۴۳ ج ۴، و ترمذی مع تحفہ ص ۲۸ ج ۴، و ابن ماجہ ص ۴۷۳ ج ۲، و دارمی ص ۳۸۰ ج ۲، و مسند احمد ص ۱۲۸ ج ۲، و بیہقی ص ۳۰۶ ج ۹، و مستدرک حاکم ص ۲۷۴ ج ۴۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن اسماء میں عبد کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہو وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو محبوب اور تمام ناموں سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں

يلحق بهذين الاسمين ماكان مثلهما كعبد الرحيم و عبدالملك و عبدالصمد.

یعنی ان دونوں ناموں میں ان کی مثل، عبدالرحیم، عبدالملک اور عبدالصمد وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بحوالہ تحفۃ الاحوذی ص ۲۹ ج ۴۔

عبد کے لفظ کی خالق کائنات کی طرف اضافت میں چونکہ یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ انتہائی عاجزی، تذلل، خضوع، توحید پرستی اور دنیا سے اپنے آپ کو روک کر اللہ کا ہی ہو جانا، کہ اس سے مفارقت اختیار نہ کی جائے، چنانچہ لغت عرب کی امہات الکتاب میں اس کا یہی معنی لکھا ہے، علامہ راغب فرماتے ہیں

عبد، العبودیۃ اظہار التذلل، والعبادۃ ابلغ منها لانها غاية التذلل ولا يستحقها الا من له غاية الافضال وهو الله تعالى۔

یعنی عبد اور عبودیت تامل و عاجزی کے اظہار کو کہتے ہیں، اور عبادت کا لفظ عبد سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے کیونکہ اس کے معنی انتہائی عاجزی کرنے کے ہیں، اور اس کا کوئی مستحق نہیں مگر وہی جس کے انعام و اکرام بہت زیادہ ہوں، اور ایسی ذات فقط اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ المفردات فی غریب القرآن ص ۳۱۹۔

علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی حنفی فرماتے ہیں

وقال بعض ائمة الاشتقاق اصل العبودیۃ الذل و الخضوع و قال آخرون العبودۃ الرضا بما يفعل الرب و العباد فعل ما یرضی بہ الرب والا ول اقوی واشق۔
یعنی علم اشتقاق کے بعض آئمہ نے کہا ہے عبودیت کے اصل معنی عاجزی اور خضوع کے ہیں، پھر بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قضا کے ساتھ راضی رہنے کو عبودیت کہتے ہیں اور عبادت وہ فعل ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ راضی رہتا ہے لیکن پہلے معنی زیادہ قوی ہیں۔ تاج العروس ص ۴۱۰ ج ۲۔
گو اس کے دوسرے معانی بھی موجود ہیں مثلاً کسی چیز کا بھی غلام بن جانا، جیسے عبدالدرہم، اور عبدالدینار، بمعنی مال و دولت کا غلام یا پرستار یا عبد الطاغوت وغیرہ اور عبد بمعنی کسی شخص کا غلام بھی ہے، (ضد حر) خواہ یہ زر خرید ہو یا ورثہ میں ملا ہو یا غنیمت میں ہاتھ لگا ہو۔

الغرض لفظ عبد ایک مشترک لفظ ہے جس کے متعدد معانی ہیں لیکن نام اور تسمیہ کے موقع و محل پر یہ لفظ عبادت کے معنی میں ہی مستعمل ہوتا ہے، لغت عرب کے مسلم امام علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں

و يقال فلان عبد بین العبودۃ و العبودیۃ و العبدیۃ، و اصل العبودیۃ الخضوع و التذلل و فی حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ لا یقل احد کم لمملوکہ عبدی و امتی و لیقل فتای و فتاتی، هذا علی نفی الاستکبار علیہم و ان ینسب عبدیتہم الیہ فان المستحق لذلك اللہ تعالیٰ هو رب العباد کلہم و العبد۔

اور کہا جاتا ہے فلاں عبد، ہے (تو اس کہنے سے اس شخص کی) عبودۃ واضح ہوگی، اور عبودیت

کا معنی ہے عاجزی و خضوع، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے غلام کو میرا عبد میری لونڈی نہ کہے بلکہ میرا چھوکر میری چھوکر کہے، یہ نفی ان (غلاموں) پر تکبر کی وجہ سے کی گئی ہے کیونکہ وہ ان کی عبدیت کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں اس چیز کا مستحق فقط اللہ تبارک و تعالیٰ ہے کیونکہ وہ عباد (بندوں) کا رب ہے اور تمام لوگ اس کے عبید (بندے) ہیں۔

لسان العرب ص ۳۷۱ ج ۳۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال لا يقولن احدكم عبدی و امتی کلکم عبيد الله و كل نسائکم اماء الله و لكن ليقبل غلامی و جاريتی و فتای و فتاتی۔

یعنی بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ عبدی (میرا بندہ) یا امتی (میری لونڈی) کیونکہ تم سب اللہ کے بندے اور تمہاری عورتیں اللہ تعالیٰ کی لونڈیاں ہیں، بلکہ کہے میرا غلام میری چھوکر۔

صحیح مسلم ص ۲۳۸ ج ۲۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں

قال رسول الله ﷺ لا يقولن احدكم عبدی فکلکم عبيد الله و لكن ليقبل فتای و لا يقبل العبد ربی و لكن ليقبل سیدی۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یہ نہ کہے عبدی (میرا بندہ) کیونکہ تم سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہو، بلکہ کہے میرا غلام اور نہ غلام کہے میرا رب بلکہ سردار کہے۔ صحیح مسلم ص ۲۳۸ ج ۲۔

ایک حدیث میں اس سے بھی قدرے وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں

لا يقبل احدكم اسق ربك اطعم ربك و ضئ ربك و قال لا يقبل احدكم ربی و ليقبل سیدی و مولای و لا يقبل احدكم عبدی و امتی و ليقبل فتای و فتاتی غلامی۔ کوئی تم میں سے (غلام کو) یوں نہ کہے اپنے رب کو پانی پلا، اپنے رب کو کھانا کھلا، اپنے رب

کو وضو کرا، اور کوئی تم میں سے کسی کو اپنا رب نہ کہے بلکہ سید یا مولیٰ کہے اور کوئی تم میں سے میرا بندہ (عبدی) میری بندی نہ کہے بلکہ میرا جوان اور میری جوان عورت، میرا غلام (یہ الفاظ) کہے، صحیح مسلم ص ۲۳۸ ج ۲۔

ان احادیث مبارکہ کو مکرر پڑھئے یہ کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں بلکہ اپنی تفسیر آپ ہیں کہ کوئی اپنے غلام کو عبدی نہ کہے کیونکہ وہ (غلام) اس کا عبد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عبد ہے لہذا عبد کی اضافت اس کی طرف ہی کرنی چاہیے جس کا وہ عبد ہے اسی طرح غلام کو بھی رسول اللہ ﷺ یہ تربیت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے آقا کو رب نہ کہے کیونکہ اس کا آقا اس کا رب نہیں بلکہ اس کا رب خالق ارض و سماء ہے، اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے علماء کرام نے صراحت کی ہے کہ لفظ عبد کو بندہ کی طرف مضاف کر کے نام رکھنا ایہام شرک سے ہے، چنانچہ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

و منها انهم كانوا يسمون ابناء هم عبد العزى و عبد شمس و نحو ذلك فهذه اشباح و قوالب للشرک نهى الشارع عنها لكونها قوالب له والله اعلم.

یعنی اقسام شرک میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے اسماء عبد العزى اور عبد شمس وغیرہ رکھتے تھے، تو یہ اسماء شرک کے قالب اور اس کے سانچے ہیں اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان ناموں سے منع فرمایا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ ص ۶۳ ج ۱۔

علامہ ابن حجر مکی (جن کی عبارات کو چن چن کر مفتی جی نے، جاء الباطل، جیسی بے کار تالیف تصنیف کی ہے) لکھتے ہیں۔

و يحرم ملك الاملاك لان ذلك ليس لغير الله و كذا عبد النبی و عبد الکعبة او الدار او علی او لحسن لایهام الشریک.

یعنی کسی کا نام شہنشاہ رکھنا حرام ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کیلئے (جائز نہیں) اور اس طرح، عبد النبی، عبد الکعبہ، عبد الدار، (اور حضرت علی مرتضیٰ کی طرف نسبت کر کے) عبد العلی، اور

عبدالحسن نام بھی درست نہیں کیونکہ ان میں ایہام شرک ہے، شرح منہاج بحوالہ مجموعۃ الفتاویٰ ص ۲۵۳ ج ۳۔

ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں

واما ما اشتهر من التسمية بعبد النبي فظاهره كفر الا ان اراد بالعبد المملوك.

یعنی عبدالنبی نام جو مشہور ہے تو اس کا ظاہر کفر ہے مگر یہ کہ عبد سے مراد غلام ہو تو پھر کفر نہ ہوگا، شرح فقہ اکبر ص ۲۳۸۔ طبع مجتہائی و ص ۱۹۳ طبع کراچی۔

اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ مملوک مراد ہو تو تب جائز ہے بلکہ یہ ہے کہ بہر حال ناجائز پھر بھی ہے، چنانچہ خود ملا علی القاری فرماتے ہیں

ولا يجوز نحو عبد الحارث ولا عبد النبي ولا عبوة بما شاع فيما بين الناس.
یعنی عبد الحارث اور عبدالنبی نام رکھنا جائز نہیں، اور عوام میں ان ناموں کے رواج کا کوئی اعتبار نہیں، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۱۰۶ ج ۹ طبع ملتان۔

اسی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے فتاویٰ اور تفسیر میں اور مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے اپنے مجموعہ فتاویٰ ص ۲۵۲ ج ۳ میں اسے ایہام شرک سے قرار دیا ہے۔
حضرت سید محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں

فی الواقع این چنین تسمیہ غیر مشروع است بنا بر آن مولانا شاہ عبدالعزیز
این را از جملہ شرک در غیر عبادت تحت این آیت کریم، فلا تجعلوا لله انداد،
نوشتہ اند عبارتہ ہکذا، اما ہمسر کنندگان در غیر عبادت پس بسیار انداز
انجملہ کسانے کہ در ذکر دیگران را با خدا ہمسر می کنند و نام دیگران را بانام
خدا بطریق تقرب ذکر می نمایند و ازان جملہ اند کسانے کہ در نام نہادن خود
را بندہ فلاں و عبد فلاں می گویند و این شرک در تسمیہ است، انتہی کلامہ
مختصر، بس از تقریر شاہ صاحب مغفور و مبرور تسمیہ ابن حنین اسماء غیر

شروع شد و ارتکاب غیر مشروع منہی عنہ است پس ازین احتراز ہر ضرور
است کہ توہم شرک نہاید۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فتاویٰ نذیریہ ص ۴۳۲ ج ۳۔

حضرت مولانا محمد بشیر الدین محدث سیہرورد فرماتے ہیں۔

اگر از تسمیہ بعد النبی و عبدالرسول عبدیت حقیقہ مراد دارد لاریب
شرک و کفر است کما هو الظاهر والا کفر نیست لیکن خالی از جرم ہم نیست
بجہت ایہام شرک پس تبدیل ہم چون اسماء مذکورہ الزم و واجب است ملا
علی قاری در مرقاة شرح مشکوٰۃ نوشتہ، ولا يجوز نحو عبد الحارث ولا عبد النبی
ولا غیرہ مما شاع فیما بین الناس، انتہی، و ابن حجر مکی در تحفہ نوشتہ، و
یحرم ملک الملوک لان ذلک لیس لغير الله تعالى و کذا عبد النبی و الکعبۃ او
الدار، او علی او الحسنین، لایہام التشریک، انتہی، و ہم چنین در شرعۃ الاسلام
و شرح آن و کتب دیگر مرقوم است کمالا یشفی علی الناظر فقط کتبہ عبدہ
المسکین محمد بشیر الدین العثماني نسباً والقنوجی وطناً۔ بحوالہ فتاویٰ نذیریہ
ص ۴۳۵ ج ۳۔

مفتی صاحب کا اعتراض

فرماتے ہیں، ان تمام حدیث میں ان ناموں سے جو مانعت ہے کراہت تزییہ کی بنا پر ہے
ورنہ قرآن و حدیث بلکہ خود احادیث میں سخت تعارض ہوگا، دیکھو رب خدا کا بھی نام ہے اور قرآن
کریم میں بندوں کو بھی رب فرماتا ہے

کما ربیانی صغیراً، فارجع الی ربک۔

اگر کوئی شخص کسی کو اپنا مربی یا رب کہے تو مشرک نہ ہوگا، ہاں اس سے بچے تو بھی کوئی حرج
نہیں کیونکہ یہ نام رکھنا واجب نہیں لیکن اگر اس زمانہ میں دیوبندیوں و دہائیوں کو چڑانے کیلئے یہ نام
رکھے تو بہت باعث ثواب ہے جیسے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی۔ جاء الباطل ص ۳۸۲ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس ممانعت کو کراہت تنزیہی پر محمول کرنے کیلئے دلیل شرعی کی ضرورت تھی جو خیر سے مفتی صاحب نے درج نہیں کی، اگر درج کرتے تو ہم بفضلہ تعالیٰ اس کا بخوبی تجربہ کرتے۔

ثانیاً۔ اسے مکروہ تنزیہی تسلیم کرنے کی کئی شرعی خرابیاں ہیں، مثلاً اس حدیث میں اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو رب وغیرہ نہ کہے تو کیا یہ بھی مکروہ تنزیہی ہی ہے، اور کیا علماء بریلویہ نے اپنی تربیت کرنے والے کو بھی کبھی لغوی طور پر رب کہا ہے؟ یا کسی تقریر و تحریر میں اپنے استاذ کی طرف اشارہ کر کے اسے اپنا رب قرار دیا ہے، مبتدعین میں سے جاہل سے جاہل نے بھی آج تک ایسا نہیں کیا کہ وہ تحریر میں اپنے علماء کے اقوال کو یوں نقل کرتا ہو کہ میرا رب مواہی احمد رضا خاں یہ کہتا ہے، یا ہمارے رب مفتی احمد یار خاں نے یہ لکھا ہے، یا مفتی احمد یار کے رب مولوی نعیم الدین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے۔

اگر مبتدعین نے عبدالنبی کی طرح بندوں کو رب کہنے کا جماعتی سطح پر اہتمام نہیں کیا! تو ثابت ہوا کہ حدیث کے ان الفاظ کو بریلویہ بھی مکروہ تنزیہی تسلیم نہیں کرتے۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے عبدالنبی کے جواز کی بھی زالی دلیل عنایت فرمائی ہے کہ چونکہ وہابیوں کو چڑانا مقصود ہے، لہذا ان اسماء کا رکھنا بھی باعث ثواب ہے، اے جی آپ کے عمل سے ہمیں کیا چڑ ہے آپ خواہ جو چاہیں کریں، ہمیں آپ کے متعلق پوچھ گچھ ہی نہ ہوگی، ارشاد ہوتا ہے

فذكر انما انت مذكر ☆ لست عليهم بمسيطر ☆ الا من تولي و كفر ☆
 فيعذبه الله العذاب الاكبر ☆ ان الينا اياهم ☆ ثم ان علينا حسابهم ☆ الغاشية ۲۶ تا ۲۱

تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو، تم ان پر دروغ نہیں ہو، ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑا عذاب دے گا، بے شک انکو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے پھر ہم ہی کو ان سے حساب لینا ہے۔ (۲۶ تا ۲۱-۸۸)

اس لئے بھائی ہمیں آپ کے کسی قول و فعل سے چڑ نہیں، آپ شرک کریں یا اکبر الاکبار کا ارتکاب کریں، ہاں ہم درد دل سے آپ کو نصیحت ضرور کریں گے۔

رابعاً۔ کیا مکروہ تنزیہی بھی کسی گروہ و جماعت کو چڑانے کیلئے باعث ثواب بن جایا کرتی ہے، اصول فقہ کی کس کتاب میں ایسا لکھا ہے، کاش مفتی صاحب نے قرآن کو ہی بخوبی سمجھا ہوتا تو ایسی بات قطعاً نہ کہتے، رب قدیر فرماتے ہیں

ولا یجزمکم شأن قوم ان صلواکم عن المسجد الحرام ان تعتلوا۔ (المائدة آیت ۲)
اور لوگوں کی دشمنی اس وجہ سے کہ انہوں نے تم کو عزت والی مسجد سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ (۵-۲)

دیکھئے کتنی پاکیزہ تعلیم ہے کہ کسی کی عداوت تمہیں زیادتی پر آمادہ نہ کر دے، مگر مفتی صاحب عداوت کی آڑ میں ایک فعل شنیع (اور بقول مفتی صاحب مکروہ تنزیہی) کو کار ثواب قرار دیتے ہیں۔
خامساً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اگر کوئی کسی کو اپنا رب کہے تو مشرک نہ ہوگا، تو ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ رب کے معنی ہیں کسی کو پرورش کر کے بتدریج حد کمال تک پہنچانا اور اس کی پوری ضرورتوں کا خیال رکھنا، المفردات القرآن ص ۱۸۴، یہ لفظ عموماً بطور اسم فاعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الحمد لله رب العلمین - سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سب جہان والوں کا پرورش کرنے والا ہے، (ثانی ۱-۲)

ربوبیت کی صفت اللہ ہی کو سزاوار ہے اور، الرب، صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، تاہم لفظ رب کی نسبت آقا اور مالک کی طرف بھی ہو سکتی ہے (اور اس صورت میں اس کا مصدر ربوبیۃ، نہیں بلکہ ربابیت آئے گا، مفردات ص ۱۸۴) لیکن ان معنوں میں لفظ رب کے استعمال کو نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ اپنے آقا و مالک کو رب کہا جائے جیسا کہ پہلے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے فرمان نبوی گزر چکا ہے۔ امت مرحومہ نے اس کا حقیقی و اصلی معنی ہی ملحوظ رکھا ہے اور کوئی بھی اپنے والدین کو رب کے نام سے موسوم نہیں کرتا اور نہ ہی تربیب کرنے کو رب کہتا ہے، افسوس کہ مفتی صاحب نے عبدالنبی کو ثابت کرنے کیلئے غیر اللہ کو رب کہنے کا فتویٰ بھی صادر کر دیا ہے پھر اس عیاری سے بیان کیا ہے کہ کمال ہی کر دیا کہ مشرک نہ ہوگا، انا للہ وانا الیہ راجعون، حالانکہ اس کے ابھام شرک ہونے سے کوئی بھی منکر نہیں یہ فقط مفتی صاحب کی ہی ایجاد ہے۔

کیا فرماتے ہیں علماء بریلویہ

اگر کوئی شخص اپنے مالک و آقا کو رب کہے یا والدین کو رب کہے اور اس سے مراد لغوی طور پر وہی معنی لے جو مفتی صاحب نے بیان کیا ہے، اور اس کو عام طور پر استعمال کرے اور اپنے کو اس طرح مخاطب کرے کہ میں نے اپنے رب کو پانی پلایا کھانا کھلایا ان کا بستر بچھایا وغیرہ اور ان افعال سے اس کا مقصود اہل حدیث کو چڑانا ہو، تو ایسا شخص خطا کار اور گناہ گار ہے یا مصیب و ثواب کار ہے، بنیو تو جروا۔

اگر آپ حضرات کا جواب نفی میں ہے تو اس کی بھی صراحت کیجئے گا کہ ایک ہی حدیث میں آقا کو رب کہنے اور غلام کو عبد کہنے سے منع کیا گیا ہے جبکہ آپ نے آدھی کو تو قبول کر لیا اور آدھی سے انکار کر دیا ہے، وجہ فرق بیان کریں جو واضح اور بین ہو۔

اگر آپ حضرات عبدالنبی کی طرح آقا و مالک کو بھی رب کہنے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں تو اس کی بھی صراحت کیجئے کہ کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات میں عبدالنبی اور عبدالمصطفیٰ وغیرہ نام پائے جاتے ہیں مگر آپ اپنے والدین کو رب نہیں کہتے اور نہ ہی تربیت کرنے والے کو رب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

لہذا مناسب ہے کہ آپ حضرات آئندہ کیلئے اپنے علماء کو بمعنی مربی رب کہا کریں اور جلسہ و جلوس اور جشن میلاد میں اسٹیج وغیرہ پر اعلان کیا کریں کہ اب ہمارے فلاں رب صاحب خطاب کریں گے، یا مولوی احمد رضا خاں کی برسی پر ہی کوئی اشتہار وغیرہ شائع کر دیا کریں کہ ہمارے رب کی فلاں مقام پر برسی ہونے والی ہے، آخر اس میں مضامین ہی کیا ہے، اگر لغوی معنی مراد لیکر ایسا کیا جائے، انما الاعمال بالنیات، بھی تو آخر فرمان مصطفویٰ ہے، لیکن یقیناً جانئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس سے انکار ہی کریں گے اور قبول کرنے کیلئے قطعاً تیار نہ ہوں گے، کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹے بہانے اور طفل تسلیمیاں ہیں۔

بس جناب یہی کچھ ہم عبدالبنی وغیرہ کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تمام عذر لنگ ہیں اور عذر گناہ بدتر از گناہ ہیں۔

مفتی صاحب کے دلائل کا تجزیہ

پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ، قرآن کریم فرماتا ہے

وانكسحوا الایا منی منكم و الصلحین من عبادكم و اما نكم.

اور نکاح کرو اپنوں میں ان کا جو بے نکاح ہوں اور اپنے لائق بندوں اور کنیزوں کا۔

وجہ استدلال میں فرماتے ہیں

اس عبارت میں، عباد، کو، کم، کی طرف مضاف کیا گیا ہے یعنی تمہارے بندے، جاء الباطل

ص ۳۷۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ آیت میں، عباد کم، سے مراد اپنے بندوں، نہیں بلکہ، اپنے غلام، معنی ہے چنانچہ، مفسرین نے اس کا یہی معنی بیان کیا ہے۔

اردو میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کا ترجمہ مستند شمار کیا جاتا ہے اور انہوں نے اس کا یہی معنی کیا ہے، مولوی احمد رضا خاں کے علاوہ جملہ اردو تراجم میں اس کا معنی، غلام، کیا گیا ہے، موجودہ دور کے بریلویت کے مفسر قرآن پیر کرم شاہ صاحب بھیرودی نے بھی اس کا معنی، غلاموں، ہی کیا ہے۔ ضیاء القرآن ص ۳۲۰ ج ۳۔

لغت عرب کے بے نظیر ادیب اور لغت میں مسلمہ امام علامہ زنجیری نے، الکشاف ص ۲۳۴ ج ۳، میں علامہ نسفی نے، مدارک التنزیل ص ۳۴۰ ج ۳، میں، عباد کم، کا معنی، غلام کم، کیا ہے، کسی تفسیر میں اس کا معنی عبید کم، نہیں جو مفتی صاحب کر رہے ہیں، معلوم نہیں کہ مبتدعین نے حقائق کے برعکس چلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔

ثانیاً۔ بات یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی کتاب قرآن حمید میں سورۃ النور کی آیت ۳۲، میں

کہہ رہا ہے کہ

اور اپنے میں سے بیوگان کی اور اپنے نیک چلن غلاموں اور لونڈیوں کی شادیاں کر دیا کرو، اگر وہ محتاج بھی ہوں تو خدا ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی فراخی والا اور جاننے والا ہے۔ (ثنائی) ۲۴-۳۲

اب ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ اس حکم میں یہ کہاں حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی اولاد کا، عبدالمصطفیٰ، عبدالرسول، عبدالنبی، وغیرہ نام رکھنا اور اپنے کو نبی ﷺ کا بندہ کہنا، اگر یہ بات نہیں قطعاً نہیں تو پھر مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی۔

ثالثاً۔ اختلاف اس میں نہیں کہ لفظ، عبد، جب انسان کی طرف مضاف ہو تو اس کا معنی کیا ہے کیونکہ یہ تو مفتی صاحب کو بھی اقرار ہے کہ جب غیر اللہ کی طرف نسبت ہوگی تو معنی ہوں گے خادم غلام۔ جاء الباطل ص ۳۸۰ ج ۱۔ بلکہ اختلاف تو اس بات میں ہے کہ، عبد، کا لفظ مخلوق کی طرف مضاف کر کے نام رکھنے جائز ہیں کہ نہیں؟ لیکن اس کی دلیل دینے کی بجائے آپ ثابت یہ کر رہے ہیں کہ فلاں جگہ پر عبد کا لفظ انسان کی طرف مضاف ہوا ہے اے جی کیا اس آیت میں بطور اسم مضاف ہوا ہے کہ آپ حجت باور کر رہے ہیں۔

دوسری دلیل

قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة اللہ۔ اے محبوب فرمادے کہ میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ وجہ استدلال میں فرماتے ہیں اس یا عبادی میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ رب فرماتا ہے کہ اے میرے بندو دوسرے یہ کہ حضور علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپ فرمادو اے میرے بندو، اس دوسری صورت میں عباد رسول اللہ مراد ہوئے، یعنی حضور علیہ السلام کے غلام اور امتی، دوسرے معنی کو بھی بہت سے بزرگان دین نے اختیار فرمایا ہے۔ جاء الباطل ص ۳۷۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس آیت میں کس لفظ کا معنی ہے کہ، عبد، کو مخلوق کی طرف مضاف کر کے نام رکھنا جائز ہے، یقین جانیے یہ مفتی صاحب کی ذاتی اختراع ہے جسے قرآن نے قطعاً بیان نہیں کیا۔

ثانیاً۔ قرآنی الفاظ کا مفہوم تو یہ ہے کہ

اے نبی! میرے بندوں کو میری طرف سے کہہ اے میرے (خدا کے) بندو! جنہوں نے مختلف قسم کے گناہوں کی وجہ سے اپنے نفس پر ظلم کئے ہیں تم اللہ کی رحمت سے بے امید نہ ہونا اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دے گا۔ (تفسیر ثنائی) لیکن مفتی صاحب اس حقیقت کو احتمال کا نام دے رہے ہیں اور دوسرے معنی کو اختیار کر کے فرماتے ہیں دوسری صورت میں عباد رسول اللہ مراد ہوئے یعنی حضور علیہ السلام کے غلام اور امتی، جاء الباطل ص ۳۷۹، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حالانکہ یہ احتمال کسی معتبر تفسیر میں سرے سے موجود ہی نہیں، یہ فقط مبتدعین کی اختراع و ایجاد ہے ہم پوری دنیا کی رضا خانی ذریت کو کھلا چیلنج دیتے ہیں کہ وہ کسی صحیح مرفوع حدیث یا صحابی و تابعی اور مستند مفسر سے اس کا ثبوت دیں ورنہ اس احتمال کی ایجاد پر اپنے بستر پر ہی شرمندگی و خفت سے سر جھکا لینا، اور لعنت اللہ علی الکاذبین، کی وعید شدید سے ڈر کر اپنی خرافات سے تائب ہو کر، کونوا مع الصادقین، کی جماعت میں شامل ہو جانا کہ قیامت کے روز بارگاہ الہی میں سجدہ کا شرف حاصل ہوگا، ان شاء اللہ۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

عبادی کا معنی امتی کرنا سرسرا تحریف اور جس کا عربی کی کسی لغت کی کتاب میں وجود نہیں، یہ قرآن کریم کی معنوی تحریف کی بدترین مثال ہے۔ (محمد عقیلی گوندلوی)

اب آئیے ذرا شان نزول کی روشنی میں دیکھئے کہ، عبادی، سے مراد اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں یا نبی ﷺ کے امتی و غلام، تو اس سوال کا جواب مبتدعین کو آنکھوں سے ضد کی پٹی اتار کر سننا چاہیے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

ان ناسا من اهل الشرک کانوا قد قتلوا واکثروا و زنوا و اکثروا فاتوا محمداً ﷺ فقالوا ان الذی تقول و تدعوا الیہ لحسن لو نخبرنا ان لما عملنا کفارة فنزل..... قل یا عبادى الذین اسرفوا على انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله، الحديث.

بخاری رقم الحديث ۴۸۱۰

مشرکین کے لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے جنہوں نے قتل کئے اور کثرت سے کئے، اور بدکاری کی تو کثرت سے کی، وہ کہنے لگے کہ جس دین کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ اچھا ہے اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو گناہ ہم کر چکے ہیں وہ معاف ہو جائیں گے، (اسلام قبول کرنے کی وجہ

(سے) اس پر، قل یا عبادى الذین، کی آیت نازل ہوئی۔ صحیح بخاری ص ۱۱ ج ۲، و مسلم ص ۶ ج ۱۔
اس صحیح اور متفق علیہ حدیث سے ثابت ہوا کہ، عبادی، سے مشرکین مراد ہیں، اب ظاہر ہے کہ
مشرکین تو آنحضرت ﷺ کے غلام و امتی نہیں تھے، پس ثابت ہوا کہ، عبادی، کا تعلق اللہ تعالیٰ کی
ذات بابرکات سے ہے۔

لیکن افسوس کہ اس صحیح و صریح حدیث کی موجودگی میں مفتی صاحب عبادی کا تعلق رسول اللہ
ﷺ سے جوڑ رہے ہیں، کاش بریلویت کے مفسر قرآن نے قرآن کو بھی پڑھا ہوتا، تو اس بات کو کہنے
کی جرات نہ کرتا، چنانچہ آیات قرآنیہ کا سیاق و سباق کچھ اس طرح ہے

قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله ان الله
یغفر الذنوب جمیعاً انه هو الغفور الرحیم ☆ وانیبوا الی ربکم و اسلموا له من قبل ان
یاتیکم العذاب ثم لاتنصرون ☆ واتبعوا احسن ما نزل الیکم من ربکم من قبل ان
یاتیکم العذاب بغتة و انتم لاتشعرون ☆ ان تقول نفس یحسرتی علی ما فرطت فی
جنب الله وان کنت لمن السخرین ☆ او تقول لو ان الله هدانی لکنت من المتقین ☆
او تقول حین ترى العذاب لو ان لی کرة فاکون من المحسنین ☆ بلی قد جاء تک
ایثنی فکذبت بها و استکبرت و کنت من الکفرین۔ (الزمر آیت ۵۳ تا ۵۹)

ترجمہ۔ (اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی
جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوں، خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے (اور)
وہ تو بخشے والا مہربان ہے، اور اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آواقع ہوا اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو
اور اس کے فرمانبردار ہو جاؤ، پھر تم کو مدد نہیں ملے گی، اور اس سے پہلے کہ تم پر ناگہاں عذاب آجائے،
اور تم کو خبر بھی نہ ہو اس نہایت اچھی کتاب کی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے
پیروی کرو کہ (مبادا اس وقت) کوئی تنفس کہنے لگے کہ (ہائے ہائے) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں
نے خدا کے حق میں کی اور میں تو ہنسی ہی کرتا رہا یا یہ کہنے لگے کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت دیتا تو میں بھی
پرہیز گاروں میں ہوتا، یا جب عذاب دیکھ لے کہنے لگے کہ اگر مجھے پھر ایک دفعہ دنیا میں جانا ہو تو
میں نیکوکاروں میں ہو جاؤں گا، (خدا فرمایگا) کیوں نہیں میری آیتیں تیرے پاس پہنچ گئی تھیں مگر تو نے
ان کو جھٹلایا اور شیخی میں آگیا اور تو کافر بن گیا۔ (از ترجمہ مولوی فتح محمد حنفی) ۳۹-۵۳ تا ۵۹۔

ان آیات بینات کو مکرر پڑھیے، یہ کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں، ان کا ماحصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی کوئی کل ہی سیدھی نہ تھی، کفر و شرک کے علاوہ فسق و فجور، ظلم و ستم، راہزنی و قزاقی، بدکاری و شراب خوری، سود خوری اور قتل اولاد وغیرہ سنگین خرابیوں میں بری طرح مبتلا تھے، وہ اپنی زندگی کے لائحہ عمل کو دیکھ کر اپنی اصلاح و نجات سے کلی طور پر ناامید ہو چکے تھے، اس مایوسی نے انہیں مزید گناہوں کے ارتکاب سے زندگی بسر کرنے کا عادی بنادیا تھا، انہیں دعوتِ فکر دی جا رہی ہے کہ اب تم نے اپنے نفس پر ظلم و زیادتی کی حد کر دی ہے اب بھی اگر تائب ہو کر ربِ قدیر کی ذات کے درِ رحمت پر آ کر دستک دو گے تو اس کی رحمت تمہیں مایوس نہیں کرے گی اور تمہارے گزشتہ تمام جرائم کو معاف کر دیا جائے گا اور اگر تم نے یہ موقع بھی ہاتھ سے گنوا دیا تو آنے والی زندگی میں اور آخرت کے روز تمہیں کوئی مددگار و حامی نہ ملے گا، اور تمہارے تمام عزرات کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ، و کنت من الکفرین، یعنی تو کافروں میں سے تھا، چنانچہ بریلویت کے معروف مفسر قرآن اور مفتی احمد یار خاں کے استاذ مکرم جناب مولوی نعیم الدین فاضل مراد آبادی نے مولوی احمد رضا خاں کے ترجمہ قرآن پر تفسیر بیان کرتے ہوئے ان آیات کا شان نزول مشرکین کو بتایا ہے۔ ص ۶۷۲۔

پیر کرم شاہ صاحب جو دورِ حاضر میں بریلویت کے سرگرم وکیل اور ناصر ہیں نے اپنی تفسیر قرآن میں ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

اس آیت (قل یعبادی) طیبہ مبارکہ میں بھی ان لوگوں کو مزید نویدِ رحمت دی جا رہی ہے جو عمر بھر اپنے اوپر زیادتیاں کرتے رہے جن کے شب و روز فسق و فجور میں بسر ہوتے رہے جنہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو بالکل برباد کر دیا ایسے لوگوں کو کہا جا رہا ہے کہ اب میری رحمت کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے اگر تم سچے دل سے تائب ہو کر نئی اور پاکیزہ زندگی شروع کرنے کا عزم کر چکے ہو تو تمہارے گناہ بے شمار اور نہایت سنگین کیوں نہ ہوں معاف کر دیئے جائیں گے، تمہیں یہاں سے مایوس نہیں لوثایا جائے گا۔ ضیاء القرآن ص ۲۷۸ ج ۴۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کا سیاق و سباق اور شان نزولِ یعبادی کا تعلق ربِ قدیر سے جوڑنا ہے نہ کہ نبی کریم ﷺ سے، الغرض اس آیت میں عبادی حضور علیہ السلام کی طرف سرے سے مضاف ہی نہیں کہ اس سے عبد المصطفیٰ وغیرہ نام رکھنے کا ثبوت ہو۔

تیسری دلیل

الریاض النضرۃ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برسر منبر خطبہ میں فرمایا
قد کنت مع رسول اللہ ﷺ فکنت عبده و خادمه۔
میں حضور علیہ السلام کے ساتھ تھا پس میں آپ کا بندہ اور خادم تھا۔
جاء الباطل ص ۳۷۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ معلوم نہیں کہ اس کی سند کیسی ہے صحیح ہے یا من گھڑت؟ لہذا مبتدعین پر واجب ہے کہ وہ اس کی صحیح و معتبر سند پیش کریں۔

ثانیاً۔ کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے برسر منبر یہ کہا ہے کہ میں نے اپنا نام عمر بدل کر عبد الرسول اور عبد المصطفیٰ وغیرہ رکھ لیا ہے، یا ان اسماء کے رکھنے کی اجازت ہے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں تو پھر یہ مبتدعین بریلویہ کی دلیل کیسے بن گئی؟ کیونکہ اختلاف تو لفظ عبد کو اسماء میں مخلوق کی طرف مضاف کرنے کا ہے نہ کہ اس لفظ کو لغوی معنی میں استعمال کر کے حضور علیہ السلام کا خادم کہنے میں ہے، افسوس کہ مفتی صاحب دلیل دینے کی بجائے خلط بحث کر کے اپنا الو سیدھا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

ثالثاً۔ الریاض النضرۃ، کس محدث کی تالیف ہے، اور اسے کس نے شائع کیا تھا بحوالہ اسکی صراحت کیجئے، کیونکہ مجرد کسی کتاب میں لکھا ہونا کہ فلاں نے یہ بات کہی تھی، دلیل نہیں، جتنی دیر تک مؤلف کتاب کو ثقہ و معروف اور موحد ثابت نہ کیا جائے اور اس میں مروی روایات کو اصول حدیث کی رو سے صحیح ثابت نہ کیا جائے، امام عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ اگر سند نہ ہوتی تو جو کوئی چاہتا کہہ دیتا۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

عبد کی اضافت بطور نام کے غیر اللہ کی طرف قطعاً حرام اور انبیاء کی تعلیم کے خلاف ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ماکان لبشر ان یؤتیه اللہ المکب و الحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً

الٰی من دون اللہ ولکن کونوا ربانین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون
(آل عمران ۷۹)

کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ خدا اس کو کتاب علم اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ خدا کے علاوہ میرے بھی بندے بنو، ہاں تم کتاب اللہ کو پڑھ پڑھا کر اللہ والے بنو۔ (ثانی)، ۳-۷۹۔
اس آیت سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت صرف یہ تھی کہ بندے رب والے ہو جائیں اور یہ دعوت قطعی نہ تھی کہ تم میرے بندے بن جاؤ۔ اگر مفتی صاحب کے مؤقف کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام ایک صحیح عقیدہ کی نفی کرتے رہے۔ معاذ اللہ۔ نہیں بلکہ اس آیت کی روشنی میں مفتی صاحب کا ہی عقیدہ غلط ہے جس کی مزید وضاحت اس صحیح حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک شخص کا نام عبدالحجر تھا تو رسول اللہ نے فرمایا لا انت عبد اللہ، الادب المفرد (ص ۲۲) آج کے بعد تیرا نام عبدالحجر نہیں بلکہ عبد اللہ ہے۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اتفاقاً علی تحریم کل اسم معبد لغیر اللہ (فتح المجید ص ۲۹۳)۔ رہی مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت:

قد کنت مع رسول اللہ فکنت عبده ورسوله.

یہ ایک لمبی روایت کا ٹکرا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو منبر رسول پر لوگوں کو خطبہ دیا اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔ لوگو! مجھے علم ہے کہ تم مجھ میں شدت اور سختی محسوس کرتے ہو۔ یہ اس لیے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا اور آپ کا غلام اور خادم تھا۔ آپ ﷺ ایسے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بالموئین روف الرحیم۔ میں آپ کے سامنے مسلول (سوتلی ہوئی) تلوار کی طرح تھا مگر یہ کہ آپ مجھے نیام میں رکھتے یا آپ مجھے کسی امر کا حکم فرماتے تو میں اس سے رک جاتا یا میں آپ کی نرمی کی وجہ سے لوگوں کی طرف پیش قدمی کرتا۔ میں اسی کیفیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فوت کر دیا۔ پھر میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی اسی طرح تھا اور میں ان کا بھی خادم تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی فوت کر لیا۔
(کنز العمال ص ۶۸۲ ج ۵)

صاحب کنز العمال نے اس روایت کا ماخذ فوائد ابوحسین بن بشران، اور ابوالواحد الدھقان اور اللاکائی بتایا ہے۔ ظاہر ہے یہ کتابیں نہ معروف ہیں اور نہ ہی متداول، اور نہ ہی مذکورہ روایت کی سند سامنے ہے۔ تاہم یہ روایت ضعیف بھی ہے اور مفتی صاحب نے اس روایت سے جو استدلال کیا ہے وہ باطل ہے، روایت تو اس لیے ضعیف ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ خطبہ خلافت پر متمکن ہوتے ہی ارشاد فرمایا تھا اس وقت اس واقعہ کے راوی حضرت سعید بن مسیبؓ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے دو سال گزرنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ (تہذیب التہذیب ص ۸۶ ج ۴) جس سے ظاہر ہے کہ اس روایت کی فنی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے کیا انہوں نے حضرت عمرؓ کا مذکورہ خطبہ اپنی ولادت سے دو سال قبل سن لیا تھا۔

۲- مفتی صاحب کا استدلال باطل ہے اس لیے کہ وہ اس روایت سے رسول اللہ ﷺ کی طرف نام کی اضافت کرنے کے جواز کا استدلال کر رہے ہیں حالانکہ اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کے نام کی طرف اضافت کا اشارہ تک موجود نہیں بلکہ صرف اتنا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ کے خادم اور غلام کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اور وہی ذمہ داری جو رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں ان کے سامنے ادا کرنا تھا آپ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر صدیقؓ کے لیے ادا کرنے لگا۔ کیا کسی کی زندگی میں کوئی منصبی ذمہ داری نبھانا اس کی طرف عبدیت کی اضافت ہوتی ہے اگر ایسے ہی ہے تو پھر یہ واضح ہے حضرت عمرؓ اس کے قائل نہ تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے وہی منصب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لیے نبھایا۔

(۳) روایت میں لفظ خادم بھی ہے جس کا معنی خدمت کرنے کا ہے اور کنت خادمہ کا معنی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ کی خدمت کرتا تھا جب کہ مفتی صاحب کے نزدیک خدمت مقصد نہیں تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے نام کی طرف اضافت کر کے عبدیت کا مقصد ہے جو سراسر شرک ہے کبھی کسی صحابی نے حضرت رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کو جو خادم کے لفظ سے موسوم نہیں کیا۔ صحابہ کرام ایسا کر بھی کیسے کر سکتے تھے۔ وہ توحید کا صحیح مفہوم جانتے تھے جب کہ اس طرح کے شرکیہ عقائد تکمیل اسلام کے سینکڑوں سال بعد پیدا ہوئے ہیں۔ (گوند لوی)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ خود صاحب کنز العمال، کے نزدیک بھی یہ روایت ضعیف ہے۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ علامہ علی متقی نے صحاح ستہ اور چند دیگر کتب حدیث کا نام لیکر کہا ہے کہ ان میں جمع حسن اور ضعیف روایات ہیں۔ اور میں نے ہر مقام پر اس کی نشاندہی کی ہے، ان کے علاوہ جتنی روایات ہیں:

فہو ضعیف فیستغنی بالعدو الیہا او الی بعضها عن بیان ضعفہ۔

وہ ضعیف ہیں اور ان کتب کی طرف نسبت کر دینا ہی ضعیف کے لیے کافی ہے۔ لہذا حکم لگانے کی ضرورت نہیں۔ (کنز العمال ص ۱۹ ج ۱، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان۔)

ان کی اس صراحت سے معلوم ہوا کہ غیر معروف اور غیر متداول کتب کی طرف نسبت نہ کرنا ہی ان کے نزدیک ضعف کے لیے کافی ہے، اور زیر بحث روایت بھی ان کتب کی ہے جن کی طرف نسبت کرنا ہی صاحب کنز العمال کے نزدیک ضعف کے لیے کافی ہے الغرض صاحب کنز العمال کے نزدیک یہ روایات ضعیف ہے۔

SCANNED BY: MUHAMMAD SHAKIR

TRUEMASLAK@INBOX.COM.

باب جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے کلمہ وغیرہ کا ذکر کرنا

اسلام سے قبل دنیا میں جہالت کا دور دورا تھا، لوگوں نے خود تراشیدہ خدا اور انکی عبادت کے طریقے ایجاد کر رکھے تھے، انہیں میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جب کسی کی وفات ہوتی تو اس کی میت پر کلام مقدس تلاوت کی جاتی اور اس کے ساتھ مختلف ذکر و اذکار بھی کیے جاتے تھے، جیسا کہ علامہ جلال الدین الخوارزمی حنفی التوفی نے شرح ہدایہ میں پورے جزم و یقین کے ساتھ کہا ہے کہ

ویکروہ رفع الصوت بالذکر والقراءة لانه فعل الكتابی.

یعنی جنازے کے ساتھ بلند آواز سے ذکر اور تلاوت قرآن کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ اہل کتاب (یہود نصاریٰ) کا فعل ہے، الکفایہ ص ۲۹۷۔

مبتدعین کی مستم شخصیت علامہ خوارزمی کی مذکورہ عبارت سے یہ بات ہمارے سامنے کھل کر آگئی کہ جنازہ کے ساتھ ذکر وغیرہ اہل کتاب کی رسم ہے، اب اگر اس رسم میں کوئی خوبی اور حسن ہوتا تو شریعت اسے واضح کر کے بیان کرتی، مگر آپ حضرات پورے ذخیرہ حدیث کو کھنگال لیجئے کسی روایت میں آپ کو یہ الفاظ نہیں ملیں گے کہ میت کو اٹھاتے یا لے جاتے وقت اس کے پیچھے کلمہ طیبہ کا ورد کیا کرو، کسی صحابی و تابعی کا فتویٰ و عمل بھی اس کے جواز پر منقول نہیں، خیر القرون کے پورے زمانہ سے اس کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو جنازے کے ساتھ ذکر بالجہر کو مکروہ جانتے تھے۔

حضرت قیس بن عباد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

كان اصحاب رسول الله ﷺ يكرهون رفع الصوت عند الجنائز و عند القتال و عند الذکر.

یعنی رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آواز کو بلند کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے جنازہ کے ساتھ قتال اور ذکر میں۔ السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۴۷ ج ۴، اس روایت کے سارے راوی ثقہ ہیں۔

غور کیجئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنازہ کیساتھ خاموشی کی تعلیم کس سے حاصل کی تھی اور کس کی اتباع میں وہ لوگ جنازہ کے ساتھ آواز کو بلند کرنا مکروہ جانتے تھے، ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ اسوہ اپنے پیارے اور محبوب قائد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات اقدس سے حاصل کیا تھا۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

عن النبی ﷺ قال ان اللہ عزو جل يحب الصمت عند ثلاث عند تلاوة القرآن وعند الزحف وعند الجنازة.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین مقامات پر خاموشی کو پسند کرتا ہے، تلاوت قرآن، میدان جنگ اور جنازہ کے ساتھ،

طبرانی کبیر ص ۲۱۳ ج ۵، و مجمع الزوائد ص ۳۳ ج ۳، و کنز العمال (۶۸۸۳)

اس کی ہم معنی روایت، سنن ابی داؤد میں بھی آتی ہے کہ

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال لا تتبع الجنازة بصوت ولا نار.

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنازہ میں آگ اور آواز بلند کر کے شریک نہ ہوا جائے۔

ابوداؤد مع عون ص ۷۶ ج ۳، و مسند احمد ص ۵۳۲ ج ۲۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

عن النبی ﷺ انه نہی ان يتبع الميت صوت او نار.

یعنی نبی کریم ﷺ نے میت کے ساتھ آواز (کو بلند کرنے) اور آگ کو ساتھ لے جانے سے منع فرمایا۔ ابویعلیٰ بحوالہ مجمع الزوائد ص ۳۲ ج ۳۔

گو یہ روایات (زید بن ارقم رضی اللہ عنہ، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، جابر رضی اللہ عنہ) صحیح نہیں مگر اپنے شواہد کی وجہ اور قیس بن عباد رضی اللہ عنہ کے اثر صحیح کی بنا پر ہم نے انہیں بطور تائید نقل کر دیا ہے، ان احادیث و آثار سے یہ بات ہمارے سامنے کھل کر آگئی کہ جنازہ کے ساتھ کسی ذکر و اذکار

کابلند کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (بموجب فرمان نبوی) مکروہ جانتے تھے، اور اس مکروہ کی وجہ پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ خواری نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ کفار کا شعار اور اہل کتاب (یہود نصاریٰ) کا فعل ہے، اسی طرح دیگر معتبر کتب فقہ حنفیہ میں لکھا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن ہمام حنفی ہدایہ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں۔

ویکروہ لمشیعہا رفع الصوت بالذکر والقراءة.

ذکر اور تلاوت کو جنازہ کے ساتھ باواز بلند کرنا مکروہ ہے۔

فتح القدیر ص ۹۷ ج ۲۔

امام سراج الدین اودی حنفی لکھتے ہیں کہ

رفع الصوت بالذکر و قراءة القرآن و قولهم کل حی يموت و نحو ذلك خلف الجنازة بدعة.

یعنی جنازہ کے پیچھے بلند آواز سے ذکر اور تلاوت قرآن کرنا اور یہ کہنا کہ ہر زندہ مرے گا یا اسی طرح کا کوئی جملہ کہنا بدعت ہے۔ الفتاوی السراجیہ ص ۲۳۔ ایسے ہی علامہ شرنبلالی نے، مرقی الفلاح، میں اسے بدعت قرار دیا ہے، اور اسکی شرح میں علامہ محطاوی فرماتے ہیں کہ بدعت سیئہ ہے۔ (حاشیہ مرقی ۶۰۶)۔

فتاوی عالمگیری میں بحوالہ طحاوی لکھا ہے کہ

وعلى متبعی الجنازة الصمت ویکروہ لهم رفع الصوت بالذکر و قراءة قرآن.

یعنی جو لوگ جنازہ کے ساتھ جانے والے ہوں ان پر لازم ہے کہ وہ خاموش رہیں اور ان کیلئے بلند آواز سے ذکر اور تلاوت قرآن مکروہ ہے۔ (فتاوی عالمگیری ص ۱۶۳ ج ۱ الفصل الرابع فی حمل الجنازة)۔

علامہ کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ فرماتے ہیں

و يطيل الصمت اذا تبع الجنازة ویکروہ رفع الصوت بالذکر لما روی عن قیس بن عبادۃ انه قال کان اصحاب رسول اللہ ﷺ یکرهون رفع الصوت عند ثلاثة عند القتال و عند الجنازة والذکر ولانه تشبه باهل الکتاب فکان مکروہ،

یعنی جو جنازہ کے ساتھ جائے اس پر لازم ہے کہ وہ لمبی خاموشی اختیار کرے کیونکہ ذکر کے وقت آواز کو بلند کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ حضرت قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تین مقام، جہاد، جنازہ اور ذکر کے وقت آواز بلند کرنے کو مکروہ جانتے تھے، (علامہ کاسانی فرماتے ہیں) یہ مکروہ اس لئے ہے کہ اس میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہت ہے، بدائع الصنائع ص ۳۱۰ ج ۱۔

مفتی صاحب کا اعتراض

جن فقہاء نے میت کے ساتھ ذکر یا لہجہ کو مکروہ فرمایا ہے ان کی مراد مکروہ تنزیہی ہے۔ جاء الباطل ص ۴۰۹۔

جواب

اولاً۔ ہم اس سے پہلے متعدد بار اس بات کی صراحت کر چکے ہیں کہ جب فقہاء کرام مطلق مکروہ کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد مکروہ تحریمی ہوتی ہے، اس پر ہم نے بفضلہ تعالیٰ فقہ حنفیہ کی معتبر کتب کی عبارات ذکر کر دی ہیں، بلکہ مبتدعین کے گرو مولوی احمد رضا خاں بریلوی کی عبارات بھی نقل کی ہیں، تفصیل کیلئے آذان قبر کی بحث دیکھئے۔

ثانیاً۔ مذکورہ اصول و ضابطہ تو اپنے مقام پر حنفیہ کا اصول تھا ہی، مگر کمال یہ کہ فقہ حنفی میں اس کے مکروہ تحریمی ہونے کی بھی صراحت ہے۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم حنفی کنز الدقائق کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

و ينبغي لمن تبع جنازة أن يطيل الصمت ويكره رفع الصوت بالذكر و قراءة القرآن و غيرهما في الجنازة والكراهة فيها كراهة تحريم.

اور مناسب ہے اس شخص کیلئے جو جنازہ کے ساتھ جائے وہ لمبی خاموشی اختیار کرے اور بلند آواز سے ذکر اور تلاوت قرآن کو جنازہ کے ساتھ کرنا مکروہ ہے اور اس میں کراہت بھی تحریری ہے۔ البحر الرائق ص ۱۹۲ ج ۲۔

علامہ حلبی، منیۃ المصلیٰ، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

و ينبغي ان يطيل الصمت ويكره رفع الصوت فيها بالذكر و قراءة القرآن
ذكر في فتاوى العصر انها كراهة تحریم۔

اور مناسب ہے کہ طویل خاموشی اختیار کرے (جنازہ کے ساتھ جانے والا) اور آواز کو ذکر اور
تلاوت قرآن کیساتھ بلند کرنا مکروہ ہے اس کو، فتاویٰ العصر، میں ذکر کر کے کہا ہے یہ تحریمی ہے، حلّی
کبیر ص ۵۹۴۔

مگر ہمارے مفتی صاحب اس کو مکروہ تنزیہی باور کر رہے ہیں، پھر اس پر صریحاً جھوٹ بولا کہ
فقہاء بلا دلیل شرعی مکروہ کہیں تو تب مکروہ تنزیہی مراد ہوتا ہے۔

حالانکہ علامہ ابن عابدین نے فتاویٰ شامی، میں اس پر قرآنی آیت پیش کی تھی جسکی نقل کا تو
مفتی صاحب کو بھی اقرار ہے۔ جاء الباطل ص ۴۱۰ ج ۱۔

یہ الگ بات ہے کہ علامہ شامی کے استدلال کو مفتی صاحب نے ادھر اور قرار دیکر جان چھڑانے
کی فضول حرکت کی ہے، بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ فقہاء نے اس کی کراہت پر استدلال قرآن
سے کیا ہے، اور راقم الحروف نے بھی اس کے مکروہ ہونے پر عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بسند صحیح
ثابت کر دیا ہے، معلوم نہیں مبتدعین کی نظر میں دلیل کس بات کا نام ہے، حالانکہ فقہاء احناف تو اس
بات کی صراحت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی واجب ہے ہاں البتہ جب سنت
سے اس کی نفی ہو تب نہیں، فتح القدیر شرح ہدایہ ص ۲۳۷ ج ۲۔

ایک نئی دریافت

ادھر ادھر کی فضول بھرتی کے بعد مفتی صاحب نے آخر اپنے راگ کی تان اس پر توڑی ہے کہ
خاموش رہنا بہتر اور خاموش نہ رہنا بلکہ ذکر بالجہر کرنا بہتر نہیں جائز ہے، جاء الباطل ص ۴۱۰ ج ۱ ص ۳۔
اس عبارت میں مفتی صاحب نے حق کا اعتراف الٹے کان پکڑ کر کر تو لیا ہے مگر اس کے نیچے
روایتی مبتدعین کی عیاری کی جھلک ہے کہ گو ذکر کرنا بہتر نہیں مگر بہر حال جائز تو ہے، مفتی صاحب
غالباً قرآن و سنت کے علم کی طرح عقل و خرد سے بھی کورے تھے، انہیں اتنا بھی علم نہ تھا کہ جب
دونوں طرف سے دلائل شرعی موجود ہوں تو تب ایک چیز کو مکروہ کہتے ہیں اور دوسری کو جواز مع
الکراہت سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ کھڑے ہو کر کھانے کی روایات میں شدید وعید ہے لیکن کھڑے

ہو کر کھانے کی روایات بھی ملتی ہیں، تو علماء نے کھڑے ہو کر کھانے کو جواز مع الکراہت کہا ہے۔ مگر یہاں معاملہ اس طرح نہیں ہے کیونکہ ہم نے جنازہ کے ساتھ آواز بلند نہ کرنے کی احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل پیش کر دیا ہے کہ وہ جنازہ کے ساتھ آواز کو بلند کرنا مکروہ جانتے تھے، خود مفتی صاحب نے دوسرے باب میں بحوالہ ابن منذر اس اثر کو نقل کیا ہے۔ جاء الباطل ص ۴۰۹۔

اسی طرح علامہ حلبی اور کاسانی نے اس سے دلیل پکڑی ہے۔ حلبی کبیر ص ۵۹۴۔ بدائع الصنائع ص ۳۱۰ ج ۱۔

جبکہ اس کے برعکس مفتی صاحب نے جنازہ کیساتھ ذکر بالجہر کو کرنا تو کجا آواز کے بلند کرنے کی بھی کوئی شرعی دلیل درج نہیں کی! جو زیب رقم فرمایا ہے وہ غیر متعلقہ ہے جس کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں، خود مفتی صاحب کو بھی حقیقت کا بحر حال ادراک ہے اور وہ اس بات سے کما حقہ واقف ہیں کہ خیر القرون میں اس سے لوگ منع کرتے تھے چنانچہ اس بات کا اقرار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

یہ ممانعت اس زمانہ کیلئے تھی اب اس زمانہ میں چونکہ لوگوں کے حالات بدل گئے ہیں، یہ حکم کراہت بھی بدل گیا ہے، کیونکہ اس زمانہ میں جو بھی جنازے کے ساتھ جاتا تھا وہ خاموش رہتا تھا اس سے عبرت پکڑتا تھا اہل میت کے ساتھ رنج و غم میں شرکت کرتا تھا، اب وہ زمانہ ہے کہ جنازے کے ساتھ جانے والے دنیاوی باتیں ہنسی مذاق مسلمانوں کی غیبتیں کرتے جاتے ہیں، اگر قبرستان میں کچھ دیر بیٹھنا پڑے تو خوش گپیاں اڑاتے ہیں، میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ کھیل کا مشغلہ کر کے دل بہلاتے ہیں، تو ان کو ذکر الہی میں مشغول کر دینا ان بیہودہ باتوں سے بہتر ہے۔ جاء الباطل ص ۴۱۱ ج ۱۔

شکر ہے کہ مفتی صاحب نے ایک صحیح بات کا اقرار تو کیا ہے، خیر القرون میں اسکی ممانعت ہی تھی، مفتی صاحب کی اگلی بات سے ہمیں چند وجوہ سے کلام ہے جسکی ضروری تفصیل حسب ذیل ہے اولاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اب لوگوں کی حالت بدل گئی ہے الخ! بھائی بات یہ ہے کہ جو لوگ کسی شرعی امر میں غلطی کا ارتکاب کریں تو انہیں سمجھانا، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کو

بیان کر دینا ہی ضروری ہوتا ہے، انہیں اس بات پر قائل کرنا کہ یہ چیزیں خلاف شریعت ہیں، علماء اہل علم اور ہر سمجھ دار طبقہ پر فرض ہیں، اگر وہ حضرات سمجھ جائیں تو فیھا ورنہ ہمیں اور کسی بھی کلمہ گو مسلمان امتی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دین کے حکم میں ہی رد و بدل کر دے اور عوام کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر دین سازی کا عہدہ سنبھال لے، مثلاً اگر کوئی شخص نماز کو مسنون طریقہ کے برعکس پڑھتا ہے وہ کسی بھی نماز کے رکن میں کوتاہی کرتا ہے، تو اہل علم پر فرض ہے کہ اسے سمجھا دیں، مگر یہ کسی فرد بشر کو حق حاصل نہیں کہ وہ نماز کے طریقہ میں ہی تبدیلی کر دے۔

ثانیاً۔ ہر دور میں عوام و خواص ہوتے ہیں بعض دین پر کما حقہ عمل کرتے ہیں بعض ۹۰٪، بعض ۵۰٪، اور بعض کی حالت ایک فی صد کی بھی ہوتی ہے، خیر القرون میں بھی بعض جاہل جنازہ کے ساتھ ہنسی مذاق کر لیا کرتے تھے، چنانچہ علامہ حلبی، سنن سعید بن منصور سے نقل کرتے ہیں کہ۔

وسمع ابن مسعود رجلاً یضحک فی الجنازۃ فقالہ اتضحک و انت فی جنازۃ لا کلمک ابدا۔ حلبی کبیر ص ۵۹۴۔

اس کا معنی مولوی امجد علی بریلوی کرتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جنازہ کے ساتھ ہنستے دیکھا، فرمایا، تو جنازہ میں ہنستا ہے، تجھ سے کبھی کلام نہ کروں گا، بہار شریعت ص ۱۳۱ حصہ چہارم۔ یہی روایت، شعب الایمان للبیہقی ۷/ ۱۱ رقم الحدیث (۹۲۷۱) میں موجود ہے۔

مبتدعین کی اس مسلمہ روایت سے ثابت ہوا کہ خیر القرون اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی بعض لوگ نماز جنازہ میں نازیبا حرکات کرتے تھے، مگر انہوں نے جنازہ میں اس وجہ سے بدعات تو پیدا نہ کیں ہاں البتہ ایسے لوگوں سے ترک کلام ضرور کیا، لہذا آج تغیر زمانہ سے بدعات کا دروازہ کھولنا کسی طرح بھی درست نہیں جیسا خیر القرون کے زمانہ میں بعض لوگ ہنسی مذاق میں مشغول رہا کرتے تھے۔

اگر آج بھی ہوں تو انہیں احکام اسلام کی تعلیم دینا چاہیے نہ کہ سرے سے ان احکام اسلام میں ہی حک و اضافہ کر دیا جائے، الغرض ہر دور میں خواہش نفس کے پجاری تو رہا ہی کرتے ہیں، اور ہر

دور میں دین پر عمل کرنے والے بھی رہا کرتے ہیں، اگر آج دین سے لوگ لاپرواہ ہیں تو دین پر عمل کرنے والے اور جنازہ میں مودب ہو کر باقاعدہ مسنون طریقہ سے ساتھ جانے والے بھی موجود ہیں۔

ویسے راقم الحروف کو ۱۲ / اگست ۱۹۸۴ء سے لیکر تادم تحریر امامت و خطابت کرتے ہوئے تقریباً تیرا سال گزر چکے ہیں لیکن مجھے ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ لوگ نماز جنازہ پڑھنے کیلئے جاتے ہوئے یا میت کو دفن کرنے تکہ آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوں، ادھر دفن و کفن کا انتظام ہو رہا ہو تو دوسری طرف لوگ کھیل و تماشا میں مشغول ہوں، بلکہ خاکسار کا تو مشاہدہ ہے کہ لوگ مرگ کے سوگ میں خاموش کھڑے رہتے ہیں، اور مرنے والے کی موت کے اثرات سے انہیں موت یاد آ جایا کرتی ہے اور بعض دفعہ دین سے دور لوگ بھی چند ایام کیلئے پکے نمازی بن جاتے ہیں کئی حضرات اپنے والدین کی وفات پر پختہ نمازی بن جاتے ہیں، ہم اس کی متعدد امثلہ پیش کر سکتے ہیں، مگر مفتی صاحب اپنا مشاہدہ اس کے برعکس بیان کرتے ہیں، ممکن ہے کہ اکا دکا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو مگر اکثریت ایسی قطعاً نہیں، یہ مفتی صاحب کا بدعت کی ایجاد کیلئے ایک فقط بہانہ ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مفتی صاحب کے دلائل کا محاسبہ

پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ جنازے کے آگے کلمہ طیبہ یا تسبیح و تہلیل یا درود شریف یا نعت شریف آہستہ آہستہ یا بلند آواز سے پڑھنا جائز اور میت و حاضرین کو مفید ہے، اس پر قرآنی آیات و احادیث صحیحہ و اقوال فقہا شاہد ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے

الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبہم۔

وہ لوگ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر۔

اس کی شرح میں تفسیر روح البیان، ابو السعود، کبیر میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں ہمیشہ کھڑے بیٹھے ذکر الہی کرتے ہیں کیونکہ انسان اکثر ان حالات سے خالی نہیں ہوتا۔ جاء الباطل ص ۴۰۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس آیت میں کس لفظ کا معنی ہے کہ نماز جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے، ایک شخص بآواز بلند کہے، کلمہ شہادت، تو دوسرے لوگ کہیں، اشہدان لا الہ الا اللہ، وغیرہ، جب سرے سے اس بات کا یہاں ذکر ہی نہیں تو پھر یہ آپ کی دلیل کیسے بن گئی، الغرض یہاں نماز جنازہ کے ساتھ کلمہ وغیرہ پڑھنے کا ذکر نہیں۔

ثانیاً۔ اگر مبتدعین کہیں کہ اس عام حکم میں نماز جنازہ بھی شامل ہے کہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے ذکر کیا جائے، تو جواباً عرض ہے کہ خود مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ اب تفسیر قرآن کے چند مرتبے ہیں، تفسیر بالقرآن، یہ سب سے مقدم ہے اس کے بعد تفسیر قرآن بالا حدیث کیونکہ حضور علیہ السلام صاحب قرآن ہیں، ان کی تفسیر نہایت ہی اعلیٰ، پھر قرآن کی تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول سے خصوصاً فقہاء صحابہ اور خلفا راشدین کی تفسیر، رہی تفسیر قرآن تابعین یا تبع تابعین کے قول سے، یہ اگر روایت سے ہے تو معتبر ورنہ غیر معتبر۔ جاء الباطل ص ۱۱ ج ۱۔

بتائیے مفتی صاحب کے اس بتائے ہوئے اصول کی رو سے، مذکورہ آیت سے جنازہ کے ساتھ

کلمہ وغیرہ کا ذکر قرآن، صاحب قرآن، صحابہ کرام وغیرہ نے بیان فرمایا ہے، نہیں ہرگز نہیں، تو پھر مفتی صاحب کے من گھڑت استدلال کی کوئی شرعی حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

ثالثاً۔ عام سے خاص ثابت نہیں ہوتا، اس اصول کی ہم متعدد بار صراحت کر چکے ہیں۔

رابعاً۔ اختلاف ذکر کے محل و طریقہ اور کیفیت سے ہے کہ اجتماعی طور پر باواز بلند جنازہ کے ساتھ ذکر سنت سے ثابت نہیں، جیسا کہ مبتدعین میں رواج ہے کہ ایک شخص کہتا ہے، کلمہ شہادت، دوسرے شریک جنازہ، کلمہ طیبہ، کا ذکر کرتے ہیں، خیر سے اس کا ثبوت دیجئے۔

خامساً۔ اگر اس آیت کو زیر بحث مسئلہ سے ہی تعلق ہے اور اس سے جنازہ کے ساتھ کلمہ وغیرہ کا ذکر ثابت ہوتا ہے تو خود مولف جاء الباطل نے یہ کیوں لکھا ہے کہ

معلوم ہوا کہ (جنازہ کے ساتھ) خاموش رہنا بہتر ہے اور خاموش نہ رہنا بلکہ ذکر بالجہر کرنا بہتر نہیں جائز ہے۔ جاء الباطل ص ۴۱۰ ج ۱۔

اس عبارت میں مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ جنازہ کے ساتھ ذکر بالجہر کرنا غیر بہتر اور جائز مع البکراہت ہے، فرقہ بریلویہ ٹھنڈے دل سے غور کرے کہ مفتی صاحب کی اس تحریر کے بعد ان کے استدلال کی کوئی وقعت رہ جاتی ہے، کیونکہ اگر یہ مسئلہ قرآن سے ثابت ہے تو اس کے جواز کو غیر بہتر سے مفتی صاحب کیوں تعبیر کر رہے ہیں، کیا قرآن کے احکام بھی غیر بہتر ہوتے ہیں، کچھ تو خدا کا خوف کیجئے۔

سادساً۔ قرآن کی اس آیت کا مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ جنازہ کے ساتھ کلمہ کو پڑھا جائے، آئیے پہلے قرآن کے الفاظ پر غور کریں، ارشاد ہوتا ہے

ان فی خلق السموات والارض و اختلاف الیل و النهار لآیت لاولی الالباب ☆ الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبہم و یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلاً نسبحنک فقنا عذاب النار۔ ال عمران آیت ۱۹۰ و ۱۹۱۔

یعنی بے شک آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کیلئے نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے

اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے ہیں کہ) اے پروردگار تو نے اے (مخلوق کو) بے فائدہ پیدا نہیں کیا تو پاک ہے تو (قیامت کے روز) ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو (۳-۱۹۰ تا ۱۹۱)

ان آیات کو آپ مکرر پڑھیے یہ کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں کہ یہاں ذکر سے مراد مخلوق کی پیدائش میں تدبیر ہے جسے مومن دیکھ دیکھ کر اللہ کی حمد و صفت بیان کرتا ہوا اپنے لئے مغفرت کی دعا کرتا ہے، مگر یار لوگوں نے اس سے مخصوص جنازہ کا بدعی ذکر کشید کر لیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گو بعض نے اس (یزکرون اللہ) سے بدنی و لسانی ذکر بھی بیان کیا ہے مگر انکے نزدیک بھی اس سے مراد نماز ہے جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ نے صحیح بخاری ص ۶۵ ج ۲ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث لا کر اس کو بیان کیا ہے اور اس کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے کہ

واقم الصلوٰۃ لذکری، طہ آیت ۱۴۔

یعنی میرے ذکر کیلئے نماز پڑھا کرو (۲۰-۱۴)

گویا قرآن کی آیت کا مقصود یہ ہوا کہ نماز کو ہر حالت میں پڑھا کرو خواہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا پہلو پر لیٹ کر، الغرض اس کی تفسیر میں دو ہی قول ہیں تدبیر اور اقامت صلوٰۃ، مگر مفتی صاحب کے کشید کردہ معنی کو کسی مسلم مفسر نے بیان نہیں کیا، پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

قرآن فرماتا ہے، الا بذکر اللہ تطمئنن القلوب، خبردار ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے دل

چین پاتے ہیں۔

اس کی تفسیر میں صاحب روح البیان فرماتے ہیں۔ پس قرآن سے اور اللہ کے ذکر سے جو اسم اعظم ہے، مسلمان انس لیتے ہیں اور اس کو سننا چاہتے ہیں اور کفار دنیا سے خوش ہوتے ہیں اور ذکر غیر اللہ سے سرور پاتے ہیں۔

اس آیت اور تفسیری عبارت سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر مسلمان کی خوشی و فرحت کا باعث ہے۔ مگر کفار اس سے رنجیدہ ہوتے ہیں، بجز اللہ میت بھی مسلمان ہے اور سب حاضرین بھی، سب

کو ہی اس سے خوش ہوگی، نیز میت کو اس وقت اپنے اہل و عیال سے چھوٹنے کا غم ہے یہ ذکر اس غم کو دور کرے گا، خیال رہے کہ اس آیت میں بھی ذکر مطلق ہے خواہ آہستہ ہو یا بلند آواز سے لہذا ہر طرح جائز ہو! محض اپنی رائے سے اس میں قید نہیں لگا سکتے۔ جاء الباطل ص ۲۰۵ ج ۱

الجواب

اولاً۔ اذان قبر کی بحث میں تفصیل سے گزر چکا ہے کہ ایک مومن و مسلمان وفات کے بعد اہل و عیال کی جدائی سے قطعاً غم نہیں کرتا، اس پر ہم نے بفضلہ تعالیٰ صحیح احادیث پیش کر دیں ہیں، لہذا مفتی صاحب کا بدعت کی ایجاد کے لئے یہ ایک چور دروازہ ہے، جس کی علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں۔

ثانیاً۔ آیت کے کس لفظ کا معنی ہے کہ جب جنازہ لیکر چلو تو اس کے ساتھ باواز بلند کلمہ طیبہ وغیرہ کا ذکر کیا کرو، آئیے ہم آپ کو مراد قرآنی سمجھا دیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے

الذین امنوا و تطمنن قلوبہم بذكر الله الا بذكر الله تطمنن القلوب۔ (سورۃ الرعد آیت ۲۸)

یعنی جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں سن رکھو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے (۱۳-۲۸)

دیکھئے اس آیت میں تو اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے کیونکہ جو ایمان لاتا ہے تو اس کو اللہ کے ذکر سے اطمینان قلبی میسر ہوتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک مسلمان و موحّد کی زندگی مصائب و مشکلات کے اندر نا کامیوں اور قید و بند کی صعوبتوں و مخالفتوں کی آفتیں، وسائل کی کمی کی دشواریاں وغیرہ میں بھی ان کے دلوں میں راحت ہوتی ہے، جبکہ بے دین لوگ فتوحات مال و دولت کی فراوانی کے باوجود انہیں اطمینان قلب میسر نہیں ہوتا بلکہ ہوس و تمنا کی آگ انکے سینہ میں بھڑکتی رہتی ہے، مگر ایک مسلمان و مومن کا دل اطمینان سے لبریز ہوتا ہے۔

الفرض اس آیت میں ذکر کرنے والے کے دل کو اطمینان میسر ہونے کی خوش خبری سنائی گئی ہے نہ کہ میت پر ذکر کرنے سے مردے کو چین ملنے کا وعدہ دیا گیا ہے مگر ہمارے مفتی صاحب ذاکر کی بجائے میت کو اطمینان کا استدلال کر رہے ہیں اسے ان کی سادگی سے تعبیر کیا جائے یا جہالت سے،

کچھ بھی ہو بہر حال ان کا استدلال منشا قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآن تو ذاکر کے اطمینان قلب کا ذکر کرتا ہے لیکن مفتی صاحب کھینچ تان کر میت کے اطمینان قلب پر فٹ کر رہے ہیں۔

ثالثاً۔ اختلاف ذکر سے نہیں بلکہ اس کے محل و طریقہ و کیفیت سے ہے، لیکن افسوس کہ مفتی صاحب اپنے طریقہ کے ثبوت پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں مطلق ذکر کو بیان کر رہے ہیں اور عوام بچارے انکی عیاری کو بھانپنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے وہ تو فقط انکی دستار و قبا کو دیکھ کر اعتماد کر بیٹھتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ اس کے نیچے کس قدر فریب کاری و عیاری و مکاری ہے۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

ابن عدی نے کامل میں اور امام زیلیعی نے نصب الراية لتخریج احادیث الہدایہ جلد دوم ص ۲۹۲، مطبوعہ مجلس ڈابھیل میں لکھا ہے

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال لم یکن یسمع من رسول اللہ ﷺ وهو یمشی خلف الجنائز الا قول لا اله الا الله مبدیاً و راجعاً۔

اگر یہ حدیث ضعیف بھی ہو پھر بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے جاء الباطل ص ۲۰۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے روایت کے الفاظ کا معنی جان بوجھ کر نہیں کیا کہ کہیں عوام کو یہ معلوم ہی نہ ہو جائے کہ روایت کے متن میں کسی فعل و عمل کی فضیلت قطعاً بیان نہیں کی گئی، بلکہ ایک عمل کی حکایت ہی بیان ہوئی ہے، اس ہیرا پھیری کے بعد صریحاً جھوٹ بولا کہ اگر ضعیف بھی ہو تب بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے، اے جی کس عمل کی فضیلت بیان ہوئی ہے جس کیلئے آپ نے یہ مخلص تلاش کیا ہے، علاوہ ازیں فضائل اعمال میں بھی ضعیف روایات معتبر نہیں، جس کی ضروری تفصیل دین الحق ص ۵۳ ج ۱ میں عرض کر دی گئی ہے۔

ثانیاً۔ علامہ زیلیعی حنفی نے اسے ابن عدی کے حوالے سے بیان کر کے اس کی تضعیف کی تھی، نصب الراية ص ۲۹۲ ج ۲، جسے مفتی صاحب بے ڈھکار ہضم کر گئے ہیں، اسی طرح امام ابن عدی نے الکامل ص ۲۶۹ ج ۱، و ص ۱۶۰۸ ج ۲، میں اس کی پر زور الفاظ میں تضعیف کی ہے۔

مفتی صاحب کا فرض تھا کہ اس کی صحت ثابت کرتے اور علامہ زلیعی و ابن عدی کی جرح کا جواب دیتے، مگر مفتی صاحب نے اس سے تو آنکھیں بند کر لیں، کہ ان کی جرح کا جواب ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے، ہاں البتہ غیر متعلقہ بحث کو حسب دستور درمیان میں گھسیٹ لائے کہ فضائل میں ضعیف روایات معتبر ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اے جی یہ روایت فقط ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع (من گھڑت) ہے کہ اس کا راوی ابراہیم بن احمد المدانی کو امام ابو عروبہ نے، یضع الحدیث (یعنی احادیث گھڑتا تھا) کہا ہے، ابن عدی ص ۲۶۹ ج ۱، و میزان الاعتدال ص ۱۷۱ ج ۱۔

مگر ہمارے مہربان مفتی صاحب اسے فضائل میں ضعیف الخ کہہ کر اپنا الوسیدھا کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

منتخب کنز العمال جلد ہشتم ص ۹۹ میں بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ ہے

اکثر وافى الجنازة قول لا اله الا الله، جاء الباطل ص ۲۰۵ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس روایت کا بھی مفتی صاحب نے ترجمہ عمداً ترک کر دیا ہے کہ کہیں میری بے ایمانی کا بھاڈا نہ پھوٹ جائے، آئیے ہم آپ کو بتاتے جائیں کہ ترجمہ نہ کرنے میں کوئی مصلحت و مجبوری تھی، قارئین کرام بات یہ ہے کہ متن روایت کا یہ معنی ہے کہ جنازہ کے اندر اکثر، لا اله الا الله، کہا کرو، دیکھئے مقیاس حقیقت ص ۵۸۲ از مولوی محمد عمر اچھروی بریلوی۔

ان الفاظ کا یہ مفہوم تھا کہ جنازہ پڑھتے ہوئے اس کے بیچ میں کلمہ کو کثرت سے پڑھا کرو، ظاہر ہے کہ ان الفاظ سے مفتی صاحب کا، مدعا جنازہ کے ساتھ کلمہ وغیرہ کا ذکر، ثابت نہ ہوتا تھا، تو مفتی صاحب نے روایت کے متن کو نقل کر کے ترجمہ ترک کر دیا تا کہ عوام یہی سمجھیں کہ اس روایت کا تعلق بھی جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے کلمہ پڑھنے سے ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس کہ مبتدعین میں ایسے لوگ بھی مفتی اعظم، حکیم الامت اور مفسر قرآن کے القاب سے یاد

کیے جاتے ہیں، جو عوام کو بصیرتاً مغالطہ دیکر اپنا اعمال نامہ سیاہ کرتے رہے ہیں۔
 ثانیاً۔ منتخب کنز العمال، مسند احمد، کے حاشیہ پر حیدر آباد دکن سے طبع ہوئی تھی، جو کہ مسند کی چھ جلدوں کے ساتھ مطبوع ہے، لیکن مفتی صاحب اس کی جلد ہشتم کا حوالہ دے رہے ہیں، معلوم یوں ہوتا کہ مفتی صاحب نے اصل کتاب کی طرف مراجعت نہیں کی کسی رسالے سے حوالہ نقل کرتے ہوئے ان سے سہو ہوا ہے۔

ثالثاً۔ ہمیں یہ روایت اصل، کنز العمال ص ۹۵۰ ج ۱۵ میں رقم الحدیث (۳۲۵۷۸) کے تحت بحوالہ مسند فردوس الاخبار للذہبی ملی ہے، دیلمی کو دیکھ لیا گیا ہے اس میں یہ روایت سرے سے موجود ہی نہیں، ہاں البتہ علامہ عبدالرؤف مناویؒ نے، جامع الصغیر کی شرح، فیض القدیر ص ۸۸ ج ۲، طبع مصر ۱۹۳۸ء میں اس کی نسبت دیلمی کی طرف کر کے لکھا ہے، بسند فیہ مقال، یعنی اس کی سند میں جرح ہے، اسی طرح علامہ البانی رحمۃ اللہ، نے ضعیف الجامع الصغیر و زیادتہ ص ۱۵۷ (رقم الحدیث ۱۱۱۴) میں اس کی تضعیف کی ہے۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

مشکوٰۃ کتاب الدعوات باب ذکر اللہ میں ہے
 ان لله ملئكة يطوفون في الطرق يلتمسون اهل الذكر فاذا وجدوا قوما
 يذكرون الله ثنوا دوا هلموا الي حاجتكم قال فيحفظوا لهم باجنتهم
 اللہ کے کچھ فرشتے راستوں میں چکر لگاتے ہیں ذکر اللہ کرنے والوں کو تلاش کرتے ہیں ایسے جبکہ کسی قوم کو ذکر الہی کرتے ہوئے پاتے ہیں تو ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کہ آؤ اپنے مقصد کی طرف پھر ان ذکرین کو پروں میں ڈھانپ لیتے ہیں، ان
 لہذا اگر میت کے ساتھ لوگ ذکر اللہ کرتے ہوئے جائیں گے تو ملائکہ راستے ہی میں ملیں گے اور ان سب کو اپنے پروں میں ڈھانپ لیں گے، میت بھی ملائکہ کے پروں کے سایہ میں قبرستان تک جائے گی، خیال رہے کہ اس حدیث میں ذکر مطلق ہے خواہ آہستہ ہو یا بلند آواز سے۔ جا الباطل ص ۲۰۶ ج ۱

الجواب

اولاً۔ جب مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ اس حدیث میں مطلق ذکر کا بیان ہے تو پھر ان کی یہ دلیل کس طرح بن گئی کیونکہ ان کا دعویٰ عمل مطلق نہیں بلکہ مقید ہے کہ جنازہ کے ساتھ ذکر بالجہر کیا جائے۔

ثانی۔ مبتدعین کا دعویٰ اور عمل یہ ہے کہ وہ میت کو اٹھا کر چلتے ہوئے راستے میں کلمہ طیبہ وغیرہ کا ذکر بالجہر کرتے ہیں، مگر ذریعہ بحث حدیث میں مجلس ذکر کا بیان ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

عن النبی ﷺ قال ان لله تبارک وتعالی ملائکة سیارة فضلا یستغون مجالس الذکر فاذا وجدوا مجلسا فیه ذکر فعدوا معهم و خف بعضهم بعضا با جنحتهم حتی یملوا ما بینهم و ما بین السماء الدنیا فاذا تفرقوا عرجوا وصعدوا الی السماء، الحدیث،

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ کے کچھ فرشتے گشت کرنے والے ہیں جو ذکر کی مجالس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں جب وہ ذکر کی کوئی مجلس پاتے ہیں تو ان (ڈاکرین) کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے پروں سے بعض فرشتے بعض دوسرے فرشتوں کو (اوپر تلے) ڈھانپ لیتے ہیں جب ذکر کرنے والے اٹھ جاتے ہیں تو یہ فرشتے آسمان کی طرف پڑھ جاتے ہیں، الحدیث، صحیح مسلم ص ۳۴۴ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ مفتی صاحب کی پیش کردہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں مجلس کی بات ہے نہ کہ چلتے ہوئے کے بارے میں ہے، پھر آگے صاف بیان ہے کہ فرشتے ان کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور مجلس برخاست ہونے پر وہ آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب اسے راستے کے ذکر پر محمول کر رہے ہیں جو کہ غلط بیانی ہی نہیں بلکہ حدیث نبوی میں یہودانہ حد تک تحریف بھی ہے۔

ثالثاً۔ مذکورہ حدیث کا جو ہم نے ترجمہ کیا ہے وہ مولوی غلام رسول سعیدی حقی بریلوی کا ہے جو اس کی، شرح صحیح مسلم ص ۴۶۲ ج ۷، سے ہم نے، کا، کی، کی تبدیلی سے نقل کیا ہے، اسے مکرر پڑھ

لیجئے، حدیث میں پروں سے ڈھانپ لینے کا بیان ذاکرین کے بارے میں قطعاً نہیں، مگر بریلوی امت کا حکیم الامت، اسے ذاکرین کے بارے میں باور کرا کر میت کو بھی ساتھ شامل کر رہے ہیں، جو کہ صریحاً بے ایمانی ہے۔

رابعاً۔ اس حدیث میں، ذکر کی مجالس کی فضیلت بتائی گئی ہے جس سے کسی کلمہ گو کو قطعاً انکار نہیں، انکار تو آپ کے بدعی عمل سے ہے کہ میت کے ساتھ ذکر بالجہر کے طریقہ سے کلمہ وغیرہ کا ورد کیا جائے، لیکن اس حدیث میں تو سرے سے اس کا بیان ہی نہیں، مفتی صاحب کا استدلال بالکل اس بچہ نادان کی طرح ہے جو طلوع آفتاب اور غروب سورج کے وقت نفل پڑھنے لگ جائے، اور منع کرنے پہ نوافل کے فضائل کی احادیث بیان کرنے لگے، دیانت پسے کہنا کہ اسکی اس بات کو آپ حضرات دلیل سے تعبیر کریں گے یا اسے دماغی اپریشن کا مشورہ دیں گے۔

بالکل اسی طرح ہم آپ کے استدلال کو غلط و باطل کہہ کر اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ! انہیں دین کی سمجھ اور قرآن و حدیث کا اے اللہ علم عطا کر، اور انہیں بدعات ترک کرنے کی توفیق دے کہ ان میں پڑ کر یہ لوگ خطبی ہو چکے ہیں۔

خامساً۔ مفتی صاحب نے استدلال تو غلط کیا ہی تھا کہ یہ ان کی مجبوری تھی کہ غلط سلط قیاس سے ہی ان کی گاڑی چلنی تھی، مگر افسوس کہ مفتی صاحب نے حدیث کے الفاظ بھی غلط نقل کیئے ہیں، درست الفاظ، فیحفونہم، کے ہیں جنہیں مفتی صاحب نے حسب عادت، فیحفولہم، سے بدل دیا ہے۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

مشکوٰۃ اسی باب میں ہے کہ

اذا مررتم برياض الجنة فارتعوا قالوا و ما رياض الجنة قال خلق الذكر.

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم جنت کے باغوں میں سے گزرو تو کچھ کھا لیا کرو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں؟ فرمایا کہ ذکر کے حلقے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر میت کے ساتھ ذکر الہی ہوتا ہوا جاوے تو میت جنت کے باغ میں

قبرستان تک جاوے گا، خیال رہے کہ یہاں ذکر مطلق ہے، آہستہ یا بلند آواز سے، جاء الباطل ص ۴۰۶ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن ثابت البنانی ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۲۶۳ ج ۴، و مسند احمد ص ۱۵۰ ج ۳، و ابویعلیٰ ص ۳۸۳ ج ۳، و ابن عدی ص ۲۱۴ ج ۶، وغیرہ، اور یہ متکلم فیہ راوی ہے، امام ابن معین اسے، لیس بشیخی (بیچ محض) کہتے ہیں، امام ابو حاتم کہتے ہیں منکر حدیث ہے اس کی روایات سے احتجاج نہ کیا جائے، امام بخاری، فیہ نظر، فرماتے ہیں، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام دارقطنی نے اسے ضعیف کہا ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی روایات کا کوئی متابع نہیں، امام ابن معین فرماتے ہیں کہ فی نفسہ تو صدوق ہے مگر ضعیف الحدیث ہے، امام ابو زرعہ اسے لین، کہتے ہیں، امام ازدی اسے، ساقط (اعتبار سے گرا ہوا) فرماتے ہیں، امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ اپنے والد سے ایسی روایات نقل کرتا ہے جو اس کی مرویات سے نہیں، اس سے احتجاج کرنا جائز نہیں، تہذیب التہذیب ص ۸۳ ج ۹، و میزان الاعتدال ص ۴۹۵ ج ۳، و خلاصہ ص ۳۸۶ ج ۲، حافظ ابن حجر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، تقریب التہذیب ص ۲۱۶۔

ثانیاً۔ جب مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ یہ حدیث مطلق (عام) ہے تو پھر یہ مفتی صاحب کی دلیل کس طرح بن گئی کیونکہ مبتدعین کا دعویٰ و عمل مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔

ثالثاً۔ اس حدیث کے کس لفظ کا معنی ہے کہ میت کے پیچھے بلند آواز کلمہ طیبہ وغیرہ کا ورد کیا جائے، جب سرے سے اس کا زیر بحث موضوع سے واسطہ ہی نہیں تو اس سے مبتدعین کی رسم کیسے ثابت ہو گئی، پھر اسی طرح کی دوسری ضعیف روایت میں آتا ہے کہ

قال رسول الله ﷺ اذا مررتم برياض الجنة فارتعوا قلت يا رسول الله ﷺ وما رياض الجنة قال المساجد، قلت وما الرتع يا رسول الله ﷺ قال سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو اس سے کچھ کھالیا کرو،

میں (ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ جنت کے باغ کیا ہیں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ کی) مساجد، میں نے عرض کیا کہ کیسے کھالیا کریں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ کا کہنا (اس کا کھانا ہے) سنن ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ص ۲۶۳ ج ۳۔

اس روایت سے ثابت ہوا کہ مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت کا تعلق مساجد میں ذکر، سبحان اللہ والحمد للہ، الخ کے کرنے سے ہے، مگر مبتدعین کے نزدیک تو مساجد میں میت کو لیکر جانا ہی ناجائز ہے (کیونکہ ان کے نزدیک مساجد میں نماز جنازہ مکروہ تحریمی ہے، فتاویٰ رضویہ ص ۷۵ ج ۴) تو پھر اس روایت سے مبتدعین کا مروجہ عمل کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔
راجعاً اس کا تعلق ذکر مجلس سے ہے جیسا کہ مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت میں بھی، حلق الذکر کے الفاظ موجود ہیں، مگر مفتی صاحب نے کمال دیانت داری سے، جوڑ توڑ کر کے اسے جنازہ کے پیچھے کے بارے میں باور کرایا ہے جو کہ صریحاً بدوایتی ہے۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

اسی مشکوٰۃ اسی باب میں ہے

الشیطن جائم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر اللہ خنس۔
شیطان انسان کے دل میں چمٹا رہتا ہے جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ہٹ جاتا ہے۔
معلوم ہوا کہ اگر میت کو لے جاتے وقت ذکر اللہ کیا جاوے گا تو شیطان سے میت کو امن ہے گی، یہاں بھی ذکر میں ہمت یا بلند کی کوئی قید نہیں۔
جاء الباطل ص ۶۰۶ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ صاحب مشکوٰۃ نے اسے بخاری کی طرف مرفوعاً منسوب کیا ہے، مشکوٰۃ ص ۱۹۹، حالانکہ یہ بخاری میں مرفوعاً نہیں بلکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے، دیکھئے بخاری ص ۴۴ ج ۲۔
مولانا عبید اللہ محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

فی عزو هذا السياق المرفوع للبخاری نظر فانه ذکر فی تفسیر سورة الناس معناه عن ابن عباس موقوفا علیہ من قوله لا مرفوعاً۔

یعنی اس سیاق و سباق کے لحاظ سے بخاری کی طرف نسبت میں نظر ہے کیونکہ امام بخاری نے سورة الناس کی تفسیر میں معنی اس کو ابن عباس کے قول سے بیان کیا ہے نہ کہ مرفوعاً۔ میراۃ المفاتیح ص ۲۱۶ ج ۷۔

امام ابن کثیر نے تفسیر القرآن العظیم ص ۵۷۵ ج ۴ میں علامہ سیوطی نے الدرامہ شور ص ۳۲۰ ج ۶ میں اسے ابن عباس کا قول ہی بیان فرمایا ہے۔
غالباً امام بخاری نے اسے تعلیقاً (بلا شد) روایت کیا ہے امام حاکم نے مستدرک ص ۵۵۱ ج ۲ میں اس کی سند کو بیان کیا ہے جس کو حافظ ابن حجر نے حکیم بن حمیرہ زاوی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے،

فتح الباری ص ۲۰۳ ج ۸، و تعلق من ۸۱ ج ۴۔
آئمہ جرح و تعدیل نے حکیم بن حمیرہ کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ضعیف و متروک ہے چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں، ضعیف الحدیث اور مضطرب ہے امام ابن معین فرماتے ہیں کہ صحیح محض ہے امام معاذ اور یحییٰ قطان نے امام شعبہ سے کہا کہ ہم حکیم کی روایت کا مزا کرہ نہ کریں؟ تو انہوں نے کہا کہ میں (جہنم کی) آگ سے ڈرتا ہوں، امام یعقوب، امام ابو زرعة، امام ساجی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، بلکہ ابو زرعة نے اسے منکر الحدیث بھی کہا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں قوی نہیں، وار قطنی کا کہنا ہے کہ متروک ہے۔

تہذیب التہذیب ص ۳۸۳ ج ۲، و میزان الاعتدال ص ۵۹۳ ج ۱۔
الغرض یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ ہونے کے ساتھ ساتھ ضعیف بھی ہے۔

ثالثاً۔ اس قول ابن عباس میں ذکر کرنے والے کے دل سے شیطان کے ہٹ جانے کا ذکر ہے نہ کہ میت کے پاس ذکر بالجہر کرنے سے شیطان میت کو دکھ نہ دے گا جیسا کہ مفتی صاحب باور کرارہ ہیں۔

رابعاً۔ اس میں سرے سے زیر بحث مسئلہ کا بیان ہی نہیں کہ میت کے ساتھ کلمہ طیبہ کا ذکر بالجہر

کیا جائے تو میت سے شیطان دور ہو جاتا ہے، تو پھر یہ مفتی صاحب کی دلیل اور مبتدعین کے عمل کا ثبوت کیسے بن گئی۔

خلاصہ کلام

یہ کہ مفتی صاحب اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کوئی واضح اور صریحاً دلیل پیش نہیں کر سکے، ہاں البتہ غیر متعلقہ روایات کی بھر مار کر دی ہے جن کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ مبتدعین کا دعویٰ خاص ہے اس کیلئے دلیل بھی خاص کی ضرورت ہے مگر مفتی صاحب نے مطلق ذکر کی روایات بیان کر کے اس قلعہ کو فتح کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے، جو امر واقعہ میں کار آمد نہیں۔ بلکہ مفتی صاحب نے عوام کو مغالطہ دینے کی غرض سے ایسی روایات بھی بیان کر دی ہیں جن کا شرم کے مارے انہوں نے خود بھی معنی ترک کر دیا ہے کہ کہیں عوام یہ نہ کہہ دیں کہ حضرت جی اس سے ہمارا عمل کس طرح ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد مفتی صاحب نے، حدیقتہ الندیہ اور امام شعرانی کی عبارات ذکر کی ہیں، مگر کسی دینی مسئلہ کا ثبوت فقط کتب فقہ کی عبارات سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ٹھوس قرآن و حدیث کے دلائل درکار ہیں، جو خیر سے مبتدعین کے پاس قطعاً نہیں، یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام شعرانی حنفی نہیں بلکہ شافعی المسلک تھے، اور شافعیہ کی عبارات جب مفتی صاحب کے رد میں ہوں تو یہ کہہ کر جان چھڑا جاتے ہیں کہ یہ شافعی ہیں لہذا ان کی بات ہم حنفیہ پر حجت نہیں، دیکھئے جاء الباطل ص ۱۷۳۱۶۔

مگر یہاں شافعیہ کی عبارات کو حجت باور کر رہے ہیں، جو کہ صریحاً اصول فکفی ہے، اس پر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے انہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

SCANNING: MUHAMMAD SHAKIR
truemaslak@inbox.com

باب حیلہ اسقاط کی بحث

حیلہ قرآن و حدیث کی روشنی میں

تعریف کے لائق وہ مالک حقیقی ہے جس نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہماری ہدایت کیلئے دین حق دیکر بھیجا اور اس میں تمام فوائد کو بیان کر دیا جو بنی آدم کی بہتری اور فلاح و بہبود کیلئے کافی و شافی ہیں آنحضرت ﷺ نے حکم الہیہ پر عمل کر کے دین اسلام کی تعلیم کو روشن سے روشن تر کر دیا بالآخر آپ علیہ السلام نے پورے جزم و یقین کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ

لقد ترکتم علی مثل البیضاء لیلھا کنھا رہا۔ الحدیث

یعنی اللہ کی قسم ہے کہ میں نے آپ کو ایسی روشن شریعت پر چھوڑا، کہ جس کی رات بھی دن کی طرح ہے، کنز العمال (۱۰۶۲) وابن ماجہ (۵) و کتاب السنۃ لابن ابی عاصم ص ۱۰۲۷۔ وسندہ حسن، الترغیب ص ۱۸۸ ج ۱

دین میں جس قدر مصلحتیں اور آسانیاں تھیں انہیں رسول اللہ ﷺ نے کھول کر بیان کر دیا، اور ان کی توضیح و تشریح اس طرح بیان فرمائی کہ رب القدیر نے اپنی طرف سے دین اسلام کی تکمیل کا اعلان فرمادیا کہ

اليوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً۔ (المائدہ آیت ۳)۔

(اور) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا، (۵-۳)

دین کی تکمیل یہی ہے کہ اس میں رشد و ہدایت کے تمام طریقوں اور اعمال صالحہ کو بیان کر دیا گیا ہے اور ان پر عمل کرنا، ان کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا اور بلا چوں و چرا نہایت سادگی سے قبول کر لینا ہی راہ ہدایت اور طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دین میں استقامت ہے۔

اگر اسقاط کے طریقے سے میت کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا یا رب قدیر کی رحمت کا حصول ممکن تھا تو

رسول اللہ ﷺ اس کو ضرور بیان فرماتے، اور امت کو ایسا کرنے کا حکم فرماتے، کیونکہ آپ علیہ السلام رحمۃ للعالمین ہیں، آپ ﷺ کے دل میں امت کی ہمدردیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئیں تھیں، بنی آدم کے ایسے غم خوار تھے کہ رب قدیر نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ،

فلعلک باخع نفسك على آثارهم ان لم يؤمنوا بهذا الحديث اسفا.
(الکھف ۶)

(اے پیغمبر) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم انکے پیچھے رنج کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے (۱۸-)

لعلک باخع نفسك الا یكونوا مومنین (الشعراء ۳)

(اے نبی ﷺ) شاید تم اس (رنج) سے کہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے (۲۶-۳)

امام راغب، بخی، کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

البخع قتل النفس غما.

یعنی غم و اندوہ سے جان کو تلف کر دینا، المفردات ص ۳۹۔

یہ دونوں آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھیں، جب کفار مکہ کی عداوت کا یہ حال تھا کہ کسی معقول بات کو سننا تو کجا بلکہ مذاق اڑاتے تھے، لیکن ادھر پیکرِ رحمت کی یہ حالت ہے کہ اہل مکہ کو ہر وقت ہلاکت سے بچانے کا فکر دامن گیر ہے، بیت اللہ کے صحن میں، مکہ کی گلیوں و بازاروں میں ان کے دیوان خانوں میں جا کر آپ علیہ السلام انہیں سمجھاتے ہیں، لیکن وہ ہر بار آپ علیہ السلام کو جھڑک دیتے ہیں؟ غصے ہوتے ہیں، قتل کرنے کا منصوبہ تیار کرتے ہیں، منہ پر گالیاں دیتے ہیں، راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں، مگر آپ علیہ السلام کا یہ بے لوث عمل جاری رہتا ہے، رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے، لوگ محو خواب ہوتے ہیں، تو یہ اخلاص و محبت کا پیکر اٹھتا ہے، اپنا سر پروردگار عالم کے سامنے جھکاتا ہے، اور خالق ارض و سماء سے رور و کرآن کیلئے ہدایت کی دعائیں و التجائیں کرتا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان میں سے ایک بھی ایمان سے محروم رہا تو آپ علیہ السلام کی جان پر بن جائے گی، اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، تو ارشاد ہوتا ہے کہ ان جان کے دشمنوں اور خون کے

پیا سوں کیلئے اس قدر بے چینی و اضطراب، نہ کیجئے کہ اپنی جان ہی تلف کر دیں بلکہ تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

و کذب به قومک و هو الحق قل لست علیکم بوکیل . (الانعام ۶۶)

اور اس (قرآن) کو تمہاری قوم نے جھٹلایا حالانکہ وہ سراسر حق ہے کہہ دو کہ میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں (۶-۶۶)

آپ علیہ السلام کے دل میں تو غیروں کیلئے بھی اس قدر نرم گوشہ تھا۔ کہ جنہوں نے پتھر مار مار کر لہو لہان کر دیا تھا ان کے حق میں بھی جب جبرائیل امین پروردگار عالم کا یہ پیغام لیکر آئے کہ اگر آپ حکم کریں تو میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان کچل دوں، تو ایسا ہی ہوگا۔

مگر پیکرِ رحمت ﷺ فرماتے ہیں

بل ارجوان یخرج اللہ عزوجل من اصلاہم من یبعد اللہ عزوجل وحدہ
لا یشرک بہ شیئا، الحدیث، عن عائشة رضی اللہ عنہا۔

نہیں بلکہ مجھے اللہ عزوجل سے امید ہے کہ ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کریگا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے گی، صحیح بخاری ص ۴۵۸ ج ۱، و صحیح مسلم ص ۱۰۹ ج ۲۔

جو شخصیت اپنی جان کے دشمنوں کے ساتھ اتنی رؤف و رحیم ہے، اس کا اپنی امت سے کس قدر پیار و محبت ہوگا، اس کے دل میں کلمہ گو کو بخشنے کی کس قدر تڑپ ہوگی، اس کا اندازا لگانا مشکل ہے، مگر اتنی عظیم شخصیت نے ہمیں اس کی تعلیم نہیں دی کہ جب مسلمان مرجائے تو اس کو بخشنے کیلئے حیلہ اسقاط کرنا، فرائض سے غافل کی غفلت کے جرم کو اسقاط کے ذریعہ معاف کروانا، پوری دنیا کے مبتدعین سر توڑ کوشش کر لیں انہیں کوئی صحیح تو کجا ضعیف حدیث بھی نہیں ملے گی کہ بے نمازی وغیرہ کیلئے حیلہ اسقاط کیا جائے، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ یار لوگوں نے قوم سے پیسے بنورنے کا ایک پہانا بنا رکھا ہے، سادہ عوام کو ان کے والدین کی بخشش کا جھانسا دیکر پیٹ پوجا کا ایک دروازہ کھول رکھا ہے، بلکہ الٹا اس بدعت کا انکار کرنے والوں کو ان الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔

وہابی جس طرح زندہ مسلمان کے دشمن ہیں اسی طرح مردوں کے بھی دشمن کہ ان کو نفع پہنچانے سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ (لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ابوصہیب) اور مرے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔
جاء الباطل ص ۳۸۳ ج ۱۔

حالانکہ یہ صریحاً جھوٹ ہے، ہمارا دامن ان الزامات سے بری ہے، نہ تو ہم کسی زندہ وفوت شدہ مسلمان کے دشمن ہیں اور نہ ہی ہم ان کو فوائد پہنچانے کے منکر ہیں، مرنے والوں کے حق میں مغفرت کی دعا کو مسنون جانتے ہیں، والدین کی طرف سے صدقہ و خیرات کرنے کے بھی قائل ہیں۔

اگر دشمنی سے مراد مفتی صاحب کی حیلہ اسقاط کا انکار ہے تو پھر اس دشمنی میں ہمارے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آئمہ عظام فقہاء کرام بھی شامل ہیں، لہذا اسکے بہانے فقط بچارے وہابیوں کو ہی کیوں مطعون کیا جا رہا ہے، ان کے پورے گروہ کو مطعون کیجئے جو تمام کے تمام ان خرافات کے منکر ہیں اور بالخصوص نبی ﷺ کی ذات مقدسہ کو جنہوں نے حیلہ اسقاط کی تعلیم نہ دیکر مسلمانوں سے دشمنی کی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رب کعبہ کی قسم ہے کہ اسقاط نہ کرنا مومنوں سے دشمنی ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اسقاط ضرور کرتے، معلوم ہوا کہ یہ مومنوں سے سرے سے دشمنی ہی نہیں بلکہ بدعت پسند پارٹی نے عوام کا مال ہضم کرنے کا ایک ذریعہ تلاش کر رکھا ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَ الرِّهْبَانِ لَيَاْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ
وَيَصْدُونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (التوبة ۳۴)

یعنی اے ایمان والو! بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور (ان کو) اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں (۹-۳۴)

الغرض بریلوی مولوی و مشائخ اور گدی نشین پیر و فقیر اور درویش بلکہ حکیم الامت وغیرہ بالکل اس آیت کے مصداق ہیں کہ ان لوگوں نے عوام کو عبادات کی بجائے کھانے پینے کی رسوم کی طرف متوجہ کر رکھا ہے، اگر ان رسومات قبیحہ کو نکال دیا جائے تو بریلوی مکتب فکر کے انفرادی نظریات پچاس فیصد ختم ہو جاتے ہیں باقی جو بچتے ہیں وہ یا تو ان کے تابع ہیں یا جہالت کی وجہ سے تعصب و ضد کی

پیداوار ہیں، ورنہ یقین جانیں کہ اسلام کا دامن ان خرافات سے پاک ہے۔

جن لوگوں نے حیلہ کیا تھا ان کا انجام

قرآن اس بات پر گواہ ہے جن لوگوں نے رب تعالیٰ کے حکم کو حیلہ سے ٹال دیا تھا ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس دنیا میں ہی کڑی سزا دی کہ انہیں بندر بنا دیا، ارشاد ہوتا ہے

ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت فقلنا لهم کو نوا قرده حسنین ☆
فجعلنا نکلًا لما بین یدیہا و ما خلفها و موعظة للمتقین ☆ (البقرہ آیت ۲۵ و ۲۶)
اور تم ان لوگوں کو بخوبی جانتے ہو جو تم میں سے ہفتے کے دن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کر گئے تھے، تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ، اور قصے کو اس وقت کے لوگوں کیلئے اور جوان کے بعد آنے والے تھے عبرت اور پرہیز گاروں کیلئے نصیحت بنا دیا (۲-۲۵ و ۲۶)

قرآن کے یہ الفاظ حیلہ کے رد میں نص صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو حیلوں و بہانوں سے رد کرنا، عذاب الہی کو دعوت دینا ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے حیلہ سے ہی حکم الہی کی نافرمانی کی تھی کہ انہیں اس بات کا حکم دیا گیا کہ سبت کا دن عبادت کیلئے مخصوص ہے، اس روز ان کیلئے دنیاوی کاروبار ممنوع تھے لیکن مرور زمانہ کی وجہ سے انہوں نے رفتہ رفتہ اس حکم کو حیلہ و فریب سے بے اثر کر دیا تو خالق کائنات نے ان کے اس فعل کو برداشت نہ کیا اور ان پر اپنا عذاب مسلط کر دیا، جس نے انہیں ذلت و خواری کے ساتھ صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا، پھر ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ اس سزا کو ہم نے اگلے پچھلے لوگوں کیلئے عبرت بنا دیا اور پرہیز گاروں کیلئے نصیحت، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ قرآن کا مقصود فقط داستان سرائی نہیں بلکہ ہماری عبرت پزیری کیلئے اسے بیان کر رہا ہے۔

مفتی صاحب کا اعتراض

فرماتے ہیں کہ حیلہ کا حرام ہونا بھی بنی اسرائیل پر عذاب تھا جیسے کہ بہت سے گوشت ان پر حرام تھے، ایسے ہی یہ بھی اس امت پر جائز حیلوں کا حلال ہونا رب کی رحمت ہے نیز انہوں نے حرام

کو حلال کرنے کا حیلہ کیا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار ان پر حرام تھا ایسے حیلے اب بھی منع ہیں۔ جاء الباطل ص ۳۹۱ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کی مذکورہ عبارت میں تناقض ہے، پہلے تو فرمایا کہ حیلے بنی اسرائیل پر حرام تھے، جو اللہ کی طرف سے ان پر عذاب تھا، مگر امت مسلمہ پر حیلوں کا جائز ہونا رحمت ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ حرام کو حلال کرنا ان میں بھی ناجائز تھا اور ہمارے ہاں بھی منع ہیں۔

● گویا مفتی صاحب پہلے ایک چیز کو ان کیلئے عذاب اور اپنے لئے رحمت کہہ رہے ہیں لیکن معاً بعد ہی اسی چیز کو ان کیلئے بھی حرام اور اپنے لئے بھی منع فرما رہے ہیں، یعنی جس طرح ان کیلئے حیلوں کی ممانعت عذاب تھی ایسے ہی اب بھی ہے، معلوم نہیں کہ مفتی صاحب کتاب لکھتے وقت محو خواب ہوتے تھے، کہ کچھ نہ کچھ جواب تحریر کر دوں، یہی ہماری کامیابی کا راز ہے۔

ثانیاً۔ بعض ایسے گوشت جو امت اسلام پر حلال اور بنی اسرائیل پر حرام تھے، اس چیز کا بیان تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق حضرت محمد ﷺ نے کیا ہے، اور ان کی حلت کو کھول کر بیان فرمایا ہے، تو کیا بنی اسرائیل کے حیلوں کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے امت محمدیہ کیلئے جائز بنایا ہے، دلیل دیجئے۔

یقین جانیئے کہ یہ مفتی صاحب کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ پر کھلا کھلا بہتان ہے، پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اور عاشقین بدعات سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کر سکتے۔

اہل اسلام مفتی صاحب کے اس کلام سے مغالطہ نہ کھانا بلکہ آپ کے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے صاف کہا ہے کہ حیلہ جس طرح قوم موسیٰ پر حرام تھا اسی طرح امت محمدیہ ﷺ پر بھی حرام ہے، چنانچہ امام ابن بطہ نے اپنی معروف کتاب، ابطال الحیل (رقم الحدیث ۴۲) میں نبی ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال لا تتركبوا ما ارتکت

اليهود فتنستحلوا محارم الله بادنئ الحيل.

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جن چیزوں کے یہود مرتکب ہو چکے ہیں، تم نہ ہونا کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو ادنیٰ ادنیٰ حیلوں سے حلال کر لینا۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس کی سند جید ہے، تفسیر ابن کثیر ص ۱۰۷ ج ۱ و ص ۲۵۷ ج ۲۔

مگر حضرت مفتی صاحب اس صحیح حدیث کے بالمقابل یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حیلوں کا حرام ہونا یہود پر عذاب تھا جب کہ یہ ہمارے لئے حلال ہو کر رحمت الہی ہیں، انا للہ ونا الیہ راجعون۔
اے جی اگر ہمارے لئے یہ رحمت ہوتے تو نبی ﷺ اسے منع نہ فرماتے، کیونکہ آپ علیہ السلام حصول رحمت کے کاموں کی تلقین کرنے کیلئے آئے تھے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کرنے سے منع کرنے کی غرض سے تشریف نہ لائے تھے۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ دعویٰ کہ ایسے حیلے اب بھی حرام ہیں جس سے حرام کو حلال کر لیا جائے، یقیناً جائیے کہ اس عبارت کو لکھ کر مفتی صاحب نے عوام کو مغالطہ دیا ہے کیونکہ اس عبارت پر خود مفتی صاحب کا ایمان بھی حلق کے اوپر اوپر سے ہی ہے، ورنہ یہ لوگ حیلے سے حرام کو حلال میں بدلنے کے قائل ہیں، کیونکہ خود انہوں نے اسی کتاب میں حلالہ کا فتویٰ دیا ہے، دیکھئے جاء الباطل ص ۲۵۴ ج ۱،

ہم قارئین کرام کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مبتدعین سے پوچھئے کہ کیا حلالہ کے ذریعے آپ حرام کو حلال میں نہیں بدلتے؟ اگر بدلتے ہیں اور یقیناً بدلتے ہیں، تو بتائیے ایسا شخص کس قبیل کا ہے جو محض اعتراض سے جان چھڑانے کی غرض سے صریحاً جھوٹ بولتا ہو۔

اس کی ایک اور مثال خود مولف جاء الباطل کی تصانیف سے سنتے جائیے، فرماتے ہیں، سید کو زکوٰۃ دینے یا مسجد میں لگانے کیلئے یہ حیلہ کیا جاوے کہ کسی فقیر کو دے دی جائے اور وہ مالک بن کر اپنی طرف سے وہاں صرف کر دے تو عین ثواب ہے، تفسیر نعیمی ص ۴۲۲ ج ۱، اور اس چیز کو اختصار کے ساتھ مفتی صاحب نے جاء الباطل ص ۳۸۹ ج ۱، میں بھی بیان کیا ہے اب دیکھئے کہ مسجد میں زکوٰۃ

کو صرف کرنا حنفیہ کے نزدیک حرام ہے، اس حرام کو اس حیلے سے حلال کر لیا ہے کہ فقیر کو دیکر پھر مسجد کے مصرف میں لائی گئی ہے، اس طرح سید آل رسول پر زکوٰۃ حرام ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبدالمطلب بن ربیعۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

قال رسول الله ﷺ ان هذه الصدقات انما هي اوساخ الناس و انها لا تحل

لمحمد ولا لآل محمد.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ یہ صدقات لوگوں کی میل کچیل ہے اور بے شک یہ حلال نہیں محمد ﷺ اور ان کی آل کیلئے،

مشکوٰۃ ص ۱۶۱، صحیح مسلم ص ۳۴۴ ج ۱، و مسند احمد ص ۱۶۶ ج ۴،

یہ حدیث اس بات پر برہان واضح ہے کہ آل رسول اللہ ﷺ پر زکوٰۃ حرام ہے، مگر مفتی صاحب اس حرام کو حیلے سے بدل رہے ہیں، مگر پھر بھی یہ کہتے ہوئے ذرا برابر شرم و حیا نہیں کہ ہمارے نزدیک جس حیلے سے حرام حلال بن جائے وہ حیلہ حرام ہے، اس پر اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ انہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

حیلہ اللہ تعالیٰ کی شریعت سے مذاق ہے

حیلہ دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے مذاق ہے، کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حرام کی ہے اس میں دینی و دنیاوی فوائد اور عظیم الشان مصلحتیں ہیں۔ اب جو شخص کسی حرام چیز کو حیلے سے حلال کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے ان کا مذاق اڑاتا ہے، فقیر کو زکوٰۃ دیکر سید کو دلوانی محض ایک فریب ہے کیونکہ جب فقیر کو ہی اس شرط پر دی کہ تو نے فلاں شخص کو دینی ہے، تو یہ فقیر کو سرے سے دینا ہی نہیں (زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقیر کا درمیان میں واسطہ پڑ گیا ہے) کیونکہ انسان کے فعل کا دار و مدار نیت پر ہے، ان چیزوں کو ہی ملحوظ رکھ کر حضرت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں، کتاب الحیل، کی ابتدا ہی اس فرمان نبوی سے کی ہے کہ

انما الاعمال بالنية،

یعنی اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ صحیح بخاری ص ۲۸۰ ج ۲۔

اب دیکھئے کہ زکوٰۃ دینے کی اصل نیت تو سید کو تھی، مگر درمیان میں فقیر کا واسطہ ڈال لیا، تو اس واسطے سے دینے والے کی نیت نہیں بدلی بلکہ دینے کا طریقہ بدلا ہے جو معتبر نہیں۔

الغرض حیلہ کے مردود و باطل ہونے کی یہ زبردست دلیل ہے کہ یہ دین کے احکام سے مذاق ہے اور یہ اس قدر فعل قبیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس صفت کو منافقین کی صفت قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ

يُخٰدِعُونَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخٰدِعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ . (البقرہ

(۹

یہ اللہ تعالیٰ اور مومنوں کو دھوکا دیتے ہیں مگر (حقیقت میں) اپنے سوا کسی کو چکا نہیں دیتے اور اس سے بے خبر ہیں (۲-۹)

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

فرماتے ہیں کہ حیلہ کو دھوکا کہنا جہالت ہے حیلہ سے مراد ہے ضرورت شرعیہ کو پورا کرنیکی شرعی تدبیر، اردو میں بولتے ہیں، حیلے رزق بہانے موت، اور شرعی حیلہ تو رب نے سکھایا اور حضور علیہ السلام نے تعلیم فرمایا۔ جاء الباطل ص ۳۸۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ صریحاً جھوٹ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حیلے کی تعلیم فرمائی ہے، یقیناً جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، رہے وہ دلائل جو مفتی صاحب نے دیئے ہیں تو ان کی حقیقت آگے اپنے مقام پر آرہی ہے کہ ان سے حیلہ اسقاط کا مطلب مفتی صاحب کا کشید کردہ ہے۔

ثانیاً۔ لفظ حیلہ تحول سے مشتق ہے اور اس کا باب حال یحول ہے، واؤ اپنے ماقبل کے کسرہ سے یا میں بدل گئی ہے، اور اس کا معنی ایک مخصوص قسم سے اس کا فاعل ایک حال سے دوسرے حال کی طرف گھوم جائے، پھر عرف میں اس کا غالب استعمال ان پوشیدہ راہوں میں چلنے سے ہو گیا جن سے انسان اپنی مرضی ایسے ڈھب سے کرے کہ جسے بجز فطین انسان کے دوسرا نہ پرکھ سکے جب

اپنے لغوی معنی سے اس عربی معنی میں اس کی خصوصیت ہوگئی تو اس کا عام استعمال ناجائز و ممنوع چیزوں میں حصول غرض کیلئے ہوگیا، مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں تو حیلہ بازوں سے ہے، فلاں شخص سے معاملہ نہ کرنا وہ بڑا حیلہ ساز ہے، فلاں حیلہ سکھاتا ہے۔

دیکھئے تاج العروس ص ۲۹۴ ج ۷، ولسان العرب ص ۱۸۵ ج ۱۱۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب اس حقیقت کا محض انکار ہی نہیں بلکہ الٹا ہمیں جہالت کا طعنہ دے رہے ہیں، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

پھر اس پر دگیل عنایت کی ہے کہ اردو میں بولتے ہیں، حیلے رزق بہانے موت، حالانکہ اس مثال سے بھی مفتی صاحب کا مدعا واضح نہیں ہوتا کیونکہ اس کا معنی ہے کہ رزق کوئی نہ کوئی کام کرنے سے ملتا ہے، موت کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ فیروز اللغات ص ۵۷۸۔

غور کیجئے اس معنی سے مفتی صاحب کے زیر بحث حیلہ کو کیا تعلق ہے، علاوہ ازیں اگر مفتی صاحب نے اردو محاورات سے ہی دیکھنا ہے تو اردو لغات میں حیلہ کا معنی، فریب، دھوکا، لکھا ہوا ہے، دیکھئے فیروز اللغات ص ۵۷۸، و علمی اردو لغت (متوسط) ص ۴۵۲۔

شم اقول

اے جی ہمارا آپ کا اختلاف حیلہ کے معنی میں نہیں کیونکہ یہ اچھے معنی میں بھی مستعمل ہے، قرآن میں ہے

الا المستضعفين من الرجال و النساء و الولدان
یہتدون سبیلاً۔ (النساء ۹۸)

ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ پرستہ جانتے ہیں (۹۸-۴)

دیکھئے یہاں حیلہ سے مراد وہ طریقہ ہے جس سے کفار کے ہاتھوں سے چھٹکارا مل جائے، تو گو اس پر بھی حیلہ کا لفظ بولا گیا ہے۔

الغرض لفظ حیلہ اچھی تدبیر پر بھی بولا جاتا ہے اس سے ہمیں اختلاف نہیں بلکہ اختلاف تو اس حیلہ سے ہے جو آپ کر کے حکم شرعی کا حکم بدلتے ہیں جس سے حرام حلال میں بدل جاتا ہے، زکوٰۃ

سید کیلئے حرام تھی۔ آپ نے حیلہ سے سید کیلئے حلال کر دی تو اس اصطلاحی مفہوم کو ہم نے دھوکا قرار دیا ہے۔

دوسرا اعتراض

فرماتے ہیں کہ لینے کا حیلہ کرنا برا اور دینے کا حیلہ کرنا اچھا ہوتا ہے، اس میں فقرا کو دینے کا حیلہ ہے..... یہ آیت منافقین کے متعلق نازل ہوئی جو کہ کلمہ ایمانی کو اپنے لئے آڑ بناتے تھے، اور دل میں کافر تھے، مسلمانوں کے عمدہ اور شرعی اعمال پر اس کو چسپاں کرنا سخت جرم ہے، جاء الباطل ص ۳۹۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے یہ بات کہہ دی ہے، ورنہ کسی سے حیلہ سے چیز لینے کے تو خود مفتی صاحب بھی قائل ہیں، اسی بحث میں حیلہ کے جواز پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ بنیامین کو اپنے پاس رکھیں اور راز ظاہر نہ ہو اس کیلئے بھی ایک حیلہ فرمایا، جاء الباطل ص ۳۸۴ ج ۱۔

دیکھئے اس دلیل میں مفتی صاحب نے حیلہ کی یہ دلیل عنایت فرمائی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے بنیامین کو حیلہ سے چھین لیا تھا، تو چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے استدلال نہ کرتے بلکہ اس کا جواب تحریر کرتے مگر مفتی صاحب کا چونکہ موقف ہی یہ ہے اس لئے اس سے استدلال کر لیا، مگر اس کے پانچ صفحات بعد فرماتے ہیں کہ لینے کیلئے حیلہ کرنا غلط ہے۔

ایمان سے کہنا کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک میں مفتی صاحب کا کذب ہے کہ نہیں؟

ثانیاً۔ گویا مفتی صاحب کے نزدیک حیلہ سے حرام کو حلال کر کے اپنا مقصود حاصل کرنا تو ناجائز ہوا مگر کسی کا مقصد پورا کرنا جائز ہوا، خشیت الہیہ کو پیش نظر رکھ کر کوئی عاقل یہ بات کہہ سکتا ہے کہ شراب پینی تو ناجائز ہے مگر پلانی جائز ہے، چوری، بدکاری، حرام خوری، وغیرہ کرنی تو حرام ہیں، مگر کروانی جائز کیونکہ اس میں کسی کا بھلا ہے، انا للہ انا الیہ راجعون۔

معلوم نہیں کہ اتنی چھوٹی سی بات ان بڑے بڑے متفکرین بریلویہ کے دماغ میں کیونکر نہیں اتر رہی کہ اس پر اڑے بیٹھے ہیں کہ لینے کیلئے حیلہ ناجائز اور دینے کیلئے حلال، گویا مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند مولوی حضرات سے حیلہ سے رقم بٹورنا تو حرام، مگر حیلہ سے ان کی جیب بھر دینا جائز، کیا کہنے ہیں آپ کی قانون سازی، اصول دانی، فتویٰ نویسی، اور کتب میں دلائل کی دریافت کے، اس طرح کی ہیرا پھیریوں پر امت بریلویہ انہیں حکیم الامت کہتی ہے جو دراصل امت کا سب سے بڑا مریض ہے۔

ثالثاً۔ یہ بھی خوب کہا کہ ان آیات کا تعلق منافقین سے ہے کلمہ گو سے نہیں، اور مسلمان کے بارے میں کہنا سخت جرم ہے، اے جی جس صفت کو اللہ تعالیٰ منافقین کی صفت قرار دے اور مومن کلمہ گو بھی اس فعل کا مرتکب ہو تو کیا کلمہ گو کو اس سے الگ کر لیا جائے کہ یہ صفت منافقین کی ہے نہ کہ ایک مسلمان کی، جبکہ کلمہ پڑھکر اس فعل قبیح کا مرتکب ہو رہا ہو، جناب عالی اس صورت میں کلمہ گو کا گناہ تو کافر سے سنگین ہو جائے گا کہ اس نے ایمان کے بعد برے فعل کا ارتکاب کیا ہے نہ یہ کہ اس فعل کا گناہ یہ کہہ کر کم قرار دیا جائے گا کہ یہ مسلمان ہے۔

ثم اقول، سورة الانعام کے رکوع ۱۹، میں کفار کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر، شرک، والدین سے بدسلوکی، ناداری کے اندیشے سے اولاد کو قتل کرنا، کسی جان کو ناحق قتل کرنا، یتیم کے مال کو کھانا، ماپ تول میں بے ایمانی، اور اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو پورا نہ کرنا حرام قرار دیا۔ (الانعام ۱۵۱ تا ۱۵۲)

اب اگر کوئی کلمہ پڑھنے والا ان افعال کا مرتکب ہو، بت کی عبادت کرے، والدین کو مارے پیٹے، اولاد کو قتل کرے، لوگوں کو بلا شرعی عذر کے قتل کرے، یتیم کے مال کو ہضم کر جائے، پیدائش اور وزن میں ہیرا پھیری کرے، اور نذر شرعی کو پورا نہ کرے، اور اپنے اس عمل کی دلیل یہ عنایت کرے کہ ان احکام کا تعلق تو کفار سے ہے اور ان آیات کا سبب عرب کے کافر تھے، نہ کہ امت محمدیہ ان آیات کی مخاطب ہے، تو کیا وہ ایسا کرنے اور کہنے میں حق بجانب ہے، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اسی طرح گو ان آیات کا تعلق منافقین سے ہے مگر اس حکم کے تمام مسلمان مخاطب ہیں کہ ان جیسے فعل نہ کرنا، قرآن نے ان کا ذکر محض داستان سرائی کی غرض سے نہیں کیا بلکہ ہماری عبرت کیلئے کیا ہے کہ

ان افعال قبیحہ کا تم بھی مرتکب نہ ہونا کیونکہ جو شخص بھی کلمہ پڑھ چکنے کے بعد ایسا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک منافقین کی جماعت و گروہ میں سے ہے نہ کہ سچے اور پکے مسلمانوں کی جماعت میں اس کا شمار ہوگا۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

فرماتے ہیں کہ۔ اسقاط کے مال کی وجہ سے نماز معاف نہیں ہوتی بلکہ زمانہ زندگی میں نماز پڑھنے کا جو قصور میت سے ہو چکا ہے اور اب اس کا بدلہ میت سے ناممکن ہے اور میت اس میں گرفتار ہے اس کے قصور معاف کرانے کا یہ حیلہ ہے کیونکہ صدقہ غضب الہی کو ٹھنڈا کرتا ہے، الصدقة تطفي غضب الرب، مشکوٰۃ باب الجمعة میں ہے کہ جس سے نماز جمعہ چھوٹ جائے وہ ایک دینار خیرات کرے، اسی مشکوٰۃ باب الحيض میں ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے بحالت حیض صحبت کرے تو ایک دینار یا نصف دینار خیرات کرے، یہ خیرات کیا ہے، اس گناہ کا کفارہ ہے جس کا بدلہ ناممکن ہو گیا۔ جاء الباطل ص ۳۹۰۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب یہ تحریر کرتے وقت ایسے مبہوت تھے کہ انہیں یہ ہی خبر نہ رہی کہ کیا لکھ رہے ہیں، لکھنا تو یہ چاہتے تھے کہ نماز نہ پڑھنے کا، مگر لکھ دیا کہ نماز پڑھنے کا جو قصور الخ۔

ثانیاً۔ حیلہ اسقاط کی یہ دلیل بھی زالی ہے کہ صدقہ غضب الہی کو ٹھنڈا کرتا ہے، اے جی اس کی دلیل عنایت کیجئے کہ حیلہ اسقاط غضب الہی کو ٹھنڈا کرتا ہے، کیونکہ بحث صدقہ میں نہیں بلکہ حیلہ اسقاط پر ہو رہی ہے، جس کی دلیل دینے کی بجائے آپ خلط بحث کر رہے ہیں، واضح رہے کہ مفتی صاحب نے روایت کے الفاظ نقل کیئے ہیں، درست الفاظ اس طرح ہیں

الصدقة تطفي غضب الرب، طبرانی اوسط ص ۷۳ ج ۸، و مجمع الزوائد

ص ۱۱۳ ج ۳، و ص ۷۳ ج ۹۔

علاوہ ازیں یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ اس کی سند میں اصرم بن حوشب، راوی ہے، اسے امام یحییٰ نے کذاب (بہت بڑا جھوٹا) اور خبیث کہا ہے، امام بخاری امام مسلم، نسائی نے متروک قرار

دیا ہے امام دارقطنی نے منکر الحدیث کہا ہے امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ ثقات راویوں پر احادیث گھڑتا تھا، میزان ص ۱۲۷۲ ج ۱، علامہ ھیثمی نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند میں اصرم راوی متروک ہے، مجمع الزوائد (۱۷۳/۹) مگر افسوس کہ مفتی صاحب نے اسے دلیل بنا کر عوام کو الو بنانے کی فضول کوشش کی ہے، کیونکہ اول تو یہ روایت ہی من گھڑت ہے دوم اس کا تعلق حیلہ سے نہیں صدقہ و خیرات سے ہے اور صدقہ و خیرات اور حیلہ اسقاط کو ایک سمجھنا مفتی صاحب کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا ترک جمعہ اور حائضہ سے وطی کے کفارہ کو پیش کرنا، تو یہ بھی ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ کفارہ اور حیلہ اسقاط ایک نہیں کہ کفارہ پر حیلہ کو قیاس کر لیا جائے، بلکہ کفارہ تو شرعی حکم ہے جسے بہر حال ادا کرنا پڑھے گا جبکہ حیلہ اسقاط تو کفارہ کو ٹالنے کا ایک بہانہ ہے، الغرض ادا انگلی اور ٹالنے کو ایک سمجھنا مفتی صاحب کے علم کا کرشمہ ہے۔

رابعاً۔ ان احادیث کا یہ مفہوم نہیں کہ اگر جمعہ رہ جائے تو نماز ظہر کی بجائے ایک دینار صدقہ کر دے تو فریضہ اس سے ساقط ہو جائے گا، نہیں ہرگز نہیں بلکہ نماز ظہر اس پر فرض ہے کیونکہ جمعہ ظہر کے قائم مقام ہے، اگر عذر شرعی کی وجہ سے جمعہ رہ جائے تو نماز ظہر پڑھنا فرض ہے۔

خامساً۔ من ترک الجمعة من بغیر عذر فلیتصدق بدینار فان لم یجد فنصف دینار۔ کی روایت سنداً ضعیف ہے کیونکہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا راوی قدامہ بن وبرة ہے، ابوداؤد ص ۱۵۱ ج ۱، نسائی (۱۳۷۳) و حاکم ص ۲۸۰ ج ۱، وابن حبان (۲۷۷۷ و ۲۷۷۸) وابن ابی شیبہ ص ۱۵۴ ج ۲، و عقیلی ص ۲۸۴ ج ۳۔

اور امام بخاریؒ نے صراحت کی ہے کہ قدامہ کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں، تھذیب التھذیب ص ۳۶۶ ج ۸، و میزان ص ۳۸۶ ج ۳۔ علاوہ ازیں قدامہ مجہول ہے (تقریب ص ۲۸۱)

الغرض یہ روایت انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے، اگر کوئی خفی کہے کہ یہ روایت سنن ابن ماجہ ص ۸۰ میں قتادہ عن الحسن عن سمرہ کے طریق سے بھی مروی ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سند بھی منقطع ہے کیونکہ حسن بصری کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سوائے عقیقہ کی حدیث کے سماع ہی

ثابت نہیں، چنانچہ فن رجال کے عظیم الشان امام ترمذی بن معین کا کہنا ہے کہ حسن کی حضرت سرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہوئی، کتاب المراسیل لابن ابی حاتم ص ۳۳، قصہ مختصر یہ کہ اس میں بھی انقطاع ہے اور قتادہ کی تدلیس بھی موجود ہے، جس کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔

سادساً۔ رہی حائضہ عورت سے وطی کے کفارہ والی حدیث، گو اس کی سند میں بھی بعض نے کلام کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مختلف الفاظ اور اسناد سے مروی ہے جن میں بعض احادیث صحیح ہیں تفصیل کیلئے دیکھئے مرعاة ص ۲۵۰ ج ۲، لیکن اس کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ حائضہ سے مباشرت کرنا سنگین جرم ہے، جس کی ممانعت قرآن مجید میں وارد ہے (البقرہ آیت ۲۲۲) اور رسول اللہ ﷺ نے بھی سختی سے روکا ہے، دیکھئے مشکوٰۃ باب الحیض الفصل الثانی عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

اگر کوئی شخص بھول کر اس کا مرتکب ہو جائے اور اسے اپنے کیئے پر افسوس بھی ہو تو اسے حکم ہے کہ آئندہ کیلئے توبہ کرے اور حسب توفیق دینار یا نصف دینار صدقہ کر دے، اس حدیث کا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ حائضہ سے مباشرت کی عادت ڈال لے اور ہر روز اٹھ کر صدقہ کر دیا کرے۔

سابعاً۔ گو حائضہ سے مباشرت کرنا گناہ ہے مگر اس گناہ میں وہ کسی عبادت شرعی کا تارک نہیں ہوا کہ حائضہ سے وطی کے کفارہ سے نماز روزہ کا کفارہ کشید کر لیا جائے۔ الغرض یہ قیاس ہی سرے سے باطل ہے۔

ثامناً۔ حائضہ سے وطی کے کفارہ کو تو شریعت نے واضح کر دیا ہے مگر نماز روزہ کا مالی کفارہ شریعت نے بیان ہی نہیں کیا، روزے کا کفارہ تو میت کی طرف سے روزے رکھنے کا ہے جیسا کہ اس پر صحیح احادیث گواہ ہیں۔

بخاری ص ۲۶۲ ج ۱، و مسلم ص ۳۶۲ ج ۱۔

(تفصیل آگے مفتی صاحب کے دلائل میں نماز اور روزے کا حیلہ، کے زیر عنوان آرہی ہے) اور اسی طرح نماز کا مالی کفارہ متعین کرنا بھی غلط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کی نماز قضاء ہو جائے تو جب اسے یاد آئے تو نماز کو پڑھ لے کیونکہ اس کا یہی کفارہ ہے، اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

بخاری ص ۸۴ ج ۱، و مسلم ص ۲۴۱ ج ۱۔

(حدیث کے اصلی الفاظ آگے مفتی صاحب کے دلائل میں، اسقاط کا ثبوت کے زیر عنوان آرہے ہیں) اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز کا کفارہ فقط اس کو ادا کرنا ہی ہے، مالی کفارہ بدنی عبادت کا کفارہ نہیں بن سکتا۔

تاسعاً۔ کفارہ اور حیلہ کو ایک باور کرنا مفتی جی کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ کفارہ تو بہر حال ادا کرنے سے ہی انسان حکم شرعی سے عہدہ برآں ہوگا جبکہ حیلہ اسقاط حکم شرعی کو نالنے کا ایک طریقہ و بہانہ ہے۔

صدقہ گناہوں کو مٹاتا ہے

روایت، صدقہ غضب الہی کو ٹھنڈا کرتا ہے، ضعیف ہے، لیکن صحیح حدیث میں الفاظ، والصدقۃ تطفی الخطیئۃ، یعنی صدقہ گناہوں کو مٹاتا ہے، الحدیث، عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم، مسند ابو یعلیٰ ص ۳۸۳ ج ۲، (۱۹۹۵) و مسند احمد ص ۳۲۱ ج ۳، (۱۴۰۳۲) و مصنف عبدالرزاق ص ۳۶۱ ج ۱۱، (۲۰۷۱۹) و مستدرک حاکم ص ۴۲۲ ج ۴، و صحیح ابن حبان (۴۴۹۷) و شعب الایمان (۵۷۶۱) اس حدیث کو حاکم و ذہبی نے صحیح کہا ہے، اور ہیثمی نے، مجمع الزوائد ص ۵۲۷ ج ۵ میں مسند احمد کے راویوں کو صحیح کے راوی کہا ہے، یہ روایت مختصر حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، مسند احمد ص ۲۴۳ ج ۴، و نسائی ص ۱۷۹ ج ۲، و ترمذی باب ما ذکر فضل الصلاۃ (۶۱۴) و بیہقی ص ۱۶۵ ج ۸، و طبرانی صغیر ص ۲۶۳ ج ۱ (۴۳۰) مگر اس میں مذکورہ الفاظ، الصدقۃ تطفی الخطیئۃ، کے نہیں، ہاں البتہ امام طبرانی نے، المعجم لاوسط ص ۲۴۳ ج ۵، (۴۴۷۷) و طبرانی کبیر ص ۱۰۶ ج ۱۹ (۲۱۲) و طبرانی صغیر ص ۳۷۷ ج ۱ (۶۲۵) میں اور بیہقی نے، شعب الایمان ص ۵۷ ج ۴ (۵۷۶۲) میں ان الفاظ کو بیان کیا ہے اور ہیثمی نے، مجمع الزوائد ص ۲۳۳ ج ۱۰ میں طبرانی اوسط کے راویوں کو ثقہ کہا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صحیح حدیث کے مطابق صدقہ گناہوں کو مٹاتا ہے، واضح رہے کہ یہاں صدقہ کے متعلق فرمان نبوی ﷺ ہے، حیلہ اسقاط کے بارے میں قطعاً نہیں، کیونکہ صدقہ کا لفظ، صدق، سے مشتق ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ صدقہ کرنے والے نے عمل سے اپنے اسلام کی سچائی ثابت کی، جب کہ حیلہ تو حکم شرعی کو بدلنے کا نام ہے، معلوم ہوا کہ یہ دونوں ایک نہیں بلکہ دونوں آپس میں متعارض اور ضد ہیں، مگر یہ عقل و فہم کی باتیں مفتی جی کی بلا جانے۔

حیلہ نبی ﷺ کی نظر میں

اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ علیہ السلام پر چربی کو حرام قرار دیا تھا، مگر یہود نے اس کو پگھلا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کو ہضم کر گئے، رسول اللہ ﷺ نے جب ان کے اس حیلہ کا تذکرہ کیا تو فرمایا

عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال قاتل اللہ الیہود احرمت علیہم الشحوم فباعوها واکلوا اثمناھا۔

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے کہ ان پر چربی کو حرام کیا گیا تھا تو انہوں نے اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کو کھالیا، صحیح بخاری ص ۲۹۶ ج ۱، و مسلم ص ۲۳ ج ۲۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انکو خبر ملی کہ فلاں شخص شراب کی تجارت کرتا ہے تو فرمایا کہ اللہ اسے ہلاک کرے کیا اسے خبر نہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال قاتل اللہ الیہود حرمت علیہم الشحوم فجملواھا فباعوها۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے کہ ان پر چربی حرام کی گئی تھی تو انہوں نے چربی کو پگھلا کر فروخت کیا (اور اس کی قیمت کو کھا گئے) بخاری ص ۲۹۶ ج ۱، و مسلم ص ۲۳ ج ۲۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے، شراب، مردار، سور، اور بتوں کی تجارت سے منع فرمایا ہے لوگوں نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ مردے کی چربی تو کشتیوں پر ملتے ہیں، (انہیں ملائم کرنے کی غرض سے) کھالوں پر لگاتے ہیں اور لوگ اس سے روشنی کرتے ہیں، آپ نے فرمایا نہیں وہ حرام ہے، پھر اسی وقت ارشاد فرمایا

قاتل اللہ الیہود ان اللہ لما حرم شحومھا اجملوہ ثم باعوہ فاكلوا اثمہ۔

اللہ تعالیٰ یہود کو تباہ کرے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی حرام کی تو انہوں نے پگھلایا اور پھر

اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کو کھالیا۔

صحیح بخاری ص ۲۹۸ ج ۱، و مسلم ص ۲۳ ج ۲۔

یہ احادیث اس بات پر گواہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود پر حیلہ کی وجہ سے بدعا کی ہے بلکہ صحیح مسلم میں ایک حدیث کے الفاظ، لعن اللہ الیہود، یعنی یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، ص ۲۳ ج ۲، ظاہر ہے کہ جس فعل پر رسول اللہ ﷺ کسی قوم پر لعنت و بدعا کریں اس فعل کی اجازت اپنی امت کو کیسے دے سکتے ہیں۔

الغرض دین میں حیلہ کی اجازت دینے والے اور اس کو اسلام کا حصہ و جزو باور کرانے والے حضرات غلطی پر ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت اور سمجھ عطاء فرمائے، امین یا الہ العالمین۔

اصول شریعت کا تقاضا

شرعی اصول کا تقاضا ہے کہ جس حکم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح بیان فرمایا ہے اور اس کے رسول ﷺ نے جس ڈھنگ سے اس کی توضیح و تشریح بیان فرمائی ہے اسے بلا چون و چرا قبول کر لیا جائے، اس میں کمی و بیشی اور لاحقہ کے بغیر اس پر عمل کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے روزے کا فدیہ ایسے شخص کیلئے مقرر فرمایا ہے جو اس قدر کمزور ہو چکا ہو کہ اس کی صحت کے لوٹنے کی امید نہ ہو، مگر جو شخص فوت ہو جائے اور اسکے ذمہ کچھ روزوں کی قضاء لازم ہو تو اس کے وارث کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کی طرف سے روزوں کی قضا کرے، بخاری ص ۲۶۲ ج ۱، و مسلم ص ۳۶۲ ج ۱۔

اگر مرنے والے کی طرف سے فدیہ بھی ادا ہو سکتا تو اس کی وضاحت رسول اللہ ﷺ فرمادیتے، مگر آپ علیہ السلام نے جب بیان ہی نہیں فرمایا تو ہم کسی غیر معصوم کی من گھڑت فقہ کو کیسے قبول کر لیں کہ اس کی طرف سے فدیہ بھی ادا ہو سکتا ہے، پھر فدیہ بھی اتنی ایمانی سے کہ ساری زندگی کے روزوں کی چند سیر گندم دیکر میت کا وارث فارغ ہو جائے اور اپنی آرام طلبی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی بیان کی ہوئی روزوں کی قضا ساقط ہو جائے۔

مبتدعین کے اکابرین کی دراصل میت سے ہمدردی نہیں بلکہ اس کے وارث کو آرام مہیا کرنا ہے کہ جون و جولائی کی شدید گرمی میں میت کی طرف سے روزے رکھنے کی بجائے چند سیر گندم ہیر

پھیر کر کے صدقہ کر دے، تاکہ جہان عوام شرعی حکم سے بچ جائیں وہاں مبتدعین کے پیش امام کو چند سیر گندم بھی مل جائے، پیٹ پوجا کیلئے یہ سب کچھ ایجاد ہوا ہے، مرنے والے سے ہمدردی سرے سے ہے ہی مفقود، مگر مفتی صاحب الٹا چور کو توال کو ڈانٹے پر عمل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہابی مردوں کے دشمن ہیں، جاء الباطل ص ۳۸۳ ج ۱، اے جی ہم مردوں کے تو واللہ دشمن نہیں، ہاں البتہ آپ کے پیٹ پوجا کے طریقہ کے ضرور مخالف ہیں کیونکہ یہ غیر شرعی طریقہ ہے جس کو آپ حضرات نے چند دہائیوں کی خاطر دین میں ایجاد کر رکھا ہے اور عوام کو میت سے ہمدردی باور کراتے ہیں جو حقیقت میں مرنے والے سے دشمنی ہے۔

اسی طرح نماز جو کہ بدنی عبادت ہے اس کا فدیہ بھی غلط ہے کیونکہ بدنی عبادت کا مالی کفارہ نہیں ہوا کرتا، پھر خاص کر نماز کہ جس کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا کفارہ فقط قضا پڑھنا ہے اور کوئی اس کا کفارہ نہیں،

بخاری ص ۸۴ ج ۱، و مسلم ص ۲۲۱ ج ۱۔

مگر یار لوگوں نے اس کا بھی کفارہ ایجاد کر لیا کہ چند سیر گندم کو ہیر پھیر کر کے پوری زندگی کی نمازوں کا فرض اس سے ساقط ہو جائے گا۔

مفتی صاحب کا اعتراض

یہ قیاس قرآنی آیت کے مقابل ہے کہ قرآن فرما رہا ہے، جو اس روزے کی طاقت نہیں رکھتے، ان پر فدیہ ہے، مسکین کا کھانا اور حکم الہی کے مقابل اپنا قیاس کرنا شیطان کا کام ہے کہ اس کو حکم الہی ہوا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کر، اس نے اس حکم کے مقابل اپنا قیاس دوڑایا مردود ہوا، پھر بدنی محنت کے مقابل مال کا ہونا عقل کے مطابق ہے کہ ہم کسی سے کام کراتے ہیں، اس کو معاوضہ مال دیتے ہیں، بعض صورتوں میں جان کا بدلہ بھی مال سے ہوتا ہے، کوئی نمازی پہلی التیات بھول گیا تو سجدہ سہو کرے کسی نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا تو اس کے کفارہ میں ۶۰ روزے رکھے، حاجی نے بحالت احرام شکار کر لیا، اگر پیسہ ہے تو اس شکار کی قیمت خیرات کرے ورنہ روزے رکھے، یہ تمام کفارے خلاف قیاس ہیں مگر شریعت نے مقرر فرمادیا، بسرو چشم منظور ہے، جاء الباطل

ص ۳۹۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اسے قیاس کہہ کر مفتی صاحب کا تردید کرنا خالص شیطانی وسواس ہے کیونکہ ہم نے صحیح احادیث پیش کر دی ہیں کہ مرے ہوئے شخص کی طرف سے روزوں کا کفارہ صدقہ و خیرات نہیں ہے، اسی طرح قضاء نماز کی احادیث پیش کر کے نماز کے مالی صدقہ کی تردید کی ہے مگر مفتی صاحب کو یہ قیاس نظر آتا ہے۔ ان للہ وانا الیہ راجعون۔

ثانیاً۔ میت کی طرف سے روزوں کا مالی کفارہ ادا کرنا قرآن نے قطعاً بیان نہیں کیا، یہ مفتی صاحب کا کھلا مغالطہ اور صریحاً جھوٹ اور سولہ آنے شریعت پر انفرا ہے، اگر کسی بدعتی میں علم شریعت ہے تو اس کا ثبوت قرآن سے دے، ورنہ یہ لوگ گھر میں ہی بیٹھے ہوئے اپنے علم و عقل کا ماتم کریں، رہی مفتی صاحب کی پیش کردہ آیت تو اسکا تعلق زندہ انسان سے ہے جس کی پوری تفصیل آگے مفتی صاحب کے دلائل میں، نماز و روزہ کا حیلہ، کے زیر عنوان آرہی ہے۔

ثالثاً۔ بدنی محنت پر عبادت کو قیاس کرنا، یہ مفتی صاحب کا ہی اجتہاد ہے ورنہ جس کے دل میں قرآن و سنت کا علم ہے وہ تو ایسے قیاس کو خرافات کا نام دے گا، اگر مالی اجرت پر نماز روزہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ مبتدعین اس بات کا فتویٰ نہیں دیتے کہ اگر امیر انسان اجرت پر کسی شخص کو رکھ کر اس سے اپنی نماز روزہ اور دیگر احکام شرعی کروالے، تو کیا فرائض اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائیں گے؟ دیدہ باید، مگر اس کا کوئی قائل ہے نہ ہوگا، مگر مفتی صاحب کی دیدہ دلیری ملاحظہ کیجئے کہ اجرت پر عبادت کو قیاس کر رہے ہیں، یہ ہیں فقہ کے ٹھیکے دار۔

رابعاً۔ بیوی سے ظہار اور حالت احرام میں شکار شرعی طور پر گناہ ہیں اور ان گناہوں کا یہ کفارہ مقرر کیا گیا ہے کہ نیکی سے گناہ معاف ہوتے ہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب گناہ کے کفارہ پر عبادت کا کفارہ قیاس کر رہے ہیں، اس پر انہیں شرم ہے نہ حیا اور ہیں ماشاء اللہ مفتی اعظم، حکیم الامت وغیرہ لیکن ان کے ان قیاسات سے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ دراصل جاہل اعظم اور مرض الامت ہے۔

پھر ان کفارات کو خلاف قیاس کہنا بھی مفتی صاحب کی بیباکی، گستاخی و شوخی ہے اگر عقل کے

خلاف ہونے کی دلیل درج کرتے تو راقم الحروف اس کا پورا پورا محاسبہ کرتا اور ان شاء اللہ بفضلہ تعالیٰ قارئین کرام پر واضح ہو جاتا کہ شریعت کے یہ احکام عقل کے موافق ہیں یہ الگ بات ہے کہ مفتی جی کی الٹی عقل و سوچ کو یہ خلاف قیاس نظر آرہے ہیں۔

پھر درمیانی تشہد کے ترک پر سجدہ سہو کو مفتی صاحب کا خلاف قیاس کہنا بھی غلط بیانی ہے کیونکہ درمیانی تشہد کے ترک پر سجدہ سہو کرنا تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، بخاری ص ۱۱۵ ج ۱ و مسلم ص ۲۱۱ ج ۱، مشکوٰۃ ص ۹۳، اور جو شخص آنحضرت ﷺ کے عمل کو خلاف قیاس کہتا ہے وہ واہیات بکتا ہے یقین جانیے کہ اگر مفتی صاحب اس کی بھی وجہ بیان کرتے تو ہم ان کے قیاس کا ایسا بفضلہ تعالیٰ رد کرتے کہ مفتی جی کی عقل و خرد کا حدود اربعہ معلوم ہو جاتا۔

اسی طرح مفتی صاحب کا دیت کے مسئلہ کو درمیان میں کھینچ لانا بھی دراصل ان کے فہم کا قصور ہے کجا قتل وغیرہ کے جرم میں وارثوں کو مال دیکر راضی کرنا اور کجا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مالی فدیہ دینا، غور کیجئے کہ ان کے درمیان بھی کوئی تعلق و ربطہ ہے، مگر مفتی صاحب یہ کہہ کر کہ، بعض صورتوں میں جان کا بدلہ بھی مال ہوتا ہے، اے جی ادھر ادھر سے فضول بھرتی کرنے کی بجائے اگر بدنی عبادت کے مالی کفارہ پر بھی آپ کے پاس کوئی دلیل ہے، تو اسے سامنے کیوں نہیں لاتے، اسے پردہ میں کس غرض سے چھپا رکھا ہے۔

معلوم ہوا کہ بدنی عبادت کے مالی کفارہ پر آپ کے پاس سرے سے کوئی قرآن و سنت سے دلیل ہی نہیں، جس کی وجہ سے آپ کچھ نا کچھ لکھ کر عوام کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں، یقین جانیے کہ قرآن کی ایک آیت یا کتب احادیث میں سے صرف ایک صحیح حدیث یا کم از کم حسن ہی پیش کر دیں کہ میت کی نماز اور روزہ کے فدیہ میں اس قدر گندم یا چاول یا جو، صدقہ و خیرات، حیلہ اسقاط کے طریقہ سے کرنا چاہیے۔

راقم الحروف مبتدعین کے اکابرین سے وعدہ کرتا ہے کہ جس وقت آپ ایسی دلیل پیش کر دیں گے اسی محفل اسی گھڑی پوری دنیا کے سلفی جماعتی طور پر اس کے مسنون ہونے کا اعلان کر دیں گے، مگر یاد رہے کہ اس کا ثبوت مبتدعین قیامت تک نہیں دے سکتے، لہذا عرض ہے کہ دنیاوی مفاد کی غرض سے آخرت برباد نہ کیجئے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے، آمین یا الہ

حیلہ اسقاط کے دلائل کا تجزیہ

اسقاط کے طریقہ پر تبصرہ

بات کو آگے لے جانے سے قبل ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ قارئین کرام کی دلچسپی کیلئے مفتی صاحب سے اسقاط کا طریقہ نقل کر کے اس پر قرآن و سنت کی روشنی میں تبصرہ کر دیں۔

چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ وہابی دیوبندی جس طرح زندہ مسلمان کے دشمن ہیں اسی طرح مردود کے بھی دشمن ہیں کہ ان کو نفع پہنچانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور مرے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے (لعنت اللہ علی الکاذبین) اسقاط کا طریقہ یہ ہے کہ میت کی عمر معلوم کی جاوے اس میں نو سال عورت کیلئے اور بارہ سال مرد کیلئے نابالغی کیلئے نکال دو اب جتنے سال بچے اس میں حساب لگاؤ کتنی مدت تک وہ بے نمازی یا بے روزہ رہا، یا نمازی ہونے کے زمانہ میں کس قدر نمازیں اس کی باقی رہ گئی ہیں کہ نہ وہ پڑھی اور نہ قضا کیں، اس لئے زیادہ سے زیادہ اندازہ لگاؤ، جتنی نمازیں حاصل ہوں فی نماز ۱۷۵ روپے اٹھنی بھر گیہوں خیرات یعنی جو فطرانہ کی مقدار ہے، وہ ہی ایک نماز کے فدیہ کی، وہ ہی ایک روزہ کی، تو ایک ماہ کی نمازوں کا فدیہ ۹ من گندم تقریباً اور سال کی نمازوں کا ۱۰۸ من گندم ہوتا ہے، اب کسی کے ذمہ دس بیس سال کی نمازیں ہیں تو صد ہا من غلہ خیرات کرنا ہوگا، شاید کوئی بڑا دیندار مالدار تو یہ کر سکے مگر غربا سے ناممکن، ان کیلئے یہ طریقہ ہے کہ ولی میت بقدر طاقت گندم یا اس کی قیمت لے مثلاً ایک ماہ کی نمازوں کا فدیہ ۹ من تھا، تو ۹ من گندم یا اس کی قیمت لے اور کسی مسکین کو اس کا مالک کر دے وہ مسکین یا تو دوسرے مسکین کو یا خود مالک کو بطور ہبہ دے دے، وہ پھر اس فقیر کو صدقہ دے، ہر بار کے صدقہ میں ایک ماہ کی نمازوں کا فدیہ ادا ہوگا، بارہ بار صدقہ کیا ایک سال کا فدیہ ادا ہوا، اسی طرح بار بار گھمانے میں فدیہ ادا ہو جائے گا، نمازوں کے فدیہ سے فارغ ہو کر اسی طرح روزہ اور زکوٰۃ کا فدیہ ادا کریں، رحمت الہی سے امید ہے کہ میت کی مغفرت فرمادے گا، اسقاط کا یہ طریقہ صحیح ہے۔ جاء الباطل ص ۳۸۳ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ وہابی زندہ و مردہ مسلمان کے دشمن ہیں، یہ انکی غلط بیانی ہے، ہمیں کسی مسلمان سے کوئی ذاتی عداوت و دشمنی نہیں ہے، ہم بفضلہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کرتے ہیں، ہاں البتہ، الحب للہ والبغض للہ کے تحت ہماری محبت و دشمنی کے معیار میں فرق ضرور ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے جو نماز روزہ کی مقدار فدیہ مقرر کی ہے اس کی کوئی شرعی دلیل درج نہیں کی، کوئی ہوتی تو اسے ضرور نقل کرتے۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے صراحت نہیں کی کہ گندم کو چند بار گھمانے کے بعد گندم کو میت کا وارث ہی گھر لے جائے گا یا محتاج و فقیر کے حوالے کر دی جائے گی یا مسجد غوثیہ کے پیش امام کو بطور نذرانہ عنایت کر دی جائے گی۔

رابعاً۔ مبتدعین کا وارث میت جب مذکورہ مقدار میں گندم فقیر و محتاج کو ہبہ کر دے گا، تو اب دوبارہ اسے فقیر سے واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ ہبہ کی ہوئی چیز کو واپس لینا شرعاً اتنا بڑا گناہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے کتے کی قے خوری قرار دیا ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال النبی ﷺ لیس لنا مثل السوء الذی یعود فی ہبتہ کا لکلب یرجع فی قیئہ۔

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ بری مثال اپنے اوپر لانا کوئی مومن پسند نہیں کرے گا جو شخص ہبہ کر کے پھر اسے واپس لیتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کتا قے کر کے خود چاٹ لیتا ہے۔ بخاری ص ۳۵۷ ج ۱، و مسلم ص ۳۶ ج ۲۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مجاہد کو نبی سبیل اللہ ایک گھوڑا عنایت کر دیا مگر اس نے خراب کر دیا، میں نے چاہا کہ اس سے گھوڑے کو خرید لوں پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مجاہد گھوڑا ارزاں و سستا نہ دے دے، تو اس کا تذکرہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ

لا تشتره وان اعطاكه بدرهم واحد فان العائد في صدقه كالكلب يعود في قيئه.

یعنی اے عمر (رضی اللہ عنہ) اگر وہ ایک روپیہ کا بھی فروخت کر ڈالے تو تم نہ لینا کیونکہ صدقہ دیکر پھر واپس لینے والا کتے کی طرح ہے جو قے کر کے پھر چاٹنے لگ جاتا ہے۔ بخاری ص ۳۵۷ ج ۱، و مسلم ص ۳۶ ج ۲۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب یہ درس دے رہے ہیں کہ ۹ من گندم وارث فقیر کو دے پھر فقیر وارث کو لوٹائے اور وارث پھر فقیر کو ہبہ کرے یوں سلسلہ چلتا رہے، اور مبتدعین کے اکابرین بقول رسول اللہ ﷺ کے ہبہ کو واپس لیکر کتے کی طرح قے خوری کرتے رہیں، پھر آخر میں مبتدعین بریلویہ کے پیش امام کی مٹھی گرم کر کے میت کے تمام گناہ بخشوا لیں کہ یہ دین الہی کے واحد ٹھیکے دار ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حیلہ اسقاط کی پہلی دلیل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی کہ میں اپنی بیوی کو سو کڑیاں ماروں گا رب تعالیٰ نے ان کو تعلیم فرمایا کہ تم ایک جھاڑو لیکر ان کو مارو اور اپنی قسم نہ توڑو، قرآن مجید نے اسی قصہ کو نقل فرمایا

وَخَذَ بِيَدِكَ ضَغْثًا فَاَضْرَبَ بِهِ وَلَا تَحْنُثْ.

تم اپنے ہاتھ میں جھاڑو لیکر مار دو اور قسم نہ توڑو۔ جاء الباطل ص ۳۸۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قرآن کے الفاظ **فَاَضْرَبَ بِهِ** کے ہیں، امید ہے کہ جاء الباطل کے ناشرین شکریہ کے ساتھ اسکی تصحیح کر لیں گے۔

ثانیاً قرآن کریم نے یہ کہاں کہا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی تھی کہ ضرب علیحدہ علیحدہ لگاؤں گا، اگر اس احتمال کو تسلیم کر لیا جائے تو حیلہ رہتا ہی نہیں کیونکہ حیلہ تو اسے کہا جاتا ہے جو لفظ کو اس کے مصداق سے علی الاطلاق ہٹا دے، خود فقہاء میں ایسی قسموں کے بارے میں

اختلاف ہے مثلاً کسی نے کہا کہ میں اپنی لونڈی کو سوزرب لگاؤں گا ایک تو یہ ہے کہ اسکو الگ الگ مارے دوسرا یہ کہ کسی چیز سے ایک ہی بار ضرب لگائے، اور بعض نے یہ شرط لگائی ہے کہ مجموعی طور پر اسے مارنا بھی ضروری ہے۔ دیکھئے فتح القدیر ص ۴۶۰ ج ۴۔ و اعلام الموقعین ص ۹۶۳ ج ۵۔ مترجم

ثالثاً۔ اگر آیات قرآنیہ سے مراد ضرب معروف ہے تو تب بھی آپ کا اس سے استدلال درست نہیں، کیونکہ پہلی شریعت کا کوئی فقہی مسئلہ ہم پر حجت نہیں، اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں کہ پہلے ادیان ہمارے لئے شرع ہیں یا نہیں ہیں۔ اگر نہیں تو مفتی صاحب کا استدلال خود بخود باطل ہو گیا، اور اگر ہیں تو اس شرط سے ہے کہ شرع محمدی کے خلاف نہ ہوں، جب خلاف ہوگا تو تب بھی مفتی صاحب کا استدلال باطل ہوگا۔

جب کہ مفتی صاحب کے اکابرین کو مسلم ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ انہیں کے ساتھ خاص ہے۔

علامہ ابن ہمام حنفی ہدایہ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

والحق ان البر بضرب بضغت بلا الم اصلاً خصوصية رحمة لزوجۃ ایوب علیہ السلام۔ فتح القدیر ص ۴۶۰ ج ۴۔

یعنی یہ بات حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی محترمہ کے ساتھ خاص ہے۔

یہی بات درمختار میں ہے اور اسی کو ہی محقق ابن عابدین نے اختیار کیا ہے، فتاویٰ شامی ص ۸۳ ج ۳، فقہاء احناف کی ان عبارات کے علاوہ ان کی خصوصیت پر خود قرآن مجید میں دلیل موجود ہے کہ، انا وجدنا صابراً، سورۃ ص آیت ۴۴) بے شک ہم نے اسے صابرہ پایا (۳۸-۴۴) یہ جملہ قرینہ ہے کہ یہ خاص صورت اللہ تعالیٰ نے انکے صبر کی جزا میں بیان فرمائی۔

رابعاً۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انکی شریعت میں قسم کا کفارہ نہ تھا، بلکہ ان کیلئے دو ہی صورتیں تھیں (۱) قسم کو پورا کیا جائے (۲) یا قسم کو توڑا جائے، خود مفتی صاحب کو اس بات کا اقرار ہے۔

دیکھئے نور العرفان ص ۷۷۔

لیکن شریعت محمدیہ علیہ السلام میں کفارہ بھی مقرر کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

لا یواخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم و لکن یواخذکم بما عقدتم الایمان فکفارتہ اطعام عشرة مسکین من اوسط ما تطعمون اہلیکم او کسوتہم او تحریر رقبة فمن لم یجد فصیام ثلثة ايام ذلک کفارة ایمانکم اذا حلفتم واحفظوا ایمانکم کذلک یمین اللہ لکم ایئہ لعلکم تشکرون۔ (المائدہ ص ۸۹)

اللہ تعالیٰ تمہاری بے ارادہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہ کرے گا لیکن پختہ قسموں پر (جن کے خلاف کرو گے) مواخذہ کریگا، تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا، اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ تین روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا لو (اور اسے توڑ دو) اور (تم کو) چاہیے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے (سمجھانے کے) لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ (۵-۸۹)

اس آیت کا شان نزول بھی ہمارے موقف کی تائید کرتا ہے چنانچہ ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

ان اباہا کان لا یحنت فی یمین حتی انزل اللہ کفارة الیمین قال ابو بکر رضی اللہ عنہ لا اری یمیناً اری غیرہا خیر منها الا قبلت رخصة اللہ و فعلت الذی ہو خیرا۔

یعنی انکے والد (سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ) کبھی اپنی قسم نہ توڑا کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کے کفارہ (کا حکم) نازل فرمایا، تب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میں (کسی کام کے متعلق) قسم کھا لیتا ہوں پھر اسکے خلاف اگر بہتری جانتا ہوں تو اللہ کی رخصت کو منظور کر کے وہ کام کر لیتا ہوں جو بہتر ہوتا ہے (اور قسم کا کفارہ ادا کر دیتا ہوں) صحیح بخاری ص ۶۶۲ ج ۲۔

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ پہلی شریعتوں میں کفارہ کا مسئلہ نہ تھا، اور عرب میں قسم کو پورے کرنے کا ہی رواج تھا یہاں تک کہ کفارہ کی آیات نازل ہوئیں، اس لئے کسی کام کیلئے قسم کھا لینا لیکن بعد میں قسم کے خلاف بہتری معلوم ہو تو حیلہ و اسقاط کی سرے سے ضرورت ہی نہیں بلکہ کفارہ

ادا کر کے اس کام کو کر لینا جس میں دین و دنیا کی بہتری ہے، اور اس بات کی اجازت حدیث نبوی میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ من حلف على يمين فرى غيرها خيرا منها فليأت الذي هو خير و ليكفر عن يمينه.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس (قسم) کے خلاف کو بہتر خیال کیا وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر کے اس کام کو کر لے۔
صحیح مسلم ص ۴۸ ج ۲۔

خامساً۔ کیا اس آیت کے الفاظ کا یہ معنی ہے کہ میت کے وارث مردے کیلئے اسقاط کریں تاکہ اس کے گناہ معاف ہو کر فرائض اس سے ساقط ہو جائیں، نہیں ہرگز نہیں، تو پھر یہ مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی۔

ایک بریلوی عالم کا اعتراف حق

دور حاضر میں پیر کرم شاہ صاحب بھیروی بریلوی مکتب فکر کے ایک علمی شخصیت ہیں جو کہ متعدد کتب کے مصنف اور ناصر بریلویت ہیں، وہ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ شرعی احکام سے بچنے کیلئے حیلوں سے کام لینا جائز ہے، حالانکہ یہ ہرگز درست نہیں، اس طرح احکام شرعیہ بچوں کا کھیل بن جائیں گے اور اغیار کو مذاق کرنے کا موقع مل جائے گا، نیز جن مقاصد کیلئے یہ احکام جاری کئے گئے انکا حصول ناممکن ہو جائے گا، علامہ آلوسی نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے بڑی محققانہ اور جامع بات فرمائی ہے۔

عندی ان کل حيلة اوجبت ابطال حكمة شرعية لا تقبل كحيلة سقوط الزكوة و حيلة سقوط الاستبراء. (روح المعانی)

یعنی ہر وہ حیلہ جس سے حکم شرعیہ کی اس حکمت کا بطلان ہوتا ہو جس کیلئے یہ حکم شرعی نافذ

کیا گیا، ایسا حیلہ قطعاً باطل ہے جیسے زکوٰۃ ساقط کرنے کیلئے لوگ حیلہ سازیاں کرتے ہیں اور استبراء سے بچنے کیلئے، وہ یہ نہیں جانتے کہ ایسا کر کے وہ اپنے رب سے دھوکا کر رہے ہیں۔ ضیاء القرآن ص ۲۴۶ ج ۵، طبع ۱۳۹۹ھ ناشر ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ بنیامین کو اپنے پاس رکھیں اور راز ظاہر نہ ہو، اس کیلئے بھی ایک حیلہ ہی فرمایا جس کا مفصل ذکر سورۃ یوسف میں ہے۔ جاء الباطل ص ۳۸۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قارئین کرام دیکھتے جانا کہ مفتی صاحب ایک دلیل دے رہے ہیں مگر دلیل کے الفاظ نقل کر کے ان کا معنی و مفہوم بیان نہیں کر رہے کہ کہیں حقیقت حال سے عوام واقف نہ ہو جائیں، حالانکہ مفتی صاحب کا حق تھا کہ قرآنی الفاظ کو نقل کر کے ان سے وجہ استدلال بیان کرتے کہ کس لفظ کا معنی ہے کہ مرنے والے کے وارث مذکورہ طریقہ سے اسقاط کریں تو مردہ بخش دیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن میں چونکہ ایسا کوئی لفظ تھا ہی نہیں لہذا مفتی صاحب نے عدم نقل کو ہی مناسب جانا کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثانیاً۔ بات کو آگے لے جانے سے پہلے آیات قرآن اور ان کا معنی و مفہوم جان لینا ضروری ہے تاکہ بات کو سمجھنے میں آسانی رہے، ارشاد ہوتا ہے کہ

ولما دخلوا علیٰ یوسف اَوّٰی الیہ اخاہ قال انی انا اخوک فلا تبئس بما کانوا یعملون ☆ فلما جهزهم بجهازهم جعل السقاية فی رحل اخیه ثم اذن مؤذن ایتها العیر انکم لسرّقون ☆ قالوا واقبلوا علیہم ماذا تفقدون ☆ قالوا نفقد صواع الملوک ولمن جاء به حمل بعیر وانا به زعیم ☆ قالوا تالله لقد علمتم ما جئنا لنفسد فی الارض وما کنا سرّقین ☆ قالوا فما جزاؤہ ان کنتم کذّبین ☆ قالوا جزاؤہ من وجد فی رحله فهو جزاؤہ کذلک نجزی الظالمین ☆ فبدا باوعیتهم قبل وعاء اخیه ثم استخرجها من وعاء اخیه کذلک کدنا لیوسف ماکان لیاخذ

اِخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ نَرْفَعُ دَرَجَتٍ مِنْ نِشْءٍ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ☆ قَالُوا اِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَهُ مِنْ قَبْلُ فَاَسْرِهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يَبْدُهَا لَهُمْ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَكَانًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ☆ قَالُوا يَا يٰهِيَ الْعَزِيزُ اِنْ لَكَ اَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ اِحْدُنَا مَكَانَهُ اِنَّا نُرَاكَ مِنَ الْمَحْسِنِينَ ☆ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنْ نَاخُذُ اِلَّا مِنْ وَجْدِنَا مُتَاعِنَا عِنْدَهُ اِنَّا اِذَا الظّٰلِمُوْنَ . سُوْرَةُ يُوْسُفَ (آیت ۶۹ تا ۷۹، رکوع ۹)

ترجمہ۔ اور یوسف کے بھائی جب یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ جگہ دی اور کہہ دیا کہ میں تیرا بھائی ہوں پس تو ان کے کاموں سے رنجیدہ مت ہو، پھر جب انکی بوریا بندھوانے کا حکم دیا تو اپنے بھائی کی بوری میں کٹورا رکھوا دیا پھر ایک پکارنے والے نے پکار دیا کہ اے قافلہ والو! تم چور ہو، یوسف کے بھائیوں نے پھر کر پوچھا تمہارا کیا کھو گیا ہے؟ سپاہیوں نے کہا سرکاری کٹورا ہمیں نہیں ملتا اور جو کوئی اسے لائے اس کو اونٹ کے بوجھ جتنا غلہ ملے گا اور میں اس کا ضامن ہوں۔

یوسف کے بھائی بولے کہ واللہ تم جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں سپاہیوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے نکلے تو اس کی کیا سزا ہے،

بولے جس کے اسباب سے وہ نکلے وہی اس کی سزا ہے ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں، تو یوسف نے اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں اور بوریوں کو کھلوا دیا پھر اپنے بھائی کے تھیلے سے نکال لیا، اسی طرح ہم نے یوسف کو ڈھب سکھایا تھا، ورنہ بادشاہ کے قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو نہ رکھ سکتا تھا، مگر جو خدا چاہتا ہے ہم جس کو چاہیں بلند رتبہ کر دیتے ہیں اور ہر ایک دانا سے بڑھکر دوسرا دانا ہے، بولے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی یوسف نے اس کلمہ کو چھپا رکھا اور ان کے سامنے اس کو نہ دہرایا کہا کہ تم بڑے نالائق ہو تمہارا بیان اللہ کو خوب معلوم ہے،

کہنے لگے اے عزیز! اس کا باپ نہایت بوڑھا ہے پس تو ہم میں سے کسی کو اس کے عوض رکھ لے ہم تجھے محسن جانتے ہیں، یوسف نے کہا خدا پناہ دے کہ ہم اس شخص کو چھوڑ کر جس کے پاس ہمیں اپنی چیز ملی ہے کسی دوسرے کو لیں تو فوراً ہم ظالم ٹھہریں گے (ثانی) ۱۲-۶۹-۷۹۔

لیجئے جناب یہ ہے مفتی صاحب کی دلیل کا اسل متین قارئین کرام ان آیات کو مکرر پڑھئے اور غور و تدبر کیجئے کہ ان آیات کو مرنے والوں کے وارثوں کو اسقاط کا حکم کن الفاظ میں دیا گیا ہے کہ ایک ماہ کی نمازوں کا فدیہ ۹ من گندم ہے جسے تم فقیر و محتاج کو ہبہ کر دو پھر اس سے واپس لیکر مکرر اسے ہبہ کرو علیٰ هذا القیاس اسی طرح کرتے رہو حتیٰ کہ پوری زندگی کی نمازوں کا کفارہ ادا کر دو پھر زکوٰۃ و روزہ کو بھی لگے ہاتھوں پورا کر دو اور یوں ایک ہی دن میں پوری شریعت اسلامیہ کے احکام کی ادائیگی سے مرنے والا سرخرو ہو کر جنت کا وارث بن جائے گا۔
اللہ اکبر۔

مفتی صاحب کے استدلال کی خامیاں

قارئین کرام اب ترتیب وار مذکورہ آیات قرآن سے مفتی صاحب کے استدلال باطل کا رد سنے جائیے۔

(۱) خود حنفیہ اس طرح کے حیلوں کو ناجائز و حرام مانتے ہیں، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ

فنقول مذهب علمائنا رحمہم اللہ تعالیٰ ان کل حيلة یحتال بہا الرجل لا بطل حق الغیر اولاد خال شبهة فیہ اولتمویہ باطل فہی مکروہة۔
یعنی ہمارے علماء کا مذہب یہ ہے کہ تمام وہ حیلے جو کسی کا حق مارنے یا اس میں شبہ پیدا کرنے یا باطل (جھوٹ) سے فریب دینے کیلئے کیئے جائیں وہ مکروہ ہیں،
فتاویٰ عالمگیری ص ۳۹۰ ج ۶۔

اس عبارت کو خود مفتی صاحب نے جاء الباطل ص ۳۸۵ میں نقل کیا ہے۔
اس صراحت سے معلوم ہوا کہ ایسا حیلہ جس میں جھوٹ سے کسی کو فریب دیا جائے خود مفتی صاحب کے مذہب میں ناجائز و حرام ہے۔

(۲) یہ اللہ تعالیٰ کی ایک تدبیر تھی، اور حضرت یوسف علیہ السلام کا بوری میں سقایا کو رکھنا وحی الہی سے تھا، اور اس تدبیر سے اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کو پاس رکھنے کے

اسباب اکٹھے کروادیئے، ورنہ اتنی سی بات (بھائی کی بوری میں سقایا رکھنے) سے حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو روک نہ سکتے تھے۔

کیونکہ یہ بات تو قرآن نے کھول کر بیان فرمائی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی مملکت کا یہ قانون نہ تھا کہ چور کو روک کر غلام وغیرہ بنالیا جائے، بلکہ بقول مفسرین انکی سلطنت کا یہ دستور تھا کہ چور سے دو گنا مال لیکر اور مار پیٹ کر اسے چھوڑ دیا جائے، لیکن جب منادی نے پکارا کہ اے قافلے والو تم چور ہو، انہوں نے کہا کہ تمہاری کیا چیز چوری ہوئی ہے کہ ہمیں چور ہونے سے مطعون کر رہے ہو، اس پر منادی نے کہا کہ شاہی سقایا گم ہے، مگر اولاد یعقوب نے اس کی چوری سے انکار کیا، منادی نے کہا کہ اگر تمہارے پاس سے برآمد ہو تو تمہاری کیا سزا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ

جز آؤہ من وجد فی رحلہ (۷۵)

ان کے دل میں یہ جواب ڈال دینا بھی اللہ تعالیٰ کی تدبیر تھی ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اختیار میں ایسا اعتراف کرا لینا نہ تھا، ممکن ہے کہ وہ کہہ دیتے کہ جو آپ کی سلطنت کا قانون ہے وہی اس کی سزا ہے یا محض کسی سے سقایا برآمد ہونا اس کے چور ہونے کی دلیل نہیں (حنفیہ کا یہی موقف ہے کہ کسی سے مال کے برآمد ہونے سے وہ چور ثابت نہ ہوگا)

اس کا ثبوت دیجئے کہ اسی نے ہی چرایا ہے، تو اس سوال کا جواب نفی میں تھا کیونکہ وہ نہ تو چور تھے اور نہ ہی اس پر شرعی شہادت تھی، اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنی عدالت سے مجبور ہو جاتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان تمام تدابیر کو جمع کر دیا، یہی مطلب ہے قرآن کے ان الفاظ کا کہ

کذلک کدنا لیوسف (۷۶) اس طرح ہم نے یوسف کیلئے تدبیر کی۔

دیکھئے کہ ان الفاظ قرآن میں تدبیر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف مضاف کیا ہے، نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کہ یہ انکی تدبیر تھی۔ اور اللہ تعالیٰ تو فعال الما یرید ہے، وہ جو چاہے کرتا ہے، خضر علیہ السلام سے کشتی تڑوادے یا لڑکے کو قتل کرا دے، اسے کون پوچھنے والا ہے؟ لیکن اگر ہم کسی کے بچہ کو قتل کر دیں یا کشتی توڑ دیں، تو ہم سے قصاص و معاوضہ وصول کیا جائے گا، کیوں؟ وجہ فرق یہ ہے کہ ہم شریعت کے پابند اور مکلف ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نہیں، آئیے ہم آپ کو بریلوی

عالم سے تصدیق کروا دیتے ہیں کہ یہ تدبیر اللہ تعالیٰ تھیں۔ یوسف علیہ السلام کی نہ تھیں۔

چنانچہ بریلویت کے معروف مفسر قرآن پیر کرم شاہ صاحب فرماتے ہیں

ان واقعات میں سے کس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی تدبیر فرمایا ہے، اس کے متعلق گزارش ہے کہ اگر ذرا غور کیا جائے تو حقیقت عیاں ہو جاتی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس قافلہ کی روانگی کے بعد فوراً ان کو پیالہ کی گمشدگی کا پتہ نہ چلتا کچھ دن گزرنے کے بعد انہیں معلوم ہوتا کہ پیالہ گم ہو چکا ہے اتنے میں وہ مصر کی سرحد عبور کر کے چلے جاتے یا پہلے اپنے میں سے کسی کو چوری سے مٹہم کرتے اور ان کی طرف انکا خیال ہی نہ جاتا، یا یہ نوبت ہی پیش نہ آتی کہ چور کی سزا کے متعلق ان سے ہی دریافت کیا جاتا اور اگر ان سے پوچھا بھی گیا تھا تو وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ جو بادشاہ کی مرضی ہو اس چور کو سزا دے، یہ سب احتمالات تھے، جو اغلب الوقوع تھے، اس لئے ان کو پیالہ کی گمشدگی کا فوراً علم ہو جانا، پھر ذہن کا فوراً ان کی طرف منتقل ہونا پھر مجرم کی سزا کے متعلق ان سے پوچھا جانا اور پھر ان کا یہ سزا تجویز کرنا یہ سب تدبیر الہی اور ارادہ ربانی کی کرشمہ سازی تھی، اور اگر ان واقعات میں سے ایک آدھ کڑی بھی گم ہو جاتی تو پھر بنیامین کو رکھنے کی کوئی وجہ جواز نہ مل سکتی،

تفسیر ضیاء القرآن ص ۴۴۷ ج ۲، طبع ۱۴۰۲ھ۔

اس ساری تفصیل سے ثابت ہوا کہ یہ تدبیر خالق کائنات کی تھی، جس میں اس نے اپنے مومن و متوکل اور مظلوم بندے کی مدد فرمائی کہ وہ ظالموں سے انتقام لیکر اپنے دل کو ٹھنڈا کر لے، ایمان سے کہنا کہ اس کو مفتی صاحب کے حرام حیلوں سے کیا مناسبت ہے کہ وہ اسے دلیل بنا رہے ہیں۔

مبتدعین جس قدر حیلہ کرتے ہیں کیا ان کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ نماز کا یہ حیلہ ہے اور زکوٰۃ ٹالنے کا یہ حیلہ ہے، حضرت جی یہ تو شریعت سے ویسے ہی مذاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرض کی ہوئی چیزوں کو بہانوں سے ٹال دیا جائے اور یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک فعل کو فرض قرار دے اور پھر اسے ٹالنے کا حیلہ بھی بتائے کہ اس طرح یہ فرض ٹل جاتا ہے۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

ایک بار حضرت سارا نے قسم اٹھائی تھی کہ میں قابو پاؤں گی تو حضرت ہاجرہ کا کوئی عضو قطع

کر دوں گی، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وحی آئی کہ ان کی آپس میں صلح کرادو، حضرت سارا نے فرمایا میری قسم کیسے پوری ہو، تو ان کو تعلیم دی گئی کہ حضرت ہاجرہ کے کان چھید دیں۔ جاء الباطل ص ۳۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ بات کسی معتبر دلیل سے ثابت نہیں، مبتدعین پر لازم ہے کہ وہ اسے نقل صحیح سے ثابت کریں ورنہ اللہ رب العزت سے ڈر کر ان جیسے قصے کہانیوں سے اپنی بدی رسومات کے جواز پر استدلال سے توبہ کریں۔

ثانیاً۔ اس بات کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص ۳۰۷ ج ۶، میں اور علامہ سہارنپوری نے حاشیہ بخاری ص ۷۴ ج ۱، میں نقل تو کیا ہے مگر یہ صراحت نہیں کی کہ اس بات کو کس نے بیان کیا اور یہ قول مرفوع ہے یا موقوف، الغرض انہوں نے اس قضیہ کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دی، معلوم ہوتا کہ انہوں نے بھی زبان زدعام کی بنا پر لکھ دیا ہے ورنہ اس کی سند یا کم از کم حوالے کی نشان دہی ضرور کرتے۔

ثالثاً۔ اگر بالفرض اس کو نقل صحیح سے ثابت کر دیا جائے، حالانکہ ایسا ممکن نہیں، تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سرے سے حیلہ ہے ہی نہیں کیونکہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے عضو کاٹنے کی قسم کھائی تھی جسے انہوں نے کان چھید کر اپنی قسم کو پورا کیا ہے نہ کہ کسی حیلہ سے اسے ٹال دیا ہے۔

رابعاً۔ اگر مبتدعین اسی پر ہی بضد رہیں کہ نہیں یہ حیلہ ہی ہے، تو اسکو معتبر دلیل سے ثابت کرنا ان پر ادھار ہے، اور یہ ثابت کرنا کہ شریعت اسلامیہ میں یہ حکم اسی طرح ہی وارد ہوا ہے، ان پر لازم ہے کوئی صحیح حدیث پیش کریں۔

خامساً۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ پہلی شرائع میں قسم کا کفارہ نہ تھا، جبکہ دین اسلام میں قسم کا کفارہ بھی مقرر کر کیا گیا ہے، لہذا ہمیں کسی چیز پر قسم کھا کر حیلہ سے ٹالنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں بلکہ کفارہ ادا کر کے اپنی قسم کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

مشکوٰۃ کتاب البیوع باب الربوا میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عمدہ خرے لائے، حضور علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ کہاں سے لائے، عرض کیا کہ میرے پاس کچھ ردی خرے تھے، میں نے دو صاع ردی خرے دیئے اور ایک صاع عمدہ خرے لے لیے فرمایا یہ سود ہو گیا آئندہ ایسا کرو کہ ردی خرے پیسوں کی عوض فروخت کرو اور ان پیسوں کے اچھے خرے لے لو، دیکھو یہ سود سے بچنے کا ایک حیلہ ہے۔ جاء الباطل ص ۳۸۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اسے حیلہ کہنا ہی غلط ہے، کیونکہ حیلہ تو کہتے ہیں کسی حکم شرعی کو بہانے سے ٹالنے کو، جبکہ اس حدیث میں حکم شرعی کو قبول کیا گیا ہے، اور اس کا ایک عمدہ طریقہ شارع علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ہم علی سے کہیں فلاں راستے سے نہ گزرنا کہ وہاں رنڈیوں کا بازار ہے، بلکہ فلاں راستے سے گزرنا، تو علی کا اس راستے سے نہ جانا حیلہ نہیں بلکہ برے راستے سے بچنے کا ایک طریقہ ہے۔

ثانیاً۔ کھجوروں کو اپنی ہم جنس سے کمی و بیشی سے لینا تو واقعی سود ہوا کہ دونوں کی جنس ایک ہی ہے، اب اس سے بچنے کیلئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اپنی کھجوروں کو قیمتاً فروخت کرو، پھر ان پیسوں سے اعلیٰ کوالٹی کی کھجوریں خریدیں، حضرت جی یہ ایک بیع نہیں بلکہ دو ہیں کیونکہ جس طرح پہلی بیع تھی، اسی طرح دوسری بیع مستقل ہے اگر پہلے سے یہ طے کر لیا گیا کہ اتنے میں تو خرید لے اور فلاں قیمت پر میں تجھ سے خریدوں گا، دوسری بیع الگ نہ گنی جائے گی بلکہ اس کا شمار پہلی میں ہی ہوگا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، ثم اشتربہ، یعنی ان پیسوں سے پھر اچھی کھجوریں خرید۔

بخاری ص ۳۱۱ و مسلم ص ۲۶ ج ۲ و مشکوٰۃ ص ۲۴۵۔

ان الفاظ کا واضح مفاد یہ ہے کہ پہلی فروخت کے بعد یہ خرید بتلائی ہے جو اس بات کا قرینہ قویہ ہے کہ آخری بیع مستقل اور الگ ہے، پہلی بیع کا تہہ نہیں۔

الغرض حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی کھجوروں کو پہلے مارکیٹ میں منڈی کے ریٹ کے مطابق

فروخت کیجئے اور پیسے حاصل کر کے ان سے اچھی کھجوریں خرید لیجئے، ہم قارئین کرام کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حدیث کو فقہاء کے سودی حیلوں سے کیا مناسبت ہے کہ ایک غریب و مفلس جو دین دار ہے، وہ قرض لینا چاہتا ہے مگر قرض سود کے بغیر مل نہیں رہا، وہ حنفی سیٹھ صاحب کے پاس جاتا ہے کہ مجھے قرض سود کے بغیر چاہیے تو وہ فقیہ سیٹھ اسے اس طرح قرض عنایت کرتا ہے کہ تو مجھ سے ٹریکٹر پانچ لاکھ روپے کا خرید لے اور پھر وہیں بیٹھے ہوئے ہی میں تجھ سے وہی ٹریکٹر تین لاکھ کا خرید لوں گا، پھر رقم کی واپسی کی تاریخ متعین کی جاتی ہے اور حنفی مفتی و سیٹھ وہاں بیٹھے بیٹھے ہی اسے ٹریکٹر کی بجائے ایک مدت تک کیلئے تین لاکھ روپیہ عنایت کر دیتا ہے جسے واپسی کے وقت لینے والے نے پانچ لاکھ روپے دینے ہیں، ایمان سے کہنا کہ یہ سود نہیں تو اور کیا ہے، مگر حنفی فقہاء جو ساری زندگی تفقہ کا راگ آلاپتے رہتے ہیں اور اہل حدیث کو ظاہر پرست کہتے تھکتے نہیں، وہ اسے سود نہیں (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) کی مذکورہ حدیث سے استدلال کر کے سود سے بچنے کا ایک حیلہ کہہ رہے ہیں۔

آہ عربی میں ایک ضرب المثل ہے کہ، فرمن المطر وقام تحت المیزاب، یعنی بارش سے بھاگا اور پرنا لے کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا، افسوس کہ مبتدعین لفاظی سے اسے حیلہ ثابت کرنے کے درپہ ہیں۔
 رابعا۔ ایک بیع میں دو بیع کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

نہی رسول اللہ ﷺ عن بيعتين في بيعة.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ترمذی مع تحفة ص ۲۳۵ ج ۲، و نسائی ص ۲۲۰ ج ۲، و ابو داؤد مع عون ص ۲۹۰ ج ۳، و ابن حبان (۳۹۵۲) واللفظ له

یہ حدیث متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے

تحفة الاحوذی ص ۲۳۵ ج ۲، و التمهید ص ۳۸۸ ج ۲، و عون ص ۲۹۰ ج ۳، وغیرہ۔

اس بیع کی یہی صورت ہے کہ ایک شخص کسی سے پانچ لاکھ روپے میں ٹریکٹر ادھار لیتا ہے پھر وہی شخص اسی ٹریکٹر کو اڑھائی لاکھ میں خرید لیتا ہے، ٹریکٹر اسی کے پاس رہا مگر اس کے اڑھائی لاکھ

کھرے ہو گئے، جبکہ ان دونوں میں یہ بات پہلے سے طے پا چکی تھی، تو یہ ایک بیع میں دو بیع ہوئیں۔

جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

جس حدیث سے مبتدعین حیلہ ثابت کرتے ہیں اس کا وہی مفہوم لیا جائے جو مفتی صاحب نے بیان کیا ہے، تو ایک حرام کو حلال ماننا پڑھے گا، اور یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک صورت کو حرام بھی قرار دیں، لیکن پھر اسے حلال میں بھی داخل کر دیں، الغرض حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ایک بیع میں دو بیع جمع کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اپنی کھجوروں کو فروخت کرنا مستقل بیع ہے اور ان پیسوں سے دوسری کھجوریں خریدنا الگ اور دوسری بیع ہے، مگر یہ سیدھی اور صحیح بات مبتدعین کے فقہی دماغ میں نہیں اتر رہی، تو اسے حیلہ سے تعبیر کر کے سود کھانے کا بہانا بنا لیا ہے۔

نماز اور روزے کا حیلہ

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

روزے کا فدیہ قرآن سے ثابت ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامَ مَسْكِينٍ.

اور جن کو اس روزے کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجبور بوڑھا یا مرض الموت کا مریض جب روزے کے قابل نہ رہے تو ہر روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا دے اور نماز بمقابلہ روزے کے زیادہ مہتمم بالشان ہے، اس لئے نماز کو روزے کے حکم میں رکھا گیا، اسی آیت کے ماتحت تفسیرات احمدیہ شریف میں ملا احمد جیون قدس سرہ فرماتے ہیں،

نماز روزے کی مثل ہے بلکہ اس سے بھی اہم لہذا ہم نے اس میں بھی فدیہ کا احتیاطاً حکم دیا اور رب تعالیٰ کے فضل سے قبول کی امید ہے، نماز میں فدیہ کا واجب ہونا احتیاطاً ہے۔

شرح وقایہ میں ہے کہ ہر نماز کا ایک فدیہ ایک دن کے روزے کی طرح ہے اور وہ ہی صحیح ہے، شرح الیاس میں ہے، ہر فوت شدہ نماز کے فدیہ کا اعتبار ایک دن روزے پر ہے، یعنی ایک دن کے

روزے کی طرح ہے، جو شخص مرجائے اور اس پر رمضان کی قضا ہے پس اس نے وصیت کی تو اس کی طرف سے اس کا ولی ہر دن کے عوض ایک مسکین کو نصف صاع گیہوں (گندم) یا ایک صاع خرے یا جو دیدے کیونکہ میت اب ادا سے مجبور ہو گیا اور اسی طرح اس نے نماز کے بدلے میں کھانا دینے کی وصیت کی ہو،

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ نماز روزے کا فدیہ دینا جائز ہے اور قبول کی امید ہے بلکہ احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں چنانچہ نسائی نے اپنی سنن کبریٰ اور عبد الرزاق نے کتاب الوصایا میں سیدنا عبداللہ ابن عباس سے نقل فرمایا

لا یصلی احد عن احد ولا یصوم احد عن احد ولكن یطعم عنه مکان کل یوم مدین من حنطة.

کوئی کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے نہ روزے رکھے لیکن اس کی طرف سے ہر دن کے عوض دو گندم (آدھا صاع) خیرات کر دے۔

مشکوٰۃ کتاب الصوم باب القضاء میں ہے،

قال مات علیہ صیام شهر رمضان فلیطعم عنه مکان کل یوم مسکینا، جو مرجائے اور اس کے ذمہ رمضان کے روزے ہوں تو چاہیے کہ اس کی طرف سے ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا دیا جائے۔

غرض کہ نماز روزے کا فدیہ مال سے دینا شریعت میں وارد ہے اس کا انکار کرنا جہالت ہے۔

جاء الباطل ص ۳۸۵ تا ۳۸۷ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کا روزے کے فدیہ سے حیلہ کو ثابت کرنا ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ فدیہ تو زندہ شخص اپنی طرف سے ادا کرتا ہے جب کہ حیلہ اسقاط مرنے والے کے وارث اس کی طرف سے ہیر پھیر کر کے چند سیر گندم ادا کرتے ہیں، تو ان دونوں کے درمیان سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں، مگر مفتی صاحب کے ہاتھ ایسا محکمہ افتا لگ گیا ہے کہ جس کی آڑ میں وہ غلط سلط استدلال کر کے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں، اے جی روزے کا فدیہ ہر شخص کیلئے نہیں کہ جس کا روزے

رکھنے کو جی نہ چاہا وہ ایک مسکین کا کھانا کھلا دے تو فرض اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، بلکہ الفاظ قرآن کا معنی یہ ہے کہ،
ایسا شخص جو شیخ فانی ہو چکا ہے یا ایسا مریض جو مرض الموت میں مبتلا ہے تو اس کی طرف سے روزے کا فدیہ دے دیا جائے۔

چنانچہ احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے کہ

بعض جاہلوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ روزہ کا فدیہ ہر شخص کیلئے جائز ہے جب کہ روزے میں اسے تکلیف ہو، ایسا ہر گز نہیں، فدیہ صرف شیخ فانی کیلئے رکھا گیا ہے جو بہ سبب پیرانہ سالی حقیقۃً روزہ کی قدرت نہ رکھتا ہو نہ آئندہ طاقت کی امید کہ عمر جتنی بڑھے گی ضعف بڑھے گا اس کیلئے فدیہ کا حکم ہے۔

فتاویٰ رضویہ ص ۶۰۲ ج ۴۔

مولوی احمد رضا خاں کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ فدیہ کا حکم عام نہیں بلکہ خاص ہے، یہی ان کے قابل فخر شاگرد اور مفتی جی کے استاذ المکرم مولوی نعیم الدین فاضل مراد آبادی نے مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ترجمہ قرآن کے حواشی سورۃ بقرہ (۳۲۸) میں لکھا ہے بلکہ خود مفتی صاحب نے نور العرفان ص ۴۳ میں لکھا ہے۔

قارئین کرام جب آپ نے اس بات کو بخوبی جان لیا کہ فدیہ کا حکم عام نہیں بلکہ خاص ہے اور اس کا تعلق اضطراری حالت سے ہے، تو مفتی صاحب کا ایک تندرست اور جوان کا فدیہ کشید کرنا اور پھر فدیہ سے حیلہ کی طرف گھیٹ لانا غلط بیانی نہیں تو کیا ہے۔

ثانیاً۔ فدیہ سے حیلہ تو بنایا ہی تھا ستم بالائے ستم یہ کہ روزے کے فدیہ سے نماز کے فدیہ کو کشید کر لیا، پھر اس پر حنفی فقہ کی عبارات نقل کر دیں گویا کہ جیسی روح ویسے فرشتے، اے جی فقہ حنفی میں کیا کچھ نہیں لکھا کہ آپ اس کی عبارات ہم پر بطور حجت نقل کر رہے ہیں۔

ثالثاً۔ پھر مفتی صاحب نے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول سنن کبریٰ اور عبدالرزاق سے نقل کیا ہے، اس میں بھی تقلیدی ہاتھ کی صفائی دکھائی، اثر کے آخری الفاظ تھے، کل یوم مدمن خطیہ، دیکھئے السنن الکبریٰ للنسائی ص ۲۷۵ ج ۲، و بیہقی ص ۲۵۷ ج ۴، یہی الفاظ علامہ زلیعی حنفی نے، نصب الراية

ص ۴۶۳ ج ۲، میں علامہ مار دینی حنفی نے، الجوهرا لقی ص ۲۵ ج ۴، میں نقل کیے ہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب نقل میں اس قدر غیر معتبر ہیں کہ بلا وجہ واحد سے ثثنیہ بنا ڈالا ہے، پھر مفتی صاحب کا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کو مصنف عبدالرزاق کی طرف منسوب کرنا بھی نہایت درجہ کی غفلت ہے، کیونکہ مصنف میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے نہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا۔

دیکھئے مصنف عبدالرزاق ص ۶۱ ج ۹ (رقم الحدیث ۱۶۳۴۶) ونصب الراية ص ۶۳ ج ۲۔

رابعاً۔ جب انسان زندہ موجود ہو تو تب بلا شبہ معذور شخص کے متعلق یہی حکم ہے کہ اس کی طرف سے روزے کا فدیہ دینا ہی شرعی طور پر روزہ کے قائم مقام ہے، لیکن اس میں بھی حیلہ کی تجویز شریعت نے بیان نہیں کی کہ ایک دن کا کھانا بھہ کر کے واپس لیا جائے اور اس کو پھر دیکر واپس لے لیا جائے یہاں تک تیس بار ایسا کر کے ایک ہی فدیہ میں پورے روزوں کا کفارہ ادا کر لیا جائے، الغرض اس کو بھی ہر روزہ کے بدلہ میں فدیہ دینا ضروری ہے۔

خامساً۔ شریعت کا یہ حکم فقط زندہ شخص کے بارے میں ہے لیکن جب کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ روزوں کی قضا ہو تو ایسے شخص کے بارے میں فیصلہ مصطفوی فدیہ دینے کا نہیں بلکہ اس کی طرف سے وارث کو روزے رکھنے کا حکم ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال من مات و علیہ صیام صام عنہ ولیہ۔

یعنی بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر روزے رکھنے (باقی ہوں) تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے۔

صحیح بخاری ص ۲۶۲ ج ۱، و مسلم ص ۳۶۲ ج ۱۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

جاء رجل الى النبی ﷺ فقال يا رسول الله ﷺ ان امی ماتت و علیہا صوم

شہرا فاقضیہ عنہا؟ قال نعم فدين الله احق ان يقضى، الحديث۔

یعنی ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میری والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا فوت ہو گئی ہیں اور ان کے ذمہ رمضان المبارک کے مہینہ کے روزے تھے، تو کیا میں ان کی طرف سے

قضا کروں؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ مستحق ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔

صحیح بخاری ص ۲۶۲ ج ۱، صحیح مسلم ص ۳۶۲ ج ۱۔

صحیح مسلم کی روایت میں قدرے تفصیل زیادہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے جواب میں فرمایا،

لو كان على امك دين اكنت قاضيه عنها.

یعنی اگر تیری والدہ پر کوئی قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کرتا، تو اس شخص نے کہا ہاں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ مستحق ہے کہ اسے ادا کیا جائے، صحیح مسلم شریف ص ۳۶۲ ج ۱۔

ان احادیث صحیحہ سے ثابت ہوا کہ مرنے والے کی طرف سے وارث روزے رکھے گا نہ کہ فدیہ ادا کرے گا، اقوال ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ چونکہ احادیث مرفوعہ کے مخالف ہیں، اس لئے حجت نہیں، کیونکہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب قول صحابی حدیث مرفوعہ کے مخالف ہوگا، تو تب حجت نہ ہوگا۔

چنانچہ علامہ ابن ہمام ہدایہ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں،

ان قول الصحابی حجة مالم ينفه شئ من السنة.

یعنی صحابی کا قول یقیناً حجت ہے جب تک سنت اس کی نفی نہ کرے،

فتح القدیر ص ۳۷۷ ج ۲۔

مولوی احمد رضا خاں بریلوی کا شاگرد خاص مولوی ابو یوسف محمد شریف حنفی بریلوی لکھتا ہے کہ،

اور صحابی کا قول جب کہ سنت کے برخلاف ہو حجت نہیں ہوتا،

کشف الغطاء مندرجہ دلائل المسائل ص ۲۱۰۔

الغرض قول ابن عمر رضی اللہ عنہ اور قول ابن عباس رضی اللہ عنہ چونکہ احادیث مرفوعہ کے خلاف ہیں۔ لہذا حجت نہیں، باقی رہا مفتی صاحب کا مشکوٰۃ سے حدیث نقل کرنا کہ مرنے والے کی طرف سے ایک مسکین کا فدیہ ادا کر دو، تو یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبد الرحمن بن ابی

لیلیٰ راوی ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۴۳ ج ۲، اور محمد بن عبدالرحمن سی الحفظ ہے، دیکھئے دین الحق ص ۳۸۳ ج ۱۔

تنبیہ

علامہ مار دینی حنفی، الجوہر النقی ص ۲۵۴ ج ۴، میں فرماتے ہیں کہ محمد بن عبدالرحمن کا محمد بن سرین ابن ملجہ میں متابع موجود ہے، واضح رہے کہ ابن سرین کہنا امام ابن ملجہ یا ان کے شیخ کا وہم ہے جیسا کہ امام مزنی نے، الاطراف، میں اور حافظ ابن حجر نے، التلخیص ص ۲۰۹ ج ۲، میں اس کی صراحت کی ہے، مولانا عبید اللہ رحمانی محدث مبارک پوری نے، مرعہ المفاتیح ص ۳۳ ج ۷، میں اس پر نہایت عمدہ بحث کی ہے بازوق حضرات مراجعت فرمائیں،

خلاصہ کلام یہ کہ سند میں محمد بن عبدالرحمن ہی ہے اور محمد بن سرین کہنا امام ابن ملجہ یا ان کے شیخ کا وہم ہے۔

خلاصہ کلام

یہ کہ صحیح اور خالص حق بات یہی ہے کہ فوت شدہ کے ذمہ اگر روزوں کی قضا ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے قضاء ادا کرے، اس ساری تفصیل سے یہ بات ہمارے سامنے کھل کر آگئی کہ مرنے والے کی طرف سے فدیہ دینا غیر مشروع اور دین میں زیادتی ہے لہذا مفتی صاحب کا مرنے والے کی طرف سے روزہ کی قضا میں فدیہ ادا کرنے کی تلقین کرنا اور منکر پر جہل ہونے کا فتویٰ صادر کرنا، خود مولف جاء الباطل کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، پھر روزے کے فدیہ سے نماز کا فدیہ کھینچ لینا تو ان کے اچھل ہونے کی برہان واضح ہے۔

الغرض شریعت میں مرنے والے کی طرف سے روزوں کی قضا کے عوض میں فدیہ ادا کرنا ثابت نہیں بلکہ روزوں کی قضا ادا کرنے کا حکم ہے جب روزوں کا ہی فدیہ ثابت نہ ہوا تو نماز کا بالا ولی ثابت نہ ہوا کہ کیونکہ مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند لوگوں نے نماز کے فدیہ کو روزے کے فدیہ پر قیاس کیا تھا، جب اصل کا ہی فدیہ ثابت نہ ہوا تو اس پر قیاس کے چہ معنی۔

العود الی المقصود

خیر مفتی صاحب نے روزوں کا فدیہ ثابت کرنے کے لئے جو پاڑ بیلنے تھے وہ تو ایک الگ اور مستقل بحث تھی، ستم یہ ڈھایا کہ فدیہ سے حیلہ بنانے کی فضول کوشش کی ہے، حالانکہ فدیہ تو ہر روزہ کا الگ دینا ضروری ہے جبکہ حیلہ تو فدیہ کو ٹالنے کا ناکام بہانہ ہے کہ گندم وغیرہ کو ہیر پھیر کر کے فقیر کو دیدیتے کہ چند سیروں میں پوری زندگی کے روزے اور نمازیں معاف ہو جائیں، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ دعویٰ اور دلیل میں کونسی مناسبت ہے کہ حیلے کے جواز کیلئے مفتی صاحب فدیہ کی بحث کو درمیان میں گھسیٹ لائے ہیں۔

اسقاط کا ثبوت

مفتی صاحب نے اسقاط کے ثبوت کے لئے دور کا چکر لگا کر آخر میں حیلہ اسقاط کا ثبوت دینے کی غرض سے تیسری فصل کے تحت، مسئلہ اسقاط کے ثبوت، کے زیر عنوان جو بھی زیب رقم فرمایا ہے، وہ چند کتب فقہ حنفیہ کی عبارات ہیں، حالانکہ مفتی صاحب کا حق تھا کہ قرآن و سنت اور اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا ثبوت دیتے یا کم از کم امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ارشد تلامذہ سے اس کا ثبوت عنایت فرماتے، مگر مفتی صاحب نے ان تمام چیزوں کو بالاسطاق رکھ کے، نور الایضاح، درمختار، فتاویٰ شامی، الاشباہ والنظائر، عالمگیری، کی عبارات ذکر کی ہیں، اور مزید پانچ چھ کتب فقہ کے نام لکھ کر فرمایا کہ ان میں بھی ایسا ہی لکھا ہے، دیکھئے جاء الباطل ص ۳۸۷ تا ۳۸۸ ج ۱۔

جب کہ ان میں کسی مسئلہ کا بیان کیا جانا، حنفیہ پر تو یقیناً حجت ہے لیکن ایک تنبیح سنت اور قرآن اور صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اپنا راہنما اور قائد جاننے والے کے نزدیک ان کتب فقہ کی حیثیت پر کاہ اور دمڑی کی بھی نہیں، بالخصوص جبکہ ان کے مسائل خلاف شریعت اور قرآن و سنت سے متصادم و متعارض ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو انشاء اللہ، دین الحق کی چوتھی جلد میں ہم فقہ حنفیہ کے عجیب و غریب مسائل ذکر کریں گے۔

واضح رہے کہ جس شخص کی نماز عذر شرعی کی وجہ سے قضا ہو جائے اس کا فقط یہی کفارہ ہے کہ اسے جب یاد آئے، تو نماز کو پڑھ لے، نماز کے عوض میں کوئی صدقہ و خیرات کفارہ نہیں بن سکتا،

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ،

عن النبی ﷺ قال من نسی صلوٰۃ فلیصلی اذا ذکر ہا لا کفارة لہا الا ذلک،
الحديث.

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نماز کو بھول جائے، تو اسے جب یاد آئے تو پڑھ لے، اس کا کوئی اور کفارہ نہیں فقط یہی ہے (کہ نماز کو قضا کرے)

بخاری ص ۸۴ ج ۱، و مسلم ص ۲۴۱ ج ۱، و ابو داود ص ۶۴ ج ۱، و ابو
عوانہ ص ۳۸۵ ج ۱، و ص ۲۵۲ ج ۲، و مسند احمد ص ۲۶۹ ج ۳، و ابن خزیمہ
(۹۹۳) و بیہقی ص ۲۱۸، ۳۳۰، ۴۵۶، ج ۲.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر کسی نماز کی ادائیگی باقی ہو
تو اس کی طرف سے اس نماز کی قضا نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس کے عوض میں اسکی طرف سے
کھانا کھلایا جائے گا، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے، لا کفارة لہا الا ذلک، کہہ کر حصر کر دیا ہے کہ اس کے
کفارہ کی ایک ہی صورت ہے کہ جس کی رہ گئی ہے وہ خود اس نماز کی قضا کرے، جب زندگی میں
قضاء نماز کا صدقہ کفارہ نہیں بن سکتا تو مرنے کے بعد اس کی طرف سے وارثوں کا کیا ہوا صدقہ عوض
کیسے بن جائے گا، مگر افسوس کہ یہ چھوٹی سی بات مولف جاء الباطل کے مفتیانہ دماغ میں نہیں اتری
کہ نماز کے عوض میں فدیہ کا فتویٰ صادر کر دیا ہے پھر فدیہ کو بھی ہیر پھیر اور حیلہ سازی سے اس کا
حلیہ بگاڑ دیا ہے، کاش حضرت مفتی صاحب کتب فقہ کی بجائے احادیث رسول اللہ ﷺ کا مطالعہ
فرماتے، تو انہیں ایسے خرافات کے جواز پر کتاب تحریر کرنے کی بجائے کسی بہتر دینی خدمت کی اللہ
رب العزت کی طرف سے توفیق دی جاتی، واللہ یھدی من یشاء۔

اسکیننگ : محمد شاہد
اکراۃ تجاویز کیلئے رابطہ کریں
truemaslak@inbox.com

باب اذان میں انگوٹھے چومنے کی بحث

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مبتدعین کے عوام جب مؤذن سے، اشہدان محمد رسول اللہ (ﷺ)، کی آواز سنتے ہیں، تو وہ پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو چومتے ہیں، پھر اسے آنکھوں پر لگاتے ہیں، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں،

جب مؤذن کہے، اشہدان محمد رسول اللہ (ﷺ)، تو اس کو سن کر اپنے دونوں انگوٹھے یا کلمے کی انگلی چوم کر آنکھوں سے لگانا مستحب ہے۔

جاء الباطل ص ۳۹۴ ج ۱۔

الغرض ہمارا مشاہدہ اور مفتی صاحب کا اقرار اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ مبتدعین اذان سن کر جواب اذان دینے کی بجائے کلمہ شہادت پر انگوٹھوں کو چوما کرتے ہیں، اور یہ ایک ایسی بدعت سیئہ ہے جو کہ سنت خیر الانام کے مخالف ہے کیونکہ، مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ اذان کا جواب دیا جائے یعنی جس طرح مؤذن کلمات اذان کہتا ہے سننے والا بھی انہیں کلمات کو دہرائے۔

جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر گواہ ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

انہ سمع النبی ﷺ یقول اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول ثم صلوا علی فانه من صلی علی صلوٰۃ صلی اللہ علیہ بہا عشراً، الحدیث۔

یعنی میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے کہ جب مؤذن سے اذان سنو تو اسی کی مثل تم بھی کلمات اذان کہو پھر مجھ پر درود بھیجو کیونکہ جس نے مجھ پر ایک بار درود بھیجا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں بھیجے گا،

الحدیث، صحیح مسلم ص ۱۶۶ ج ۱، والبوداؤد ص ۷۷ ج ۱۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب مؤذن، اللہ اکبر اللہ اکبر، کہے تو تم میں سے ہر ایک بھی، اللہ اکبر اللہ اکبر، کہے، جب مؤذن، اشہدان لا الہ الا اللہ، کہے تو وہ بھی یہی کہے، پھر جب مؤذن، اشہدان محمد رسول اللہ، کہے تو وہ بھی یہی کہے، جب

مؤذن، حی علی الصلوٰۃ، کہے تو سننے والا، لا حول ولا قوۃ الا باللہ، کہے، جب مؤذن حی علی الفلاح، کہے تو سننے والا، لا حول ولا قوۃ الا باللہ، کہے، جب مؤذن، اللہ اکبر اللہ اکبر، کہے تو وہ بھی ان کلمات کو دہرائے اور جب مؤذن، لا الہ الا اللہ، کہے تو وہ بھی اسی طرح کہے، آخر میں فرمایا کہ
من قلبہ دخل الجنة، یعنی جس نے دل سے ان کلمات کو کہا اسکے لئے جنت میں داخلہ ہے، صحیح مسلم ص ۱۶۷ ج ۱، و ابوداؤد ص ۸ ج ۱۔

اذان کا جواب دینے کی احادیث متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں مثلاً، ابی رافع رضی اللہ عنہ، ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، عبداللہ بن ربیعۃ رضی اللہ عنہ، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، معاذ بن انس رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ۔ دیکھئے ترمذی مع تحفہ ص ۱۸۳ ج ۱، والتلخیص الحجیر ص ۲۱۱ ج ۱، والتحصید ص ۱۳۲ ج ۱۰، و ارواء الغلیل ص ۲۵۸ ج ۱، و بیہقی ص ۴۰۹ ج ۱ وغیرہ۔

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ اذان سننے والے پر اس کا جواب دینا واجب ہے، لیکن مبتدعین اس مسنون طریقہ کو ترک کر کے اور، اشھدان محمد رسول اللہ، کہنے کی بجائے بقول مفتی صاحب مرحبا بحبیبی قرۃ عینی محمد بن عبداللہ، کو کہتے ہوئے اپنے انگوٹھے چومتے ہیں۔ جاء الباطل ص ۹۶ ج ۱۔

حالانکہ اس کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی وزنی ثبوت تو کجا کوئی حسن درجہ کی روایت بھی نہیں ہے، اس سلسلہ میں جو بھی بیان کیا جاتا ہے اس کی حیثیت زیب داستان سے بڑھکر نہیں ہے، مولوی احمد رضا خاں نے لکھا ہے کہ

بعض جہال بدست یا نیم ملاشہوت پرست یا جھوٹے صوفی باد بدست کہ احادیث صحاح مرفوع محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصے یا محتمل واقعے متشابہ پیش کرتے ہیں انہیں اتنی عقل بھی نہیں یا قصداً بے عقل بنتے ہیں کہ صحیح کے سامنے ضعیف، متعین کے آگے محتمل، محکم کے حضور متشابہ واجب التکرار ہے،

احکام شریعت ص ۶۲۔ و فتاویٰ رضویہ ص ۱۹۹ ج ۱۰ حصہ اول واللفظ لہ

یہی کچھ ہم یہاں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اذان کا جواب دینے کی احادیث صحیحہ ہیں اور متعدد

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جبکہ اس کے برعکس کلمہ شہادت کے وقت، اشہد ان محمد رسول اللہ، کہنے کی بجائے، مرحبا بحبیبی قرۃ یعنی محمد بن عبد اللہ، کہہ کر انگوٹھوں کو چومنے کی روایات من گھڑت اور وضعی ہیں جن کی حیثیت قصے و کہاوٹوں سے زیادہ نہیں ہے، لیکن افسوس کہ مبتدعین کے بانی نے اپنے قائم کیے ہوئے اصول و ضابطے سے انحراف کرتے ہوئے، انگوٹھے چومنے کے جواز پر مستقل کتابیں لکھیں ہیں جن میں سے معروف، منیر العینین، ہے جو فتاویٰ رضویہ کی دوسری جلد میں شامل اشاعت ہے، جس میں انہوں نے دو تین صفحات اصل موضوع پر لکھنے (مفتی صاحب کی پیش کردہ من گھڑت روایات) کے بعد ادھر ادھر کی بے کار بھرتی کر کے فتح حاصل کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے، حالانکہ ان کا یہ حق تھا کہ اذان کے جواب کی روایات کے بالمقابل صحیح مرفوع احادیث پیش کر کے محدثین کرام سے ان کی تصحیح نقل کرتے، چونکہ یہ کام علمی تھا اور سند مولوی احمد رضا خاں کو ملی نہ تھی، اس لئے انہوں نے خلط بحث کرتے ہوئے مسئلہ کو الجھاؤ میں ضرور ڈالا، لیکن اپنے عمل کی کوئی صحیح سند حدیث تو کجا کوئی حسن درجہ کی بھی پیش نہ کر سکے، تو خاں صاحب خود اپنے اصول کی رو سے جاہل ثابت ہو گئے۔

انگوٹھے چومنے کا ثبوت

اس عنوان کے تحت حضرت مفتی صاحب نے متعدد کتب فقہ اور تفاسیر کی عبارات نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسند فردوس الاخبار، میں حدیث آتی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مؤذن سے کلمہ، اشہد ان محمد رسول اللہ، سن کر اپنی شہادت والی انگلی کو چوم کر اپنی آنکھوں کو لگایا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میرے اس پیارے کی طرح کرے اس کیلئے میری شفاعت واجب ہوگی۔

دوسری روایت حضرت خضر علیہ السلام کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس نے مؤذن کو یہ کہتے ہوئے سنا، اشہد ان محمد رسول اللہ، تو کہے مرحبا بحبیبی وقرۃ یعنی محمد بن عبد اللہ، پھر اپنے انگوٹھوں کو چومے اور اپنی آنکھوں سے لگائے تو اس کی آنکھیں کبھی نہ دھیں گی، اس پر مفتی صاحب نے مقاصد حسنہ، وغیرہ کتب کے حوالے بھی نقل کیے ہیں، جاء الباطل

ص ۳۹۴ تا ۳۹۷ ج ۱۔

الجواب

مفتی صاحب اور ان کے گرو مولوی احمد رضا خاں اور دیگر بدعت پسند حضرات نے اس کی دلیل پر جس قدر حوالے نقل فرمائے ہیں، ان تمام کا خلاصہ مطلب یہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث فردوس الاخبار میں آتی ہے، مسند فردوس، آج سے تقریباً دس سال قبل کی شائع ہو چکی ہے اور بفضلہ تعالیٰ ہماری لائبریری میں موجود ہے، جس کی ایک ایک سطر کو راقم نے گہری نظر سے پڑھا ہے مگر اس میں مبتدعین کی پیش کردہ روایت سرے سے موجود ہی نہیں، یہی وجہ تھی کہ راقم الحروف نے، دین الحق ص ۳۷ ج ۱، میں چیلنج دیا تھا کہ اس کی سند ثابت کرنے والے کو راقم پانچ ہزار روپیہ نقد انعام دے گا، مگر مبتدعین نے اس پر دم نہیں مارا، اب بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ ہم پوری دنیا کے منکرین سنت اور عاشقین بدعات کو کھلا چیلنج دیتے ہیں کہ اس کی صحیح سند ثابت کر دو تو ہم اس کو سنت تسلیم کرنے کو تیار ہیں، اور انشاء اللہ جماعتی سطح پر اس پر عمل کریں گے مگر یاد رہے کہ پوری دنیا کے رضا خانی اس کا ثبوت نہیں دے سکتے،

غالباً انہیں چیزوں کو ملحوظ رکھ کر ہی علامہ سیوطی نے کہا ہے کہ

والاحادیث التي رويت في تقبيل الانامل وجعلها على العينين عند سماع اسمه ﷺ عن المؤذن في كلمة الشهادة كلها موضوعات.

یعنی وہ احادیث جن میں مؤذن سے کلمہ شہادت میں رسول اللہ ﷺ کا نام سننے کے وقت انگلیاں چومنے اور آنکھوں پر رکھنے کا ذکر ہے سب کی سب من گھڑت اور جعلی ہیں۔ تیسیر المقال بحوالہ فتاویٰ نذیریہ ص ۲۲۸ ج ۱۔

علامہ ابواسحاق بن عبد الجبار کابلی نے شرح رسالہ عبدالسلام لاہوری میں لکھا ہے کہ،

قد تكلّموا في احاديث وضع الابهامين على العينين فلم يصح شئى

منها برواية ضعيفة ايضاً صرح بعضهم بوضع كلها.

یعنی محدثین کرام نے انگوٹھوں کا آنکھوں پر رکھنے کی روایات پر کلام کیا ہے اور ان میں سے کوئی روایت سند ضعیف سے بھی ثابت نہیں ہوئی اور بعض محدثین نے اسی وجہ سے ان کے من

گھڑت ہونے کی صراحت کی ہے،

بحوالہ ایضاً ص ۲۴۷ ج ۱۔

امام ابو الحسن عبدالغافر فارسی شارح صحیح مسلم فرماتے ہیں،

والروایات فی هذا الباب كثيرة لا اصل لها بسند ضعيف ايضاً وقال ابو نعیم

الا صفهانی ماروی فی ذلك كله موضوع.

یعنی انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر انگوٹھے رکھنے کی روایات گو کثرت سے بیان کی جاتی ہیں مگر ان سے کوئی بھی ضعیف سند سے بھی ثابت نہیں امام ابو نعیم اصفہانی نے کہا کہ یہ تمام کی تمام من گھڑت اور جعلی ہیں۔

اقوال الا کاذیب بحوالہ فتاویٰ نذیریہ ص ۲۴۷ ج ۱۔

علامہ سخاوی، ملا علی قاری، علامہ طاہر حنفی، عجلونی وغیرہ نے اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ، لم یصح، یعنی اس کا صحیح ہونا ثابت نہیں، اس کا جواب تحریر کرتے ہوئے مولوی احمد رضا خاں کی تقلید میں مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ، لم یصح، سے ضعف ثابت نہیں ہوتا اور ضعیف فضائل میں معتبر ہیں جاء الباطل ص ۳۰۰ و ۳۰۱ ج ۱۔

حالانکہ یہ روایت ضعیف ہی نہیں بلکہ جعلی ومن گھڑت ہے اور کوئی دنیا میں بریلوی مائی کا لال۔ اس کی سند صحیح تو کجا مسند فردوس سے اس کا وجود ہی ثابت نہیں کر سکتا جب یہ سرے سے ہے ہی من گھڑت تو فضائل میں ضعیف کے معتبر ہونے کا، اصول کون سنتا ہے بالخصوص جب یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے، رہی حضرت خضر علیہ السلام کی طرف سے منسوب روایت کا معاملہ تو گزارش ہے کہ اس کے بارے میں ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں،

بسند فيه مجاہیل مع انقطاعه.

یعنی اس کی سند منقطع ہے اور کئی راوی درمیان میں مجہول ہیں،

موضوعات کبیر ص ۸۰ طبع میر محمد کتب خانہ کراچی۔

عیسائیوں کے گھر سے

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت صدر الافاضل مولائی مرشدی استاذی مولانا الحاج سید نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی دام ظلہم فرماتے ہیں کہ ولایت سے انجیل کا ایک بہت پرانا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام ہے، انجیل برنباس، آجکل وہ عام طور شائع ہے اور ہر زبان میں اس کے ترجمے کئے گئے ہیں اس کے اکثر احکام اسلامی احکام سے ملتے جلتے ہیں اس میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے روح القدس (نور مصطفوی) کے دیکھنے کی تمنا کی تو وہ نور ان کے انگوٹھے کے ناخنوں میں چمکایا گیا، انہوں نے فرط محبت سے ان ناخنوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا، جاء الباطل ص ۳۹۸ ج ۱۔

الجواب

بات کو آگے لے جانے سے قبل بہتر معلوم ہوتا کہ، انجیل برنباس، کی اصل عبارت قارئین کرام کے ہدیہ کی جائے۔

پس آدم نے بہمت یہ کہا کہ ابے پروردگار یہ تحریر مجھے میرے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن پر عطا فرما۔

تب اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کو یہ تحریر اس کے دونوں انگوٹھوں پر عطاء کی، دہنے ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن پر یہ عبارت، لا الہ الا اللہ، اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن پر یہ عبارت، محمد رسول اللہ ﷺ، تب پہلے انسان نے ان کلمات کو پدری محبت کے ساتھ بوسہ دیا، اور اپنی دونوں آنکھوں سے ملا اور کہا، مبارک ہے وہ دن جس میں کہ تو دنیا کی طرف آئے گا، انجیل برنباس فصل ۳۹ آیت ۲۳ تا ۲۷، ص ۱۰۶۔

یہ ہے جناب وہ عبارت جس کی طرف حضرت مفتی صاحب نے روایتی طور پر اشارہ کیا ہے، لیکن اس میں چند وجوہات سے کلام ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اولاً۔ مفتی صاحب کے بیان اور اصل عبارت میں اختلاف ہے۔

ثانیاً۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انگوٹھوں کو پدری محبت کی وجہ سے بوسہ دیا، جبکہ مبتدعین پدری محبت سے نہیں بلکہ حضور علیہ السلام کی محبت کی وجہ سے چومتے ہیں۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں نیز

آدم علیہ السلام نے اس تحریر کو چوما تھا جس میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا تھا جب کہ مبتدین حضرات کے ہاتھوں پر تحریر نہیں ہوتی وہ صرف اسم مبارک سنتے ہی انگوٹھے چومتے ہیں۔ پھر حضرت آدم نے اذان میں رسول اکرم ﷺ کا نام سن کر انگوٹھا نہیں چوما تھا جب کہ مبتدعین اذان میں اسم مبارک سن کر انگوٹھے چومتے ہیں۔ (محمد یحییٰ گوندلوی)

ثالثاً۔ انجیل برنباس بھی دیگر اناجیل کی طرح لفظی و معنوی تحریفات کا شکار ہے، جس کی ضروری تفصیل انجیل برنباس کے مقدمہ میں خلیل سعادت نے بڑی تفصیل سے بیان فرمائی ہے۔
 رابعاً۔ انجیل کے اس اقتباس سے استدلال دراصل اس کی صحت کی تصدیق کرنا ہے جبکہ آنحضرت ﷺ نے اہل کتاب کی خبر کی تصدیق کرنے سے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم. الحديث.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی بات کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو۔ بخاری شریف ص ۱۱۲۵ ج ۲، و بیہقی ص ۱۶۳ ج ۱۰۔

لہذا مبتدعین کا انجیل برنباس کے قول کی تصدیق کر کے مخالف کو حجت باور کرانا، فرمان نبوی کی مخالفت ہے، الغرض انجیل برنباس کا اقتباس تب معتبر ہے جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے تصدیق شدہ ہو یعنی قرآن و حدیث میں اس واقعہ کی صحت ثابت ہو، لیکن ہم پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور نبی ﷺ نے اس کی قطعاً تصدیق نہیں کی، اور پوری دنیا کے مبتدعین سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کر سکتے، قیامت تک مہلت ہے تجربہ کر دیکھئے۔

خامساً۔ انجیل برنباس میں کئی ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جو اس کی صحت کو ساقط الاعتبار قرار دیتی ہیں، اور انبیاء کرام کی تعلیم کے منافی ہیں، اگر مبتدعین اس

حقیقت سے انکار کریں گے، تو انشاء الرحمن اس کی بحوالہ نشان دہی کر دی جائے گی، لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اس میں اکثر احکام اسلام سے ملتے ہیں، اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔

ایک من گھڑت

حضرت مفتی صاحب نے تفسیر روح البیان کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ انسان کے ناخن دراصل جنتی لباس ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام کے پورے جسم پر نہایت خوبصورت اور نرم تھا جب ان پر عتاب الہی ہوا وہ کپڑا اتار لیا گیا مگر انگلیوں کے پوروں پر بطور یادگار باقی رکھا گیا، جاء الباطل ص ۴۰۳ ج ۱۔

حالانکہ یہ روایت محض جھوٹ کا پلندہ اور سینہ گزٹ ہے، کسی معتبر دلیل شرعی سے اس کا ثبوت نہیں دیا جاسکتا، الغرض انگوٹھے چومنے کی جس قدر روایات اور محل استدلال کی عبارات ہیں وہ تمام کی تمام من گھڑت ہیں جن کی حیثیت افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

علماء بریلویہ کا اعتراف

دین میں کسی چیز کے اثبات کیلئے حنفیہ نے ادلہ اربعہ کا اصول بنایا تھا کہ دین کے مسائل، قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس شرعی سے ثابت ہونگے، گو ہمارے نزدیک اصل قرآن و حدیث ہی ہے کیونکہ قرآن و حدیث کے خلاف اجماع ہو سکتا ہے نہ ہی قیاس۔

الغرض قرآن و حدیث سے دلائل شرعیہ کا اثبات کرنے میں فریقین متفق ہیں اس ضابطہ پر بھی محقق علماء کا اتفاق ہے کہ ضعیف و موضوع اور من گھڑت واقعہ کو بنیاد بنا کر کسی شرعی مسئلہ کا اثبات کرنا درست نہیں ہے، اور یہ کہ کسی ضعیف روایت سے کوئی دینی مسئلہ ثابت نہ ہوگا، بریلوی مکتب فکر کا بانی مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے کہ

مذکورہ حدیث کو زید نے بالجزم رسول خدا کا ارشاد بتایا ﷺ، یہ سخت

بیباکی و جرأت ہے وہ حدیث صحیح نہیں، اس کی سند کا مدار ابو صالح بازام پر ہے، بازام کو آئمہ فن نے ضعیف بتایا ہے، تقریب امام ابن حجر عسقلانی میں ہے،

بازام بالذال المعجمة ويقال اخره نون ابو صالح مولیٰ ام هانی ضعیف

مدلس۔

یہیں سے ظاہر ہوا کہ یہ حدیث قابل احتجاج نہیں،

فتاویٰ رضویہ ص ۱۵۷ ج ۴۔

مزید کہتا ہے کہ اگر سند کا سلسلہ نہ ہوتا تو جو شخص چاہتا دین میں اپنی مرضی کی بات کرتا پھرتا، احکام شریعت ص ۱۳۳ حصہ اول مسئلہ ۵۸۔

رضا خانی فرقہ کا مناظر اعظم مولوی محمد عمر اچھروی لکھتا ہے،

اس کی سند میں بہت ضعف ہے چنانچہ اس سند کے رواۃ سے عبد اللہ بن صالح راوی ہیں، ان کے متعلق لکھا گیا ہے کہ، بہت غلط روایتیں بیان کرتا تھا، اہل حدیث بننے کا دعویٰ کرنے والو، ایسی کچی بات احناف کے سامنے پھر زبان پر نہ لانا،
مقیاس حقیقت ص ۲۴۷۔

مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ کراچی، شرح صحیح مسلم میں لکھتا ہے کہ یہ غیر مستند روایت ہے اور اسکی سند مذکور نہیں ہے، شیخ دھلوی نے اس کو، معارج النبوة، میں نقل کیا ہے اور اس میں رطب و یابس موجود ہے یہ حوالہ ہم پر حجت نہیں ہے، شرح صحیح مسلم ص ۵۱۸ ج ۱۔

مزید فرماتے ہیں، یہ واقعہ بنو سلمہ کے بعض بوڑھوں سے مروی ہے جن کا نام نہیں بیان کیا گیا، سو یہ مجھول روایت ہے، اور مجھول روایت حجت نہیں ہوتی۔
شرح صحیح مسلم ص ۵۱۱ ج ۱۔

ان عبارات سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ضعیف روایت سے استدلال کرنا درست نہیں اور بلا سند حدیث حجت نہیں ہے کیونکہ اگر سند نہ ہوتی تو ہر شخص جو جی میں آتا کہتا پھرتا، اور اپنی بات اور نظریہ کو حدیث کر کے پیش کرتا۔

قارئین کرام جب آپ نے یہ اصولی بات بخوبی سمجھ لی ہے کہ بلا سند حدیث معتبر اور قابل استدلال نہیں ہوتی، تو اب سنئے کہ انگوٹھے چومنے کی جس قدر روایات

بیان کی جاتی ہیں وہ تمام کی تمام من گھڑت بلا سند اور مجھول لوگوں سے مروی ہیں اور ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں جو قابل استدلال ہو۔

مبتدعین کا بنیادی استدلال ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی روایت پر ہے مگر

ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ ان کی طرف جھوٹی منسوب کی گئی ہے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ یہ کسی مستند حدیث کی کتاب میں نہیں ہے ہاں بعض متاخرین نے بغیر سند کے ذکر کیا ہے، لیکن یہ ان کا وہم ہے، اور اوہام کو دین میں داخل کرنا، کم عقلی ہی نہیں بدترین جہالت ہے، دوسری روایت جو حضرت خضر علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے بیان کی جاتی ہے اس کے بارے میں خود متاخرین نے اس کی سند میں مجہول راویوں کے علاوہ انقطاع کو تسلیم کیا ہے۔

الغرض یہ من گھڑت ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہیں جو کہ ہم پر لجت نہیں ہے۔



باب الطلاق الثالث فی مجلس واحد

فصل اول

پہلی آیت

للذین یولون من نساء هم تربص اربعة اشهر فان فاءو فان الله غفور الرحیم ☆ وان عزموا الطلاق فان الله سمیع علیم ☆ والمطلقت یتربصن بانفسهن، ثلاثة قروء ولا یحل لهن ان یمکن ما خلق الله فی ارحامهن ان کن یومن بالله والیوم الآخر وبعولتهن احق برد هن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا ولهن مثل الذی علیهن بالنعروف و للرجال علیهن درجة والله عزیز حکیم ☆ الطلاق مرتن فامساک بمعروف او تسریح باحسان.

پ ۲ سورة البقرہ آیت ۲۲۶ تا ۲۲۹

اور وہ جو قسم کھا بیٹھے ہیں اپنی عورتوں کے پاس (نہ) جانے کی انہیں چار مہینے کی مہلت ہے پس اگر مدت میں پھر آئے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر چھوڑ دینے کا ارادہ پکا کر لیا، تو اللہ سنتا جانتا ہے اور طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رہیں، تین حیض تک اور انہیں حلال نہیں کہ چھپائیں وہ جو اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کیا، اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتی ہیں، اور ان کے شوہروں کو اس مدت کے اندر ان کے پھیر لینے کا حق پہنچتا ہے اگر ملاپ چاہیں اور عورتوں کا بھی حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے شرع کے موافق اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے، پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا کوئی (نیکی) کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

(ترجمہ مولوی احمد رضا خان فاضل بریلوی)

ان آیات بینات سے دو باتیں کھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں کہ قسم کھانے والا مرد چار مہینے کی مدت گزرنے پر دو راستوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے میں مکلف ہے 'اول اپنی' قسم سے رجوع کرے، دوم یا پھر عورت کو طلاق دیکر رخصت کر دے اگر خاوند نے منوخر اللہ کر راستہ اختیار کیا ہے

طلاق دے دی، تو عورت کو حکم ہے کہ وہ تین قرؤ (جس کا مولوی احمد رضا خاں نے معنی تین حیض کیا ہے) انتظار کرے اور خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ اس دوران طلاق سے رجوع کر لے، اور یہ رجوع دو طلاقوں تک ہے تیسری کے بعد نہیں ہے اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ طلاق دینے کے بعد مرد کو عدت کے دوران رجوع کا حق قرآن نے دیا ہے اور یہ حکم عام ہے جس میں ہر طلاق دینے والا اور ہر مطلقہ عورت داخل ہے (مگر وہی جسے اللہ اور اس کے رسول نے علیحدہ کر دیا ہو)

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

آیت کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ایک دم تین طلاقیں ایک ہی ہوں گی، بلکہ مقصد یہ ہے کہ طلاق رجعی دو طلاقیں ہیں، الطلاق میں الف لام عہدی ہے پھر فرمایا کہ جو کوئی دو سے زیادہ یعنی تین دے تو بغیر حلالہ سے عورت حلال نہیں۔ جاء الباطل ص ۴۶۱ ج ۱۔

الجواب

اولاً: قرآن کے الفاظ ہمارے سامنے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ کے بعد دوسری دفعہ طلاق دینا مشروع فرمایا ہے مجموعی طور پر تین طلاقیں (بیک وقت) دینا اصل میں مشروع ہی نہیں فرمایا، چنانچہ اطلاق مرتان میں دو یکے بعد دی گئی طلاقوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اب وقت ہے کہ یا تو پہلے دی گئی طلاقوں سے ”فامساک بمعروف“ معروف طریقہ سے عورت کو روک لیا جائے یعنی ان طلاقوں سے رجوع کر لیا جائے یا پھر تیسری دیکر اسے ”او تسرع باحسان“ فارغ کر دیا جائے پھر اسی تسرع باحسان کا تھوڑا سا آگے چل کر ذکر کر کے فرمایا کہ فان طلقها فلا تحل لہ، یعنی اگر تیسری بار طلاق دے دی تو وہ (عورت) اس مرد کے لیے حلال نہیں رہتی۔

یہ تیسری آخری طلاق بائن ہوگی، جس سے میاں بیوی کے درمیان ہمیشہ کیلئے جدائی واقع ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے طلاق دینے کی ہدایت دیکر جو حکمت و مصلحت ملحوظ رکھی ہے وہ اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب قرآنی حکم کے مطابق طلاق دی جائے اور یہ تب ممکن ہے جب طلاق باری باری متفرق طہروں میں دی جائے، اب اگر کوئی شخص ایک دم تین طلاقیں دیتا ہے اور پھر اسے تین تسلیم بھی کر لیا جاتا ہے تو جہاں اس کا یہ فعل معصیت ہے وہاں ہی کتاب اللہ کے ساتھ

مذاق بھی ہے اور اللہ نے رجعت کا جو حق دیکر فریقین کو سوچ و بچار کا موقع فراہم کیا تھا اس کو ضائع کرنے کے علاوہ دو خاندانوں کی بربادی اس پر مستند ہے ان تمام حقائق کے برعکس مفتی صاحب کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے یہ فرما رہے ہیں کہ اس میں ایک دم دی گئی تین طلاقیں کے ایک کا ذکر نہیں ہے حالانکہ مرتان کا لفظ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دو طلاقیں دوبار دو طہروں میں واقع ہوں جیسا کہ علامہ ابو بکر حصاص نے احکام القرآن میں صراحت کی ہے (تفصیل آگے مفتی صاحب کی پہلی دلیل میں آرہی ہے انشاء الرحمن۔

عربی زبان ہی نہیں دنیا کی کسی زبان میں اگر آپ کہیں کہ میں نے زید کو ایک بار دو درہم دیئے تو اس کا کوئی جاہل بھی یہ معنی نہ سمجھے گا کہ بکرنے زید کو دو مرتبہ درہم دیئے۔

رہا مفتی صاحب کا مذکورہ دھکوسلہ کہ تین کو ایک نہیں کہا تو جواباً عرض ہے کہ ایک دم دی گئی تین کو تین تسلیم کرنے کا جب رد ہو گیا اور قرآن نے صاف کہہ دیا کہ مرد کو ایک وقت میں صرف ایک رجعی طلاق دینے کا حق ہے اور کسی شخص کو اس کا شرعاً کوئی اختیار نہیں کہ وہ یکدم تین طلاقیں دے سکتا ہے جس کے بعد دروازہ رجوع بند ہو جائے اور جس پر انسان کو شرعاً کوئی اختیار ہی نہ ہوا اس کو اگر کوئی نادان و جاہل کر بھی لے تو تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی جہالت کی وجہ سے عند اللہ کوئی مواخذہ نہیں نہ کہ کسی جاہل کا کر لینا ہی اس کے حق میں قانون بھی بن جاتا ہے مثال کے طور پر اگر کسی جاہل نے ایسی عورت سے نکاح کر لیا جس سے نکاح کرنے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق حضرت محمد ﷺ نے منع فرمایا ہے تو جہالت سے ایسی حماقت کرنے والے کو یہی کہا جائے گا کہ نکاح نہیں ہوا اسی مسئلہ طلاق کے ہی ایک پہلو کو لے لیجئے کہ اگر کسی نے یہ کہا کہ اگر میں فلانی عورت سے شادی کروں تو میری طرف سے اس پر طلاق ہے اور بعد میں اس سے شادی بھی ہو جاتی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے صاف کہا ہے کہ ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی، لا طلاق قبل النکاح، یعنی نکاح سے قبل طلاق واقع نہیں ہوتی، ابن ماجہ ص ۱۳۸ و بیہقی ص ۳۲۰ ج ۷، و مصنف عبد الرزاق (۱۳۸۹۹) و حاکم ص ۲۰۵ و دارقطنی ص ۴ ج ۴، واقع نہ ہونے کی صاف اور صریح وجہ یہی ہے کہ نکاح سے پہلے مرد کو طلاق دینے کا اختیار نہیں، اسی طرح اگر کوئی صبح وقت ہی ظہر و عصر و مغرب و عشاء کی نماز پڑھ لے اگرچہ پڑھنے والا جاہل ہی کیوں نہ ہو مگر کوئی اناڑی

بھی یہ نہ کہے گا کہ ایسے کرنے والے کی پانچوں نمازیں ہو گئیں جناب من اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ جب قرآن نے مرد کو ایک وقت میں صرف ایک ہی طلاق دینے کا حق دیا ہے تو واقع بھی صرف وہی ہوگی جس کا مرد حق دیا گیا ہے، ایک اور طرح سے اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو وقف کرتا ہے جس پر اس کی ملکیت نہیں تو کیا اس شخص کا وقف کرنا درست ہے اور فی الواقع وہ چیز وقف بھی ہو جائے گی، جان من جس چیز پر انسان کو اختیار ہی نہیں وہ کسی کے زبانی جمع خرچ سے اختیار مل نہیں جائے گا۔

ثانیاً: مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ الطلاق میں الف لام عہدی ہے، غلط محض ہے کیونکہ یہاں لام عہد کیلئے نہیں بلکہ عموم کیلئے ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ طلاق مشروع متفرق ہے چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر مظہری میں، 'الطلاق مرتان' کے تحت لکھتے ہیں

وفي ما قال مرتان، دون ثنتان دلالة على كراهة الطلقين دفعة واحدة فان كلمة مرتان تدل بالعبادة على التفريق وبالإشارة على العدد وللام اللجنس وليس وراء الجنس شئى وكان القياس ان لا يكون الطلقين المجتمعان معتبرة شرعا واذا لم يكن الطلقان معتبرة لم يكن الثلاث مجتمعة معتبرة باطريق الاولى لو جودهما فيها مع زياده

اللہ تعالیٰ کا 'مرتان'، فرمانا، 'ثنتان' نہ کہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ طلاق مجموعی طور پر دینی حرام ہیں اس لئے کہ کلمہ مرتان عبارت انص کے طور پر تفریق پر دلالت کرتا ہے اور بطور اشارۃ انص عدد طلاق پر اور الطلاق کے اندر الف لام جنس کا ہے اور جنس کے آگے کچھ نہیں ہوتا اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ مجموعی دو طلاقیں معتبر نہ ہوں گی تو تین طلاقیں بدرجہ اولیٰ معتبر نہ ہوں گی کیونکہ تین کے اندر دو کا عدد زیادتی کے ساتھ موجود ہوتا ہے، اور دو اور ایک ملا کر تین ہوتے ہیں)

ثالثاً: مفتی صاحب کا یہاں یہ فرمانا کہ پھر فرمایا کہ جو کوئی دو سے زیادہ تین دے تو بغیر حلالہ عورت حلال نہیں الخ اگر مفتی صاحب کی یہاں مراد ایک دم تین طلاقیں دینا ہے تو یہ قرآن پر افترا ہے اور اس کا افترا ہونا فریقین کو مسلم ہے کیونکہ یکدم تین طلاقیں کے ممنوع ہونے کا اعتراف مؤلف جاء الباطل کے تقلیدی مذہب کو بھی ہے اور اس تقلیدی مذہب نے اپنے منوقت پر آیت قرآنی، 'الطلاق مرتان' کو دلیل قرار دیا ہے۔

ملاحظہ احکام القرآن للجصاص والمبسوط للسرخسی، ص ۴۰۳ ج ۶۔

ظاہر ہے کہ اگر یکدم تین طلاقوں کا یہاں ذکر ہوتا تو فقہاء احناف تین کی حرمت کا اس سے استدلال نہ کرتے

دوسرا اعتراض

اگر مان لیا جائے کہ مرتان سے تین طلاقوں کی علیحدگی مراد ہے تو یہ کہنا کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے اس میں بھی طلاقوں کی لفظاً علیحدگی ہے اور یہ کہنا کہ تجھے تین طلاقیں ہیں اس میں عددی علیحدگی، کیونکہ علیحدگی کے بعد کیسے عدد بنے گا آیت کا یہ مطلب کہاں سے نکال لیا کہ طلاقوں کے درمیان ایک حیض کا فاصلہ ہونا شرط ہے، جاء الباطل ص ۴۶۱ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قرآن نے عورت کو تین حیض تک انتظار کرنے کا حکم دیا ہے، اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اس دوران مرد کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے، صاف ظاہر ہے کہ اگر مرد طلاق کو وقفہ حیض سے دے گا تو تب ہی تین حیض کے درمیان رجوع کر سکتا ہے کیونکہ جب دوسری طلاق دے گا تو دوسرا حیض آنے کے بعد ختم ہو چکا ہوگا اور یہی آخری رجعی طلاق ہوگی، اگر تیسرا حیض بھی آ گیا تو عورت بائن ہو کر مرد پر حرام ہو جائے گی اگر مفتی صاحب زندہ ہوتے تو ہم انہیں مشورہ دیتے کہ مولوی احمد رضا خاں بریلی کے ترجمہ قرآن کو پڑھیں جنہوں نے مغلطہ قراء کا معنی تین حیض کیا ہے ثانیاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے میں بھی لفظاً علیحدگی ہے، جواباً عرض ہے کہ حضرت اس طرح یکدم تین طلاقیں دینا قرآن کے موافق ہیں یا مخالف؟

اگر مخالف ہیں یقیناً مخالف ہیں کیونکہ اسی طرح طلاق دینا تو صاحب ہدایہ (جو کہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب ہے) نے لکھا ہے بدی ہے اگر اس طرح طلاق قرآن کے موافق ہوتی تو بدی طلاق کیوں ہوتی؟ اس سے واضح ہوا کہ مفتی صاحب کا اعتراض غلط ہے اور انہوں نے قرآنی حکم سے فرار کا ایک جھوٹا بہانہ تلاش کیا ہے جب قرآن نے ایک وقت میں صرف ایک ہی طلاق دینے کا حکم فرمایا ہے تو صاف واضح ہے تو ایک ہی واقع ہوگی نہ کہ تینوں، اس کی مثال اس طرح سمجھئے کہ ایک

دن میں نماز ظہر صرف ایک ہی بار پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اب اگر کوئی شخص تین دنوں کی نماز ظہر ایک ہی دن پڑھنے کا ارادہ کر لے اور یہ سوچ کر سپنچر کو ظہر کے وقت میں تین بار نماز ظہر اس طرح پڑھے کہ پہلی بار کی نماز ظہر ہفتہ کی نماز ظہر ہے دوسری بار کی نماز ظہر اتوار کی اور تیسری بار کی نماز سوموار کی نماز ظہر ہے تو ظاہر ہے شریعت اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ظہر کی نماز تینوں مختلف اوقات میں ایک ایک دن کے وقفہ سے ظہر کے وقت میں پڑھیں جائیں اس لیے ایک دم پڑھی ہوئی دوسری اور تیسری ظہر کی نمازیں کا اہتمام ہوگی اسی طرح اگر کوئی مختلف اوقات کے بجائے ایک وقت میں الفاظ طلاق کو دہرائے گا تو اس کا ایک سے زیادہ والا مانا جائے گا کیونکہ شریعت نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ دو مرتبہ طلاق رجعی دی جائے مطابق عدت دی جائے طلاقھن لعدتھن“ اور مطابق عدت طلاق کا مطلب شریعت نے یہ بتلایا ہے کہ طلاق دینے کے لائق وقت میں صرف ایک ہی طلاق دی

جاسکتی ہے اس کی ایک نظیر مسئلہ حج بھی ہے کہ شریعت میں حج مقررہ وقت میں صرف ایک ہی بار کیا جاسکتا ہے اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ میں حج کے مقررہ وقت میں ایک دم دو تین بار یا اس سے بھی زیادہ حج کر ڈالوں اور وہ یکدم ایک حج کی بجائے وہ تین حجوں کیلئے دو تین احرام یا ان سے بھی زیادہ حجوں کیلئے باندھ لے اور احرام کی تعداد کے مطابق افعال حج بھی متعدد بار انجام دے تو ظاہر ہے کہ بیک وقت ایک سے زیادہ احرام دیئے ہوئے یہ افعال حج جہاں کتاب و سنت کے ساتھ ایک مذاق ہے وہاں ہی اس کے یہ افعال حج کا اہتمام ہو گئے۔

خلاصہ یہ کہ جس کام کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کسی کو اختیار ہی نہیں دیا وہ کسی امتی کی محض جہالت سے کر لینے سے ہی اس فعل کا صادر ہو جانا ممکن نہیں اور اس کے صدور کا قائل روح شریعت سے مذاق کر رہا ہے یہ اتنی واضح بات ہے کہ ہر شخص کی سمجھ میں آسانی آسکتی ہے اور اس پر تمام دوسرے شرعی امور کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

تمہاری تفسیر سے بھی آیت کا یہ مطلب بنے گا کہ طلاقیں الگ الگ ہونی چاہئیں ہم بھی یہ ہی

کہتے ہیں کہ بیشک ایک دم تین طلاقیں دینا سخت منع ہے الگ الگ ہی دینا ضروری ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ جو کوئی حماقت سے ایک دم تین طلاقیں دیدے تو واقع بھی ہوگی یا نہیں اس سے آیت ساکت ہے، 'جاء الباطل ص ۴۶۱ ج ۱۔

الجواب

اولاً طلاق کو الگ الگ دینا یہ صرف ہماری ہی تفسیر نہیں بلکہ تمام مفسرین کرام اس کی یہی تفسیر کرتے ہیں کیونکہ قرآن کی آیات کا یہی مقصود ہے اور خود مفتی صاحب نے یہ بات لکھ کر کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ایک دم تین طلاقیں دینا سخت منع ہیں۔ الگ الگ دینا ضروری ہیں، تمام مفسرین کی بالعموم اور ہمارے موقف کی بالخصوص تائید کر دی ہے۔

ثانیاً۔ ربی مفتی صاحب کی یہ الٹی منطق کہ اگر کوئی حماقت سے طلاق دیدے تو واقع بھی ہوگی یا نہیں، اور پھر خود ہی یہ کہنا کہ آیت قرآنی اس سے خاموش ہے۔ اس لا یعنی کلام کا مقصد بالکل وہی ہے جس طرح کسی جاہل و نادان نے قرآن کی ان آیات کا مذاق اڑایا تھا کہ قرآن میں یہ تو ضرور ہے کہ تمہاری مائیں بیٹیاں بہنیں پھوپھیاں خالائیں بھتیجیاں، بھانجھیاں، دودھ کی مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا، تمہاری دودھ کی بہنیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، پچھلی لڑکیاں جو اکثر اوقات تمہاری پرورش میں ہوں یہ سب تم پر حرام ہیں۔

سورۃ النساء آیت ۲۳۔

مگر قرآن اس سے ساکت ہے کہ اگر کسی نے حماقت سے ان عورتوں میں سے کسی سے نکاح کر لیا تو اب اس پر وطی کرنا بھی حرام ہے۔

فریق ثانی جس دلیل سے ایسے خبیث انسان کو مطمئن کرے گا وہی دلیل ہماری طرف سے مفتی صاحب کے مذکورہ ڈھکوسلے کی تصور کر لیجئے گا، حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب نے مذکورہ اعتراض کر کے آیات قرآنی کا مذاق اڑایا ہے، مفتی جی جب ایک سے زیادہ طلاق دینا نص سے حرام ہیں (جیسا کہ حنفیہ کو بھی اس کا اقرار ہے) تو پھر کسی کے فعل حرام سے حلال حرام نہیں ہو گا جیسا کہ حدیث نبوی میں صراحت ہے کہ ”لا تحرم الحرام الحلال“ ابن ماجہ (۲۰۱۵) و بیہقی ص ۱۶۸، ۱۶۹ ج ۷ و دارقطنی ص ۶۸ ج ۳۔

یعنی حرام حلال کو حرام نہیں کرتا اس طرح تین یکدم دینے سے گہنگار تو ہوا مگر طلاق کے بعد رجعت کو قرآن نے تین مہینے کے اندر حلال کیا ہے اسے اس کا یہ فعل حرام نہیں کرے گا، باطل اسی طرح جس طرح مذکورہ عورتیں جو کہ محرمات سے ہیں اگر کوئی نکاح کرے تو نکاح کرنے والا گہنگار تو ہوگا مگر نکاح فاسد ہوگا، یہی علماء بریلی کے سرخیل اور مجدد بریلویت مولوی احمد رضا خاں نے فتویٰ دے رکھا ہے، چنانچہ خاں صاحب سے سوال کیا جاتا ہے کہ زید نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا اور اس کی حیات میں اس کی چھوٹی بہن سے نکاح کیا، نکاح دوم جائز ہے یا ناجائز اس کا خاں صاحب نے صاف جواب دیا ہے کہ نکاح دوم فاسد ہے احکام شریعت ص ۱۳۵ حصہ اول

دوسری آیت

اللہ تعالیٰ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تَخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبِينَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ لَا يَتَعَدُّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا ☆ فَإِذَا بَلَغَ اجْلِهِنَّ فَاْمَسْكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَى عَدْلٍ مِنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّيْءَ لِلَّهِ

سورة الطلاق آیت ۲۱ -

اے نبی ﷺ جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت میں طلاق دیا کرو اور عدت شمار کیا کرو اور اپنے پروردگار سے ڈرتے رہا کرو تم ان کو ان کے مکانوں سے نہ نکالا کرو اور نہ وہ خود نکلا کریں ہاں جس وقت وہ کھلی بدکاری کریں تو نکال دو اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا، شاید اللہ اس کے بعد کوئی امر پیدا کر دے، پھر جب وہ اپنی عدت کو پہنچنے لگیں تو عزت کے ساتھ ان کو روک لیا کرو یا دستور کی موافق ان کو جدا کر دیا کرو اور وہ علول گواہ بنا لیا کرو اور شہادت اللہ کے لیے دیا کرو۔

آگے فرمایا۔ جو لوگ اللہ پر اور بچھلے دن پر ایمان رکھتے ہیں انکو یہ نصیحت کی جاتی ہے جو شخص

اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کیلئے راہ نکال دے گا اور خدا اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو گا جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کو کافی ہو گا بیشک اللہ تعالیٰ اپنی منشاء کے مطابق اپنا کام کر دیا کرتا ہے۔

قد جعل الله لكل شئ قدراً (۳)

اللہ نے ہر چیز کیلئے اندازہ اور وقت مقرر کر رکھا ہے (ثانی)

ناظرین کرام

اولاً: ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک بات کی صراحت فرمائی ہے کہ

قد جعل الله لكل شئ قدراً (۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر دی ہے، ظاہر ہے کہ اس فرمان الہی میں طلاق بھی داخل ہے بلکہ طلاق کے سلسلہ میں اس کا ذکر فرما کر اس طرف توجہ دلا دی کہ طلاق کیلئے خصوصی ایک حد مقرر کر رکھی ہے، ذالکم یوعظ بہ کہہ کہ معاملہ اور بھی صاف کر دیا کہ جو اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں انہیں نصیحت ہے کہ طلاق کے سلسلہ میں جاری کردہ میرے فرمان کی مخالفت ایک مومن کے شایان شان نہیں اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے ہاں ظالم اور اسلامی حدود سے تجاوز کے مرتکب قرار پائیں گے۔

”ذلک امر اللہ“ کہہ کر اس بات پر مزید زور دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم نازل کیا ہے اس کی پابندی کی جائے۔

ثانیاً۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت صراحت سے طلاق دینے والوں کو حکم دیا ہے کہ اپنی عورتوں کو عدت میں طلاق دو اور اس (عدت) کی پوری پوری نگہداشت رکھو اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے صاف اعلان فرمایا کہ عدت میں طلاقیں دینے کا مطلب یہ ہے کہ مدخلہ عورت کو (جس طہر میں جماع نہ کیا ہو) ایک بار طلاق دو حضرت امام نافع فرماتے ہیں کہ۔

ان عبد الله بن عمر طلق امراته وهي حائض على عهد رسول الله ﷺ فسال عمر بن الخطاب رسول الله ﷺ عن ذلك فقال رسول الله ﷺ مره اجمعها ثم يمسكها حتى تطهر ثم تحيض ثم تطهر ثم انشاء املاء بعد وان شاء طلق قبل ان

یمس فنلک العدة التي امر الله ان يطلق لها النساء . موطا امام مالک ص ۵۲۲ واللفظ وبخاری ص ۷۹۰ ج ۲، و مسلم ص ۴۷۶ ج ۱ .

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی عورت کو حیض کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں طلاق دی، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔ نہیں حکم دو رجعت کر لیں۔ پھر رہنے دیں جہاں تک کہ حیض سے پاک ہو پھر حائضہ ہو پھر حیض سے پاک ہو، اب اختیار ہے خواہ رکھے یا طلاق دے اگر طلاق دے تو اس طہر میں صحبت نہ کرے یہی عدت ہے جس میں حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا۔ (انحی)

اس حدیث کی روشنی میں قرآن مجید کی مذکورہ آیات کا یہ معنی متعین ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ اصول بتایا ہے، ”ہر چیز کیلئے ایک حد متعین کر دی گئی ہے“ اس کے مطابق اس نے طلاق کے لیے حد متعین کر دی ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک طلاق دی جائے اور یہ بھی حکم قرآنی ہے کہ اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ طلاقیں دینے کی شریعت نے اجازت نہیں دی اور یہ چیز بھی کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جس کام کا انسان کو شرعاً اختیار نہیں اسے کسی نے کر ڈالا تو اس کا اعتبار نہیں بلکہ وہ کام کالعدم ہوگا، اس کی مسئلہ طلاق میں ہی مثال موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے نہ کہ عورت کو، اگر عورت حماقت سے یہ کہہ دے کہ میں نے اپنے خاوند کو طلاق دی طلاق دی طلاق دی اور ان تینوں طلاقوں سے مراد بھی عورت کی تینوں طلاقیں دینا ہی ہو، تو کیا طلاق واقع ہو جائے گی، یقیناً نہیں، علماء بریلویہ طلاق کے واقع نہ ہونے کی یہی دلیل دیں گے کہ عورت کو طلاق دینے کا اختیار ہی نہیں دیا گیا، اسی طرح جب طلاق کا مرد کا اختیار نہیں دیا گیا وہ واقع ہی نہیں ہوگی۔

تنبیہ

حضرت مفتی صاحب نے مذکورہ آیات کے ماتحت، ”ابوداؤد وغیرہ سے حدیث رکانہ درج کر کے اہل حدیث کی طرف سے، ”تیسرا اعتراض“ ذکر کیا ہے کہ ابو رکانہ نے اپنی بیوی ام رکانہ کو طلاق دی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ رجوع کر لو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور میں نے تین

طلاق دی ہیں، فرمایا ہاں ہم جانتے ہیں مگر رجوع کرو اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلَّقُوا هُنَّ لَعْنَتُهُنَّ .

اگر اکٹھی طلاق تین واقع ہوئیں تو رجوع ناممکن تھا وہاں تو حلالہ کی ضرورت درپیش آتی۔

معلوم ہوا کہ ایک طلاق باقی رکھی گئی اور دو کو رد کر دیا گیا حالانکہ ابو رکانہ عرض کر رہے ہیں کہ

میں نے تین طلاقیں دی ہیں یہاں تاکید کا احتمال نہیں اور پھر بھی ایک ہی مانی گئی الخ۔

حضرت مفتی صاحب نے اس کا جواب تقریباً ڈیڑھ صفحہ تحریر کیا ہے خلاصہ ان کی تحریر کا یہ ہے

کہ تین طلاقیں والی روایت ضعیف ہے جب کہ صحیح روایت سے یہ ثابت ہے کہ ابو رکانہ نے طلاق

بتہ دی تھی پھر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دیگر احادیث سے صحیح ہے کیونکہ اس کا بیٹا اور اس کے گھر

والے اس کے حالات سے بمقابلہ غیروں کے زیادہ واقف ہوتے ہیں رکانہ کے پوتے تو فرماتے

ہیں کہ میرے دادا نے میری دادی کو طلاق بتہ دی اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ طلاق تین دیں۔

جاء الباطل ص ۴۶۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ طلاق بتہ کی روایت ضعیف ہونے کے علاوہ مفتی صاحب کے مذہب کے مخالف ہے

جیسا کہ آگے مفتی صاحب کی چھٹی دلیل کے جواب میں تفصیل سے انشاء الرحمن آ رہا ہے۔

ثانیاً۔ لفظ بتہ سے مروی یہ حدیث ہمارے مخالف نہیں بلکہ موافق ہے جو اسے اہل حدیث کے

رد میں پیش کرتا ہے، اس نے یا تو مغالطہ کھایا ہے یا جان بوجھ کر حقیقت پر پردہ ڈال رہا ہے وجہ اس

کی یہ ہے کہ اہل مدینہ طلاق ثلاثہ کو طلاق بتہ کہتے تھے۔

فریق ثانی پر حجت تامہ کیلئے ہم اس جگہ پر ایک بریلوی مکتب فکر کے مفسر قرآن جناب پیر کرم

شاہ ادھر می آف بحیرہ کا حوالہ پیش کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ

اہل مدینہ کا عرف یہ تھا کہ طلاق ثلاث کو طلاق بتہ کہا کرتے نہ یہ کہ طلاق البتہ کو طلاق ثلاث،

دعوت فکر و نظر مندرجہ مجموعہ مقالات علیمہ ص ۲۳۴۔

اس لحاظ سے مدنی عرف کے مطابق حدیث رکانہ کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے بیوی کو مجلس

واحد میں تین طلاقیں دی تھیں لیکن طلاق کے بعد انہوں نے اپنی بیوی کو رکھنا چاہا تو رسول اللہ ﷺ

نے ان کو اس کی اجازت مرحمت فرمادی۔ ثالثاً حضرت مفتی صاحب نے ابو داود اور بیہقی سے حسب ذیل الفاظ نقل کر کے۔

انما طلق امراته البتة وجعلها النبی ﷺ واحدة، جاء الباطل ص ۴۶۴ ج ۱۔
 طلاق ثلاث کے الفاظ سے مروی روایت کو ضعیف ٹھہرایا ہے، حالانکہ ایسا کرنا حضرت مفتی صاحب کی شایان شان نہ تھا کیونکہ مذکورہ الفاظ تو ہمارے موقف (جو کہ ثانیاً کے تحت گزر چکا ہے) کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ یہاں بتہ کے الفاظ واحدة کے بالقابل بولے گئے ہیں جو اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ بتہ سے مراد ایک دم دی گئی تین طلاقیں ہیں جنہیں نبی ﷺ نے ایک شمار کیا،، جعلھا“ کا یہی مفاد ہے۔

پہلی حدیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ۔

كان الطلاق على عهد رسول الله ﷺ وابي بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا في امر كانت لهم فيه اناة فلو امضيته عليهم فامضاه عليهم۔

مسلم ص ۳۷۷ ج ۱

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارکہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی دو سال تک تین طلاقیں ایک ہوتی تھیں۔ (پھر) عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں نے ایک ایسے کام میں جلد بازی شروع کر دی ہے جس میں ان کو مہلت تھی، پس اگر ہم ان تینوں کو ہی ان پر نافذ کر دیں، (تو مناسب ہے) پس آپ نے تین طلاقوں کو نافذ کر دیا،

اس حدیث کی صحت کیلئے اس قدر ہی کافی ہے کہ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں داخل کیا ہے اور اس کے اول تا آخر تمام راوی ثقہ و ثبت ہیں، خود حضرت مفتی صاحب نے بھی اسکی صحت کو تسلیم کیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنا پورا زور حدیث مذکورہ کی تاویل میں صرف کیا ہے اگر

صحت حدیث میں انہیں رتی بڑی گنجائش نظر آتی تو حضرت حکیم صاحب اپنی مخصوص حکمت کو جوش میں لا کر کوئی نہ کوئی حواس باختہ جرح ضرور کرتے خلاصہ یہ کہ حدیث مذکورہ صحیح ہے اس مسئلہ میں واضح بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی طیبہ میں اور اس طرح خلافت صدیقی و ابتدائی دور فاروقی میں بیک وقت دی گئی تین طلاقیں کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا، نبی رحمت حضرت مصطفیٰ ﷺ کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کی شایان شان نہیں کہ وہ اس کی جان بوجھ کر مخالفت کرے کیونکہ یہ راستہ سیدھا جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی کی تو یہ روایت ہے اور خود ان ہی کا فتویٰ ہے کہ ایک دم تین طلاقیں ہی تین طلاقیں ہی ہوں گی جس کا ذکر پہلے باب میں ہو چکا ہے اور جہاں راوی حدیث کا عمل اپنی روایت کے خلاف ہو وہاں معلوم ہو گا کہ راوی کے علم میں یہ حدیث منسوخ ہے نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قانون بنا دینا کہ ایک دم تین طلاقیں تین ہی ہوں گی اور اس پر عمل درآمد ہو جانا اور کسی صحابی بلکہ خود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا اس پر اعتراض نہ کرنا باواز بلند خبر دیتا ہے کہ وہ حدیث یا منسوخ ہے یا ماول (نقل مطابق اصل، ابو صہیب) کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حدیث کے خلاف اجماع کر سکتے ہیں، جاء الباطل ص ۴۲ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ طلاق ثلاثہ کے وقوع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے تفصیل آگے آ رہی ہے، انشاء الرحمن۔

ثانیاً۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد اسناد صحیحہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے یکدم دی گئی طلاق ثلاثہ کو ایک طلاق رجعی قرار دیا ہے کماسیاتی انشاء الرحمن بفضلہ تعالیٰ۔

ثالثاً۔ قال اعتبار راوی کی حدیث کا ہوتا ہے نہ کہ راوی کی رائے کا خاص کر جب راوی سے نبی ﷺ کی وفات کے بعد حدیث کے موافق فتویٰ منقول ہو، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے

حدیث کے موافق فتویٰ عیا ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پوری مدت خلافت صدیقی اور ابتدائی دور خلافت فاروقی کے دو تین سال تک اس حدیث پر امت کا تعامل رہا ہے تو اس کے بعد کس چیز نے اس کو منسوخ کر دیا ہے، امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ۔

الماذری وقد زعم من لا خبر له بالحقائق ان ذلك كان ثم نسخ قال وهذا غلط فاحش لان عمر رضى الله عنه لا ينسخ ولو نسخ و حاشاه لبأدبرت الصحابة الى انكاره وان اراده هذا القائل انه نسخ في زمن النبي ﷺ فذلك غير ممتنع ولكن يخرج عن طاهر الحديث لانه لو كان كذلك لم يخبر للراوى ان يخبر ببقاء الحكم في خلافة ابى بكر و بعض خلافة عمر فان قيل قد يجمع الصحابة على النسخ فيقبل ذلك منهم قلنا انما يقبل ذلك لانه يستدل اجماعهم على ناسخ واما انهم ينسخون من تلقاء انفسهم فمعاذ الله لانه اجماع على الخطا وهم معصومون من ذلك فان قيل فلعل النسخ انما ظهر لهم في زمن عمر قلنا هذا غلط ايضا لانه يكون قد حص الاجماع على الخطا في زمن ابى بكر و المحققون من الاصوليين لا يشترطون انقراض العصر في صحة الاجماع، والله اعلم. شرح صحيح مسلم ص ۴۷۸ ج ۱.

مازری نے کہا ہے کہ جن لوگوں کو حقائق کی خبر نہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ حکم تھا پھر منسوخ ہو گیا، مازری نے کہا یہ واضح طور پر غلط ہے کیونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کسی چیز کو منسوخ نہیں کر سکتے اور اگر حاشاؤ کلا منسوخ کرتے بھی تو صحابہ کرام فوراً انکار کرتے اور اگر قائل کا منشا یہ ہے کہ حکم نبی ﷺ کے دور میں منسوخ ہو گیا تو یہ بات ناممکن نہیں لیکن یہ بات حدیث کے خلاف ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو راوی کیلئے جائز نہ ہوتا کہ وہ خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض سالوں تک اس حکم کے باقی رہنے کی خبر دیتا، اگر یہ کہا جائے کہ کبھی صحابہ نسخ پر اجماع کر لیتے ہے اور ان کا اجماع قبول کر لیا جاتا ہے، ہم کہتے ہیں کہ انکا اجماع اس لئے قبول کر لیا جاتا ہے کہ اس سے نسخ کے وجود کیلئے دلیل فراہم ہو جاتی ہے، رہی یہ بات کہ وہ خود منسوخ کرتے

ہیں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کیونکہ یہ غلطی پر اجماع ہوگا اور وہ اس سے معصوم ہیں۔

اگر کہا جائے کہ نسخ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ظاہر ہوا، ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں غلطی پر اجماع ہو گیا تھا اور محقق علماء اصول نے اجماع کی صحت کیلئے زمانہ کے ختم ہونے کی شرط نہیں لگائی، واللہ اعلم۔

مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض

دوسرے یہ کہ اس حدیث میں اس عورت کو طلاق دینا مراد ہے جس سے خلوت نہ ہوئی ہو اور واقعی اگر کوئی شخص اپنی ایسی عورت کو تین طلاقیں ایک دم اس طرح دے کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے تو اول واقع ہوگی اور اخیر کی دو طلاقیں لغو چنانچہ ابو داؤد کتاب الطلاق باب النسخ المراجعة التعلیقات الثلث میں ہے کہ ابو صعبان نے عہد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کو خبر نہیں کہ زمانہ نبوی زمانہ صدیقی اور شروع خلافت فاروقی میں جو کوئی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تو ایک ہی مانی جاتی تھی۔ فرمایا ہاں جو غیر مدخولہ بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا اسکی طلاق ایک پڑتی تھی۔ جاء الباطل ص ۴۶۲ ج ۱۔

الجواب

اولا۔ مفتی صاحب نے صحیح حدیث کو رد کرنے کیلئے جو یہ مخلص تلاش کیا ہے اس میں رتی بھر جان نہیں اور اسے بے جان سمجھ کر ہی اکابر احناف نے اس کی تردید کی ہے تفصیل آگے انشاء الرحمن آ رہی ہے۔

ثانیا۔ یہ خود مفتی صاحب کے تقلیدی مذہب کے خلاف ہے کیونکہ ان کا موقف ہے کہ اگر خاوند نے بیوی سے کہا تجھے تین طلاقیں ہیں تو تینوں ہی واقع ہو جائیں گی چنانچہ علماء بریلویہ کے سر اور مجدد بدعات مولوی احمد رضا خاں نے لکھا ہے کہ۔

قربت نہ کی تھی تو ایک لفظ میں تین طلاقیں دیں مثلاً یہ کہ تو تین طلاق سے مطلقہ ہے تو طلاق مغلطہ ہو گئی اور بغیر حلالہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا اور اگر ہنوز قربت نہ کی تھی اور متفرق لفظوں میں تین طلاقیں دیں مثلاً تجھ پر طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے، تو طلاق بائن ہوئی مغلطہ نہ ہوئی بے

حلالہ اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے فتاویٰ رضویہ ص ۱۱۳ جلد ۵ حصہ اول مسئلہ نمبر ۱۱۳۔

اس عبارت کا واضح مفاد ہے کہ اگر غیر مدخولہ کو یک دم تین طلاقیں دی جائیں تو احناف کے نزدیک تینوں ہی واقع ہو جائیں گی، خود حضرت مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو جس سے صرف نکاح ہوا ہو اور خلوت نہ ہوئی ایک دم تین طلاقیں اس طرح دے کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے اس صورت میں صرف ایک طلاق واقع ہوگی اور آخری دو واقع نہ ہوں گی کیونکہ پہلی طلاق بولتے ہی وہ عورت نکاح سے خارج ہوگئی اور اس پر عدت بھی واجب نہ ہوئی۔۔۔۔۔۔ ہاں اگر اس طرح عورت سے کہے کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو تینوں پڑ جائیں گی کیونکہ اس صورت میں تینوں طلاقیں نکاح کی موجودگی میں پڑیں۔ ص ۴۵۴ ج ۱۔

اس عبارت میں مفتی صاحب نے صاف اقرار کیا ہے کہ یکدم ایک ہی لفظ سے تینوں طلاقیں دے گا تو تینوں ہی واقع ہو جائیں گی یہی وجہ ہے کہ اکابر احناف نے صاف اقرار کیا ہے مذکورہ توجیح ہمارے خلاف ہے چنانچہ علامہ ماردینی فرماتے ہیں۔

ولیس ذلک مذهب الشافعی بل مذهب انہا تبیین بالا ولی ولا حکم لما بعدھا وهو مذهب ابی حنیفہ واصحابہ والثوری واحمد واسحق ذکرہ الخطابی و رواۃ ایوب ضعیفۃ فکیف یستدل بها البیہقی علی صحۃ هذا التاویل الذی خالفہ هو وامامہ واكثر الفقہاء

(اور جو امام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ غیر مدخولہ کے متعلق ہے) اور یہ مذہب امام شافعی کا نہیں بلکہ ان کا موقف ہے کہ پہلی طلاق سے عورت بائن ہو جائے گی اور بعد کی طلاق کا کوئی فائدہ نہیں اور یہی مذہب امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں اور امام ثوریؒ احمد بن حنبل اور اسحاق کا ہے جیسا کہ علامہ خطابی نے بیان کیا ہے اور ایوب کی (ابوداؤد والی) روایت ضعیف ہے تو پھر امام بیہقی کی تاویل کی صحت کو کیسے تسلیم کر لیا جائے خاص کر جب اس تاویل کی ان کے امام اور اکثر فقہاء نے مخالفت کی ہے۔ الجوہر النقی ۳۳۹ ج ۷۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ فقہ حنفی میں غیر مدخولہ کے متعلق دو موقف پائے جاتے ہیں پہلا موقف جس میں مرد تین بار علیحدہ علیحدہ طلاق کا لفظ بولتا ہے، دوسرا موقف جس میں مرد تینوں

طلاق یکدم بولتا ہے، پہلی صورت میں طلاق صرف ایک ہی واقع ہوگی جب کہ دوسری صورت میں تینوں ہی واقع ہو جائیں گی، سوال یہ ہے کہ مفتی صاحب نے کس دلیل سے پہلا موقف مراد لیا ہے اور دوسرے کو ترک کر دیا ہے جب کہ حدیث میں اس تقسیم کے متعلق کوئی لفظ تو کجا اشارہ تک موجود نہیں، امر واقعہ یہ ہے کہ ابو داؤد کی روایت مفتی صاحب کے تقلیدی مذہب کے خلاف حجت تامہ ہے جیسا کہ علامہ مار دینی نے صراحت کی ہے۔

ثالثاً۔ جب آپ نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث منسوخ نہیں، (جب کہ اس سے پہلے آپ نے نسخ کا دعویٰ بھی کر رکھا ہے) بلکہ یہ صرف غیر مدخولہ کے متعلق ہے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث جو کہ عام ہے آپ نے کس دلیل سے خاص کیا ہے کہ یہ صرف غیر مدخولہ کے متعلق ہے؟ اگر آپ کہہ دیں کہ ابو داؤد کی حدیث ایوب سے ہم نے یہ تخصیص کی ہے جو اباً عرض ہے کہ اول تو محض طلاق کی حد تک مدخولہ اور غیر مدخولہ کا کوئی فرق نہیں، جب آپ نے اس حدیث کو ایک کے متعلق تسلیم کر لیا ہے تو مدخولہ کا حکم خود بخود ثابت ہو گیا دوم ابو داؤد کی حدیث ضعیف ہے جیسا کہ علامہ مار دینی نے صراحت کی ہے اور ضعیف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں مجھول راوی ہیں چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں۔

واما هذا الرواية التي لا بی داود فضيفة رواها ايوب السخيتاني عن قوم مجهولين عن طاؤس عن ابن عباس فلا يحتج بها، ۴۷۸ ج ۱۔
اور یہ روایت جو کہ ابو داؤد نے روایت کی ہے ضعیف ہے کیونکہ اسے ایوب نے ایک مجھول قوم کے طریق سے بیان کیا ہے لہذا اس سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

زمانہ نبوی اور زمانہ صدیقی میں لوگ تین طلاقیں اس طرح دیتے تھے کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے، گویا پچھلی دو طلاقوں سے پہلی طلاق کی تائید کرتے تھے اور زمانہ فاروقی میں لوگوں کا یہ حال بدل گیا کہ وہ تین طلاقیں ہی دینے لگے لہذا صورت مسئلہ بدلنے سے حکم بدل گیا، جاء الباطل ص ۴۶۲ ج ۱۔

الجواب

اولا۔ حضرت مفتی اعظم اور حکم الامت کی یہ تحقیق ہے کہ اگر حدیث میں تعارض ہو تو احادیث نا قابل عمل ہو جاتی ہیں (دیکھئے جاء الباطل ص ۲۰۳ ج ۱۔ اور یہاں حضرت صاحب کے بدایونی اعتراضات میں تعارض ہے پہلے میں کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا، دوسرے اعتراض میں نسخ سے انکار کر دیا ہے اور صاف کہہ دیا ہے کہ یہ حکم غیر مدخولہ عورت کی طلاق کی ایک خاص شق کے متعلق ہے اب اس سے بھی مکر گئے ہیں اور پہلی اور جہانوی تحقیق کے برعکس یہ کہہ دیا کہ نہ تو یہ حکم منسوخ ہوا ہے نہ ہی غیر مدخولہ کے متعلق ہے بلکہ یہاں مقصود ہی ایک طلاق دینا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سوال یہ ہے کہ جب آپ کے اعتراض میں تعارض ہو تو وہ خود بخود مردود و باطل کیوں نہیں ہو جاتے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کے اعتراض سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے طلاق میں شرعاً نیت کو بھی دخل ہے جب ہی تو انہوں نے تین دفعہ بولے ہوئے لفظ طلاق کو محض طلاق دینے والے کی نیت پر اعتبار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی مراد پہلی طلاق کی تائید کرنا تھا، حالانکہ ایسا لکھنا مفتی صاحب کے رضوی مذہب کے خلاف تھا، چنانچہ مولوی رضا خاں سے سوال کیا جاتا ہے کہ زید نے اپنی بیوی کے دروازے پر جا کر باواز بلند اپنی زوجہ کو طلاق دی اب شوہر کا کہنا ہے کہ میں نے یہ لفظ محض خوف دلانے کیلئے غصہ کی حالت میں کہا تھا۔

اور گھر میں زوجہ کے بھائی اور والدہ اور ثانی اور دروازے پر ایک ملازم کا بیان ہے کہ ہم نے طلاق دی، دی، دی، کا لفظ تین دفعہ سنا اور دروازہ کے باہر دو شخصوں نے بھی اس آواز کو سنا وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دی کا لفظ ایک دفعہ سنا اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ صورت مذکورہ بالا میں تین طلاق ہو سکتی ہیں ایک طلاق رجعی

الجواب

عورت کے دونوں بھائی اور ملازم ان تینوں شخصوں میں اگر دو ثقہ عادل قابل قبول ہیں تو تین طلاقیں ہو گئیں۔

فتاویٰ رضویہ ص ۶۱ ج ۵ حصہ پنجم مسئلہ نمبر ۷۷

مجدد بریلویت کے اس فتویٰ سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ طلاق میں نیت کو کچھ دخل نہیں ہے، ورنہ فتویٰ تو اس طرح لکھنا چاہے تھا کہ چونکہ مرد کا کہنا ہے کہ میں نے طلاق کی نیت ہی نہیں کی محض خوف دلایا ہے لہذا طلاق واقع ہی نہیں ہوئی، اس بات کو بھی جانے دیجیے مرد کا کہنا کہ میں نے ایک بار طلاق دی ہے اور اس کے دو آدمی باہر کے گواہ بھی موجود ہیں تب بھی مجدد صاحب نے طلاق دی دی دی سے تین طلاقیں کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ بقول مفتی صاحب مرد کی بات پہ اعتماد کیا جاتا ہے اور فتویٰ یہ دیا جاتا کہ بالفرض اگر مرد نے تین بار یہی جملہ کہا ہو تب بھی ایک ہی واقع ہوگی کیونکہ اس کی نیت تو ایک ہی کی تھی مگر دیکھا آپ نے کہ مولوی احمد رضا خاں فاضل بریلی نے تین طلاقیں کا ہی فتویٰ دیا ہے، اس طرح غصہ کی حالت میں دی گئی طلاق کو بھی کالعدم اور نامقبول کیا جانا چاہیئے کیونکہ غصہ کی حالت میں مرد نیت و ارادہ سے طلاق نہیں دیتا مگر سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ حالت غصہ میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے، یہ خیال کہ غصہ میں مطلقاً طلاق نہیں ہوتی محض جاہلانہ خیال ہے طلاق اکثر غصہ میں ہوتی ہے رضا مندی میں کون چھوڑتا ہے، ایضاً ص ۷۲ مسئلہ ۱۰۰، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر علمائے احناف کے نزدیک تو جبرائی گئی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے جس کی تائید تو مولوی احمد رضا خاں نے بھی کر رکھی ہے، ایضاً ص ۶۱ مسئلہ نمبر ۶۸ الغرض اگر طلاق میں نیت کو دخل ہوتا تو غصہ میں دی گئی اور جبرائی گئی طلاق واقع نہ ہوتی بلکہ محض خوف دلانے کی نیت میں بولے گئے الفاظ طلاق کا وقوع نہ ہوتا مگر آپ نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے مجدد صاحب نے اس کے برعکس فتویٰ دیا ہے۔

ثالثاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ طلاق میں نیت کو دخل ہے اور تین بار جدا جدا لفظ طلاق کہہ کر بھی دینے والے کی نیت اگر ایک ہی طلاق دینے کی تھی تو بقول مفتی صاحب وہ ایک ہی طلاق واقع ہوگی مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب لوگوں نے تینوں سے مراد تین طلاقیں دینا ہی مراد لیا تو طلاق دینے والے کی منشاء کے ماتحت شریعت بھی بدل گئی ہے، یہ ایک ایسی بات ہے جس میں حضرت مفتی صاحب نے ہماری تائید کی ہے کیونکہ کوئی بھی خفی بریلوی یا دیوبندی اس کا قائل نہیں بلکہ تمام کے نزدیک طلاقیں تین ہی واقع ہوں گی۔

ایک دم دی گئیں تین طلاقوں میں ہم نوے فی صد ایسی امثلہ پیش کر سکتے ہیں جس میں ان کی مراد صرف ایک طلاق دینا ہوتی ہے تین طلاقوں کا تصور تو ان کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتا اور جب وہ اپنے علماء کرام سے رابطہ قائم کرتے ہیں تو تب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہی آن میں اپنے اوپر حرام کر لیا ہے تب اسے علماء بریلی حلالے جیسی لعنت کا مشورہ دیتے ہیں آخر علماء بریلویہ حلالے جیسی لعنت کا فتویٰ دینے سے پہلے اس سے قسماً و حلفاً یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ تو نے جب اپنی بیوی کو یہ کہا تھا، میں نے تجھے طلاق دی، دی، دی، تو ان الفاظ سے تیری کیا مراد تھی تین یا ایک طلاق دینے کا یا تجھے طلاق کے سلسلہ میں حکم شریعت کا کوئی علم ہی نہیں تھا، راقم الحروف باواز بلند یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر علمائے بریلویہ اس طرح سوالات کریں تو نوے فیصد کیسوں کی طلاق محض ایک رجعی طلاق قرار پائے اور کئی لوگ حلالے جیسی بے غیرتی سے چھوٹ جائیں ان کی اجڑی ہوئی دنیا دوبارہ آباد ہو جائے ان کا جیون ساتھی انہیں مل جائے بچہ مامتا کی گود سے محروم نہ ہوں، اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ پہلے جیسے لوگ صادق نہیں رہے اور ہر طلاق دینے والا اپنا گھر آباد کرنے کی غرض سے جھوٹ موٹ یہی کہے گا کہ میری مراد صرف ایک ہی طلاق دینا تھی تو جواباً عرض ہے کہ جب عہد رسالت میں طلاق دینے والے کی نیت کا اعتبار ہوتا تھا تو کیا وجہ ہے کہ آج اس کا اعتبار کلی طور پر ختم ہو جائے؟ کیا اس زمانے کا ہر فرد بشر کذاب و دجال ہے اور اہل تقویٰ اور اہل خشیت الہی روئے زمین سے یکسر ناپیدا اور فنا ہو گئے ہیں؟

رابعاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ یہاں آخری دو طلاقوں سے پہلی طلاق کی تائید کرنا ہے اور لوگوں کی بات پہ اعتماد کر کے انہیں ایک رجعی طلاق قرار دیا جاتا تھا، متن حدیث کے خلاف ہے کیونکہ اس حدیث میں یہ الفاظ صاف موجود ہیں۔

من تعجل اناة الله في الطلاق الزمناه اياه

شرح معانی الآثار ص ۳۶ ج ۲

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جو کوئی معاملہ طلاق کے اندر اللہ تعالیٰ کی عنایت فرمودہ مہلت سے روگردانی کرتے ہوئے غلٹ سے ساری طلاقیں بیک وقت دے دیگا تو ہم اس کی ان طلاقوں کو اس پر لازم کر دیں گے۔

اس بات کا ثبوت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عجلت کی متعدد طلاقوں کو متعدد اور مغالطہ نہیں سمجھتے تھے، ورنہ الزمنا یاہ، ہم ان کو ان پر چسپاں کر دیں گے، کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو اس وقت کہا جاسکتا ہے جب کہ دینے والے نے تین کی نیت سے طلاقیں دی ہوں اور اس سے پہلے ان کو لازم نہ سمجھا جاتا رہا ہو، خود حضرت مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ جو کوئی بغیر نیت کے بھی ایک دم تین طلاقیں دیتا تو ایک مانی جاتی تھی، کہ اس وقت غالب حال یہی تھا، بلفظ

جاء الباطل ص ۴۶۳ ج ۱

تنبیہ

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے تیسرا اعتراض ذکر کیا ہے جس کی ضروری تفصیل تنبیہ کے زیر عنوان گزر چکی ہے اور مزید آگے آ رہی ہے تیسرے کے بعد مفتی صاحب نے اہل حدیث کی طرف سے جو تھا اعتراض یہ ذکر کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں تین طلاقیں دی تھیں۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے رجوع کرادیا اگر یکدم دی گئی تین طلاقیں تین ہی ہوتیں تو رجوع ناممکن تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے لکھا ہے، تین طلاقوں کی روایت ضعیف ہے اور صحیح حدیث کے مخالف بھی، جس میں صرف ایک طلاق کا ذکر ہے جاء الباطل ص ۴۶۵ ج ۱۔ ہمیں اعتراف ہے کہ قصہ ابن عمر رضی اللہ عنہ میں مروی صحیح حدیث میں صرف ایک ہی طلاق کا ذکر ہے، اور جن میں طلاقوں کا ذکر ہے وہ روایات ضعیف ہیں مگر ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مفتی صاحب نے غلط بیانی سے کام لیکر عوام کو اہل حدیث کے اصلی دلائل کے بجائے ادھر ادھر سے روایات اکٹھی کر کے قارئین کو یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ اہل حدیث کے پاس کوئی وزنی دلیل موجود نہیں، حالانکہ ان کی بجائے اہل حدیث کی طرف سے حسب ذیل صحیح احادیث پیش کی جاتیں رہی ہیں۔

دوسری حدیث

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

اخبر رسول الله ﷺ عن رجل طلق امراته ثلاث تطليقات جميعا فقال غضباناً ثم قال ايلعب بكتاب الله وانا بين اظهر كم حتى قام رجل و قال يا رسول الله ﷺ الا اقتل السنن للنسائي ص ۸۹ ج ۲ .

خبر دی گئی رسول اللہ ﷺ کو کسی شخص کی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی ہیں یہ سن کر نبی ﷺ کھڑے ہو گئے اور غصے میں فرمانے لگے، کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیل ہو رہا ہے؟ جب کہ میں ان میں موجود ہوں یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے اللہ کے نبی ﷺ میں اس کو قتل کر ڈالوں (نسائی رقم الحدیث ۳۳۳۰) اس حدیث کے متعلق علامہ ترکمانی حنفی جیسے معتبر مقلد فرماتے ہیں۔

وقد وورد في هذا الباب حديث صحيح صريح فاخرج النسائي في باب الثلاثة المجموعه ومافيه من التفليظ بسند صحيح عن محمود بن لبيد ، الجوهر النقي ص ۳۳۳ ج ۷ .

یعنی بیک وقت طلاق ثلاثہ کی ممانعت میں حضرت محمود بن لبيد رضی اللہ عنہ کی صحیح و صریح حدیث بسند صحیح سنن نسائی شریف میں پائی جاتی ہے۔

تیسری حدیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

طلق ركانة بن عبد يزيد ، اخو نبی مطلب امراته ثلاث في مجلس واحد ، فحزن عليها زنا شديداً ، قال ، فساله رسول الله ﷺ كيف طلقته ؟ قال طلقته ثلاثا ، قال فقال في مجلس واحد قال نعم ، قال فانما تلك واحدة فارجمها ان شئت ، قال فرجمها فكان ابن عباس يرى انما الطلاق عند كل طهر ،

مسند امام احمد ص ۲۶۵ ج ۱ بھیقی ص ۳۳۹ ج ۷ ، وابو یعلیٰ ص ۶۵ ج ۳ .
یعنی ركانہ بن عبد یزید ، جو کہ مطلب کے بھائی تھے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں پھر بہت زیادہ افسوس ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کس طرح تو نے طلاق دی ہے تو ركانہ نے عرض کی

کہ میں نے تین طلاقیں دی ہیں، تو آپ علیہ السلام نے پوچھا کیا ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں؟ تو رکانہ نے کہا، ہاں،

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ تو ایک ہی طلاق ہوئی اگر تو رجوع کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے پس رکانہ نے رجعت کر لی، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ تحقیق تھی کہ طلاق الگ ہر ایک طہر میں ہونی چاہیے۔

ایک مجلس کی طلاق ثلاثہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ

مذکورہ حدیث کے آخر میں عکرمہ کے بیان کردہ قول کا واضح مطلب یہ ہے کہ حضرت بن عباس رضی اللہ عنہ حدیث رکانہ کے موافق ایک وقت کی تین طلاقوں کو صرف ایک رجعی طلاق قرار دیتے تھے بلکہ اس سے بھی واضح ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ سنن ابی داود وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ۔

روی حماد بن زید عن ایوب عن عکرمہ عن ابن عباس اذا قال انت طالق ثلاثا بضم واحد فهو واحدہ سنن ابی داود ص ۲۹۹ ج ۱
یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت زبان و بیک کلمہ تین طلاقیں دے ڈالے تو وہ تین ایک ہی طلاق ہوگی۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند بخاری کی شرط پر ہے

عون المعبود ص ۲۲۷ ج ۲۔

امام عکرمہ کی طرح امام طاؤس بن کیسان یمانی اور زہری نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ نقل کیا ہے کہ ایک وقت کی طلاق ثلاثہ ایک رجعی طلاق ہوگی چنانچہ امام عبدالرزاق نے اپنی کتاب المصنف میں کہا ہے کہ۔

عن ابن جریج قال اخبرنی حسن بن مسلم عن ابن شہاب ان ابن عباس رضی اللہ عنہ قال اذا طلق الرجل امراته ثلاثہ ولم یجمع، کن ثلاثہ، قال، فاخبرت ذلک طاؤساً قال فاشہد ما کان ابن عباس یداهن الا واحدة، مصنف عبدالرزاق

ص ۳۳۵ ج ۶ (رقم الحدیث ۱۱۰۷۷)

یعنی امام ابن شہاب الذہری نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص متفرق طہروں میں تینوں طلاقیں دینے کی بجائے صرف ایک وقت میں تینوں طلاقیں دے ڈالے وہ تین واقع ہوں گی امام زہری نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس فتویٰ کی خبر میں نے ان کے خاص شاگرد طاؤس کو دی تو انہوں نے گواہی دی کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک وقت کی طلاق ثلاثہ کو صرف ایک رجعی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس روایت کی سند کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد خاص امام طاؤس کہتے تھے کہ ایک وقت کی طلاق ثلاثہ کو ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک رجعی طلاق قرار دیتے تھے یہی فتویٰ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے امام عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے (جن کے حق میں امام ابو حنیفہ نے کہہ رکھا ہے کہ مارآیت افضل من عطاء میں نے عطاء سے بڑھ کر کسی کو افضل نہیں دیکھا، میزان ص ۳۸۰ ج ۱ او کتاب القراءۃ ص ۱۳۴، فتاویٰ رضویہ ص ۲۲ ج ۲۔ کہ

عن ابن جریج عن عطاء قال ان طلقت امرأة ثلاثا ولم تجمع فانما هي واحدة بلغني ذلك عن ابن عباس.

یعنی امام عطاء ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تم متفرق طہروں کی بجائے صرف ایک وقت میں اپنی بیوی کو طلاق ثلاثہ دے دو تو وہ صرف ایک رجعی طلاق واقع ہوگی مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ یہی فتویٰ دیتے تھے، مصنف عبد الرزاق ص ۳۳۵ ج ۶ رقم الحدیث ۱۱۰۷۶

ہمیں اس چیز کا اعتراف ہے کہ بعض روایات میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ تینوں طلاقیں واقع ہو جانے کا بھی منقول ہے۔

چنانچہ امام عبد الرزاق فرماتے ہیں کہ۔

عن عمر حو بن شب اخبرني عمرو بن دينار ان طاؤساً اخبره قال دخلت على ابن عباس رضي الله عنه ومعه مولاہ ابو الصهباء عن الرجل يطلق امراته ثلاثا جميعها فقال ابن عباس رضي الله عنه كانوا يجعلونها واحدة على عهد رسول

اللہ ﷺ ابی بکر و رایۃ عمر الا اقلها حتی خطب عمر الناس فقال قد اکثر تمفی
هذا الطلاق فمن شئیا فهو علی ماتکلم۔

یعنی عمرو بن شب نے کہا کہ مجھے عمرو بن دینار نے خبر دی اور عمرو کو طاؤس نے خبر دی کہ میں
ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اس وقت ان کے مولیٰ ابو صہباء ان کے ساتھ تھے ابو صہباء نے
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پوچھا کہ ایک شخص اگر تینوں طلاقوں کو بیک وقت دے ڈالے تو کیا
حکم ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ
میں او ر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دور خلافت کے تھوڑے سے زمانہ تک ایک وقت کی تینوں
طلاقوں کو صرف ایک قرار دیا جاتا تھا مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت کے تھوڑے
عرصہ بعد خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگوں نے طلاق کے معاملہ میں بڑی زیادتی کر رکھی ہے
لہذا اب جو شخص جس طرح کی طلاق دے گا وہ اسی طرح نافذ ہوگی مصنف عبدالرزاق ص ۳۹۳ ج
۶۔ (رقم الحدیث ۱۱۳۳۸)

اس روایت کا مفاد یہ ہے کہ حضرت امین عباسؓ بیک وقت دی گئی طلاق ثلاثہ کے متعلق
دو باتیں بتلائیں ہیں۔ ایک یہ کہ نبی ﷺ کی زندگی مبارکہ میں اور پوری مدت خلافت حضرت ابو بکر
صدیق رضی اللہ عنہ میں اور ابتدائے عہد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں ایسی طلاقوں کو صرف
ایک قرار دیا جاتا تھا دوسری بات یہ کہ لوگوں کی بے راہ روی کی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ
عنہ انہیں تین قرار دینے لگے۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ ان دونوں باتوں
میں سے جو زیادہ قابل قبول ہو اس پر عمل کی بنیاد بناؤ یہی وجہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے
دونوں طرح کے فتاویٰ ملتے ہیں جب آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تعزیری حکم کو زیادہ
قرین مصلحت سمجھتے تھے تو اس کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے یہی ہمارا متوقف ہے کہ جو لوگ اہل
حدیث حضرات کے خلاف بڑے سرگرم رہا کرتے ہیں اور ذاتی ضرورت پڑنے پر اس قسم کے مسائل
میں علماء اہل حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور مطلب نکل جانے پر پھر اہل حدیث کے خلاف
خرافات میں سرگرم ہو جاتے ہیں انہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تعزیری حکم کے مطابق
فتویٰ دینا چاہیے۔

تابعین کرامؒ کے فتاویٰ

فتویٰ امام عکرمہؒ

آپ خلافت راشدہ میں ۷۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تلمذ کا شرف حاصل تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ارشد تلامذہ سے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں ہی ان کو مسند درس و افتاء پر بٹھا دیا تھا۔
امام عکرمہ فرماتے ہیں کہ

قال لی ابن عباس رضی اللہ عنہ انطلق فافت بالناس وانا لک عون قال فقلت
لہ لو ان هذا الناس مثلهم مرتین لا فتیتهم قال فانطلق فافتهم۔

یعنی مجھ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جا کر لوگوں کو فتویٰ دیا کرو اور میں تمہاری پشت پناہی کرتا رہوں گا، امام عکرمہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا کہ لوگوں کی تعداد اس سے دو گنا بھی ہو تب بھی میں فتویٰ دیا کروں، تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جاؤ اور لوگوں کو فتاویٰ دیا کرو۔ بحوالہ تہذیب التہذیب ص ۲۶۵ ج ۷۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حین حیات میں آپ مفتی بن گئے تھے، کتب رجال میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا سال وفات ۶۸، ۶۹ھ لکھا ہوا ہے جس سے واضح ہے کہ ۶۸ھ ہجری سے قبل آپ بحکم ابن عباس رضی اللہ عنہ فتویٰ نویسی شروع کر چکے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس دور میں فقط وہی مفتی ہو سکتا تھا جو قرآن و سنت اور اجتہاد میں بلند درجہ رکھتا ہوگا۔

امام شہر ابن حوشب کبیر تابعی فرماتے ہیں کہ امت اسلامیہ کا عکرمہ، حمر، (فقہیہ) ہے، امام عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ عکرمہ علم کے دریا و سمندر ہیں، امام سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ عکرمہ مجھ سے بھی زیادہ بڑا عالم ہے، امام عامر شعفی فرماتے ہیں کہ علوم قرآن کا عکرمہ سے زیادہ واقف کوئی اور نہیں، امام قتادہ فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کے سب سے زیادہ واقف عکرمہ ہیں، یہی بات امام ایوب خستینی، ابن جریج، امام سفیان ثوری نے کہی ہے، تہذیب التہذیب ص ۲۶۵ ج ۷۔

یہی امام جلیل فرماتے ہیں کہ بیک وقت اور بیک کلمہ دی ہوئی طلاق ثلاثہ ایک رجعی طلاق ہوگی، ابو داؤد مع عون المعبود ص ۲۲۷ ج ۲۔

امام طاووسؒ کا فتویٰ

امام عکرمہ اس فتویٰ میں منفرد نہیں بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے خصوصی شاگردوں میں امام طاووس بھی یہی مؤقف و مذہب رکھتے تھے کہ طلاق صرف وہی واقع ہوگی جو حکم شرعی کے مطابق ایک طہر میں ایک عدد دی گئی ہو، یعنی ایک طہر میں ایک سے زیادہ دی ہوئی طلاقیں کا عدم ہو کر معنوی طور پر ایک پڑیں گی۔ انماۃ اللفان ص ۷۵، و مصنف عبدالرزاق ص ۳۰۲ ج ۶۔

فتویٰ امام عطاء بن ابی رباحؒ

امام عبدالرزاق بیان کرتے ہیں کہ

عن ابن جریج عن عطاء قال ان طلقت امرأة ثلاثا و لم تجمع، فانما هي واحدة بلغني ذلك عن ابن عباس رضي الله عنه.

یعنی امام عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ اگر عورت کو متفرق طہروں کی بجائے صرف ایک وقت میں اپنی بیوی کو طلاق ثلاثہ دے دیں تو وہ صرف ایک رجعی طلاق واقع ہوگی، مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی یہی فتویٰ دیتے تھے۔ مصنف عبدالرزاق ص ۳۳۵ ج ۶۔ (رقم الحدیث ۱۱۰۷۶)

یہ عطاء وہی ہیں جن کے بارے میں مبتدعین کے مقتدائے اعظم امام ابو حنیفہؒ نے کہہ رکھا ہے کہ

مار أيت افضل من عطاء.

یعنی میں نے عطاء سے بڑھ کر کسی کو افضل نہیں دیکھا۔ تہذیب التہذیب ص ۲۸ ج ۲، و میزان ص ۳۸۰ ج ۱، و کتاب القراءۃ ص ۱۳۲۔

فتویٰ عطاء بن یسارؒ

موطا امام مالک باب طلاق البکر اور متعدد کتب حدیث میں ہے کہ

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتویٰ کے خلاف ان کی موجودگی میں امام عطاء بن یسار نے صراحت سے کہا کہ غیر مدخولہ کو ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاقیں صرف ایک ہی ہوگی، موطا امام مالک ص ۵۲۱۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ امام عطاء بن یسار کبار تابعین عظام میں سے ہیں۔

فتویٰ جابر بن زیدؓ

امام ابن ابی شعیبہ نے صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ امام قتادہ نے کہا کہ طاؤس، جابر بن زید، اور عطاء بن یسار کا یہی مذہب تھا کہ غیر مدخولہ کو دی ہوئی تین طلاقیں ایک ہی ہوں گی۔ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۶ ج ۵۔ امام جابر بن زید کبار تابعین سے ہیں انکے حق میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ

انک من فقہاء البصرة.

آپ فقہاء بصرہ میں سے ہیں۔ تہذیب ص ۳۴ ج ۲۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر لوگ ان کی باتیں سنیں تو موصوف لوگوں کو کتاب اللہ کے علوم سے بھر دیں گے، ایضاً۔

فتویٰ عمرو بن دینارؓ

حافظ ابن حجر اور متعدد اہل علم امام ابن منذر کی تالیف، الاوسط، سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے معروف شاگرد امام عمرو بن دینار مکی تھے متوفی ۱۲۵ھ بھی ایک وقت کی طلاق ثلاثہ کو ایک ہی طلاق کہتے تھے۔

فتح الباری ص ۲۹۷ ج ۹، واثاع اللہ ص ۱۷۶۔

واضح رہے کہ امام عمرو بن دینار صحابہ و تابعین کے زمانہ میں مرکز اسلام مکہ مکرمہ کے مفتی تھے، امام ابن نجیح نے کہا ہے کہ ہمارے یہاں عمرو بن دینار سے زیادہ کوئی اور علم و فقیہ نہیں تھا، تہذیب ص ۲۹ ج ۸۔

فتویٰ خلاص بن عمروؓ

حافظ ابن قیم نے بشر بن ولید عن ابی یوسف کی سند سے نقل کیا ہے کہ اس مسئلہ میں مؤقف اہلحدیث کی موافقت کرنے والے معروف تابعی خلاص بن عمرو ہجری بصری بھی ہیں۔ انشاء اللہ فان ص ۱۷۶۔

دیگر تابعین عظام کے فتاویٰ

امام حسن بصری اور امام محمد بن اسحاق امام المغاری بھی مؤقف اہل حدیث کے قائل و فاعل تھے۔

دعویٰ اجماع حقیقت کے آئینہ میں

مبتدعین عوام الناس کو یہ کہہ کر مغالطہ دیتے ہیں کہ ایک مجلس و وقت میں دی ہوئی تین ملاقاتوں کے تین ہونے پر امت کا اجماع ہو چکا ہے، حالانکہ یہ صریحاً جھوٹ ہے، شارحین حدیث اور مذہب پر لکھنے والے آئمہ کرام نے اس مسئلہ کو اختلافی تسلیم کیا ہے۔

اختصار کی بنا پر یہاں بات پر ہی اکتفا کر رہے ہیں، ہاں اگر ضرورت پیش آئی اور ہم مجبور کر دیئے گئے تو، دین الحق، کی دوسری اشاعت میں آئمہ کی عبارات بھی نقل کر دیں گے، بہر حال اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) امام ابن رشد قرطبی مولود ۵۲۰ھ و متوفی ۵۹۵ھ بدایۃ المجتہد ص ۶۱ تا ۶۳ ج ۲،

(۲) امام تلمسانی ابراہیم بن یحییٰ مالکی متوفی ۶۳۳ھ، ارشاد الساری ص ۱۲۷ ج ۸،

(۳) امام ابو عبد اللہ محمد قرطبی متوفی ۶۷۲ھ، تفسیر قرطبی ص ۱۲۹ ج ۳،

(۴) امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر کبیر ص ۲۴۸ ج ۲،

- (۵) امام ابوالولید ازدی متوفی ۶۰۶ھ، بحوالہ اغاثۃ اللہفان ص ۱۷۸، ۱۷۹،
 (۶) امام ابوالحسن لخمی متوفی ۳۷۸ھ، بحوالہ ایضاً ص ۱۷۶ تا ۱۷۷،
 (۷) امام ابن ابی زید قیروانی متوفی ۳۹۸ھ، بحوالہ ایضاً ص ۱۷۶،
 (۸) امام ابن تیمیہ، فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۸۶ ج ۳۳،
 (۹) امام ابن قیم، اعلام الموقعین ص ۴۴ ج ۳،
 (۱۰) امام ابو حیان اندلسی، تفسیر البحر المحیط ص ۱۹۲ ج ۱،
 (۱۱) حافظ ابن حجر، فتح الباری باب من جوز طلاق الثلاث ص ۲۹۷ ج ۹،
 (۱۲) علامہ عینی حنفی، عمدۃ القاری ص ۲۳۳ ج ۲۰،
 (۱۳) امام نووی، شرح صحیح مسلم باب طلاق الثلاث ص ۷۷ ج ۱،
 (۱۴) امام طحاوی حنفی، المولود ۲۲۹ و المتوفی شرح معانی الآثار ص ۳۵ ج ۲،
 (۱۵) مولانا عبداللہ لکھنوی حنفی، المولود ۲۱۶ و المتوفی ۱۳۰۴ عمدۃ الرعاۃ ص ۶۳ ج ۲۔

ہمارے دور کے علماء عرب و عجم

یہ تو تھے علمائے سلف و خلف کے حوالے، جن میں ہر مکتب فکر کے محققین شامل ہیں، ان چند حوالوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ

عہد صحابہ کرام سے لیکر یہ مسئلہ مختلف فیہ چلا آرہا ہے، اور اس کے متعلق اجماع کا دعویٰ کرنا غلط ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لیکر تابعین عظام میں بیک وقت دی گئی تین طلاقیں کو ایک شمار کرنے والے موجود تھے، اور ان کے بعد آئمہ و مجتہدین میں ایک گروہ اس کا قائل چلا آرہا ہے، بالخصوص ہر دور میں حق کے چراغ کو روشن کرنے والے اہل حدیث حضرات (جنہیں بعض نے ظاہرین کے لقب سے ملقب کیا ہے) اسی کے قائل رہے ہیں۔

یہ بات مزید دلچسپی کا باعث ہے کہ موجودہ دور کے حنفی علماء نے بھی اس مسئلے کو نہ صرف اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا ہے بلکہ اہل حدیث نقطہ نظر کی بھرپور تائید کی ہے، چنانچہ مصر کے نامور عالم علامہ عبدالرحمن الجزیری نے اپنی معروف کتاب، الفقہ علی مذاہب الاربعہ ص ۳۴۱ تا ۳۴۲ ج ۴، میں

اختلاف ذکر کرتے ہوئے بر ملا لکھا ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں ہے۔

علامہ سید رشید رضا مصری مرحوم نے اپنی، تفسیر المنار ص ۳۸۳ و ۳۸۷ (طبع ثانی ۱۳۵۰ھ) میں اور شیخ جمال الدین قاسمی مرحوم نے اپنی تالیف، الاستیناس تصحیح النسخۃ الناس، میں اہل حدیث مؤقف کی تائید و حمایت کی ہے۔

علمائے پاک و ہند

برصغیر پاک و ہند کے جن علماء نے اس موضوع پر اپنے نتائج مطالعہ و تحقیق پیش کئے ہیں ان میں علماء اہل حدیث کے علاوہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مدیر ماہنامہ برہان، دہلی، مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، مولانا حامد علی صاحب سیکرٹری جماعت ہند، مولانا عروج احمد قادری، مدیر ماہنامہ زندگی، رامپور، مولانا شمس پور زادہ، مولانا محفوظ الرحمن فاضل دیوبند ہیں۔

چنانچہ ہندوستان کے بعض درد مند حضرات نے زیر بحث مسئلہ کے موضوع ایک سیمینار (۶ تا ۴ نومبر ۱۹۷۳ء) احمد آباد میں منعقد کروایا، جس میں مذکورہ حضرات اور اہل حدیث علماء مولانا عبدالرحمن صاحب اور مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے شرکت کی، مجلس مذاکرہ میں حصہ لینے والے حضرات کی خدمت میں حسب ذیل سوالنامہ روانہ کیا گیا تھا تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے مقالات مرتب کر سکیں اور اپنے نقطہ نظر کو مدلل طور پر پیش کرنے کے ساتھ ان سوالات کے جوابات بھی دے سکیں۔

(۱) کیا محض طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرانے سے یعنی بیک وقت طلاق، طلاق، طلاق، کہہ دینے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں جبکہ طلاق دینے والا کہتا ہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی۔

(۲) کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دیتا ہے، لفظ، تین کی صراحت کے ساتھ لیکن وہ کہتا ہے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تین کا لفظ جب تک استعمال نہ کیا جائے طلاق واقع ہی نہیں، اس صورت میں تین طلاقیں واقع ہوں گی یا ایک؟

(۳) کیا ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مغلط ہونے پر امت کا اجماع ہے؟ اگر

نہیں تو ان علماء اور فقہاء کے نام تحریر فرمائیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیتے ہیں۔

(۴) آپ کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مسئلے کا کیا حل ہے؟ اسے ایک شمار کیا جانا چاہیے یا تین؟

مذکورہ مذاکرہ میں شرکت کرنے والے آٹھ حضرات میں سے سات علماء کرام نے مقالے مرتب کئے، مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب نے مقالہ تو نہیں پڑھا تھا، البتہ معمولاتی کلمات میں مجلس میں پڑھے گئے مقالات پر جامع تبصرہ فرمایا اور زیر بحث مسئلہ کو امت مرحومہ میں مختلف فیہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے مناسب حل پر زور دیا، اور علماء کرام کو توسیع پیدا کرنے کی تلقین کی، ان میں صرف مولانا عروج احمد قادری صاحب نے اپنے مقالے میں حنفی نقطہ نظر پیش کیا تاہم انہوں نے بھی مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر ایک معتدل راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، باقی حضرات نے اس مسئلے میں ایک تو اجماع کے دعوے کی نفی کی ہے اور صاف اعتراف کیا ہے کہ یہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی اختلافی چلا آرہا ہے، اور دوسرے انہوں نے مسئلے کا وہی حل پیش کیا ہے، جس کے اہل حدیث قائل ہیں کہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کیا جائے، مزید برآں اس نقطہ نظر کی حمایت میں انہوں نے قرآن و سنت اور کتب فقہ سے ایسے ٹھوس دلائل پیش کئے ہیں جس کے بعد فقہی جمود پر اصرار کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں رہتی، جزاہم اللہ احسن الجزاء۔

سیمینار کی پوری کاروائی مقالات اور ان پر اعتراضات کے جوابات یہ سب ایک کتابی شکل میں، ایک مجلس کی تین طلاقیں قرآن و سنت کی روشنی میں، کے عنوان سے چھپ گئے ہیں۔

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کا فتویٰ

اس کتاب کے ایک مقالے میں (جو مولانا محفوظ الحق قاسمی کا ہے) مولانا کفایت اللہ دہلوی کا ایک فتویٰ بھی درج ہے، کسی سائل نے اسی طلاق ثلاثہ کے متعلق دریافت کیا تھا، سائل کے گاؤں میں ایک واقعہ ایسا ہوا تھا کہ ایک حنفی شخص نے تین طلاق دینے کے بعد کسی اہل حدیث عالم سے فتویٰ پوچھ کر رجوع کر لیا، اب گاؤں کے لوگوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا، مفتی صاحب مرحوم نے

حسب ذیل جواب دیا،

ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں پڑ جانے کا مذہب جمہور علماء کا ہے اور آئمہ اربعہ اس پر متفق ہیں، جمہور علماء اور آئمہ اربعہ کے علاوہ بعض علماء اس کے قائل ضرور ہیں کہ ایک رجعی طلاق ہوتی ہے اور یہ مذہب اہلحدیث حضرات نے بھی اختیار کیا ہے، اور حضرت ابن عباس اور طاؤس و عکرمہ، اور ابن اسحاق، سے منقول ہے، پس کسی اہل حدیث کو اس حکم کی وجہ سے کافر کہنا درست نہیں اور نہ وہ قابل مقاطعہ اور نہ مستحق خراج عن مسجد ہے، ہاں حنفی کا اہل حدیث سے فتویٰ حاصل کرنا اور

اس پر عمل کرنا باعتبار فتویٰ ناجائز تھا، لیکن اگر وہ بھی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اس کا مرتکب ہوا ہو تو قابل درگزر ہے۔ اخبار الجمعیۃ دہلی مورخہ ۶ شعبان ۱۳۵۰ مطابق ۱۶ دسمبر ۱۹۳۱ء محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ مدرسہ امینیہ دہلی۔

کفایت المفتی ص ۳۶۱ ج ۶، طبع مکتبہ حقانیہ ملتان۔

ایک اور فتویٰ

اس مدرسہ امینیہ دہلی کا ایک اور فتویٰ حسب ذیل ہے

اور بعض سلف صالحین اور علمائے متقدمین میں سے اس کے بھی قائل ہیں اگرچہ آئمہ اربعہ میں یہ بعض نہیں ہیں لہذا جن مولوی صاحب نے مفتی اہل حدیث پر جو فتویٰ دیا ہے یہ غلط ہے اور مفتی اہل حدیث پر اس اختلاف کی بنا پر کفر و مقاطعہ و اخراج از مسجد کا فتویٰ غیر صحیح ہے، بوجہ شدید ضرورت اور خوف مفاسد اگر طلاق دینے والا ان بعض علماء کے قول پر عمل کرے گا جن کے نزدیک اس واقعہ مرقومہ میں ایک ہی طلاق ہوتی ہے تو وہ خارج از مذہب حنفی نہ ہوگا کیونکہ فقہائے حنفیہ نے بوجہ شدت ضرورت کے دوسرے امام کے قول پر عمل کر لینے کو جائز لکھا ہے،

دستخط، حبیب المرسلین عفی عنہ، مہر دار الافتاء مدرسہ امینیہ دہلی،

ایک مجلس کی تین طلاق ۳۰، تا ۳۱ و فتاویٰ ثنائیہ ص ۲۵۸ ج ۲،

پیر کرم شاہ صاحب بریلوی کا فتویٰ

اس مسئلہ پر پاکستان کے ایک معروف سجادہ نشین بریلوی عالم جسٹس پیر کرم شاہ ازہری نے ایک کتابچہ، دعوت فکر و نظر، کے عنوان سے شائع کیا تھا، جس سے ان کا مقصود علمائے احناف کو اس معاملے میں تقلیدی جمود سے ہٹ کر خالص قرآن و سنت کی روشنی میں غور و فکر کی دعوت دینا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقیں کو ایک شمار کرنا، قرآن و حدیث کے مطابق ہے، اپنے اس کتابچہ میں انہوں نے اس مسلک کی پرزور حمایت کی ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

چنانچہ موصوف دونوں کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہوئے کتاب کے بالکل آخر میں فرماتے ہیں کہ مسئلے کے سارے پہلو آپ کے سامنے ہیں۔ اس کی عقلی اور نقلی دلیلیں اور ان پر ہر طرح کی رد و قدح بھی آپ نے ملاحظہ فرمائی، اب آپ خود اس کے متعلق فیصلہ فرما سکتے ہیں، اس ناچیز کی ناقص رائے میں تو ان حالات میں علماء مصر اور علمائے ازہر کے فتویٰ (یعنی بیک وقت تین طلاقیں کا ایک رجعی طلاق ماننا) کے مطابق عمل کرنا ارجح ہے۔

دعوت فکر و نظر مندرجہ ایک مجلس کی تین طلاق ص ۲۳۸،

طبع مکتبہ نعمانی اردو بازار لاہور ۱۹۷۹ء۔

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ

الطلاق مرتان فامساک بمعرف او تسریح باحسان۔

پھر فرماتا ہے

فان طلقها فلا تحل له، (الایہ)

اس سے معلوم ہوا کہ دو طلاقیں تک رجوع کا حق ہے، تین میں نہیں اور مرتان کے اطلاق سے

معلوم ہوا کہ الگ الگ طلاقیں دینا شرط نہیں جس کے بغیر طلاقیں واقع ہی نہ ہوں خواہ ایک دم دے یا الگ الگ حکم یہ ہی ہوگا، چنانچہ تفسیر صاوی میں اسی آیت کے ماتحت ہے کہ اگر تین طلاقیں دیں تو واقع ہو جائیں گی خواہ ایک دم یا الگ الگ، عورت حلال نہ رہے گی۔ جاء الباطل ص ۴۵۶ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ معلوم نہیں کہ حضرت مفتی صاحب قرآنی آیات کو غلط نقل کرنے میں بے دردی کی حد تک بے لگام کیوں تھے، بمعرف، سے حرف واؤ کو اڑا دیا ہے۔

ثانیاً۔ اس آیت کو یک دم دی گئی تین طلاقوں کے مؤثر ہونے پر، مفتی صاحب کا پیش کرنا جہالت محض ہے کیونکہ یہاں مرتان کے لفظ سے علیحدہ اور متفرق اوقات میں طلاق دینا مراد ہے جیسا کہ اس آیت کا شان نزول اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے، حضرت عروہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

ان رجلا قال لامراته لا اطلقک ابدا قالت و کیف ذلک، قال اطلق حتی اذا دنا اجلک راجعتک فانت رسول اللہ ﷺ فذکرت ذلک له فانزل اللہ عذو جل الطلاق مرتان۔

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ نہ میں تجھے بساؤں گا اور نہ ہی طلاق دوں گا، اس کی بیوی نے پوچھا کیسے؟ تو اس نے کہا کہ طلاق دے دوں گا اور مدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیا کروں گا، یونہی کرتا چلا جاؤں گا، وہ عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور اپنا (دکھ) بیان کرنے لگی تو تب یہ آیت، الطلاق مرتان، کی اللہ عزوجل نے نازل فرمائی، ابن ابی حاتم بحوالہ تفسیر ابن کثیر ص ۱۲۷ ج ۱۔

آیت مذکورہ کا یہی شان نزول مولوی نعیم الدین حنفی بریلوی نے، خزائن العرفان ص ۵۴ میں، پیر کرم شاہ بھیروی حنفی بریلوی نے، ضیاء القرآن ص ۱۵۷ ج ۱ میں اور اسی کے قریب قریب مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی نے، تبیان القرآن ص ۸۵۵ ج ۱ میں بیان فرمایا ہے۔

قرآن کے ان الفاظ کا شان نزول بتا رہا ہے کہ یہاں مرتان سے مراد مختلف اوقات میں دی گئی طلاقیں ہیں مگر ہمارے مفتی صاحب سینہ زوری سے اسے ایک دم دی گئی طلاقوں کے بارے باور

کرار ہے ہیں۔

ثالث۔ مرتان کا لغوی معنی بھی یہی ہے کہ کسی کام کو دو متفرق و مختلف اوقات میں کیا گیا ہو۔
ارشاد ربانی ہے

يا ايها الذين امنوا ليستاذنكم الذين ملكت ايمانكم والذين لم يبلغوا الحلم منكم ثلاث مراتٍ من قبل صلوة الفجر و حين تضعون ثيابكم من الظهيرة و من بعد صلوة العشاء ثلاث عورتٍ لكم ليس عليكم ولا عليهم جناح بعدهن طوفون عليكم بعضكم على بعض كذلك يبين الله لكم الايت والله عليم حكيم. (سورة النور آيت نمبر ۵۸)

ترجمہ۔ مومنو! تمہارے غلام لونڈیاں اور جو بچے تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے، تین اوقات میں تم سے اجازت لیا کریں، نماز صبح سے پہلے، اور گرمی کی دوپہر کو جب تم کپڑے اتار دیتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد، یہ تین اوقات تمہارے پردہ کے ہیں ان کے (آگے) پیچھے (دوسرے وقتوں میں) نہ تم پر کچھ گناہ نہ ان پر کہ کام کاج کیلئے ایک دوسرے کے پاس آتے رہتے ہو، اس طرح اللہ اپنی آیتیں تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور اللہ بڑا علم والا حکمت والا ہے۔ (۲۴-۵۸)

اس آیت فرقان کو بخوبی ملاحظہ کیجئے کہ اس میں، مرات، کا لفظ متفرق مختلف اوقات کیلئے مستعمل ہوا ہے، اسی طرح سورة التوبہ آیت ۱۰۱ و ۱۲۶، بنی اسرائیل آیت نمبر ۴، میں انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

یہی معنی لغت عرب کی امہات الکتب میں لکھا ہے، اسی کو ہی مفسرین کرام نے اختیار کیا ہے، چنانچہ علامہ ابوبکر بھٹو صحنی آیت، الطلاق مرتان، کے تحت فرماتے ہیں کہ

تضمنت الامر بايقاع الاثنتين في مرتين فمن اوقع الاثنتين في مرة فهو مخالف لحكمها.

یعنی آیت، الطلاق مرتان، دو طلاق کو دو مرتبہ واقع کرنے کے امر کو شامل ہے تو جس شخص نے دو طلاقیں کو ایک دم ایک ہی طہر میں دے دیا اس نے حکم قرآنی کی مخالفت کی، احکام القرآن ص ۳۸۰ ج ۱۔

علامہ سندھی حنفی مرحوم فرماتے ہیں کہ

قوله تعالى الطلاق مرتان الى قوله ولا تتخذوا آيت الله هذوا، فان معناه الطلاق الشرعى تطليقة بعد تطليقة على التفريق دون الجمع والارسال مرة واحدة ولم يرد بالمرتين التثنية و مثله قوله تعالى ثم ارجع البصر كرتين اى كرة بعد كرة لا كرتين اثنتين.

یعنی آیت، الطلاق مرتان، کا مطلب یہ ہے کہ شرعی متفرق طور پر ایک طلاق کے بعد دوسری طلاق ہونی چاہیے نہ کہ ایک ہی بار اکٹھا، مرتین، سے مراد تثنیہ نہیں ہے، جیسا کہ آیت ثم ارجع البصر، میں ایک مرتبہ کے بعد دوسری مرتبہ نظر اٹھا کر دیکھنے کا حکم دیا گیا ہے، حاشیہ سندھی علی النساء ص ۸۱ ج ۲۔ طبع انصاری دہلی، والتعلیقات السلفیہ ص ۸۹ ج ۲۔

مولوی اشرف علی صاحب مرحوم دیوبندی کے استاذ شیخ محمد تھانوی فرماتے ہیں کہ

ان قوله تعالى الطلاق مرتان معناه مرة بعد مرة فالتطليق الشرعى على التفريق دون الجمع والارسال.

یعنی آیت، الطلاق مرتان، کا مطلب یہ ہے کہ ایک طلاق کے بعد دوسری طلاق دی جائے اس لئے کہ شرعی طلاق وہ ہے جو متفرق طور پر متفرق طہروں میں دی جائے نہ کہ ایک دم دی گئی، حاشیہ نسائی ص ۲۹ ج ۲۔

علامہ آلوسی حنفی فرماتے ہیں کہ، مرتان کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاقیں بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، الطلاق طلاقان، سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مرتان ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپیہ ایک دفعہ دے دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دو طلاقیں دی جائیں، روح المعانی بحوالہ معارف القرآن ص ۵۰۵ ج ۵۔ طبع دہلی ص ۱۹۹۸۔

الغرض، مرتان، کا لفظ مغایرت چاہتا ہے مگر ہمارے مفتی صاحب سینہ زوری سے اسے ایک دم

دی گئی طلاقوں پر بھی لاگو کرتے ہیں، جو کہ شان نزول کے علاوہ قرآن میں معنوی تخریف بھی ہے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

رب تعالیٰ فرماتا ہے

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا.

یعنی جو کوئی اللہ کی حدیں توڑے کہ ایک دم تین طلاقیں دیدے تو اپنی جان پر ظلم کرتا ہے، جاء

الباطل ص ۳۵۷ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب چونکہ بدعت پسند پارٹی سے تعلق رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دل میں قرآن و حدیث کا احترام نہ تھا، وہ قرآن کے الفاظ میں حک و اضافہ کرتے ہوئے کوئی شرم و حیا محسوس نہ کرتے تھے، یہاں پر حضرت جی نے اپنے ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے اپنی طرف سے متن قرآن میں ان الفاظ کا ترجمہ داخل کیا ہے کہ، ایک دم تین طلاقیں دیدے تو اپنی جان پر ظلم کرتا ہے، یقین جانیے قرآن میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ معنی ہو یہ مفتی صاحب جی کی اپنی ذاتی اختراع ہے پھر اسے بنیاد بنا کر مبتدعین کا حکیم الامت لکھتا ہے کہ

اگر اس سے طلاق ایک واقع ہوتی تو ظالم کیسے ہوتا، جاء الباطل ص ۳۵۷۔

گویا مفتی جی کے نزدیک وہ ظالم اس بنا پر ہے کہ اس نے ایک دم میں تین طلاقیں دے دیں، جو حقیقت میں واقع بھی ہو گئیں۔

الغرض مفتی جی کو اس بے ایمانی پر خفت و شرمندگی کی بجائے اصرار بھی ہے، ہماری طرف سے پوری دنیا کے منکرین سنت کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ اپنے بقلم خود حکیم الامت کے ترجمہ قرآن کی صحت کسی مسلم و معتبر مفسر سے ثابت کریں، ورنہ یاد رکھئے کہ جس کو آپ حکیم الامت کا لقب دیتے ہیں وہ جاہل مطلق اور ممرض الامت ہے، اسے مفتی کہنا لفظ مفتی کی توہین ہے، یہ مفتی کے بجائے متفنی تھا، جو قرآن کا غلط معنی کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتا تھا۔

ثانیاً۔ اب آئیے مفتی صاحب کی پیش کردہ آیت کا معنی و مفہوم معلوم کریں، ارشاد ہوتا ہے کہ

یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن و احصوا العدة واتقوا الله ربکم لاتخرجوهن من بیوتهن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشة مبینه و تلک حدود الله ومن یتعد حدود الله فقد ظلم نفسه لاتدری لعل الله یحدث بعد ذلک امراً. (سورة الطلاق آیت نمبر ۱)

اے پیغمبر ﷺ (مسلمانوں سے کہہ دو کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو اور اللہ تعالیٰ سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرو (نہ تو تم ہی) ان کو (ایام عدت میں) ان کو گھروں سے نکالو اور نہ وہ (خود ہی) نکلیں ہاں اگر وہ صریح بے حیائی کریں (تو نکال دینا چاہیے) اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا، (اے طلاق دینے والے) تجھے کیا معلوم کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کر دے۔ (۱-۶۵)

الفاظ قرآن کو مکرر ملاحظہ کریں اور ان پر تدبر و فکر کریں کہ کن الفاظ کا یہ معنی ہے کہ تین طلاقیں دی گئیں واقع بھی ہو جاتی ہیں، یہاں تو عورتوں کو عدت میں طلاق دینے اور دوران عدت گھر میں رکھنے کا حکم ہے اور عورتوں کو بھی تعلیم دی جا رہی ہے کہ ان مردوں کے گھروں میں ہی قیام کریں اس فرمان کا مقصود یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہیں گے تو ممکن ہے کہ کوئی اصلاح کی صورت نکل آئے ہاں مرد کو ایک صورت میں گھر سے عورت کو نکال باہر کرنے کی اجازت بھی دی گئی کہ جب عورت کسی امر فاحش کا ارتکاب کرے، تو گویا افہام و تفہیم کی جو راہ تھی اسے خود ہی عورت نے خواہش کا مرتکب ہو کر ضائع کر لیا ہے۔

الغرض اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چار حدود بیان فرمائی ہیں،

(۱) عورت کو اگر طلاق دینی ہے تو عدت کو ملحوظ رکھ کر دیں

(۲) دوران عدت عورت کو گھر سے نہ نکالنے کی۔

(۳) عورت خود بھی خاوند کے گھر سے عدت کے دوران نہ نکلے۔

(۴) ہاں اگر کوئی شرعی مجبوری ہو تو تب اسے گھر سے نکالا جاسکتا ہے۔

مبتدعین کا دعویٰ یہ ہے کہ پہلی حد سے، ظلم نفسہ، کا تعلق ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں بلکہ

مذکورہ چاروں حدود سے اس کا گہرا ربط ہے، اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ لفظ، حدود، واحد نہیں بلکہ جمع ہے، مگر ہمارے مفتی صاحب فقط اسی سے ہی جوڑ کر اس سے تین طلاقیں ثابت کر رہے ہیں۔

ثالثاً۔ فقہ ظلم نفسہ، کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ اس نے اگر طلاق بغیر عدت کے دیکر گناہ کیا ہے، تو اب اس کا گناہ شریعت و دین میں اس کیلئے وبال جان بن جائے اور فی الواقع یک دم دی گئی تین طلاقوں کو ہم نافذ بھی مان لیں، بلکہ اس کا تعلق حدود الہی کو توڑنے سے ہے یعنی اس نے شریعت کے اصول و ضابطے کو توڑ کر اپنے نفس پر ظلم و زیادتی کی ہے، مگر ہمارے مہربان مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے توڑنے سے اس کے حق میں اصول و دستور اور شریعت کا قانون بھی بن گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے جی ظلم کو دستور و قانون باور کرانا آپ جیسے مفتیوں کا ہی کام ہے، ورنہ دین میں ظلم قانون نہیں بنتا، کیونکہ پھر شریعت کو ظالم ماننا پڑے گا حالانکہ دین رحمت ہوتا ہے نہ کہ لعنت، بلکہ انسان کے خلاف شریعت، فعل کو دین الہی نفس پر ظلم سے تعبیر کرتا ہے کہ اس نے فلاں برا فعل کر کے یا فلاں جرم کا مرتکب ہو کر کسی کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنے نفس پر ہی ظلم کیا ہے کہ کل قیامت کے روز اسے اس کا بدلہ ملے گا جو اسے حدود الہی کے توڑنے کے جرم میں جنت سے محروم کر دے گا، مگر مبتدعین کا باوا ہی نرالا ہے کہ اپنے نفس پر ظلم سے یک دم دی گئی تین طلاقوں کے نافذ ہونے کا اثبات کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

فرماتے ہیں، بیہقی اور طبرانی میں سوید ابن غفلۃ سے روایت ہے کہ حضرت امام حسن ابن علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی عائشہ شعمیہ کو ایک دم تین طلاقیں دے دیں، بعد میں خبر ملی کہ وہ امام حسن کے فراق میں بہت روتی ہیں، تو آپ بھی رو پڑے اور فرمانے لگے کہ اگر میں اپنے والد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو الگ الگ یا ایک دم تین طلاقیں دیدے تو وہ عورت بغیر حلالہ اسے جائز نہیں، تو میں ضرور رجوع کر لیتا۔

جاء الباطل ص ۴۵ ج ۱۔

الجواب

اولاً اس کی سند میں عمرو بن ابی قیس سے روایت کرنے والا سلمہ بن فضل راوی ہے (السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۳۳۶ ج ۷ و سنن دارقطنی ص ۴۳۰ ج ۴ و طبرانی کبیر ص ۹۱ ج ۳ (رقم الحدیث ۲۷۵۷)، اور یہ متکلم فیہ راوی ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ

صدوق کثیر الخطا، یعنی سچا تو ہے لیکن کثرت سے غلطیاں کرتا ہے، تقریب ص ۹۸، سلمہ سے روایت کرنے والا، محمد بن حمید الرازی ہے۔ اور یہ متروک و کذاب ہے، امام ابو زرہ امام صالح جزرة، امام ابن خراش نے اسے کذاب کہا ہے اور امام بخاری نے، فیہ نظر) سے اس پر کلام کیا ہے، میزان ص ۵۳۰ ج ۳، و تہذیب ص ۱۳۱ ج ۹۔

ثانیاً۔ بیہقی نے ایک دوسری سند کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اس کی سند میں عمرو بن شمر الجعفی راوی کذاب و دجال ہے، میزان ص ۲۶۸ ج ۳۔

جس روایت کی سند میں ایک ضعیف دوسرا کذاب و متروک ہو اس کے باطل و مردود ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

ہمارے معاصر مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی اس روایت کے سلسلہ میں بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں کہ اس حدیث کو طبرانی دوسری سند سے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان دونوں کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور پہلی حدیث کے راوی صحیح کے ہیں۔ شرح صحیح مسلم ص ۱۰۴۳ ج ۳۔ آئیے متن روایت ملاحظہ کریں:

متع الحسن بن علی رضی اللہ عنہ امراتین بعشرين ألفاً و زفاق من عسل فقلت احدهما و أراها حنفية، طبرانی کبیر ص ۲۷ ج ۳ (۲۵۶۱) و مصنف عبد الرزاق ص ۷۳ ج ۷ (۱۲۲۵۷)

متع، کا معنی ہوتا ہے، فائدہ اٹھانا، متعہ کرنا، امراتین، امراة (عورت) کی تشبیہ ہے (عشرین ألفا، کا معنی ہوتا ہے، بیس ہزار (درہم) فقرہ آپ خود بنالیں، اور سعیدی کی عقل سلیم کا ماتم کریں۔ ہم سے پوچھتے ہوں تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اس میں سفیان ثوری کی تدلیس ہے، امام ثوری کے مدلس ہونے کی بحوالہ صراحت، دین الحق ص ۱۱۱ ج ۱ میں دیکھئے، مزید یہ کہ اس روایت کا تعلق

ہی سرے سے طلاق ثلاثہ سے نہیں۔ یہ سعیدی صاحب کی زیادتی اور خلط بحث کی بدترین مثال ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

سنن کبریٰ بیہقی میں حبیب بن ابی ثابت کی روایت سے ہے

قال جاء رجل الى علي رضي الله عنه فقال طلقت امراتي الفاقال قلت
تحرمها عليك و اقسام سائر هن بين نساءك، السنن الكبرى للبيهقي
ص ۳۳۵ ج ۷۔

یعنی ایک شخص سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بولا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دی ہیں، فرمایا کہ تین طلاقوں نے اسے تجھ پر حرام کر دیا، باقی طلاقیں اپنی اور بیویوں کو بانٹ دے، یعنی وہ لغو ہیں ظاہر ہے کہ اس سائل نے یہ ہزار طلاقیں مہینوں میں تو نہ دی ہوں گی ورنہ ۸۲ سال ۲ مہینے اسی میں صرف ہو جاتے، ایک دم ہی دی تھیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تینوں جائز رکھیں، جاء الباطل ص ۴۵۷ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے، وا قسم سائرہا بین نسائك، کا صحیح معنی کر کے آخر میں تقلیدی ہاتھ کی صفائی دکھا گئے ہیں کہ، یعنی وہ لغو ہیں، حالانکہ متن روایت میں ایسا کوئی لفظ نہیں جو اس مفہوم کا قرینہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مذکورہ الفاظ کا یہی مفہوم ہے کہ تین طلاقوں سے تو تمھاری بیوی بائنے ہو گئی، اور باقی نو سو ستانوے طلاقیں تم اپنی دوسری بیویوں پر تقسیم کر دو۔

ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات محض غصہ اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمائی تھی، ورنہ اس موقف پر انکی کسی نے موافقت نہیں کی، لیکن افسوس کہ حضرت مفتی صاحب نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے چال چلی کہ، یعنی لغو ہیں، کے الفاظ کو متن روایت کے ترجمہ میں داخل کر دیا تاکہ کوئی بریلوی یہ سوال ہی نہ کر سکے کہ حضرت جی آخر کیا وجہ ہے کہ قول مرتضوی کو تم حجت بنا رہے ہو اور خصم پر بطور برہان نقل کر رہے ہو، یہ تو خود تمہارے مذہب و موقف کے خلاف ہے،

کیونکہ تم تین سے زیادہ طلاقوں کو لغو قرار دیتے ہو اور بقایا عورتوں پر طلاق واقع ہونے کے قائل ہی نہیں۔

اس اعتراض سے جان چھڑانے کی غرض سے مفتی صاحب نے یہ مخلص تلاش کیا کہ ترجمہ ہی اس انداز سے کرو کہ عوام الناس متن روایت کا ہی یہ مفہوم خیال کریں تاکہ اعتراض تک نوبت ہی نہ آئے۔

ثانیاً۔ جب مفتی صاحب اور دیگر مبتدعین، ۹ سو ستاون طلاقوں کو اس وجہ سے لغو قرار دیتے ہیں کہ یہ طلاقیں بے موقع و بے محل ہیں اور حضرت علی کا یہ قول نصوص کے خلاف ہونے کے سبب ناقابل اعتبار ہے، اگر یہی اصول دیگر صحابہ کرام بلکہ خود علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے آدھے فتویٰ کی بجائے پورے فتویٰ پر بھی جاری کیا جائے اور کہا جائے کہ چونکہ موقع و محل صرف ایک ہی طلاق کا تھا، لہذا ایک ہی واقع ہوئی ہے، تو بھلا یہ اقدام کس طرح درست نہ ہوگا۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے آخری الفاظ غلط نقل کئے ہیں، درست الفاظ، وا قسم سارہا بن نسا نک، بیہقی ص ۳۳۵ ج ۷، و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۵۳۱ ج ۵، اور بعض روایات میں، و سارہن اسمن بین نسا نک، سنن دارقطنی ص ۲۱ ج ۴، کے ہیں، مگر مفتی صاحب نے بیہقی سے دیکھ کر بھی متن روایت کو صحیح نقل نہیں کیا، اصل میں ہیرا پھیری کرنا مفتی صاحب کی عادت بن چکی تھی، مثل ہے چور چوری سے گیا مگر ہیرا پھیری سے نہ گیا۔

رابعاً۔ مذکورہ روایت میں ایک راوی مبہم ہے کیونکہ حبیب بن ابی ثابت اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے درمیان کا واسطہ ساقط ہے کہ حبیب نے، عن بعض اصحابہ، کہہ کر روایت نقل کی ہے، اور مبہم کی عدالت ثابت کرنا مبتدعین کا فرض ہے، مگر مبتدعین پر یہ ادھار ہی رہے گا، انشاء اللہ۔

خامساً۔ حبیب بن ابی ثابت سے روایت کرنیوالے سلیمان بن مهران الأعمش ہے اور یہ مدلس ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں

وكان يدلس وصفه بذلك الكرابیسی والنسائی والدارقطنی وغيرهم.
یعنی الأعمش کی تدلیس کی صراحت امام کرابیسی امام نسائی امام دارقطنی وغیرہ نے کی ہے، طبقات المدلسین ص ۳۳۔

حافظ ابن حجر نے، تقریب ص ۱۰۳ میں ان کی تالیس کی صراحت کی ہے، اور زیر بحث روایت سماع کی صراحت کے بغیر معتن مروی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مزید ثبوت

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بیہقی میں ہے،

عن جعفر ابن محمد عن ابیہ عن علی رضی اللہ عنہ قال لا تحل لہ حتی تنکح زوجاً غیرہ، السنن الکبری للبیہقی ص ۳۳۵ ج ۴۔

یعنی امام جعفر صادق اپنے جد امجد سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو ایک دم تین طلاقیں دے تو بیوی بغیر حلالہ حلال نہیں، اس کی تائید بیہقی کی اس روایت سے ہوتی ہے جو اس مقام پر ابی یعلیٰ سے مروی ہے کہ،

عن علی رضی اللہ عنہ فیمن طلق امراتہ ثلاثا قبل ان یدخل بها قال لا تحل لہ حتی تنکح زوجاً غیرہ، جاء الباطل ص ۵۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قارئین کرام ہم آپ کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ مفتی صاحب کی پیش کردہ پہلی روایت کی سند کو بغور ملاحظہ کریں اس میں امام جعفر بن محمد، عن ابیہ، کہہ کر اپنے والد کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں مگر ہمارے مفتی صاحب اس قدر سطحی معلومات رکھتے تھے کہ وہ اسے امام جعفر کی طرف نسبت کرتے ہیں، اسی طرح دوسری روایت کو مفتی صاحب، ابی یعلیٰ، راوی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں حالانکہ راوی، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، ہے السنن الکبریٰ ص ۳۳۲ ج ۴۔

حقیقت یہ ہے کہ بدعت ایسی بری اور منحوس چیز ہے جو انسان کو خطی بنا کر علم و فہم سے کورا کر دیتی ہے، اور مفتی صاحب جیسے حکیم الامت کو بھی، ابن ابی لیلیٰ، ابی یعلیٰ، نظر آتا ہے اور، عن ابیہ، آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے روایت مذکورہ کو عدم علم یا مغالطہ کی غرض سے دو روایات بیان کیا ہے، حالانکہ یہ روایت فقط ایک ہی ہے، صرف سند کا فرق ہے، دراصل امام بیہقی نے مذکورہ واقعہ کو پہلے

مفصل بیان کیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ اگر کوئی شخص ایسی عورت کو ایکدم تین طلاقیں دیدیتا ہے جس سے ابھی خلوت نہیں کی؟ تو آپ نے فرمایا کہ، لاتحل لہ، اس کیلئے وہ عورت حلال نہ رہی، اس کی سند میں امام فضل بن دکینؒ سے آگے امام بیہقی نے، انا حاتم بن اسماعیل عن جعفر بن محمد عن ابیہ، کہہ کر سند کا اختلاف بیان کیا تھا، مگر مفتی صاحب اسے الگ اور جدا روایت تصور کر بیٹھے ہیں، پھر اس کوڑھ پہ یہ کھاج کہ جس سند کو پیش کر کے امام بیہقی نے اختلاف روایت و سند بیان کیا تھا اسے مفتی صاحب اصل بیان کر رہے ہیں۔

اگر بقول مفتی صاحب ان کو دو الگ اور مستقل روایات تسلیم کیا جائے تو امام جعفر کی سند سے مروی روایت تو بے معنی ہو جاتی ہے، روایت کے اصل الفاظ مفتی صاحب کے پیش کر رہے ہی ملاحظہ کریں،

قال لاتحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ۔

یعنی جتنی دیر کسی اور مرد سے نکاح نہ ہو وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں۔

سوال یہ ہے کہ کب حلال نہ رہے گی، کیونکہ بہر حال اس سند کے ساتھ اس میں اس کی صراحت نہیں، اس اعتراض سے جان چھڑانے کی غرض سے مفتی صاحب نے یہ چال چلی کہ معنی روایت میں تصرف کر لیا کہ جب ایکدم میں تین طلاقیں دے اٹخ، اس بے ایمانی کی وجہ صرف یہی تھی کہ کوئی انٹاڑی یہ نہ جان لے کہ مفتی صاحب نے جو بعد میں عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کی سند سے روایت بیان کی ہے، اس کا یہ اختصار ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثالثاً۔ پھر مزید بے ایمانی یہ کی کہ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کی جب مفصل روایت کو نقل کیا تو اس کا معنی ہی چھوڑ دیا، آئیے پہلے بمع ترجمہ الفاظ روایت ملاحظہ کریں،

عن علی رضی اللہ عنہ فیمن طلق امرأته ثلاثاً قبل ان یدخل بها قال لاتحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ۔

یعنی علی رضی اللہ عنہ سے ایسے شخص کے متعلق سوال کیا گیا جس نے اپنی بیوی غیر مدخولہ کو تین طلاقیں دے دیں تو آپ نے فرمایا کہ اس کیلئے وہ عورت حلال نہ رہی جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔

السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۳۳۴ ج ۷۔

اس روایت کو مکرر ملاحظہ کریں کہ اس کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں، خود مبتدعین کے نزدیک اگر کسی نے اپنی غیر مدخولہ (جس سے شوہر نے وطی نہ کی ہو) بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ عورت اس پر پہلی طلاق سے ہی بائن ہو کر اس پر حرام ہو گئی اور باقی دو طلاقیں لغو و بیکار ہو گئیں، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں،

اس حدیث میں اس عورت کو طلاق دینا مراد ہے جس سے خلوت نہ ہوئی ہو اور واقعی اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایکدم اس طرح دے کہ تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے، تو اول ہی واقع ہوگی اور اخیر دو طلاقیں لغو، بلفظہ جاء الباطل ص ۴۶۲ ج ۱۔ یہی فقہ حنفی کا متفق علیہ فتویٰ ہے جو ان کی متداول کتب فقہ میں لکھا ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول میں مردی آخری دو طلاقوں کو خود مبتدعین لغو و بیکار جانتے ہیں، اور اس اعتراض سے جان چھڑانے کیلئے مفتی صاحب نے یہ مخلص تلاش کیا کہ متن روایت کا ترجمہ ہی سرے سے نہ کیا تا کہ عوام الناس روایت کے اصل محل کو نہ جان لیں اور کہیں وہ سوال ہی نہ کر دیں کہ حضرت مفتی صاحب جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کو خود ہم ہی قبول نہیں کر رہے تو وہ مخالفین کو ہم کیسے حجت باور کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر کون نادان و جاہل ہے کہ جس فتویٰ کو وہ خود تسلیم نہیں کرتا وہ مخالفین پر اتمام حجت کیلئے نقل کرے، امر واقعہ یہ ہے کہ مبتدعین کی تقلیدی گاڑی چلتی ہی اس طرح کی ہیرا پھیریوں سے ہے، پھر بدعات نے انہیں مزید گمراہ کر دیا ہے جن سے یہ لوگ تقویٰ اور خشیت الہی سے بہت دور ہو چکے ہیں۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

بیہقی نے محمد بن ایاز بن کبیر سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے ایکدم تین طلاقیں دے دیں پھر اس کا خیال ہوا کہ اس سے دوبارہ نکاح کرے تو وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا ان دونوں صحابیوں نے فرمایا کہ ہم

اس کے نکاح کی کوئی صورت نہیں دیکھتے جب تک کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے، وہ بولا حضرت میں نے ایک ہی لفظ سے تین طلاقیں دی تھیں اس پر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو کچھ تیرے قبضہ میں بچا کچھا تھا تو نے اکٹھا ہی دے دیا، حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں،

فسئل ابا ہریرۃ رضی اللہ عنہ و عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فقال لانری ان تنکحها حتی تنکح زوجا غیرک قال انما کان طلاقى ایاها واحدة فقال ابن عباس انک ارسلت من یدک ماکان لک من فضل، السنن الکبریٰ جلد ۷ ص ۳۳۵۔ جاء الباطل ص ۴۵۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کا یہ تحریر کرنا کہ سوال کرنے والے نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ بتایا تھا کہ میں نے ایک ہی لفظ سے تین طلاقیں دی تھیں، غلط بیانی ہے، کیونکہ متن روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ معنی و مفہوم ہو بلکہ روایت کے الفاظ محض اس قدر ہیں کہ،

قال طلق رجل امرأته ثلاثاً قبل ان یدخل بها۔
یعنی ایک شخص نے اپنی غیر مدخولہ عورت کو تین طلاقیں دیدیں ہیں۔
السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۳۳۵ ج ۷۔

الغرض روایت میں تین طلاقیں دینے کا تو ذکر ہے مگر اس میں تین طلاقیں دینے کی کیفیت مروی نہیں کہ دینے والے نے تجھے تین طلاقیں ہیں، کہا تھا یا تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، کہہ کر تین طلاقیں دیں تھیں، متن روایت میں بہر حال اس کا ذکر نہیں، لہذا مفتی صاحب کا بالجزم یہ کہنا کہ یکدم اس نے تین طلاقیں دی تھیں، کذب بیانی اور دغا بازی ہے۔

ثانیاً۔ روایت مذکورہ میں یہ بات صاف اور آئینہ کی طرح شفاف ہے کہ مذکورہ فتویٰ غیر مدخولہ عورت کے بارے میں ہے جس کا معاملہ مدخولہ عورت سے کئی صورتوں میں مختلف ہے اور بعض صورتوں میں خود مؤلف جاء الباطل کا تقلیدی مذہب ہمارے موقف کا حامی ہے (جس کی قدرے تفصیل پہلے عرض کر دی گئی ہے) جس سے اصولی طور لازم آتا ہے کہ حنفی مذہب میں اسی اصول و

دستور سے مدخولہ اور غیر مدخولہ دونوں کو علی الاطلاق بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں ایک رجعی طلاق ہونی چاہیئے۔

ثالثاً، پھر روایت کے الفاظ، فسال، کے ہیں، بیہقی ص ۳۳۵ ج ۴ لیکن مفتی صاحب نے حسب عادت، فسل، بنا دیا ہے۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

(۱) بیہقی میں سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دی ہیں آپ نے فرمایا تین لے لو اور نو سو ستانوے چھوڑ دو، ص ۳۳۷ ج ۷۔

(۲) اسی بیہقی میں عبدالحمید ابن رافع سے بروایت عطاء ہے کہ کسی نے سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں، فرمایا تین لے لو اور ستانوے چھوڑ دو، ص ۳۳۷ ج ۷۔

(۳) بیہقی میں بروایت سعید بن جبیر ہے کہ سیدنا حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے فرمایا کہ جس نے اپنی بیوی کو ایک دم تین طلاقیں دی تھیں کہ تجھ پر تیری بیوی حرام ہوگئی، ص ۳۳۷ ج ۷۔

(۴) بیہقی میں بروایت عمرو ابن دینار ہے کہ کسی شخص نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو ستاروں کے برابر طلاقیں دے اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا اس سے کہہ دو کہ تجھے برج جوزہ کا سر ہی کافی ہے خیال رہے کہ برج جوزہ کے سر پر تین ستارے ہیں، ص ۳۳۷ ج ۷، جاء الباطل ص ۴۵۸ تا ۴۵۹، ملخصاً۔

الجواب

اولاً۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مذکورہ فتاویٰ میں اضطراب پایا جاتا ہے، کیونکہ کسی میں طلاقوں کا عدد، ہزار، کسی میں ستاروں کے برابر، کسی میں سو، اور کسی میں تین بیان ہوئی ہیں۔

ثانیاً۔ محمد بن ایاس عکرمہ مولیٰ ابن عباس، عطاء بن یسار، طاؤس بن کيسان، جابر بن زید اور

حسن بصری متفقہ طور پر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ غیر مدخولہ عورت کی تین طلاقوں کو ایک طلاق بائن قرار دیتے تھے۔
السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۳۵۵ ج ۷۔

اور غیر مدخولہ کے بارے میں ہم وضاحت کر آئے ہیں کہ اگر کوئی ایکدم تین طلاقیں دے ڈالے تو خود مفتی صاحب کے تقلیدی مذہب میں صرف ایک ہی واقع ہوتی ہے، بقایا لغو و بیکار ہیں۔
ثالثاً۔ سنن ابی داؤد باب نسخ المراجعة، میں عکرمہ کی روایت سے صحیح سند سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایکدم دی گئی تین طلاقوں کو ایک ہی رجعی قرار دیتے تھے، سنن ابوداؤد مع عون ص ۲۲۷ ج ۲۔

(۲) امام زہری نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ نقل کیا ہے، مصنف عبدالرزاق ص ۳۳۵ ج ۶۔

(۳) یہی امام عطاء بن ابی رباح ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں، ایضاً ص ۳۳۵ ج ۶۔

(۴) امام ابو عیاض عمرو بن اسود نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی نقل کیا ہے، ایضاً ص ۳۳۵ ج ۶۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نصوص کے مطابق (ایکدم دی گئی تین طلاقوں کو ایک رجعی طلاق قرار دینے) فتاویٰ بھی موجود ہیں لہذا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ان فتاویٰ کو قبول نہیں کیا جائے گا جو نصوص کے خلاف اور معارض ہیں۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

ابن ماجہ، شروع لبواب الطلاق، باب من طلق ثلاثاً فی مجلس واحد، میں ہے کہ فاطمہ بنت قیس فرماتی ہیں کہ مجھے میرے شوہر نے یمن جاتے وقت تین طلاقیں ایکدم دے دیں، ان تینوں کو حضور ﷺ نے جائز رکھا، جاء الباطل ص ۴۵۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس کی سند میں ایک راوی، اسحاق بن فروقہ، ہے، ابن ماجہ ص ۱۲۷، اسے امام ابو زرہ امام نسائی امام دارقطنی امام برقانی نے، متروک الحدیث کہا ہے، امام بخاری کا کہنا ہے کہ محدثین نے اسے ترک کر دیا تھا، امام علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ منکر الحدیث ہے، امام ابن معین نے اسے ہیج محض اور ضعیف و غیر ثقہ (اور ایک روایت میں کذاب) قرار دیا ہے، امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اس کی روایات سے احتجاج نہ کیا جائے، امام ابن عدی کا کہنا کہ اس کی اسناد و متون میں اس کا کوئی متابع موجود نہیں، امام غلیلی نے سخت ضعیف کہا ہے اور اسے امام مالکؒ و شافعی نے ترک کر دیا تھا، امام بزار نے اس کی تضعیف کی ہے، ابن جارد، عقیلی، دولابی، ابو عرب، ساجی، اور ابن شاہین نے اسے ضعفاء میں شمار کیا ہے، ابن حبان نے کہا ہے کہ اسناد کو الٹ پلٹ کر دیتا تھا، تھذیب التھذیب ص ۲۱۱ ج ۱۔

ثانیاً۔ صحیح حدیث اس کے برعکس ہے، جس میں وضاحت ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ان کے خاوند نے متفرق و مختلف اوقات میں باقاعدہ شرعی طریقہ سے تین طلاقیں دی تھیں، چنانچہ خود حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں،

كنت عند ابی عمرو بن حفص بن المغيرة و كان قد طلقني تطليقتين ثم انه سار مع علي بن ابي طالب الى اليمن حين بعثه رسول الله ﷺ اليه فبعث الي بتطليقتي الثالثة، الحديث.

یعنی میرے شوہر (حضرت) ابو عمرو بن حفص بن مغیرہ رضی اللہ عنہ مجھے دو طلاقیں دے چکے تھے کہ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حکم نبوی ﷺ کے مطابق آپ یمن چلے گئے تو انہوں نے یمن سے مجھے تیسری طلاق بھیج دی، الحدیث، مسند احمد ص ۴۱۳-۴۱۴ ج ۶۔

اس روایت میں پوری صراحت کے ساتھ یہ وضاحت ہے کہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہ کو تین طلاقیں متفرق و مختلف اوقات میں دی گئیں تھیں اور آخری و تیسری طلاق موصوفہ کے شوہر نے یمن سے تحریری طور پر لکھ کر بھیجی تھی، اس کی تائید حسب ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے۔

امام عید اللہ بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ

ان ابا عمرو بن حفص بن المغيرة خرج مع علي بن ابي طالب الى اليمن

فارسل الى امراته فاطمة بنت قيس رضى الله عنها بتطليقة كانت بقيت من طلاقها.

یعنی حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابو عمرو بن حفص رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ کے ساتھ یمن چلے گئے تو وہاں سے انہوں نے ایک آخری طلاق (فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو) بھیج دی تھی جو کہ باقی رہ گئی تھی، صحیح مسلم ص ۲۸۲ ج ۱، و مسند احمد ص ۴۱۴ ج ۱، و ابو داؤد ص ۳۱۲ ج ۱، و عبد الرزاق ص ۲۲ ج ۷۔

اس صراحت سے مبتدعین کی اس دلیل کے پرچے اڑ گئے۔

مفتی صاحب کی آٹھویں دلیل

حاکم، ابن ماجہ، ابو داؤد نے عبداللہ ابن علی ابن یزید ابن رکانہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میرے دادا رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دی پھر وہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا اور عرض کیا کہ میں نے ایک کی نیت کی تھی حضور ﷺ نے فرمایا کہ کہ اللہ کی قسم تم نے ایک ہی کی نیت کی تھی، عرض کیا تم ہے رب کی میں نے نہ نیت کی مگر ایک کی، پس حضرت ﷺ نے انکی بیوی کو ان پر واپس فرمادیا۔

مفتی صاحب وجہ استدلال میں فرماتے ہیں کہ،

اگر ایک دم تین طلاقیں سے ایک ہی واقع ہوتی ہے تو حضور ﷺ حضرت رکانہ سے اس کی نیت کی قسم کیوں لیتے، جاء الباطل ص ۴۵۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اسکی سند کا مدار، زبیر بن سعید نوفلی، پر ہے، اور یہ ضعیف ہے، امام علی بن مدینی نے اس کی تضعیف کی ہے، امام ابو احمد حاکم نے کہا ہے کہ، یس بالقوی عندہم، یعنی یہ جملہ اہل علم کے نزدیک قوی نہیں، امام احمد نے اسے، لین، کہا ہے، امام ابن معین نے (ایک روایت میں) اسے ضعیف کہا ہے، امام بخاری امام نسائی، امام ساجی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، امام ابو داؤد نے کہا ہے کہ اس کی روایت میں نکارۃ ہے، امام عجل نے اس کی اس روایت کو منکر کہا ہے، تھذیب

ص ۳۱۵ ج ۳۔

امام ابن حزم نے متروک لکھا ہے (المحلی) امام عبدالحق نے روایت مذکورہ کو ساقط الاعتبار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ، الزبیر اضعفہم، یعنی زبیر تمام سند کے راویوں سے زیادہ ضعیف ہے، بحوالہ التعلیق المغنی ص ۳۵ ج ۴۔

ثانیاً۔ زبیر ضعیف ہونے کے علاوہ اسے بیان کرنے میں اضطراب کا شکار بھی ہوا ہے، (۱) کہتا ہے کہ

عن عبد الله بن علي بن يزيد بن ركانة حدثني ابي عن جدي انه طلق امراته البتة، سنن دارمی ص ۲۱۶ ج ۲۔

(۲) دوسری بار کہتا ہے کہ

عن عبد الله بن علي بن ركانة عن ابيه عن جدہ، دارقطنی ص ۳۴ ج ۴۔

(۳) تیسری بار کہتا ہے

عن عبد الله بن علي بن السائب، دارقطنی ص ۳۵ ج ۴۔

(۴) چوتھی بار کہتا ہے

عن محمد بن ادريس حدثني عمي محمد بن علي عن ابن السائب، ابوداود ص ۳۰۰ ج ۴۔

یہی وجہ ہے کہ اس روایت کو محدثین کرام نے ضعیف و معلول قرار دیا ہے، چنانچہ امام بخاری، علامہ ابن عبد البر، حافظ ابن حجر اور علامہ ترکمانی حنفی نے اسے ضعیف و معلول کہا ہے، التلخیص الحمبر ص ۲۱۳ ج ۳، والجوہر النقی ص ۳۲۹ ج ۷۔

امام ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ، ابو عبید ترکہ ناجیۃ و احمد جبن عنہ، یعنی امام ابو عبید قاسم بن سلام، نے اس حدیث کو قطعی طور پر متروک قرار دیا ہے اور امام احمد نے اسے ضعیف ہونے کے وجہ سے اس کی روایت سے ہمت ہار دی، سنن ابن ماجہ ص ۱۴۹۔

علامہ زیلعی حنفی فرماتے ہیں،

قال عبدالحق فی، احکامہ، فی اسناد هذا الحديث عبد الله بن علي بن

السائب عن نافع بن عجير عن ركانه، والزبير ابن سعيد عن عبدالله بن علي بن يزيد بن ركانة عن ابيه عن جدّه و كلهم ضعفاء والزبير اضعفهم وقال البخاري علي بن يزيد بن ركانه عن ابيه لم يصح حديثه.

یعنی امام عبدالحق نے، احکام، میں کہا ہے کہ اس کی سند کے تمام راوی ضعیف ہیں اور ان سب سے زیادہ ضعیف زبیر بن سعید ہے، نصب الراية ص ۳۳۷ ج ۳۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کا اس روایت سے استدلال دراصل مفہوم مخالف ہے جو کہ انکے تقلیدی مذہب میں حجت نہیں، جس کا اعتراف حنفی بریلوی علماء کو بھی ہے، دیکھئے شرح صحیح مسلم ص ۸۴ ج ۴، للمولوی غلام رسول سعیدی بریلوی۔

چنانچہ علامہ مار دینی حنفی نے اس حدیث سے استدلال کرنیوالے غیر احتاف کار د اسی اصول سے کرتے ہوئے لکھا ہے۔

هذا الحديث ضعفه كذا قال صاحب التمهيد وعلي تقدير صحته لا نعلم ماذا كان عليه السلام يريد ان يقول له لو قال اردت الثلاث.

یعنی یہ حدیث اول تو ضعیف ہے، اور اگر بالفرض اس کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے، تو یہ معلوم نہیں کہ نبی ﷺ کیا ارادہ رکھتے تھے، جب آپ علیہ السلام سے حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ یہ کہتے کہ میں نے تین طلاقیں ہی دی ہیں، الجواهر النقی ص ۳۲۹ ج ۷۔

ملفوظ

واضح رہے کہ تین طلاقوں کی نیت سے دی ہوئی ایک مجلس کی تین طلاقوں کو صرف ایک رجعی قرار دینے کی صراحت حدیث نبوی میں موجود ہے، لہذا علامہ ابن ترکمانی کا یہ کہنا کہ، لا نعلم ماذا كان يريد ان يقول له لو قال اردت الثلاث.

یعنی حکم نبوی کیا ہوتا، ہمارے نزدیک صرف علامہ موصوف یا ان جیسے دیگر مقلدین کا اپنا ذاتی خیال اپنی معلومات کی بنیاد پر ہے۔
المعود الی المقصود

ہماری اس مجمل بات کی تفصیل یہ ہے کہ طلاق کیلئے استعمال ہونے والے الفاظ صریحہ میں طلاق دینے والے کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ عموم الفاظ کا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ،

ثلاث جدھن جد وھذلھن جدالنکاح والطلاق والرجعة.

ابو داود ص ۲۹۸ ج ۱، و ترمذی مع تحفه ص ۲۱۵ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۱۲۸، و دارقطنی ص ۱۸ ج ۴، و مستدرک حاکم ص ۱۹۷ ج ۲.

جبکہ از روئے شریعت، طلاق البتہ، طلاق صریح کی قسم سے ہے، کیونکہ دور نبوی میں طلاق البتہ کا لفظ طلاق ثلاثہ کیلئے بولا جاتا تھا، اور یہ ثابت ہے کہ ایک وقت کی طلاق ثلاثہ یا بلفظ دیگر طلاق البتہ کو شریعت میں ایک رجعی طلاق قرار دیا گیا ہے، اس لئے رکانہ والی زیر بحث حدیث کو اگر بالفرض صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ کہنا کہ اگر رکانہ یہ کہتے کہ طلاق البتہ سے ہماری نیت تین طلاقیں تھیں، تو جواب نبوی کیا ہوتا، صحیح نہیں، کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں جواب نبوی معلوم ہے کہ خواہ کسی بھی نیت سے طلاق البتہ و طلاق ثلاثہ دی گئیں ہوتیں تو ایک رجعی ہوتی، بہر حال مؤلف جاء الباطل کے مذہب اور علامہ ماردینی کے مذکورہ قول کے موافق حدیث رکانہ کو شرعاً تین طلاقیں قرار دینا ثابت نہیں ہوتا۔

رابعاً۔ اگر اس کا یہی مفہوم نکالا جائے کہ طلاق دینے والے کی نیت محض مذاق و ہنسی ہو، طلاق کا ارادہ و نیت نہ ہو، فقط یوں ہی بطور مذاق طلاق البتہ کا لفظ کہہ دیا ہو، تو یہ طلاق بالکل واقع نہ ہو، کیونکہ اس کی نیت طلاق دینے کی نہ تھی، مگر چاروں تقلیدی مذاہب متفقہ طور پر حدیث البتہ کے اس مفہوم کو غیر معتبر جان کر اس کے خلاف عمل پیرا ہیں، تو پھر اس کا یہ مفہوم نکالنا کہ اگر تین کی نیت ہو تو تین واقع ہوں گی، کیونکہ جائز و درست ہوگا۔

خامساً۔ اس حدیث کا مفتی صاحب بلکہ چاروں تقلیدی مذاہب کے مطابق ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر طلاق دینے والے کی نیت ایک یا دو رجعی طلاقیں ہوں، تو ایک یا دو رجعی ہی ہوں گی، اور اگر طلاق کی نیت نہ ہو تو طلاق واقع ہی نہ ہوگی، لیکن مالکی و حنبلی مذہب میں تین طلاقیں واقع ہوں گی، اور حنفی مذہب میں اگر طلاق البتہ تین کی نیت سے دی گئی تو تین واقع ہوں گی، اور اگر تین کی

نیت سے نہیں دی گئی تو بہر صورت ایک طلاق بائن ہوگی، خواہ طلاق دینے والے کی نیت ایک یا دو طلاق رجعی یا بائن کی ہی ہو، یا سرے سے طلاق کی نیت سے دی ہی نہ ہو، طلاق بائن بہر حال ہو جائیگی، اور طلاق دینے والے کی نیت کا اعتبار نہ ہوگا اور شافعی مذہب میں نیت کے مطابق ایک یا دو رجعی یا بائن یا تین طلاقیں ہوں گی لیکن اگر نیت طلاق کی نہ تھی، تو طلاق بائن ہوگی۔ اوجز المسالک ص ۳۲۹ تا ۳۳۰ ج ۴، و ۳۹۳ تا ۳۹۷۔

سادساً۔ بقول امام شافعیؒ اس حدیث کا ایک مفہوم مخالف یہ بھی ہے کہ ایک دم تین طلاقیں دینا بلا کراہت مباح و حلال ہیں، لیکن مفتی صاحب بلکہ باقی تینوں تقلیدی مذاہب اس مفہوم مخالف کے منکر ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ امام شافعی کا بیان کردہ مفہوم مخالف تو صحیح نہ ہو مگر احناف کا بیان کردہ درست تسلیم کر لیا جائے، کیا انصاف کا یہی میزان ہے۔

سابعاً۔ امام احمد بن حنبلؒ کا کہنا ہے کہ رکناہ کی حدیث البتہ ناقابل اعتبار ہونے کے ساتھ یکدم دی گئی طلاق ثلاثہ والی حدیث کے منافی و مخالف نہیں ہے کیونکہ اہل مدینہ ایک مجلس کی طلاق کو طلاق البتہ کے نام سے بھی موسوم کرتے تھے۔

فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۸۶ ج ۳۳، اعلام الموقعین ص ۸۰ ج ۲ مترجم۔

امام ابن ماجہ اور حدیث البتہ

حضرت مفتی فرماتے ہیں کہ، امام ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ، ما اشرف هذا الحديث، یہ حدیث کیا ہی شریف الاسناد ہے، جاء الباطل ص ۳۵۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ قول امام ابن ماجہ کا قطعاً نہیں، یہ مفتی صاحب کا وہم اور علم حدیث سے کم آگاہی کا نتیجہ ہے، بلکہ اس قول کو امام مہذب نے، ابوالحسن طنافسی سے نقل کیا ہے، انکے الفاظ ہیں،

قال محمد بن ماجه سمعت اباالحسن علي بن محمد الطنافسي يقول ما

اشرف هذا الحديث، ابن ماجه (۲۰۵۱)

(امام) محمد بن ماجہؒ کہتے ہیں کہ ابوالحسن (طنافسی) سے سنا وہ فرماتے تھے یہ حدیث کتنی

عمدہ ہے۔

(مترجم سنن ابن ماجہ ص ۵۷۰ ج ۱ ترجمہ از مولوی عبدالحکیم خاں بریلوی)

مگر حضرت مفتی صاحب ان الفاظ کو امام ابن ماجہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ثانیاً۔ امام ابن ماجہ نے اس کے بعد حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کر کے اس روایت کو ضعیف قرار دیا تھا، جسے مفتی صاحب بے ڈکار ہضم کر گئے ہیں، اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہدایت عطا فرمائے اور اس طرح کی ہیرا پھیریاں کرنے سے انہیں بچائے اور عوام الناس کو ان کی عیاریوں سے محفوظ رکھے، آمین یا الہ العلمین۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کا، ما اشرف هذا الحديث، کا یہ معنی کرنا کہ، یہ حدیث کیا ہی شریف الاسناد ہے، غلط بیانی ہے، کیونکہ اصول حدیث کی کسی کتاب میں بھی یہ معنی موجود نہیں، حقیقت یہ ہے کہ امام طنفسی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایت کتنی شاندار اور عمدہ ہے کہ جو بھی اسے دلیل و حجت بنائے گا اس کے خلاف یہی حدیث دوسرے پہلو سے ردِ بلیغ بن جائے گی، جیسا کہ قارئین کرام پہلے پڑھ آئے ہیں کہ اس کو دلیل و حجت بنانے والے بھی اس پر عامل نہیں کیونکہ اس کا مفاد یہ ہے کہ اگر طلاق دینے والے نے بلائیت طلاق البتہ دے دی تو طلاق واقع نہ ہوگی مگر کسی شخص نے بھی اس حدیث سے نکلنے والے مسئلہ پر عمل نہیں کیا، تو اس چیز کو ملحوظ رکھ کر امام طنفسی نے یہ بات کہی کہ یہ حدیث کتنی عمدہ ہے کہ اسے دلیل بنانے والے بھی اس کے جال میں پھنس کر رہ جائیں گے، اور اعتراضات کا شکار ہوں گے، مقصد یہ تھا کہ یہ روایت دلیل کے لائق نہیں کیونکہ اگر ایک پہلو سے دلیل بن رہی ہے تو دوسرے پہلو سے پاؤں پر کلہاڑا چلا رہی ہے، معلوم نہیں کہ حضرت مفتی صاحب نے ادھیڑ عمر میں بھی ان الفاظ کا صحیح مطلب کیوں نہیں سمجھا۔

مفتی صاحب کی نویں دلیل

بیہقی نے بسام صریفی سے روایت کی ہے کہ جعفر ابن محمد فرماتے ہیں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو نادانی سے یا جان بوجھ کر تین طلاقیں دیدے وہ عورت اس پر حرام ہو جائیگی، اسی بیہقی نے مسلمہ ابن جعفر احمد سے روایت کی کہ میں نے امام جعفر ابن محمد رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپ یہ

فرماتے ہیں کہ جو کوئی ایکدم تین طلاقیں دے تو ایک رجعی ہی واقع ہوگی؟ فرمایا معاذ اللہ ہم نے یہ کبھی نہ کہا اس کی تین طلاقیں ہی ہوں گی، بحوالہ روح المعانی، جاء الباطل ص ۳۶۰ ج ۱۔

الجواب

امام جعفر صادق اتباع التابعین سے ہیں، اگر ان کے قول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آئمہ اربعہ کی طرح ان کا بھی یہی موقف تھا، مگر کسی مسلمان کلمہ گو اور بزرگ کے قول سے قرآن و حدیث کی واضح نصوص کو رد نہیں کیا جاسکتا، گو وہ ہمارے اسلاف ہیں مگر دلیل قرآن و حدیث سے ہی لی جائے گی، اور اس کے بالمقابل بڑی سے بڑی بزرگ ہستی کے اقوال کو بھی لائق بنانا درست نہیں، یہی حنفی بریلوی علماء کا موقف و مذہب ہے، دیکھئے دین الحق ص ۳۴۱ ج ۱۔

ثانیاً۔ روایت مذکورہ کی سند میں، مسلمہ بن جعفر الاحمسی ہے، بیہشتی ص ۳۴۰ ج ۷، مگر مفتی صاحب، الاحمسی، کو احمد فرماتے ہیں۔

ثالثاً۔ الاحمسی کے نیچے کا راوی، محمد بن عبدالرحمن، ہے جو کہ ضعیف و متروک ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے، دین الحق ص ۳۸۲ ج ۱، جبکہ دوسری سند میں بسام (بن عبداللہ) میر فی راوی ہے جو کہ شیعہ ہے اسے ابن عقدہ اور طوسی نے رجال شیعہ میں ذکر کیا ہے، تہذیب ص ۳۸۰ ج ۱، تفصیل کیلئے، تنقیح المقال ص ۱۶۸ ج ۱، دیکھئے۔

اور شیعہ کی روایت مفتی صاحب کے نزدیک ضعیف ہوتی ہے، جاء الباطل ص ۲۶۸ ج ۲، گو ہم اس کی اسناد سے کئی اور راوی بھی متکلم فیہ دکھا سکتے ہیں مگر مبتدعین کو جب ان کا دل پسند جواب مل گیا تو اور کسی کی ضرورت ہی نہ رہی۔

مفتی صاحب کی دسویں دلیل

مسلم شریف کتاب الطلاق باب الطلاق الثلث، میں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ ایکدم تین طلاقیں تین ہی ہوں گی، اس حدیث کی شرح نووی میں ہے کہ صحابہ کرام کا اجماع اس پر ہے کہ تین طلاقیں تین ہی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کبھی غلط بات پر اجماع نہیں کر سکتے، جاء الباطل ص ۳۶۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ فتویٰ پر ہی اگر تعصب سے الگ ہو کر غور کر لیا جائے تو مسئلے کا حل نکل آتا ہے، ان کے فتویٰ کے پورے الفاظ یہ ہیں کہ۔

عن ابن عباس قال كان الطلاق على عهد رسول الله ﷺ و ابى بكر و سنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا في امر كانت لهم فيه اناة فلو امكنهم فامضاه عليهم.

یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس معاملے میں لوگوں کو سوچ و بچار سے کام لینا چاہیے تھا، اس میں وہ جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں، لہذا ہم کیوں نہ اس کو نافذ کر دیں، چنانچہ آپ نے اس کو نافذ کر دیا، صحیح مسلم ص ۸۷۸ ج ۱۔

اس حدیث کو مفتی صاحب ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین شمار کرنے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں، اور دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا تھا۔ لیکن حدیث کے پورے الفاظ کو نقل ہی نہیں کیا اور کاٹ چھانٹ کر انہوں نے جو الفاظ درج کئے ہیں، ان کا معنی بھی خیر سے چھوڑ دیا ہے۔

ہم مفتی صاحب کی اس مجبوری سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر پوری حدیث نقل کر کے اس کا معنی کر دیا تو ایک اناڑی بھی جان جائے گا کہ خود عہد رسالت مآب ﷺ اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی پوری مدت خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک امت مرحومہ کا تعامل یہی تھا کہ تین طلاقوں کو ایک رجعی طلاق شمار کیا جاتا تھا، اس کیلئے مفتی صاحب نے جوڑ توڑ سے یہ مخلص تلاش کیا کہ حدیث کے الفاظ کو قطع و برید کے ساتھ پیش کیا، پھر بریلویوں کے ستم شعار مفتی اعظم اور حکیم الامت نے درج کردہ الفاظ کا بھی معنی کرنے کی زحمت نہ کی۔

انصاف شرط ہے کہ امت مرحومہ کا وہ تعامل زیادہ صحیح ہے جو آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی

مبارکہ اور خلافت صدیقی کی پوری مدت اور خلافت فاروقی کے ابتدائی دوسالوں تک رہا، یا وہ جس کا آغاز آنحضرت ﷺ کی وفات کے پانچ سال بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شروع ہوا۔

ثانیاً۔ اگر مبتدعین یہ کہیں کہ عہد رسالت اور دور صدیقی، کے خلاف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیوں حکم نافذ فرمایا؟ تو گزارش ہے کہ اسی حدیث میں اس کی وجہ بیان کر دی گئی ہے کہ لوگ کثرت سے طلاقیں دینے لگ گئے تھے جبکہ شریعت نے اس میں انتہائی غور و فکر اور صبر و تحمل سے کام لینے کی تاکید کی ہے، لیکن جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ طلاق کے معاملے میں اس احتیاط سے کام نہیں لیتے جو شریعت کا منشا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خیال میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ ایک مجلس کی تین طلاقیں کو تین ہی شمار کرنے کا نفاذ کر دیا جائے، تاکہ اس سخت اقدام سے لوگوں کو کچھ تنبیہ ہو اور کثرت سے بیک وقت تین طلاقیں دینے کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہو، یہ گو ایک تعزیری اور تہدیدی اقدام تھا، جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا تھا۔

ہمارے اس موقف کی تائید علامہ قسستانی حنفی کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

انه كان في الصدر الاول اذا ارسل الثلاث جملة لم يحكم الا بوقوع واحدة الى زمن عمر ثم حكم بوقوع الثلاث سياسة لكثرة من الناس.

یعنی ایک وقت میں دی ہوئیں تین طلاقیں ابتدا اسلام سے لیکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے شروع تک ایک ہی شمار کی جاتی تھی، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کے کثرت فعل پر نظر کی تو تین کے واقع ہونے کا حکم از روئے سیاست جاری کرایا، بحوالہ طحاوی علی درمختار ص ۱۰۵ ج ۲، یہی بات فقہ حنفی کی معتبر کتب، جامع الرموز ص ۳۲۱ اور مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ص ۳۲۸ وغیرہ میں بھی درج ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ تعزیری اور اجتہادی تھا جس کو دین و شریعت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، بالخصوص جب کہ عہد رسالت اور عہد صدیقی میں تین طلاقیں کو ایک ہی طلاق سمجھا جاتا تھا۔

خلفائے راشدین کے نافذ کردہ قوانین کی امثلہ

اولاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا محض قانون نافذ کرنا ہی صحابہ کرام کا اجماع ثابت کرتا ہے، درست نہیں کیونکہ جن الفاظ سے مبتدعین کے مفتی اعظم کا استدلال ہے، ان سے پہلے کی عبارت اس طرح ہے کہ،

كانت الطلاق على عهد رسول الله ﷺ وأبي بكر و سنتين من خلافة عمر
طلاق الثلاث واحدة، مسلم ص ۷۸ ج ۱۔

ان الفاظ کا واضح مفاد یہ ہے کہ دور نبوی و صدیقی اور ابتدائی عہد فاروقی میں ایک وقت کی تین طلاقیں کو ایک قرار دیا جاتا تھا، مگر حیرت ہے کہ حضرت مفتی صاحب کو یہ اجماع تو نظر نہیں آ رہا جو نبی ﷺ کی زندگی طیبہ میں ہوا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی پوری مدت خلافت میں اس پر مسلسل عمل رہا یہاں تک عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی دو تین سال تک اسی سنت نبوی اور اجماع امت پر عمل رہا؟ مگر کمال ہے کہ مفتی صاحب کا ایک کو تو قابل عمل قرار دینا اور دوسرے کو متروک العمل کہنا بذات خود ان کے علمی و عملی تضاد کا مظہر ہے۔

ثانیاً۔ موقع کی مناسبت سے ہم یہاں ایسی مثالوں کا ذکر کرنا بھی چاہتے ہیں جن کا زیر بحث مسئلہ سے بہت گہرا تعلق ہے، وہ یہ کہ چند ایسی امثلہ کی ہم نشان دہی کروا رہے ہیں، جو کہ خلفائے راشدین کے قانون نافذ کرنے کے باوجود مفتی صاحب اور ان کے ہم مشرب تقلیدی حضرات ان پر عمل نہیں کرتے۔

(۱) حج تمتع کی مثال

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

تمتعنا على عهد رسول الله ﷺ و نزل القرآن قال رجل (ای عمر بن خطاب

رضی اللہ عنہ) برأيه ماشاء۔

یعنی نبی ﷺ کے زمانہ مبارکہ اور خلافت صدیقی میں ہم حج تمتع کیا کرتے تھے اور قرآن کریم بھی اس سلسلہ میں نازل ہوا پھر بعد میں ایک شخص نے (عمر فاروق رضی اللہ عنہ قسطلانی بحوالہ حاشیہ

بخاری) اپنی رائے سے حج تمتع پر پابندی لگادی، بخاری ص ۲۱۳ ج ۱، و مسلم ص ۴۰۳ ج ۱۔

اس قانون کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دور خلافت میں نافذ رکھا، جیسا کہ مروان بن الحکم (بخاری ص ۲۱۲ ج ۱) اور عبداللہ بن شقیق (مسلم ص ۴۰۱ ج ۱) بیان کرتے ہیں، تمام اہل علم کا مقلدین سمیت اس بات پر اتفاق ہے کہ گو حضرات خلفائے راشدین نے اس سے منع فرمایا لیکن حج تمتع کرنا جائز ہے کیونکہ دور نبوی و صدیقی میں اسے جائز سمجھا جاتا تھا، اس لئے خلفاء کی لگائی ہوئی پابندی کو حجت تسلیم نہیں کیا گیا، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں اسی معنی و مفہوم کی روایت کو حجت باور کرایا جاتا ہے اور منکرین کو دین کا باغی قرار دیا جاتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۲) سفر حج میں قصر نماز کی مثال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

صلیت مع النبی ﷺ بمنیٰ رکعتین و ابی بکر و عمرو مع عثمان صدراً من

امارتہ (و فی روایۃ ثمان سنین من خلافت عثمان) ثم اتمھا عثمان۔

یعنی میں نے نبی ﷺ کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں پڑھیں، اسی طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ دور خلافت میں، اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی چھ سال یا آٹھ سال تک انکی اقتدا میں دو رکعتیں پڑھیں مگر بعد میں انہوں نے اپنی خلافت کے آخری سالوں میں دو رکعتوں کی بجائے پوری نماز پڑھنے لگے۔

بخاری ص ۱۴۷ ج ۱، و مسلم ص ۲۴۳ ج ۱، و نسائی ص ۷۰ ج ۱۔

اس حدیث کا واضح مفاد یہ ہے کہ دور نبوی و صدیقی و فاروقی اور ابتدائی عہد عثمانی میں حج کے موقع پر منیٰ میں نماز کو قصر کیا جاتا تھا، مگر بعد میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پوری نماز پڑھنا شروع کر دی تھی، اس حدیث کی بنا پر تمام اہل تقلید (بشمول حنفیہ) یہ مانتے ہیں کہ چونکہ عہد نبوی و صدیقی و فاروقی اور ابتدائے عہد عثمانی میں قصر کی جاتی تھی، اس لئے اس موقع پر قصر کرنی ہی افضل و اولیٰ اور راہ استقامت ہے، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اسی معنی و مفہوم پر عمل کرنے کے باوجود حنفی طلاق کے بارے میں مروی اسی معنی و مفہوم کی حدیث کو متروک العمل قرار دیکر تضاد کے شکار ہیں۔

(۳) بیک وقت ہزار طلاقیں دینے کی مثال

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک وقت میں ہزار طلاقیں دے دے، تو اس کی وہ بیوی تین طلاقوں کی وجہ سے حرام ہو جائے گی، اور باقی طلاقیں وہ شخص اپنی دیگر بیویوں پر تقسیم کر دے، گویا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا واضح مفاد یہ ہے کہ اسکی باقی عورتیں بھی مطلقہ ہو کر حرام ہو جائیں گی بشرطیکہ کہ اس کے عقد میں اور بیویاں بھی ہوں،

مفتی صاحب کے اصول کے موافق خلیفہ راشد کا یہ فرمان امت کا اجماعی فیصلہ قرار پاتا ہے۔ مگر حنفی اس اجماع کو تسلیم نہیں کرتے۔

(۴) مفقود الخمر شوہر کی مثال

امام سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں کہ

ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال ایما امرأة فقدت زوجها فلم یدر این هو فانها تنظر اربع سنین ثم تعتد اربعة اشهر و عشر اثم تحل۔
یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جس کا شوہر گم ہو جائے، وہ عورت چار سال انتظار کرنے کے بعد چار مہینے دس دن کی عدت گزار کر دوسری شادی کر لے، موطا امام مالک ص ۵۲۳، ونبھتی ص ۴۴۵ ج ۷۔

یہی فتویٰ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ہے، نبھتی ص ۴۴۵ ج ۷۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ مفقود الخمر شوہر کی بیوی کے بارے میں حکم فاروقی و عثمانی چار سال انتظار کے بعد عدت گزار کر دوسری شادی کر لینے کا ہے، ظاہر ہے کہ مفتی صاحب کے اصول سے مذکورہ حکم فاروقی و عثمانی امت کا اجماعی مسئلہ ہے مگر افسوس کہ حنفیہ اس اصول سے انحراف کر کے بقول مفتی صاحب اجماع امت کے منکر ہیں۔ کیونکہ فقہ حنفی کے مطابق مفقود الخمر خاوند والی عورت اپنے خاوند کی پیدائش سے لیکر ایک سو بیس سال عمر ہونے تک انتظار کرے گی اور جب خاوند کی عمر ایک سو بیس سال ہو جائے گی تو پھر وہ عدت گزارے گی (قدری ص ۱۵۵)

(۵) مروجہ نکاح حلالہ کی مثال

متعدد کتب حدیث میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے،

ابوداؤد (۲۰۷۷-۲۰۷۸) و ابن ماجہ (۱۹۳۶-۱۹۳۷) و ترمذی (۱۱۱۹-۱۱۲۰) و مسند احمد (۳۲۳/۲) و بیہقی (۲۰۸/۷) و مستدرک حاکم (۱۹۸/۲-۱۹۹) و دارقطنی (۲۵۱/۳) و ابن ابی شیبہ (۲۹۵/۳)۔

جب کہ خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں کہ

لا اوتی بمحلل ولا محلل له الا رجعتہما۔

یعنی میں حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو رجم کر دوں گا،

ابن ابی شیبہ (۲۹۴/۳) و مصنف عبدالرزاق ص ۲۶۵ ج ۶ (۱۰۷۷۷)۔

اس روایت کا صاف مطلب یہ ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حلالہ کو زنا قرار دیتے تھے، مفتی صاحب کے اصول کے موافق یہ حکم فاروقی بھی امت کا اجماع ہے مگر حنفیہ مروجہ حلالہ کے قائل ہیں اور اپنے ہی بنائے ہوئے اصول سے انحراف کر کے انہوں نے اجماع امت کا انکار کر کے سبیل المؤمنین کو ترک کر دیا ہے۔

(۶) حالت احرام میں نکاح کی مثال

حالت احرام میں نکاح کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر منع فرمایا ہے، صحیح مسلم ص ۴۵۳ ج ۱، اور امام داؤد بن حصینؒ بیان کرتے ہیں کہ

ان اباعطفان بن طریف المری اخبرہ ان اباه طریفا تزوج امرأه وهو محرم فرد عمر بن الخطاب نکاحه۔

یعنی ابو عطفان مری کہتے ہیں کہ میرے باپ طریف نے حالت احرام میں ایک عورت سے نکاح کر لیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس نکاح کو مردود قرار دیا، موطا امام مالک ص ۳۶۱۔ اس صحیح اثر کا بھی یہ مفاد ہے کہ اس مسئلہ پر بھی دور فاروقی میں امت کا اجماع ہو گیا تھا، مگر

مفتی صاحب کے فقہی مذہب کے مطابق محرم آدمی اور مرحمہ عورت حالت احرام میں نکاح کر سکتے ہیں۔ (قدوری ص ۱۶۲) کتنے افسوس کی بات ہے کہ احناف نے اپنے اصول سے انحراف کرتے ہوئے امت کے اس اجماع کو بھی توڑ دیا ہے۔

(۷) نکاح بلاولی کے مثال

عکرمہ بن خالد بیان کرتے ہیں کہ

جمعت الطريق ركبا فجعلت امرأة منهم ثيب امرها الى رجل من العوام غير وليها فانكحها رجلاً، قال فجلد عمر الناكح والمنكح و فرق بينهما.

یعنی ایک سفر میں ایک عورت ثیبہ (ایسی شادی شدہ خاتون جو وطی کے بعد بیوہ یا مطلقہ ہوگئی ہو) نے ولی کی اجازت کے بغیر ایک شخص کے ذریعہ نکاح کر لیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نکاح کرنے اور کرانے والے دونوں کو کوڑے لگائے اور نکاح کو باطل قرار دیتے ہوئے دونوں کے درمیان تفریق کروادی،

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۲۲ ج ۲ (۲)۔ مصنف عبدالرزاق ص ۱۹۹ ج ۶ (۱۰۳۸۶) و دارقطنی ص ۲۲۵ ج ۳ و بیہقی ص ۱۱۱ ج ۲۔

اسی طرح خلیفہ راشد حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایسے نکاح کو باطل قرار دے کر نکاح کرنے والے کو سزا دیتے تھے، ایضاً۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس جاری کردہ قانون و دستور پر مفتی صاحب کے اصول کے موافق امت کا اجماع منعقد ہو گیا ہے، لیکن یہاں اپنے اصول کے مطابق اجماع امت کی مخالفت کی ہے کہ عورت خواہ منکوحہ ہو یا باکرہ البتہ بالغ ہونا ضروری ہے، ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر سکتی ہے (قدوری ص ۱۶۲)، حالانکہ مذکورہ اجماع کے علاوہ اس پر تو احادیث صحیحہ بھی موجود ہیں۔

(۸) مدت رضاعت کی مثال

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین۔ (الایہ بقرہ ۲۳۳)

اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس۔ (احمد رضا) ۲-۲۳۳

اور خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حکم و فتویٰ ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ،

سمعت عمر رضی اللہ عنہ یقول لا رضاع الا فی الحولین فی الصغر۔

یعنی میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ رضاعت نہیں مگر مہد کے دو سال میں، بیہقی ص ۴۶۲ ج ۷۔

مفتی صاحب کے اصول کے مطابق اس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے مگر احناف کے نزدیک مدت رضاعت اڑھائی سال ہے (قدوری ص ۱۶۹) جس سے واضح ہے کہ حنفیہ نے مدت رضاعت کو اڑھائی سال قرار دیکر امت کے اس اجماع کی بھی مخالفت کی ہے۔

(۹) طلاق غلام کی مثال

امام عبداللہ بن عتبہؓ بیان کرتے ہیں کہ

عن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ انه قال ینکح العبد امرا تین (هذا خطأ والصواب امرأة) و یطلق تطلیقتین و تعتد الامة حیضتین فان لم تکن حیض فشهیرین او شهرا و نصفاً۔

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر غلام عورت سے نکاح کرے پھر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو صرف دو طلاقیں دینے کا اختیار رکھتا ہے، اس کے بعد تیسری طلاق کا اختیار نہیں اور باندی کی عدت دو طہر ہے اگر حیض نہ آتا ہو تو تب ڈیڑھ دو ماہ اس کی عدت ہے، السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۴۲۵ ج ۷۔

حافظ ابن حجر نے اس روایت کو صحیح کہا ہے، التلخیص الحمیر ص ۲۳۳ ج ۳۔

یہی مؤقف و فتویٰ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تھا، چنانچہ امام سلیمان بن یسار بیان کرتے ہیں کہ

ان نفیعا مکاتبا کان لام سلمة زوج النبی ﷺ او عبدا كانت تحته امرأة حرة فطلقها اثنتین ثم اراد ان یرا جمعها فامرہ ازواج النبی ﷺ ان یأتی عثمان بن عفان فیسئلہ عن ذلک فلقیہ عند الدرج اخذاً بید زید بن ثابت فسالها فابتدراہ جمیعاً فقال حرمت علیک حرمت علیک۔

یعنی ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ایک مکاتب غلام نفعی نے اپنی ایک حرہ بیوی کو دو طلاقیں دینے کے بعد رجوع کرنا چاہا مگر امہات المؤمنین رضی اللہ عنہم نے کہا کہ پہلے جا کر امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ پوچھ لو، چنانچہ نفعی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا (مقام) درج پر ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، سوال مذکورہ کے جواب میں دونوں نے کہا کہ تمہاری یہ بیوی تجھ پر حرام ہوگئی ہے اب تم اس سے رجوع نہیں کر سکتے

موطا امام مالک ص ۵۲۳ و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۸۳ ج ۵۔

ان دونوں صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ غلام کو صرف دو مرتبہ ہی طلاق دینے کا حق ہے، اور اس پر مفتی صاحب کے اصول کے مطابق امت کا اجماع ہو چکا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حنفیہ نے اپنے بنائے ہوئے اصول کی مخالفت کر کے اجماع امت کو توڑ دیا ہے کہ اگر غلام کی عورت حرہ ہو تو اس کی تین طلاقیں ہوں گیں (ہدایہ ص ۳۵۹ اولین)

(۱۰) عدت خلع کی مثال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

عدة المختلعة حیضة، یعنی خلع کی عدت فقط ایک حیض ہے،

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۱۴ ج ۵، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس فیصلہ میں میں

نے نبی ﷺ کی حدیث کی پیروی کی ہے، سنن ابن ماجہ ص ۱۴۹۔

الغرض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ تھا کہ عدت خلع ایک حیض ہے، اور اس کے موافق حدیث صحیح صریح بھی مروی ہے اور قرآن کے سیاق و سباق کا بھی یہی مفاد ہے، اور مفتی صاحب کے اصول کے موافق خلافت عثمانی میں اس پر امت کا اجماع بھی ہو گیا ہے، لیکن کس قدر ستم کی بات ہے کہ حنفیہ نے اپنے بنائے اصول اجماع کی مخالفت کرتے ہوئے خلع کی عدت تین حیض قرار دی ہے۔

(۱۱) زبردستی طلاق کی مثال

متعدد معتبر روایات سے مروی ہے کہ اگر شوہر سے زبردستی طلاق حاصل کی گئی ہو تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اس طلاق کو کالعدم اور غیر واقع مانتے تھے، مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۱ ج ۵، و سنن سعید بن منصور ص ۲۷۱ ج ۱ والمحملی بالاثار ص ۶۲۳ ج ۹۔

ظاہر ہے کہ مفتی صاحب کے اصول کے موافق اس پر بھی امت کا اجماع ہو چکا ہے، لیکن ان خلفائے راشدین کے حکم و فتویٰ اور قانون و دستور کے باوجود حنفیہ نے ایسی طلاق کے واقع ہو جانیکا فتویٰ دیکر اس کی مخالفت کی ہے۔

(۱۲) بدمست آدمی کی طلاق

مختلف اور معتبر سندوں سے مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حالت نشہ میں دی ہوئی طلاق کو غیر واقع مانتے تھے، ابن ابی شیبہ ص ۳۹ ج ۵، اسی پر ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا فتویٰ تھا، ایضاً، مفتی صاحب کے اصول کے ماتحت یہ بھی اجماع امت ہے مگر احناف نے ایسی طلاق کے واقع ہو جانیکا فتویٰ صادر کر کے اجماع امت کی مخالفت کی ہے۔

(۱۳) نکاح سے پہلے طلاق کی مثال

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (۳) حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ (۴) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (۵) حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ (۶) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (۷) حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ (۸) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ (۹) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے متعدد و مختلف اسناد و الفاظ سے فرمان نبوی مروی ہے کہ نکاح سے پہلے دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

ابو داود ص ۱۵۳ ج ۱، و ترمذی مع تحفہ ص ۱۱۳ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۱۴۸، و دارقطنی ص ۱۲ ج ۳، و بیہقی ص ۳۱۸ ج ۷، مصنف عبدالرزاق (۱۳۸۹)، و حاکم ص ۲۰۵-۲۲۰ ج ۲، و شرح السنہ ص ۱۹۸ ج ۹، و نصب الراية ص ۲۳۱ ج ۳، و درمنثور ص ۲۰۸ ج ۵، و التلخیص الحبیر ص ۲۱۰ ج ۳، و مسند احمد ص ۲۷۶ ج ۶، و ابن ابی شیبہ ص ۴۹ ج ۵، و طبرانی کبیر ص ۲۸ ج ۱۱، و مجمع الزوائد ص ۱۸۷، ۳۳۲ ج ۴، یہی حکم و فتویٰ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۲۱۴ ج ۲،

مفتی صاحب کے دستور و اصول کے مطابق یہاں بھی امت کا اجماع ہی ہے مگر حنفیہ کے نزدیک نکاح سے پہلے دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے، انصاف شرط ہے کیا حنفیہ نے یہاں پر اجماع امت کی مخالفت کی ہے کہ نہیں۔

(۱۴) ہدم طلاق کی مثال

(۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۲) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (۳) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (۴) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ (۵) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ (۶) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۷) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۸) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۹) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (۱۰) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ کرام سے صراحت و ضاحت سے مروی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی عورت منکوحہ کو ایک یا دو عد و طلاقیں دی تھیں اور وہ عورت عدت گزار کر کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لیتی ہے لیکن قدرت و اتفاقاً اس کا دوسرا شوہر فوت ہو جاتا ہے یا طلاق دے دیتا ہے، اب اس عورت نے دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح شرعی کر لیا تو اب یہ ماننا پڑھے گا کہ اس کے پہلے خاوند کو فقط ایک ہی

طلاق کا حق حاصل ہے،

ابن ابی شیبہ ص ۱۰۲ تا ۱۰۵ ج ۵، والسنن الکبریٰ للبیہقی ص ۶۲ تا ۶۵ ج ۷۔

ظاہر ہے کہ مؤلف جاء الباطل کے اصول کے موافق یہ امت مرحومہ کا اجماع ہے، لیکن کتنے ستم کی بات ہے کہ حنفیہ کے نزدیک ایسے مرد کو از سر نو تینوں طلاقوں کا حق حاصل ہے،

(۱۵) ایلاء کی مثال

امام سعید بن مسیبؒ بیان کرتے ہیں کہ

ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کان یقول اذا مضت اربعة أشهر فہی تطليقة وھی املک بردھا مادامت فی عدتها۔

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب مدت ایلاء ختم ہو جائے تو ایلاء شدہ عورت پر رجعی طلاق واقع ہو جائے گی،
سنن دارقطنی ص ۶۳ ج ۴۔

مولانا محمد شمس الحق محدث عظیم آبادیؒ بیان کرتے ہیں کہ
قاضی اسماعیلؒ نے، الاحکام، میں سعید بن جبیرؒ کے طریق سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ

مدت ایلاء گزرنے پر ایلاء کرنے والے سے مطالبہ رجوع یا مطالبہ طلاق کیا جائے گا، التعلیق
المغنی علی السنن دارقطنی ص ۶۳ ج ۴۔

گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ اثر کا مطلب یہ ہے کہ مدت ایلاء گزرنے پر ایلاء کرنے والے شوہر سے بذریعہ سرکاری فرمان یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ ایلاء سے رجوع کر لیا یا پھر طلاق دے دو، اس موقع پر اگر شوہر رجوع نہ کرے تو اسے طلاق دینی پڑے گی اور اس کی دی ہوئی یہ طلاق رجعی ہوگی۔

یہی موقف حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ہے، چنانچہ عمر بن سلمہ اور عبدالرحمن ابن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ

عن علی فی الایلاء، قال، یوقف بعد الاربعۃ، فاما ان ینفی وأما ان یطلق.
یعنی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مدت ایلاء گزرنے پر ایلاء کرنے والا شوہر یا تو رجوع کرے یا طلاق دے،

سنن دارقطنی ص ۶۱ ج ۴، ومعنی فی المصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۳۱ ج ۵۔
حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان قرآن کریم کے سیاق و سباق کے بالکل مطابق ہے، اور یہ معلوم ہے کہ عدالتی فیصلہ جات میں ان کا مقام بہت بلند ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمین کا قاضی و حاکم بنا کر بھیجا تو ان کے حق میں توفیق قضاء کی دعا کی تھی۔
ابوداؤد ص ۱۲۸ ج ۲، وابن ماجہ ص ۱۶۸، ومسند احمد ص ۸۳ ج ۱، ونبھتی ص ۶۷ ج ۱، ومستدرک حاکم ص ۹۳ ج ۴۔

عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو امت کا سب سے بڑا اور عمدہ قاضی کہا ہے، ظاہر ہے کہ خلفائے راشدین کا مذکورہ فیصلہ مفتی صاحب کے اصول کے موافق پوری امت کا اجماعی فیصلہ ہے مگر اس کے برعکس مؤلف جاء الباطل کے تقلیدی مذہب میں مدت ایلاء گزرنے پر خود بخود طلاق بائن پڑ جائے گی اور شوہر کو رجوع کا حق نہیں رہے گا۔ (قدوری ۱۷۹)

(۱۶) حد چوری کی مثال

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ زیادہ سے زیادہ تین درہم اور بعض روایات میں پانچ درہم کی قیمت والی چوری پر چور کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے، مصنف ابن ابی شیبہ ص ۴۷۰ ج ۹، وعبدالرزاق ص ۲۳۶ ج ۱۰، ونبھتی ص ۲۵۹ ج ۸۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اترج (لیموں) کی چوری پر ہاتھ کاٹ دیتے تھے، جبکہ اترج کی قیمت ربع دینار (تین درہم) کے برابر تھی،

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۴۷۲ ج ۹، وعبدالرزاق ص ۲۳۷ ج ۱۰، ونبھتی ص ۲۵۵ ج ۸۔

ربع دینار پر ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ خلیفہ راشد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے،

ابن ابی شیبہ ص ۴۷۰ ج ۹، وعبدالرزاق ص ۲۳۷ ج ۱۰، ونبھتی ص ۲۶۰ ج ۸۔

خلفائے راشدین کا مذکورہ فتویٰ حدیث نبوی علیہ السلام کے عین مطابق ہے، کیونکہ بہت سی صحیح احادیث میں یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چوتھائی دینار (تین درہم) کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا،

صحیح بخاری ص ۱۰۰۴ ج ۲، و مسلم ص ۶۳ ج ۲۔

مفتی صاحب کے اصول سے یہ مسئلہ بھی اجماعی ہے مگر احناف نے اس مسئلہ میں بھی خلفائے راشدین کے حکم و فتویٰ کی خلاف عمل کرتے ہوئے کہا ہے کہ کم از کم دس درہم یا ایک دینار کی چوری پر ہاتھ کاٹنا جائیگا۔ ہدایہ ص ۵۳۷ اولین)

(۱۷) سزائے لوطی کی مثال

امام ابی حصینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے محاصرہ کے موقع پر لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ چار اسباب میں سے کسی ایک کی وجہ سے کسی مسلمان کا خون جائز ہوا کرتا ہے،

(۱) قتل کرنا (۲) شادی کے بعد زنا کرنا (۳) مرتد ہونا (۴) لوٹے بازی کرنا، مصنف ابن

ابی شیبہ ص ۴۱۲ ج ۹، نصب الراية ص ۳۴۲ ج ۳۔

یہی فتویٰ سیدنا علی مرتضیٰ کا ہے، مصنف ابن ابی شیبہ ص ۵۳۰ ج ۹، و بیہقی ص ۲۳۲ ج ۸، مگر حنفیہ نے مذکورہ فتاویٰ عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی ہے، کہ لوطی پر حد نہیں تعزیر ہے ہدایہ اولین ص ۵۱۶) حالانکہ مفتی صاحب کے اصول کے موافق یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

(۱۸) بٹائی پر کھیتی کی مثال

متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ

رسول اللہ و نے خود مزارعہ کا معاملہ کیا اور آپ علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر خلفائے راشدین کے زمانہ تک اور بعد میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام تابعین عظام اور عامۃ المسلمین میں مزارعہ کا رواج عام رہا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، اور تمام خلفائے راشدین نے اسے اپنے اپنے دور خلافت میں برقرار و جاری رکھا۔

صحیح بخاری ص ۳۱۳ ج ۱، (باب المزارعة) اور ابن ابی شیبہ ص ۳۳۷ تا ۳۴۲ ج ۶۔ میں صراحت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، نیز جملہ مہاجرین و انصار بذات خود مزارعہ کرتے تھے، ظاہر ہے کہ مفتی صاحب کے اصول کے موافق اس پر امت مرحومہ کا اجماع ہو چکا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک مزارعہ فاسد ہے۔ (المحرم الرائق ص ۱۵۹ ج ۸)

(۱۹) مسئلہ وقف کی مثال

کتب احادیث میں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حکم نبوی کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی جائیدادیں دینی امور کیلئے وقف کر دی تھیں، اس سلسلہ میں، ہلال الرائی، حنفی کی ایک کتاب الوقف بھی ہے مگر امام ابو حنیفہ وقف کو جائز نہیں مانتے حالانکہ حنفی حضرات (بشمول بریلوی مکتب فکر) کے عام دینی مدارس اوقاف ہی کی آمدنی سے عموماً چلتے ہیں۔

(۲۰) گوہ کے گوشت کی مثال

احادیث نبویہ میں گوہ کا گوشت کھانے کی اجازت موجود ہے اسی کے مطابق عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بھی تھا، حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک گوہ کا گوشت مرغ سے زیادہ پسندیدہ ہے، مصنف ابن ابی شیبہ ص ۸۴ ج ۸۔

مزید کہا کرتے تھے کہ کاش ہر سوراخ میں دو عدد گوہ ہوا کریں تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ کھا سکیں، ایضاً ص ۸۳ ج ۸۔

آپ سے یہ مروی ہے کہ

ان الله لينفع بالضب فانه لطعام عامة الرعاء و لو كان عندی لطعمت منه.

یعنی اللہ تعالیٰ نے گوہ کا گوشت نفع بخش بنا رکھا ہے اس کا گوشت عام چرواہوں کی غذا ہے اگر وہ مجھے ملے تو میں بھی اس سے کھاؤں۔

ابن ابی شیبہ ص ۸۳ ج ۸، و بیہقی ص ۳۲۲ ج ۹۔

عصمتہ بن ربیع فرماتے ہیں کہ

قد منا علی عمر نحن اناس سمان حسنة هيئتنا، قال فقال ما طعامكم؟ قلنا الضباب قال فقال عمر، ويجزىكم؟ قلنا، نعم، فقال وددت ان مع كل ضب مثله. یعنی ہم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو ہمارے جسم بھر پور، اور شکل و صورت اچھی تھی، اس پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگ بھلا کیا چیزیں کھایا کرتے ہو کہ اس طرح تندرست اور اچھی شکل و صورت والے ہو؟ تو ہم نے جواب دیا کہ ہم لوگ گوہ کا گوشت کھایا کرتے ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گوہ کا گوشت کیا تمہیں کفایت کرتا ہے اور اس سے غذا کا کام پورا ہو جاتا ہے؟ ہم نے کہا جی ہاں! اس پر آپ نے فرمایا کاش دنیا میں پانی جانے والی گوہ کی مقدار دو گنا ہو جائے،

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۸۵ ج ۸۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ گوہ کا گوشت حلال و مباح سمجھتے تھے، مگر حنفی مذہب میں اس کے خلاف گوہ کے گوشت کو ممنوع و مکروہ کہا گیا ہے (قدوری ص ۲۲۰ و ہدایہ ص ۲۷۲ ج ۲)۔

تک عشرين کاملہ

اس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جس میں مفتی صاحب کے تقلیدی مذہب نے خلفائے راشدین کے حکم و فیصلہ کے خلاف فتویٰ دیا ہے، مگر اختصار کی وجہ سے انہیں میں مسئلہ پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

کیا جمہور کی مخالفت گمراہی ہے؟

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

جمہور علماء خصوصاً چاروں اماموں کا یہی مذہب ہے کہ ایک دم تین طلاقیں دینے سے تین ہی

واقع ہوگی اس کی مخالفت امت مسلمہ کی مخالفت ہے جو گمراہی ہے، جاء الباطل ص ۴۶۰ ج ۱۔
مزید فرماتے ہیں کہ

ایکدم دی ہوئی تین طلاقوں سے ایک ہی واقع ہوتی ہے، یہ سوائے ابن تیمیہ حنبلی کے اور کسی نے بھی نہیں کہا ہے اور ابن تیمیہ کی خود اس مذہب کے اماموں نے تردید کر دی، علماء فرماتے ہیں کہ ابن تیمیہ گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہے، جاء الباطل ص ۴۵۵ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ پہلے تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ ایکدم تین طلاقوں کو ایک قرار دینے میں امام ابن تیمیہ "منفرد نہیں بلکہ قرآن و حدیث کے دلائل کے علاوہ ایک جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام اور فقہائے دین امام ابن تیمیہ کے ساتھ ہیں۔

ثانیاً۔ امام ابن تیمیہ کو گمراہ و بے دین کہنے والے خود جاہل اور دینی علوم سے کورے چٹے ہیں جو ایک مومن و موحد کی تکفیر کر کے بموجب فرمان نبوی مکفر کی طرف کفر لوٹ گیا ہے، حنفی علماء سے معذرت سے عرض ہے کہ معاصرانہ چشمک سے کون محفوظ رہا ہے اگر اعتبار نہ ہو تو، تاریخ بغداد کی جلد ۱۳، میں امام ابو حنیفہؒ کے متعلق ان کے معاصرین کی آراء کو پڑھ لیجئے گا۔

ثالثاً۔ اصول فقہ حنفیہ میں صاف لکھا ہے کہ دلائل شرعی چار ہیں (۱) قرآن (۲) حدیث (۳) اجماع امت (۴) قیاس شرعی، اس سے واضح ہے کہ احناف کے نزدیک بھی جمہور کوئی شرعی دلیل نہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب جان بوجھ کر غلط بیانی کرتے ہوئے کوئی شرم و عار محسوس نہیں کر رہے کہ جمہور کو بھی دلیل شرعی باور کر رہے ہیں پھر دلیل بھی ایسی کہ جس کے مخالف کو گمراہ باور کر رہے ہیں۔

ہم نو نقد نہ تیرا ادھار کے تحت یہاں پر چند ایسے مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں جو فقہ حنفی کے جمہور امت کی خلاف ہیں، امید ہے کہ اس آئینہ میں علمائے بریلویہ اپنا منہ دیکھ کر مناسب اظہار خیال فرمائیں گے، ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

(۱) جانور کو ادھار لینا

حضرت ابی رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ
ان رسول اللہ ﷺ استسلف من رجل بکرا۔
یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے جو انٹ ادھار لیا۔
صحیح مسلم ص ۳۰، ج ۲، مشکوٰۃ ص ۲۵۱، و نسائی ص ۲۱۹ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جانور کو ادھار لیا جاسکتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک
جانور کو ادھار لینا جائز نہیں (قدوری ۰۰)، حالانکہ امت مرحومہ کے جمہور علماء کا فتویٰ جواز کا ہے، امام
نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں،

مذهب الشافعی و مالک و جماہیر العلماء من السلف والخلف انه یجوز
قرض جمیع الحيوان و مذهب ابی حنیفہ انه لا یجوز قرض من الحيوان و هذا
الاحادیث ترد علیہم، ملخصاً شرح صحیح مسلم. ص ۳۰ ج ۲،
ملا علی القاری حنفی مشکوٰۃ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

وفیه جواز اقراض الحيوانات کلها وهو مذهب مالک والشافعی وجماہیر
العلماء من الخلف و السلف و مذهب ابی حنیفہ انه لا یجوز والا حادیث
الصحیحة ترد علیہ، مرقاة ص ۹۹ ج ۲۔

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ

یعنی امام شافعی امام مالک اور جمہور علماء سلف و خلف کا یہ مذهب ہے کہ تمام جانوروں کو ادھار
لینا جائز ہے، لیکن امام ابو حنیفہ کا یہ موقف ہے کہ جانوروں میں سے کسی کا بھی ادھار لینا جائز نہیں
اور یہ احادیث صحیحہ ان کے موقف و مذهب کی تردید کرتی ہیں۔

یہی بات علامہ شوکانی نے، نیل الاوطار ص ۲۴۴ ج ۵ میں کہی ہے۔

(۲) جانور کو کمی و بیشی سے فروخت کرنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

جاء عبد فبايع النبي ﷺ على الهجرة و لم يشعرا نه عبد ف جاء سيدة يريده فقال له النبي ﷺ بعنيه فاشتراه بعبدین اسودین ثم لم يبايع احداً بعده حتى يساله اعبد هو.

یعنی ایک غلام نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ علیہ السلام کے ہاتھ پر ہجرت کی بیعت کی، اور آپ ﷺ کو معلوم نہ تھا کہ یہ غلام ہے، پھر اس کا مالک آیا جس کی خواہش تھی کہ وہ اسے لے جائے، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اسے میرے ہاتھ فروخت کر دے، چنانچہ آپ علیہ السلام نے دو کالے غلام دیکر اسے خرید لیا اس کے بعد آپ ﷺ کسی سے بیعت نہ لیتے تھے جب تک یہ معلوم نہ کر لیتے کہ یہ غلام ہے (یا آزاد) صحیح مسلم ص ۲۳۰ ج ۲، و نسائی ص ۲۲۰ ج ۲، و ترمذی مع تحفہ ص ۲۳۹ ج ۲۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں،

(۱) نبی ﷺ عالم الغیب نہ تھے جس کی وجہ سے آپ نے غلام کو آزاد جان کر اسکی بیعت قبول فرمائی اور بعد میں دریافت کر کے بیعت لیتے رہے۔

(۲) کسی جاندار کو کمی و بیشی کے ساتھ فروخت کیا جاسکتا ہے، کسی جانور کو کمی و بیشی سے فروخت کرنے کے جواز کا مذہب و موقف جمہور امت کا ہے مگر امام ابو حنیفہ نے اس کی مخالفت کی ہے، امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں،

فان باع عبدا بعدين او بعيرا بعيرين الى اجل فمذهب الشافعي والجمهور جوازه وقال ابو حنيفة والكوفيون لا يجوز.

یعنی اگر ایک غلام کو دو غلاموں کے عوض یا ایک اونٹ کو دو اونٹوں کے بدلے، مدت مقرر کر کے فروخت کرے، تو امام شافعی اور جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے اور امام ابو حنیفہ اور کوفی علماء کے نزدیک ناجائز ہے، شرح صحیح مسلم ص ۳۱ ج ۲۔

(۳) مال کی تیسرے حصہ سے زیادہ کی وصیت کرنا

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

عَادَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي حِجَةِ الْوُدَاعِ مِنْ وَجَعِ اشْفَيْتَ مِنْهُ عَلَى الْمَوْتِ
قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بَلِّغْ بِي مَا تَرَى مِنَ الْوَجَعِ وَأَنَا ذُو مَالٍ وَلَا يَرِثُنِي إِلَّا ابْنَتِي لِي
وَاحِدَةٌ أَفَا تَصَدَّقُ بِثَلَاثِي مَالِي قَالَ لَا، قُلْتُ أَفَا تَصَدَّقُ بِشَطْرِهِ قَالَ لَا الثَّلَاثُ وَ الثَّلَاثُ

كثِير. الْحَدِيث

یعنی رسول اللہ ﷺ حجتہ الوداع کے موقع پر میری عیادت کیلئے تشریف لائے، اور میں ایسی درد میں مبتلا تھا کہ موت کے قریب ہو گیا تھا، میں نے عرض کی کہ مجھے جیسا درد ہے وہ آپ علیہ السلام جانتے ہیں، اور میں مال دار آدمی ہوں جبکہ میرا وارث سوائے ایک بیٹی کے اور کوئی نہیں ہے، تو کیا میں اپنا دو تہائی مال خیرات کر دوں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں! میں نے عرض کی آدھا خیرات کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، صرف تیسرا حصہ ہی صدقہ کر دو اور یہی کافی ہے۔

بخاری ص ۱۷۳ ج ۱، ص ۳۸۳ و ص ۵۶۰ و ص ۶۶۲ و ص ۸۰۶ و ص ۸۴۵ و ص ۸۴۶ و ص ۹۴۳ و ص ۹۹۷ صحیح مسلم ص ۳۹ ج ۲۔ واللفظ لہ۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ تیسرے حصے سے زیادہ کی وصیت کرنی جائز نہیں، مگر حنفیہ کے نزدیک اگر وارث نہ ہو تو تب تیسرے حصے سے زیادہ کی وصیت کرنی جائز ہے، حالانکہ یہ موقف جمہور امت کے خلاف ہے، امام نووی فرماتے ہیں

فمذهبنا و مذهب الجمهور انه لا يصح وصيته فيما زاد على الثلث و جوزة ابو حنيفة و اصحابه.

یعنی ہمارا اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تیسرے حصہ مال سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں، جبکہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اس کو جائز بتاتے ہیں،

شرح صحیح مسلم ص ۳۹ ج ۲ حافظ ابن حجر نے، فتح الباری ص ۲۸۴ ج ۵ میں اور علامہ شوکانی نے، نیل الاوطار ص ۴۲ ج ۶۔ میں یہی موقف جمہور کا بیان کر کے حنفیہ کو ان کا مخالف لکھا ہے۔

(۴) آقا لونڈی پر حد قائم کر سکتا ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ سئل عن الامة اذا زنت ولم تحصن قال ان زنت

فاجلدوها ثم ان زنت فاجلدوها ثم ان زنت فاجلدوها ثم بيعوها ولو بضعفیر.

یعنی رسول اللہ ﷺ سے اس باندی کے متعلق سوال ہوا جو کہ محضہ نہیں، اور زنا کرے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ، پھر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ، پھر اگر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ، پھر اسے فروخت کر دو خواہ قیمت میں ایک رسی ہی آئے، بخاری ص ۱۰۱۱ ج ۲، و مسلم ص ۷۰ ج ۲، و موطا امام مالک ص ۶۸۷، و مسند احمد ص ۱۱۷ ج ۴، و بیہقی ص ۲۳۳ ج ۸، و ابو دؤد (۴۶۹) یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آقا اپنی لونڈی پر حد قائم کر سکتا ہے، اور یہ جمہور علماء کا مذہب ہے، چنانچہ ملا علی القاری الحنفی امام نووی سے نقل کرتے ہیں، کہ

فيه دليل على ان السيد يقيم الحد عليهما (ای الاماء والعبد) و هذا مذهبنا و مذهب مالک و احمد و جماهير العلماء و من الصحابة و التابعين فمن بعدهم و قال ابو حنيفة ليس له ذلك.

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے کہ آقا اپنے غلام اور لونڈی پر حد قائم کرے اور یہی مذہب ہمارا، امام مالک، امام احمد، اور جمہور علماء صحابہ کرام تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے علماء کرام کا ہے، جب کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک آقا اپنی لونڈی پر حد قائم کرنے کا مجاز نہیں ملخصاً، مرقاة ص ۱۳۸ ج ۷۔

نوٹ۔ امام نووی کی عبارت شرح مسلم ص ۷۰ ج ۲، میں دیکھی جاسکتی ہے، مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی فرماتے ہیں کہ

اذا زنت فاجلدوها ظاهر الحديث ان الخطاب الى الملاك فيفيد جواز اقامة السيد على عبده وامته الحدودية قال مالک والشافعي و احمد و الجمهور من الصحابة و التابعين و من بعدهم خلافا للحنفية.

یعنی جب زنا کرے تو کوڑے لگاؤ، ان الفاظ میں ظاہراً لونڈی کے آقا کو خطاب ہے اور یہ الفاظ اس چیز کا فائدہ دیتے ہیں کہ آقا اپنے غلام اور لونڈی پر حد قائم کرے، اور یہ قول ہے امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور صحابہ کرام اور تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے علماء کا ہے حنفیہ کے خلاف،
التعلیق المجید ص ۳۰۹۔

(۶) گھر میں اعتکاف

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

وَلَا تَبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسْجِدِ . (البقرہ ۱۸۷)

اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو۔ (ترجمہ احمد رضا خاں)
یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کیلئے مسجد شرط ہے اور اس سلسلہ میں صحیح حدیث مرفوع بھی مروی ہے کہ

وَلَا اعْتِكَافُ إِلَّا فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ، یعنی اعتکاف نہیں مگر مسجد میں،

سنن ابوداؤد ص ۳۳۵ ج ۱، و سنن دارقطنی ص ۲۰۱ ج ۲، و بیہقی ص ۳۱۵ ج ۴۔

لیکن اس کے برعکس حنفیہ کا موقف یہ ہے کہ عورت گھر میں اعتکاف بیٹھ سکتی ہے، اور یہ جمہور امت کے تعامل کے خلاف ہے،

امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

وهذا الذى ذكرنا من اختصاصه بالمسجد وانه لا يصح فى غيره هو مذهب

مالك و الشافعى و احمد و الجمهور سواء الرجل والمرأة و قال ابو حنيفة يصح

اعتكاف المرأة فى مسجد بيتها و هو المواضع المهيأة من بيتها لصلوتها قال ولا

يجوز للرجل فى مسجد بيته .

یعنی جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ اعتکاف کیلئے مسجد ضروری ہے اور مسجد کے علاوہ اور کسی جگہ

اعتکاف صحیح نہیں، یہ مذہب ہے امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور علماء کا ہے، معتکف

خواہ مرد ہو یا عورت، مگر ان سب کے خلاف امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ عورت کیلئے گھر کی مسجد میں اعتکاف بیٹھنا درست ہے، لیکن مرد کیلئے جائز نہیں اور گھر کی مسجد سے مراد وہ جگہ ہے جسے نماز کیلئے تیار کیا گیا ہو،

شرح صحیح مسلم ص ۱۳۷ ج ۱۔

مولانا فخر الحسن حنفی دیوبندی نے بھی، حاشیہ سنن ابی داؤد ص ۳۳۵ ج ۱، میں اس عبارت کو نقل کر کے اقرار کیا ہے کہ جمہور علماء کا یہی مذہب و موقف ہے کہ اعتکاف کیلئے مسجد جامع شرط ہے معتکف خواہ مرد ہو یا عورت۔

(۷) اشعار بدن

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ

فَلَمَّا قَلَّ بَدَنُ النَّبِيِّ ﷺ بَدَى ثَمَّ قَلْدَهَا وَاشْعَرَهَا وَاهْدَاها وَمَا حَرَّمَ عَلَيْهِ

شَيْءٌ كَانَ أَحْلَ لَهُ.

یعنی نبی ﷺ کے اونٹوں کیلئے میں نے اپنے ہاتھ سے ہار بٹے پھر آپ علیہ السلام نے ان کے گلوں میں ڈالے، ان کو زخمی کیا اور ان کو ہدی بنا کر مکہ کی طرف بھیجا، آپ علیہ السلام پر کوئی چیز حرام نہ ہوئی جو آپ کیلئے حلال کی گئی تھی،

بخاری ص ۲۳۰ ج ۱، و مسلم ص ۲۲۵ ج ۱۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الظَّهْرَ بَذَى الْحَلِيفَةُ ثَمَّ دَعَا بِنَاقَتِهِ فَاشْعَرَهَا فِي صَفْحَةِ

سِنَانِهَا الْيَمَنِ وَسَلَّتِ الدَّمَ وَقَلْدَهَا نَعْلَيْنِ ثَمَّ رَكِبَ رَاحِلَتَهُ فَلَمَّا اسْتَوَتْ بِهِ عَلَى

الْبَيْدَاءِ أَهَلَ الْحَجَّ.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ذی الحلیفہ میں ظہر کی نماز پڑھی پھر اپنی اونٹنی منگوائی اس کے دائیں کوہان کے کنارے پر زخم کیا، اس کا خون صاف کیا اور دو جوتوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا پھر اس پر سوار ہوئے جب وہ آپ علیہ السلام کو مقام بیداء میں لے آئی تو آپ نے حج کی لبیک کہی،

صحیح مسلم ص ۴۰۷ ج ۱۔

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ اشعار بدن (اونٹ کو زخمی کرنا) سنت خیر الانام ﷺ ہے، اور جمہور امت اس کو مسنون جان کر اس پر عامل ہے مگر امام ابو حنیفہ اس کو بدعت کہتے ہیں۔
امام نووی فرماتے ہیں کہ

ففي هذا الحديث استحباب الاشعار والتقليد في الهدايا من الابل و بهذا قال جماهير العلماء من السلف و الخلف و قال ابو حنيفة الاشعار بدعة لانه مثله وهذا يخالف الاحاديث الصحيحة المشهورة في الاشعار.

یعنی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اشعار اور قربانی کے جانوروں (اونٹوں) کی گردنوں میں جوتوں کا ہار ڈالنا مستحب ہے اور یہ جمہور علماء سلف و خلف کا موقف ہے لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اشعار بدعت ہے کیونکہ یہ مثلہ کی ایک قسم ہے، شرح صحیح مسلم ص ۴۰۷ ج ۱۔

اس طرح حافظ ابن حجر نے، فتح الباری ص ۴۲۸ ج ۳، میں اشعار بدن کو جمہور کا مذہب بتا کر ابو حنیفہ سے اس کے خلاف نقل کیا ہے۔

(۸) کافر حرمین شریفین میں جا سکتا ہے

ياايهاالذين امنوا انماالمشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا، الايه. سورة توبه آيت ۲۸.

اے ایمان والوں مشرک نرے ناپاک ہیں تو اس برس کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں۔ (احمد رضا خان)۔

یہ آیت قرآنی اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی مشرک حرمین شریفین میں داخل نہیں ہو سکتا اور یہ مذہب جمہور علمائے اسلام کا ہے، اس بارے میں صحیح حدیث مرفوع بھی مروی ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ۔

بعثنی ابو بکر رضی اللہ عنہ فی الحجة النبی امرہ النبی ﷺ علیہا قبل حجة الوداع يوم النحر فی رهط امرہ ان یوذن فی الناس الا لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوفن بالبيت عریان، بخاری ص ۲۲۰ ج ۱ و مسلم ص ۴۳۵ ج ۱ و بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۲۷ باب دخول مكة و الطواف. واللفظ له

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس حج کے موقع پر جس میں انکو نبی ﷺ نے امیر بنا کر بھیجا تھا اور یہ حجۃ الوداع کے ایک سال پہلے کا واقعہ ہے، مجھے قربانی کے دن ایک جماعت میں بھیجا کہ اس بات کا اعلان کرو کہ خبردار اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی ننگا خانہ کعبہ کا طواف کرے (انتهی)

لیکن قرآن کی آیت حدیث نبوی اور جمہور امت کے برعکس امام صاحب کا قول ہے کہ ذمی حرم میں داخل ہو سکتا ہے امام نووی جمہور کا مسلک بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

فلا یجوز تمکین کافر من دخوله بحال فان دخله فی خفیة و جب اخراجه فان مات و دفن فیہ نبش و اخراج مالم یتغیر هذا مذهب الشافعی و جماہیر الفقہاء و جوز ابو حنیفة دخولهم الحرم.

شرح صحیح مسلم ص ۴۳ ج ۲.

کسی حالت میں بھی کافر کو حرم میں داخل ہونے کے قابل بنانا جائز نہیں اگر وہ خفیہ طریقہ سے داخل ہو جائے تو اس کا اخراج واجب ہے اگر وہ داخل ہونے کے بعد (حدود حرم میں) مرجائے اور وہیں دفن کر دیا گیا ہو تو اس کی قبر کو اکھاڑ کر نکال دیا جائے بشرط کہ لاش متغیر نہ ہوئی ہو یہ امام شافعی اور جمہور علماء کا مذہب ہے لیکن امام ابو حنیفہ نے حرم میں کفار کا داخلہ جائز قرار دیا ہے۔

(۹) خون مسلم کی بے قدری

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ

الا لا یقتل المؤمن بکافر. الحدیث

یعنی خبردار مسلمان کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے گا۔

ابو داؤد ج ۲ ص ۲۶۷، مسند امام احمد ص ۱۲۲ ج ۱، نسائی ص ۲۳۶ ج ۲، ابن ماجہ ص ۱۹۵، و ترمذی مع تحفہ ص ۲۳۱۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے اور یہ مسلک ہے جمہور فقہاء اسلام کا لیکن حنفیہ نے اس میں حدیث نبوی اور جمہور کی مخالفت کی ہے، چنانچہ امام نووی صیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

وقد يستدل به اصحاب ابی حنیفہ فی قولهم یقتل المسلم بالذمی و یقتل الحرب العبد و جمہور العلماء علی خلافہ منهم مالک والشافعی واللیث و احمد۔ شرح صحیح مسلم ص ۵۹ و ۶۰ ج ۲۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ

واما ترک قتل المسلم بالکافر فاخذ به الجمهور..... وخالف الحنفیة فقالوا یقتل المسلم بالذمی. فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۱۲۔

ان عبارات کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جاسکتا امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ ذمی کے بدلہ میں مومن قتل کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) ایک گواہی اور قسم سے فیصلہ کرنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قضی بيمين و شاهد.

یعنی رسول اللہ نے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کیا۔

مسلم ص ۲ ج ۲، ویتھی ص ۱۶ ج ۱۰، وابدود ص ۱۵۲ ج ۲۔

نوٹ۔ یہ حدیث تقریباً بیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، جیسا کہ علامہ ابن جوزی

نے ”التحقیق“ میں ان کو ذکر کیا ہے،

تنقیح الرواة فی تخریج احادیث مشکوٰۃ ص ۱۲۶ ج ۳۔

الغرض ان احادیث صحیحہ کا واضح مفاد یہ ہے کہ اگر مدعی اثبات دعویٰ پر دو گواہ پیش نہ کر سکے تو

ایک قسم اور گواہی پر دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اور یہ مذہب جمہور علمائے اسلام کا ہے جیسا کہ امام نووی فرماتے ہیں کہ،

قال ابو حنیفہ والکوفیون..... لا یحکم بشاهد و یمین فی شئی من

الاحکام وقال جمہور علماء الاسلام من الصحابة و التابعین و من بعد هم من

علماء الامصار یقضی بشاهد و یمین المدعی فی الاموال وما یقصد به الا موال

وبہ قال ابو بکر الصدیق و علی و عمر بن عبدالعزیز و مالک و الشافعی و احمد و

فقہاء المدینة و سائر علماء الحجاز و معظم علماء الامصار.

امام ابو حنیفہ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء نے کہا ہے کہ ایک گواہ اور ایک قسم کے ساتھ فیصلہ نہ کیا

جائے لیکن جمہور علماء اسلام صحابہ و تابعین اور ان کے بعد آنے والے علماء امصار کا مسلک یہ ہے کہ

مالی معاملات یا جن سے اموال مقصود ہوں ان میں ایک گواہ اور مدعی کی قسم سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے

اس موقف کے قائل سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضرت عمر بن

عبدالعزیز اور امام مالک شافعی امام احمد اور فقہائے مدینہ اور حجاز کے تمام علماء بلکہ اردگرد کے علماء کی

ایک بڑی جماعت شامل ہے، شرح صحیح مسلم ص ۷۷ ج ۲۔

علامہ ابن عبدالبر موطا امام مالک کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

و ممن روى عنه القضاء باليمين مع الشاهد منصوصا من الصحابة، ابو بكر
رضى الله عنه، و عثمان رضى الله عنه و على رضى الله عنه و ابى بن كعب رضى
الله عنه و عبد الله بن عمر، وان كان فى الا سانيد عنهم ضعف فانا لم نذكرهم على
سبيل الحجة لان الحجة قد لزمت بالسنة الثابتة ولا تحتاج السنة الى من يتا
بعها لان من خالفها محجوج بها ولم يات عن احدهم من الصحابة انه انكر اليمين مع
الشاهد بل جاء عنهم القول به و على القول به جمهور التابعين بالمدينة سعيد بن
المسيب و وابو سلمة بن عبد الرحمن و القاسم بن محمد و عروة و سالم و ابو بكر
بن عبد الرحمن و عبيد الله بن عبد الله و خارجة بن زيد و سلمان بن يسار و على
بن حسين و ابو جعفر محمد بن على و ابو الزناد و عمر بن عبد العزيز، و به قال
مالک و اصحابه و الشافعى و اتباعه و احمد بن حنبل و اسحاق بن راهوية و ابو
ثور و داؤد بن على و جماعته اهل الاثر هو الذى لا يجوز عنده خلافه التواتر الاثار
به عن النبى ﷺ و عمل اهل المدينة به قرنا بعد قرن،

التهميد لما فى الموطا من المعانى والا سانيد ص ۵۳ تا ۵۴ ج ۲.

اور جن سے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کرنا مروی ہے ان میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
حضرت عمر فاروق، رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابی بن کعب
رضی اللہ عنہ، اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، شامل ہیں، اگرچہ ان میں بعض کی اسناد میں
ضعف ہے لیکن ہم نے ان کو بطور دلیل نقل نہیں کیا کیونکہ دلیل تو سنت ثابتہ ہے اور وہ (سنت) کسی
کی متابعت کی محتاج نہیں کیونکہ جس نے بھی اس کی مخالفت کی ہے وہ دلیل و حجت سے مغلوب ہے،
اور کسی ایک بھی صحابی سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس نے قضا باليمين سے انکار کیا ہو بلکہ
تمام صحابہ سے اس کے موافق ہی قول منقول ہے اور یہی قول ہے مدینہ طیبہ کے جمہور تابعین کا جن
میں سے امام سعید بن مسیب، امام ابوسلمہ عبدالرحمن، امام قاسم بن محمد، امام عروہ بن الزبیر، امام سالم،

امام ابو بکر بن عبدالرحمن، امام عبید اللہ بن عبداللہ، امام خارجہ بن زید امام سالم، امام سلمان بن یسار، امام علی بن حسین، امام ابو جعفر، امام ابو زناد، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز، رحمہم اللہ اجمعین وغیرہ ہیں اور یہی کہا ہے امام مالک اور ان کے تلامذہ امام شافعی اور ان کے متبعین نے امام احمد بن حنبل امام اسحاق بن راہویہ امام ابو عبیدہ امام ابو ثور امام داؤد بن علی اور جماعت اہل حدیث نے، اور میرے نزدیک اس کی مخالفت جائز نہیں نبی ﷺ سے متواتر آثار اور عمل اہل مدینہ اور قرن بعد قرن عامۃ المسلمین کے عمل کی وجہ سے۔

علامہ محمد بن اسماعیل امیر محدث یمنی بلوغ المرام کی شرح میں فرماتے ہیں کہ
والحدیث دلیل علی أنه یثبت القضاء بشاهدو یمین والیہ ذهب جماہیر من الصحابة و التابعین وغیرہم وهو مذهب فقہاء المدینة السبعة والہادیة و مالک و الشافعی۔ سبل السلام ص ۱۲۸۲ ج ۴۔
یعنی یہ حدیث دلیل ہے اس بات پر کہ ایک گواہ اور قسم سے دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اور اس طرف تمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام گئے ہیں اور یہی مذہب ہے مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ اور ہادیہ اور امام مالک و شافعی کا (انتہی)

(۱۱) کیا کتے کے جوٹھے برتن کو تین بار دھونا ہی کافی ہے؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ
ان رسول اللہ ﷺ قال اذا شرب الکلب فی إناء احدکم فلیغسلہ سبعاً۔
بخاری ص ۲۹ ج ۱، و مسلم ص ۱۳۷ ج ۱، و موطا امام مالک ص ۲۲، و بیہقی ص ۲۴۰ ج ۱۔

مفتی صاحب نے اس حدیث کا حسب ذیل معنی کیا ہے کہ
فرمایا نبی ﷺ نے کہ جب برتن میں کتا چاٹ جائے تو سات بار دھویا جائے۔ جاء الباطل
ص ۲۲۳ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کتے کے جوٹھے برتن کو سات بار دھونا ضروری ہے اور جمہور علماء اسلام کا یہ مذہب ہے چنانچہ علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

و فیہ وجوب غسل نجاسة ولوغ الکلب سبع مرات و هذا مذهبنا و مذهب مالک و احمد و الجماہیر و قال ابو حنیفۃ یکفی غسلہ ثلاث مرات. شرح مسلم ص ۱۳۷ ج ۱.

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے کہ کتے کے جوٹھے برتن کو سات بار دھونا واجب ہے اور یہ مذہب ہمارا ہے اور امام مالک امام احمد اور جمہور کا، لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ تین بار دھونا ہی کافی ہے (انتہی)

امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ

فاما اکثر اهل علم من الصحابة والتابعین و من بعدهم من فقهاء المسلمين فانهم يقولون ان الانا يغسل من ولوغ الکلب سبع مرات بالماء و ممن روى ذلك عنه بالطرق الصحاح ابو هريرة رضى الله عنه و ابن عباس رضى الله عنه و عروة بن الزبير و محمد بن سيرين و طاوس و عمرو بن دينار و به قال مالک والا وزاعی و الشافعی و احمد و اسحاق و ابو ثور و ابو عبيد و داؤد.

التمهيد لما فى الموطا من المعانى والا سانيد ص ۲۶۸ ج ۱۸.

زیادہ اہل علم صحابہ کرام اور تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے فقہاء اسلام کا یہ کہنا ہے کہ جب برتن سے کتا چاٹ جائے تو اسے سات بار دھونا چاہیے اور جن میں سے صحیح سند کے ساتھ یہ فتویٰ منقول ہے ان میں سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور امام محمد بن سیرین امام طاؤس امام عمرو بن دینار اور یہی کہا ہے امام مالک امام اوزاعی امام شافعی امام احمد امام اسحاق، امام ابو ثور امام ابو عبیدہ اور امام داؤد وغیرہ نے (انتہی)۔

(۱۲) نکاح کے بغیر بیوی

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا کہنا ہے کہ حاکم کا فیصلہ ظاہر و باطن نافذ ہو جاتا ہے مثال کے طور پر اگر زینب نے بکر پر جھوٹا دعویٰ دائر کر دیا کہ اس نے میرے ساتھ شادی کی تھی اور اس پر جھوٹی گواہی بھی ہو گئی اور بظاہر گواہی کو دیکھ کر قاضی نے زینب کے حق میں فیصلہ دے دیا تو اب اس عورت کو اس مرد کے ساتھ رہنا سہنا اور جماع کرنا جائز ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ

من ادعت علیہ امراة انه تزوجها و اقامت بینة فجعلها القاضی امراته ولم یکن تزوجها وسعها المقام معه وان تدعه یجا معها.

ہدایہ مع شرح فتح القدیر ص ۵۴ ج ۳.

یعنی کسی عورت نے کسی مرد پر یہ دعویٰ کیا کہ اس نے اس سے نکاح کیا ہے اور گواہ بھی گزار دیئے حج نے فیصلہ دے دیا کہ یہ اس مرد کی عورت ہے اگر واقع میں بھی نکاح نہیں ہوا، تاہم اس عورت کو اس مرد کے ساتھ رہنا سہنا اور اس سے جماع کرنا جائز اور درست ہے۔ (انتہی)

یہ مسئلہ بھی قرآن و حدیث کے علاوہ جمہور علماء اسلام کے مؤقف کے برعکس ہے چنانچہ امام نووی شرح صحیح مسلم ص ۵۷ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ

وفی هذا الحديث دلالة لمذهب مالک والشافعی واحمد و جماہیر علماء الاسلام و فقہاء الامصار من الصحابة و التابعین فمن بعدہم ان حکم الحاكم لا یحل الباطن حراما و قال ابو حنیفہ یحل الحاكم الفروج.

اس حدیث میں امام شافعیؒ امام مالکؒ احمدؒ اور جمہور علماء اسلام اور فقہاء امصار جن میں سے صحابہ کرام تابعین عظام اور ان کے بعد میں آنے والے لوگوں کے مذہب کی دلیل ہے کہ حاکم (قاضی و حج) کا فیصلہ باطناً (حقیقت میں) کسی حرام چیز کو حلال نہیں کرتا ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ حاکم کا فیصلہ شرمگاہوں کو بھی حلال کر دیتا ہے (انتہی)

جمہور کا یہی مذہب حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص ۱۴۹ ج ۱۳ میں بیان کیا ہے۔

جمہور علماء کی مخالفت کے علاوہ یہ تو صحیح حدیث نبوی کے بھی خلاف ہے چنانچہ ام المومنین

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

عن رسول اللہ ﷺ انه سمع خصومة بباب حجرته فخرج اليهم فقال انما انا

بشر و انہ یاتینی الخصم فلعل بعضکم ان یکون ابلغ من بعض فاحسب انہ قد صدق و اقضیٰ له بذلک فمن قضیت له بحق مسلم فانما هی قطعة من النار فلیاخذها او فلیترکھا۔

بخاری ص ۳۳۲ ج ۱ و ص ۱۰۶۲ ج ۲، و مسلم ص ۷۵ ج ۲۔

نبی ﷺ نے اپنے حجرے کے دروازے پر جھگڑنے کی آواز سنی تو آپ علیہ السلام باہر تشریف لے گئے اور فرمایا میں بھی بشر ہوں میرے پاس ایک مقدمہ آتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے تم میں سے کسی کی تقریر دوسرے سے عمدہ ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں وہ سچا ہے اس کے موافق فیصلہ کر دیتا ہوں پھر جس کسی کو میں ظاہری روداد پر بھروسہ کر کے دوسرے مسلمان کا حق دلا دوں وہ اس کو لے! یا چھوڑ دے (اسے اختیار ہے) میں اسے درحقیقت جہنم کا ایک ٹکڑا دلا رہا ہوں (انتہی)

اس حدیث سے تین باتیں واضح ہیں،

اولاً۔ قاضی کا فیصلہ کسی حرام چیز کو حلال نہیں کر دیتا ورنہ نبی ﷺ یہ نہ فرماتے کہ میرے فیصلہ کے بعد جو اسے ملتا ہے وہ جہنم کا ٹکڑا ہے۔

ثانیاً۔ نبی ﷺ نور نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔

ثالثاً۔ آپ علیہ السلام عالم الغیب اور ماکان و مایکون کا علم نہیں رکھتے تھے۔

(۱۳) بیع اختیار کا مسئلہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال النبی ﷺ ان المتبايعين بالخيار في بيعهما مالم يتفرقا، البخاری

ص ۲۸۳ ج ۱، و مسلم ص ۶ ج ۲۔

نبی ﷺ نے فرمایا کہ بائع و مشتری جب تک جدا نہ ہوں اپنی بیع میں اختیار رکھتے ہیں۔ (انتہی)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بائع و مشتری کو جدا ہونے سے پہلے بیع کا اختیار ہے اور یہ مذہب جمہور علماء اسلام کا ہے جب کہ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ زبان کے ساتھ محض قول و اقرار ہو

جانے کے بعد نسخ کا اختیار نہیں رہتا چنانچہ علامہ نووی شرح صحیح ص ۲۶۶ میں فرماتے ہیں کہ

هذا الحديث دليل لثبوت خيار المجلس لكل واحد من المتبايعين بعد انعقاد البيع حتى يتفرقا من ذلك المجلس بابتدائهما وبهذا قال جماهير العلماء من الصحابة والتابعين ومن بعدهم ومن قال به علي بن ابي طالب و ابن عمر و ابن عباس و ابو هريرة و ابو برة الاسلمي رضي الله عنهم و طاوس و سعيد بن المسيب و عطاء و شريح القاضي و الحسن البصري و الشعبي و الزهري و الاوزاعي و ابن ابي ذئب و سفيان بن عيينة و الشافعي و ابن المبارك و علي بن المديني و احمد بن حنبل و اسحاق بن راهويه و ابو ثور و البخاري و سائر المحدثين و اخرون الى عن قال و قال ابو حنيفة لا يثبت خيار المجلس.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بائع و مشتری کو اپنی بیع منسوخ کرنے کا اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں، جمہور علماء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے اہل علم کا یہی مذہب ہے اور اس مذہب کے قائلین میں سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ابو برة رضی اللہ عنہ (تابعین سے) امام طاؤس امام سعید بن مسیب امام عطاء قاضی شریح امام حسن، بصری امام شععی امام زہری امام اوزاعی امام ابن ابی ذئب امام سفيان امام شافعی امام عبداللہ بن المبارک امام علی مدینی امام احمد بن حنبل امام اسحاق بن راہویہ امام ابو ثور اور امام بخاری ان کے علاوہ تمام محدثین وغیرہم ہیں جبکہ اس کے برعکس امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ بیع میں اختیار ثابت نہیں ہے۔

امام ابن عبدالبر نے اس سے چند نام زیادہ شمار کیئے ہیں،

امام عبداللہ بن حسن امام ابو عیینہ امام داؤد امام طبری امام معمر امام مسلم بن خالد زنجی امام یحییٰ بن قطن امام عبدالرحمن بن مہدی وغیرہ، التہدید لما فی الموطا من المعانی والا سانید ص ۱۵ ج ۱۴۔

(۱۴) سنت الفجر کے بعد گفتگو

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتیں ہیں کہ

كان النبي ﷺ اذا صلى ركعتي الفجر فان كنت مستيقظة حدثني الحديث بخاری ص ۱۵۵ ج ۱، و مسلم ص ۲۵۵ ج ۱. واللفظ للمسلم،
یعنی نبی ﷺ جب سنت الفجر ادا فرما لیتے تو اگر میں جاگتی ہوتی تو مجھ سے باتیں کرتے۔
الحديث

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سنت الفجر کے بعد انسان گفتگو کر سکتا ہے اور یہ مذہب جمہور علماء اسلام کا ہے چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں کہ
فيه دليل على اباحة الكلام بعد سنة الفجر وهو مذهبنا و مذهب مالک و الجمهور و كرهه الكوفيون، (المنهاج شرح صحيح مسلم بن حجاج ص ۲۵۵ ج ۱).
اس حدیث میں دلیل ہے کہ سنت الفجر کے بعد کلام کرنا جائز ہے اور یہ مذہب ہمارا امام مالک اور جمہور علماء اسلام کا ہے جبکہ کوفیوں کا کہنا ہے کہ کلام کرنا مکروہ ہے۔

(۱۵) نماز صبح میں اگر سورج طلوع ہو گیا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ اذا ادرك احدكم سجدة من صلوة العصر قبل ان تغرب الشمس فليتم صلاته واذا ادرك سجدة من صلوة الصبح قبل ان تطلع الشمس فليتم صلاته. بخاری ص ۷۹ ج ۱، و مسلم ص ۲۲۱ ج ۱.
یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز عصر کی ایک رکعت سورج غروب ہونے سے پہلے پالی وہ (نماز عصر) کو پورا کرے اور جس نے صبح کی نماز میں ایک رکعت سورج طلوع ہونے سے پہلے پالی وہ (صبح کی نماز) پوری کرے۔ (انتہی)

یہ حدیث اس بات کی دلیل واضح ہے کہ اگر صبح کی نماز پڑھتے ہوئے سورج طلوع ہو جائے تو نمازی بقیہ نماز پوری کر لے اور اس کی نماز ہو جائے گی مگر حنفی فقہ میں کہا گیا ہے کہ اگر نماز کی حالت میں سورج طلوع ہوا تو نماز باطل ہو جائے گی اسکا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے پھر سب سے افسوسناک

بات تو یہ ہے کہ حنفی مذکورہ حدیث کے نصف حصے پر ایمان و یقین رکھتے ہیں کہ اگر ایک رکعت نماز عصر ادا کی تھی کہ سورج غروب ہو گیا تو اب نمازی اپنی نماز کو پورا کرے اور اس کی نماز ہو جائے گی! مگر حدیث کے اگلے حصہ پر تقلیدی آری چلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر صبح کی نماز میں سورج طلوع ہو گیا تو نماز باطل ہو جائے گی! یہ موقف مذکورہ حدیث کی مخالفت کو ہی مستلزم نہیں بلکہ جمہور امت مرحومہ کے خلاف بھی ہے چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ

هذا دليل صريح في ان من صلى ركعة من الصبح او العصر ثم خرج الوقت قبل سلامه لا تبطل صلاته بل يتمها وهي صحيحة و هذا مجمع عليه في العصر واما في الصبح فقال به مالک و الشافعي و احمد و العلماء كافة الا ابا حنيفة رضي الله عنه فانه قال تبطل صلاة الصبح بطلوع الشمس فيها لانه دخل وقت النهي عن الصلوة بخلاف غروب الشمس و الحديث حجة عليه. شرح مسلم ص ۲۲۲ ج ۱.

اس حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں دلیل ہے کہ جس نے صبح و عصر کی نماز سے ایک رکعت پڑھ لی تھی کہ پھر نماز کا وقت ختم ہو گیا نمازی کے سلام پھیرنے سے پہلے تو اس کی نماز باطل نہ ہوگی بلکہ وہ اپنی نماز کو پورا کر لے اور یہی بات درست ہے، اور نماز عصر کے باطل نہ ہونے پر علماء کا اجماع ہے لیکن صبح کی نماز کے متعلق امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل اور دیگر تمام علماء نے کہا ہے کہ نماز ہو جائے گی مگر امام ابو حنیفہؒ (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کا کہنا ہے کہ صبح کی نماز باطل ہو جائے گی سورج طلوع ہونے کی وجہ سے کیونکہ نماز کا ممنوع وقت داخل ہو گیا ہے، بخلاف نماز عصر کے، اور یہ حدیث ان پر حجت ہے۔ (انقی)

مولانا عبید اللہ رحمائیؒ فرماتے ہیں کہ

والحديث يدل على أن من أدرك ركعة من صلاة الصبح قبل طلوع الشمس فقد أدرك صلاة الصبح ولا تبطل بطلوعها كما أن من أدرك ركعة من صلاة العصر قبل غروب الشمس فقد أدرك صلاة العصر ولا تبطل بغروبها، و به قال

مالک و الشافعی و احمد و اسحاق، و هو الحق و خالف ابو حنیفہ هذا الحديث، فقال، من طلعت عليه الشمس و هو في صلاة الصبح بطلت صلاته و احتج في ذلك بالا حاديث الواردة في النهي عن الصلوة عند طلوع الشمس، و أجيب عنه بان أحاديث النهي عامة تشمل ذوات الأسباب المتقدمة وغيره ذوات الأسباب من النوافل و الفرائض، و حديث أبي هريرة رضي الله عنه هذا خاص ليس فيه الا ذكر صلاة ذات سبب متقدم فتحمل احاديث النهي على مالا سبب له من النوافل جمعا بين الحديثين فان المجمع بالتخصيص أولى من ادعاء النسخ قاله الحافظ. (مرعاة المفاتيح ص ۳۰۹ ج ۲)

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے نماز صبح کی ایک رکعت پالی سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اس نے نماز صبح کو پالیا اور سورج طلوع ہونے سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی جس طرح نماز عصر کی ایک رکعت اگر کسی نے پالی سورج غروب ہونے سے پہلے تو اس نے نماز عصر کو پالیا اور سورج غروب ہونے سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی، اور یہی کہا ہے امام مالک امام شافعی امام احمد امام اسحاق نے اور یہی حق ہے اور امام ابو حنیفہ نے مخالفت کی ہے اس حدیث کی اور کہا ہے کہ کسی نمازی پر اس حالت میں سورج طلوع ہوا کہ وہ نماز میں تھا تو اس کی نماز باطل ہوگئی، اس میں انہوں نے احتجاج کیا ہے ان احادیث سے جن میں سورج طلوع ہوتے وقت نماز سے منع کیا گیا ہے اور انہیں جواب دیا گیا ہے کہ

منع کی احادیث عام ہیں جو کہ مستثمل ہیں کسی سبب اور غیر سبب سے نوافل و فرائض پر، لیکن حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خاص ہے جس میں سبب کا ذکر ہے لہذا منع کی احادیث کو اس امر پر محمول کریں گے جس میں بلا وجہ نوافل پڑھنے کی ممانعت کا ذکر ہے دونوں احادیث میں موافقت کیلئے کیونکہ نسخ کی بجائے تخصیص اولیٰ ہے جیسا کہ حافظ نے کہا ہے۔ (انتہی)

(۱۶) نماز استسقاء کی مشروعیت سے انکار

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان النبی ﷺ خرج الى المصلی فاستسقی فاستقبل القبلة و قلب رداءه و
وصلی رکعتین۔ بخاری ص ۳۷ ج ۱، و مسلم ص ۲۹۲ ج ۱۔

یعنی نبی ﷺ طلب بارش کیلئے لوگوں کے ساتھ عید گاہ کی طرف گئے وہاں آپ نے قبلہ کی
طرف منہ کیا اور چادر کو پلٹا اور دو رکعات نماز پڑھی۔ انتھی۔

امام بخاری نے مزید یہ الفاظ بھی روایت کیئے ہیں کہ جھر فیہما بالقرۃ۔

بخاری ص ۱۳۹ ج ۱۔

یعنی نبی ﷺ نے ان دونوں رکعات میں قرۃ بلند آواز سے کہی تھی۔

یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ طلب بارش کیلئے نماز پڑھنا سنت سے ثابت ہے لیکن
امام ابو حنیفہ کا قول ہے استسقاء میں نماز نہیں ہے چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ
اما ابو حنیفۃ فکان لا یری فی الاستسقاء صلوۃ۔

موطا امام محمد ص ۱۵۸۔

یعنی امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ استسقاء میں نماز نہیں ہے۔

جبکہ یہ مذہب جمہور کے خلاف ہے امام ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ

واختلفوا فی الصلوۃ فی الاستسقاء فقال ابو حنیفۃ لیس فی الاستسقاء صلوۃ

و لكن یخرج الامام ویدعو..... و قال مالک و الشافعی و ابو یوسف و

محمد و سائر فقهاء الامصار صلوۃ الاستسقاء سنة۔ التمهید لمافی الموطا من

المعانی والاسانید ص ۱۷۲ ج ۱۔

نماز استسقاء میں اختلاف کیا گیا ہے کہا امام ابو حنیفہؒ نے کہ استسقاء میں نماز نہیں البتہ امام باہر

نکلے اور دعا کرے جبکہ امام مالکؒ امام شافعیؒ قاضی ابو یوسف امام محمدؒ اور تمام فقہاء امصار نے کہا ہے

کہ استسقاء کی نماز (پڑھنا) سنت ہے (انتھی)

مولانا عبید اللہ رحمائیؒ فرماتے ہیں کہ

فیه دلیل علی ان الصلوۃ فی الاستسقاء فی جماعۃ فی حالۃ البروز سنة و بہ

قال مالک و الشافعی و احمد والجمهور وهو قول ابی یوسف و محمد. مرعاة المفاتیح ص ۷۰ ج ۵.

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے کہ صحرا میں جماعت کے ساتھ نماز استنقاء سنت ہے یہی امام مالک امام شافعی امام احمد اور جمہور علماء نے کہا ہے اور یہی قول ہے قاضی ابو یوسف اور امام محمد کا۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ

وقال سائر العلماء من السلف والخلف الصحابة والتابعون فمن بعدهم تسن له الصلوة ولم يخالف فيه الا ابو حنیفة،

شرح مسلم ص ۲۹۲ ج ۱.

تمام علماء سلف و خلف صحابہ کرام تابعین عظام اور ان کے بعد پیدا ہونے والے کہتے ہیں کہ استنقاء کی نماز مسنون ہے اس میں کسی نے مخالفت نہیں کی سوائے امام ابو حنیفہؒ کے۔ (انتهی)

(۱۷) اگر نماز میں ایک رکعت زیادہ ادا کر لی جائے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

صلی النبی ﷺ الظهر خمسا فقالوا ازید فی الصلوة قال وما ذاک قالوا صلیت خمسا قال فثنی رجله وسجد سجدتین.

بخاری ص ۵۸ ج ۱، و مسلم ص ۲۱۲ ج ۱.

نبی ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی پانچ رکعت، تو صحابہ کرام نے کہا کیا نماز میں زیادتی کی گئی ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا سبب ہے، تو صحابہ کرام نے کہا کہ آپ نے پانچ رکعت نماز پڑھی ہے یہ سن کر آپ نے اپنے پاؤں موڑے (قبلہ کی طرف) اور (سہو کے) دو سجدے کیے (انتهی)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر چوتھی رکعت پر تشہد نہ بیٹھا جائے اور انسان غلطی سے پانچویں رکعت شروع کر دے تو اس کی نماز درست ہے البتہ سجدہ سہو اس پر لازم ہے اور یہ جمہور علماء کا مذہب ہے جبکہ حنفیہ کے نزدیک اگر پانچویں رکعت غلطی سے پڑھی گئی تو اس کی نماز باطل ہوگئی،

چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ

فيه دليل لمذهب مالک و الشافعی و احمد و الجمهور من السلف و الخلف ان من زاد في صلوته ركعة ناسيها لم تبطل صلوته و قال ابو حنيفة اذا زاد ركعة ساهيا بطلت صلوته و لزمه اعادتها. شرح مسلم ص ۲۱۲ ج ۱.

اس حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں دلیل ہے امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل اور جمہور علماء سلف و خلف کی مذہب کی کہ اگر بھول کر ایک رکعت زیادہ پڑھ لی جائے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی لیکن امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ اگر بھول کر ایک رکعت زیادہ پڑھی گئی تو اس کی نماز باطل ہوگئی اور اس پر لازم ہے کہ نماز کو لوٹائے۔ (انتہی)

مولانا عبید اللہ محدث مبارک پوری فرماتے ہیں کہ

ذهب الجمهور مالک و الشافعی و احمد و اسحاق ابن راهويه و غيرهم الى أنه اذا صلى الظهر خمسا فصلاته جائزة و سجد سجدتي السهو، وان لم يجلس في الرابعة، والحديث حجة لهم.

مرعاة ص ۲۰۲ ج ۳.

یعنی امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل امام اسحاق اور جمہور علماء اسلام اس طرف گئے ہیں کہ اگر نمازی نے ظہر کی پانچ رکعت پڑھ لیں تو اس کی نماز درست ہے البتہ سجدہ سہو کریگا اگرچہ وہ چوتھی رکعت میں تشہد نہ بیٹھا ہو۔ (انتہی)

پھر لطف کی بات تو یہ ہے کہ حنفی اس حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نصف حصے پر تو ایمان لاتے ہیں اور نصف اول پر تقلیدی ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حدیث مذکورہ میں اس بات کا ذکر ہے کہ نبی ﷺ کو جب سلام پھیرنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یاد دہانی کرائی کہ آپ نے چار کی بجائے پانچ رکعات پڑھی ہیں تو آپ علیہ السلام نے سجدہ سہو کیا ہے لہذا بھول کا سجدہ سلام پھیرنے کے بعد ہی کرنا چاہیے پھر مزید اپنی طرف سے متن حدیث میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتے ہیں کہ سجدہ سہو کے بعد

دوبارہ تشہد پڑھا جائے پھر سلام پھیرا جائے، حالانکہ سلام پھیر کر پھر تشہد پڑھ کر سلام پھرنے کا ذکر مذکورہ حدیث میں بالکل نہیں۔

گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی حدیث کو ترک کر دیا گیا ہے جس پر جمہور امت کا تعامل تھا پھر مطلب برآری کیلئے جس حصے کو قبول کیا ہے اس میں بھی قوم موسیٰ کو مات کر گئے ہیں، حدیث کا مفہوم واضح ہے کہ اگر امام نے چار کی بجائے پانچ رکعات پڑھا دی اور مقتدیوں نے سلام پھیرنے کے بعد بتایا تو امام قبلہ رخ ہو کر سجدہ سہو کرے، یہ چیز محض احتمال نہیں بلکہ اس امر کا اتفاق تو راقم الحروف کو بھی ایک آدھ بار ہوا ہے۔ وکفی باللہ شھیدا۔

(۱۸) مردہ مچھلی کا حکم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

غزونا جيش الخبط و امر علينا ابو عبيدة فجعنا جو عا شديدا فالقى البحر حوتا ميتا لم نرمثله يقال له العنبر فاكلنا منه نصف شهر، فاخذ ابو عبيدة عظما من عظامه، فمر الراكب تحته، فلما قدمنا المدينة ذكرنا للنبي ﷺ فقال، كلوا رزقا اخرج به الله، اطعمونا ان كان معكم منه، قال فارسلنا الى رسول الله ﷺ منه فاكله. بخارى و مسلم بحواله مصابيح السنة ص ۱۳۲ ج ۳.

میں نے جيش خبط کے ساتھ جہاد کیا ہم پر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ امیر مقرر کیے گئے تھے ہم کو سخت بھوک لگی سمندر نے ایک مردہ مچھلی باہر پھینکی ہم نے اس کی مانند کبھی مچھلی نہ دیکھی تھی اس کو عنبر کہا جاتا تھا، ہم نصف مہینہ تک اسے کھاتے رہے، ابو عبیدہ نے اسکی ایک بڑی پکڑی، اونٹ سوار اس کے نیچے سے گزر گیا، جب ہم واپس آئے، تو رسول اللہ ﷺ سے ہم نے اس بات کا ذکر کیا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ کھاؤ وہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف رزق بھیجا ہے، اور اگر اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہے تو ہمیں بھی کھاؤ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اس سے کچھ بھیجا تو آپ علیہ السلام نے اس مچھلی کو کھایا۔ بخاری ص ۶۲۶ ج ۲، و مسلم ص ۱۳۸ ج ۲۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو مچھلی دریا میں بلا سبب مرجائے اس کا کھانا حلال ہے جبکہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس کا کھانا حرام ہے، یہ موقف بھی جمہور امت کے خلاف ہے چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں کہ

واما السمک الطافی وهو الذی یموت فی البحر بلا سبب فمذہبنا اباحتہ و بہ قال جماہیر العلماء من الصحابة فمن بعدهم وقال ابو حنیفۃ لا یحل، المنہاج شرح مسلم ص ۱۴۸ ج ۲.

ایسی مچھلی جو دریا میں بلا سبب مرجائے اسکے بارہ میں ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کا کھانا مباح ہے اور جمہور علماء صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے اسی کے قائل ہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ کا کہنا ہے وہ حلال نہیں۔ (انتہی)

(۱۹) کتے کو فروخت کرنا

حضرت ابی مسعود انصاری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ نہی عن ثمن الکلب و مہر البغی و حلوان الکاھن.

بخاری ص ۲۹۸ ج ۱، و مسلم ص ۱۹ ج ۲، و موطا امام مالک ص ۵۹۴.

رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت زانیہ کی خرچی اور کاھن کی اجرت سے منع کیا ہے۔ (انتہی)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کتے کی فروخت جائز نہیں اور یہ جمہور علماء اسلام کا مذہب

ہے، جب کہ امام ابو حنیفہؒ کتے کی فروخت کو جائز بتاتے ہیں چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ

واما النہی عن ثمن الکلب و کونہ من شر الکسب و کونہ خبیثا فیدل علی

تحریم بیعہ وانہ لا یصح بیعہ ولا یحل ثمنہ ولا قیمته علی متلفہ..... و بہذا

قال جماہیر العلماء منهم ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ والحسن البصری و ربیعۃ

والاوزاعی و الحکم و حماد و الشافعی و احمد و داؤد وابن المنذر و غیر ہم

وقال ابو حنیفۃ یصح بیع الکلاب التی فیہا منفعة. شرح مسلم ص ۱۹ ج ۲.

یعنی کتے کی قیمت وصول کرنے کی ممانعت اس کام کے بدترین فعل میں سے ہونا اور کتے کا

ایک خبیث جانور ہونا، اس کی فروخت کی حرمت پر دلالت کرتا ہے لہذا اس کا فروخت کرنا جائز نہیں اور نہ اس کی قیمت (وصول کی ہوئی استعمال میں لانا) حلال ہے اور نہ اس کی قیمت فروخت کرنے والے کیلئے جائز ہے جمہور علماء کا یہی مذہب ہے جن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حسن بصری امام ربیعہ امام اوزاعی امام حکم امام حماد امام شافعی امام احمد بن حنبل امام داؤد امام ابن منذر وغیرہ شامل ہیں جبکہ امام ابوحنیفہ کا کہنا ہے کہ جن کتوں سے فائدہ حاصل ہو ان کی فروخت جائز ہے۔ (انہی)۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ،

وظاهر النهی تحريم بيعه وهو عام في كل كلب معلما كان او غيره وبذلك قال الجمهور، فتح الباری ص ۳۳۸ ج ۴.

اس حدیث سے ظاہراً ہر کتے کے فروخت کی نفی ثابت ہوتی ہے اگرچہ وہ سدھارا ہوا ہو یا نہ اور یہ مذہب ہے جمہور علماء اسلام کا (انہی)۔

ملا علی القاری خفی شرح مشکوٰۃ میں علامہ طیبی سے نقل کرتے ہوئے اس پر سکوت کرتے ہیں کہ واقعی بات درست ہے کہ

الجمهور على انه لا يصح بيعه،

مرعاة ص ۳۸ ج ۶،

یعنی جمہور اس مذہب پر ہیں کہ کتے کی بیع درست نہیں۔

(۲۰) عیدین کے دن روزہ رکھنا

امام ابی عبید مولیٰ ازہرؒ بیان کرتے ہیں کہ میں عید کے دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز عید پڑھنے کیلئے حاضر ہوا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھا کر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا

هذان يومان نهى رسول الله ﷺ عن صيا مهما يوم فطر كم من صيامكم واليوم الآخر تاكلون فيه من نسككم.

بخاری ص ۲۶۷ ج ۱، و مسلم ص ۳۶۰ ج ۱.

ان دونوں ایام (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) میں رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے ایک تو روزہ کھولنے کا دن اور دوسرا اپنی قربانی کھانے کا۔ (انتہی)

اس حدیث کا یہ تقاضا ہے کہ عیدین کے ایام میں روزہ رکھنا منع ہے اور اس دن روزہ عبادت نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی وجہ سے معصیت ہے ظاہر ہے کہ اگر کوئی عید کے دن میں روزہ رکھنے کی جان بوجھ کر نذر مانتا ہے تو اس کی یہ نذر معصیت ہے اور معصیت میں نذر کے ایفاء سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے،

لا نذر فی معصیۃ اللہ. مسلم کتاب النذر باب لا وفاء النذر.

لیکن امام ابو حنیفہؒ کا کہنا ہے کہ اگر کوئی قصداً بھی عید کے دن روزہ کی نذر مانے تو تب بھی روزہ کی قضاء لازم آئے گی اور یہ مسئلہ جمہور علماء اسلام کے مخالف ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ

و فی الحدیث تحریم صوم یومی العید..... وهو بالاجماع و
اختلفوا فیمن قد صام یوم عید فعن ابی حنیفۃ ینعقد و خالفہ الجمهور فلو نذر صوم
یوم قدوم زید فقد یوم العید فلا کثر لا ینعقد النذر و عن الحنیفۃ ینعقد و یلزمہ
القضاء.

فتح الباری شرح صحیح بخاری ص ۹۴ ج ۴.

اس حدیث میں عید کے دن روزہ رکھنے کی حرمت ہے اور اس پر اجماع ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر کسی نے روزہ رکھ لیا تو امام ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ اس کا روزہ ہو گیا اور اس میں انہوں نے جمہور کی مخالفت کی ہے اور اگر (کسی نے) نذر مانی کہ جس دن زید گھر آیا تو میں اس دن روزہ رکھوں گا اور زید عید کے دن آیا تو اکثر علماء کے نزدیک ایسے شخص پر قضاء لازم نہیں آئے گی لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر قضاء لازم ہے۔ (انتہی)

علامہ نووی شرح صحیح مسلم ص ۳۶۰ ج ۱ میں فرماتے ہیں کہ

وقد اجمع العلماء علی تحریم صوم ہذین الیومین بکل حال سواء صامہما
عن نذر او تطوع او کفارة او غیر ذلک ولونذر صومہما متعمدا بعینہما قال

الشافعی والجمهور لا یعتقد نذرہ ولا یلزمہ قضاء ہما و قال ابو حنیفہ یعتقد ویلزمہ قضاء ہما قال فان صامہما اجزاء و خالف الناس کلہم فی ذلک۔

اور تحقیق عیدین کے دن روزہ رکھنے کی حرمت پر علماء کا اجماع ہے، تمام حالتوں میں اگرچہ روزہ نذر کا ہو یا نفلی یا کفارہ کا یا کسی اور وجہ سے، اور اگر کسی نے جان بوجھ کر عیدین کے روزہ کی نذر مانی تو امام شافعی اور جمہور علماء کے نزدیک ان کی قضاء لازم نہیں آتی لیکن امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ اس کی قضاء لازم آئے گی (اور انہوں نے مزید یہ کہا ہے کہ) اگر کسی نے روزہ رکھ لیا تو وہ اس کو کفایت کرے گا اور اس میں انہوں نے تمام لوگوں کی مخالفت کی ہے۔ (انہی)

اس اکثری مذہب کا اقرار تو معروف حنفی بزرگ ملا علی قاری نے بھی شرح مشکوٰۃ ص ۲۹۳ ج ۴، میں کیا ہے۔

کیا فرماتے ہیں علماء بریلویہ

یہ بیس امثلہ ہم نے سرسری طور پر پیش کر دی ہیں ہم اس سلسلہ میں صدہا مسائل پیش کر سکتے ہیں جن میں احناف نے جمہور امت سے مخالفت کی ہے اور قرآن و حدیث کے واضح دلائل بھی جمہور کے ساتھ ہیں، اگر مفتی صاحب کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ جمہور کی مخالفت گمراہی و بے دینی کا راستہ ہے کیونکہ انہوں نے اسی دلیل سے امام ابن تیمیہ کو گمراہ و بے دین قرار دیا ہے کہ انہوں نے جمہور کی مخالفت کی ہے!

انصاف شرط ہے کہ آیا مذکورہ مسائل میں حنفیہ نے جمہور کی مخالفت کر کے بقول مفتی صاحب گمراہی و بے دینی کا راستہ منتخب کیا ہے؟ یا جمہور کی مخالفت کے باوجود راہ ہدایت پر ہیں؟۔

برائیوں کی جڑ نجد یا عراق

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اسی جماعت (اہل الحدیث) کی پیشین گوئی خود حضور انور ﷺ نے کی تھی کہ نجد کے متعلق ارشاد فرمایا کہ

يُخْرِجُ مِنْهَا قُرْنَ الشَّيْطَانِ.

وہاں سے ایک شیطانی فرقہ نکلے گا۔ جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ۲۔

الجواب

جواب ہے قبل ہم اس جگہ اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بریلویت نے اکابر سے لیکر اصاغر تک صرف ایک ہی لفظ کو لیکر اس حدیث نبوی کا ایسا مفہوم بگاڑا ہے کہ یہودیوں کے بھی کان کتر ڈالے ہیں جب اس گروہ کے علماء کی یہ حالت ہے تو عوام تو پہلے ہی گئے گزرے ہوتے ہیں (ان کے پڑھانے سے آگے چلتے ہیں اور انہوں نے مسائل میں تحقیق کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں اگر کبھی زحمت گوارہ کر ہی لیں تو پھر ان کے مولوی مسئلہ بتاتے ہوئے جو جو ہیرا پھیریاں کرتے ہیں وہ علماء کی شان نہیں! حالانکہ تحقیق کرنا کروالینا ہمیشہ کسی اصول کے تحت ہونی چاہئے ورنہ نتیجہ کبھی صحیح نہیں نکل سکتا بلکہ ویسا ہی نکلے گا جو ایک کہادت کی رو سے چار اندھوں کا نکلا تھا کہتے ہیں چار اندھے تھے ان کو ہاتھی دیکھنے کا شوق ہوا جس پر انہوں نے اپنے کسی ساتھی سے کہا کہ جب کبھی گاؤں میں ہاتھی آئے تو ہمیں بھی بتانا ہم نے دیکھنا ہے ہاتھی کس طرح کا ہوتا ہے چنانچہ جب کبھی ہاتھی آیا تو بتانے والے نے انہیں خبر دی اور وہ چاروں ہاتھی دیکھنے کیلئے باہر نکل آئے اور ٹٹولتے ہوئے ہاتھی کے پاس پہنچے ان میں سے ایک کا ہاتھ ہاتھی کے پیٹ پر پڑا، دوسرے کا ہاتھ ہاتھی کی ٹانگ پر پڑا، تیسرے کا سونڈ پر اور چوتھے کا کان پر، اور انہیں کو اپنے ہاتھ سے ٹٹولتے رہے جب وہ دیکھ بھال کر واپس اپنے ڈیرے پہ گئے تو کسی کے پوچھنے پر حافظ صاحب ہاتھی کس طرح کا ہوتا ہے؟ پہلانا بینا بولا کہ بس موٹا چوڑا چکلا جسم ہی جسم ہوتا ہے دوسرا کہنے لگا نہیں یہ جھوٹ کہتا ہے بلکہ ہاتھی تو ایک موٹے اور اونچے ستون کی طرح ہوتا ہے تیسرا بولا یہ دونوں جھوٹے ہیں ہاتھی ایک نرم نرم گاؤں دم گوشت کا لوتھرا ہوتا ہے، چوتھے نے چلا کر کہا معلوم ہوتا ہے ان سب کو غلطی لگی ہے

کیونکہ ہاتھی تو ایک پتلے اور چوڑے پٹکھے (دستی) کی طرح ہوتا ہے۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ ہی ہے مگر اس سے ایک سبق ضرور ملتا ہے اور وہ یہ کہ جب تک چشم بصیرت سے باقاعدہ اصول کے تحت کسی چیز کی پرکھ نہ کی جائے تو نتیجہ غلط نکلتا ہے بس یہ ضروری ہے کہ ہم حدیث ”قرن الشیطان“ کے متعلق کسی درست اصول کے مطابق تحقیقات کریں، سو واضح ہو کہ اس حدیث میں دو باتیں تشریح طلب ہیں اول یہ کہ نجد سے کونسا نجد مراد ہے کیونکہ نجد بہت زیادہ ہیں دوم یہ کہ اس وقت وہ کونسا گروہ ہے جو قرن الشیطان ہے، ان دونوں باتوں کی تحقیق ضد اور تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار کر ملاحظہ کیجئے، واللہ یمہدی من یشاء۔

تعداد نجد

ملک عرب میں نجد کے نام سے جو جو علاقہ جات معروف ہیں انکی مختصر فہرست علامہ زبیدی نے تاج العروس شرح قاموس کی دوسری جلد ص ۵۱۱ میں اور علامہ حموی نے معجم البلدان ص ۲۶۵ ج ۱۹، میں دی ہے جو کہ حسب ذیل ہے۔

- (۱) نجد الوز (۲) نجد أجا (۳) نجد برق (۴) نجد خال (۵) نجد الشری
- (۶) نجد عضر (۷) نجد العقاب (۸) نجد کبکب (۹) نجد مریع (۱۰) نجد
- الیمین (۱۱) نجد العراق (۱۲) نجد الحجاز۔

جب نجد نام کے متعدد مقامات ہیں اور عراق و یمین دونوں علاقوں میں پائے جاتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس نجد کی تلاش کی جائے جس کو زبان رسالت ﷺ نے (قرن الشیطان) کہا ہے تاکہ پیشگوئی کا ظہور پورے طور پر سمجھ میں آسکے، جب ہم اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ نجد عراق ہی وہ سرزمین ہے جسے نبی رحمت حضرت محمد ﷺ نے مراد لیا ہے آئیے اس دعوے کا ثبوت بھی دیکھیں۔

قرن الشیطان کونسا نجد ہے؟

اس سوال کے جواب کیلئے سب سے اول ہم حدیث نبوی کو ہی لیتے ہیں چنانچہ حضرت عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے دعا فرمائی کہ

اللهم بارک لنا فی شامنا اللهم بارک لنا فی یمنا قالوا یا رسول اللہ ﷺ و
فی نجدنا قال اللهم بارک لنا فی شامنا اللهم بارک لنا فی یمنا قالوا یا رسول اللہ
ﷺ و فی نجدنا فاظنہ قال فی الثالثة هنا ک الزلازل والفتن و بها یطلع قرن
الشیطان. بخاری ص ۱۰۵۱ ج ۲.

یعنی اے اللہ ہمارے لئے شام میں برکت دے، اے اللہ ہمارے لئے یمن میں برکت دے،
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ ہمارے نجد میں (بھی برکت کی
دعا کیجئے) آپؐ نے پھر دعا فرمائی، اے اللہ ہمارے لئے شام میں برکت دے ہمارے لئے یمن
میں برکت دے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ اور ہمارے نجد
میں (بھی برکت کی دعا کیجئے) (راوی ابن عمر) نے کہا میرا خیال ہے کہ تیسری مرتبہ (صحابہ کرام
رضی اللہ عنہم کے جواب میں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہیں سے
شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا۔ انتہی)

حضرت امام بخاریؒ اس حدیث کو ”الفتن قبل المشرق“ کے عنوان کے تحت لا کر حدیث
میں موجود لفظ ”و فی نجدنا“ کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ نجد سے مراد اس جگہ کوئی سرزمین ہے،
اس تشریح کیلئے امام بخاری ایک اور حدیث لائے ہیں کہ
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

انه سمع رسول اللہ ﷺ وهو مستقبل المشرق یقول الا ان الفتنة ههنا من

حيث یطلع قرن الشیطان. بخاری ص ۱۰۵۰.

یعنی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مشرق کی طرف منہ کر
کے یہ کہتے ہوئے سنا کہ خبردار بے شک فتنہ یہاں سے نکلے گا جہاں سے شیطان کا سینگ نکلتا ہے۔
(انتہی)

اس حدیث نے بات صاف کر دی کہ نبی ﷺ نے پیشگوئی فرماتے ہوئے مشرق کی طرف
اشارہ کرتے فرمایا تھے کہ قرن شیطان اس طرف ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید العرب والعجم

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کب اور کس جگہ کھڑے ہو کر مشرق کی طرف اشارہ کیا تھا سو اس کی تشریح کیلئے امام بخاری ایک تیسری حدیث امام سالمؒ کے واسطے سے لائے ہیں جس میں یہ الفاظ ہیں کہ

انه قام الى جنب المنبر. بخاری ص ۱۰۵۰ ج ۲.

یعنی نبی ﷺ نے یہ بات منبر کی ایک جانب کھڑے ہو کر کہی تھی۔

اس حدیث سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ طیبہ میں مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ قرن الشیطان اس طرف سے نکلے گا اور مدینہ طیبہ سے عین مشرق کی طرف نجد عراق ہے جو کہ اہل الرائے کا مرکز ہے۔ چنانچہ علامہ محمد طاہر فتنی حنفی اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے نجد شیطان کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ

هو اسم خاص لما دون الحجاز مماليى العراق،
یعنی یہ ایک خاص جگہ کا نام ہے جو حجاز کے علاوہ عراق کے ساتھ ملتی ہے، مجمع بحار الانوار ص ۶۸۰ ج ۴۔

مزید وضاحت

(۱) حضرت حسن رحمۃ اللہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ اللهم! بارك لنا في مدينتنا اللهم! بارك لنا في شامنا
اللهم! بارك لنا في يمننا، فقال له رجل، يا رسول الله ﷺ فالعراق! فان فيها ميرتنا
و فيها حاجتنا، فسكت، ثم اعاد عليه فسكت، فقال: بها يطلع قرنا الشيطان و
هنالك الزلازل و الفتن.

کنز العمال ص ۷۷ ج ۱۴. رقم الحديث ۳۸۲۷۳

یعنی اللہ کے رسول ﷺ نے دعا کی اے اللہ ہمارے مدینہ کو ہمارے لئے برکت والا بنا اے
اللہ ہمارے شام میں ہمارے لئے برکت عطاء فرما! اے اللہ ہمارے یمن کو ہمارے لئے بابرکت بنا،
ایک آدمی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ عراق کیلئے بھی دعا فرمائیے کیونکہ وہاں سے ہمارے
لئے گندم اور دیگر ضروریات کا سامان مہیا ہوتا ہے، آپ ﷺ خاموش رہے، اس نے یہ دیکھ کر پھر

گزارش کی، آپ ﷺ پھر خاموش رہے، پھر فرمایا کہ وہاں سے شیطان کا سینک نکلے گا وہاں زلزلے اور فتنے برپا ہوں گے (یعنی میں اس کے کیلئے کیسے دعا کروں وہ تو زلزلوں اور فتنوں کی سر زمین ہے)۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ

صلی رسول اللہ ﷺ صلاة الفجر ثم انفتل فاقبل على القوم فقال، اللهم بارک لنا فی مدینتنا و بارک لنا فی مدنا و صاعنا، اللهم! بارک لنا فی حرمننا و بارک لنا فی شامنا و یمنا، فقال رجل، و العراق یرسول اللہ ﷺ! فسکت، ثم اعاد، فقال، اللهم! بارک لنا فی مدینتنا و بارک لنا فی مدنا و صاعنا اللهم! بارک لنا فی حرمننا و بارک لنا فی شامنا و یمنا، فقال رجل، و العراق یرسول اللہ ﷺ! فسکت ثم اعاد فقال اللهم بارک لنا فی مدینتنا و بارک لنا فی مدنا و صاعنا، اللهم! بارک لنا فی حرمننا و بارک لنا فی شامنا و یمنا، فقال رجل، و العراق یرسول اللہ ﷺ! قال من ثم یطلع قرن الشیطان و تهیج الفتن. ایضاً ص ۷۱ ج ۱۲. (رقم الحدیث ۳۸۲۲۸)

رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز ادا فرمانے کے بعد متقدموں کی طرف منہ کر کے دعا فرمائی، اے اللہ ہمارے واسطے مدینہ میں برکت دے، اور ہمارے مد اور صاع میں برکت دے، اے اللہ حرم میں ہمارے لئے برکت دے، شام اور یمن میں برکت دے، ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ عراق (کیلئے بھی برکت کی دعا کیجئے) آپ ﷺ خاموش رہے، پھر فرمایا اے اللہ ہمارے مدینہ میں ہمارے لئے برکت دے، ہمارے مد اور صاع میں ہمارے لئے برکت دے اے اللہ ہمارے حرم میں ہمارے لئے برکت دے، شام اور یمن میں ہمارے لئے برکت دے، (اس پر) ایک آدمی نے گزارش کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ عراق (کیلئے بھی برکت کی دعا کیجئے) تو نبی ﷺ خاموش رہے، پھر دعا فرمائی اے اللہ ہمارے لئے مدینہ میں برکت دے اور ہمارے مد اور صاع میں برکت دے اے اللہ ہمارے حرم میں ہمارے لئے برکت دے اور ہمارے شام اور یمن میں برکت دے (اس پر پھر) ایک آدمی نے گزارش کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ عراق (کیلئے بھی

برکت کی دعا کیجئے) تو نبی ﷺ نے فرمایا (میں وہاں کیلئے کیسے دعا کروں) جبکہ وہاں شیطان کا سینک ظاہر ہوگا اور فتنے فساد جوش ماریں گے۔ (انہی)

اس حدیث کو مکرر ملاحظہ کیجئے یہ کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں بلکہ اپنی تفسیر آپ کر رہی ہے کیونکہ یہاں نجد کی بجائے صاف عراق کا لفظ موجود ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ بخاری کی روایت میں جو نجد کا لفظ آیا ہے اس سے مراد نجد عراق ہے نجد یمن جس کو آج کل نجد سعودیہ کہتے ہیں وہ مراد نہیں یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو باب الفتن قبل المشرق کے تحت لا کر اس بات کا اشارہ کیا تھا کہ یہاں نجد سے وہ نجد مراد ہے جو مدینہ سے جانب مشرق ہے اور سب جانتے ہیں کہ مدینہ سے مشرق کی جانب عراق ہے جس میں بصرہ و کوفہ جیسے شہر آباد ہیں جو کہ اہل الرائے کے مرکز اور فتنوں کی سر زمین ہے۔

تاریخ کی شہادت

(۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والا عجمی تھا۔

(۲) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد کا فتنہ عراق ہی سے اٹھ کر مصر تک پھیلا۔

(۳) جنگ جمل و صفین اسی سر زمین عراق پر ہوئی جس کے نتیجے میں وہ قیمتی خون بہا جس کی تلافی رہتی دنیا تک نہ ہو سکے گی اور وہ پاک نفوس ان جنگوں میں کام آئے جن کی مثال دنیا کبھی پیش نہیں کر سکے گی۔

(۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ یہیں شہید ہوئے۔

(۵) خوارج، اسلام کا پہلا گمراہ کن فرقہ یہیں سے نکلا، جبریہ اور قدریہ نے بھی یہیں سے جنم لیا، اسلام کے دیگر فرقوں مثلاً جہمیہ کا فتنہ جس کا موجد جہم بن صفوان تھا عراق سے نکلا، معتزلہ نے بھی یہیں سے سر نکالا جس کی وجہ سے بے شمار فقہاء و محدثین کو ناقابل برداشت اذیتیں سہنا پڑیں، اعتزال کے بانی مبانی واصل بن عطا اور عمرو بن عبید بھی عراقی تھے۔

(۶) جگر گوشہ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا قافلہ یہیں فرات کے کنارے لٹا۔

(۷) شیعیت جس نے اسلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا یہیں عراق کی پیداوار ہے۔

(۸) حجاج کی سفاکیاں اسی سرزمین پر ہوئی۔

(۹) مختار بن ابوعبید نے دعویٰ نبوت عراق سے ہی کیا۔

(۱۰) ترک و تاتار کی غارت گریوں کے نتائج (جنہوں نے اسلام کی رہی سہی طاقت اور عرب و

خلافت عربی کا تار تار الگ کر دیا) یہیں رونما ہوئے

(۱۱) حتیٰ کہ جنگ عظیم میں واحد اسلامی طاقت کیساتھ غداری کے نتائج بھی اولاً یہیں ظاہر ہوئے اور اسی کے اثرات بعد کو اور اطراف میں بھی رونما ہوئے۔

(۱۲) ماضی قریب میں عبدالکریم قاسم کا فتنہ بھی عراق سے نکلا۔

(۱۳) ماضی قریب میں بہایت اور باہیت نے یہیں سے جنم لیا اور اسی کی بگڑی ہوئی صورت

قادیانیت ہمارے سامنے ہے۔

(۱۴) عراق ایران جنگ جس نے تمام مسلمانوں کو تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے جس کے

دور رس نتائج نکل رہے ہیں اور صدر صدام کا تازہ فتنہ کویت پر قبضہ جس نے عالم اسلام کو تباہ کر دیا ہے، یہ تمام فتنے عراق سے ہی نکلے ہیں۔

(۱۵) اور آخر میں دجال بھی اسی سرزمین سے نکلے گا۔

(مستفاد از سیرت النبی جلد سوم صفحہ ۳۸۹ و تاریخ اسلام مؤلفہ معین الدین ندوی)

ان تمام تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عراق ہی قرن الشیطان اور

زلازل و فتن کی سرزمین ہے۔

حدیث نبوی کے مطابق مشرق سے دس سے زیادہ بڑے بڑے فتنے کھڑے ہونگے تفصیل

آپ کے سامنے ہے آپ نے ملاحظہ کیا کہ اللہ کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی یہ پیشگوئی کس

قدر حقیقت و سچائی پر مبنی ہے، اس کے برعکس نجد سعود سے آج تک کوئی فتنہ کھڑا نہیں ہوا، بلکہ بنو تمیم

کے ایک مومن کامل نے فتنہ پروروں اور ملت فروشوں کا قلع قمع کرتے ہوئے توحید و سنت کے پیغام

سے قبر پرستوں کو ننگا کر دیا، ولایت کے نام سے قبروں کو مال تجارت بننے سے منع کر دیا، طریقت

کے نام سے ملت فروشی کو ختم کر دیا، جب مشرکین کے کار بار ماند پڑ گئے، تو اس مرد حق کو اس قدر

بدنام کیا گیا ”الامان والحفیظ“ مگر دنیا نے دیکھا کہ اس کی دعوت نجد سے نکل کر حجاز و تہامہ یمن و شام

تک عام ہوگئی، اور اسی کی دعوت و جہاد ہی کے نتیجہ میں حرمین شریفین کو انکا پرانا وقار مل سکا اور ان کی حقیقی حرمت و عزت بحال ہو سکی۔

آہ رحمت کو زحمت کہنے والے تجدید و احیائے دین کو فتنہ بتانے والے کبھی اپنے گریبانوں میں منہ ڈالتے تو پرانی تاریخ کو دیکھتے شریف حسین کے زمانہ کے حالات کا جائزہ لیتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ خاص مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں حالات انتہائی مخدوش نظم و ضبط کا فقدان اور خطرات کے بادل ہر وقت سر پر منڈلاتے رہتے تھے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے راستے میں حاجیوں کے قتل تک کی نوبت پہنچ جاتی تھی اور یہ راستہ اس قدر پر خطر اور اندوہ گین تھا کہ حاجی مسلح قافلوں کی صورت میں اپنے کو خطرات سے محفوظ نہیں پاتے تھے آج سے ساٹھ سال پیشتر کی تاریخ حاجیوں پر ظلم و زیادتیوں کی داستانوں سے بھری پری پڑی ہے، پاک و ہند کے نامور تاریخ دان مولانا عبدالرحمن شوق امرتسری حنفی لکھتے ہیں کہ

حجاز کے حکمران کو شریف مکہ کہتے تھے لیکن وہ ملکی انتظام کے قیام و انصرام میں ناکام رہا لوٹ مار کی گرم بازاری تھی بدوی ڈاکوؤں نے حاجیوں پر چیرہ دستی کر کے ناک میں دم کر رکھا تھا حکومت ترکی یہ سب کچھ کانوں سے سنتی اور آنکھوں سے دیکھتی تھی لیکن جب کبھی وہ شریف کی سرکوبی کا ارادہ کرتی وہی احترام و پاکیزگی کا خیال اس کا دامن تھام لیتا اس رواداری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۵ء میں شریف حسین نے بغاوت کا علم بلند کر دیا جس کا نتیجہ اس صورت میں رونما ہوا کہ حجاز میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں ۱۹۱۶ء میں شریف کی تقریب تاج پوشی سنائی گئی اور اسے خلعت ملوکیت سے سرفراز کیا گیا ۱۹۱۸ء میں تسخیر عرب پایہ تکمیل کو پہنچ گیا اس کے بعد حجاز میں شریفی حکومت کا شادیانہ اقتدار پورے زور سے بجنے لگا ۱۹۱۹ء میں معاہدہ سیورے نے ترکی کا تختہ الٹ دیا تو شریف کے گھر ساغر اطمینان میں زہر گھولتے رہے مگر جنگ عظیم سے پائی ہوئی قوت کی پھونکیں بغاوت کے ان شعلوں کو گل کرتی رہیں، بدویوں کی پیدا کی ہوئی شورش کا مقابلہ تو وہ آسانی سے کرتا رہا لیکن نجد و یمن کی مخالفانہ بساط آرائی کے آگے اس کی بازی مات ہوگئی اور ۱۹۲۳ء میں سلطان ابن سعود نے شریف کے ایوان حکومت کو پیوند زمین کر دیا۔

تاریخ اسلام ص ۸۷۶ حصہ پنجم، سلطان عبدالعزیز بن سعود نے ملک الحجاز بنتے ہی ملک کے

گوشے گوشے میں امن و آسائش کا مینہ برسا دیا ایضاً ص ۸۷۹ حصہ پنجم۔

عراق حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ

دخل ابليس العراق فقضى فيه حاجته ثم دخل الشام فطر دوه ثم دخل مصر فباض فيها و فرخ و بسط عبقریه، طبرانی کبیر ص ۲۶۲ ج ۱۲، (رقم الحدیث ۱۳۲۹۰) و طبرانی اوسط ص ۲۲۱ ج ۷ (رقم الحدیث ۶۴۲۷) کنز العمال ص ۱۳۸ ج ۱۲ (رقم الحدیث ۳۵۱۵۴) و درمنثور ص ۱۱۲ ج ۳۔

شیطان عراق میں داخل ہوا تو وہاں اپنی ضرورت پوری کی پھر شام گیا تو وہاں کے لوگوں نے اسے بھگا دیا پھر مصر گیا اور وہاں خوب انڈے بچے دیے اور وہاں خوب مزے سے رہ بسا۔ انتھی) علامہ ھیشمی فرماتے ہیں کہ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، البتہ اس کی سند میں انقطاع ہے کیونکہ یعقوب کی ابن عمر سے ملاقات و سماع ثابت نہیں۔

مجمع الزوائد ص ۶۳ ج ۱۰ باب فی ماجاء فضل الشام۔

راقم عرض کرتا ہے کہ گویہ روایت منقطع ہے مگر فرقہ بریلویہ کے نزدیک منقطع حجت ہے، چنانچہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے کہ

ہمارے نزدیک مرسل ہر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند متصل نہ ہو اور اس کے اقسام میں فرق کرنا اور ان کے جدا جدا نام مرسل و منقطع و مقطوع و معطل رکھنا یہ محدثین کی ایک نری اصطلاح ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس میں کتنی صورتیں ہوتی ہیں، رہا حکم وہ ہمارے نزدیک ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ثقہ اگر کوئی حدیث مرسل لائے تو مقبول ہے،

کفل الفقیہ الفہام فی احکام قرطاس الدراہم، مندرجہ فتاویٰ رضویہ ص ۷۷ ج ۷۔

خاں صاحب کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ وہ منقطع کو مرسل کی ایک قسم قرار دیتے تھے۔ اور اگر بیان کرنے والا ثقہ ہو تو وہ مقبول ہوتی ہے جب کہ امام یعقوب بن عتبہ ثقہ ہیں، تہذیب

ص ۳۹۲ ج ۱۱،

الغرض یہ روایت فرقہ بریلویہ کے گرو کے نزدیک صحیح و معتبر ہے، آئیے اس سلسلہ میں دوسری حدیث ملاحظہ کریں،

امام یسیر بن عمرو بیان فرماتے ہیں کہ

دخلت على سهل بن حنيف فقلت، حدثني ما سمعت من رسول الله ﷺ؟ قال، في الحرورية؟ قال احدثك ما سمعت لا يزيدك عليه سمعت رسول الله ﷺ يذكر قوما يخرجون من ههنا، واثاربيده نحو العراق يقرآن القرآن لا يجاوز حناجرهم، يمرقون من الدين كما يمرق السهم من الرمية، قلت هل ذكر لهم علامة؟ قال هذا ما سمعت لا يزيدك عليه.

مسند امام احمد ص ۴۸۶ ج ۳، و تهذيب مسند ص ۳۶ ج ۴.

میں حضرت سهل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے عرض کی کہ مجھ سے وہ بیان کیجئے جو آپ نے نبی ﷺ سے سنا ہے انہوں نے کہا کہ (شاید تم) حرویہ (کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو) سو ان کے (متعلق) میں تم سے اپنی طرف سے بڑھائے بغیر بتاتا ہوں کہ میں نے سنا آپ ﷺ ایک قوم کا تذکرہ کر رہے تھے جو ادھر سے نکلے گی یہ کہہ کر آپ نے عراق کی طرف اشارہ کیا (اور فرمایا کہ) جو قرآن پڑھیں گے ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے کمان سے تیر (راوی حدیث یسیر) کہتے ہیں کہ میں نے کہا کیا نبی ﷺ نے ان کی کچھ نشانی بھی بتائی ہے وہ (سهل بن حنیف رضی اللہ عنہ) بولے میں نے جو کچھ سنا تھا اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ انتہی۔

معلوم ہوا کہ، یقرؤن القرآن لا يجاوز تراجمهم، سے جو اہل بدعت حضرات جماعت اہل الحدیث کو مطعون کرتے ہیں وہ سرا سر جھوٹ فریب اور ان کی مکاری و عیاری ہے اور اس کے مصداق ان کے عراقی بھائی خوارج ہیں اور اہل الحدیث کی بجائے اہل بدعت اس حدیث کے مصداق ہیں کیونکہ انکا تعلق عراق کے شہر کوفہ سے ہے۔

بصورت تسلیم

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ نجد قرن الشیطان اور، ہناک الزلازل و الفتن، سے مراد وہی نجد ہے جسے آج نجد سعود کہا جاتا ہے، جس سے توحید کی دعوت پھیلی اور حرمین شریفین میں امن و امان قائم ہوا، کیا اتنی سے بات سے ہی دعوت توحید و سنت دینے والے یکسر غلط ٹھہریں گے اور ان کو گمراہ اور ناقابل اعتبار ثابت کرنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ نجد کے رہنے والے ہیں؟

یہ ایک سوال ہے جس کا جواب بہت غور طلب ہے کہ آیا کہ کسی شخص کو زمین بھی مقدس و محترم بناتی ہے؟ یا کہ انسان کو اس کے اعمال ہی محترم و مقدس بناتے ہیں؟ جب اس کے جواب کیلئے ہم قرآن پاک میں غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقِيهِ (الایہ) پ ۲۶ سورة الحجرات آیت ۱۳۔

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے (احمد رضا)

اس آیت کریم نے بات صاف کر دی کہ انسان کی شخصیت محترم و مقدس ہونے میں کسی علاقہ و زمین کا دخل نہیں ہوتا بلکہ شرافت کیلئے عمل صالحہ کی ضرورت ہے سید العرب و العجم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے خود ایک صحابی کے سوال کرنے پر ارشاد فرمایا ہے کہ

من اکرم الناس؟ قال اتقاهم۔ بخاری ص ۴۷۳ ج ۱ کتاب الانبیاء باب واتخذ الله ابراهيم خلیلا و مسلم ص ۲۶۸ ج ۲ فی الفضائل باب من فضائل یوسف) عن ابی هريرة رضى الله عنه

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں پرہیز گار لوگ سب سے زیادہ مرتبہ والے ہیں۔

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ کسی جگہ کے مقدس ہونے سے وہاں کا مقیم بھی مقدس و محترم بن جاتا ہے تو یہ بھی ماننا پڑھے گا کہ ابو جہل اور ابو لہب امیہ بن خلف وغیرہ کفار مکہ بھی مقدس و محترم

تھے (نعوذ باللہ) کیونکہ ارض حرم روز اول سے ہی پاکیزہ و مبارک اور عزت والی جگہ ہے، ارشاد ہوتا ہے

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبرکاً و ہدی للعلمین۔ پ ۴ ال عمران آیت ۹۶۔

بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کو مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہانوں کا راہنما۔ (احمد رضا خاں)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان ظالم کافروں نے اس مقدس زمین میں سب سے زیادہ مقدس شخص کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا مگر خود ان کافروں کو مکہ کی شرافت محترم نہ بنا سکی پھر جب نبی ﷺ نے مدینہ طیبہ میں قدم مبارک رکھا تو یہ زمین ارض مقدس کہلائی (جیسا کہ حدیث نبوی میں اس کی صراحت ہے) مگر عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین اور اس کا گروہ اسی مدینہ کے باشندہ تھے لیکن مدینہ ان کے لئے تقدس کی ضمانت نہ ہو سکا، حرمین شرفین کی عزت و حرمت سے نعوذ باللہ انکار مقصود نہیں، بتانا یہ ہے کہ صرف حرمین کی حرمت اس کے باشندوں کو شرافت کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ مصر و شام نص قرآنی سے ارض مقدس ہیں المسجد الاقصا الذی برکنا حولہ۔ الایہ بنی اسرائیل آیت ۱۔

یعنی مسجد اقصیٰ جس کے گرد اگر دم نے برکت رکھی ہے۔

مگر اس کی وجہ سے وہاں کے باشندوں کو علی الطلاق شرف تقدس کا تحفظ نہیں دیا جاسکتا کہ اسی ارض مقدس میں یہود جیسی مغضوب و ملعون قوم آباد ہے اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر رہی ہے۔

جس طرح کوئی زمین اپنی عظمت و حرمت کے باوجود کسی قوم یا شخص کو عظمت و حرمت عطا نہیں کر سکتی اسی طرح کوئی قوم یا شخص کسی مغضوب و مقہور جگہ پر رہنے سے غلط نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر نجدی موحدین یا ان کو اچھا جاننے والوں کو صرف اس وجہ سے گمراہ و بے دین ٹھہرایا جاتا ہے کہ وہ نجد سے تعلق رکھتے ہیں سرسرا دھوکہ ہے اگر یہ اصول درست تسلیم کر لیا جائے تو حضرت امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ و مقلدین پر بھی عراقی ہونے کی وجہ سے اسی قسم کا

فتویٰ لگایا جاسکتا ہے مگر ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ اصول ہی لچر ہے اور اس کا قائل قرآن و حدیث سے محض نابلد ہے کیونکہ ایک نجدی کو تو خود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے جنت کی خوش خبری دی ہے چنانچہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

جاء رجل الى رسول الله ﷺ من اهل نجد ثائر الراس نسمع دوى صوته ولا نفقه مايقول حتى دنا من رسول الله ﷺ فاذا هو يسأل عن الاسلام فقال رسول الله ﷺ خمس صلوات في اليوم و الليلة فقال هل على غيرهن فقال لا الا ان تطوع قال رسول الله ﷺ و صيام شهر رمضان فقال هل على غيره قال لا الا ان تطوع قال وذكر له رسول الله ﷺ الزكوة فقال هل على غيرها فقال لا الا ان تطوع قال فادبر الرجل وهو يقول والله لا ازيد على هذا ولا انقص منه فقال رسول الله ﷺ افلح الرجل ان صدق. بخارى و مسلم بحواله مشكوة ص ۱۳.

ایک آدمی نجد کا رہنا والا رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جس کے سر کے بال پر اگندہ تھے اس کی آواز میں گنگناہٹ تھی ہم سنتے تھے لیکن سمجھتے نہ تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب آگیا ناگہاں وہ اسلام کے متعلق پوچھ رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پاؤں نمازیں دن رات میں، اس نے کہا انکے علاوہ بھی کچھ مجھ پر ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں مگر یہ کہ تو نفل پڑھے، نبی ﷺ نے فرمایا کہ اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا، اس نے کہا ان کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے، نبی ﷺ نے کہا کہ نہیں مگر یہ کہ تو نفلی روزے رکھے، اور رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کا ذکر کیا، اس نے کہا اس کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفلی صدقہ کرے۔

(راوی حدیث حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) اس آدمی نے پیٹھ پھیری اور وہ کہتے جا رہا تھا اللہ تعالیٰ کی قسم ہے کہ میں اس پر زیادہ نہ کروں گا اور نہ کم کروں گا (یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے کہا) اس نے فلاح پائی اگر سچا ہے۔

بخاری ص ۱۱۱ ج ۱ و مسلم ص ۱۳۰ ج ۱

وہ لوگ جو صرف لفظ نجدی کو دیکھ کر ہی آگ بگولہ ہو جاتے ہیں وہ ذرہ ٹھنڈے دل سے غور

کریں کہ ایک نجدی کو نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اس دنیا میں ہی جنت کی بشارت سنائی ہے۔

گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نبی ﷺ کی پیشگوئی اس نجد کے متعلق ہے (جس سے شیخ محمد بن عبد الوہاب کا تعلق ہے) تو تب بھی اس پیشگوئی میں ہر فرد بشر داخل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک خاص گروہ ہے جو دین میں فتنہ اور بدعات کا مرتکب ہوگا جس سے کوئی ایسا فعل قبیح سرزد ہوگا جس کی تلافی ناممکن ہوگی اور امت اسلام کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ محمد بن عبد الوہاب کا دامن ان تمام چیزوں سے پاک ہے اور کوئی مائی کا لال شیخ کا کوئی ایسا عقیدہ ثابت نہیں کر سکتا جو کہ غیر اسلامی ہو، یہاں چونکہ چنانچہ اور فلاں علامہ صاحب نے یوں لکھا ہے اور فلاں نے اس طرح کہا ہے، سے بات نہیں بنے گی بلکہ یہاں علماء آل سعود کی لکھی ہوئی کتب سے دلائل نقل کرنے کی ضرورت ہے، کہنے کو تو شیطان رشدی ملعون نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو کیا کچھ نہیں کہا، مگر مثل ہے، چاند پر تھوکنے والے کے منہ میں آتا ہے۔

محمد بن عبد الوہاب تاریخ کے آئینہ میں

(۱) اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ شیخ محمد بن عبد الوہاب کی ذات کو ان کی دعوت کی وجہ سے بدنام کیا گیا ہے اس لئے اس سلسلہ میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ محمد بن عبد الوہاب کی دعوت نجدی نہیں بلکہ شامی ہے کیونکہ ان کی زندگی میں جو انقلاب اور جذبہ جہاد پیدا ہوا ہے وہ امام ابن تیمیہ دمشقی اور ان کے شاگرد امام ابن قیم کی کتب کے مطالعہ سے پیدا ہوا ورنہ وہ خود تو پہلے بہت سے خرافات اور زمانہ کے رسم و رواج میں گرفتار تھے اور جس حدیث کی بنیاد پر محمد بن عبد الوہاب کو مطعون کیا جاتا ہے وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ شام مبارک جگہ ہے اور اس کیلئے نبی ﷺ نے دعا فرمائی ہے کہ، اللھم بارک لنا فی شامنا، اے اللہ ہمارے شام میں برکت ڈال۔

(۲) شیخ محمد بن عبد الوہاب خاندان بنو تمیم کے چشم و چراغ تھے اور اس قبیلہ کی حدیث نبوی سے عظمت ثابت ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

لا ازال احب بنی تمیم بعد ثلث سمعته من رسول اللہ ﷺ یقولہا فیہ ہم

اشد امتی علی الدجال و كانت فیہم سبۃ عند عائشۃ فقال اعتقیہا فانہا من ولد اسمعیل و جاء ت صدقاتہم فقال ہذہ صدقات قوم اوقومی۔ صحیح بخاری ص ۶۲۶ ج ۲۔ و مسلم ص ۳۰۷ ج ۲، و اللفظ لہ۔

یعنی میں بنی تمیم سے اس وقت سے برابر محبت کرنے لگا جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے ان کی تین باتیں سنیں آپ ﷺ فرماتے تھے کہ

بنی تمیم میری ساری امت میں دجال کے بڑے مخالف ہوں گے (جب وہ خبیث نکلے گا) اور ایسا ہوا کہ بنی تمیم کی ایک عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس قید تھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے آزاد کر دے کیونکہ بنی تمیم حضرت اسمعیل کی اولاد سے ہیں، بنی تمیم کی زکوٰۃ آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا میری قوم کی زکوٰۃ ہے۔ (انتہی)

مسلمانو! ذرا غور کیجئے گا جس قوم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کریں ان کی بہادری دجال کے بالمقابل ایمانی قوت کی پیشگوئی فرمائیں ان کو اپنی قوم قرار دیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انہیں محبوب رکھیں، آہ آج انہیں بے دین و گمراہ کہا جاتا اور وہ بھی صرف بے بنیاد اور جھوٹی افواہوں کے نتیجہ میں جنہیں صرف انگریز اور اس کے چچوں نے اپنے پیٹ کی خاطر ایجاد کر رکھا ہے۔

SCANNED BY: MUHAMMAD SHAKIR

TRUEMASLAK@INBOX.COM

تعلیم القرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ

تصویر کا پہلا رخ

حضرت سعد بن سہل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، کہنے لگی اے اللہ کے رسول ﷺ میں اس لئے آئی ہوں کہ میں اپنے کو آپ علیہ السلام کو بخش دوں، آپ علیہ السلام جس طرح چاہیں مجھ میں تصرف کریں، آپ علیہ السلام نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔

جب عورت نے دیکھا کہ آپ علیہ السلام نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا، تو وہ بیٹھ گئی، دریں حالت ایک صحابی کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ کو اس عورت کی خواہش نہیں ہے، تو مجھ سے نکاح کر دیجئے، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرے پاس (حق مہر) دینے کو کچھ ہے، اس نے کہا کہ اللہ کی قسم میرے پاس (حق مہر) دینے کو کچھ نہیں ہے۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے عزیز و اقارب کے پاس جا اور کچھ (ادھار ہی) لے آ، وہ گیا اور خالی ہاتھ پلٹا، کہنے لگا اللہ کی قسم ہے کہ مجھے کچھ بھی نہیں ملا، آپ نے فرمایا کہ جا دیکھ بھال اور نہیں تو لوہے کی ایک انگوٹھی ہی سہی، وہ دوبارہ گیا پھر لوٹ کر آیا، کہنے لگا اے اللہ کے رسول ﷺ، اللہ تعالیٰ کی قسم! مجھے لوہے کی ایک انگوٹھی بھی نہ مل سکی، البتہ یہ تہ بند (جو میں نے پہن رکھا ہے اس کو حق مہر میں دیتا ہوں) حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کے پاس چادر بھی نہ تھی (بلکہ لنگی تھی) کہنے لگا یہی لنگی آدھی پھاڑ کر اس عورت کو مہر میں دیتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لنگی کیا کام آئے گی، اگر عورت پہنے تو تو ننگا رہے گا اور اگر تو پہنے گا تو عورت ننگی رہے گی، یہ بات سن کر وہ صحابی بھی بیٹھ گیا، دیر تک خاموش و ناامید ہو کر بیٹھا رہا، بالآخر وہ اٹھ کر چل دیا، جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ وہ جا رہا ہے تو آپ علیہ السلام نے حکم دیا، اسے بلایا گیا جب وہ حاضر ہوا تو آپ علیہ السلام نے کہا کہ

ماذا معك من القرآن؟ قال، معي سورة كذا وسورة كذا وسورة كذا وعدها قال اتقروهن عن ظهر قلبك؟ قال نعم، قال اذهب فقد ملكتكها بما معك من

القرآن.

تجھے کچھ قرآن بھی یاد ہے؟ کہنے لگا جی ہاں فلاں فلاں سورت یاد ہے، کئی سورتیں اس نے شمار کی، آپ علیہ السلام نے فرمایا ان کو یاد سے پڑھ سکتا ہے؟ کہنے لگا جی ہاں، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جائیں نے یہ عورت اس قرآن (کی تعلیم) کے بدلے میں تیرے نام نکاح میں دی، جو تجھ کو یاد ہے۔

بخاری ص ۵۲ ج ۲ کتاب فضائل القرآن باب القراءة عن ظهر القلب. و مسلم ص ۴۵ ج ۱،

یہ حدیث اس بات کی واضح اور کھلی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تعلیم قرآن کو حق مہر قرار دیکر اس صحابی کا نکاح کیا ہے۔

اور حق مہر کا تعلق دنیا کے مال و دولت سے ہے، مگر آنحضرت ﷺ نے مجبور و فقیر کو تعلیم قرآن پر نکاح کر دیا ہے، اور یہ اجرت ہی ہے، لہذا ثابت ہوا کہ تعلیم القرآن پر محتاج کو اجرت لینی جائز ہے۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتیں ہیں کہ

لما استخلف ابوبکر الصديق قال لقد علم قومي ان حرفتي لم تكن تعجز عن مؤنة اهلى وشغلت بامر المسلمين فسيا كل آل ابو بكر من هذا المال و يحترف للمسلمين فيه.

یعنی جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میری قوم کو معلوم ہے کہ میرا کاروبار میرے اہل و عیال کی کفالت سے عاجز نہیں، لیکن اب میں مسلمانوں کے ملکی نظام کو سنبھالنے میں مشغول ہو گیا ہوں، تو اب ابوبکر کی اولاد اس مال سے کھائے گی اور ابوبکر مسلمانوں کے دینی اور ملکی امور سرانجام دے گا، صحیح بخاری ص ۸۷ ج ۱۔

علامہ ذیلی حنفی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو خط لکھا کہ وہ تعلیم قرآن پر معلمین کو اجرت دیں،

نصب الراية ص ۱۳ ج ۴۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر کوئی شخص تعلیم قرآن، خطابت و امامت اور دیگر دینی امور کی انجام دہی کی وجہ سے کوئی کاروبار یا ملازمت نہ کر سکتا ہو، اور اس کی مالی حالت بھی کمزور ہو، جس سے اس کے گھر کا گزارہ نہ ہوتا ہو، تو وہ وظیفہ لے سکتا ہے اس کیلئے یہ جائز و مباح ہے، جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے محتاج و فقیر کا نکاح تعلیم قرآن کو حق مہر قرار دیکر پڑھا دیا تھا۔

اسی طرح جو لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح دینی امور میں اس حد تک مصروف ہوتے ہیں وہ کوئی دنیا کا پیشہ کر کے اپنی آل و اولاد کا پیٹ نہیں پال سکتے تو ان کے لئے گزارے کے مطابق وظیفہ لینا جائز و مباح ہے، لیکن تدریس و خطابت و امامت اور وعظ کو ایک پیشہ بنا کر جو حضرات دنیا کی دولت اکٹھی کرتے ہیں، جائیدادیں پیدا کرتے ہیں، اور شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں، وہ بہر حال ناجائز و حرام ہے۔

ہمارے زمانہ میں ایک مزید بد رسم چل پڑی ہے کہ بعض جہال چند تقاریر کو رٹ کر وعظ کو پیشہ بنا لیتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے۔

اسی طرح وہ جاہل جو خطابت و امامت کو ایک کاروبار سمجھ کر پیش امام بن بیٹھتے ہیں، حالانکہ وہ دینی علوم تو کجا سادہ قرآن بھی پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یہ بھی ناجائز ہے۔

جائز صرف اس قدر ہے کہ اگر کوئی شخص فی الواقع عالم دین ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ محتاج بھی ہو تو اسے وظیفہ لینا جائز ہے، خواہ تدریس ہو، امامت و خطابت ہو، خواہ کوئی اور دینی امور ہو، لیکن یہ بہر حال کسی کیلئے بھی جائز نہیں کہ وہ اسے بطور کاروبار کرے اور اس کو ذریعہ معاش بنا کر مال و دولت جمع کرے۔

خلاصہ یہ کہ جس قدر بھی ممکن ہو، تعلیم پر اجرت لینے سے اعراض کرے اگر بوجہ مجبوری لے بھی تو فقط گزارے تک لے سکتا ہے، اس سے زائد بہر حال ناجائز ہے۔

تنبیہ

ہم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو دلیل اس لئے نہیں بنایا کہ وہ دم کے متعلق ہے،

اجرت تعلیم کے بارے میں نہیں، امام بخاری کی تبویب بخاری سے بھی ان کا اسی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ

عدم جواز کے قائل حضرات جو دلائل پیش کرتے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

میں بعض اہل صفہ کو قرآن مجید کی تعلیم اور لکھنا سکھاتا تھا، ان میں سے ایک نے مجھے ایک کمان تحفہ میں دی، میں نے سوچا کہ یہ مال نہیں ہے اور میں اس سے اللہ کی راہ میں تیر اندازی کروں گا، میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کے متعلق عرض کیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ

ان كنت تحب ان تطوق طوقا من نار فاقبلها،

یعنی اگر تجھے گلے میں آگ کا طوق ڈالنا پسند ہے، تو اسے قبول کر لے۔

سنن ابی داؤد مع عون ص ۲۷۶ ج ۳، و ابن ماجہ (۲۱۵۷) و مسند احمد ص ۳۱۵ ج ۵، و بیہقی

۱۲۵ ج ۶۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں، الاسود بن ثعلبہ راوی مجہول ہے، اس کی دوسری سند بھی ہے جس میں، بقیہ ولید راوی ضعیف ہے،

المحلی بالاثار ص ۲۱ ج ۷، مسئلہ نمبر ۱۳۰۷۔

(۲) حضرت عبدالرحمان بن شبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اقرأوا القرآن ولا تاكلوا به، ولا تستكثروا به، ولا تجفوا عنه ولا تغلوا فيه .

یعنی قرآن پڑھو اور اس کو کھانے کا ذریعہ نہ بناؤ، اس سے کثرت حاصل کرو اور نہ ہی مال جمع کرو اور نہ ہی اس میں غلو کرو۔

مسند احمد ص ۴۲۸ ج ۳، و معجم طبرانی الاوسط ص ۲۷۲ ج ۳، (۲۵۹۵) و ابن ابی شیبہ ص ۴۰۰ ج ۲۔

واللفظ لابن ابی شیبہ۔

اس کی سند میں، یحییٰ بن ابی کثیر راوی مدلس ہے، اس کی تدلیس کی صراحت امام نسائی، بحوالہ

طبقات المدلسین ص ۳۶، اور حافظ ابن حجر نے کی ہے، تقریب ص ۳۷۸، اور زیر بحث روایت میں

سماع کی صراحت نہیں۔

(تنبیہ اول)

راقم کے پاس جو مسند احمد کا نسخہ ہے، اس میں یحییٰ بن ابی نمیر ہے، رقم الحدیث (۱۵۱۰۳) جو غالباً، کتابت کی غلطی ہے، کیونکہ یہی روایت حافظ زیلعی نے، نصب الرایۃ ص ۱۳۶ ج ۴، میں مسند احمد سے بمع سند نقل کی ہے اور، یحییٰ بن ابی کثیر، نقل کیا ہے، اسی طرح طبرانی، ابن ابی شیبہ، اور المحلی لا بن حزم ص ۲۰ ج ۷، میں ابن ابی کثیر ہی ہے۔

تنبیہ ثانی

ابن ابی شیبہ، میں کتابت کی غلطی سے، عبدالرحمن، کی بجائے عبداللہ بن شبل، ہے۔

تنبیہ ثالث

امام ابن حزم نے، المحلی ص ۲۱ ج ۷، میں اس روایت کا یہ جواب تحریر کیا ہے کہ اس کی سند میں، ابو راشد الحمرانی، راوی مجھول ہے، ہمارے نزدیک یہ بات درست نہیں کیونکہ ابو راشد، ثقہ ہے، تقریب ص ۴۰۵۔

(۳) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک شخص کو قرآن سکھاتا تھا، اس نے مجھے ایک کمان تحفہ بھیجی اس کا ذکر میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ

ان اخذتها اخذت قوسا من نار فرددتها۔

اگر تو نے یہ کمان لی تو آگ کی ایک کمان لی، یہ سن کر میں نے اس کو کمان واپس کر دی، ابن ماجہ (۲۱۵۸) و بیہقی ص ۱۲۵ و ۱۲۶ ج ۶۔

اس کی سند میں انقطاع ہے، کیونکہ حضرت ابی بن کعب سے روایت کرنے والے راوی، عطیہ بن قیس الکلاعی، کی ان سے ملاقات و سماع ثابت نہیں۔

جیسا کہ بوسری نے، الزوائد ص ۱۳۴ ج ۲، میں علامہ العلانی کے حوالے سے صراحت کی ہے، دوسرا راوی، الکلاعی، کا شاگرد، عبدالرحمن بن سلم، مجھول ہے، تقریب ص ۲۰۲۔

(۴) حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

من قرأ القرآن يتأكل به الناس جاء اليوم القيامة و وجهه عظم ليس عليه لحم.
یعنی جس نے قرآن کو اس لئے پڑھا تا کہ لوگوں سے دنیا کا مال کھائے تو وہ قیامت کے روز
اس حالت میں آئے گا کہ اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا۔

شعب الایمان للبیہقی ص ۵۳۳ ج ۲ (رقم الحدیث ۲۶۲۵)

اس کی سند میں علی بن قادم راوی ہے، جس کو امام یحییٰ بن معین اور امام احمد اور دارقطنی نے
ضعیف کہا ہے، العلل المتناہیۃ ص ۱۱۰ ج ۱۔

ہمارے معاصر غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی نے اس روایت کو بیہقی کی سنن الکبریٰ
ص ۵۳۳ ج ۲، کی طرف منسوب کیا ہے، شرح صحیح مسلم ص ۴۴ ج ۱۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی شاگرد سے طرق حدیث جمع کرواتے رہے ہیں، اور اس
نے، بیہقی، کی طرف منسوب کیا ہوگا، اور سعیدی صاحب نے مغالطہ سے، السنن، کا نام تحریر کر دیا
ہوگا، واللہ اعلم۔

(۵) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

من اخذ قوسا علی تعلیم القرآن قلده اللہ قوسا من نار

یعنی جس نے تعلیم قرآن پر ایک کمان بھی وصول کی اللہ تعالیٰ اس کو آگ کا قلابہ پہنائے گا،
سنن الکبریٰ للبیہقی ص ۱۲۶ ج ۶۔

امام بیہقی فرماتے ہیں یہ روایت ضعیف ہے۔ امام دحیم فرماتے ہیں اس روایت کا کوئی اصل
نہیں (بیہقی ص ۱۲۶ ج ۶)

(۶) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

من قرأ القرآن فلیسال اللہ به فانه سیجنی اقوام یقرؤن القرآن یسالون به
الناس۔

یعنی جو شخص قرآن کو پڑھے (اور جب آیات رحمت پر سے گزرے تو) اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ
سے سوال کرے، عنقریب ایسی اقوام آئیں گی جو قرآن کو پڑھیں گی اور اس سے لوگوں سے سوال
کریں گے۔

ترمذی مع تحفہ ص ۵۵ ج ۴، و مسند احمد ص ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۶، ۴۳۹، ۴۴۵، و طبرانی کبیر ص ۱۶۶ ج ۱۸۔

ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے، لیکن حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے حسن بصری ہیں، جو صحابہ کرام سے بہت زیادہ مرسل بیان کرتے ہیں اور مدلس ہیں۔ تقریب ص ۶۹، اور جب تک سماع کی تصریح نہ ہو قابل حجت نہیں۔

اور حسن کے شاگرد، خیشمۃ بن ابی خیشمۃ، لین الحدیث، ہیں، تقریب ص ۹۵۔
الغرض یہ روایت بھی ضعیف ہے۔

راہ اعتدال

مذکورہ احادیث میں بلاشبہ اکثر ضعیف ہیں، لیکن حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح ہے امام بیہقی نے بلاوجہ اس کو ضعیف کہا ہے، علامہ شوکانی نے اسے علی شرط مسلم کہا ہے، نیل الاوطار ص ۳۰ ج ۵، اور، ماردینی نے، جید، قرار دیا ہے، الجوہر النقی ص ۱۲۶ ج ۶، اور علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح قرار دیا ہے،

سلسلہ احادیث الصحیحہ (۲۵۶-۲۶۰) بحوالہ اروا الغلیل ص ۳۱۷ ج ۵۔

اس طرح حضرت عبادہ کی حدیث بھی، حسن درجہ سے کم نہیں، بلاشبہ اس کی سند میں، اسود بن ثعلبہ مجھول ہے مگر اس کی دوسری سند بھی ہے، جو حسن درجہ کی ہے، واضح رہے کہ بقیہ بن ولید صدوق ہے، ضعیف نہیں، ہاں البتہ مدلس ہے، لیکن یہاں اس نے سماع کی صراحت کی ہے۔
اور بقایا روایات شواہد کی وجہ سے حسن درجہ کی ہیں، لہذا علی الاطلاق ان روایات کو ضعیف کہنا قطعاً درست نہیں۔

ان احادیث کا صحیح محل

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ محتاج و معذور اس سے الگ ہے، کیونکہ اگر ان احادیث کو علی الاطلاق ممانعت پر محمول کریں، تو دین کا نظام ختم ہو کر رہ جائے گا، اور نشر و اشاعت، اسی طرح دعوت و تبلیغ کا وجود بھی جاتا رہے گا، اور تعلیم قرآن کیلئے مستقل کوئی مدرس ملنا بھی مشکل سے مشکل تر

ہو جائے گا۔

ان چیزوں کو ہی ملحوظ رکھ کر متاخرین فقہاء احناف نے جواز کا فتویٰ دیا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

- (۱) علامہ سرخسی حنفی، المصنوع ص ۳۷۶ ج ۱۶، طبع دارالمعرفۃ بیروت ۱۳۹۸ھ
- (۲) علامہ مرغینانی حنفی، ہدایہ اخیرین ص ۳۰۳ طبع ملتان
- (۳) علامہ بابر قحنی، عنایہ علی ہامش فتح القدیر ص ۴۰، ج ۸، طبع سکھر
- (۴) علامہ خوارزمی حنفی، کفایہ علی ہامش فتح القدیر ص ۴۱ ج ۸
- (۵) ملا نظام الدین حنفی، فتاویٰ عالمگیری ص ۴۳۸ ج ۴
- (۶) ابن عابدین، رسائل ابن عابدین ص ۱۲۶ ج ۲ طبع سہیل اکیڈمی
- (۷) علامہ کردری، فتاویٰ برازیہ علی ہامش عالمگیری ص ۳۷ ج ۵
- (۸) علامہ زیلعی، تبیین الحقائق ص ۱۲۵ ج ۵، طبع مکتبہ امدادیہ ملتان
- (۹) ملا علی القاری، شرح النقایہ ص ۱۱۴ ج ۲، طبع کراچی
- (۱۰) عبدالحق محدث دہلوی، اشعۃ اللمعات ص ۱۱ ج ۳

تلك عشرة كاملة

آخر میں ہم مبتدعین کے مجدد ملت مولوی احمد رضا خاں کا فتویٰ پیش کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

سائل پر شرعاً کوئی الزام نہیں، اور جو کچھ اسے ماہوار مل جاتا ہے، حلال طیب ہے، اور کیفیت مذکورہ سوال اسکے نہایت صبر و استتعال و طلب وجہ حلال و خوف مولیٰ ذوالجلال پر دال ہے، جزاء اللہ تعالیٰ خیرا، بلکہ اگر وہ سب پڑھنے والوں سے اپنا ماہوار مقرر کر لے جب بھی جائز ہے اور مذہب مفتی بہ پر اصلاً مضائقہ نہیں،

فی حاشیۃ البحر الرائق للعلامة خیر الدین الرملى کتاب الوقف المفتی بہ جواز الاخذ استحساناً علی تعلیم القرآن الخ، و مثله فی کثیر من الكتب.

معتز کا اعتراض محض بے جا ہے اور اس کا یہ کہنا کہ اللہ سمجھ کر بھی دیتے ہیں، جب بھی حرام ہے، شریعت مطہرہ پر کھلا ہوا افترا ہے، اگر پڑھنے والوں نے اتنے تنگدست استاد کی لوجہ اللہ خدمت کی، کیا گناہ ہوا، اور استاد کو اس کا لینا کیونکر حرام ٹھہرا، یہ محض جہالت و تعصب ہے،..... خیر اگر وہ حدیث ہی مانگیں تو خاص صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ

ان احق ما اخذتم عليه اجراً كتاب الله،
یعنی قرآن مجید سب چیزوں سے زیادہ اس کا لائق ہے کہ تم اس پر اجرت لو۔
ملخصاً، فتاویٰ رضویہ ص ۸۳۲ ج ۸، طبع کراچی۔

تم الجزء الثاني من دين الحق

ويليه الجزء الثالث، اوله باب التقليد۔

کتبہ ابو صہیب محمد داؤد ارشد

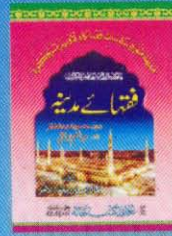
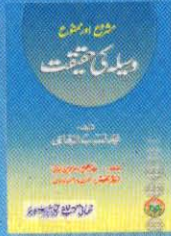
کوٹلی ورکاں، نارنگ منڈی، شیخوپورہ

☆☆☆☆☆☆

ایکیننگ : مسٹر
کراچی، جی او ایز اداریہ
Books
contribution کے رابطہ کیلئے

truemaslak@inbox.com

ہماری مطبوعات آپ کے علمی ذوق کی ترجمان



نعمانی بک خانہ حق سٹیڈیو
آرڈو بازار لاہور



E-Mail: nomania2000@hotmail.com